ناظرینِ "ادبی دنیا" کیلئے ایک نادر تحفہ ـــــ طاقت کا لاثانی فقیری نسخہ

ناظرین آج میں آپ کو ایک ایسا عجیب و غریب سا نسخہ بتلا رہا ہوں جو ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے نیز اپنے فوائد اور خوبیوں میں بے مثل ہے اگر آپ کمزور ہیں تو ایک بار اسے بنا کر ضرور استعمال کریں اور میری محنت کی داد دیں۔ اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے تھوڑی ہے صرف سات دن کے استعمال سے جسم میں خون دوڑتا ہوا نظر آتا ہے اکیس دن میں چہرہ رخ سونے کی طرح چمکنے لگتا ہے نیز چالیس دن میں پوری طاقت حاصل ہو جاتی ہے کیسی ہی کمزوری نامردی ہو۔ اس کے استعمال سے دور ہو جاتی ہے اس سے عورتوں کی ہر قسم کی رحم کی بیماریاں دور ہو کر ان میں اولاد پیدا کرنے کی قوت آجاتی ہے۔ یہ نسخہ قبض نہیں کرتا بلکہ جگر اور معدہ کو قوت پہنچاتا ہے۔ پرانا قبض بھی اس کے استعمال سے دور ہو جاتا ہے اور بھوک خوب لگتی ہے۔ کف۔ کھانسی۔ نزلہ۔ زکام۔ بدن کا دکھنا۔ خون کا پتلا ہونا جگر اور معدہ کی خرابی آنکھوں میں پیلا پن۔ پیٹ کی گھڑگھڑاہٹ۔ بار بار تھوک گرنا۔ بواسیر۔ دمہ نیز ہر قسم کی کمزوری اس کے استعمال سے جلد دور ہو کر انتہا قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ ہر موسم میں ہر مزاج والے کو یکساں فائدہ کرتا ہے۔ ہم ناظرین کرام سے استدعا کرتے ہیں کہ امسال چالیس دن ضرور استعمال کریں۔

قلاتی پہاڑی کے رتن گری سادھو نے اس دوا کی پانچ چھ خوراکیں ایک گوالے کو دے دی تھیں جو کہ دودھ وغیرہ سے ہمیشہ باباجی کی خدمت کیا کرتا تھا۔ وہ بوڑھا گوالہ بوجہ لاعلمی کے ساری خوراکیں ایک ہی بار کھا گیا اس سے جو حالت ہوئی اس کا ذکر خلاف تہذیب ہے صرف یہ لکھنا کافی ہو گا کہ بڑھاپے میں ... باسے علاج کرانے کے بعد اس گوالے نے تین بیاہ کئے تھے اس خبر کو سن کر خلیفہ حاجی حیات محمد خان صاحب نواب بھاولپور کے خسر صاحب نے بہت سا وقت صرف کرکے اور بڑی محنت کرکے مہاتما جی سے یہ نسخہ آب حیات حاصل کیا پھر آپ سے یہ نسخہ کری دنود وید بھوشن پو ... یاد پنڈت ٹھاکر دت جی شرما کو ملا۔ شرما جی نے اچھی طرح آزمائش کرکے دنیا کے بھلے کی خاطر اخبار دیش اپکارک میں چھپوا دیا اور اس سے عمدہ نسخہ بتلانے والے کو اپنے تین نسخوں کے لئے ایک ہزار روپیہ انعام اور سرٹیفکیٹ دینے کا وعدہ کیا تھا جسے تقریباً تیرہ سال ہو چکے ہیں جو ابھی تک کسی نے حاصل نہیں کیا۔ پنڈت جی کی کمال مہربانی سے یہ نسخہ ہمیں ملا ہے۔ ہم نے بھی اسے نفع عام کی خاطر اخبارات میں چھپوانے کا فیصلہ کیا ہے نیز آج ہم "ادبی دنیا" کے معزز ناظرین کی خدمت میں بزور سفارش کرتے ہیں کہ کسی موسم میں چالیس دن ضرور لگاتار اس کا استعمال کرنا چاہئے۔ پھر ناظرین دیکھیں گے کہ قیمتی خوراکوں کے مقابلہ میں یہ نسخہ کیسا ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ آپ ہمیشہ کیلئے اس کے معتقد بن جائیں گے لیکن یہ خیال رہے کہ یہ نسخہ کسی نااہل سے تیار نہ کرائیں۔ اس نسخہ کی تعریف میں کلکتہ کے مشہور ویدراج بابو ہری داس اپنی کتاب چکتسا درپن میں لکھتے ہیں کہ اس دوا سے ایک آدمی کا ایک ہفتہ میں چار پونڈ وزن بڑھ گیا اور دوسرے کا چہرہ لال سرخ ہو گیا۔ بھوپال کے وید پنڈت بال کرشن شرما لکھتے ہیں میں نے ... لوگوں پر استعمال کیا امید سے بڑھ کر مفید پایا تیار کرکے ایڈیٹر آیورویدا چاریہ شری چھوٹے لال جی نے رتناکر میں لکھا ہے کہ اتنا مؤثر اور جلد فائدہ پہنچانے والا دوسرا نسخہ نہیں ہو سکتا۔ کرتانہ کے مشہور ویدڈاکٹر امیشور دیال نے بھی انوبھو یوگ مالا پتر میں چھپوایا ہے کہ یہ نسخہ حقیقت میں انوکھا ہے کبھی خطا نہیں کرتا میں نے اب تک ... مریض اس نسخے کے ذریعے اچھے کئے ہیں۔ ایسے ہی ہزاروں سرٹیفکیٹ ہمارے پاس موجود ہیں ناظرین ادبی دنیا یقین کریں اور ضرور ... دن اس کا استعمال کریں نسخہ یہ ہے

شدھ برادہ فولاد دو تولہ۔ شدھ سنکھیا (سفید رنگ) ایک تولہ کو ... ماشہ کو ایک گھنٹہ تک گھی کوار کے رس میں گھونٹ کر مٹی کے کوزہ میں بند کرکے پانچ سیر اپلوں کی آگ میں ٹھنڈا ہونے پر دوبارہ ایک تولہ ہڑتال ورقی شدھ ... ماشہ۔ کیور شدھ ... میں تین بار گندھک آملسار شدھ ایک تولہ۔ کیور شدھ ... ماشہ میں چوتھی بار شدھ سنگرف بارہ ایک تولہ۔ کیور ... ماشہ کے ساتھ اوپر کی طرح آگ دیں اسی طرح سولہ بار آگ دیں سولہویں آنچ کے بعد بھسم نکال کر لوہے کی کڑاہی میں ڈال دیں اور اوپر سے بھسم کے برابر پھٹکری ڈال دیں جب سب پھٹکری جل کر خاک ہو جائیں تو پنکھے کی ہوا سے اڑا دیں اور بھسم شیشی میں رکھ لیں بس یہی قوت بخش نسخہ آب حیات ہے۔

طریق استعمال چار چاول کے برابر مکھن یا ملائی میں صبح شام کھائیں۔ اوپر سے دودھ۔ گھی بادام مصری استعمال کریں۔ کھانے میں انار سیب انگور شیریں تقویت دینے والے پھل کھائیں نیز دال۔ چاول۔ گھی شکر سے کھائیں پوری روٹی۔ کدو کی سبزی استعمال کریں اور بادی چیزوں سے پرہیز کریں۔ نمک سرخ مرچ اور کھٹی چیزوں سے پرہیز کریں سفید نمک کالی مرچ کھا سکتے ہیں۔

نوٹ ادویات کا نسخہ پورے طریقے پر سمجھا کر لکھ دیا گیا ہے۔ بنائیے اور فائدہ اٹھائیے اگر آپ عدیم الفرصت ہیں یا کسی وجہ سے خود نہ تیار کر سکیں تو ہم آپ کو تیار شدہ دوا لاگت پر مہیا کرنے کو تیار ہیں۔ ۴۰ دن کی خوراک مع ڈاک خرچ پانچ روپیہ آٹھ آنہ میں بھیج دیں گے۔ اگر کوئی صاحب بات ثابت کر دیں گے کہ ہماری دوا نسخے کے مطابق نہیں بنی ہے تو ہم اس کو مبلغ

ایک ہزار روپیہ انعام دیں گے

اس سے زیادہ ... کیا سچائی کا ثبوت پیش کر سکتے ہیں۔ ایک مرتبہ ضرور آزمائیں اگر کوئی بات پوچھنا ہو تو جوابی کارڈ بھیج کر دریافت کر سکتے ہیں۔

مشتہر سیوک شیام بہاری لال وید بھوشن آیوروید وشارد شیام چکتسالیہ نمبر ۲۲ شاہجہانپور (یو۔پی)

سوزِ ناتمام

روزنامہ انقلاب لاہور

"سوزِ ناتمام" کے افسانوں میں حیاتِ انسانی کے مختلف پہلوؤں اور فطرت انسانی کے دقیق اسرار پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے اور مختلف کرداروں کی زبان سے زمانۂ حاضر کے ذہنی ابہام و عواطف کی آئینہ داری کی گئی ہے انداز بیان نہایت دلنشین اور خیالات و جذبات کا اظہار بے حد دلکش ہے۔

روزنامہ احسان لاہور

"سوزِ ناتمام" کا انداز بیان ماہرانہ اور موضوعات بہت اثر انگیز ہیں جناب عاشق نے اکثر مقامات پر "سِرِ دلبراں در حدیثِ دیگراں" لکھتے ہوئے اپنے وجدان و قلب کی کیفیات کا تجزیہ کر کے رکھ دیا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ انہوں نے دوسرے کے جذبات و حسیات کا تجزیہ کرنے میں بھی کمال مہارت اور قدرت کا ثبوت دیا ہے

روزنامہ زمیندار لاہور

عاشق صاحب کا طرزِ بیان سادہ، دلکش اور فلسفیانہ مگر دلچسپ ہے، ان کے اکثر پلاٹ بالعموم موجودہ تعلیم یافتہ اصحاب کی زندگی پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کے افسانوں کو اگر موجودہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی دلی کیفیات کا آئینہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کی جلتی ہوئی چتا میں جھلسنے کے بعد عاشق صاحب جب باہر نکلے ہیں تو انہوں نے ان شعلوں کی آتشیں کیفیت بیان کر دی ہے جنہوں نے کسی زمانے میں ان کی رگ رگ اور ریشے ریشے میں آگ لگا دی تھی۔

ہفتہ وار اخبار شیرازہ لاہور

"سوزِ ناتمام" کے افسانے محض وقتِ فرصت گزارنے کا ہی ذریعہ نہیں بلکہ بے حد خیال افروز واقع ہوئے ہیں۔ اور انہیں پڑھ کر ہمارے سامنے انسانی زندگی کے بعض ایسے پہلو آ جاتے ہیں جن پر غور کرنے کو جی چاہتا ہے۔ عاشق صاحب کے انداز سے پختگی جھلکتی ہے اور ان کے افسانوں کی ایک اہم خصوصیت نفسیاتی تجزیہ ہے

رسالہ ادبی دنیا لاہور

عورت کی فطرت، گناہ کی اصلیت اور انجام، معاشرت کی خامیاں اور خرابیاں، زندگی اور زندہ دلی ان افسانوں کے مضامین ہیں اور ان کو جس بے باکی اور قدرت کے ساتھ مصنف نے نبھایا ہے۔ اس کی نظیر ہمیں اپنے اہلِ قلم میں بہت کم ملتی ہے "سوزِ ناتمام" ایک مرقع ہے جس کا ہر نقش غائر نظر سے دیکھے جانے کا حق رکھتا ہے۔ عاشق صاحب کی زبان اور اسلوب تحریر بھی کچھ کم جاذب نہیں۔ اگر انہیں صاحب طرز ادیب کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ نہایت شستہ و رفتہ اردو لکھتے ہیں، الفاظ کی قدر و قیمت جانتے ہیں اور ترشی ترشائی منجھی ہوئی ترکیبیں اور فقرات استعمال کرنے میں کمال رکھتے ہیں

رسالہ کلیم دہلی

عاشق صاحب کے افسانوں میں ایک خصوصیت نمایاں اور قابلِ تعریف ہے۔ وہ یہ کہ کوئی افسانہ بے کار نہیں لکھا گیا۔ ہر افسانہ نتیجہ خیز اور سبق آموز ہے۔ ملک کے ہونہار ضرور اس بات کو پیش نظر رکھیں کہ نظمیں، افسانے تعلیمی مقاصد ہوں۔ غرض کہ کوئی چیز قسم سے بے کار نہ نکلے۔ آج ملک اور قوم کو اسی کی ضرورت ہے اور عاشق صاحب نے ملک اور قوم کی اس ضرورت کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے جس کے لئے وہ لائق مبارک باد ہیں۔

رسالہ ہمایوں لاہور

حضرتِ عاشق بٹالوی کی افسانہ نویسانہ شہرت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ان کا ساختہ اور سلجھا ہوا طرز تحریر بہت کم لوگوں کو میسر ہے اور بلاشبہ وہ ایک خاص انداز کے مالک ہیں۔

ملنے کا پتہ — مینجر ادبی دنیا — لاہور

طب کے نایاب اور صحیح مجربات کا بہترین مجموعہ
"حکمت کے موتی"

اس لاجواب کتاب میں قابل مصنف نے سر سے لے کر پاؤں تک کے زنانہ و مردانہ امراض کا مکمل علاج اور اس کی تشخیص مجرب و مفید نسخے درج کر دیئے ہیں جن کو معمولی لیاقت کا آدمی بھی سمجھ کر کامل مہارت حاصل کر سکتا ہے اس کتاب میں ... مجربات کے علاوہ خلطوں کی ... نبض قارورہ کی شناخت نہایت آسان طریقہ سے درج کی گئی ہے امید ہے کہ طب کی تمام ... یہ بے نظیر کتاب ہے قیمت اصلی ایک روپیہ رعایتی بارہ آنے مجلد ...

ذرا غور سے ملاحظہ فرمایئے ایڈیٹر صاحب ادبی دنیا کی قابل قدر رائے

زیر تبصرہ کتاب حکمت کے موتی واقعی اسم بامسمٰی ہے اس کتاب میں طبیبوں اور فن طب کے طالبوں کیلئے جہاں خلطوں کی تشریح اور نبض و قارورہ کی شناخت لکھی گئی ہے وہاں سر سے لے کر پاؤں تک کے امراض کے لئے پانچ سو سے بہت زیادہ مجرب نسخے بھی لکھے گئے ہیں ہم قارئین کرام سے پرزور سفارش کرتے ہیں کہ اس مفید کتاب کو منگا کر ہمیشہ فائدہ اٹھائیں کتابت طباعت اور کاغذ عمدہ قیمت رعایتی بارہ آنے ۱۲/

بچوں کا علاج

اس نایاب اور بے نظیر کتاب میں صرف بچوں کے لئے حمل ... کی تشخیص اور ان کی علامات کا ذکر کیا گیا ہے۔ ہر ایک مرض کا بیان اور ان کے روکنے کی ... اور بیماریوں کے مجرب آزمودہ سینکڑوں نسخے۔ بچوں کی پرورش کے بہترین اور آسان طریقے درج کئے گئے ہیں جن کے بنانے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ علاوہ اس کے نظر بد اور ہر قسم کے خطرناک آسیب وغیرہ کے تعویذات و عملیات ... درج ہیں جن کے استعمال سے معمولی لکھا پڑھا آدمی بھی اپنے پیارے بچے کی حفاظت کر سکتا ہے اس کتاب کا ہر گھر میں ہونا ضروری ہے۔ بچے کی پیدائش کے سعد و نحس اوقات کا حال بھی درج ہے قیمت مجلد سنہری حروف اصل قیمت صرف دو آنے ... جن حضرات کی درخواستیں ... پہنچ جائیں گی ان کو صرف ۶/ علاوہ محصول۔ آپ آج ہی آرڈر دے کر اپنا نام درج رجسٹر کرالیں۔

اُستادِ روزگار

بہ مفلسی دو مہینوں میں دولتمند بنانیوالی کتاب۔ یہ وہ خاص کتاب ہے کہ جس میں کہ قابل مصنف نے خلق خدا کی بھلائی کے لئے ہر قسم کی صنعت و حرفت کے کام نہایت ایمان داری سے صحیح صحیح تجربہ کر کے درج کر دیئے ہیں معمولی سے معمولی آدمی بھی اس کتاب کے مطالعہ سے کوئی نہ کوئی ہنر سیکھ کر اپنا اور اپنے بال بچے کا پیٹ پال سکتا ہے۔ اور اگر چند روز تک استقلال سے کام کرتا رہے تو یقیناً ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں روپے کا مالک بن سکتا ہے اس میں صابن سازی کے ہر قسم کے طریقے۔ ہر قسم کے شربت ہر قسم کے حلوے اچار مربے کی ترکیبوں کے علاوہ خضاب کے نسخے۔ امرت دھارا کے نسخے۔ بال اڑانے کے۔ پوڈر بنانے کے طریقے۔ ہر قسم کی سیاہیوں کے تیار کرنے اور ان کے درست کرنے کے ... ڈبل روٹی۔ بسکٹ کیک وغیرہ بنانا۔ نقلی سونا۔ نقلی چاندی۔ نقلی ہیرا بنا کر دخت کرنا۔ فوٹو گرافی۔ گھڑی سازی۔ عطاری غرض کوئی ایسا ہنر یا کوئی ایسا کام نہیں جس کی سہل ترکیب اس کتاب میں درج نہ ہو۔ مصنف کا دعوےٰ ہے کہ اس سے پیشتر ایسی اعلیٰ ایسی مفید کتاب آج تک شائع نہیں ہوئی۔ لکھائی چھپائی اعلیٰ۔ قیمت بلا جلد کے لئے ایک روپیہ ۸/ مجلد سنہری کے لئے دو روپے

اتالیق خیاطاں

یعنی استاد درزیاں جس میں زنانہ مردانہ اور ہر قسم کے فیشنی کپڑے سینے۔ ناپ لینے اور کٹائی کرنے کے ایسے آسان اور مفصل طریقے نقشے دیکھ اور تصاویر بنا کر سمجھائے گئے ہیں کہ جن کو دیکھ کر معمولی سمجھ کا ہر مرد و عورت آسانی سے ... چند دنوں میں ...

سلک جواہر

اگر آپ پیٹ کے ہر مرض سے محفوظ رہنا چاہتے ہیں ... استعمال فرمایئے ... نہایت لذیذ ... معدہ ... بھوک بڑھانے والا ... بے نظیر ... قیمت ...

[illegible]

[illegible]

فہرست مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہ مارچ سنہ ۱۹۳۷ء

جلد ۱۵ — تصویر: معصومیت — نمبر ۵

نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	صفحہ
۱	بزم ادب	منصور احمد	۳۵۸
۲	آئینۂ عالم		۳۵۹
	افسانے		
۳	گڑیا	محترمہ مس منصفۃ الرحمن صاحبہ	۳۸۲
۴	خندۂ تقدیر	جناب نسیم رضوانی	۳۸۹
۵	انتقام	جناب عبدالعزیز صاحب بہالزی	۴۰۲
۶	مصور	جناب دینا ناتھ صاحب دار کو شاہد کاشمیری	۴۱۱
	ڈراما		
۷	الوداع	جناب صادق ایوبی	۳۹۳
	علمی مضامین		
۸	جہاتما گاندھی سے بات چیت ٹھیٹ اردو میں	جناب سید ابوالقاسم صاحب	۳۶۳
۹	ٹالسٹائے کا مذہب	جناب محمد یعقوب صاحب بی اے	۳۹۶
	حصۂ نظم		
۱۰	غزل	حضرت حفیظ ہوشیارپوری ایم اے	۳۷۹
۱۱	دخت کش	جناب شاد عارفی	۳۸۰
۱۲	ایک فراموش شدہ باغ کو دیکھ کر	جناب تابش صدیقی	۳۸۱
۱۳	غزل	جناب سیفی نوگانوی	۳۸۷
۱۴	میں اور تم	جناب حمید عرفانی ایم اے	۳۸۸
۱۵	غزل	منصور احمد	۳۹۲
۱۶	فردوس خیال	جناب سکندر علی صاحب وجد	۳۹۵
۱۷	غزل	حضرت حکیم آزاد انصاری	۴۰۰
۱۸	رہزنی	جناب عبدالحمید صاحب عدم	۴۰۱
۱۹	رباعیات	مرزا عباس بیگ محشر	۴۰۹
۲۰	سہ آتشہ	جناب رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری	۴۱۰
۲۱	جرم سنگین	جناب خاور	۴۱۵
	دنیائے ادب		۴۱۶
	نقد و نظر	منصور احمد	۴۲۰

سالانہ چندہ چار روپے سات آنے محصول اور وی پی تو آنے کل پانچ روپے ممالک غیر سے دس شلنگ

دگیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام صلاح الدین صاحب پرنٹر و پبلشر چھپ کر دفتر ادبی دنیا کرشن بلڈنگس مال روڈ لاہور سے شائع ہوا

بزم ادب

مہاتما گاندھی سے بات چیت ٹھیٹ اردو میں

مندرجہ بالا عنوان سے مولانا ... الحاکم صاحب کا ایک بے نظیر مضمون اس نمبر میں شائع ہو رہا ہے۔ یہ مضمون سیاست جاننے والے اور اردو زبان کے پیش نظر مسائل پر ایک گراں بہا تحقیق ہے جو ان موضوعات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے خاص توجہ کا مستحق ہے۔ مولانا موصوف نے اس میں فارسی، سنسکرت، عربی اور ہندی کے ماخذوں کی تعیین کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ فارسی اور سنسکرت کا ماخذ ایک ہی ہے اور ان دونوں میں تفریق کرنا لاعلمی پر مبنی ہے۔ عربی زبان کے الفاظ جہاں اردو میں رائج ہو گئے ہیں وہاں دوسری ہندوستانی زبانوں میں بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اردو ان سب زبانوں کے ملاپ سے پیدا ہوئی ہے اور ہندوستان کے اتحاد کے قیام کے لئے اس سے بہتر زبان ممکن نہیں ہے۔ اس امر کو تو ہندو بھی سمجھتے ہیں کہ زبان قوموں کے اتحاد میں بڑا حصہ لیتی ہے۔ لیکن ان کی کوششیں اس وقت تک ہی بے نتیجہ نہیں۔ مولانا نے ایک نہایت عمدہ پروگرام پیش کیا ہے جو بلاشبہ قابل عمل و ممکن العمل ہے۔ اردو زبان کی وسعت اور قوت بیان کا ثبوت انہوں نے خود اپنی تحریر سے دے دیا ہے۔ یہ تقریر صرف عربی اور فارسی الفاظ سے مطلقاً پاک ہے بلکہ اس میں بجز ... سنسکرت لفظ سے بھی مدد نہیں لی گئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو زبان الفاظ کی دولت سے کتنی مالامال ہے۔ اس میں اتنے اس قدر الفاظ ہیں کہ دوسری زبانوں سے کچھ مستعار لئے بغیر ہر مفہوم ادا ہو سکتا ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ نہ صرف مہاتما گاندھی ہی اسے غور سے پڑھیں گے اور اس کے نکات پر تدبر فرمائیں گے بلکہ اردو اور ہندی کے مسائل پر فکر کرنے والے اس سے بصیرت حاصل کریں گے۔

آتش نمبر

آتش نمبر کی تجویز طے ہو گئی ہے اور ماہ جون کا پرچہ آتش نمبر ہو گا۔ جون کے مہینے کی مناسبت سے نکلنا بھی اسی آتشیں مہینے میں موزوں تھا۔ ہندوستان کے مشہور افسانہ نگار اور نقاد حضرت مجنوں گورکھپوری، حضرت یاس یگانہ چنگیزی لکھنوی، حضرت فراق گورکھپوری، اور جناب شہنشاہ حسین صاحب رضوی اس پرچے کے لئے خاص محنت اور کاوش سے مضامین لکھ رہے ہیں۔

مندرجہ ذیل موضوعات اس نمبر کے لئے تجویز ہوئے ہیں۔

(۱) آتش اور اردو شاعری
(۲) آتش اور انسانی تہذیب اور کلچر
(۳) آتش اور لکھنؤ سکول
(۴) آتش کا اثر اردو شاعری پر
(۵) آتش اور خودی
(۶) آتش اور مجازیت اور عجمیت
(۷) آتش کا سلسلہ شاگردان و متبعین

آٹھواں موضوع آتش اور غالب تجویز کیا گیا تھا جس پر خامہ فرسائی کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

جو اصحاب ان موضوعات میں سے کسی ایک موضوع پر قلم اٹھانا چاہیں وہ براہ مہربانی جلد اپنے ارادہ سے مطلع فرمائیں۔ تمام مضامین اپریل کے وسط تک دفتر میں پہنچ جانے چاہئیں۔

ساقی اور شاہجہاں

دہلی کے یہ دونوں رسالے جناب مولانا شاہد احمد صاحب بی اے آنرز کی ادارت میں اردو ادب اور زبان کی بیش بہا خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ساقی میں مختلف اور متنوع مضامین شائع ہوتے ہیں اور شاہجہاں زیادہ تر ترقی پسند مصنفین کی انجمن دہلی کی سرگرمیوں اور خیالات کو ملک کے سامنے پیش کرتا ہے۔ ساقی نے جہاں ضخامت طباعت وغیرہ میں ترقی کی ہے وہاں ایک خاص قابل ذکر بات یہ ہے کہ دنیا کے بلند پایہ اور منتخب ادب کو نہایت سرعت اور روانی کے ساتھ اردو میں منتقل کر رہا ہے۔ چنانچہ ۱۹۴۳ء کے سالنامے میں بھی دو مبسوط اور بہترین کتابیں ترجمہ کی گئی ہیں۔ اول فاؤسٹ جو خود حضرت مدیر کے گلکار قلم کا ایک دلکش نقش ہے اور دوسرے ہیملٹ ہے جو مولانا عنایت اللہ صاحب بی اے دہلوی سابق ناظم دارالترجمہ حیدرآباد دکن نے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ یہی دو کتابیں کسی ایک رسالے کی تکمیل کے لئے کم نہ تھیں لیکن انہوں نے ۲۲ کے قریب دوسرے مضامین بھی بہترین اہل قلم سے حاصل کر کے اس پرچے کی زینت بنائے ہیں۔ حجم ۳۰۰ صفحات کے قریب ہے اور قیمت ایک روپیہ چار آنے۔

منصور احمد

آئینۂ عالم

تصویری زبان

قریباً پانچ سال کا عرصہ ہوا کہ دنیا میں حقائق کو بیان کرنے کا ایک نیا طریقہ ایجاد ہوا ـــــ یہ طریقہ اس وقت اس قدر وسیع پیمانے پر رائج ہو رہا ہے کہ اب اس کے موجد کا نام تک یاد نہیں رہا۔ سرخ اور نیلی فوجوں کی طاقت کا اندازہ اگر دو سپاہیوں سے کیا جائے جن میں سے ایک سرخ اور طویل قد بنایا جائے اور دوسرا نیلا اور پست قد، تو کسی صحیح نتیجے پہنچنا بہت مشکل ہے۔ اس کے بجائے اگر بارہ سرخ سپاہی بنائے جائیں اور پانچ نیلے اور ایک سپاہی ...۲۰ کے برابر ہو تو ایک ہی نظر میں معلوم ہو جائے گا کہ سرخ فوج کی تعداد دو لاکھ چالیس ہزار ہے اور نیلی فوج کی ایک لاکھ۔

حقائق کو جلدی، آسانی اور صحت کے ساتھ صرف تصاویر کے ذریعہ سے پیش کرنے کا یہ ایک بالکل نیا طریقہ ہے ـــ اور یہ عام طور پر یہ لوگوں کو معلوم نہیں ـــــ کہ یہ اُس بین الاقوامی زبان" کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے جو الفاظ کے بجائے تصاویر کے ذریعہ لکھی جاتی ہے

اس کے موجد ڈاکٹر آٹو نیورتھ معاشرتی سائنسدان اور فلسفی ہیں جنھوں نے اسے دنیا کے معاشرتی اور اقتصادی عجائب خانے میں ترقی دی ڈاکٹر موصوف نے دس سال ہوئے اس عجائب خانے کی بنیاد رکھی تھی اور اس عرصہ میں خود ہی اس کے نگرانِ کار رہے ہیں۔

تصاویر پران کا یقین اتنا پختہ ہے کہ وہ اپنے دستخط کے بجائے ہاتھی کی تصویر بناتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ آپ بہت بھاری بھرکم آدمی ہیں۔ (آپ کا وزن ۲½ من ہے) اور ممکن ہے ـــــ اس لئے کہ آپ بہت عقلمند انسان ہیں۔

ابھی سے ان بڑھتے ہوئے تصویری نشانات کی لغات بن رہی ہے۔ انہیں کے ذریعے سے مشینیں، شہروں کے نقشے، اعداد و شمار، آبادی کی ترقیاں، تاریخی واقعات، گندم، لوہے اور سمینٹ وغیرہ کی پیدائش اور لاگت کے تفاوت بیان کئے جاتے ہیں بعض اوقات ایک کتاب کا مضمون ایک چھوٹے سے تصویری قرطاس پر سما جاتا ہے۔

جن لوگوں کو یہ الفاظ اور ان کی قواعد ازبر ہے ان کے لئے فقرے بنائے جاسکتے ہیں۔ ڈاکٹر نیورتھ کے تصویری نشانات الفاظ کے ہم معنی ہیں۔ اُن کھیل کی اینٹوں کی طرح جنھیں جوڑ جوڑ کر بچے عمارتوں کے نمونے کھڑے کر لیتے ہیں، ان نشانات کو جوڑ کر حقائق اور خیالات بیان کئے جاسکتے ہیں۔ ان نشانات کی بنی ہوئی ایک ہی تصویر دیکھنے والے کے دل سے ایک کہانی بیان کر دیتی ہے۔

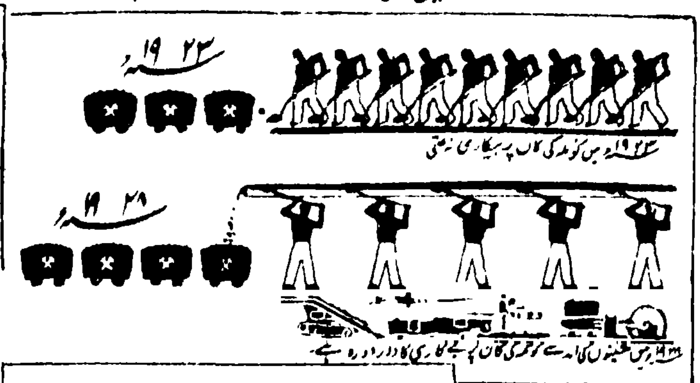
تصویری زبان کا ہر نشان نہایت سادہ اور عام فہم ہوتا ہے۔ غیر ضروری تفصیلات نظر انداز کر دی جاتی ہیں۔ ہر چیز کا انتہائی درجہ تک اختصار کیا جاتا ہے۔ انسانی تصاویر کے چہرے نہیں بنائے جاتے ـــ صرف سر کافی سمجھا جاتا ہے، ہاتھ غیر ضروری سمجھے جاتے ہیں ـــ صرف بازو بنائے جاتے ہیں۔ ٹوپی کی موجودگی یا غیر موجودگی کسی کو سفید فام، لاطینی، امریکی انڈین، ہندوستانی حبشی یا منگولی ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے۔ جوتی کی شکل پوری سپاہی ہیں۔ کارخانے کی ایک مستطیل خاکہ اور اس پر چمنی کا نشان۔ جوتی کو مستطیل میں رکھ دیجئے تو اس کا مطلب ہوا "جوتی کا کارخانہ" اور چمنی سے دھواں نکلتا ہوا دکھائی دے اور دروازے کھلے ہوں تو کارخانہ مصروف کار ہے۔ اگر دھواں نہ نکل رہا ہو اور دروازے بند ہوں تو کارخانہ بیکار پڑا ہوا ہے۔ ٹیلیفون کے آلے کی تصویر اور ایک تیر کا نشان دنیا کے کسی حصے میں یہ ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے کہ اس جگہ سے ٹیلیفون کیا جاسکتا ہے۔ سکوں کو اوپر تلے جوڑ کر رکھنے کے معنی ہیں "روپیہ"۔ ہوائی جہاز پر ایک چٹھی کی شکل کا مطلب ہے "ہوائی ڈاک"۔

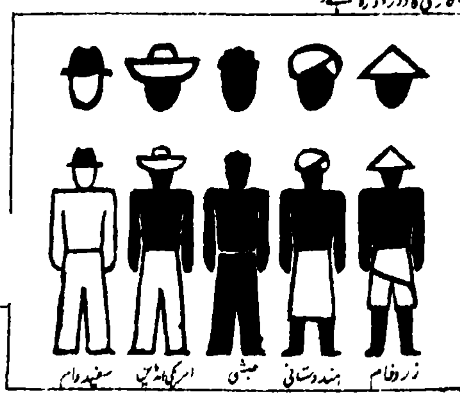
بیرون ملک میں تصویری نشانات کی تعلیمی قدر و قیمت ابھی سے

معلوم ہوتی ہے۔ ڈاکٹر نیورتھ کہتے ہیں کہ اچھی تصاویر کی موجودگی میں اچھے معلموں کی ضرورت نہیں رہتی نیز اس کے ذریعے سے بُرے معلم کے نقصانات کا اندیشہ نہیں رہتا" دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ نیچے اعلیٰ درجے کی تصاویر کی مدد سے ادنیٰ درجہ کے مدرسوں سے بھی صحیح تعلیم حاصل کر سکتے ہیں یہ اس لئے کہ تصویری نشانات اپنی اپنی جگہ خود کر کے مدرس کا بوجھ ہلکا کر دیتے ہیں اور تعلیم کے فرائض صحیح معنوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔

تصویری نشانات کو پہچاننا اور ان کی تشریح کرنا انہیں ایک عبارت میں منسلک کرنے سے زیادہ آسان ہے۔ عبارت لکھنے کے لئے کچھ عرصہ باقاعدہ تعلیم لینی پڑتی ہے لیکن اس کے نتیجے میں ایک ایسی تصویری زبان پر مہارت حاصل ہو جاتی ہے جو دنیا کی تمام زبانوں کے مقابلے میں زیادہ عالمگیر، آسان اور جلد سمجھ میں آنے والی ہوتی ہے۔ اس کی تشریح کے لئے صرف چند الفاظ لکھنے کی ضرورت ہوتی ہے ــــ مثلاً ــــ "ایک تصویر . . . . ۲۰۰ آدمیوں کو ظاہر کرتی ہے" اور یہ الفاظ ملکی زبان ہی میں لکھے جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے نیورتھ کی تصاویر جغرافیائی نقشوں کی طرح ہیں جنہیں بہت کم تفصیل کی ضرورت ہوتی ہے۔

عام طور پر کسی عبارت کو بیان کرنے کے لئے تصاویر سے کام لیا جاتا ہے۔ لیکن بعض اوقات تصاویر کو واضح کرنے کے لئے عبارت کی ضرورت پڑ جاتی ہے اور یہ سلیس اور سادہ عبارت اپنی تصویر کے ساتھ ضروری تعلقات ظاہر کرنے کے لئے نہایت اختصار کے ساتھ







استعمال کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر نیورتھ نے یورپ میں آلہ نشر الصوت پر کئی فی البدیہہ تقریریں کی ہیں جن کا تمام تر مواد صرف تصویری زبان میں اس کے پاس ہوتا تھا اور اس کی یہی تقریریں سادہ ترین اور مشہور ترین ثابت ہوئیں جس طرح کوئی معمار عمارت بناتے وقت ایک ایک اینٹ نیلے رنگ کے نقشے کی ہدایات کے مطابق رکھتا ہے اسی طرح تصویری زبان کو لکھنے والا کوئی حق نہیں رکھتا کہ اپنے تخیل یا مرضی سے اس کی ترتیب میں دخل دے۔ وہ صرف ایک اوزار ہے اس ماہرِ فن کے ہاتھ میں جس نے اس بات کا اچھی طرح مطالعہ کر لیا ہے کہ ہر سائنسدان، مورخ یا ماہر اقتصادیات کو اپنے پیغامات کس طرح لکھنے ہیں اور اس نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ہر ضرورت کے لئے کون سے اشارات استعمال کئے جائیں گے اور مطلوبہ مطلب واضح کرنے کے لئے کم از کم دماغی کاوش کے ساتھ انہیں کس طرح ترتیب دیا جائے گا۔

اس عمل کا نام "تبدیل ہیئت" ہے۔ ماری رئیڈمیسٹر اس عمل میں سب سے زیادہ ماہر ہے۔ تصویری اشارات کے بنانے میں جرڈ انٹنز اور اروِن برنتھ کامل ترین ہیں۔

اس تحریر کی تصاویر ہمیشہ جذبات سے معرا، ٹھوس، حقیقی اور ہمیشہ ایسی عملی ہوتی ہیں جیسے ہتھوڑا یا دانتوں کا برش۔ جذبات کو بالکل خارج کر دیا جاتا ہے۔ اگر عام کتابیں ایسی ہی حقایق پر منطبق ہوں

تو انسان اکتا جاتا ہے۔ اور تصاویر سے انسان اتنی جلدی تنگ نہیں آتا۔ لیکن ان کی ترتیب اور استعمال میں بدرجہ غایت احتیاط کرنی چاہیے۔ اس لئے کہ مطالب ذرا سی بے احتیاطی سے بدل جاتے ہیں" ڈاکٹر نیورتھ کہتے ہیں۔ اسی لئے وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ نشانات نہایت سادہ اور کم از کم خطوط پر مشتمل ہونے چاہئیں۔ غیر ضروری اور تزئینی تفصیلات سے کلیتہً احتراز کرنا چاہیئے۔ اُن کے قواعد میں سے ایک یہ بھی ہے کہ "کوئی چیز صرف اس لئے شامل نہ کرو کہ وہ تمہیں دلچسپ یا خوب صورت معلوم ہوتی ہے اور اپنی مصورانہ قابلیت کا اظہار نہ کرو"

تصویری تحریر بڑے بڑے مصوروں کے شاہکاروں سے بالکل مختلف چیز ہے۔ ان شاہکاروں کو تم جتنے غور کے ساتھ دیکھو گے ان میں نئی نئی خوبیاں یا برائیاں ظاہر ہوں گی لیکن تصویری تحریر میں ایسے عمق فوراً ختم ہو جاتے ہیں۔ پہلی ہی نظر میں تمام روئیداد آپ پر منکشف ہو جائے گی، دوسری نظر میں کچھ معمولی سے نکات، تیسری میں کچھ اور زوائد جو لکھنے والے نے ڈال دئے ہوں گے اور اگر چوتھی نظر کی بھی ضرورت ہے . . . تو "اکثر نیورتھ گرج کر کہتے ہیں "اسے اٹھالو، اس میں بے ہودہ تفصیلات ہیں"

یہ نشانات ہر تعلیمی ضرورت کے لئے استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ سائنس کی ترویج کے لئے، جنگ کے اثرات اور سر دبازاری کو دور کرنے کے لئے دباؤں کے استیصال کے بہترین طریقے بتلانے کے لئے اور غیر ملکی زبانوں کی تعلیم کے لئے۔ بچے بھی بجائے کھلونوں سے کھیلنے کے ان سے تعلیمی کھیلیں کھیل کر مستفید ہو سکتے ہیں۔ ڈاکٹر نیورتھ نے پچیّ اور جوڑی کی کھیلیں انہیں تصاویر سے تیار کی ہیں۔ ان کا طریقہ نہ صرف آسان فہم اور جامع ہے بلکہ زمانے اور عام تعلیمی طریقوں سے بالکل جداگانہ اور آزاد ہے۔

اس زبان کی تحریر اور تفریر استعمال کرنے والے طبقے کی استعداد کے مطابق مختلف ہے۔ طبع شدہ پیغامات، بچے کے قاعدہ میں، اخبار کے صفحات میں، کیمیا کے کورس میں، سادہ ترین صورت سے مشکل ترین فنی اصطلاحات تک بدلتے چلے جاتے ہیں۔ اقتصادیات کے کسی نظریے پر لکھی ہوئی کتاب مزدور کی فہم سے یقیناً بالا ہو گی۔

تصویری تحریر کا اولیں مقصد اُس عقلی خلیج کو قابل عبور بنانا ہے جو کالج کے پروفیسر اور عام طبقے میں حائل ہے تاکہ وہ اپنا دماغ پر واضح کر سکے اور یقیناً پروفیسر مدرسہ کی معمولی تعلیم کے مقابلے میں تصویری تحریر سے بہت کچھ زیادہ اخذ کر سکے گا۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک ذہین اور حساس ناول نویس کسی غیر شہر میں گھومتے ہوئے اس شہر کی عبادت گاہوں، دکانوں اور راہ گیروں میں وہ کچھ دیکھتا ہے جو ایک وہیں رہنے والے مزدور کو کبھی نظر نہیں آتا۔ لیکن اس کے باوجود یہ بھی ممکن ہے کہ تصویر میں سے شہر اور اس کے نظاروں کی طرح مزدور کو وہ کچھ حاصل ہو جائے جو ناول نویس کو نظر نہیں آیا۔

تصویری تحریر کا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ اسے لکھنے کے عام رائج طریقوں کے بجائے استعمال کیا جائے۔ اس کا استعمال محدود ہے ——— الفاظ اور نقرات سے بھی زیادہ محدود۔ وہ اپنے مطالب و معانی کے بیان اور زود فہمی میں یکتا ہیں۔

نیورتھ کا باصری تعلیم کا یہ طریقہ ابھی سے وسیع پیمانے پر استعمال ہو رہا ہے۔ اس ضمن میں ریاست ہائے متحدہ سب سے پیش پیش ہیں۔ لیکن اس کی تعلیم اور استعمال میں یکسانیت ملحوظ نہیں رکھی جاتی ہر مدرس، مشتہر، مصور، سرکاری محکمہ یا کاروباری دفتر اپنے طریقے پر بلا لحاظ قواعد اور ہجا کے اس میں ترمیم و تنسیخ کر لیتا ہے۔ اگر تصویری تحریر کو فرانسیسی اور چینی کے لئے ایک ہی سے معانی کا حامل بننا ہے تو اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ قواعد کی قطعی طور پر پابندی کی جائے ——— ایک حکم مقرر کیا جائے جو اس بات کا فیصلہ کیا کرے کہ کون سے نشانات استعمال کئے جائیں اور انہیں کس طرح جوڑا جائے۔

اس نئی بین الاقوامی تصویری زبان کی ترویج اور اس کے نشانات کی لغات بنانے کے لئے ہالینڈ کے شہر ہیگ میں ایک انجمن کی بنیاد ڈالی گئی ہے جس کے صدر سائیم فیلڈرس ہیں۔ اسی ملک میں ایک ایسے مرکزی مدرسہ کی بنیاد بھی رکھی جانے والی ہے جہاں تصویری نشانات تیار ہوں گے اور اس طریقے کے معلموں کو تیار کیا جائے گا۔

ایک جامع اللغات بھی بنے گی ——— جو عجیب ترین اور مفید ترین جامع ہو گی یہ لغات تمام تر ڈاکٹر نیورتھ کے تصویری اشارات پر مشتمل ہو گی اور عام الفاظ صرف اتنے ہوں گے جن سے اشارات کی توضیح کرنا مقصود ہو گا۔ یہ جامع کسی زید بکر کو دیجئے یا آئن سٹائن کو۔ دونوں پانچ منٹ میں اس سے اتنا استفادہ حاصل کر لیں گے جتنا معمولی لغاتوں میں سے کروڑوں الفاظ پڑھ کر حاصل کیا جاتا ہے

"نیویارک ٹائمز"

حیات بعد الموت ؟

ادارہ حیات ثانیہ میں محیر العقول تجربات عمل میں لائے جا رہے ہیں۔ یہاں مرے ہوئے جانور اٹھتے ہوئے اور اپنی بقایا زندگی حسب معمول گزارتے ہیں۔

لیکن ابھی تک ۔۔۔ معیار اس قسم کے تجربات کا فائدہ ہے ۔۔۔ ان تجربات کے معمول بے زبان جانور ہیں جنہیں پہلے تو اپریشن کے میز پر ڈال کر مار دیا جاتا ہے اور پھر انہیں دوبارہ زندہ کیا جاتا ہے۔

یقین کیا ۔۔۔ ان بے زبانوں پر ظلم کیا جاتا ہے یا یہ سب کچھ رحم اور نرمی سے عمل میں آتا ہے۔ اس کے متعلق جو حقائق حکومت روسیہ کے ایک افسر نے لندن میں ایک نمائندہ اخبار سے بیان کئے حسب ذیل ہیں۔ اب قارئین اسے پڑھ کر اس عمل سے موقوف بہ رحم یا عقلمندی کے متعلق خود فیصلہ کریں۔ لیکن یہ بات یقینی ہے کہ یہ عمل موجودہ زمانے میں سائنس کی تحقیقات کے سلسلے میں سب سے زیادہ محیر العقول ہے۔

یہ تجربات ماسکو کے ادارہ حیات ثانیہ میں ڈاکٹر سرجی بروخانکو کے زیر عمل ہیں

اس قابل ڈاکٹر نے ایک آلہ ایجاد کیا ہے جو مردے کو دوبارہ زندہ کر دیتا ہے۔ یہ آلہ اصل میں ایک مصنوعی دل ہے۔

کچھ عرصہ ہوا رائل انسٹی ٹیوٹ لندن میں ایک ڈاکٹر نے ایک مرے ہوئے کتے کے دل کو دوبارہ متحرک کر کے دیکھنے والوں کو حیرت زدہ کر دیا تھا۔ ڈاکٹر بروخانکو اس سے کچھ اور آگے بڑھ گئے ہیں۔

آپ نے ایک کتے کا سر جسم سے کاٹ کر الگ کر دیا اور پھر اسے اپنی مشین کے ساتھ جوڑ کر چھ مہینے تک زندہ رکھا۔ دوران خون مصنوعی طور پر اس میں جاری رکھا گیا۔

اس کے بعد دوسرا قدم پورے جسم کو زندہ کرنا تھا۔ کتے کو مارنے کے کافی دیر بعد دوران خون پیدا کیا گیا اور کتا دوبارہ زندہ ہو گیا۔

ڈاکٹر کے تحقیقاتی کام میں مدد دینے کے لئے حکام نے ایک خاص معمل تیار کر دیا ہے جس کا سرکاری نام انسٹی ٹیوٹ آف ایکسپریمنٹل فزیالوجی اینڈ تھیروپی ہے۔

اس معمل میں اس وقت پانچ کتے اپنی دوسری زندگیاں گزار رہے ہیں۔ گزشتہ اگست میں بعض کو زہر دے کر اور بعض کو خون نکال کر ہلاک کیا گیا تھا۔

ایک کتیا آج کل ہی میں بچے دینے والی ہے یہ اور اس کا جوڑا دونوں دوبارہ زندہ کئے ہوئے جانوروں میں سے ہیں۔

ان تجربات نے ڈاکٹر بروخانکو کو یقین دلا دیا ہے کہ انسانی اجسام پر بھی پوری کامیابی کے ساتھ یہی عمل کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا قول ہے کہ "موت عجیب و غریب طبیعی عمل ہے جو متعدد درجات پر منقسم ہے۔ ہم اس بات کے معلوم کرنے کی کوشش میں ہیں کہ کس درجہ پر ہم زندگی لوٹا لانے پر قادر ہیں اور کہاں ہم بے بس ہو جاتے ہیں۔

ہم ان مدارج میں سے ہر ایک کی مدتِ عمل معلوم کرنے کی کوشش میں ہیں۔ اس سے قبل یہ سمجھا جاتا تھا کہ اگر موت اور عملِ حیات ثانیہ کے درمیان پانچ منٹ سے زیادہ عرصہ گزر جائے تو عملِ حیات بیکار رہے لیکن اس وقت جانور کو مارنے کے بعد معینہ مدت سے بہت زیادہ وقفہ گذار دیا جاتا ہے۔"

انسانی اجسام پر ان تجربات کے ہونے پر جب کبھی بھی وہ عمل میں آئیں بہت سے اختلافات کے پیدا ہونے کا امکان ہے۔

"لندن گزٹ"

"لندن گزٹ" جس کا ایک خاص ضمیمہ ۳ر جنوری کو نا جپوشی کی تاریخ مشتہر کرنے کے لئے شائع ہوا۔ انگلستان کا سب سے پرانا اخبار ہے۔

یہ اخبار سب سے پہلے ۷ر نومبر ۱۶۶۵ء کو آکسفورڈ سے شائع ہوا تھا کیونکہ اس وقت لندن میں پلیگ کی وبا پھیل رہی تھی اور دربار آکسفورڈ میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ اس وقت سے ہفتہ میں دو مرتبہ منگل اور جمعہ کے روز شائع ہوتا رہا ہے یا جب کبھی خاص ضمیمہ کی ضرورت محسوس ہوئی ۱۹۲۳ء میں مزدور طبقہ کے کسی جھگڑے کی وجہ سے ۲۵۸ سال میں پہلی مرتبہ اس کی اشاعت رک گئی۔

حکومت کے عام اعلانات "گزٹ" کے ذریعے سے شائع ہوتے ہیں اور قانون کا مدعا پورا کرنے کے لئے چند اشتہارات بھی شائع کرنے پڑتے ہیں ۱۸۴۷ء میں جب انگلستان میں ریلوے کا جنون ہو رہا تھا اور ریلوے کمپنیوں کے اعلانات کی بھرمار تھی گزٹ کی ہفتہ وار اشاعت کا حجم ۳۰۰۰ صفحات تک بڑھ گیا تھا

گذشتہ بدھ ۳ر فروری ۱۹۳۷ء کے روز اس کی اشاعت کا نمبر ۳۴۳۶۷ تھا۔

منصور احمد

مہاتما گاندھی سے بات چیت ٹھیٹ اردو میں

مہاتما جی۔ پرنام۔ ڈاکٹر تارا چند جی سے میں نے جو باتیں کیں وہ آپ نے سنی تو ہوں گی۔ انہیں باتوں میں تُمھارا نیہ ساہتیہ پریشد پر چار کی بات چیت بھی چھڑ گئی تھی جس پر میں نے اُن سے یہ بھی کہا تھا میں کبھی کُھل کر اس پر گاندھی جی سے الگ باتیں کروں گا۔ اسے کئی مہینے ہو چکے۔ جب سے اب تک آپ سے باتیں کرنے کا رہ رہ کر دھیان تو آتا رہا پر ادھر اُدھر کے بکھیڑوں میں ایسا پھنسا جو ادھر آنا چاہنے پر بھی اب تک نہ آسکا۔ کچھ دنوں سے ان جھمیلوں سے چھٹکارا ملا ہے۔ آج چاہتا ہوں جو کچھ جی میں ہے اور جو اب تک نہ کہہ سکا وہ سب ایک سانس میں آپ سے کہہ دوں۔ پرماتما کرے آپ ٹھنڈے جی سے اسے دیکھ سکیں۔ کس نے کہا اسے دیکھنے والے تو بہت ہیں اور کیا کہا اس کے پڑھنے والے بہت تھوڑے ہوئے اور ہیں اور ہوں گے۔ کون کہہ رہا ہے اسے چھوڑ کر کیا کہا جا رہا ہے اسی کو جانچئے اور پرکھ لیجئے۔

پہلے یہ جتا دینا چاہتا ہوں۔ دیس کے پیچھے آپ نے اپنا سکھ چین سب کچھ کھو دیا۔ اسی کے لئے آپ نے جوگ سادھا۔ نئے نئے ڈھب سے اس سنسار نے آپ کو جھنجھوڑا اور دُکھ پہ دُکھ دئیے۔ دوسرا ہوتا تو سٹ پٹا جاتا اور ہٹ بٹا کے نہ جانے کیا کر بیٹھتا۔ پر آپ ٹس سے مس کبھی نہ ہوئے اور آپ نے یہ دکھا دیا۔ نہیں لگتی ہے جونک پتھر کو۔ دیس کے سدھرنے کے لئے جو آپ نے اپنے جی میں ٹھان لی۔ اٹھتے بیٹھتے وہی دھیان ابھی تک ہے اور اپنا سب کچھ تج کے اُسی کے پیچھے آپ دھونی رمائے بیٹھے ہیں۔ ایسا بات کا دھنی اور دُھن کا پکا ہونا ہنسی کھیل نہیں۔ ہندماتا کی دکھ بھری کہانی میں سے یہ آپ کی باتیں کسی کے بھلائے سے بھلائی نہیں جاسکتیں۔ یہ میں نے اس لئے لکھا کہیں آپ یہ نہ سمجھ لیں لکھنے والا مجھے اور آج تک جو میں نے کیا اُسے جانتا ہی نہیں جو کچھ کہنا ہے وہ تو پھر کہوں گا پہلے یہ اک کہانی سُن لیجے:۔

اک برہمن، اک چھتری، اک ویش، اک شودر۔ یہ چاروں الگ الگ گھرانوں کے نہ جانے کیسے ایک جگہ اکٹھے ہو کے جی بہلانے جنگل چلے۔ چلتے چلتے پیاس لگی۔ اِدھر اُدھر ڈھونڈنے پر بھی کہیں پانی کی اک بوند تک نہ ملی، اور آگے بڑھے تو سامنے اک اکھ دکھائی دی۔ لمبے لمبے اور موٹے موٹے پونڈے کھڑے جھومتے دیکھ کر سبھوں کے منہ میں پانی بھر آیا۔ لپک کے ایک نے جھاڑ سے ایک گنا توڑ لیا۔ دوسرے نے جھاڑ سے دوسرا۔ جو دو رہ گئے تھے۔ انہوں نے بھی ساتھیوں کی دیکھا دیکھی بڑھ بڑھ کے اپنے اپنے لئے اک اک توڑ لیا۔ گنے توڑتے ہی ایک دوسرے کو سراہنے لگا بھئی کیا کہنا اتنا موٹا اور ایسا لمبا گنا ایک ہی جھٹکے میں یوں جڑ سے اکھیڑ پھینکا۔ کیوں نہ ہو ہونا برہمن۔ برہمن نے کہا اور تم اپنے چھتری پن کو تو کہتے ہی نہیں کتنا بڑا بانس کا بانس گنا کس پھرتی سے اکھیڑ لیا۔ ویش اور شودر میں بھی ایسی ہی باتیں ہوئیں۔

اکھ والا وہیں کہیں آڑ میں کھڑا یہ سب سُن رہا تھا۔ سنتے ہی جی ہی جی میں کہنے لگا۔ ارے یہ تو سب کے سب الگ الگ گھرانوں کے ہیں ان سے گنے چھین لینا کوئی بڑی بات نہیں یہ کہہ کے چلا اور ٹھٹکا پھر کچھ سوچ ساچ کے اک لمبا سا چکر کاٹ کے ان چاروں کے سامنے آتے ہی ڈنڈوت کی اور ڈنڈوت کر کے ایک سے یہ کہنے لگا:۔ آپ تو ہمارے مائی باپ برہمن ہیں۔ دھرم اور اس کی پوجا پاٹ آپ ہی سے ہے۔ آپ نہ ہوں تو جگ میں دھرم پرچار کا اجالا ہی نہ رہے اور پورے سنسار میں ایسا اندھیرا گھُپ ہو جائے جو ہاتھ سے ہاتھ نہ سجھائی دے۔ پھر چھتری سے بولا آپ ہی کے بھروسے پر راج جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے آپ ہی کی تلوار کی چھاؤں میں راج پاٹ پھولتا پھلتا ہے۔ یہ چھاؤں نہ ہو تو وہ جھلس جائے۔ آپ لوگوں سے بھلا میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ ویش سے کہا تمھاری کھیتی باڑی کا کٹھن دھندا بھی ایسا نہیں جو کوئی اس کا گُن نہ مانے اسی سے سارا جگ بھلا چنگا دکھائی دے رہا ہے۔ نہیں تو گھڑی بھر میں ادھ موا ہو جائے۔ میں تم سے بھی کچھ نہیں کہتا تم نے جو کیا اچھا کیا۔

اب ایک شُدر بھی وگیا تھا۔ اسے گھور کے کہنے لگا کیوں بے بانجھ نری یہ ڈھٹائی۔ تجھے ترکچّی ہی چبا جاؤں کا مارے بنا۔ تونے کیا سمجھ کے گنا توڑا۔ یہ کہتے ہی اُسے کھینچ او گھسیٹتا ہوا اپنی جھونپڑی میں لے جا ہاتھ پاؤں باندھ کے ڈال آیا۔

چاروں میں سے ایک کی تو یوں پہنچی ہوئی جو تین بچے وہ اپنے اپنے گیے لئے لمبے لمبے ڈگ رکھتے آگے بڑھ ہی رہے تھے جو وہ دیکھ والا جھپٹ کے ویش سے آکے بھڑ گیا اور ڈانٹ کے کہنے لگا۔ اوبل چلانے والے تجھے بھی یہ دن لگے جو دن دہاڑے یوں ڈاکا ڈالنے لگا۔ یہ گنے کیا تیرے ماں باپ کے لگائے ہوئے ہیں۔ برہمن، چھتری یہ تو ہمارے مائی باپ ہیں۔ ہم ان کے منگتا اور انہیں کا دیا کھاتے ہیں۔ لو، تو نے بھی پیٹ سے پاؤں نکالے، اور ان کی ریس کرنے لگا۔ یہ کہہ کے اُسے بھی پکڑ دھکڑ کے لے گیا۔

جب وہاں سے وہ چھوٹ ہوا تو برہمن، چھتری دونوں سے دونوں یہ کہتے ہوئے آگے بڑھنے لگے: چلو ہماری تو کرکری نہیں ہوئی یہ کہہ ہی رہے تھے جو وہ پھر دولتا ہوا آگے بڑھ کے چھتری سے جا بھڑا اور اُسے روک کر کہنے لگا۔ کیوں جی کیا تم چھتری ہو۔ چھتری کیا ایسے ہی لٹیرے ہوا کرتے ہیں۔ بڑے آئے وہاں سے چھتری بن کے۔ ایسے چھتری بتری بہت سے دیکھے ہیں۔ یہ کہتے کہتے اس کی بھی کوئی بھری چھتری نے بہت پھڑپھڑ کی اور پنڈت جی نے بھی بہت چھڑانا چاہا پر اس نے کسی کی بھی نہ مانی اور اسے بھی جھونپڑی میں لے جا باندھ بوندھ کے ڈال آیا۔

برہمن کہنے لگے۔ ساتھی گئے تو گئے ہم تو بچ گئے۔ وہ کانٹیاں ہتھ چھوٹ اور منہ پھٹ ایکھ والا بھلا ایک کو کیسے چھوڑ دیتا۔ پنڈت جی ہانپتے، کانپتے بھاگوں بھاگ بڑھے چلے جا رہے تھے جو وہ پھر جھونپڑی سے نکلا اور نکلتے ہی وہیں سے للکارا۔ للکارتا ہوا جھپٹا اور جھپٹ کے پنڈت جی کو بھی جا دبوچا۔

کہنے کو تو یہ ایک کہانی ہے۔ پر سمجھ والوں کے لئے اسی میں بہت سی سیکھنے کی باتیں چھپی ہوئی ہیں۔ اپنی اپنی پڑی ہونے سے اک دُشمن کے اکیلے نے اپنے سے چوگنوں کو کیسے باندھ کے ڈال دیا۔ ان میں اتنا ہی ایکا ہوتا جیسے یہ سب مل کے ساتھ آئے تھے تو بھلا ایک تو ایک دُگنے تگنے بھی ایسے جھٹ پٹ ان کا بال بیکا نہیں کر سکتے تھے۔

آج کل دیس میں بھی ایسی ہی آپا دھاپی کی ہولی کھیلی جا رہی ہے راج نے کسی کو ڈھیل دی اور کسی کو جکڑ دیا۔ جدھر ڈھیل آئی سادھر والے اپنے آپے میں نہیں، ——— مونچھوں کو تاؤ دے دے کے لگے بنکارنے اور ٹوپیاں اُچھالنے۔ یہ دھیان ہی نہیں آتا۔ ڈھیل دی تو کیا ہوا ہیں تو سب کے سب بندھے ہوئے۔ اس کا بھروسہ ہی کیا آج کی ڈھیل کل کھنچ بھی تو سکتی ہے۔ ایک جگہ کا اٹھنا بیٹھنا رہنا سہنا۔ اس پر آپس میں آئے دن کی دانتا کلکل۔ ”ساہتیہ پریشد“ میں جو آپ نے کہا کوئی اور اس سے بڑھ کر بھی کہتا تو اُسے کوئی دیکھتا بھی نہیں۔ اچھا تو اسی کا ہے۔ آپ کے منہ سے ایسی ایسی باتیں نکلیں جو کوئی دوسرا کہے تو سب انہیں اٹکل پچو سمجھیں۔

پہلے تو یہی دیکھئے۔ دیس کے لئے ابھی کیا کچھ کرنا نہیں۔ آپ برسوں سے نیند کے ماتوں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کے جگانا چاہتے ہیں۔ پھر کیا سب کے سب جاگ اٹھے؟ بہت سے بہت ہوا تو یہی گھوڑے بیچ کے سونے والوں نے آپ کے جھنجھوڑنے سے ہوں ہوں کرکے کروٹیں بدل لیں۔ ہاتھ ادھر جھٹکے، پاؤں اُدھر پٹکے، جمائیوں پہ جمائیاں اور انگڑائیوں پہ انگڑائیاں لیتے لیتے پھر آنکھیں میچیں اور پھر خراٹے لینے لگے اور آپ کا جھنجھوڑنا ان کے لئے لوری بن گیا۔

”ساہتیہ پریشد“ کی دھوم دھام بنا رہی ہے۔ دیس کے لئے جو کچھ ہونا چاہئے تھا وہ سب ہو چکنے سے سب کے سب انند اور نچنت ہو کر نئی بھاشا کے پرچار میں لگے ہوئے ہیں۔ بھاشا واشا کی دیکھ بھال جانچ پڑتال، ناپ تول کا کھٹراگ اُس گھڑی کے لئے ہے۔ جب کٹھن باتوں میں سے ایک ایک کرکے سب کی سب پوری ہو چکی ہوں۔

دیس کس جنجال میں پھنسا ہوا ہے۔ کنگلاپن کتنا بڑھتا چلا جاتا ہے اور پورا دیس کیسا اپاہج ہو کے رہ گیا ہے۔ اپنے بل بوتے پر آج تک نہ یہ کچھ کر سکا اور آپس میں یہی تنا تنی رہی تو آگے بھی یہ کچھ کرتا دکھائی نہیں دیتا۔ جب ابھی تک دیس کی کسی بات کا بھی ٹھیک ٹھاک نہیں تو سب چھوڑ چھاڑ کے پہلے دیس ہی کو سدھارئیے پھر جو جی چاہے وہ کیجئے۔

گھر میں تو پھٹ پڑی ہے۔ کہرام مچا ہوا ہے۔ بھیانک چیخوں سے کان پھٹے جا رہے ہیں جیسے بھیڑوں کا ریوڑ تتر بتر ہو کے ادھر اُدھر مارا مارا پھرتا ہو۔ ایسے ہی دیس والے بھی ہیں۔ آپس میں جوتی پیزار، گالم گلوج اور بھوگ سنائے جا رہے ہیں۔

ایسے دنوں میں "بھارتیہ ساہتیہ پریشد" کی نیو رکھنا اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے اس کے پرچار پر اڑنا ایسا ہی ہے جیسے کسی گھر میں تو آگ لگی ہوئی ہو، دھڑ دھڑ گھر جل رہا ہو اور اُس کے رہنے والے آگ بجھانے کی جگہ نئے گھر کا ڈیزائن، چھت کی اونچائی، پچھیت کی بناوٹ، انگنائی کی چوڑائی، جھروکوں، کھڑکیوں کی لمبائی اور پورے گھر میں کہاں کہاں پھول پتیاں بنائی جائیں گی، گھر سجنے کے لئے اور کیا کیا ہونا چاہئے۔ ایسی ایسی باتیں کھڑے سوچتے رہیں۔ گھر نے کیسے اس کے سجنے کے لئے آپ جو چاہیں کریں۔ کوئی ٹوک نہیں سکتا۔ گھر بنا کیسا ابھی تو بھرا گھر اجڑ رہا ہے اور اس کے بننے کی گھڑی آنے تک نہ جانے ابھی کیا کیا ہونا ہے تو ایسی کھچڑی پکانا آپ کے لئے تو ٹھیک نہیں۔

یہ تو سوچئے۔ آپ کدھر جا رہے تھے اور لوگوں کے بہکانے سے بھٹک کے کدھر چلے آئے۔ چلے آنے میں تو کچھ نہ تھا۔ پر اڑنا اور یہیں جم کے بیٹھ جانا تو اچھا نہیں۔

کوئی بڑا بکیت، جیالا بھگت، منچلا سورما اپنا سب کچھ لٹا کے دُہری، تہری بیڑیوں ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے دیس والوں کے چھڑانے کی دُھن میں جھٹ پٹ اٹھ کھڑا ہوا اور لڑائی کی بھڑکتی ہوئی آگ میں کود کے ——— سوجھ بوجھ اور نت نئی گھاتوں سے جم کے ایسا لڑے جو دوسروں کے دانت کھٹے کر دے اور چھکے چھڑا دے۔ پھر وہی ایکا ایکی لڑائی بھڑائی چھوڑ چھاڑ گھومتا گھامتا بھاشا کے پرچار کرنے والوں میں آ بیٹھے اور ان کے سکھانے پڑھانے سے انہیں کا ساتھ دینے پر اڑ جائے تو اسے یہاں بیٹھا دیکھ کے دیکھنے والے اپنی اپنی سی کہنے لگیں گے۔ کوئی کہے گا لڑائی بھڑائی کے جوکھوں میں پڑنا منہ کا نوالا نہیں جو چپ چاپ نگل لیا جائے۔ دیکھا نا، جو کہتے تھے وہی ہوا۔ پہلے کیسی اکڑ اکڑ دکھائی اور پھر ٹائیں ٹائیں فش۔ جب وہاں نہ ٹھہرا گیا تو لڑائی سے جی چرا کے یہاں بیٹھنا ہی پڑا۔

دوسرا کہے گا۔ نہیں بھئی یہ بات نہیں۔ لڑائی کو بھی تو دیکھو۔ گھنٹے دو گھنٹے، ایک دن دو دن، مہینے دو مہینے کی نہیں برسوں ہو چکے۔ ہاتھ پاؤں کب تک چل سکتے ہیں۔ گھڑی بھر انگلی ہلا کے تو دیکھو کتنی سوجھتی ہے۔ لڑتے لڑتے ہاتھ پاؤں تھک کے چور ہو گئے ہوں گے سستانے کے لئے کہیں بیٹھنا بھی کیا بودا پن ہے۔ تیسرا کہے گا بیٹھنا تو بودا پن نہیں پر جم کے بیٹھنا وہ نہیں تو پھر کیا ہے۔

جتنے منہ اتنی باتیں ہوں گی۔ ساتھ ہی سوجھ بوجھ والے بھی یہی کہیں گے۔ ایسے منچلے کے لئے سب سے پہلے دیس ہی کی سیوا چاہئے۔ دیس کے پورے بندھن جب کھُل چکیں تو بھاشا واشا کا پرچار سب کچھ اس سے کہیں بڑھ چڑھ کے ہو سکتا ہے اور جب تک دیس نہ سنبھلے تب تک ایسے اُلجھاوے میں اُلجھنا نہ چاہئے۔

بکسر کی لڑائی سے ایک بانکے منہ موڑ کے چلے۔ دیکھنے والوں نے ٹوکا۔ ہائیں یہ کیا۔ آپ کی بکیتی بھکیتی کی تو دھوم تھی۔ بڑے بڑے جیالے لوہا مانتے تھے۔ جب آپ ہی نہ جم سکے تو پھر کون جمے گا اور اس گڑھی کو پھر کون جیتے گا۔ اس ٹوکنے پہ بانکے پلٹے اور جھنجھلا کے کہنے لگے۔ کیا کہتے ہو۔ تم کیا جانو۔ تمہیں تو یہی آتا ہے جو منہ میں آیا بک دیا۔ کیا کہیں ان آنکھوں سے کیا کیا دیکھ لیا۔ ایسے ایسے بیٹھے جو نک سک سے ٹھیک، ڈیل ڈول کے اچھے پورے اور ایسے سجیلے جدھر سے نکل جائیں دیکھنے والوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جائیں اور چھوٹے بڑے سب کی ٹکٹکی بندھ جائے۔ ان میں کا ایک ایک سیکڑوں پہ بھاری۔ نہتا بھی ہو تو لاکھوں کے ٹڈی دل میں گھُس کے دانتوں سے بوٹیاں کاٹ کاٹ کے تھوک دے اور منچلوں کا پتا پانی کر دے۔

ایسے ایسے جیالوں کے دھڑ گولیوں سے چھلنی چھلنی ہوتے ہوئے دیکھے۔ اس سب کچھ ہونے پر بھی دیکھنے کی بات یہ ہے۔ جس جگہ ان کے پاؤں جم گئے پھر وہاں سے نہ ہٹے اور وہیں ایڑیاں رگڑ رگڑ کے ٹھنڈے ہو گئے۔ بھلا یہ بھی کوئی لڑائی ہے۔ اس سے تو ہیجڑوں کی لڑائی اچھی کوئی کوس بھر سے دَن دَن ہونے لگی اور یہاں جی کی جی ہی میں رہی بات نہ ہونے پائی۔ تلوار کے دھنی تھے تو منہ کیوں چھپایا۔ آمنے سامنے ہو کے دو دو ہاتھ ہمارے بھی دیکھ لئے ہوتے۔ کھیرے ککڑیاں جیسے کٹتی ہیں، ایسے ہی گھڑی بھر میں پرے کے پرے کاٹ کے نہ رکھ دیتے تو یہ اپنی مونچھیں منڈا ڈالتے۔ اب یہ جگہ منچلوں کے ٹھہرنے کی نہیں اور سچ تو یہ ہے اب جینا دو بھر ہو گیا۔

پہلے کبھی بانکوں کی بڑی دھاک تھی اور ہوتے بھی تھے بڑے تلوریے۔ پھر بھی ان میں اول جلول پن بہت ہوا کرتا تھا پر آپ تو ایسے نہیں۔ آپ میں جو کچھ، سوجھ بوجھ اور اچھی اچھی باتیں پرمیشر نے اکٹھی کر دی ہیں۔ وہ پہلے کے بانکوں میں کہاں۔ آج آپ ہی ہند ماتا کے اکلوتے

بلتے ہیں۔ دیس کا اکھاڑا کھدا ہوا ہے اور اس میں برسوں سے راج کے ساتھ آپ کی گتھم گتھا ہو رہی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو رگید رگید کے جیت کرنے کی گھات میں لگے ہوئے ہیں۔ دیکھنے والوں کے جھتے کے جھتے اور ٹولیاں کی ٹولیاں یہ جانے آپ کے اس بھڑنے کو بڑے اینت سے دیکھ رہی ہیں۔ پر کچھ دنوں سے جو آپ اس اکھاڑے سے نکل کر دوسرے دھندے میں لگ گئے۔ اس پر اپنے پرائے سب میں کانا پھوسی ہو رہی ہے اور کب جا رہا ہے۔ مہاتما جی سیدھے جاتے جاتے یہ کدھر مڑ گئے۔

آپ کے ادھر آنے سے دیس کی بات کیسی ادھوری ہو کے رہ گئی۔ تو پھر ادھر ہی جائیے نا اور دیس ہی کے لئے جو بن پڑے وہ کیجیے۔ رہا بھاشا کی گتھیاں سلجھانا اسے پھر کبھی کے لئے اٹھا رکھیے۔ بھاشا کیا کہیں بھاگی جا رہی ہے جو اس کی روک تھام ابھی ہو سکتی ہے پھر نہ ہو سکے گی۔ جدھر آپ جا رہے تھے اس کے سامنے بھاشا واشا ہے کیا۔ انتہا ہو کے ایسے سیکڑوں کھیل کھیلے جا سکتے ہیں۔

گاؤں میں دیکھا ہوگا جو ہاٹ آج بھرا، پھر سات دن تک یونہی سنسان پڑا رہتا ہے۔ اس سنسار میں جو جو دھندے لوگ کر رہے ہیں کچھ ہی دنوں کے لئے ان دھندوں سے انہیں الگ رکھا جائے تو وہ پہلے سے نہیں رہتے۔ سینے پرونے والوں سے سلائی، بڑھیوں سے لکڑی کی جوڑ جاڑ، لوہاروں سے لوہے کی پیٹ پاٹ، کمہاروں سے مٹی کی تھوپ تھاپ، لکھنے پڑھنے والوں سے لکھت پڑھت، سوچ بچار بہت نہیں تھوڑے ہی دنوں کے لئے یہ ان سے چھڑا کے دیکھ لیجیے۔ ان میں سے کسی میں بھی پہلے کی سی بات نہیں رہے گی۔

آج جو کرنا ہے اُسے کل کے لئے اٹھا رکھنے پر بات آئی گئی ہو جاتی ہے۔ آج کا دھندا آج ہی کے ساتھ ہے اسے آج ہی پورا ہو جانا چاہیئے۔ کل کا دھندا آج سے الگ ہوگا۔ آج کی بات کل پر چھوڑ دی تو کل کی پرسوں اور پرسوں کی اترسوں پر چھوٹتی رہے گی اور یونہی چھوٹتے چھوٹتے پھر وہ بات ہی چھوٹ جائے گی۔ بات ادھر ٹھنڈی پڑی تو پھر دھیان بھی ٹھٹھر کے رہ جاتا ہے تو ابھی دیس کی بات ٹھنڈی نہیں پڑی ہے۔ یہ سماں ابھی ایسا ہے جس میں بھاشا واشا کو چھوڑ چھاڑ کے پھر آپ دیس کو پکڑ سکتے ہیں اور اس کے لئے ان تھک دوڑ دھوپ کر سکتے ہیں۔ آپ کی دوڑ دھوپ باسی کڑھی کا ابال نہیں جو کچھ نہ ہو سکے۔ آج کچھ نہیں ہے تو کل کچھ نہ کچھ ہو کے رہے گا اور آگے بڑھ کر آنکھیں یہ سہانا سماں دیکھیں گی۔

دیس میں میل ملاپ کے جھنڈ کے جھنڈ ایسے چھائے ہوئے ہیں جن کی گھنی چھاؤں میں پریم جل انگڑائیاں لیتا بہہ رہا ہے۔ ایک کے من کی ٹہنیاں دوسرے کے من میں کھچڑی ہو رہی ہیں۔ پیار کی بیل میل جول کے بھیکتے ہوئے پودوں پر چڑھی جا رہی ہے۔ پریم کے پھولوں کے گچھے کے گچھے ادھر ادھر لٹک رہے ہیں۔ سُکھ چین کے پھولوں کی بھینی بھینی باس سے دیس کا دیس بسا ہوا ہے۔ دھن برسانے والی گھنگھور گھٹائیں سنسار کی آنکھوں میں کاجل لگا رہی ہیں۔ کالے کالے بادلوں کے بھاٹ رہ رہ کے دیس کے گیت گا رہے ہیں۔ کوئل کی کوک، موروں کی جھنکار، پپیہوں کی پکار، ہلکی ہلکی پھوار، سلونی سلونی گھٹاؤں کے اندھیرے گھپ میں رہ رہ کے بجلی کی چمک جیسے کسی جوبن کی متوالی کے بھیگے ہوئے بال سکھانے کے لئے جھٹکنے میں گھڑی گھڑی منہ پہ آ جاتے ہیں۔ ایسے دھندلکے میں دیس کے سپوت آپ کے چرنوں میں جھکے ہوئے چڑھاوے چڑھا رہے ہیں اور آپ دیس کی ہری بھری پھلواری کے منڈوے میں ابھی سبھ گھڑی کو دیکھ دیکھ کے مسکرا رہے ہیں۔

اچھا لگے ہاتھوں اپنی اس نئی بھاشا کو بھی دیکھتے چلئے جس کے پرچار کی دھن میں آپ اپنا اب تک کا کیا کرایا سب اکارت کر دینا چاہتے ہیں۔ اردو میں عربی فارسی بولوں کی بہتات سے ایسا دھوکا کھایا جو کھلم کھلا آپ یہ کہہ اٹھے:۔

"اردو زبان مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے۔ قرآن کے حروف
میں لکھی جاتی ہے اور مسلمان بادشاہوں نے اسے بنایا اور پھیلایا
مسلمان چاہیں تو اسے رکھیں اور پھیلائیں۔"

یہ آپ سے کس نے کہہ دیا۔ کہاں مسلمانوں کے دھرم کی بھاشا اور کہاں اردو۔ دونوں میں کوئی تک بھی ہے۔ ایسی بات منہ سے نکالنے سے پہلے آپ نے پنڈت جواہر لال نہرو ہی سے پوچھ لیا ہوتا۔

ہندی اور اردو کے جھگڑے پر پنڈت جواہر لال نہرو نے ڈاکٹر سید محمود کو جو ایک لمبی چوڑی چٹھی لکھی تھی۔ اسی میں ایک جگہ پنڈت جی یہ لکھتے ہیں:۔

"عجیب بات تو یہ ہے کہ نہ جانے ہمارے ملک میں کتنی چیزیں ہیں
جو فرقہ وارانہ رنگ اختیار کر لیتی ہیں۔ زبان کا مسئلہ بھی مذہبی بن

گیا اور بعض نامعلوم اسباب کی بنا پر تسلیم کر لیا گیا ہو اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ میں بصد ادب عرض کروں گا کہ میں اسے ماننے کے لئے تیار نہیں۔ اردو کو اپنی زبان سمجھتا ہوں جسے بچپن سے بولتا چلا آیا ہوں"

لیجئے پنڈت جی تو اردو کو اپنی اسی بھاشا سمجھ رہے ہیں جسے وہ بچپن سے بولتے چلے آتے ہیں اور آپ اسے مسلمانوں کے دھرم کی بھاشا کہنے پر اڑے ہوئے ہیں۔ اب آپ ہی بتائیے۔ سننے والا کس کا کہا مانے۔ کسے جھٹلائے اور کسے سچ جانے۔ اسی کے ساتھ ساتھ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی نے مسلم یونیورسٹی یونین میں اردو کانفرنس کے اسٹیج پر "اردو ہماری زبان" کہہ کر جو لمبی چوڑی اسپیچ پڑھی اسے بھی کہیں کہیں سے سن لیجئے۔ پنڈت جی اسی میں ایک جگہہ یہ کہتے ہیں :۔

"...سا یہ سوال اٹھتا ہے کہ اردو قوموں کے میل جول اور دیسی بدیسی زبانوں کے اختلاط سے پیدا تو ہو گئی لیکن کیا بعد میں بھی ہندو اس کو اپنی زبان سمجھتے رہے اور اس کو استعمال کرتے رہے۔ حضرات میں اس تنقیح کو مختصر میں رکھنا پسند نہیں کرتا۔ سنئے ہندوؤں میں تبلیغ مذہب تو عرصے سے بند ہو چکی تھی۔ قریباً دو ہزار برس کے بعد اب پھر تازہ ہوئی ہے۔ اس واقعہ کو نظر میں رکھ کر دیکھنا یہ ہے کہ ہندوؤں میں دھرم پرچار کے سلسلے میں اردو اختیار کی گئی یا نہیں۔ اگر تحقیق سے اس کا جواب اثبات میں ملے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اردو کو ہندوؤں نے اپنے ہندو بھائیوں کی دینی ہدایت کے لئے استعمال کیا۔ انیسویں صدی عیسوی کے اول برسوں میں اچھوت ادھار اور پتر جنوں کی تبلیغ یا شدھی کا نام تک کوئی نہ جانتا تھا۔ مگر ۱۸۱۹ء میں سمریو بھاگوت کا دسواں اسکند یعنی باب، اردو کی ایک ضخیم مثنوی مسمی آئینہ مستور کی صورت میں ظہور پذیر ہوتا ہے یہ کئی سو صفحے کی قلمی کتاب میرے کتب خانہ میں موجود ہے۔ یہ مذہبی اور اعتقادی کتاب ایک ہندو اپنے ہندو بھائیوں کے لئے اچھی اردو نظم میں تصنیف کرتا ہے"

پھر پنڈت جی نے ہندو دھرم کی لائبریری میں سے ایسی بہت سی چھوٹی بڑی اردو لکھتوں کا اتا پتا دیا ہے جو پوری کی پوری ہندو دھرم کی باتوں سے بھری پڑی ہیں۔ گھر کے بھیدی کی یہ باتیں بھی سننے کی ہیں :۔

"سنسکرت اور ہندی بھاشاؤں کے ہوتے ساتے ہندوؤں نے اردو کو اور اردو وظائف سے یا زیادہ احتیاط سے یہ کہئے کہ مذہبی اور ملی تعزیروں سے خارج نہیں کیا۔ شکت جالیسی ایک اردو کی کتاب اسلوتر یعنی وظیفہ کی ہے۔ یہ اردو کے مخمس ترجیع بند کی صنف سے ہے۔ ہر بند کے چار مصرے ٹھیٹ اردو میں ہیں اور ترجیع کا مصرعہ سنسکرتی چار بار آتا ہے اس کو میں نے پوجن کے سلسلے میں وظیفہ یا مناجات کی طرح پڑھتے ہوئے دیکھا ہے اور یہ دھیان میں رکھنے کی بات ہے کہ تلسی داس رامائن لکھ چکے تھے اس کی کتھا برابر ہو رہی تھی۔ مہابھارت اور بہت سے پران اور دوسری مذہبی کتابیں ہندی میں منتقل ہو چکی تھیں لیکن اپنے اہالی ملت میں دھرم پرچار کی کمی محسوس ہوئی جب تک کہ اردو سے کام نہیں لیا گیا اس ضمن میں وہ تمام اردو دنیا کے شکریہ کے مستحق ہیں جنھوں نے مہابھارت، رامائن، گیتا، مہاتم شوپران گنیش پران اور دھارمک نبکے وغیرہ دھرم پستکیں اردو میں تصنیف اور ترجمہ کیں۔ یہ کتابیں منشی نول کشور کے مطبع سے چھپ کر آج تک شائع ہو رہی ہیں اور ہندوؤں میں ان کے مذہب کی معین اور روایات ملی کے زندہ رکھنے کا ذریعہ دست آ رہی ہیں۔ ان نظم کی کتابوں کے علاوہ بہت سے اپنشد اور چھپنوں شاستر اور سمرتیاں اردو نثر میں منتقل ہو کے شائع ہوئیں اور آج تک ان کی مانگ برابر جاری ہے۔ یہی حال آریہ سماج کے لٹریچر کا ہے"

یہ کہانی کہتے کہتے پنڈت جی نے کہی ہوئی باتوں کو پھر ایک جگہہ اکٹھا کر کے اک چیلنج بھی دیا ہے جس کا نچوڑ یہ ہے :۔

"آپ نے دیکھا کہ اردو کی تعمیر و تدوین اور ترویج میں ہندوؤں کا کتنا معتد بہ حصہ ہے۔ آپ نے دیکھا کہ ہندوؤں کی مذہبی اور ملی کتابیں کس کثرت سے اردو میں لکھی گئیں اور آپ دیکھتے ہیں کہ بھگوت گیتا کے ایک سے زیادہ نئے ترجمے اور تفسیریں اردو نظم اور نثر میں ہر سال بلا ناغہ شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی ہندی والا (میرا مطلب ہے اردو ہندی کے جھگڑے کا علمبردار) اس وقت یہاں موجود ہے تو سامنے آ کر بتائے کہ جو واقعات ابھی پیش کئے گئے ان میں سے کونسا صداقت سے محروم ہے"۔

پنڈت کیفی کی باتیں سنتے سنتے آپ اکتا گئے ہوں گے۔ یہاں تک تو آپ سن ہی چکے۔ گنتی کی دو ڈھائی باتیں اور سن لیجئے۔ یہ لکھت کسی

مسلمانوں کی ہوتی تو بیچ بات میں سے دو بول بھی کبھی یہاں نہ لکھتا۔ پر اس کا لکھنے والا ہندو اور ہندو بھی ایسا ویسا نہیں بڑی سوجھ بوجھ کا پنڈت ہے جس کی آنکھیں بھانی پر جمی ہوئی ہیں۔ اپنے ساتھ کے بھٹکے ہوؤں کو پکار پکار کے ادھر ہی بلانا چاہتا ہے جدھر سچائی کا اجالا ہے۔ ان کی کھوٹ کے ایک ایک بول سے یہی دکھائی دیتا ہے جن باتوں سے دیش بے حال ہوتا جا رہا ہے۔ ان پر وہ جی ہی جی میں کڑھ رہا ہے، اونٹ رہا ہے اور بھرا بیٹھا ہے اس نکھٹ میں جی کی بھڑاس نکالی ہے اور اپنے بیتے کی باتیں ایسی ایک جگہہ اکٹھی کر دی ہیں جنہیں کوئی جھٹلا نہیں سکتا۔ اسی میں ایک جگہہ پنڈت جی نے یہ بھی لکھا ہے۔

"جب مہاتما گاندھی نے اپنے سابرمتی کے آشرم کی بھجناولی مرتب کرنے کا حکم دیا، اس وقت بھارتیہ ساہتیہ کا نظریہ جو اب ناگ پور میں ہنگامہ آرا ہوا کہاں چلا گیا تھا۔ یہ معلوم کرنا دلچسپی کا موجب ہوگا کہ مہاتما جی کے مرتبہ سابرمتی آشرم کے بھجنوں کے اس ہندی کے مجموعے میں کل ۱۸۱ بھجن ہیں جن میں ۱۰۲ محض کو ہندوستانی نام دیا گیا ہے۔ باقی ۷۹ بھجن گجراتی، مرہٹی وغیرہ دوسری زبانوں کے ہیں اور یہ واضح رہے کہ ان ۱۰۲ ہندوستانی بھجنوں میں کئی غزلیں بھی ہیں جیسے۔

ہے بہار باغ دنیا چند روز ٭ دیکھ لو اس کا تماشا چند روز

یہ بھجناولی ہندی میں چھپی ہے۔ اب اگر اردو کے لفظ سے کسی وجہ سے بے اعتنائی ہو گئی تھی تو بھارتیہ ساہتیہ میں ہندوستانی ہی سے کام رکھتے۔"

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی کی کیا یہ سب باتیں ٹھیک ہیں۔ اچھا انہیں چھوڑیئے۔ بیچ میں بات میں سے بات نکل آئی اور جو کہنا چاہتا تھا نہ کہہ سکا۔ میں یہ کہہ رہا تھا اردو میں آپ نے عربی، فارسی بولوں کی ریل پیل دیکھ کے اسے مسلمانوں کے دھرم کی بھاشا سمجھ لیا۔ دیکھئے بات یہ ہوئی۔ اردو کی جنہیو ڈالی جا رہی تھی تو یہاں کے چھوٹے بڑے جتنے سب ہی اس میں لگے ہوئے تھے اور مسلمانوں کا راج تھا اس لئے عربی، فارسی کے بول اردو میں آئے اور بہت آئے اور جو مسلمان راج کی جگہہ کوئی اور راج ہوتا تو اسی راج کی بھاشا کے بولوں کی بھیڑ کی بھیڑ اردو میں لگ جاتی، کسی بھاشا میں اور دوسری بھاشا کے بولوں کی بھرمار دیکھ کے بے سوچے سمجھے کہہ دینا یہ بھاشا اس جتھے کے دھرم کی بھاشا ہے سوچئے تو یہ کتنی بڑی بھول ہے

آج کل اردو میں انگریزی بول بڑھتے جا رہے ہیں۔ کوئی نہ جاننے والا انگریزی بولوں کی بہتات دیکھ کر اردو کو انگریزوں کے دھرم کی بھاشا کہنے لگے تو سچ کہئے اس کے اس کہنے پر کیا آپ اپنی ہنسی روک سکیں گے

دھرم اور بھاشا ان دونوں کے ڈانڈے الگ الگ ہیں

ان دونوں کے گھال میل کو جس سے پوچھئے یہی کہے گا یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ جب دھرم اور بھاشا کا آپس میں گڈمڈ کرنا ٹھیک نہیں کہا جاتا تو منہ سے جو کہا جا رہا ہے وہ کیا کیوں نہیں جاتا۔ چبا چبا کے باتیں کرنا کس لئے۔ دونوں کا میل جول اچھا لگتا ہے تو کھل کر کہہ دیجئے۔ دھرم اور بھاشا کو ہم الگ الگ نہیں دیکھ سکتے اور دونوں کو ملا دینا چاہتے ہیں۔ اس کہنے پر بھی کوئی آپ کو ٹوکے تو اسے جو جی چاہے کہئے۔ پر جب تک آپ منہ سے یہ نہ کہیں گے تب تک پوچھا کھیچی کی کئے پڑتی ہی رہے گی۔

پہلے پہل جو بھاشا کے جھگڑے کی بھنک کانوں میں پڑی تو میں نے جی میں کہا کہیں ایسا تو نہیں نئے نئے مولوی، ملا اپنی بڑائی جتانے کے لئے چھانٹ چھانٹ کے ایسے موٹے موٹے اور بھاری بھاری عربی فارسی بول کے بول بات چیت میں ٹھونستے ہیں جو بہت سے ہندو نہیں سمجھ سکتے۔ یہ بات ہندوؤں کو بری لگی ہو اور جھلا کر انہوں نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ چننے کی ٹھان لی ہو۔ ساتھ ہی یہ بھی دھیان آیا ایسا تھا بھی تو اس کا یہ توڑ تو نہ تھا جو کیا جا رہا ہے۔ وہ بات ہی کیا تھی۔ دونوں جگہہ کے لکھے پڑھے سمجھ والوں کو بلا لیا ہوتا یہ سب ایک جگہہ بیٹھ بٹھا کے گھڑی دو گھڑی میں یہ جھگڑا چکا دیتے۔

یہ بھی آج کل کا اک نیا ڈھکوسلا ہے۔ جسے دیکھئے "اردو اور ہندی" کا منتر پڑھ رہا ہے اور اسی کی مالا جپ رہا ہے۔ بہت سے پڑھے لکھوں سے یہ پہیلی بوجھی جا چکی۔ میرا پوچھنا یہی تھا اور ہے۔ جب اردو کا ڈیول ہندی ہی کی مٹی سے بنا ہے تو پھر اردو کے ساتھ اور ہندی لکھنا کس لئے۔ اردو میں ہندی ایسی بیری ہوئی ہے جو کبھی اس سے الگ ہی نہیں ہو سکتی اور کیسے الگ ہو سکتی ہے۔ جب اردو کی کھال، چمڑا، ہڈیاں، ڈھانچہ جو کچھ ہے وہ ہندی ہی ہے۔ اپنی اپنی سب کہہ رہے ہیں اور اسے کوئی دیکھتا ہی نہیں یہ ہے کیا۔ جانچئے تو گھڑی بھر کا دودھ اور پانی کا پانی الگ الگ دکھائی دینے لگے گا۔ اس کے اور جانچنے کا ڈھب یہ ہے:

دو اچھے پڑھے لکھے سامنے بٹھا کے ایک سے کہئے تم ایسی اردو لکھو جس میں عربی، فارسی بولوں ہی کی ریل پیل ہو اور بھولے سے بھی کہیں ہندی کا ایک آدھ بول تک نہ آسکے۔ ہندی کے کسی بول کے نہ آنے پر بھی پوری لکھت اردو ہی رہے۔ دوسرے سے کہا جائے تم عربی، فارسی کو ہاتھ نہ لگاؤ اور ایسی اردو لکھو جس میں عربی، فارسی بولوں کی کہیں چھاؤں نہ آئے اور پوری کی پوری لکھت ٹھیٹ اردو رہے۔ تو پہلا ایسے ڈھائی بول بھی نہیں لکھ سکتا جس میں اردو پن رہ سکے۔ پہلے لکھنے والے کی لکھت عربی، فارسی بولوں کی ایسی کھچڑی ہو کے رہ جائے گی جیسے اردو سے نہ کوئی لگاؤ ہوگا اور نہ کوئی اسے اردو کہہ سکے گا۔

دوسرا لکھنے والا عربی، فارسی بولوں کی بھیڑ چیرتا، ہٹاتا آگے بڑھ کے ٹھیٹ اردو لکھ سکتا ہے تو اردو لکھنے اور بولنے میں ہندی سے کترا کے کوئی کتنا ہی نکلنا چاہے کبھی نہیں نکل سکتا اور کیسے نکل سکتا ہے جب اردو کے پتلے میں پوری مٹی ہندی ہی کی لگی ہوئی ہو۔ باہر والی بولیوں میں سے عربی، فارسی بول اس میں بہت سے ہی پر ہندی کے ہو گئے وہ ایسے ہی ہیں جیسے موسلا دھار مینہ کے سامنے پانی کی کچھ بوندیں یہ کبھی نہیں ہو سکتا جو ہندی کو نہ چھوا جائے اور عربی، فارسی بولوں ہی کی الٹ پلٹ سے اردو لکھت اور بات چیت ہو سکے۔ ہندی کو ہاتھ نہ لگانے اور عربی فارسی بولوں کے اکٹھا کر دینے سے اردو نہیں رہ سکتی۔ اردو میں سے عربی، فارسی بول نکال کے یوں لکھا جا سکتا ہے جیسے لکھنے کا یہی ڈھنگ جس میں آپ سے باتیں کی جا رہی ہیں۔ جب کسی جتن سے بھی ہندی کو اردو سے الگ نہیں کیا جا سکتا تو پھر اردو کے ساتھ ساتھ "اور ہندی" کا ٹکڑا کس لئے بڑھایا جا رہا ہے۔ کیا آپ یہ بتا سکیں گے۔

اور سنئے۔ پھول گیندا نہ مارو لگت کلیجا میں چوٹ، سائیں سے سچا رہ اور بندہ سے ست بھاؤ رہو پڑا ر دیو سارے رنگ کی مگر۔ یہ سب اور لکھنے کا یہ ڈھب جس میں بات چیت ہو رہی ہے۔ ان میں سے آپ کسے ہندی کہیں گے یہ تو ہو ہی نہیں سکتا جو ایک لاٹھی سے سب کو ہانک دیں اور کسی کو بھی آپ ہندی نہ کہیں۔

اچھا ان میں سے آپ جسے بھی ہندی کہیں اپنے بنارس کے "ہنس" کو اس سے ملا کے تو دیکھئے۔ ہنس کی لکھت کیا اس کی سی ہے۔ آپ اس کی لکھت کے ڈھب کو کٹھن نہیں سمجھتے نہ سمجھئے اوروں سے پڑھوا کے تو دیکھئے۔ اسے سب پڑھ بھی تو نہیں سکتے اور کیسے پڑھ سکیں گے۔ اس کی ایسی نرالی لکھت ہے جو پہلے اور آج کل کے ہندوؤں کی لکھت سے میل ہی نہیں کھاتی۔

"ہنس" اور کچھ ہنس والوں کو چھوڑ کے ہندو دانوں ہی میں سے کیا دو ایک کی بھی ایسی لکھت آپ دکھا سکیں گے۔ ہنس میں ادبلا کے ایسے ایسے من مانے کڈھب سے کڈھب بول ٹھونسے جا رہے ہیں اور ایسے بھوسے لبسرے بولوں کی بھرمار کی جا رہی ہے جن کے سمجھنے کے لئے مسلمان تو مسلمان ہندوؤں کو بھی سنسکرت کی ڈکشنری اٹھانا پڑتی ہے۔ آج کل کے نئے ہندی لکھنے والوں کی نہ کہئے یہ سب ادوان کے تو تے ہیں۔ کچھ لکھنا لکھانا ہوا، جھٹ سے سنسکرت کی ڈکشنری گھسیٹ لی۔ اسے سامنے رکھ کر آئیں بائیں شائیں جو جی میں آیا بھولے لبسرے بول سے بول دیکھ دیکھ کے لکھتے چلے گئے۔ یہ میں نہیں کہتا۔ ان کے لکھنے کا ڈھب آپ پکار پکار کر کہہ رہا ہے۔

سنسکرت کا ہندو دھرم کی بھاشا بننا اور اس بھاشا کا کبھی نہ بنتا ہوا پھیلا و کون ایسا پڑھا لکھا ہے جو نہیں جانتا۔ اس میں دیکھنے کی جو بات ہے وہ یہی ہے یہ سنسکرت جب سہاگن تھی اور راج کی چہیتی بھاشا سمجھی جاتی تھی تب بھی چھوٹے سے لے کر بڑے تک سب اسے نہیں بول سکے۔ کچھ ہی لوگ تھے جو اس میں بات چیت کر سکتے تھے تو راج کی بھاشا ہونے پر بھی جب یہ سب کی بھاشا نہ بن سکی تو اب کیا بن سکتی ہے۔ راج کے پانی ہی سے جو پودا نہ پھیک سکا۔ وہ بھوبل میں کیا پھل پھول سکتا ہے۔ پھلواری کی دیکھ بھال اور اس کے ٹھیک ٹھاک ہونے پر بھی جو پھول نہ کھل سکے تو اب پت جھڑ میں کیا کھلیں گے۔ جس کچی بھون کو راج بھی نہ بنا سکا تو راج کی دھوپ ڈھل چکنے پر وہ کیا بنتا۔ جب دانت تھے تبھی جو چنے نہ چب سکے تو دانت ٹوٹنے پر وہ کیسے چبائے جا سکتے ہیں۔ وہ پرانے ڈھنگ کے سڈول موتی جو راج کا سنگھار ہونے پر بھی مٹی میں اٹے رہے اب ٹوٹ پھوٹ پر ان کی جھاڑ پونچھ ہوئی بھی تو کیا۔

پھر یہ بھی دیکھئے۔ آج جس نئے گھر کی نیو رکھی جا رہی ہے۔ یہ بنتا بھی رہا تو کب تک پورا بن سکے گا۔ بھاشا کا گھر اور گھروں کا سا تو نہیں جو کچھ دنوں میں بن بنا کے پورا ہو گیا اور اس میں گھر والے رہنے بسنے لگے۔ بھاشا کا گھر بنانا بڑی ٹیڑھی کھیر ہے اور پھر یہ ایک آدھ

جنتے کے ہونے کا روگ نہیں۔ اس تت بنانے کے لئے سب کا ایکا اور بڑی سوجھ بوجھ چاہئے۔ یوں ہی سی آنکا پڑی تو کچھ کا کچھ ہو گیا یونہی سی چوک ہوئی اور کی کرائی ماٹی پر پانی پھر گیا۔

نہ مانئے اور اپنی بات کی تیج کرنے کی لو اور بات ہے پر ٹھنڈے جی سے دیکھئے تو آپ کی اردو میں وہ سب باتیں پائی جا رہی ہیں جو بڑھنے والی بڑی سی بڑی بھاشا میں ہونا چاہئیں اور جو یہ گننا کوئی پاپ نہ ہو تو مجھے یہ کہنے دیجئے اردو میں کچھ پایا کی ایسی ایسی باتیں بھی چھپی ہوئی ہیں جو اوروں میں نہیں۔ ابھی اس کا بچپنا ہے۔ اس ٹھٹ پن ہی میں بھولی بھولی باتوں کے ساتھ ساتھ وہ جنچی تلی گہری ٹہری باتیں بھی اس میں ہیں جنہیں دیکھ کر اچنبا ہوتا ہے۔ بڑے بوڑھوں نے سچ کہا ہے۔ ہونہار بول گھونگٹ میں اور پوت کے پاؤں پالنے میں۔ اس پوت کے پاؤں پالنے میں دیکھئے تو، جب ابھی سے اس کی اوھکٹی باتیں جی موہے لیتی ہیں تو آگے کیا ہو گا۔ کسی بھاشا کے پھیلاؤ کے جانچنے کے اور بہت سے ڈھبوں میں سے ایک ڈھب یہ بھی ہے:۔

جگ میں لوگوں کی چھٹائی بڑائی ایک سی نہیں ہوتی سنسار میں یہی ہوتا آیا ہے۔ کوئی چھوٹا ہے تو کوئی بڑا۔ کوئی بہت چھوٹا ہے تو کوئی بہت بڑا۔ کوئی راجہ ہے تو کوئی مہاراجہ کوئی اس کی چوکھٹ کا منگتا ہے اور کوئی اس منگتا کے گھر کا بھکاری۔ ایسے ہی ایسی بہت اونچ نیچ اور سیکڑوں اتار چڑھاؤ لوگوں میں پائے جاتے ہیں تو جس بھاشا میں ایسے اتار چڑھاؤ کے لئے الگ الگ بات کرنے کے ڈھب جتنے بہت ہوں اس بھاشا کا پھیلاؤ ماننا پڑے گا۔

عربی، فارسی، سنسکرت، انگریزی ان سب میں سے کسی میں بھی یہ بات کرنے کے ڈھب بہت سے بہت نکلیں گے تو تین چار انہیں کے سامنے اب اپنی اردو کا پھیلاؤ دیکھئے۔ گننے گا تو ان کی گنتی اردو میں پندرہ سولہ تک پہنچے گی اور پورا پورا سوچ بچار کیا جائے تو ایسے اور اور بول بھی نکل سکیں گے۔ انہیں دیکھ کے کہیں یہ نہ کہہ اٹھئے گا یہ بول ہیں کہاں کہاں کے۔ جہاں کے بھی ہوں اب یہ سب کے سب اردو ہی کے ہیں۔ اردو کوئی ایک بھاشا تو نہیں یہ میل مٹھائی ہے۔

تو، تم، آپ، جناب، جناب من، جناب مکرم، جناب محترم، جناب والا، والا جناب، عالی جناب، سرکار، حضور، پیر و مرشد، جلالت مآب، اعلیحضرت، ملک معظم، شہنشاہِ جہاں پناہ، یہ موتی جن جن سیپیوں کے ہیں کیا
Form of Addressal

وہاں بھی انہیں ایک جگہ ایسا ہی اکٹھا کر لیا گیا ہے جیسے ان بکھرے ہوئے موتیوں کی اردو نے چمکتی ہوئی لڑیاں بنا دیں۔ یہ آپ جب چاہیں دیکھ سکتے ہیں۔

تو جس ندی کا پاٹ اتنا چوڑا ہو چکا ہو۔ جس کا اتھلاپن گہرے پن میں چھپتا جا رہا ہو اسے پاٹنے کی دھن میں دن رات نئے نئے جتن کرنا اور الگ سے اک نئی ندی نکالنے کے سوچ بچار میں آئے دن کھکیڑ میں اٹھانا کیا کوئی سمجھ والا اسے اچھا سمجھ سکتا ہے۔

عربی کو آپ ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتے اچھا نہ سہی۔ پر فارسی سے آپ کی یہ چڑ کیسی۔ فارسی اور سنسکرت یہ دونوں تو ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ ان دونوں کے کچھ بول لکھتا ہوں ان کا ملا جلا ہونا دیکھئے۔

فارسی اور سنسکرت کے ملتے جلتے بول

فارسی	سنسکرت	فارسی	سنسکرت	فارسی	سنسکرت
مہ	مہا	شاخ	شاکھا	ترس	تراس
کافور	کرپور	آستاں	ستھان	بیوہ	ودھوا
بیم	بھیم	بار	بھار	بروت	بھروت
نباس (عبادت)	تپسیا	کرباس	کپاس	جندال	چنڈال
گریچ	مگرمچھ	انگارہ	انگار	موش	موشک
باش	باس	فرمان	پرمان	ریشم	رشمی
است	استی	داغ	داگھ	کف	کپھ
خشخاش	کھس کھس	بند	بندھ	ابرو	بھرو
زانو	جانو	انگشت	انگشٹ	اورک	آدرک
آتش	آتشن	اشتر	اشٹر	سرشت	سرشٹی
خسر	سوئسر	خر	کھر	سخت	شکت
بادام	باتام	دیر	دھیر	سربہ	شوبہ
میغ (ابر)	میکھ	نیلوفر	نیلوتپل	کان	کھان
کنج	کنج	گرم	گھرم	کام	کامنا
در	دوار	گرہ	گرہ	تن	تنو
ماست (دہی)	مستو	یک	ایک	شام	شائم
برشگال	برشاگال	بارش	برشا	جنگل	جنگل
میش	مہش	انرح	انرح	بوم	بھوم
شغال	سرگال	گاؤ	گئو	ماہ	ماس

فارسی	سنسکرت	فارسی	سنسکرت	فارسی	سنسکرت
روز	روچ	گندم	گودھوم	شیر (دودھ)	کشیر
جَو	یَو	پارینہ	پوراتا	چرم	چرم
خون	شون	پدر	پتر	مادر	ماتر
برادر	بھراتر	پُور	پتر	دختر	دہتر
سرین	شرونی	بخش (حصہ)	بکش	ہستہ (ہتھیلی)	ہستی
پُر	پورن	ششم	ششٹھم	پنجم	پنچم

آپ نے ان بولوں کا ملا جلا ہونا تو دیکھ لیا اب فارسی اور سنسکرت کے بیاسے میل ملاپ کی کچھ اور کڑیاں بھی ساتھ ہی ساتھ دیکھ لیجئے۔ یوں تو انگریزی اور جرمن بھاشا کے بھی کہیں کہیں سے اکا دکا کچھ بول سنسکرت سے ملتے جلتے ہیں۔ پر جو بات پرانی فارسی اور سنسکرت کے بولوں کو آمنے سامنے رکھنے پر دکھائی دیتی ہے وہ اور کسی بھاشا میں نہیں۔ اسی سے تاڑنے والے نہ رہ سکے اور یہ کہہ اٹھے :۔

ایران کے کیانی، زردشتی اور ہند ماتا کے سپوت برہمن، چھتری ان سب کے پرکھا، بڑے بوڑھے ایک ہی گھرانے کے تھے جن میں کبھی بڑی گاڑھی چھنتی تھی۔ ایک ہی جگہ سب کا رہنا سہنا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ پرانی فارسی اور سنسکرت ایک ہی بھاشا تھی جب آپس میں پھوٹ پڑنے سے یہ الگ ہوئے تو الگ الگ رہنے سہنے سے اس ایک بھاشا میں پہلے پہل تھوڑا پھر بہت ال بل ہوتا گیا۔ ژند اوستا اور سنسکرت کے بول ایسے ایک سے ہیں جنہیں نہ جاننے والا سنے تو ایک ہی سمجھے اور دونوں کو ایک ہی بتلائے۔

پرانی فارسی کو الگ الگ تین نمبروں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ ایک ژند اوستا کی بھاشا۔ دوسرے پہلوی بھاشا جو ژند کے پیچھے بڑھی اور پھیلی تیسرے دری بھاشا جو ساسانیوں کے راج میں پھلی پھولی۔ یہ دری بھاشا ژند اوستا سے بہت الگ اور محمود غزنوی کے راج کی بھاشا سے میل کھاتی ہے۔ ساسانی راج کی بھاشا اور غزنوی راج کی بھاشا جیسے یہ دونوں ملتی جلتی دکھائی دیتی ہیں۔ ایسے ہی ژند اوستا اور سنسکرت ہیں۔ یہی دیکھ کے یورپ کے کھوج لگانے والے یہ کہنے لگے :۔ یونہی سی گھٹ بڑھ سے ویدک گیت اوستا میں اور اوستا کے بول ویدک کے سانچے میں ڈھل سکتے ہیں۔

اوستا کا منتر اور ہوما اور وید کا منتر اور سوما دونوں کے دونوں ایک ہیں۔ ایسے ہی ژند اوستا کا ستراو ہی ہے جو رگوید کا منترا متھرا ہے۔ رگوید کا ایمن دیوتا اور ژند اوستا کا ایریمن یہ دونوں بھی ایک ہی ہیں۔ ایران کی راجدھانی میں پہلے پہلے جن جن کا راج رہا وہ رگوید اور ژند اوستا میں ایک ہی سے ہیں۔ ژند اوستا کا یما خشائتا (جمشید)، رگوید میں یما راجہ ہے خشائتا چھا راجہ، بادشاہ) کو کہتے ہیں۔ اس لئے یما خشائتا اور یما راجہ یہ دونوں ایک ہی ہوئے۔ ژند اور رگوید میں کیکاؤس اور رکاوید اشانس دونوں کی باتیں ایسی ایک سی ہیں جن میں رتی بھر ال بل نہیں۔

بھینٹ دینے والے اور چڑھاوے چڑھانے والے کو ژند اوستا میں اتروا کہتے ہیں۔ وید میں اسی اتروا کو اتھروَن کہا گیا ہے۔ کوی یہ بول ویدوں میں آئے وائی باتوں کے جاننے والوں اور بڑے بھاری بھرکم سمجھ والوں کے لئے بولا گیا ہے۔ ایران میں بھی بڑے بڑے راج پاٹ والوں کے لئے یہی بول بولا جاتا تھا۔ جیسے کوی سسرو (کیخسرو) کوی کوات (کیقباد) ٹوہ لگانے والوں نے تو یہاں تک کھوج لگا لیا۔ پوجا پاٹ میں جو بول منہ سے نکلتے تھے وہ ژند اور ویدوں میں کہیں کہیں یونہی سا ال بل ہو تو ہو، نہیں تو دونوں کے بولوں کے بول ایک ہی سے ہیں۔

ویدمیں سورج کو گوڑے والا اور دوڑنے والا بتایا گیا ہے۔ اوستا میں بھی یہی ہے۔ سورج دیوتا کو وید میں اریامن اور اوستا میں اریامن کہا گیا ہے۔ یہاں وہاں دونوں جگہ اس دیوتا کے منتر بیاہ کی سبھ گھڑی میں پڑھے جاتے تھے۔ انگیرا رشی کی پود سے آگ کی پوجا کا پرچار ہندو مانتے ہیں۔ اوستا میں بھی آگ کی پوجا کا پرچار انگرو اور اس کے گھر والوں سے مانا گیا ہے۔ ترتیا کو اوستا میں پہلا بید بتایا ہے۔ رگوید اور اتھرووید میں بھی ترتیا تھریتا، تریتک ہے جو دکھوں سے اچھا کرنے والا دیوتا مانا گیا ہے۔ اگنی ماتا کو جیسے ہندو گھروں میں رکھتے تھے۔ ایسے ہی ایرانی بھی۔ ایرانی آگ پوجنے والوں کے رات دن گانے کے منتر کو گاتا کہتے تھے۔ ہندوؤں میں یہی گاتا گاتری منتر کہلاتا ہے جو نسے برس ہندو اپنے لڑکوں کو جنیو پہناتے۔ ایرانی بھی اسی برس پہناتے تھے۔

یہاں ندیوں پر جیسے اشنان کے میلے لگتے ہیں۔ ایسے ہی ایران میں آب ریز کے تہوار ہوا کرتے تھے۔ جاڑے آتے جیسے یہاں دوالی کا تہوار ہوتا ہے۔ ایسے ہی ایرانیوں میں چراغاں کی دھوم دھام ہوا کرتی تھی۔ ہولی سے اگلے دن یہاں ہندو جو کیا کرتے ہیں یہی سب ایران میں کوسہ برنشیں کے تہوار میں کیا جاتا تھا۔ جس مہینے میں یہاں بسنت کا میلا لگتا ہے

ایران میں بھی اسی مہینے جشن گل کو بی منایا جاتا تھا۔ ان باتوں سے یہی پتا چلتا ہے پہلے میں یہاں کے آریہ جب ایرانیوں سے الگ ہوئے تو یہ اور ایرانی ایک ہی دھرم رکھتے تھے۔ پرانے لکھنے والوں میں سے کچھ نے ایران سے آریوں کے نکلنے کی باتیں یوں لکھی ہیں۔

ان میں کا ایک جتھا دھرم کی باتوں میں کچھ کتر بیونت کر کے دھرم کو بگاڑنا چاہتا تھا۔ اس سے اک آگ بھڑک اٹھی اور دھرم کے بچاؤ کے لئے تلواریں ٹیک ٹیک کے سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ گھمسان پڑا۔ لڑائی بھڑائی ہو چکنے پر آپس میں ایسی چشم چخا ہوئی جو پھر کبھی ایک جگہ مل جل کے نہ بیٹھ سکے ہارا ہوا جتھا ٹھوکریں کھاتا ادھر آ نکلا اور یہیں رہ پڑا۔

۷۵۰۔ ابھی پرانی دھرانی لکھت کے کچھ ٹکڑے کسی پارسی کے ہاتھ سے نکل کے یورپ پہنچے۔ پھر پرانی لکھت کے ٹکڑے اور کئی ٹکڑے ڈھونڈنے والوں کو ادھر ان سے ملے۔ ان سب کو دیکھ بھال اور جانچ پڑتال کے بال کی کھال نکالنے والوں نے سوچ بچار سے ان بکھری ہوئی کڑیوں کی لڑیاں بنا دیں۔

ان باتوں کا پھیلاؤ یہاں نہیں سما سکتا اسی لئے انہیں چھوڑتا ہوں۔

فارسی اور سنسکرت کے کبھی کے میل جول پر جو لکھا گیا وہ اتنا بھی نہیں جتنا اک بہتی ہوئی ندی سے چلو بھر پانی۔ پھر بھی آپ نے یہ تو دیکھ ہی لیا ہوگا۔ فارسی اور سنسکرت ایک ہی پیڑ کی ڈالیاں، ایک ہی پھلواری کے پھول، ایک ہی سیپی کے موتی اور ایک ہی منہ کی دو آنکھیں ہیں۔ جب ان دونوں کا میل ملاپ آپ دیکھ چکے تو اب فارسی بدیسی بھاشا کہاں رہی یہیں کی ہوئی اور جب یہیں کی ہوئی تو پھر اس کے بولوں کو ٹھکرانا کس لئے۔

فارسی اور سنسکرت کے ہٹے ہوئے پریم کی کہانی میں آریوں کے باہر سے یہاں آنے کی بات چھڑ گئی ہے تو یہیں وہ جھگڑا ابھی چکا دینا چاہیئے جو مسلمانوں اور ہندوؤں میں چلا آرہا ہے۔ ان دونوں جتھوں میں چلی گئی اور جو نوک جھونک چلی آتی ہے اس میں سب سے بڑھ کر ہندوؤں کی یہ بنکار ہے:۔ ہند ہمارا دیس اور ہمارا ہی جنم بھوم ہے۔ دیس کا جھولا ہمارے ہی لئے ہے اور ہمیں اس میں جھولتے رہیں گے۔ پہلے سے ہمیں یہاں کے رہنے والے ہیں۔ باہر سے آنے والے جو ساتھ رہ پڑے یہ کبھی یہاں کے نہیں بن سکتے۔ دیس کے اکلوتے سپوت ہمیں ہیں اور رہیں گے۔ یہ دیس کبھی دوسرے کا نہیں ہو سکتا۔

گونڈ، بھیل، لباڑے یہ بات کہیں تو سچ یہ ہے انہیں کوئی جھٹلا نہیں سکتا اور ہے بھی یہی۔ انہیں گونڈ، بھیل، لباڑوں کی یہ جگہ جنم بھوم ہے اور انہیں کے جتنے دیس والے ہیں جو ننگے دھڑنگے پہاڑوں بنوں، جنگلوں میں مارے مارے پڑے پھر رہے ہیں۔ انہیں چھوڑ کے دیکھئے تو پھر کوئی دیس والا ہی نہیں رہتا۔ آگے دیکھئے سب باہر ہی سے آئے ہوئے ہیں۔

کیسی ہی پرانی سی لکھت اٹھا کے کیوں نہ دیکھئے یہی پتا ملے گا۔ آریہ پہلے سے یہاں کے رہنے والے نہیں، یہ باہر ہی سے آئے اور یہاں رہ پڑے جیسے آریہ باہر سے یہاں آئے۔ ایسے ہی مسلمان بھی آ دھمکے۔ دونوں کے یہاں آنے میں کچھ بڑا ابل تھا۔

آریہ جو آئے تو آتے ہی اپنی دھاک بٹھانے کے لئے انہوں نے یہاں کے بسنے والوں کا مار مار کے ایسا کچومر نکالا جو کچھلے دیس والے یہاں کا رہنا سہنا چھوڑ پہاڑ بھاگ بھوگ کر اندھیری گھاٹیوں میں منہ چھپا کے بیٹھ رہے اور جو نہ بھاگ سکے شودر کہلائے یہ اور ان کی پود، داس بن کے باہر والوں کی سیوا کرتی رہی۔ گھر بنانا، چھپر چھانا، گھر کی جھاڑ پونچھ، کوڑا کرکٹ اٹھا اٹھا کے پھینکنا، چکیاں پیسنا، برتن باسن مانجھنا، لکڑیاں چیرنا، گائے بھینسوں کو چرانا، گوبر اٹھانا، اپلے تھاپنا انہیں دھندوں میں ان دیس والوں کے دن رات کٹتے تھے۔ یونہی سی بھول چوک پہ ان کی وہ درگت بنتی جس کے دھیان سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ پھر یہ لکھ پڑھ نہیں سکتے تھے۔ مندروں میں آنا جانا کیسا۔ ان کی پرچھائیں سے پوجا پاٹ کی ستھری جگہ پاپ کی کیچڑ میں لتھڑ جاتی تو ایسے پلید وہاں کیسے پھٹک سکتے تھے۔

یہ ادھم دیکھ کے سنسار نے کروٹ لی اور وہ ڈری ہوئی پیڑھیاں جو آئے دن کی مار دھاڑ سے چپ چاپ رہتی تھیں۔ اب سب کی سب مل کے چیخ اٹھیں ایسے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر اب آنکھیں کھلیں اور انہیں چمکار چمکار کے روکا تھاما جا رہا ہے اور ان کے اپنے سے الگ نہ ہونے کے لئے سیکڑوں جتن کئے جا رہے ہیں اور یہ جو کچھ بھی کیا جا رہا ہے ان کے لئے نہیں یہ بھی سب اپنے ہی لئے ہے۔ ڈر یہ لگا ہوا ہے کہیں یہ پورا ریوڑ کا ریوڑ کسی اور کے گلے میں جا کے نہ مل جائے اور اس کے ملنے سے دوسرے اپنی بہتات کے گھمنڈ پر آگے بڑھ جائیں اور ہمیں چپ چاپ بیٹھنا پڑے۔

رہے مسلمان تو وہ یہاں ایسے آئے جیسے کوئی اپنے گھر میں آتا ہے۔ کسی نے انہیں دیکھ کے ٹیڑھی ٹوپی کی تو راج نے ڈانٹ ڈپٹ دیا۔

نہیں تو یہاں والوں کو مسلمان اپنے راج کی جگمگاتی سبھا میں ساتھ بٹھاتے رہے۔ بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہجہاں ان میں سے اکبر کا تو پوچھنا ہی کیا یہ تو اوتار ہی مان لیا گیا اوروں کو بھی ہندو اچھا ہی جانتے ہیں۔ برا نہیں کہتے۔ اس لئے ان کی باتیں چھیڑنا نہیں چاہتا۔ ان سب میں سے اک اورنگ زیب ہی ایسا ہے جسے دھرم کا کٹر، بس کی گانٹھ، ہندوؤں کو دکھ دینے والا، ستانے والا اور نہ مانے جانا گیا اسے ہندو کہا کرتے ہیں۔

یہی اورنگ زیب جو ہندوؤں کو ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتا تھا جب دکھن کا گورنر تھا تو ہندوؤں کو آگے بڑھائے۔ انہیں جنجال سے چھڑانے کے لئے اس نے کیا کیا۔ یہ کہانی مہرچند وناتھ سرکار کے منہ سے سننے کی ہے۔ دھرم کا کٹر اورنگ زیب شاہجہاں کو ہندوؤں کے لئے ایسے ایسے ڈھب سے لکھتا تھا جو کبھی کبھی شاہجہاں کی تیوری پر بل پڑ جاتے تھے۔ اس پر بھی اس نے ہندوؤں کا ساتھ دینا نہ چھوڑا اور ان کی جو باتیں اسے سچی دکھائی دیں شاہجہاں کے سامنے ان کے کہنے سے کبھی نہ چوکا۔

دیوگڈھ کا راجہ کیسری سنگھ، راؤ کرن راجپوت، مہیش داس راٹھور، نرسنگھ داس، جیات سنگھ، سارنگدھر، اندرمن یہ اور ایسے اور راوریند وؤں کو سکھ چین سے بٹھانے کے لئے اورنگ زیب اپنے سے جتن کرتا رہا۔

یہ باتیں تو جب کی ہیں جب یہ پرنس تھا اور اس نے اپنے راج میں ہندوؤں کے ساتھ کیا کیا، انہیں کیسی کیسی جگہیں دیں، ان کی بڑی سی بڑی بھول اور بھاری سی بھاری چوک کو بھی کیسا ٹالا۔ اس کے لئے پیچھے ہٹ کے یہ دیکھنا چاہئے: کھجوا کی لڑائی میں مہاراجہ جسونت سنگھ نے داراشکوہ سے مل کے اورنگ زیب کو جو نیچا دکھانا چاہا۔ ایسے ہی اجمیر کی لڑائی میں کنور رام سنگھ سے جو بڑی بھاری چوک ہوئی۔ کوئی اور راج ہوتا تو انہیں پاپی ٹھہرا کے ان کے ایسے کرتوت سے بجائے ان کی کیا درگت بنا دیتا۔ پر اورنگزیب نے جب اور نہ لڑائیاں جیتنے پر کسی سے بھی کچھ پوچھ گچھ کی اور جو کچھ ہو چکا تھا اسے ایسا کر دیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

دھیراج۔ راجہ جے سنگھ، بجے سنگھ، راجہ دیبی سنگھ بندیلہ، راؤ دلیپ سنگھ بندیلہ، رائے سنگھ راٹھور، راجہ راج روپ، رائے رایاں، راجہ رگھناتھ داس، رام سنگھ ہاڈا، راجہ رام سنگھ کچھواہا، رگھناتھ سنگھ سیسودیہ، یہ اور ایسے اور بہت سے ہندو نکلیں گے جو اورنگ زیب ہی کی دیا سے پھلے پھولے اور پروان چڑھے۔ ان باتوں کے پھیلاؤ کے لئے نہ یہاں جگہ ہے اور نہ یہ ڈھائی بولوں میں سما سکتی ہیں۔

تو آپ نے دیکھا باہر سے آنے میں مسلمان اور ہندو دونوں کے دونوں ایک سے ہیں۔ بل اتنا ہی ہے آریوں نے پہلے آ کے ہند میں چھاونی چھائی اور مسلمان آریوں کے پیچھے یہاں آئے۔ آگے پیچھے آنے کا اس بل ایسا نہیں ہوا کرتا جو پہلے آنے والے جس جگہ آ کے ٹھہریں اُسے اپنا تو جنم بھوم سمجھیں اور اپنے پیچھے آنے والوں کو باہر والا ہی سمجھتے رہیں۔

یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے کسی جگہ آگے پیچھے دو جتھے باہر سے آ آ کے ٹھہریں اور پھر وہیں رہ پڑیں۔ ان دونوں میں سے پہلے آنے والا جتھا اپنے پیچھے آنے والوں سے یہی کہتا رہے۔ یہ جگہ ہماری ہی ہے، تم ساتھ رہنے سے یہ بھی کبھی یہاں کے نہیں بن سکتے اور نہ یہ جگہ کبھی تمہاری ہو سکتی ہے تو اس اڑنے اور ہٹ کرنے کو سمجھ والے بالکل ہٹ کہیں گے۔ بات کا بتنگڑ بنانا کوئی اچھی بات نہیں۔ مسلمان، ہندو جو بھی یہاں آ آ کے رہ پڑے، ہند اب ان سب کا جنم بھوم ہے اور رہے گا۔ منہ سے کہہ دینے سے یہ کسی ایک جتھے کا دیس کبھی نہیں بن سکتا۔

دیس کے باہر اب بھی اک چھوڑ کئی کئی راجدھانیاں مسلمانوں کی ہیں۔ پر ان میں سے کسی میں بھی یہاں کے مسلمانوں کے لئے چوتڑ ٹیکنے کی بھی جگہ نہیں۔ جیسے ہندوؤں کا باہر کوئی ٹھکانا نہیں ہے ایسے ہی یہاں کے مسلمان بھی ہیں جن کا رہنا سہنا، اٹھنا بیٹھنا، مرنا جینا جو ہے وہ سب یہیں تو پھر اب یہ باہر والے کیسے ہو سکتے ہیں۔

یہ سچ ہے مسلمان ہندوؤں سے تھوڑے اور بہت تھوڑے پر جب ان کے دکھ، سکھ، مرنے جینے کی بات بیچ میں آ پڑے تو پھر تھوڑے سے تھوڑے بھی تھوڑے نہیں رہتے۔ آٹھ کروڑ کا ٹڈی دل کبھی ایسا نہ بن سکے گا جس کا ہونا نہ ہونا ایک سا ہو کے رہ جائے۔ سانس لینے والا اتنا بڑا جتھا مٹی کا تھوا تو بنے سے رہا۔ اس میں کھلونوں کی سی من مانی توڑ پھوڑ کبھی نہیں ہو سکتی۔ اس کا یہاں رہنا سہنا کیچڑ کا سا دھبہ نہیں ہے۔

ہے جب جا! روڑ، دھوپ کے پانی سے دھودھلا کے چھڑا ڈالا۔

مہاتما جی۔ پرماتما کے لئے دیس والوں سے ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر اڑنا، سنگرنا چھڑائیے۔ تیری میری، میری تیری ایسی بے سری کبھی ہوئی تھی نہیں کب تک۔

دیکھئے اسی آپس کی جھنک پٹک، تن بھن سے دیس، اب تک کتنے ٹوٹے میں رہا۔ آپ میں بھلائی، اچھائی کی جو جو باتیں ہیں انہیں بھگوان کی دیا سمجھ کے آگے بڑھیئے اور جگت گرو بنئے۔ یہ ایک جتھے کا لیڈر بنا کیسا آپ کو تو پورے دیس کا گرو بنا چاہئے۔ سچ ہے یہ بات ایسی نہیں جس میں نہ ہینگ لگے نہ پھٹکڑی اور بیٹھے بیٹھے سب کچھ ہو جائے پر آپ تو پاؤں توڑ کے بیٹھنا نہیں چاہتے، آپ تو بتا رہے ہیں کٹھن سے کٹھن باتیں ہم جیسوں کے سٹ پٹا جانے کے لئے بہت سہی پر آپ کے سامنے تو یہ کچھ بھی نہیں آپ تو دیس ہی کے سدھارنے کی ادھیڑ بن میں رہے اور ہیں تو دیس والوں کو بھی ایسا بنا دیجئے جو آپ کی دیکھا دیکھی یہ سب بھی دیس کے پریمی بن جائیں اور یہ جو اب تک آگ لگا کے پانی کو دوڑتے رہے ہیں ایسی اندھا دھند دوڑ دھوپ سے اکتا کر آپ کے ساتھ ساتھ اس چوڑی سڑک پہ چلنے لگیں جو پریم پر پہنچا دیتی ہے۔ ان کے من کی انگیٹھیوں میں پریم کی دبی ہوئی چنگاریوں کو گرنتھ گیان منتروں کے پنکھے سے دھونک دھونک کے ایسی بھڑکتی ہوئی آگ بنا دیجئے جو بھول چوک کے پانی کے چھینٹوں سے بھی نہ کبھی بجھے اور نہ کبھی کجلائے۔

ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، یہودی، پارسی پرماتما نے ان سبھوں کو ایک سا ڈیل ڈول، ہاتھ پاؤں، آنکھیں، ناک کان دیئے ہیں۔ جیسے اس دین میں سب کو ایک سا رکھا وہ چاہتا تو کیا بڑی بات تھی جو سارے جگ میں ایک ہی دھرم ـــــ پرچار کا ڈنکا بجتا۔ ایک ہی دھرم کے مندر میں سب مل جل کے ایک ہی ڈھب پر اس کی پوجا کرتے۔ پر بھگوان نے ایسا نہیں کیا کسی نے اُسے ایک ڈھب پر پوجا۔ دوسرے نے اس کے پوجنے کا اور ڈھنگ نکالا تیسرے نے کسی اور ڈھب سے اُس سے لو لگائی۔ سب دھرموں کو دیکھئے تو یہ سب کے سب چھوٹی بڑی الگ الگ سڑکیں ہیں جو اسی ایک کے پاس پہنچانے کے لئے کھلی ہوئی ہیں جس کے راج کا پھیلاؤ چھوٹے بڑے لاکھوں کروڑوں ان گنت سنساروں سے بھی آگے نکلنے کہاں تک، بس ہی گھیرے ہوئے ہے۔ ایسے سنسار اُسے نہ پائیں اور اس کے پوجنے کا دھاگا سب مل کے توڑ تاڑ کے رکھ دیں جب بھی اُس کے امٹ راج میں سے ایک رتی بھی کبھی گھٹ نہیں سکتی۔ ایسے ہی انہیں جگمگاتے سنساروں کے رہنے والے کیسی ہی بڑھ چڑھ کے اُس کی پوجا پاٹ کیوں نہ کریں، پر اس سے اُس کا راج رتی بھر بڑھ نہیں سکتا۔

دھرموں کے ماننے نہ ماننے کی بھلائی برائی جو بھی ہے وہ دھرم والوں ہی کے لئے ہے۔ وہ ماں باپ سے بڑھ کے پیار کرنے والا پرماتما ان باتوں سے ایسا الگ تھلگ ہے جو یہاں کے دُکھ سُکھ کی دھوپ چھاؤں اس پر پڑ نہیں سکتی۔ اس کے نہ مٹنے والے راج کی چوکھٹ اتنی اونچی ہے جو یہ سنسار اپنے پہاڑوں کے ہاتھوں سے بھی اُسے چھو نہیں سکتے۔ ہمارے دھیان کا پھیلاؤ اور پھرتی جس کے سامنے بجلی کا چھلاوہ پن بھی پانی بھرتا ہے اور جو گھڑی بھر میں اونچی سی اونچی جگہ کو روند کر اس کی اونچائی ناپ تول کے رکھ دیتا ہے۔ وہاں تک پہنچنے میں یہ بھی اپاہج ہے۔ رات دن سے گھرے ہوئے سنسار اُس کے راج کے پھیلاؤ کو کبھی نہیں پا سکتے

جب سب کے سب اُسی ایک کو اپنے اپنے من کی ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے ہیں۔ اپنے اپنے ڈھنگ پر اُسی کے آگے چڑھاوے چڑھا رہے ہیں اور اُسی کے دھیان میں دھونی رمائے بیٹھے ہیں تو الگ الگ دھرم ہونے پر دھرم کے لئے آپس میں یہ ارے ترے کرنا کیسا۔ دھرم الگ الگ ہیں ہوا کریں، اس سے کیا ہوتا ہے جو دھرم ہے وہ اپنی جگہ اچھا کسی کو بھول کے بھی یہ نہ چاہیئے جو دوسرے کے دھرم کو برا کہے، برا کہنا کس لئے۔ ایک کے دھرم کی بوجھ گچھ دوسرے سے تو ہونے سے رہی جو جس کا دھرم ہے اس کا بوجھ اُسی کے کاندھوں پر ہے، اس کے پیچھے آئے دن آپس میں لڑنا جھگڑنا بڑی بُری بات ہے۔

مسلمانوں اور ہندوؤں کا ایک دن دو دن کا تو ساتھ نہیں۔ پہلے بھی یہی مسلمان تھے اور یہی ہندو، یہی مسجدیں تھیں اور یہی مندر، یہی دُکھ کا اندھیرا تھا اور یہی سُکھ کا اجالا، یہی سنہری دن تھے اور یہی روپہلی راتیں، باجا گاجا مسجدوں کے سامنے بھی بجتا تھا اور مندروں کے بھی، پر نہ کبھی مسجد والے بھڑکے اور نہ کبھی مندر کے پجاری بڑبڑائے۔ آپس میں مل جل کے رہتے اور جس سے جتنی جان پہچان ہو جاتی۔ مرتے مرتے اسے نباہتے اور اس میں کچھ بل نہ آنے دیتے تھے۔ بڑے بوڑھوں سے ہندو، مسلمانوں کے میل ملاپ کی جو کہانیاں کان سُن چکے ہیں وہ اب ساری کی

ساری من گھڑت اور زٹل دکھائی دینے لگیں۔

آج کل کے مسلمان اور ہندو تو ایسے ہو گئے جیسے توے سے روٹی الٹ جاتی ہے۔ بات بات میں آپے سے باہر۔ یونہی سی کچھ بات ہوئی اور بھڑک اٹھے۔ پھر کیا تھا جھینجم چانچ بڑھتے بڑھتے یہاں تک بڑھی جو یہ آپس میں گتھ گئے۔ سمجھ والے اجڈوں کی گتھم گتھا الگ تھلگ ہو کے دیکھنے لگے آپس کی لاگ ڈانٹ کی آگ بجھانے کا دھیان کسی کو بھی نہیں۔

یہ سنتے سنتے کان جھنّانے لگے۔ آج یہاں جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا، کل وہاں لاٹھی چلی، پرسوں اُس جگہہ گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ سیکڑوں کے ہاتھ پاؤں ٹوٹے۔ لہو لہان ہوئے، بیسیوں مارے گئے۔ جب لڑتے لڑتے دونوں تھک کے ملنے لگے تو راج نے پکڑ دھکڑ کے جیل میں ڈال کے بیچ بچاؤ کر دیا۔ بیٹے بیاسے الگ، چھوٹنے کی دوڑ دھوپ میں جو کچھ انٹی میں تھا وہ ہاتھ سے الگ نکل گیا۔ جن دھندوں سے چار پیسے ہاتھ میں آرہے تھے وہ دھندے الگ چھٹے، ور گانٹھ میں ایک جھنجی کوڑی بھی نہ رہی۔ بیٹھے بٹھلائے جو اکڑ تکڑ کا دھیان آگیا تھا اس کا یہ پھل مل گیا۔ چلئے چھٹی ہوئی۔

یہ آئے دن کی جھڑپ، بات بات میں لڑبھس، گھڑی گھڑی کا ٹرّاپن۔ دیس والوں کی ایسی سمجھ پر تیل ماش اتارے اور جیسے ہے انہیں اس بچّے پن سے روکئے۔ بے سمجھ کے ہیٹے، کانوں کے کچّے آپس میں گتھتے چلے جاتے ہیں اور ان کی جھپیٹ میں دیس کا ستیاناس ہوتا جا رہا ہے آپس کی نوچ کھسوٹ اور لوٹم لاٹ نے دیس کے لنگوٹی بندھوا دی۔ مہاتما جی، آپ کے سامنے ایسی باتیں کرنا سورج کو دیا دکھانا ہے پر یہ بھی دیکھا گیا ہے کبھی کبھی بڑے بڑے سمجھ والوں سے بھی سامنے کی باتیں دیکھنے سے رہ جاتی ہیں۔

اب پھر اسی بھاشا کو لیجے۔ کٹھن باتیں چھوڑ چھاڑ کے نئی بھاشا بنانے کے جنجال میں پھنسنا اور منجھی منجھائی بھاشا کو ٹھکرا کے منہ پھیر لینا یہ بھی نئی بات ہے۔ میں جانتا ہوں دیس کے کچھ ٹکڑوں کی بولیاں ایسی الگ الگ ہیں جو ایک دوسری سے نہیں ملتیں اور ایک ٹکڑے کی بولی بولنے والا دوسرے کی بولی نہیں سمجھتا۔ پر یہ سب کی سب بولیاں ایسی چھوٹی چھوٹی سی ہیں جو دیس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں ہی میں بولی جاتی ہیں باہر انہیں کوئی جانتا بھی نہیں ان سب میں اکیلی اردو ہی ایسی ہے جو سارے دیس میں بولی اور سمجھی جاتی ہر دیس کی پوری بولیوں میں سے اک اردو ہی کا ایسا پھیلاؤ ہے جو ٹھیکم ٹھیک پورے دیس کی بھاشا بننے کا بل بوتہ رکھتا ہے۔

کسی بھاشا میں باہر والی بولیوں کی بہنات سی بہنات جتنی بھی ہو۔ پرکھنے والے اسے تو بھاشا کی بڑھوتری سمجھتے ہیں اور آپ نہ جانے کیا چاہتے ہیں جو عربی، فارسی بول اردو میں دیکھ نہیں سکتے اور یہ بھی نہیں بتاتے یہ کیوں آپ کو برے لگتے ہیں کیا آپ کوئی بھی ایسی آگے بڑھنے والی بھاشا بنا سکیں گے جو باہر کی بولیوں کو ٹھکرا کے اپنے ہی گنے چنے ڈھائی بول لئے بیٹھی رہی ہو اور انہیں کے سہارے آگے بڑھ کے یہ ٹٹ پونجیا بھاشا ایسی پھولی پھلی ہو جو دوسری بڑھنے اور پھیلنے والی بولیوں کے لگ بھگ کہی جا سکے۔ عربی، فارسی بولوں کے نکال ڈالنے سے اردو کی بڑی لمبی چوڑی انگنائی گھٹ گھٹا کے بالشت بھر رہ جائے گی۔ یہ سچ ہے۔ ہندوؤں کو چوڑی چکلی انگنائیاں ابھی نہیں لگتیں اور اسی لئے وہ اپنے اپنے گھروں کی انگنائی چھوٹی چھوٹی سی رکھا کرتے ہیں۔ پر یہ گھر اور بھاشا کا گھر دونوں کے دونوں ایک سے تو نہیں ہو سکتے۔ جس بھاشا کی بڑھوتری دن دونی رات چوگنی ہو اور جس کی دوڑ پھیلاؤ سے پھیلاؤ کو بھی روندتی چلی جا رہی ہو۔ اُسے آپ ٹھکرانا چاہتے ہیں۔ اسے تو کلیجے سے لگا کے رکھئے۔

آپ سے یہ تو کوئی نہیں کہتا۔ عربی، فارسی کے نئے نئے من من بھر کے بھاری سے بھاری بول اُردو میں آپ ٹھونستے چلے جائیں جو یہ کہے اسے سٹری سمجھئے۔ پر ان دونوں بولیوں کے وہ بول جنہیں پڑھے لکھے تو پڑھے لکھے، ان پڑھ گاؤں والے اور گنوار تک دن رات بولتے چالتے ہیں انہیں اردو میں سے نکالنے کے جتن کرنا تو ٹھیک نہیں۔

دیکھئے وہ ہل جوتنے والے جو پو پھٹتے ہی تاروں کی چھاؤں میں اپنے اپنے دھندوں میں لگے تو سورج ڈوبنے پہ ستانے کے لئے ٹھہرتے ہیں۔ وہ بھاشا واشا کے کھڑاک کو کیا جانیں۔ پر یہ اردو کا پھیلاؤ دیکھنے کا ہے جو وہ اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے عربی، فارسی کے سیکڑوں بگڑے ہوئے بول کے بول بے جھجک بولتے چالتے ہیں۔ اچھوتوں کے لئے جب آپ گاؤں گاؤں پھر رہے تھے تو یہ سب کچھ آپ سن چکے ہوں گے جو اب آپ کو سنایا جا رہا ہے:۔

عربی، فارسی کے وہ بگڑے ہوئے بول جو گاؤں والے اور گنوار رات دن بولتے ہیں۔

مرجی (مرضی)، ناراج (ناراض)، کھپا (خفا)، منجور (منظور)، تکدیر (تقدیر)، جمین (زمین)، صِپھت (صفت)، منائی (منع)، کبالہ (قبالہ)، کھزانہ (خزانہ)، تنکھا

زنخو)، مجوری (مزدوری)، کھون (خون)، سبد کھلی (بے دخلی)، دستاویج (دستاویز)، کاگج (کاغذ)، کلم (قلم)، کاجی (قاضی)، راجی (راضی)، کھتا (خطا)، جلم (ظلم)، کابل (قابل)، کبول (قبول)، جکام (زکام)، نجلہ (نزلہ)، کھار (خار)، رجا (رضا)، تپنیج مند (فیض مند)، کھیرت (خیرات)، کیامت (قیامت)، اب اب (عذاب)، نازک (نازک)، بھکت (بخت)، جرحانہ (جرمانہ)، کھالی (خالی)، کسور (قصور)، سجا (سزا)، سورت (صورت)، جلدی (جلدی)، طرح طرح، مجود (موجود)، مالوم (معلوم)، نفد (نقد)، معاملہ، گلت (غلط)، مدرسہ، لانت (لعنت)، رونک (رونق)، مولی ساب (مولوی صاحب)، ہمیشہ (ہمیشہ)، کمجور (کمزور)، کھشامد (خوشامد)، ریسم (ریشم)، جمانت (ضمانت)، جامن (ضامن)، مکدما (مقدمہ)، کھارج (خارج)، دسکھت (دستخط)، کواب (کباب)، سادی (شادی)۔

یہ کچھ بول تو یونہی لکھ دیے ہیں۔ سوچ بچار کیا جائے تو اور ایسے سیکڑوں بول کے بول نکل آئیں گے عربی، فارسی کے بگڑے ہوئے کچھ بول ابھی آپ نے سنے اب انہیں بولیوں کے وہ بول بھی دیکھئے جنہیں ان پڑھ سے ان پڑھ گاؤں والے اور گنوار جوں کا توں بولتے ہیں۔

جیسے مکان، دکان، میدان، جان، ران، تکیہ، لتہ، صورت، بدن، گردن، سینہ، پلک، کمر، آدمی، عورت، بچہ، اگر، مگر، کتاب، سردی، گرمی، بادام، ادرک، کام، نام، کمان، تیر، لگام، مال، عینک، گلاب، بہار۔

میرا کہنا یہی ہے یہ اور ایسے اور اور عربی، فارسی کے وہ بول جو اردو میں پورے سما چکے ہیں جنہیں چھوٹے بڑے سب بولتے ہیں انہیں ہاتھ نہ لگائیے۔ ایسے ہی ہندی کے وہ گھلے ملے بول جو سب کی بات چیت میں چلے آرہے ہیں۔ ان سب کو ملا جلا کے اردو کو اور آگے بڑھانے کے نئے نئے ڈھب نکالئے۔ ہند جیسے، ہندو مسلمان سب کا جنم بھوم ہے ایسے ہی اردو بھی ان میں سے کسی ایک کی بھاشا نہیں یہ ان سب کی بھاشا ہے سب کی بھاشا اس لئے کہہ رہا ہوں۔ اردو کے آگے بڑھنے اور پھیلنے کے لئے مسلمان اور ہندو دونوں ساتھ ساتھ اب تک اپنے اپنے جتن کرتے رہے۔

یہ کہہ چکا ہوں ہند کے چپے چپے کی چھوٹی چھوٹی بولیاں ایسی بہت سی ہیں جو دیس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں الگ الگ بولی اور سمجھی جاتی ہیں ان میں دیکھئے اور ڈھونڈئیے تو عربی فارسی بول چھپے چھپائے ملیں گے بل اتنا ہی ہوگا کسی میں بدیسی بولیوں کے بول بہت ہوں گے کسی میں تھوڑے، اور کسی میں بہت تھوڑے۔ دیس کی سب بولیوں کے گنتی ہی کے کچھ کچھ بول یہاں لکھے جائیں تو یہ لکھت بڑھ کے نہ جانے کہاں تک پہنچے۔ اس لئے وہ سب تو نہیں اک مرہٹی بھاشا ہی کے کچھ بول لکھتا ہوں:۔

عربی، فارسی بولوں کی ریل پیل مرہٹی میں

ابین (آئین)، اکل (عقل)، اکھتیار (اختیار)، اکھر (آخر)، اکھیر (اخیر)، بمعانی (بے معنی)، عجب، اجمت (عظمت)، اجماس (آزمائش)، اجار (آزار)، اجاری (آزاری)، اتر (عطر)، عدالت، عداوت، امانت (امانت)، اپھکرا (اجرہ)، اپھوا (افواہ)، آباد (آباد)، ابھاری (عماری)، ابھر (ابر)، عیب، ارکھ (عرق)، ارج (عرض)، الاہیدا (علیحدہ)، اول (اول)، آتس باجی (آتش بازی)، آپ گرجی (خود غرضی)، آمیج (آمیز)، آواج (آواز)، اشک (عشق)، آشک (عاشق)، اشک باج (عشقباز)، اکرار (اقرار)، اکھلاس (اخلاص)، اجت (عزت)، ایجا (ایذا)، اتبار (اعتبار)، اتلا (اطلاع)، انساپھ (انصاف)، انام (انعام)، ارادہ، عنایت، امان (ایمان)، عادت، انگشتان (انگشتانہ)، عالم، آلی سان (عالی شان)، الاکھا (علاقہ)، علاج، علت، عمدہ، عمر، ادا، ادب، ایین، امرا، امیدوار، اولاد۔

مرہٹی کی بات چیت پر اک بھولی ہوئی بات دھیان میں آئی۔ بہت دن ہوئے جو مرہٹی کے اک اناڑی کھلاڑی سے مڈبھیڑ ہوئی۔ اس کا اوڑھنا بچھونا جو تھا وہ مرہٹی اور انگریزی، اور کوئی بھاشا وہ جانتا نہ تھا۔ کچھ لوگ آپس میں کسی بھاشا کے پھیلاؤ پر کچھ کہہ سن رہے تھے۔ مرہٹی کا نیا کھلاڑی جو سب سے الگ بیٹھا تھا۔ یہ بات چیت سن کے نہ رہ سکا اور وہیں سے کڑک کے بولا ہماری بھاشا کا سا پھیلاؤ دیس کی کسی بھاشا میں نہیں۔ چار دن سے اردو جو بڑھ چلی ہے یہ بھی ہماری بھاشا کے بل پر۔ بجلنے مرہٹی نے اردو کی سیوا کی جو اس کے سیکڑوں بول اردو میں آگئے جنہیں اردو والے اپنے یہاں کا سمجھ رہے ہیں۔ وہ بول کون کون سے ہیں اس پوچھنے پر وہ مسکرا کے کہنے لگا۔ ایک دو؟ سیکڑوں ——— یہ کہہ کے اوپر لکھے ہوئے بولوں میں سے کئی بول اس نے سنائے۔ جس پر جاننے والے ہنس پڑے اور وہ ہکا بکا ہو کے ایک ایک کا منہ دیکھنے لگا۔ اس میں ہنسی کی کون سی بات ہے اسی پہ اسے اچنبھا ہوا۔

مظفر پور میں ہندی ساہتیہ سمیلن کے اک بڑے بھاری بھرکم پنڈت نے جو وہاں ——— پڑھ کے سنایا اس کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا یہاں لکھتا ہوں

"ہماری ہندی کے کویوں کویوں کی متی گتی بالکل نرالی ہے۔
وہ کیتا کی گاڑی کے دھرے اور پہیے بھی بدل رہے ہیں۔
اپنے اُدبھُت جھگڑے میں نیچے کی اور مرل تو جو ت کرکنتو پتھ
پر پہنچا یا جاتے ہیں۔ یہ اتنی بہیں منوکھتا کا لکشن ہے۔ اس سے کیتا
کا سدھار نہیں سنگھار ہو رہا ہے۔"

کیا ایسی ہی ان گھڑ بھاشا سارے دیس کی بھاشا بن سکتی ہے؟ کیا ایسی ہی انوکھی بولی پورے دیس میں پھیل سکتی ہے؟ کیا ایسی ہی لکھت کے پرچار پر آپ اڑے ہوئے ہیں۔ کیا ہی سب تیم بھوم والوں کی اکیلی بھاشا بن سکے گی اور کیا اسے ہی سب چھوٹے بڑے بول سکیں گے۔ دیکھئے تو یہ کیسا اودھم مچا ہوا ہے۔ عربی، فارسی کے گھُلے ملے بول جو سب بولتے جانتے ہیں جان جان کے انہیں جھوڑ جھاڑ اور چھانٹ چھانٹ کر کویوں، متی گتی، کیتا، اُدبھُت، گنتو پتھ، منوکھتا، لکشن۔ ان بھونڈے بسرے بولوں کو ٹھونسا گیا ہے۔ باہر والی بولیوں سے کترا کے او نچ بچ کے نکلنے پہ بھی بدیسی بولوں سے یہ لکھت نہ بچ سکی اور گنتی ہی کے سہی پر کئی بول اس میں آ ہی گئے۔ کچھ فلم بنانے والی کمپنیاں بھی اپنے یہاں کے ڈراموں میں ایسی ہی ٹھونس ٹھانس کر رہی ہیں۔ یہ جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے۔ دیس کے ماتھے کے لئے کلنک کا ٹیکا ہے۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی اس نئی اپج کو دیکھ کے نہ رہ سکے اور انہیں یہ کہنا ہی پڑا۔

"یہ زبان کیوں کر کل ملک کی زبان ہونے کا دعوےٰ کر سکتی ہے
اور کوئی مذاق سلیم اور اُردو میں شعور رکھنے والا اردو کو چھوڑ کر
اسے کس طرح اختیار کر سکتا ہے"۔

فارسی کے رسیا بھیم سین کانستھ، پٹن کے ایسری داس، پٹیالے کے سجان رائے، جگ جیون داس، کیول رام اگروال، منشی بھوپت رائے، منشی چندر بھان، اودے رائے، منشی ٹیک چند بہار یہ اور ایسے اور اور ہندوؤں کی فارسی لکھتیں۔ دیکھنے کو آپ سے نہیں کہا جاتا۔ پر وہ نئے پرانے اردو لکھنے والے ہندو جنھوں نے اردو کی ایسی سیوا کی جس پر اتنا لکھا جا سکتا ہے جو لکھتے لکھتے بڑا ۔۔۔ ڈھیر لگ جائے۔ ان کی لکھتوں کو تو دیکھ لیجے۔

پنڈت دیا شنکر نسیم، پنڈت ہنڈولا لال زار، پنڈت رتن ناتھ سرشار، پنڈت نوبت رائے نظر، پنڈت بشن نرائن در آبر، پنڈت برج نرائن چکبست، منشی درگا سہائے سرور، منشی پریم چند، سر تیج بہادر سپرو، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، پنڈت امرناتھ جھا، پنڈت گنگا ناتھ جھا، پنڈت آنند نرائن مُلا، پنڈت کشن پرشاد کول، پنڈت منوہر لال زتشی، مسٹر رگھوپتی سہائے فراق، مسٹر اقبال ورما سحر، مسٹر رام پرشاد کھوسلہ ناشاد، مسٹر کرشن سہائے، مسٹر تلوک چند محروم، مسٹر مہاراج بہادر برق، چودھری جگت موہن لال رواں، پروفیسر سری رام شرما، مسٹر رام دیال سکسینہ، ٹھاکر بے آر رائے، لالہ روشن لال، مسٹر رام سرن نگم، مسٹر سری نرائن نگم، مسٹر دیا نرائن نگم، مسٹر سورج نرائن مہر، مسٹر سدرشن، مسٹر شیام موہن لال جگر۔ یہ سب کے سب ہندو اور پکے ہندو۔ اس پہ بھی ان کی لکھتوں کا ڈھچر ایسا ہے جس میں تویں، متی گتی، کیتا، اودبھت، گنتو پتھ، منوکھتا لکشن، سمپتی، شکتی، رکچھا، نویدن، آشا، دشا، سمبندھ، کلاہل، ویاکرن، ہتوں ایسے ایسے بولوں کا پتا بھی نہیں اور ڈھونڈے سے بھی ایسے کڈھب بول ان میں کہیں نہ مل سکیں گے۔

ان ہندوؤں کی لکھت کا وہی ڈھنگ ہے جو مسلمانوں کا۔ دونوں میں بال بھر ال بل نہیں اور ال بل ہو کیسے جب ہندو مسلمانوں نے مل جل کے اب تک اردو کو یہاں تک سدھارا جو راج کے بل پر بڑھنے والی بولیوں کے لگ بھگ، دکھائی دینے لگی۔ اب تک پہلا سا نہ سہی اسی اردو کے بولنے چالنے ہی میں تھوڑا بہت جو بھی ہے۔ ہے تو ایکا یہی ایکا آگے رہے کہ جب منت سیدھی ہوگی تو پورا بھی ہو سکتا ہے اور جو یہ تھوڑا بھی نہ رہا تو پھر رہا کیا۔ اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ۔

ہند ماتا کا گہنا پاتا جو بھی تھا ایک ایک کرکے سب کا سب کب کا لٹ لٹا چکا اور آئے دن کی نوچ کھسوٹ اور لوٹم لاٹ نے ایک چھلا بھی نہ چھوڑا۔ لے دے کے یہی اردو ہندو مسلمانوں کے ملاپ کی اک پرانی انگوٹھی دیس کے ہاتھ میں پڑی رہ گئی تھی۔ آج کل اس کی بھی چھینا جھپٹی ہو رہی ہے اور دیس کی انگلی سے اسے بھی اتارنے کے جتن کئے جا رہے ہیں۔ یہ پرانی انگوٹھی بھی چھن گئی تو پھر کیا ہوگا یہ آپ سوچئے۔

اُردو کو مسلمانوں کے دھرم کی بھاشا آپ کہہ چکے ہیں اس لئے یہ ڈر لگتا ہے کہیں اس بات چیت سے آپ یہ نہ سمجھ لیں۔ اپنی بھاشا کی پرچک لی جا رہی ہے اور اس کے بچاؤ کے لئے یہ باتیں بنائی جا رہی ہیں۔ کسی کے دھیان پر روک ٹوک کیسے ہو سکتی ہے جس کا جو جی چاہے سمجھے۔ پر سچی بات تو یہ ہے دیس کے لئے یہ باتیں چھیڑنا پڑیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں۔ دیس کے منہ پہ کیسی جھریاں پڑتی چلی جا رہی ہیں یہ کیسا

نڈھال ہوتا جارہا ہے تہا دھاپلی کے کیسے جھگڑے چل رہے ہیں۔ ایسا اندھیارا ہے جو آنکھیں کھولنا دوبھر ہو گیا ہے۔ دیس کے اندھیرے گھپ میں بگاڑ کا لمبا بڑا کالا بھوت ہاتھ پھیلائے، دانت نکالے کھڑا ہنس رہا ہے۔ اس کے پرچھاویں سے یہاں والے سڑی بن کے آپس میں لڑتے مرتے ہیں۔ کوئی بڑا منتر پڑھنے والا ایسا منتر پڑھے اور ٹونا کرے جس سے دیس پر سے یہ بھوت اتر جائے، اور بھوت اتر جانے سے یہاں کے ساتھ رہنے بسنے والوں کی ایسی آنکھیں کھلیں جو سب مل ملا کے سانس لینے کے بہ ڈھائی۔ ان آپس میں جس لوں کے کاٹ دیں۔ بھوت اتارنا ہنسی کھیل نہیں اس کے لئے بڑی پڑھنت پھونک چاہئے جسے آپ ہی کر سکتے ہیں۔

یہی اردو تو اب بہ سننے مٹانے کے جوکھوں سے نکل چکی، اس کا پودا اب پودا نہیں۔ جو لو کے تھپیڑوں اور ہمند کی سے جھلس اور ٹھٹھر کے رہ جائے۔ یہ پودا پیڑ بنا اور بن رہا ہے اس کی جڑیں آگے تک پھیلیں اور پھل رہی ہیں۔ اس کی بڑی بڑی ڈالیاں، موٹے موٹے ٹہنے اور ہری بھری ٹہنیوں سے موٹی پتلی اور اور ـــــ ٹہنیاں نکل نکل کے ان میں نئی نئی کونپلیں پھوٹتی چلی جارہی ہیں۔ اس کا تو اب کچھ ڈر ہی نہیں۔ اس میں اک یہی بات دیکھنے کی ہے جس دھندے کو سب اب تک مل جل کے کر رہے تھے۔ اب ان میں پھوٹ پڑنے اور الگ تھلگ ہو جانے سے ایک ہی جتھے کو وہ پورا بوجھ اٹھانا پڑے گا۔ جسے پہلے سب مل ملا کے اٹھا رہے تھے۔ اس سے بڑھتی ہوئی چال دھیمی پڑ جائے گی اور پہلی سی پھرتی نہیں رہے گی۔ پہلے جو بات دنوں میں پوری ہوتی تھی وہ اب مہینوں پہ جا پڑے گی۔ پر نمٹے تو یہ دکھائی دیتا ہے۔ پورے ہندو بھی کبھی اپنی اردو کو چھوڑ نہیں سکتے اور اپنے بڑے بوڑھوں کے گاڑھے پسینے سے سینچی ہوئی اس ہری بھری کھیتی سے کبھی ہاتھ نہیں اٹھا سکتے۔

مہاتما جی۔ دیکھئے تو آپ کی اردو کسی بھاشا سے بھی ہیٹی اور دبتی ہوئی نہیں۔ یہی باتیں وہی گھاتیں ایک ایک کر کے اس میں دیکھ لیجے تو نئی بھاشا کی جگہ اپنی اسی اردو کو ایسے ہی آگے بڑھائیے نا جیسے آج تک ہندو مسلمان سب مل جل کے اسے بڑھاتے اور سدھارتے چلے آئے۔

اس کے پرچار کے لئے پہلے ایسی ریڈریں لکھوائی جائیں جن میں عربی، فارسی، ہندی ان سب کے وہی گھلے ملے بول ہوں جنھیں سب بولتے ہیں۔ جیسے عربی، فارسی کے کڈھب بول ان میں جگہ نہ پا سکیں ایسے ہی ہندی کے بھوبے بسرے بول بھی ان میں کہیں نہ آنے پائیں اسی بات میں آگے بڑھ کے یہ دیکھ بھال بھی کرنا پڑے گی ماردو کے پھیلاؤ اور بڑھانے کے لئے کہاں کہاں سے، اور کون کون سے بول چنے جائیں یہ گتھی ایسے لوگوں کے اکٹھا کرنے سے سلجھ سکتی ہے جو بھاشا کی بناوٹ اس کا اتار چڑھاؤ، لوچ، گھلاوٹ اور بولوں کی ناپ تول، ان کا بھدا پن، ہلکا پن یہ اور ایسی اور اور باتوں کو پرکھ سکتے ہوں۔

جیسی جگہ ہو ویسے ہی چن چنا کے وہاں بولوں کا جڑنا اور بٹھانا جانتے ہوں۔ سب لوگ بھاشا کا ست لڑا نہیں بنا سکتے۔ بڑی ہی بڑی سبھاہیں سے بھی چھانٹئے گا تو ایسے لوگ کچھ ہی نکلیں گے۔ عربی، فارسی، ہندی ان میں سے نئے بول جس کے بھی ہوں پورے سوچ بچار سے جانچ جانچ کے ان کا چنا اور انہیں اپنی اپنی جگہ ایسا جمانا جو وہ پھر نہ اکھڑ سکیں۔ ایسے ڈھب انہیں لوگوں کو آتے ہیں جو بھاشا کے پورے بھید جانتے ہوں۔ ایسے لوگوں کی دیکھ بھال سے یہ ریڈریں ایسی لکھی جائیں گی جن میں نہ بھاری بھاری عربی، فارسی کے بول ہوں گے اور نہ ہندی کے بھوبے بسرے بھد پھسلے بول۔ ان میں نہ مولویوں، ملاؤں کے ان گھڑ بول دکھائی دیں گے اور نہ پنڈتوں کے کٹھن اور کڈھب بول۔ ان میں نہ ٹھیٹ ملا پن ہوگا اور نہ ٹھیٹ پنڈت پن۔ یہ ریڈریں ٹھیٹ مولویوں اور ٹھیٹ پنڈتوں کی لکھتوں سے الگ ہوں گی۔

ان کے لکھنے کا ڈھب ایسا سمویا ہوا، موتی سا چمکتا، میٹھا پانی ہوگا جس میں بھوبے بسرے بولوں کی ٹھونس ٹھانس کا کوڑا کرکٹ اور گدلا پن کچھ بھی نہ رہ سکے گا اور یہ سوجھ بوجھ بڑھانے والا امرت جل آنکھوں سے پیا جائے گا۔ جس سے من ڈھلتے ڈھلتے چمک اٹھیں گے اور آنے والی پود پہلے ہی سے یہ پریم جل پی کے سمجھ کی پوری آنکھ کھلنے تک ایسے ستھرے من کی ہو جائے گی جسے پھرتی سے آگے بڑھنے اور دیس کے سنبھالنے میں کوئی رکاوٹ ہی نہ رہے گی۔

پہلے ہی سے عربی، فارسی، ہندی ان سب کے ملواں بول ساتھ ساتھ پڑھنے لکھنے سے پھوٹ ڈالنے والا یہ دھیان کبھی بھولے سے بھی پھر کسی کو نہ آئے گا۔ اس لکھت میں بدیسی بولیوں کے اتنے بول ہیں اور ہندی کے اتنے۔ ان میں سے انہیں چھوڑ کر انہیں چن لینا چاہئے۔ سب بولوں کو ساتھ ساتھ دیکھتے دیکھتے اور پڑھتے پڑھتے ان سب کا پیار، پریم جی میں جڑ پکڑتا چلا جائے گا اور سب اسی اردو کو اپنی بھاشا سمجھیں گے اور اس کے اور اور

بناؤ سنگھار کے لئے سوچ سوچ کے نئے ڈھب نکالتے رہیں گے تو اس جتن سے **بھاشا الگ پھلے پھولے گی اور آج کل کی سی چھیڑ چھاڑ جس سے دیس کو گھن لگتا** جا رہا ہے یہ بات بھی پھر نہ رہے گی۔ سانپ مرے اور لاٹھی نہ ٹوٹے اس کہاوت کو سچا کر کے دکھا دیجئے اور جو اوپر لکھا جا چکا اس کا پرچار ایسا کیجئے جس سے گھڑی گھڑی کے جھگڑے ٹنٹے کا سانپ بھی مر کے رہ جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹنے پائے۔

بھاشا کے لکھنے کا ڈھنگ کون سا رکھنا چاہئے۔ یہ بھی اک بڑی اُلجھی ہوئی گتھی ہے۔ اس پر بھی یہیں لکھنا چاہتا تھا پر اس لئے چھوڑتا ہوں ایک تو یہ بات کٹھن ہے اور اس کے کٹھن ہونے سے بہت پھیلانا پڑے گا۔ دوسرے یہاں تک جو کچھ لکھا جا چکا ابھی یہ بھی دیکھنا ہے اسے دیکھ کے آپ کتنے کیا ہیں۔ یہ باتیں آپ نے کان دھر کے سن لیں تو پھر کبھی اس پر بھی جو جو باتیں دھیان میں ہیں ایک ایک کر کے سب لکھوں گا اور بتاؤں گا اس کے لئے کیا کرنا چاہئے۔

یہاں تک ادھ کٹے بولوں میں جو بھی کہا جا چکا۔ ٹھنڈے جی سے اسے آپ نے سُنا اور سوچ بچار کی آنکھوں سے دیکھا تو سمجھوں گا یہ لکھت ٹھکانے لگی اور جو یوں ہی دیکھ دکھا کے ڈال دیا تو بات آئی گئی ہوئی۔ اچھا چلتے چلتے یہ ایک بات اور سُن لیجئے:۔

اب تک میں نے جو بھی کہا اُسے آپ نہیں سنتے اور نہیں مانتے۔ نہ سنئے اور نہ مانئے۔ عربی فارسی بولوں کو آپ ہاتھ لگانا نہیں چاہتے۔ نہ لگایئے۔ ان بدیسی بولیوں کے بول آپ نہیں دیکھ سکتے نہ سہی۔ اچھا ٹھیٹ اردو لکھنے کا یہی ڈھب جو آپ کے سامنے ہے اسی کو برتئے اور اس کا پرچار کیجئے۔ عربی فارسی بول جن سے آپ کو چڑ ہے دیکھ لیجئے اس میں ان کا پتا بھی نہیں تو پھر کیوں، ستی گتی، کیتا، اُدبُھت، گنت تپھ، منو مکمنا، کلشن، کرتویہ، ساہتیہ، سوبھاؤ، سیمئے، جیونا، آشا، ونشا، شکتی، شنکشا، سمبندھ، ایکتا، ہتوں، ابھیاس، دشے، شبد، رکھا، نشچئے، کلاپ، ویاکرن، اودئے، راج نیتی۔ ایسے ایسے بھوسے بھرے بولوں کی ٹھونس ٹھانس سے نئی بولی بنانے کی کھکیڑیں اٹھانے سے کیا یہ اچھا نہیں جو آپ اسی ٹھیٹ اردو لکھت کے پرچار کی حامی بھریں اور اسی کو پھیلائیں اور اسی کو آگے بڑھائیں۔

آپ سے باتیں کرنا تھیں اور آپ کو بدیسی بولیوں سے چڑ تو پھر لکھنے کا یہ ڈھب نہ رکھتا تو کیا کرتا عربی، فارسی، ہندی بولوں کو سمو کے لکھتا جیسے لکھا کرتا ہوں تو اس کے مدھ بول بھی آپ نہ دیکھتے۔

اسے دیکھ بھال کے یہ جو سچی بات آپ کو دکھائی دے۔ وہ آپ لکھ بھیجیں۔ پرماتما کرے آپ آنند ہوں۔

سید ابوالقاسم سررشتہ دار التراجم
حیدرآباد دکن

غزل

تو وہ عہدِ رفتہ کی یاد ہے کہ نہ جس کو دل سے بھلا سکوں
میں وہ بھولا بسرا سا خواب ہوں کہ کسی کو یاد نہ آ سکوں

کوئی پوچھتا ہے جو حالِ دل تو میں سوچتا ہوں کہ کیا کہوں
ترا احترام ہے اس قدر کہ زبان تک نہ ہلا سکوں

یہ تری جفا کی ہے انتہا کہ تو مجھ کو یاد نہ کر سکے
یہ مری وفا کا کمال ہے کہ نہ تجھ کو دل سے بھلا سکوں

مرے جذبِ عشق کو کیا ہوا، وہ کہاں گئی کششِ وفا
مجھے کوئی یاد کرے گا کیا جو تمہیں کو یاد نہ آ سکوں

حفیظ ہوشیارپوری
ایم اے

دخت کُش

دخترِ مادرِ ہندی ہے زبانِ اُردو — "دُخت کُش" اس کی تباہی کے اٹھاتے ہیں سوال
یہ دکن میں ہوئی پیدا تو پلی دِلّی میں — لکھنؤ میں ہوئی دوشیزۂ سلمائے جمال
کچھ دنوں خطۂ دلچسپِ اودھ میں ٹھہری — اور پنجاب میں پہنچی بہ سرِ اوجِ کمال
یعنی پنجاب میں اک پریم کا ساگر بن کر — گوشہ گوشہ کو دیا مژدۂ احساسِ وصال
سنسکرت اس کی ہے دادی تو ہے پوتی اردو — باعثِ حسن ہیں ایران و عرب کے خد و خال (اتحاد)
لوچ الفاظ میں، لہجے میں نزاکت آئی — کھو دیا فیضِ فصاحت نے ثقالت کا وبال
سعیٔ مشاطۂ معنیٰ نے سنوارا ہے مگر — وہی عفت وہی عصمت وہی قد ہے وہی چال
نہیں پہچان کچھ اپنوں کی بھی ہٹ دھرموں کو — وائے بر ضعفِ بصر ہائے تعقل کا زوال
سچ ہے یہ قول کہ اردو کی فنا "ممکن" ہے — مگر ایسے بھی ہیں "ممکن" کہ جو ہوتے ہیں محال
ہے یہ جاں دادۂ اردو کی زباں پر جاری — "دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال

ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا"

شاد عارفی

ایک فراموش شدہ باغ کو دیکھ کر

(سانیٹ)

یہیں پر اُس کو میں نے کھیلتے دیکھا تھا پھولوں میں
فرشتے جس طرح فردوس کی رنگیں بہاروں میں
ادائے بے خودی سے کھیلتے ہیں مرغزاروں میں
وہ جھُولے جھولتی تھی چاند کی کرنوں کے جھولوں میں
فضائے قدس اب تک اس کے نورانی تبسم سے
محبت سے بھرے دل کی طرح معمور رہتی ہے
سرود و کیف کی اک نہر سی دنیا میں بہتی ہے
متاعِ دلبری سے سرمدی کیفِ ترنم سے
فضا میں اب بھی اُس کے آسمانی گیت رقصاں ہیں
جو اُس نے کہکشاں کے نغمہ زاروں میں بکھیرے تھے
جو غلماتوں کے قدسی لالہ زاروں میں بکھیرے تھے
ہواؤں میں ابھی تک ایک شعلہ بن کے پرّاں ہیں
مرے دل کو ابھی تک اُس کی بو آتی ہے پھولوں سے
جواں ہو کر مری ہر آرزو آتی ہے پھولوں سے

تابش صدیقی

گڑیا

"مجھے ایک گڑیا چاہئے" عورت نے کہا اور دکاندار نے اس کی ظاہری حالت سے اندازہ لگا کر کتنی قیمت ادا کر سکتی ہے اسے دو شلنگ کی ایک گڑیا دکھائی۔

یقیناً مس مورڈنٹ امیر نہ تھی اور اس کے لباس سے بھی اسے کوئی امیر نہیں کہہ سکتا تھا اس کے کپڑے بہت معمولی تھے۔ صرف اس کی آنکھیں خوبصورت تھیں اور بال کالے اور لمبے تھے جن کی وجہ سے اس کے بہت سے عیب ڈھک جاتے تھے بجائے بالوں کو کاٹنے کے وہ جوڑا باندھا کرتی تھی۔ اس کی عمر تینتیس سال کی تھی اور وہ ایک ہفتے میں تیئیس شلنگ کماتی تھی

مگر دو شلنگ کی گڑیا اس کو پسند نہیں آئی۔ "یہ گڑیا تو کچھ اچھی نہیں ہے" اس نے منہ بنا کر کہا۔

"اگر آپ کو یہ پسند نہیں تو میں دوسری دکھلائے دیتا ہوں" دکاندار نے کہا مس مورڈنٹ نے گڑیا کو ہاتھ میں لے کر اس کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ مگر وہ اُسے پسند نہیں آئی۔

"یہ تو . . . " اس نے کہا "یہ تو لڑکی کو پسند نہیں آئے گی۔ اسے اس سے بڑی گڑیا چاہئے" وہ یوں بات کرتے کرتے اس لئے رکی کہ اسے دھوکا دینا نہیں آتا تھا۔ واقعہ یہ تھا کہ گڑیا کی ضرورت کسی چھوٹی سی لڑکی کو نہ تھی اور اسی لئے وہ جھوٹ بولتے ہوئے گھبرا سی گئی۔

آخر میں مس مورڈنٹ نے (جو ہفتے میں تیئیس شلنگ کماتی تھی) آٹھ شلنگ کی گڑیا خریدی۔

"بڑی خوب صورت گڑیا ہے" دکاندار نے اسے کاغذ میں لپیٹتے ہوئے کہا اور اس کو ڈبے میں بند کر دیا "اس سے کھیلنے میں یقیناً بچی کو بہت لطف آئے گا" ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اسے دینا نہیں چاہتا۔ بعد میں دکان دار نے بہت سے دوسرے قسم کے کھلونے دکھائے۔ مگر مس مورڈنٹ نے کہا کہ اسے اور کچھ نہیں چاہئے۔

وہ گڑیا کے ڈبے کو لے کر دکان سے نکلی۔ ڈبے میں اٹھانے کے لئے ڈوری کا پھندا لگا ہوا تھا۔ مگر مس مورڈنٹ نے بجائے اس پھندے کو پکڑنے کے ڈبے کو احتیاط سے بغل میں دبا لیا۔

سڑک پر آج غیر معمولی طور پر بہت شور تھا موٹر کے ہارن سائیکلوں کے غل غپاڑے سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی کوچوان نے ایک کتے کو چابک مارا۔ اُس نے چیخ چیخ کر سارے بازار کو سر پر اٹھا لیا۔ اخبار بیچنے والوں نے الگ شور مچا رکھا تھا۔ اس شور میں جو کچھ مس مورڈانٹ نے گڑیا سے کہا کوئی نہ سن سکا۔ "تمہارا گھر اب بہت دور نہیں ہے" اس نے کہا۔

مگر وہ پاگل نہ تھی۔ اگر وہ پاگل ہوتی تو اتنے بڑے دفتر میں تیئیس شلنگ فی ہفتہ کس طرح کما سکتی تھی۔ جب وہ پہلے نوکر ہوئی ہے تو اسے صرف اٹھارہ شلنگ ملتے تھے۔ صرف چار سال میں اس نے اتنی ترقی کر لی تھی۔ وہاں کے مینجر کا خیال تھا کہ وہ اپنے فرائض سے زیادہ کام کرتی ہے۔ مسٹر فورٹ جو دفتر کا حساب کتاب رکھتا تھا اس کا خیال تھا کہ مس مورڈانٹ ذرا تیز مزاج ہے۔ بوڑھی عورت جو دفتر صاف کرنے پر مقرر تھی سمجھتی تھی کہ وہ بہت با اخلاق عورت ہے اور چپراسی کا خیال تھا کہ ضرورت سے زیادہ شرمیلی ہے اور ایسے ہی آدمی کو پسند کرتی ہے۔ اس طرح ایک ہی شخصیت کے متعلق لوگوں کے مختلف خیالات تھے۔ مگر یہ تو سب جانتے تھے کہ مس مورڈنٹ پاگل نہیں ہے۔

لیکن سوال یہ تھا کہ جب وہ پاگل نہ تھی تو اس نے اپنے لئے آٹھ شلنگ کی گڑیا کیوں خریدی!

وہ عورت تھی۔ صرف قسمت کے پھیر نے اسے کام کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ بالکل اکیلی تھی اس نے اب تک شادی نہیں کی تھی۔ اس کے عورت ہونے ہی نے اسے گڑیا خریدنے پر مجبور کیا۔ ایسی عورتیں انہیں کاموں کو قربانی اور بہادری کے کام سمجھتی ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ ایک

کم معاش عورت کا آدھ شلنگ کی گڑیا خریدنا واقعی بہت بڑی قربانی کہلانے کا مستحق تھا۔ ایک چھوٹی سی گلی میں اس نے دو کمرے کرائے پر لے رکھے تھے۔ ان کمروں سے ملا ہوا بالکل چھوٹا سا ایک باورچی خانہ تھا۔ اس کا فرنیچر بہت معمولی تھا مگر صاف ستھرا۔ اسے ان دو کمروں میں بہت آرام ملتا تھا

گھر پہنچ کر اس نے گڑیا کو ڈبے میں سے نکالا اسے پیار کیا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگی "تھوڑی دیر یہیں ٹھیرو میری ، دیکھو شرارتیں مت کرنا!"

اس نے ڈبے کو الماری پر رکھ دیا جہاں وہ ردی کے ڈبے رکھتی تھی کہ شاید کبھی کام آجائیں۔ پھر وہ باورچی خانے میں جاکر کھانا پکانے لگی۔ میری اس کے کہنے کے مطابق چپ چاپ بیٹھی سب دیکھتی رہی۔ مس مورڈنٹ کھانا پکاتے ہوئے اس سے باتیں کرتی رہی

"ان ڈبوں کی قید سے تو یہ گھر اچھا ہے نا؟ تمہیں معلوم بھی ہے میں کھانا کھانے کے بعد کیا کرنے والی ہوں؟ میں تمہارے لئے سفید ریشم کا فراک سیوں گی۔ پھر تم شہزادیوں کی طرح خوبصورت معلوم ہوگی۔ تم اپنی اماں کے پلنگ کے پاس چھوٹے سے پلنگ پر سونا!"

مس مورڈنٹ خاموش طبیعت کی عورت تھی اتنے لمبے اور اتنے خوبصورت فقرے تو اس نے عمر بھر نہیں بولے ہوں گے۔ اگر کبھی ٹائپ کرتے کرتے مشین میں خرابی پڑ جاتی تھی تو وہ بالکل مختصر طور پر اس کی خرابی بیان کر دیا کرتی تھی۔ مس مورڈنٹ کے اس مختصر سے فقرے پر مسٹر فورٹ کو اکثر ہنسی آجایا کرتی تھی اور اسے مسٹر فورٹ کی بے جا ہنسی پر غصہ آجایا کرتا تھا۔ مگر کمرہ صاف کرنے والی عورت سے اس کا ذکر کرنے کے سوا اس نے مسٹر فورٹ سے کبھی خفگی کا اظہار بھی نہیں کیا تھا۔

فراک سیتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ میری سے باتیں کر رہی تھی۔ "اب تک میں بالکل اکیلی تھی گو میری بہت سی سہیلیاں ہیں مگر مجھے ایک چھوٹی سی لڑکی کی ضرورت تھی جو میرے ساتھ ہمیشہ رہے۔ میں کتا خرید لیتی مگر مشکل یہ ہے کہ میرے دفتر جانے کے بعد کتے کی حفاظت کون کرتا۔ میری چھوٹی سی بچی کتوں سے بہتر ہے!"

خوش قسمتی سے میری کی آنکھوں سے یہ ظاہر ہوتا رہتا تھا کہ وہ ہر وقت ہنستی رہتی ہے۔ مگر لٹانے سے اس کی آنکھیں بند ہو جاتی تھیں اور یہ خوشی

غائب ہو جاتی تھی۔ مس مورڈنٹ اس سے کہہ رہی تھی کہ وہ گھر میں دکان کے مقابلے میں زیادہ خوش رہے گی۔ وہ کچھ اور کہنے والی ہی تھی کہ اس کے پڑوس سے پیانو کی ہلکی سی آواز آئی جس نے ان کی گفتگو کو تھوڑی دیر کے لئے روک دیا۔ اس نے پھر کہنا شروع کیا۔

"ہاں دیکھو معلوم ہوتا ہے کہ ساتھ والے کمرے بھی کسی نے کرائے پر لے لئے ہیں اور وہ عورت آج اس میں آگئی ہے۔ اس پیانو کے متعلق اس سے بات چیت کرنی پڑے گی۔ وہ بجاتی تو اچھا ہے مگر اس کے لئے مقررہ اوقات ہونے چاہئیں یہ ہر وقت کی ریں ریں تو ذرا تکلیف دہ ہے اگر یہ اس طرح شور مچاتی رہی تو میں عورتوں کی ادبی مجلس کا جلسہ کس طرح کر سکوں گی۔ سارا دن کام کرنے کے بعد میں آدھی رات تک اس پیانو کے شور کی وجہ سے جاگنا نہیں چاہتی کل دفتر جانے سے پہلے ان بیگم صاحبہ سے ضرور ملوں گی۔ اچھا اب تم یہ فراک پہن کر دیکھو اس میں کیسی لگتی ہو!"

لیکن وہ فراک پہنانے ہی والی تھی کہ دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ اس نے جلدی سے گڑیا کو اور ان کپڑوں کو سونے کے کمرے میں ڈالا اور مس سٹیفرڈ کے لئے دروازہ کھول دیا۔

مس سٹیفرڈ دبلی پتلی سیدھی سادھی عورت تھی اور حفظانِ صحت کے قواعدوں کا بہت خیال رکھتی تھی۔ سوائے سگرٹ پینے کے وہ کوئی کام صحت کے اصولوں کے خلاف نہیں کرتی تھی۔

"تم اچھی تو ہو۔ کل شام عورتوں کی ادبی مجلس کے جلسے میں کیوں نہیں آئیں؟ میں سمجھی شاید طبیعت اچھی نہ ہوگی!"

"میں بہت تھک گئی تھی اس لئے آنے کو جی نہیں چاہا!" مس مورڈنٹ نے کہا۔

"فضول گو اس" مس سٹیفرڈ نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "جب تک تم یہ نہ سوچو کہ تم تھکی ہوئی ہو تم تھکان محسوس کر ہی نہیں سکتیں۔ اسی طرح بعض آدمی اپنے آپ کو کاہل بنا لیتے ہیں۔ خیر اب کے اس میں کچھ خاص بات نہیں تھی مارگرٹ جیکسن کو اپنی عادت کے مطابق غصہ آگیا اور اس نے تمہارے متعلق بھی کچھ کہا۔"

"سچ مچ! اس نے کیا کہا؟" مس مورڈنٹ نے گھبرا کر پوچھا۔

"کیا تم مسٹر فورٹ سے شادی کرنے والی ہو؟" مس سٹیفرڈ نے سوال کیا۔

"نہیں ہرگز نہیں! ایسا کبھی نہیں ہو سکتا!"

مارگرٹ جیکسن نے سنا ہے کہ آج کل مسٹر فورٹ کم سے بہت خوش ہیں۔"

"تو کل تک وہ اپنا خیال بدل لیں گے۔"

"بہت خوب!" مس سٹیفرڈ نے سگرٹ کی راکھ گراتے ہوئے کہا۔ "یہ عمر شادی کرنے کی نہیں ہے۔ اگر ساری دنیا کی لڑکیاں میرے کہنے پر چلیں تو ہم بہت جلدی مردوں کے پھندے سے آزاد ہو سکتے ہیں۔"

مس مورڈنٹ خاموش ہو گئی۔ اس کا خیال تھا کہ مسٹر فورٹ بے وقوف آدمی ہے۔ اسے یہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ وہ آج کل بہت اکیلی ہے۔ ایک دم سے پیانو کی آواز نے اسے گھبرا دیا۔

"کتنا شور ہے" مس سٹیفرڈ نے کہا۔

"ہاں اس عورت کے پیانو نے میرا بھی ناک میں دم کر دیا ہے۔ میں کل اس سے اس کے متعلق بات چیت کروں گی۔ اس کمرے میں بیٹھ کر باتیں کرنا مشکل ہو گیا ہے۔"

مس سٹیفرڈ نے یاد دلایا کہ اس ہفتے عورتوں کی ادبی مجلس کا جلسہ اس کے ہاں ہوگا اور خدا حافظ کہہ کر چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد مس مورڈنٹ نے نیا فراک گڑیا کو پہنایا۔ گریبان میں ذرا خرابی تھی اسے ٹھیک کیا اور گڑیا کو اپنے ساتھ پلنگ پر سلا لیا۔

دوسرے دن صبح کو چائے پینے کے بعد مس مورڈنٹ اپنی ہمسائی کے پاس گئی تاکہ اسے آہستہ سے سمجھا دے کہ ہر ایک کام کا ایک وقت ہونا چاہیئے یہ ہر وقت کا باجا ذرا تکلیف دہ ہے۔

اس نے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا اور جب دروازہ کھلا تو اسے بڑا اچنبھا ہوا۔ کیونکہ کمرے میں عورت نہیں تھی بلکہ ایک مرد تھا۔ گفتگو سے معلوم ہوا کہ یہ شخص گویا ہے۔ غصیلا ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ اس کے بات کہنے کا ڈھنگ بہت دلچسپ تھا مگر اس کی عادتیں ضدی بچوں کی سی تھیں۔ اس کا نام مسٹر سمتھ تھا۔

ابھی مس مورڈنٹ نے دو فقرے ہی کہے ہوں گے کہ اس نے اس کا مطلب بھانپ لیا۔

اس نے مس مورڈنٹ کو گھور کر دیکھا اور سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر کہنے لگا "میں کیا کروں! آپ ہی بتائیے میں کیا کر سکتا ہوں! میں جتنے گھروں سے نکالا گیا ہوں شاید ہی کوئی اور نکالا گیا ہوگا۔ میرے ہمسایوں نے ہمیشہ مجھ سے یہی شکایت کی۔ اب میں نے سوچا تھا کہ اس مصیبت سے نجات مل گئی۔ پیانو بجانے میں کوئی وقت کی پابندی نہیں کرتا۔ آج تک کسی نے نہیں کی۔ ابھی میں نے ناشتا بھی ختم نہیں کیا کہ آپ نے آکر کہنا شروع کر دیا پیانو جلا دو، جہنم میں جاؤ۔"

مس مورڈنٹ نے بہ مشکل تمام اپنی ہنسی روکی اور کہا "میرا مطلب یہ نہیں ہے بلکہ میں نے یہ کہا تھا کہ آپ صبح چھ بجے سے لے کر شام کے دس بجے تک بجا سکتے ہیں۔ ہاں بعض دنوں میں میں آپ کو شام کے چھ بجے با جا بند کر دینے کو کہہ دوں گی۔"

مسٹر سمتھ نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور کہا "ذرا ٹھیرو۔" پھر کہنے لگا "جانے جناب۔ میں اتنی باتیں کیسے یاد رکھ سکتا ہوں! میں صبح چھ بجے نہیں اٹھتا اور رات کو چھ بجے تک بہت کم جاگتا ہوں۔ یہ ضرور ہے کہ اگر اپنے نزدیک مکان ہوں تو بہت سی باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔" مس مورڈنٹ ذرا گھبرا گئی کیونکہ وہ خود یہی کہنے والی تھی۔ پھر مسٹر سمتھ نے کہنا شروع کیا "میں نے آج تک کسی کی شکایت نہیں کی۔ اوپر کی منزل میں ایک عورت ہے وہ سارا دن مشین چلا چلا کر اتنا شور مچاتی ہے کہ ایک منٹ آرام نہیں ملتا۔ مگر میں آج تک آپ کی طرح چیختا چلاتا اس کے پاس نہیں گیا کہ مہربانی کر کے مشین چلانی بند کر دو۔"

مس مورڈنٹ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ نہ تو وہ چیخی نہ چلائی نہ اس سے پیانو جلانے کو کہا۔ مگر اسے صبح جلدی اٹھنا پڑتا ہے کہ دفتر جانے سے پہلے گھر کا کام کرے۔ اس لئے . . . .

"آپ نے خوب یاد دلایا" مسٹر سمتھ نے چلا کر کہا۔ اس طرح بات کاٹنا بہت بدتمیزی کی بات تھی مگر بچاری مس مورڈنٹ کیا کر سکتی تھی۔ "کیا آپ مجھے کسی ایسی بڑھیا کا پتہ بتا سکتی ہیں جو روز صبح شام آکر میرے گھر کا کام کاج کر جایا کرے؟"

"ہاں ممکن تو ہے" مس مورڈنٹ نے کہا "مگر میں آپ سے یہ کہنے نہیں آئی تھی۔"

پھر اس نے سمجھایا کہ وہ کیا چاہتی ہے اور مسٹر سمتھ نے کہا کہ وہ وقت کی پابندی کرنے کی کوشش کرے گا مگر وعدہ نہیں کرتا اور ساتھ ہی اس نے مس مورڈنٹ سے کہہ دیا کہ ما ما بھیجنا نہیں بھولنا۔ اس نے جلدی سے مسٹر سمتھ کو خدا حافظ کہا کیونکہ اسے فکر تھا کہ کہیں دفتر سے دیر نہ ہو جائے۔ وہاں جا

اس نے تھوڑی دیر مسز فاگ سے باتیں کیں جو دفتر میں جھاڑو دیا کرتی تھی۔
مسز فاگ نے کہا "ہاں اگر ان کو میرا کام پسند آجائے گا تو میں بھی کرنے کو تیار رہوں۔ اچھا تو یہ بتائیں وہ کیسے آدمی ہیں؟"

"خاصے اچھے آدمی ہیں۔"

"اچھا کل صبح میں خود جا کر دیکھ لوں گی کہ وہ کیسے آدمی ہیں۔ میں کہہ دوں گی کہ آپ نے بھیجا ہے۔"

مس مورڈنٹ آج ضرورت سے زیادہ خوش تھی اور اُس نے اس دن مسٹر فورٹ سے بھی بہت ہنس ہنس کر باتیں کیں۔ مسٹر فورٹ اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ اس کا خیال تھا کہ وہ اچھی عورت ہے۔ صورت شکل کی بھی اچھی ہے عقلمند بھی ہے مگر مزاج کی ذرا تیز ہے۔ مگر یہ کوئی خرابی نہ تھی وہ اس کو نظر انداز کر سکتا تھا اور کچھ روز سے مس مورڈنٹ کو غصہ بھی نہیں آرہا تھا۔

آج مسٹر فورٹ نے جو یہ رنگ دیکھا تو اپنا خیال ذرا بدل دیا اور ذرا بے تکلفی سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگا۔ یہ دیکھ کر پھر مس مورڈنٹ نے اپنا پرانا رویہ اختیار کر لیا۔ اس نے مسٹر فورٹ کی ہر ایک بات کا بہت مختصر سا جواب دیا۔ مگر وہ اسی سے خوش ہو گیا۔ اس نے شام کو اپنے ایک دوست سے کہا کہ عورتیں بھی عجیب قسم کی جانور ہیں گھڑی میں خوش گھڑی میں ناخوش۔

گھر واپس آکر جیسے ہی مس مورڈنٹ نے سیڑھیوں پر قدم رکھا باجے کی سریلی آواز نے اس کا استقبال کیا۔ مسٹر سمتھ کی آواز بہت اچھی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ اسے گانے کی کافی مشق ہے۔ مس مورڈنٹ کو اس وقت گانا سننے کا شوق ہو رہا تھا مگر جیسے ہی اس نے دروازہ بند کیا گانا ایک دم رک گیا۔ وہ میری سے باتیں کرنے لگی جس طرح مس مورڈنٹ اسے صبح کو بٹھا کر گئی تھی وہ اب بھی اسی طرح گدیلوں میں دبکی ہوئی بیٹھی تھی اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس کے آنے سے خوش ہو کر مسکرا رہی ہے۔

مس مورڈنٹ نے کہا "میری بہت اچھی لڑکی ہے بالکل شرارت نہیں کرتی اور مجھے دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔" پھر اس نے باجے کے متعلق باتیں شروع کیں "معلوم نہیں میری انہوں نے باجا کیوں بند کر دیا۔ اگر پورا گیت ختم کر کے بند کرتے تو اچھا تھا۔ بعض لوگ عجیب کم عقل ہوتے ہیں۔ بس انہیں بیٹھے بیٹھے غصہ آگیا ہوگا۔ تم یہ تو نہیں بتا سکتیں کہ وہ سارا دن بجاتے رہے تھے یا نہیں؟"

ہاں یہ ٹھیک تھا بچاری میری کس طرح بتا سکتی تھی۔ اپنے معمول کے مطابق مس مورڈنٹ کھانا تیار کر رہی تھی کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا جب اس نے دروازہ کھولا تو ایک آدمی نے پوچھا "کیا آپ کا نام مس مورڈنٹ ہے" اس کے ہاں کہنے پر اس آدمی نے ایک کارڈ اور پھولوں کا گلدستہ اس کو دیا کارڈ پر لکھا تھا "اُس کار آمد تحفے کے شکریے میں جو آپ نے صبح کو بھیجا تھا یعنی مسز فاگ" اس نے پہلے سوچا کہ قبول نہ کرے مگر مسٹر سمتھ نے کچھ اس طرح لکھا تھا کہ اسے لینے پڑے اور اس کو پھول پسند بھی بہت تھے۔ مگر وہ خریدتی بہت کم تھی۔ اس نے سفید گلاب کے پھول کھانے کی میز پر رکھے اور خواہش ظاہر کی کہ میری ان کی تعریف کرے پھر وہ کھانا پکانے میں مشغول ہو گئی۔ وہ بھوکی تھی اور خوش بھی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد مس مورڈنٹ نے مسٹر سمتھ کو شکریے کا خط لکھا، اور میری کے لئے ایک اور فراک تیار کیا۔

اس طرح دن گزرتے گئے اور جیسے ہی مس مورڈنٹ گھر میں قدم رکھتی تھی مسٹر سمتھ پیانو بند کر دیتے تھے۔ یہ بہت بری بات تھی کہ وہ پیانو اس پھرتی سے بند کر دیتا تھا۔ مس مورڈنٹ نے ارادہ کیا کہ وہ اس کے متعلق اس سے پھر بات چیت کرے گی۔ خاص خاص موقعوں پر شام کو وہ چھ سے دس تک خاموشی چاہتی تھی۔ معمولی دنوں میں اگر پیانو رات کے دس بجے تک بجتا رہے تو کچھ مضائقہ کی بات نہ تھی۔ عورتوں کی ادبی مجلس کے دن اسے گفتگو کا موقع مل گیا

مس مورڈنٹ کے پاس صرف چائے کی چھ پیالیاں تھیں اور اس انجمن کے سات ممبر تھے۔ وہ اپنے کمرے کو سجا رہی تھی کہ اسے خیال آیا کہ ایک پیالی کم ہے۔ اس نے سوچا کہ مسٹر سمتھ سے مانگ لے اور اسے یہ بھی سمجھا دے کہ اسے موسیقی سے نفرت نہیں ہے۔

جب وہ کمرے میں داخل ہوئی تو مسٹر سمتھ نے غصے کے آثار نہیں ظاہر کئے۔ بلکہ اس کو کمرے میں بٹھا کر اس موقع کے لئے موزوں پیالی تلاش کرنے اندر چلا گیا۔ اس کمرے میں ایک پیانو اور بہت سی کتابیں رکھی تھیں۔ روسی چمڑے اور ترکی سگرٹ کی بو آرہی تھی۔

مسٹر سمتھ پیالی لے کر آیا اور پوچھا کہ اب وہ کب سے پیانو رات کے دس بجے تک بجا سکے گا۔

"اُن دنوں میں بھی آپ بجا سکتے تھے۔ جب کبھی مجھے ضرورت ہوگی میں خود ہی کہہ دیا کروں گی کہ باجا بند کر دیں۔"

وہ ایک دم گھبرا کر بیٹھ گئی اور پیالی اس کے ہاتھ سے چھوٹنے لگی۔

"ہاں یہ میری ہی غلطی ہے۔ میں ہر دفعہ بات کا الٹا مطلب لیتا ہوں۔ میں سمجھا تھا کہ شاید بعض دن شام کو آپ مجھے دیر تک بجانے کی اجازت دیں گی اور آپ تو مجھ پر بہت مہربان ہیں آپ نے نوکرانی کو بھیجا اور ہر طرح میرے آرام کا خیال رکھا۔ مگر یہاں تو دس بج کر پانچ منٹ والا قصہ ہوگیا۔"

"وہ کیا؟" مس مورڈنٹ نے مسکرا کر پوچھا۔

"مجھے ایک ڈنر پر دس بج کر پانچ منٹ پر جانا تھا۔ مگر مجھے یہ خیال رہا تھا کہ پانچ بج کر دس منٹ پر جانا ہے۔ میں جلدی جلدی کام ختم کر کے اور بغیر ناشتا کئے ٹھیک وقت پر وہاں پہنچا تو سب میرا مذاق اڑانے لگے کہ اجی جناب ذرا سی مشق تو دس بج کر پانچ منٹ سے ہوگی اور میں شرم کے مارے پانی پانی ہوگیا۔"

مس مورڈنٹ نے معافی مانگی۔ مگر اسے مسٹر سمتھ کی باتوں میں بہت مزا آرہا تھا۔

"میں نہیں سمجھ سکتی کہ اتنا بڑا آدمی اتنی معمولی باتیں کس طرح بھول سکتا ہے؟"

"مگر میں تو سمجھتا ہوں کہ گانا بہت بڑا عیب ہے اس نے تو میرا دماغ خراب کردیا ہے۔ اب تو مجھے ایک سکرٹری رکھنا پڑے گا جو میری ہر ایک بات کا خیال رکھے۔"

"آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے صرف میری خاطر اتنی تکلیف اٹھائی۔ آج تو آپ نہیں بجا سکیں گے کیونکہ آج خواتین کی انجمن کا جلسہ ہے۔ مگر کل سے آپ بجا سکتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی میرا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ اچھا خدا حافظ بہت بہت شکریہ۔"

مس سیمنز کچھ کاغذ ہاتھ میں لئے دروازے پر کھڑی تھی "میں ذرا جلدی آگئی ہوں کہ شاید تمہیں کام میں کچھ مدد کی ضرورت ہو۔"

"تمہارا شکریہ میں سب کچھ کرچکی ہوں صرف ایک پیالی مانگنے سامنے کے گھر میں گئی تھی۔"

"ہاں مجھے یاد آیا کہ تم نے کہا تھا کہ سامنے کے گھر میں ایک عورت آئی ہے۔ کیا تم نے اس سے کہہ دیا کہ آج باجا نہ بجائے؟"

"ہاں کہہ دیا وہ آج نہیں بجائے گی۔" مس مورڈنٹ نے شرماتے ہوئے کہا۔ یہ تو پہلے ہی معلوم ہوچکا ہے مس مورڈنٹ کو دھوکا دینا نہیں آتا تھا۔

جلسہ اچھا کامیاب رہا سب نے عورتوں کی تعلیم و تمدن پر چھوٹے چھوٹے لیکچر دیئے۔ چائے پیتے وقت سب نے تو ایک رنگ کی پیالیوں میں چائے پی مگر مس مورڈنٹ نے بالکل مختلف رنگ کی پیالی میں پی۔ رات کو سوتے وقت مس مورڈنٹ نے میری سے کہا "آج کی شام بہت اچھی طرح گزری اور مسٹر سمتھ خوب آدمی ہے۔ اس کو غصہ بہت جلد آجاتا ہے اور اچھا امیر آدمی معلوم ہوتا ہے۔" میری خاموش بیٹھی اس کی باتیں سنتی رہی مگر ایک دم سے اس کا سر تکئے پر سے پھسل گیا اور اس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔

دوسرے دن صبح وہ ناشتا کر کے بیٹھی ہی تھی اور میری سے کچھ کہنے ہی والی تھی کہ مسٹر سمتھ کے پیانو نے اسے ایک دم روک دیا۔ وہ بہت شوق سے سن رہی تھی اور جب اس نے بجانا بند کردیا تو مس مورڈنٹ نے تعریف کے طور پر آہستہ سے تالی بجائی۔

پھر دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی اس نے کنڈی کھولی تو مسٹر سمتھ کھڑے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کرے۔ مجبور تھی۔ کیا کرتی ان کو اندر بلا لیا۔ مگر وہ میری کو اٹھانا بھول گئی۔ مسٹر سمتھ نے کہا "میں نے آپ کی تالیوں کی آواز سنی تھی۔ آپ کی تعریف کا بہت بہت شکریہ۔ اگر آپ میرے کمرے میں تشریف لے چلیں تو اس سے اچھی طرح سن سکیں گی۔"

مس مورڈنٹ راضی ہوگئی اور بعد میں اسے خود تعجب ہوا کہ اس نے کیوں رضامندی ظاہر کردی۔ وہاں جا کر وہ ایک آرام کرسی پر بیٹھ گئی اور مسٹر سمتھ نے اس سے پوچھا کہ وہ کیا بجائے۔ مس مورڈنٹ نے کچھ بتایا اور وہ بجانے لگا۔

"یہ کتنی اچھی سُر ہے" مس مورڈنٹ نے کہا۔ "مگر اب یہ بہت پرانی ہوگئی ہے۔"

"ہاں واقعی بہت اچھی ہے۔ مس مورڈنٹ میں نے آج صبح کافی نہیں پی۔ کیا آپ کافی بنانے میں مجھے مدد دیں گی؟"

"مگر کافی تو بہت بری چیز ہے۔ اگر آپ اس وقت پی لیں گے تو رات بھر نیند نہیں آئے گی۔"

"نہیں مس مورڈنٹ میرا حال عام لوگوں سے بالکل مختلف ہے اگر کافی نہ پیوں تو مجھے نیند نہیں آتی۔"

دونوں نے مل کر کافی تیار کی اور بعد میں مل کر پی۔ مس مورڈنٹ نے کہا کہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ تالیوں کی آواز اس تک پہنچے۔

مسٹر سمتھ نے کہا۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ دیواریں بہت پتلی ہیں آپ اپنی سہیلی سے جو باتیں کرتی ہیں میں سن تو نہیں سکتا مگر دھیمی دھیمی آواز ضرور آتی ہے۔

"کون سی سہیلی؟" مس مورڈنٹ نے گھبرا کر پوچھا۔

"آپ کی گڑیا! اور کون؟" مسٹر سمتھ نے مسکرا کر جواب دیا۔

"اصل بات یہ ہے . . . . "

مسٹر سمتھ نے کہا "میں سب کچھ جانتا ہوں اگر کوئی اتنا بھی نہ سمجھ سکے تو وہ موسیقی بھی نہیں سمجھ سکتا!"

اس طرح وہ ایک دوسرے سے ملتے رہے آخر کار ان کی شادی ہو گئی

چند برس کے بعد مسز سمتھ نے اپنی بیٹی کو جس کا نام اس نے میری ہی رکھا تھا۔ ایک گڑیا دینے کا وعدہ کیا اور کہا کہ وہ بہت پرانی گڑیا ہے اور وہ خود اس سے کھیل چکی ہے۔ میری جس نے ابھی حساب سیکھنا شروع ہی کیا تھا سمجھی کہ یہ گڑیا کم از کم سو سال پرانی ہوگی۔

"اس کو میں نے بہت اچھے کپڑے پہنا رکھے ہیں اور اس کا اور تمہارا نام بھی ایک ہی ہے اور اس کی آنکھیں بند ہوتی اور کھلتی بھی ہیں۔"

"اچھا! ذرا مجھے دکھائیے تو سہی" میری نے کہا۔ مسز سمتھ نے گڑیا نکال کر دی۔ میری تھوڑی دیر تک تو غور سے دیکھتی رہی پھر حیرت سے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگی "اماں جان، آپ بچپن میں بہت عقلمند تھیں جو آپ نے گڑیا کے لئے اتنے اچھے کپڑے سی لئے۔"

"مگر میں اس زمانے میں تم سے بہت بڑی تھی میری۔"

"آپ کتنی بڑی تھیں اماں جان؟"

"اتنی ہی بڑی جتنی اب ہوں۔" مسز سمتھ نے مسکرا کر جواب دیا

ابھی وہ دونوں باتیں کر رہے تھے کہ مسٹر سمتھ نے پکارا۔

"ادھر سنو گریس مجھے کچھ روپیہ منی آرڈر کرانا ہے بتاؤ کس طرح کرتے ہیں!"

"اب تک تمہاری یہ عادت نہیں گئی" مسز سمتھ نے ہنس کر کہا "مجھے دے دو میں منی آرڈر کر دوں گی" پھر اس نے آہستہ سے کہا "میں نے وہ گڑیا میری کو دے دی ہے اور وہ اسے پسند بھی آ گئی ہے!"

مس معتصمۃ الرحمن

(ترجمہ)

غزل

خاک ڈالو مرے شکوے پہ نہ جاؤ پیارے
نیچی نظریں نہ کرو آنکھ اٹھاؤ پیارے

بعد مرنے کے مرے سوگ سے حاصل کیا ہے
چپ نہ ہو غم نہ کرو جی نہ کڑھاؤ پیارے

پھر کبھی آن ملو گے، یہ بجا ہے لیکن
کوئی صورت بھی تو جینے کی بتاؤ پیارے

تم جو آ جاؤ تو تقدیر کا شکوہ نہ رہے
میری سوئی ہوئی قسمت کو جگاؤ پیارے

ضبط سے راز محبت نہ چھپے گا سیفیؔ
ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کو چھپاؤ پیارے

سیفی لوگانوی

میں اور تم

مرے جہانِ محبت کو خواب کہتے ہو، مگر بتاؤ تو پھر اصلِ زندگی کیا ہے
مرے سرورِ نظر کو حجاب کہتے ہو مگر کھُلا نہ یہ تم پر کہ روشنی کیا ہے

تمہاری زیست ہے کیا انتظار مرنے کا؟ ترس رہے ہو تم اک خوابِ جاوداں کے لئے
مرا جہاں مری رنگینیوں سے ہے پیدا تمہاری بود ہے اوہامِ ناگہاں کے لئے

مرا مقام ثواب و گناہ سے ہے بلند تم اور تمہاری نشیب و فراز کی دنیا
ہے میری دید کو اصل نگاہ سے پیوند ہے مجھ کو وجہِ حقیقت مجاز کی دنیا

مجھے یقیں ہے بہر حال زندگانی میں مگر تمہیں تو کسی بات پر یقیں ہی نہیں
مرے لئے تو مزا ہے اسی کہانی میں مرے جنوں کو تمیزِ چناں چنیں ہی نہیں
مری حیات میں رنگِ شباب رہنے دو
فریبِ حسن سے کچھ بار یاب رہنے دو

حمید عرفانی ایم اے

خندۂ تقدیر

گاڑی ایک منٹ کے لئے راہ والی کے اسٹیشن پر رُکی۔ صرف وہی ایک مسافر تھا جو گاڑی سے اترا۔ بابو نے جو تنہا اس اسٹیشن پر ٹکٹ دینے لینے کے علاوہ دوسرے فرائض بھی انجام دیتا تھا حیرت کی نگاہوں سے اسے دیکھا لیکن وہ خاموشی سے ٹکٹ دے کر شہنائی کا ڈبہ بغل میں دبائے۔ اسٹیشن سے باہر نکل گیا اور ایک پگڈنڈی پر چلنے لگا۔ اس چھوٹے سے اسٹیشن سے چند فرلانگ کے فاصلے پر اسی نام کا گاؤں آباد تھا۔ دن ڈھل رہا تھا جبکہ شاہنواز نے گاؤں کا رُخ کیا۔ اس کے قدم آہستہ آہستہ اُٹھ رہے تھے۔

پگ ڈنڈی پر مرگ آسا سکوت طاری تھا۔ کھیتوں کے درخت! چھوٹے بڑے پودے سب حیرت سے اُس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ نو وارد اور اجنبی نہ تھا لیکن اس میں اجنبیت پیدا ہو چکی تھی یہ پگڈنڈی، یہ درخت اور یہ فضا شاہ نواز سے ناآشنا تھی۔ آج سے آٹھ سال قبل یہی چیزیں اُسے شاہو کے نام سے جانتی تھیں۔

راستے پر چلتے ہوئے شاہنواز کو آٹھ سال قبل کی زندگی کی تصویریں نظر آرہی تھیں۔ یہ تو اسے معلوم ہی نہ تھا کہ اُس کے والدین کون تھے اور انہوں نے اس کا کیا نام رکھا تھا لیکن اس نے جب سے ہوش سنبھالا تھا وہ گاؤں کے ایک زمیندار کی گائیں بھینسیں چرانے پر مامور تھا۔ زمیندار اور گاؤں کی مختصر دنیا اُسے شاہو کے نام سے پکارتی تھی۔

گاؤں کے جس علاقے میں وہ چوپائے چرانے جاتا تھا وہیں ناجو گاؤں کے چودھری کا ریوڑ لے کر آتی تھی۔ ایک دوسرے کے قریب رہنے سے دونوں میں اُنس پیدا ہوگیا۔ سردی کے دنوں میں شاہو خشک اُپلے جمع کرتا اور انہیں آگ لگا کر سورج نکلنے تک شاہو اور ناجو دونوں آگ تاپتے رہتے۔ گرما میں شاہو درختوں کی بڑی بڑی ٹہنیاں کاٹ کر زمین میں گاڑ دیتا اور ناجو اپنی اوڑھنی اُن پر پھیلا دیتی اور دونوں اس کے سائے میں بیٹھ کر باتیں کرتے رہتے۔ موسم خوشگوار ہونے پر دونوں کھیلتے بھی رہتے۔

بچپن کے معصوم ایام آنکھ جھپکنے میں گذر گئے۔ آغازِ شباب نے جہاں ان معصوم بچوں کو جسمانی بلوغت عطا کی وہاں اُن کے جذبات میں بھی رُومانی عنصر داخل کر دیا۔ کسی ناقابلِ فہم جذبے کے زیر اثر وہ اکثر ایک دوسرے کے پاس رہنے کی خواہش کرنے لگے۔ اُنس نے رفاقت اور رفاقت نے الفت کی شکل اختیار کر لی۔ صبح سویرے آنا اور شام کو دیر سے لوٹنا ان کا معمول ہوگیا۔ زندگی کے یہ لمحات بھی نشاط آوری میں کسی طرح بچپن سے کم نہ تھے۔

پھر دفعتہً صاف مطلع پر غم کی گھٹائیں چھانے لگیں۔ شاہو بدستور مسرور تھا لیکن ناجو کے بے اختیار قہقہے رفتہ رفتہ تبسم میں تبدیل ہو گئے۔ شاہو نفسیات کا ماہر تھا لیکن حساس دل کا مالک ضرور تھا۔ ناجو کی اندرونی کشمکش اس کے لئے ایک عرصے تک راز نہ بنی رہی۔ وہ خود کئی دنوں سے سوچ رہا تھا کہ کسی بہانے سے اپنے مستقبل کے متعلق ناجو سے کہہ دے اور اس کا عندیہ معلوم کرے کہ وہ کہاں تک اس کی رفیق حیات بننے کی آرزومند تھی۔ لیکن اس مسئلے کا آغاز کرنا اُس کے لئے کارِ دشوار بنا ہوا تھا۔ شاہو شاید ابھی کچھ دن اور متذبذب رہتا لیکن ناجو کے رویے میں ناگہانی تبدیلی دیکھ کر وہ عرضِ مدعا کرنے پر مجبور ہو گیا۔

اُس روز صبح سے کئی بار شاہو ناجو سے آنکھ مچولی کھیلنے کے لئے کہہ چکا تھا لیکن وہ کسی نہ کسی عذر پر انکار کر دیتی۔ سہ پہر ہو چکی تھی جب کہ شاہو نے جھلّا کر ناجو کے ہاتھ سے وہ ادھوری ٹوکری چھین کر پرے پھینک دی جسے وہ صبح سے بنا رہی تھی اور طیش میں آ کر اس سے کہا:۔

"تو تم میرے ساتھ آج کھیلو گی یا نہیں؟"

"نہیں، آج نہیں بلکہ کبھی بھی نہیں!" ناجو نے زمین کریدتے ہوئے دھیمی آواز سے جواب دیا۔

شاہو بھونچکا سا رہ گیا۔ اُس کی تیوری کے بل ایک ایک کر کے اترتے گئے اور اس کا دل کسی نامعلوم وجہ سے بیٹھنے لگا ناجو کو بازو سے پکڑ کر اٹھانے کی بجائے وہ خود اس کے پاس بیٹھ گیا اور آہستہ سے بولا:۔

"کیوں ناجو کیا بات ہے؟"

ناجو خاموشی سے زمین کی طرف دیکھتی رہی ایک دو آنسو آنکھوں سے نکل کر پلکوں تک آئے اور وہاں سے سارے دن کی تپی ہوئی زمین پر

گرا جذب ہو گئے۔ شاہو نے ایک بار پھر کہا۔

"ناجو کچھ کہو تو سہی"

ناجو نے اپنا سر اوپر اٹھایا۔ دو آنسوؤں سے ہی عمر میں پہلی دفعہ دکھے ہوئے دل سے مدد کا بار ہلکا ہو گیا۔ وہ بلند آواز سے بولی۔

"شاہو آج سے میرا تمہارا راستہ الگ ہے۔ میری کل منگنی ہونے والی ہے۔ چودھری میری شادی اپنے ملازم بخشو سے کرنا چاہتا ہے"

شاہو بہت دیر تک جیسا ہوا ناجو کے چہرے کی طرف تکتا رہا۔ ناجو نے اٹھ کر ابھی ٹوکری اٹھائی اور گاؤں کی طرف بڑھنے لگی۔ افق پر سورج آہستہ آہستہ ڈھل رہا تھا اور شیشم کے بلند درختوں کے اوپر آسمان پر سرخی پھیل رہی تھی جیسے روشنی کا خون ہو رہا ہو۔ شاہو نے افق پر دیکھا۔ وہ شاعر نہ تھا لیکن افق کی سرخی اور اپنی امیدوں کے خون میں اسے کچھ مطابقت نظر آئی۔ اُس نے مایوس ہو کر افق سے نظریں ہٹا لیں۔ ناجو دور جا کر دور نکل گئی تھی۔ شاہو بھی اپنے چوپائے جمع کر کے گاؤں کی طرف چلنے لگا۔

نصف رات گزر گئی لیکن شاہو کی آنکھیں ابھی تک وا تھیں اُس کی زندگی میں کبھی کوئی مسئلہ پیدا نہ ہوا تھا جس پر اُسے غور کرنے کا موقع ملا ہو۔ اُس کے لئے زندگی کی یہ پہلی اُلجھن تھی وہ خیالات میں ربط اور ترتیب پیدا کرنے کا عادی نہ تھا۔ لیکن آج اُسے ان چیزوں کی شدت سے ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ ناجو سے محبت اور عشق پیدا ہوتے ایک عمر کا عرصہ صرف ہو گیا تھا اور آج ایک ہی دن میں اُسے ناجو سے مایوس ہونا پڑا تھا۔ گاؤں میں حکومت انگریزی کا تسلط برائے نام تھا۔ کم از کم سماجی قوانین ابھی تک گاؤں کے اپنے تھے۔ گاؤں کے چودھری کے فیصلے کے خلاف آواز بلند کرنا ترک وطن کے مترادف تھا۔ لیکن شاہو چودھری کے فیصلے کو تسلیم کرنے کے لئے بھی تیار نہ تھا۔ آخر کار اُس نے اپنی اُلجھن کا حل سوچ لیا۔

وہ چپکے سے اٹھا اور اپنی بانسری بغل میں دبا کر گاؤں سے نکل گیا بانسری اور بدن کے کپڑے ہی اُس کی کل کائنات تھی۔ کچھ دیر تک وہ غیر ارادی طور پر حرکت کرتا رہا۔ پھر اُس نے شہر کا رُخ کیا جو وہاں سے دس میل کے فاصلے پر تھا۔

شہر میں دیہات کے آزمائے ہوئے دست و بازو کی بڑی قدر تھی۔ اُسے شکم پُری کے لئے کافی مزدوری مل جاتی۔ شام کو وہ اپنے کام کاج سے فارغ ہو کر کسی کونے میں بیٹھ کر بنسری بجانے لگتا۔ نہ جانے کیوں اُسے اِس سے کچھ تسکین ہوتی۔ قریب کے محلے کے لڑکے اُس کے گرد جمع ہو جاتے۔ اُن کا خیال تھا کہ شاہو کی بنسری نہایت سریلی ہے۔ بچوں سے یہ بات بڑھ کر بڑوں تک پہنچی۔ کبھی کبھار کوئی بڑا آدمی بھی اس کی بنسری سننے کے لئے رُک جاتا۔ رفتہ رفتہ موسیقی کے شائق اسے بنسری سننے کے لئے گھر پر بلانے لگے۔ بچے کھچے کھانے یا ایک دو آنے سے اُس کی تواضع کر دی جاتی اور گھنٹہ دو گھنٹے اس کی بنسری سنی جاتی۔

حسنِ اتفاق سے کچھ دنوں کے بعد اُسی شہر میں تماشا کرنے والوں کا ایک گروہ آیا۔ اس جماعت میں مختلف طرح کے فن کار شامل تھے۔ شاہو کی بنسری کی دھوم اس گروہ کے مالک تک بھی پہنچی۔ تجربے سے معلوم ہوا کہ ان کی جماعت میں شاہو کا اضافہ مفید ثابت ہو گا۔ چنانچہ شاہو کو ایک معقول مشاہرے پر ملازم رکھ لیا گیا۔ اُس کے پھٹے پرانے چیتھڑے اتروا کر اُسے انگریزی لباس پہنا دیا گیا۔ لمبے لمبے گھنگھریالے بالوں کی جگہ اب شاہو کے سر پر صرف چھوٹے چھوٹے انگریزی وضع کے بال رہ گئے ابتداءً شاہو اس نئی فضا سے کچھ خائف خائف سا رہتا لیکن رفتہ رفتہ وہ سب سے گھل مل گیا اور جاہل آدمیوں کی طرح اُسے انگریزی بولنے کا ڈھب بھی آ گیا۔ کمپنی کے مینیجر نے ضرورت کے مطابق اس کا نام شاہو سے شاہنواز کر دیا۔ جس بڑے شہر میں کمپنی جاتی شاہو نہیں بلکہ شاہنواز کی بنسری کی دھوم پہلے پہنچ جاتی۔ وہ اب دیہاتی بنسری کو ترک کر چکا تھا وہ اُس کے نئے نئے راگوں کو بجانے کے لئے ناکافی تھی اور اُس نے اب ایک شہنائی خرید لی تھی۔ کمپنی کے کام کے علاوہ اُسے کئی بار دیگر مجلسوں میں بھی شہنائی بجانے کے لئے بلایا جاتا۔ اُس کی شہنائی میں ایک مخصوص سوز روز افزوں تھا۔ جو آدمی ایک دفعہ اُس سے شہنائی سنتا وہ دوسری دفعہ سننے کا متمنائی رہتا اور دوسری دفعہ سنتا تو پہلے سے زیادہ متاثر ہوتا۔

مغربی وضع کے سماجی اجتماعات میں شاہنواز کی بڑی قدر ہوتی۔ مردوں کے علاوہ جدید خیالات کی تعلیم یافتہ لڑکیاں اُس سے ملاقات کرنا فخر سمجھتیں۔ کئی شاموں کو سرخ و سفید ساری پوشوں نے شاہو کا پُرتپاک استقبال کیا۔ برقی روشنی میں غازے اور لپ اسٹک کی آرائش سے چمکتے ہوئے چہرے اُس کا دل لبھانے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن صنفِ نازک میں شاہو نے صرف اس قدر دلچسپی لی کہ جب کبھی اسے کوئی چہرہ حسین نظر آیا تو وہ چند لمحوں کے لئے اس کی طرف صرف اس لئے دیکھتا

رہا کہ اس کے چند نقوش ناجو سے مشابہ تھے لیکن اس تماشے کا ردِّ عمل نہایت خوفناک ہوتا۔ شاہو کی وہ شام اور بعد میں آنے والی کئی راتیں ایک خلشِ مستقل کی نذر ہو جاتیں۔ وہ اُس دنیائے رنگ و بو کو تیاگ کر کہیں دور چلے جانے کے لئے آمادہ ہو جاتا۔ پھر زندگی کی مصروفیتیں اس کے عزائم کو تہ و بالا کر دیتیں۔

آٹھ سال اسی کشمکش میں گزر گئے۔ ایک دن وہ اپنے ارادوں میں کامیاب ہو گیا۔ راہ والی کا شاہو شاہنواز کی شکل میں پھر کسی جذبے کے زیرِ اثر گاؤں آنے کے لئے بے قرار ہو گیا۔

چند فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد جب شاہو گاؤں کے نزدیک پہنچا اس وقت شام ہو چلی تھی۔ گاؤں کے ایک دو کتوں نے اس اجنبی شاہنواز کا خیر مقدم بھونک کر کیا۔ لیکن وہ ان کی پروا نہ کرتے ہوئے ایک گلی میں داخل ہو گیا اور ایک جھونپڑے کے قریب جا کر رک گیا۔ ایک نوجوان زمیندار جھونپڑے سے باہر نکل رہا تھا۔ شاہو نے دفعتاً اس سے استفسار کیا۔

"ناجو کس گھر میں رہتی ہے؟"

زمیندار ٹھٹکا۔ گاؤں میں پیدا ہو کر تمام عمر گاؤں میں گزار دینے والی ناجو کو پوچھنے والا یہ شہری کون تھا۔ فرطِ حیرت سے اُس کے منہ سے نکلا۔

"ناجو!"

"ہاں" شاہو نے تائید کرتے ہوئے کہا۔

نوجوان زمیندار اُس وقت تک اپنی حیرت پر غلبہ پا چکا تھا۔ اُس نے نہایت افسوسناک لہجے میں کہا:-

"ناجو تو دو دن ہوئے مر چکی ہے"

"اچھا!" شاہو کے منہ سے دھیمی سی آواز نکلی۔ اُس نے مٹی سے لپی ہوئی دیوار کا سہارا لیا۔ شہنائی کا ڈبہ ایک سرے سے کھسک کر اس کے ہاتھ سے چھوٹنے لگا کہ اُس نے ٹیک دے کر اسے سنبھال لیا۔ اور پیشتر اس کے کہ نوجوان زمیندار اس پر کوئی سوال کرے۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا گاؤں سے باہر نکل آیا۔ گاؤں کے مغرب میں کھیتوں کے درمیان گاؤں کا قبرستان تھا۔ شاہو قبرستان میں پہنچ گیا۔ چند ٹوٹی پھوٹی قبروں میں ایک ہی قبر نظر آ رہی تھی کسی محبت بھرے دل نے سرسوں کے چند پھول قبر پر چڑھا رکھے تھے۔ قبر کے ایک سرے پر نیم کا درخت تھا۔ شاہو اُس سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

کچھ دیر تک بیکار بیٹھنے کے بعد شاہو نے ڈبے سے شہنائی نکالی اور اُسے بجانے لگا۔ شہنائی کے مدھم اور باریک سُر رفتہ رفتہ بلند ہوتے گئے۔ دردناک چیخوں نے ہنگامہ خیز گریے کی شکل اختیار کر لی۔ اُس روز جتنے پُرسوز نغمے شہنائی سے بلند ہوئے اُس سے پہلے کبھی نہیں سے گئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے شاہو اپنا دل شہنائی میں پھونک رہا ہے۔ نصف شب سے کچھ قریب شاہو شہنائی بجاتا رہا اور پھر شہنائی کی آواز کم ہوتی ہوئی رات کی بھیانک تاریکی میں گم ہو گئی۔

اُس رات باد و باراں کا نہایت خوفناک طوفان آیا۔ ایک دفعہ بجلی اس زور سے کڑکی کہ گاؤں والوں کے دل دہل گئے۔ ساری رات گاؤں والوں نے اللہ اللہ کر کے کاٹی۔

صبح ہونے پر مطلع صاف ہو چکا تھا۔ دوپہر کے قریب ایک چرواہے نے گاؤں میں آ کر اطلاع دی کہ قبرستان میں بجلی گرنے سے ایک درخت جل گیا تھا اور ایک آدمی بھی مر گیا تھا۔ گاؤں کے چودھری نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ گاؤں کا کوئی آدمی کم نہیں ہوا تھا۔ مرنے والے کی شخصیت کے متعلق مختلف چہ مے گوئیاں ہوتی رہیں۔

شام کے قریب ایک نوجوان نے گاؤں والوں سے بیان کیا:-

"لاش کے قریب جو ڈبہ پڑا ہوا ملا ہے، ایسا ڈبہ کل شام ایک آدمی نے اٹھا رکھا تھا، جو ناجو کا پتہ پوچھتا تھا۔"

نسیم رضوانی

غزل

اب سرِ بالیں وہ شوخِ فتنہ گر آیا تو کیا
ہو چکا جب حشر، حشرِ منتظر آیا تو کیا

کب ہوئیں آباد ہستی سے عدم کی وسعتیں
بلبلہ اک سطحِ دریا پر اُبھر آیا تو کیا

روشنی امید کی صحرائے ہستی کا سراب
دُور سے بہتا ہوا دریا نظر آیا تو کیا

صبحدم روشن نگاہیں اُس کے جلووں سے ہوئیں
رات بھر آنکھوں میں کٹ کٹ کر جگر آیا تو کیا

جس کی ہیبت سے لرز اٹھی تھی ساری کائنات
میرے سینے میں وہی طوفاں اتر آیا تو کیا

نالہ تو اک پل میں ہفت افلاک کو طے کر گیا
بارگہ سے اُس کی محتاجِ اثر آیا تو کیا

گھر کی ویرانی ہے کچھ صحرا کی ویرانی سے بیش
چھوڑ کر دیوانہ صحرا کو اگر آیا تو کیا

اک نگہ حسرت کی جاتے جاتے اُس نے بھی تو کی
عمر بھر بھولا تو کیا، وقتِ سفر آیا تو کیا

منصور احمد

الوداع

[منظر:۔ پارک کے ایک گوشۂ تنہائی میں ایک مرد اور ایک عورت مستِ خرام ہیں۔]

عورت۔ لو اب تو بس ـــــ ہمیں جدا ہونا چاہئے۔ میرا ہاتھ چوم لو۔

مرد۔ جو حکم دو۔

عورت۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ زیادہ میل جول اور کثرت بوس وکنار سے طبیعت بھر جائے اور ہم ایک دوسرے کے نام سے نفرت کرنے لگیں

مرد۔ بجا کہتی ہو (وہ اس کا ہاتھ چومتا ہے)

عورت۔ میں دائیں ہاتھ کا راستہ لے کر جاتی ہوں۔ تم ایک منٹ کے بعد بائیں ہاتھ کا راستہ لے کر چلے جانا۔ میرا شوہر ہماری ٹوہ میں لگا رہتا ہے کیونکہ اب ہم ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جدا ہو رہے ہیں۔

مرد۔ الوداع! (دونوں سرکنے کا نام نہیں لیتے)

عورت۔ تم کیوں نہیں جاتے؟

مرد۔ ابھی مجھے کچھ کہنا سننا ہے۔

عورت۔ کہو ـــــ؟

مرد۔ غالباً تم کو یاد ہوگا کہ ہمارا پہلا آمنا سامنا کنڈلے میں ہوا تھا۔ اس روز تمہارا شوہر تمہارے ہمراہ نہ تھا۔ البتہ چند سہیلیاں تمہارے ہمراہ تھیں۔

عورت۔ ہاں خوب یاد ہے۔

مرد۔ ہمیں الفت کا دم بھرتے ایک مدت ہوگئی ہے مگر آج تک تمہارے شوہر کی زیارت نصیب نہیں ہوئی۔

عورت۔ پھر کیا منّت کروں؟

مرد۔ پچھلے دنوں تم نے ایک کڑیل جوان کی تصویر دے کر کہا تھا کہ یہ تصویر میرے شوہر کی ہے۔ میں نے اُس تصویر کی تعریف اِن لفظوں میں کی تھی:۔

بال دھواں دھار ہیں۔ ابرو شمشیر برہنہ ہیں۔ کٹورا سی آنکھیں ہیں۔ بٹوا سا منہ ہے۔ چاند سا مکھڑا ہے۔ گردن کا ڈورا دامِ محبت ہے۔ کمر چیتے کی ہے۔ غرض بدن سانچے میں ڈھلا اور کانٹے میں تُلا ہوا ہے

عورت۔ مجھے یاد پڑتا ہے

مرد۔ قسم ہے کہ اُس رات میری آنکھ لگی ہو کیونکہ میں اُن دنوں تم پر ہزار جاں سے فدا تھا بار بار اٹھ اٹھ کر آئینہ میں اپنی شکل وصورت کا مقابلہ اس تصویر سے کرتا تھا مگر کجا ایک قبول صورت انسان اور کجا حسن کی ایک منہ بولتی تصویر۔ اس احساس نے مجھے تڑپا دیا اور میں نے حسین بننے کا ارادہ کر لیا۔

عورت۔ میں اس تغیّر کو دیکھ رہی ہوں۔

مرد۔ پھر مجھے اس خیال نے ڈھارس بندھائی کہ شاید تمہارا شوہر کوئی گاؤدی اور گیلا ہے جو تم نے اُس سے مُنہ موڑ کر مجھے محبت کے لئے تاکا ہے۔ جب تصویر پر پھر نظر ڈالی تو یہ ساں وگمان بھی جاتا رہا۔ اس حقیقت وآگاہی نے میرا طور بے طور کر دیا۔

عورت۔ میں بھانپ گئی تھی

مرد۔ تمہارا دل موہ لینے کے لئے میں تیتی لباس میں ملبوس ہو کر بہترین وضع میں تم سے ملنے لگا۔

عورت۔ میں اس حقیقت سے آگاہ ہوں

مرد۔ میں اُن دنوں تمہاری ات گت نعت میں اندھا ہو رہا تھا۔ جب تمہارا شوہر ہفتہ بھر کے لئے دہلی گیا تھا تو میں پل بھر تم سے جدا نہ ہوا تھا۔

عورت۔ ہاں وہ دہلی گیا تھا۔

مرد۔ میں نے اُس کی واپسی پر اُسے ایک نظر دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی مگر تم نے مجھے روک دیا تھا۔ غالباً دوسری بار پھر میں نے یہ خواہش ظاہر کی تھی مگر تم نے سختی کے ساتھ منع کر دیا تھا۔ پھر یہ واقعہ پیش آیا . . .

عورت۔ کون؟

مرد۔ لو سنو! ـــــ ایک روز دوپہر کو میرے ہاں تم نے اپنی ماں کو

ایک خط لکھا تھا۔ جس میں مذکور تھا کہ رات کو میں اپنے شوہر کے ہمراہ تماشہ دیکھنے جاؤں گی۔ راستہ میں تمہیں بھی اپنے ہمراہ لے جاؤں گی۔ یہ خط تم بٹوے میں رکھنا بھول گئی تھیں۔ اتفاق سے میں نے خط کو پڑھ لیا تھا

عورت۔ واقعی خط میں بھول گئی تھی۔

مرد۔ موقع کو غنیمت جان کر میں تماشہ دیکھنے چلا گیا تھا۔ وہاں تمہارے شوہر کو دیکھ لیا تھا۔

عورت۔ اچھا۔

مرد۔ کیا ایسی بدصورت شوہر بیاہا تھا؟

عورت۔ اجی تمہیں اس سے کیا —— چپ رہو!

مرد۔ خدا کے واسطے جھوٹ نہ بولو۔ تمہارا بدشکل شوہر کوئی ستر برس کا ہو

عورت۔ بھلا تمہیں بات میں نئی نکالنے سے کیا حاصل ہو رہا ہے؟ کیوں دل دکھاتے ہو؟

مرد۔ پھر مجھے باتوں میں اڑانے لگی ہو! بوڑھا گھاگ یقیناً تمہارا شوہر تھا۔

عورت۔ وہ میرا شوہر نہ تھا۔

مرد۔ اب تو بات کھل گئی ہے۔ میں تمہارے شوہر کا گھر گھاٹ، ٹھور ٹھکانا اور آگا تاگا لے چکا ہوں۔

عورت۔ اچھا وہ میرا شوہر تھا۔

مرد۔ پھر مجھ سے یہ فریب کیوں کھیلا تھا —— تصویر کس کی تھی؟

عورت۔ میں نے دہلی میں بکتی ہوئی خرید کی تھی۔

مرد۔ (جھنجھلا کر) کس لئے!

عورت۔ محض تم کو پریشان کرنے کے لئے —— میرا شکریہ ادا کرو کہ اس تصویر نے تم کو بنا دیا ہے۔ اب تم بانکے ترچھے، چھیل چھبیلے بن گئے ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ میں اُن دنوں تمہارے دامِ محبت میں بری طرح گرفتار تھی اس لئے ہر پہلو سے تم کو خوب صورت دیکھنا میری دلی آرزو تھی۔

مرد۔ ستم کیا! —— کان پکڑتا ہوں مگر یہ فریب کانٹے پر کی اوس تھا۔

عورت۔ وہ کیسے؟

مرد۔ اے آفت کی پڑیا! —— تمہارے شوہر کو دیکھ کر میرا دل آپے میں آ گیا تھا۔ کیونکہ تمہارا شوہر کسی نوع سے میرا لگا نہیں کھا سکتا تھا۔ اس لئے وہ جذبۂ رشک جاتا رہا اور میری آتشِ شوق ٹھنڈی پڑ گئی۔ اگر تم وہ خط بھول نہ جاتیں تو آج تک میں تمہارے دامِ محبت میں گرفتار رہتا۔

عورت۔ (صاف گوئی کے ساتھ) تم کس خیال میں ہو، بھلا مجھ ایسی عورت سے جو آسمان میں تھگلی لگا سکے بلا قصد اس قسم کی غفلت سرزد ہو سکتی ہے؟

مرد۔ پھر اس چلتر کا کیا مقصد تھا؟

عورت۔ وہ عورت جو اپنے شوہر کی آنکھ میں خاک جھونک کر اپنے چاہنے والے سے مل سکے وہ اس قدر بے پروا اور آٹے کی آپا نہیں ہو سکتی!

مرد۔ پھر تم عمداً وہ خط چھوڑ گئی تھیں؟

عورت۔ جی ہاں!

مرد۔ (شعلہ بھبوکا ہو کر) وہ کس لئے؟

عورت۔ تمہاری آتشِ شوق کو ٹھنڈا کرنے کے لئے تاکہ تم موقع پا کر میرے شوہر کو دیکھ لو۔ تمہاری لگی کو بجھانے کا یہی ایک طریقہ رہ گیا تھا —— وہ آندھی جو مجھے چڑھی ہوئی تھی اُتر چکی تھی اور میں تعلقات کا رشتہ توڑنا چاہتی تھی کیونکہ میں ہرجائی ہوں۔

مرد۔ توبہ! —— اب کیا ارادہ ہے؟

عورت میں کسی اور مرد کے ساتھ فریب کھیلنا چاہتی ہوں۔ خفا نہ ہونا، مرد اسی سلوک کے مستحق ہیں۔ خدا حافظ!

—— الوداع!!

[مرد حیرت و استعجاب کی تصویر بن کر رہ جاتا ہے اور عورت دائیں ہاتھ کا راستہ لے کر آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہے]

(مولنار)

صادق ایوبی

فردوسِ خیال

مرحبا اے دل! کہ وہ جانِ بہار آ ہی گیا
جس حیات افروز کا تھا انتظار آ ہی گیا

اک جہانِ رنگ و بُو بردوش ہے مستِ شباب
ہے جلو میں زندگی، رعنائیاں ہیں ہم رکاب

نوجوانی، جوش اور مستی شرابِ حُسن کی
حل ہوئے سیماب میں تو یہ قیامت ڈھل گئی

حشر برپا کر رہا ہے آج یہ مستِ خرام
ہو نہ جائے منتشر ربطِ عناصر کا نظام

موجزن ہے ہر طرف عالم میں طوفانِ حیات
نشۂ عیش و طرب میں جھومتی ہے کائنات

فیضِ موسم ہے کہ داغِ دل فروزاں ہو گئے
تارِ دامن روکشِ تارِ رگِ جاں ہو گئے

دل کی یہ حالت کہ سازِ نغمہ بے تاب ہے
جنبشِ موجِ نفس بھی جنبشِ مضراب ہے

اس نگاہِ فتنہ زا کی برق پاشی الاماں!
خون کے بدلے رگوں میں کوندتی ہیں بجلیاں

چہرۂ گلگوں پہ ہے چینِ جبیں کا پیچ و تاب
یا شفق کے جال میں الجھی شعاعِ آفتاب

مدبھری آنکھوں میں یوں کیفِ شرابِ لالہ فام
شوخیٔ رفتارِ ساقی جیسے چھلکاتی ہے جام

مسکرانے میں لبوں پر عکسِ دنداں ضو فگن
چومتی ہے منہ کلی کا چاند کی چنچل کرن

اک نظر دیکھے تو دم لعلِ بدخشاں چھوڑ دے
ہونٹ جیسے بارِ شبنم، گل کی پتی توڑ دے

خوش خرامی پر ہوئی موجِ صبا دل سے نثار
پانی پانی ہو رہا ہے شرم سے ابرِ بہار

ہے تری رفتار موجِ قلزمِ طوفانِ حسن
ہاں! ڈبو دے مجھ کو بھی اے بحرِ بے پایانِ حُسن

دور آنکھوں سے رہا گر آئینہ تو کیا ہوا!
تجھ میں اپنا عکس دیکھوں اس قدر نزدیک آ!

وہ ہنسا تقدیر چمکی، کارگر آہیں ہوئیں
عشق کے شانوں کی زینت حسن کی باہیں ہوئیں

کر چکا آرائشِ منزل فریبِ جستجو
اک طلسمِ خواب تھی یہ کائناتِ رنگ و بو

ظلمتِ شب میں سرابِ آرزو روپوش ہے
میں نے پا کر کھو دیا کچھ، صرف اتنا ہوش ہے

سکندر علی وجد

ٹالسٹائے کا مذہب

ٹالسٹائے عمر کے آخری سالوں میں فلسفیانہ، معاشرتی اور مذہبی مسائل کی طرف زیادہ راغب ہو گیا تھا۔ ۱۸۸۰ء کے بعد اس کی تمام تصانیف میں ان مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ اس نے اپنی کتاب (My Confession) میں اپنے مذہبی تجربات کے مختلف مدارج کو بیان کیا ہے جن میں سے اسے گزرنا پڑا۔ یہ کتاب ۱۸۸۲ء میں جنیوا میں شائع ہوئی تھی۔ ٹالسٹائے اپنے Confession میں اپنی گزشتہ تصنیفات کی تنقید کھلے طور پر بیان کرتا ہے۔ یہ اس اصول کا ایجاب ہے کہ مذہب کی مقدس فطرت کو جب دوسرے بیرونی لوازم سے علیحدہ کیا جاتا ہے تو یہ زندگی کا ایک قیمتی جزو بن جاتا ہے۔ ذیل میں ہم اس کتاب کا لب لباب قارئین ادبی دنیا کے پیش کرتے ہیں۔ (ر۔ م۔ ن۔)

اگرچہ میری تعلیم و تربیت ایک نہایت ہی راسخ الاعتقاد عیسائی گھرانے میں ہوئی تھی۔ لیکن جب میں اٹھارہ برس کی عمر میں یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہوا تو مذہب کے متعلق جو کچھ بھی مجھے بتایا گیا تھا میں نے اس پر اعتقاد رکھنا چھوڑ دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مذہبی تعلیم سے مجھے شروع ہی سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میں نے نہ صرف نماز کرنا ہی ترک کیا بلکہ گرجا میں جانا اور روزے رکھنا بھی چھوڑ دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب باوجود خدا کی ہستی کا قائل ہونے کے میرے دل میں خدا کی حقیقت اور یسوع مسیح کی تعلیم کے متعلق کوئی خیال موجود نہ تھا۔

جب میرے دل میں نیک اور پاک طینت بننے کے لئے کوئی خیال پیدا ہوا اور اس کا اظہار کیا گیا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لوگ مجھے ہنسی اور تمسخر کا ہدف بنا رہے ہیں۔ لیکن برعکس اس کے میرے برے کاموں کا نتیجہ میری شہرت کی صورت میں نمودار ہوا۔

اب جبکہ میں اپنی گزشتہ زندگی پر ایک عمیق نظر ڈالتا ہوں تو ایک نامعلوم خوف سے تھرا اٹھتا ہوں۔ کیونکہ یہ وہ زمانہ تھا جب میں میدان جنگ میں بے گناہ لوگوں کے قتل، قماربازی، مکر و فریب اور رنڈیوں کے گاڑھے پسینے کی کمائی کے لٹانے کا سبب بنا ہوا تھا۔ یہ سلسلہ دس سال تک جاری رہا اس کے بعد میں تالیف و تصنیف کی طرف رجوع ہوا لیکن اس پیشے کا مقصد میرے سامنے کمینگی کے سوا کچھ نہ تھا، کیونکہ میرا مدعا دولت اکٹھی کرنا اور خوشامد پسندی تھا۔

میری آرزوؤں کا قابل قدر صلہ مجھے اس وقت ملا جب میں چھبیس سال کی عمر میں سینٹ پیٹرزبرگ گیا اور وہاں کے شہرہ آفاق مصنفین نے میری ادبی قابلیت کا اعتراف کرتے ہوئے میرا پرمسرت استقبال کیا۔ وہ خونیں جنگ جس کے متعلق رزم گاہ سے واپس آ کر میں نے بہت کچھ لکھا تھا ابھی ختم ہوئی تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ خواص (Intellegentia) میں یہ خیال پیدا ہو چلا ہے کہ مصنفوں، فلسفیوں اور شاعروں کا فرض صرف پیغام دینا ہے۔ ان کا یہ فرض ان پر اس لئے عاید نہیں ہوتا کہ وہ جانتے ہیں اور سمجھتے ہیں بلکہ اس لئے کہ ان میں یہ صلاحیت فطرتی ہے۔ میں نے اس فلسفہ پر عمل کرتے ہوئے ایک شاعر اور فلسفی کی حیثیت سے بہت کچھ لکھا اور اس کا پرچار کیا لیکن میں نہیں جانتا کہ یہ سب کچھ کیا ہے۔ میری قلمی کاوشوں کا مجھے شاندار معاوضہ ملا اور تین سال تک میں دل کھول کر عیش و عشرت میں مشغول رہا۔

اس طرح میں علم ادب کے درخشندہ ستاروں میں شمار ہونے لگا۔ ایک طویل مدت تک اس ادبی عقیدہ کی صحت میں مجھے کوئی شک نہ ہوا لیکن جب اس تگ و دو میں تین سال گذر گئے تو میرے دل و دماغ پر مہیب شکوک طاری ہونے لگے۔ مجھے اس نظریے کی بنیادیں متزلزل معلوم ہونے لگیں۔ اس اصول کے پیروؤں میں اختلاف تھا۔ وہ ایک دوسرے کو دھوکا دینے، گالی گلوچ اور لڑنے جھگڑنے میں مصروف رہتے تھے۔ ان میں سے بہت سے ایسے تھے جو پرلے درجے کے لالچی اور بد اخلاق تھے۔ مجھے اپنی ذات اور دوسرے انسانوں سے نفرت ہونے لگی۔ اب

میری غلطی یہ تھی کہ اگرچہ میری آنکھیں میرے اپنے رستے کی خامیوں کو دیکھ رہی تھیں لیکن پھر بھی میں اس سے علیحدہ نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ میں اپنے خیال میں ایک شاعر، فلسفی اور معلم کی حیثیت سے دوسروں کو پیغام دے رہا تھا خواہ اس پیغام کی حقیقت کو میں خود بھی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اس طرح علم و ادب کے ساتھ میرے تعلقات سے میرے گناہوں میں ایک اور قصور کا اضافہ ہوا میں جب زندگی کے اس دور پر نظر ڈالتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ میری ایک طرح کی دیوانگی کا زمانہ تھا ہم میں سے سینکڑوں لوگوں کو پیغام دے رہے تھے جب کہ ہماری اپنی قلمیں آپس میں ایک دوسرے کے خلاف زہر اگل رہی تھیں۔ چونکہ ہم بے عمل تھے اس لئے ہمارا پیغام لوگوں پر کوئی اثر نہ کر سکا۔ تاہم تمام روس میں ہماری تصنیفات کا ایک سیلاب امنڈ آیا لیکن ہمیں اس بات سے بہت اذیت ہوئی کہ ہماری چیخ پکار صدا بصحرا ہو کر رہ گئی ہے

(۲)

میں شادی کرنے سے قبل تمام یورپ کی سیاحت کے لئے نکلا میرے دل میں تمام فنون کی تکمیل کا از حد شوق تھا۔ کیونکہ اس زمانے میں خواص کے نزدیک یہ مسئلہ بہت اہمیت رکھتا تھا۔ متمدن طبقات ترقی "Progress" کے نظریے کے بہت حامی تھے۔ اگرچہ یہ اصطلاح مختلف لوگوں کے نزدیک مختلف معنی کی حامل تھی۔ دوران سفر میں جب میں نے پیرس میں ایک شخص کو پھانسی کے تختے پر لٹکتے دیکھا تو میں بہت خوف زدہ ہوا۔ میری آنکھوں کے سامنے وہ غلطی اپنی اصلی صورت میں ظاہر ہوئی جو "انسانی خرد" کے بارے میں مستور تھی۔ اس وقت میں نے محسوس کیا کہ "نظریۂ تمدن" کی حقیقت ایک وہم سے بڑھ کر نہیں ہے۔ میرے اس خیال کو میرے بھائی کی موت کے المناک حادثے سے اور بھی تقویت پہنچی جو ایک سال تک بیمار رہنے کے بعد اس دنیا سے فانی سے ہمیشہ کے لئے کوچ کر گیا۔

میرا بھائی ایک نہایت ہی پاک طینت، صاحب خرد اور سنجیدہ نوجوان تھا۔ لیکن وہ اس دنیا سے اس بات کے جاننے کے بغیر ہی چل بسا کہ اس کا دنیا میں آنے کا مقصد کیا تھا اور اس کی موت میں کیا راز پوشیدہ ہے۔ مجھے اس ترکیب کے پیش نظر تمام نظریے بے وقعت اور بے فائدہ معلوم ہوتے تھے۔ روس میں واپس آ کر میں نے اپنے دیہاتی مکان میں رہائش اختیار کی اور کسانوں کے لئے درسگاہیں قائم کرنے کا کام شروع کیا۔ میں اپنی اس نئی سعی میں حقیقی جوش و خروش محسوس کر رہا تھا کیونکہ میں ابھی تک بڑی حد تک "تمدن کے عروج کے لئے" ترقی کو ضروری سمجھتا تھا۔ میں نے خیال کیا کہ گو جیسے متمدن اشخاص کی تعلیم اور خیالات بھی مختلف ہیں اور وہ کسی ایک نقطہ پر بھی متفق نہیں تاہم کسانوں کے بچوں کی تعلیم کی صورت میں اس مشکل کو اس طرح حل کیا جا سکتا ہے کہ ان کی پسند کے مطابق ان کو تعلیم دی جائے

میں نے اپنے اخبار کے ذریعے عوام کو ان لوگوں کے مختلف نظریے سے برگشتہ کرنے کی کوشش کی لیکن مجھے پھر بھی تسکین قلب حاصل نہ ہوئی میرے دل کو زیادہ سے زیادہ اذیت پہنچی گئی۔ یہاں تک کہ پریشان کن خیالات نے میری دماغی طاقتوں کو بہت نقصان پہنچایا۔ میں ناراض ہوا۔ گھوڑی کے دودھ اور سادہ زندگی کی تلاش میں سٹیپ (Steppe) کے میدانوں کی طرف روانہ ہو گیا۔ جاگیر میں تھوڑا عرصہ قیام کے بعد میں نے شادی کر لی۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا میں اپنے بال بچوں اور بیوی کے آرام و آسائش کے لئے خوشی سے کوشاں رہا۔ پندرہ سال تک "انفرادی تکمیل" کے پرانے خیال کو بھول کر فارغ البال خانگی زندگی بسر کی۔ کیونکہ بال بچوں کی فلاح و بہبود کے خیال نے اس خواہش کی جگہ لے لی تھی۔

لیکن اس دوران میں بھی میں نے تالیف و تصنیف کا کام جاری رکھا جس سے مجھے کافی دولت اور شہرت حاصل ہوئی۔ اس دور میں جو کچھ میں نے لکھا اس میں اس خیال کا پرچار کیا جو میرے نزدیک واحد صداقت تھا۔ کہ ہماری حیات کا مقصد اپنی خوشی اور اپنے خاندان کی راحت حاصل کرنا ہے۔

لیکن یہ خوشی بھی میرے لئے کوئی ابدی خوشی ثابت نہ ہوئی۔ بلکہ آج سے پانچ سال پہلے مجھے پھر دماغی پریشانی کا شکار ہونا پڑا۔ میں ناامید ہو گیا۔ میری پریشانی بڑھتی گئی "کیوں" اور اس کے بعد "کیا" کے پریشان کن سوالات نے میری دماغی طاقتوں کو بہت اذیت پہنچائی۔ ان سوالات نے بتدریج ایک خاص شکل اختیار کر لی۔ میں نے اپنے آپ سے پوچھا "میرے پاس حکومت سمارا میں چھ ہزار ایکڑ زمین ہے اور تین سو گھوڑے ہیں۔ لیکن پھر کیا؟" باوجود سخت کوشش کے اس سوال کا جواب مجھے نہ مل سکا میرے نزدیک اب زندگی کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی۔ یہ ایک بے حقیقت چیز تھی۔ میں ایک تندرست اور فارغ البال آدمی تھا لیکن پھر بھی زندگی مجھے ایک بے مقصد چیز نظر آتی تھی۔ مجھے اکثر خودکشی کا خیال پریشان رکھتا تھا اگرچہ میرا اس جرم کے مرتکب ہونے کا کوئی ارادہ نہ تھا

(۳)

جب میں نے عمر کے پچاسویں سال میں قدم رکھا تو "زندگی کیا ہے؟" کے سوال نے مجھے بہت مایوس کر دیا تھا۔ اس مرکزی سوال کے گرد اور بہت سے شکوک و شبہات جمع ہو گئے: "میرے زندہ رہنے کا کیا مقصد ہے؟" "مجھے کوئی کام کیوں کرنا چاہئے؟" "کیا زندگی میں کوئی ایسی خصوصیت ہے جو موت پر قابو پا سکے؟" یہ تھے سوالات جن کا باوجود سخت تحقیق و تدقیق کے مجھ پر کوئی راز نہ کھل سکا۔ اگر مجھے کچھ معلوم ہوا تو صرف یہ کہ انسانی دماغ ان مسائل کو حل کرنے سے قاصر ہے۔

مجھے معلوم ہوا کہ نہ صرف حضرت سلیمان ہی نے زندگی سے نفرت کا اعلان کیا اور کہا کہ تمام دنیوی چیزیں روح کی تکلیف کا باعث ہیں بلکہ ہندوستانی رشی ساکیہ منی بھی پکار اٹھا کہ حیات ایک "بڑی بدی" ہے۔ سقراط اور شوپنہار نے بھی ایک قدم آگے بڑھے اور کہا کہ "فنا" ایک ایسی چیز ہے جس کے لئے ہر فرد بشر کو آرزو مند رہنا چاہئے۔ لیکن نہ ان بڑے فلسفیوں کے خیالات نے اور نہ میری اپنی عقل نے مجھے اپنے آپ کو تباہ کرنے پر آمادہ کیا۔ کیونکہ عین اس کشمکش میں ایک اندرونی آواز نے مجھے زندگی کے وجود سے آگاہ کیا۔ مجھے ایسا معلوم ہونے لگا کہ زندگی کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہے۔ اس خیال نے میری مایوسی کو دبا کر مجھے روح کی تکلیف سے بچا لیا۔ میں نے محسوس کیا کہ زندگی کا مطالعہ کرنے اور اس کا مقصد سمجھنے کے لئے مجھے اپنے طبقے کے لوگوں کو چھوڑ کر کروڑوں عوام میں جا ملنا ہوا پڑے گا۔ کیونکہ میرے نزدیک زندگی کا صحیح مطالعہ صرف اس صورت میں کیا جا سکتا ہے جس صورت میں وہ عوام کے درمیان ہے۔ میں آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ علم جو دلائل پر مبنی ہے اور جس کا متمدن لوگوں میں چرچا ہے وہ زندگی کے سربستہ راز کا انکشاف کرنے سے قاصر ہے۔ برخلاف اس کے عوام میں حیات کا ایک غیر مدلل احساس ہے جو حیات کے اعلیٰ ترین مقاصد سے ہمیں آشنا کرتا ہے۔

یہی غیر مدلل علم، وہ عقیدہ تھا جس کو میں ناکارہ سمجھ رہا تھا۔ ایک خدا میں تین خداؤں کا تصور، شیطانوں، عفریتوں، بھوتوں اور فرشتوں کی پیدائش میں اعتقاد رکھنا ایک ایسی چیز تھی جس کو میں نہ دیکھ سکتا تھا نہ سمجھ سکتا تھا۔ یہ چیزیں سراپا خلاف عقل معلوم ہوتی تھیں۔ میں نے سخت مایوسی کی حالت میں سوچنا شروع کیا کہ شاید میں جن چیزوں کو معقول سمجھ رہا ہوں وہ ایسی نہ ہوں جیسا کہ مجھے دکھائی دیتی ہیں اور جن چیزوں کو خلافِ عقل تصور کر رہا ہوں وہ بھی حقیقت میں ایسی نہ ہوں۔

اب میں اچھی طرح سمجھ گیا کہ علمی تحقیق میرے سوالات کا جواب دینے سے عاجز ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ اگرچہ مذہب خلافِ عقل جوابات دے رہا ہے لیکن یہ جوابات یقیناً ایک اہم مسئلہ کو حل کر رہے ہیں۔ انہوں نے کم از کم میرے لئے "محدود" کا تعلق "غیر محدود" سے منکشف کر دیا۔

مذہب کیا ہے؟ یہ صرف خدا اور غیبی طاقتوں میں انسانی اعتقاد کا نام نہیں ہے بلکہ یہ زندگی کے مقاصد کا سمجھنا ہے۔ یہ زندگی کی طاقت ہے۔ میں نے اس درجے پر پہنچ کر سمجھنا شروع کیا کہ انسانی عقل کے عمیق ترین ماخذ کا پتہ اُن جوابات میں مل سکتا ہے جو مذہب نے پیش کئے ہیں۔ مجھے کوئی حق حاصل نہیں کہ اُن کے خلاف علمِ بغاوت بلند کروں کیونکہ صرف وہی زندگی کے پیچیدہ مسئلے کو حل کر سکتے ہیں۔

(۴)

لیکن پھر بھی مجھے گوہرِ مقصود ہاتھ نہ آیا۔ میرا دل معرفت کے نور سے روشن نہ ہو سکا۔ میں نے بدھ مذہب، اسلام اور عیسائیت کی مقدس کتب کو پڑھا۔ مذہبی پیشواؤں، راہبوں اور صوفیوں کی زندگیوں کا مطالعہ کیا جو صرف خدا کو ہی نجات کا واحد ذریعہ سمجھتے تھے۔ میں نے اُن سے دریافت کیا کہ تم اپنے اعتقادات کی روشنی میں زندگی کی تعبیر کیسے کرو گے! لیکن میں ان میں سے کسی ایک کے عقیدے کا بھی پیرو نہ ہو سکا کیونکہ میں نے دیکھ لیا تھا کہ ان میں سے ایک نے بھی مسئلہ حیات کو حل کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اس کو اور زیادہ پیچیدہ بنا دیا ہے۔ اس طرح ایک دفعہ پھر مایوسی کا مہیب احساس میرے دل و دماغ پر چھا گیا۔

اُن اشخاص کا عقیدہ مجھے اپنی طرف نہ کھینچ سکا جو خود اُن اصولوں میں مخلص نہ تھے جن کا وہ پرچار کرتے تھے۔ یہ محسوس کر کے کہ وہ علم پر عمل نہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں اور وہ بھی میری طرح نفسانی خواہشات کے غلام ہیں مجھے سخت رنج ہوا۔ میں اُن کی طرف سے منہ موڑ کر سادہ جاہل غربا، کسانوں، جاتریوں اور تارک الدنیا لوگوں کے قریب زندگی کی تلاش میں چلا آیا۔

جتنا زیادہ میں سادہ عوام کی زندگیوں کو سمجھتا گیا۔ اتنا ہی زیادہ میں اُن کے اعتقادات کا گرویدہ ہوتا گیا، اور یہی مذہبی حقیقت میں نے اُن کے لئے اشد ضروری خیال کی۔ کیونکہ یہی دلیل بازی سے پاکیز

مذہب وہ چیز تھی جو زندگی کے معنی کو تفصیل سے بیان کر سکتی تھی اور دنیا کو ایک بہشت کی صورت میں پیش کر سکتی تھی۔ جو کچھ میں نے اس پس ماندہ طبقے میں دیکھا وہ میرے اپنے طبقے کے لوگوں کے افعال و اعمال کے بالکل برعکس تھا۔ میرے طبقے میں مذہب کے بغیر زندگی کا امکان تھا۔ یہاں ہزاروں مبلغوں اور واعظوں میں ایک بھی صحیح راستہ پر نہ تھا۔ حالانکہ مزدور جماعتوں میں ہزاروں میں ایک بھی ملحد نہ تھا۔

جتنا زیادہ میں ان مخلص لوگوں کے قریب تر ہوتا گیا اتنا ہی زیادہ میں اُن کو پسند کرنے لگا۔ مجھے حقیقی معنوں میں زندہ رہنا آسان معلوم ہونے لگا۔ دو سال تک میں اُن کے نقش میں رہا۔ مجھے اپنی متمول اور متمدن جماعت کی زندگی بری معلوم ہونے لگی۔ یہ مجھے بچوں کے خالی کھلونوں کی طرح دکھائی دیتی تھی۔ برخلاف اس کے مزدور جماعتوں کی زندگی اپنی صحیح اور اصلی صورت میں مجھے نظر آنے لگی۔

اب میں سمجھنے لگا کہ میں نے حیات کے مقاصد سمجھنے میں کہاں کہاں غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ میری غلطی یہ تھی کہ میں نے زندگی کے متعلق سوال کے جواب میں اپنی زندگی کو پیش کیا نہ کہ عوام کی زندگی کو۔ میری زندگی میری نفسانی خواہشات کی غلامی میں گزر رہی تھی۔ یہ بے معنی اور بے مقصد تھی۔ اس لئے ایسا جواب زندگی کے مسئلے کا حل نہیں ہو سکتا تھا۔

میں نے دوسروں کی کبھی مدد نہ کی تھی۔ پورے تیس سال تک میری زندگی مزدوروں کے خون پر پرورش پاتی رہی۔ میں مقصدِ حیات سے ناواقف رہنے پر قانع رہا۔

کائنات کے پس پردہ ایک زبردست طاقت کام کرتی ہے۔ یہی طاقت کائناتی زندگی کا ماخذ ہے۔ اسی بڑی طاقت کے سمجھنے کے لئے ہمیں بغیر کسی حیل و حجت کے اس کے تابع فرمان ہونا چاہیئے۔ مزدور اپنے مالکوں کے خلاف کوئی شکوہ شکایت نہیں کر سکتے۔ جب مالک اُن کی مرضی کے مطابق اُن سے سلوک کرتے ہیں اگرچہ ہم اُن کو درندوں سے تشبیہہ دینے کے عادی ہیں۔ برخلاف اس کے ہم جو اپنے آپ کو صاحب خرد سمجھتے ہیں اور اپنے مالک کی پیدا کردہ اشیا کو اپنے استعمال میں لاتے ہیں کبھی اُن فرائض کو خوشی سے سرانجام نہیں دیتے جو اُس نے ہم پر عاید کئے ہیں۔ ہم ان فرائض کی انجام دہی کو احمقانہ حرکت تصور کرتے ہیں۔ ہماری ایسی حرکت کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟ یہ کہ یا ہمارا مالک بے وقوف ہے یا ہمارا کوئی مالک ہی نہیں۔

(۵)

خیالات کی اس ادھیڑبن کے بعد میں آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ دلائل پر مبنی علم غلطی کا مرتکب ہوتا ہے اور یہ کہ صداقت کا علم صرف سادہ اور بے عیب زندگی بسر کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ مجھے اب جھیڑیوں کی سی زندگی کے بجائے ایک حقیقی زندگی کا متلاشی ہونا چاہیئے اور یہ کہ زندگی کے معنی صرف اس صورت میں سمجھے جا سکتے ہیں کہ بڑے انسانی قبیلہ (Great Human Community) کی مجموعی زندگیوں کا مطالعہ کیا جائے۔

ان تمام تجربات اور مشاہدات کے دوران میں میرے دل کے احساسات ایک اندرونی درد کے ساتھ گھل مل گئے۔ اس تجربے کو میں صرف اس صورت میں الفاظ کا لباس پہنا سکتا ہوں کہ یہ خدا کی تلاش تھی۔ یہ تلاش ایک جذبہ تھا نہ کہ علمی تحقیق۔ یہ وہ جذبہ تھا جو میرے دل کی گہرائیوں سے نکلا تھا اور جو میرے سوچنے بچار کے طریقے کے بالکل برعکس تھا۔

کانٹ خدا کی ہستی کو ثابت کرنے سے قاصر رہا۔ لیکن پھر بھی مجھے اپنے گوہر مقصود کے ہاتھ آنے کی امید تھی۔ میں ابھی تک دعاؤں میں اس کو مخاطب کرتا تھا ــــ لیکن پھر بھی میں نے اُس کو نہ پایا جس کا میں متلاشی تھا۔

اکثر اوقات میں کانٹ اور شوپنہار کے فلسفہ کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا تھا اور دلائل پیش کرتا تھا کہ علت و معلول کا اُس سلسلے سے کوئی تعلق نہیں جس سے زمان و مکان اور خیال کا تعلق ہے۔ میں نے خیال کیا کہ اگر میں کتم عدم سے معرض وجود میں آیا تو اس کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہے اور یہی سبب تمام اسباب کا سبب ہے۔ بڑے غور و خوض کے بعد آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ تمام کائنات کا سبب وہی مبدء حقیقی ہے جسے لوگ خدا کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ مجھے ایک بالاتر ہستی کا براہ راست پتہ چلا جس نے مجھ میں زندگی کے امکان کا احساس پیدا کیا۔ میں نے اپنے دل سے سوال کیا "یہ سبب کیا ہے؟ اور میرا تعلق اس سبب سے کیا ہے جسے میں خدا کے نام سے پکارتا ہوں؟"

میرے اس سوال کا جواب مجھے وہی پرانا آشنا جواب ملا کہ خدا تمام کائنات کا پیدا کرنے والا ہے اور تمام کی پرورش کرنے والا ہے لیکن یہ جواب پہلی طرح مجھے اب بھی کوئی تسلی نہ دے سکا۔ میں غیر مطمئن اور مخوف

... جتنی زیادہ میں نے دعائیں مانگیں اتنا ہی زیادہ مجھے یقین ہوا کہ میری آہ و فریاد کی کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔

لیکن یہ خیال بار بار میرے دل میں پیدا ہوتا رہا کہ جس طاقت نے مجھے اس دنیا میں بھیجا ہے اس کا ایسا کرنے میں کوئی نہ کوئی مطلب ضرور ہے اس طرح خدا کی ہستی کا قائل ہونے کے بعد مجھے اس کے ساتھ اپنے تعلقات کی کھوج ہوئی اور معلوم ہوا کہ وہ اپنے بیٹے یسوع مسیح کے ذریعے ہمارا نجات دہندہ ہے لیکن یہ عقیدہ بھی مجھے اپنی ذات اور دنیا سے بہت دور اور الگ تھلگ نظر آیا اور یہ خدا پگھلتی ہوئی برف کی طرح میری آنکھوں کے سامنے سے مٹ گیا ایک دفعہ پھر میں ہستی کے بے پایاں سمندر میں مخالف ہواؤں کے تھپیڑوں کا شکار رہا۔

اس طرح مدت تک میں کبھی مایوس اور کبھی مسرور ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ شب میں ایک سنسان جنگل میں آوازیں سن رہا تھا اور چاروں طرف سناٹے کا عالم طاری تھا۔ ابتدائے بہار کے اس دن جب میں اپنے خیالات کی دنیا میں خدا کی تلاش کر رہا تھا یکایک روحانی مسرت کے ایک چمکارے نے میرے دل کو منور کر دیا۔ اس وقت میں نے جانا کہ خدا کا خیال "خدا کی ذات" نہیں تھا میں نے محسوس کیا کہ میں صرف خدا کا حقیقی پرستار بن کر ہی حقیقی زندگی سے لطف اندوز ہو سکتا ہوں۔

خدا زندگی ہے۔

دنیا میں رہنے کا مقصد صرف خدا کی تلاش ہے۔ زندگی کا امکان خدا کے بغیر ناممکن ہے۔ اس وقت جو سوز میرے دل میں چمکا وہ مجھ سے کبھی جدا نہ ہوا۔ میں نے اپنے طبقے کی زندگی سے نفرت کا اظہار کیا کیونکہ یہ بے حقیقت تھی اور اس کے افراد کی حد سے بڑھی ہوئی عیاشی نے زندگی کے مقصد کو سمجھنا بہت مشکل بنا دیا تھا۔ میرے اردگرد کے سادہ لوگ اور مزدور جو حقیقی اصلی روسی قوم تھے انہوں نے مجھے زندگی کے معنی اور اعلیٰ ترین مقاصد سے آشنا کر دیا تھا یہ معنی الفاظ کی صورت میں اس طرح بیان کئے جا سکتے ہیں۔

ہم میں سے ہر ایک کو خدا اس طریقے سے پیدا کرتا ہے کہ اگر انسان چاہے تو اپنی روح کو ضائع کرے یا بچا لے۔ اگر وہ اپنی روح کو بچانا چاہتا ہے تو خدا کے احکام پر عمل کرے اور عجز، خیرات اور صبر و قناعت کو اپنا شعار بنائے اور زندگی کی تمام دوسری چند روزہ خوشیوں کو ترک کر دے —— یہ ہے عام لوگوں کے لئے تمام مذہبی نظام کا مطلب جو ان کو آباؤ اجداد کی طرف سے ورثے میں ملا ہے۔

محمد یعقوب بی اے

غزل

بہت اغماض بھی اچھا نہیں ہے ہمارا کوئی حق ہے یا نہیں ہے!

ضرورت تھی کہ تو غافل نہ ہوتا مگر تقدیر سے ایسا نہیں ہے

منانا ہے تو کوتاہی نہ فرما بسکتا چھوڑنا اچھا نہیں ہے

کسی کو تیری نسبت کیا بتا دوں یہ دیکھا ہے کہ کچھ دیکھا نہیں ہے

کبھی اپنے سلوکوں پر نظر کر شکایت ہو تو کچھ بے جا نہیں ہے

نگاہ لطف کی تکلیف فرما کہ ضبطِ شوق کا یارا نہیں ہے

تعلق جان کو آیا ہوا ہے ترے ہوتے بھی صبر آتا نہیں ہے

کبھی وہ سنگدل تک مہرباں تھا اور اب قسمت سے بھی لینا نہیں ہے

ترے حجاب اور یہ کس مپرسی تجھے کیا واقعی پروا نہیں ہے

ادھر بھی۔ اک نگاہ لطف ادھر بھی

غریب آزاد مستثنیٰ نہیں ہے

حکیم آزاد انصاری

رہزنی

وہ دِل، وہ ذوقِ شعر و نوا کون لے گیا   وہ دن، وہ جشنِ صبح و مسا کون لے گیا

رنگینیٔ بہار کا افسوں کدھر گیا   سرمستیٔ خرامِ صبا کون لے گیا

وہ پرتوِ شراب سے زائد حسیں نظر   اے ساقیٔ فسردہ نوا! کون لے گیا

وہ دل میں جذب ہوتا ہوا نطقِ بانفزا   اس نطقِ جاں فزا کا مزا کون لے گیا

میرے لبوں کی تشنہ مزاجی کدھر گئی   تیرے دہن کا آبِ بقا کون لے گیا

وہ رقصِ گرم جوش، وہ طوفانِ بےخودی   وہ انبساطِ لغزشِ پا کون لے گیا

وہ شغل جن پہ جنتیں قرباں، وہ واقعات   جن کا کوئی جواب نہ تھا، کون لے گیا

وہ سجدہ ہائے مست و دل آویز کیا ہوئے   وہ عرش دوست ذوقِ دعا کون لے گیا

وہ گرمیٔ نیازِ جنوں کار کیا ہوئی   وہ حدّتِ خلوص و وفا کون لے گیا

اُس شوخ کے تلّونِ دلکش کو کیا ہوا   کافر کی خوئے جور و جفا کون لے گیا

وہ رُت، وہ کائنات، وہ اسبابِ زندگی   وہ ہم نفس، وہ آب و ہوا کون لے گیا

دنیا سے کیا، خدا سے بھی پرہیز ہے عدمؔ
مت پوچھ جوئے صبر و رضا کون لے گیا

عدمؔ

اِنتقام

میں ایک معمولی کاشتکار ہوں۔ میری عمر بیالیس کے لگ بھگ ہے انگلستان کے شمال میں ایک چھوٹا سا قصبہ مانٹیر ہے جس میں تھوڑی سی زمین مجھے ورثہ کے طور پر ملی ہوئی ہے جو میرے گزارے کے لئے بہت مشکل سے کفائت کرتی ہے۔ یہ زمین پتھریلی ہے، زرخیز نہیں۔ اس لئے سخت محنت کرنے کے باوجود بھی پیداوار بہت کم ہوتی ہے۔ میں نے چند ایک گائیں بھی رکھی ہوئی ہیں تاکہ ان کا دودھ بیچ کر اپنی آمدنی میں اضافہ کر سکوں۔ مگر یہاں کے مکانات اور خاص طور پر ڈھور ڈنگر باندھنے کے کمرے ایسے بنے ہوئے ہیں کہ ہر سال مرمت طلب ہو جاتے ہیں۔ جس سے میری مالی مشکلات میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ مگر قہرِ درویش بر جان درویش جس طرح سے بھی ہوتا ہے۔ گزر اوقات کرتا ہوں۔

جب میں نے یہ کام سنبھالا تو میں جوان تھا۔ بدن میں طاقت و ہمت تھی اس لئے صبح سے لے کر ستاروں کی روشنی تک میں اپنے کام میں مصروف رہتا۔ میرا بوڑھا باپ بھی کبھی کبھی میرے کاموں میں میرا ہاتھ بٹا دیتا۔ اتوار کا دن میرے لئے آرام کا دن ہوتا۔ میں گاؤں کے اس گرجا میں جاتا جہاں اور میرے جیسے غریب کاشتکار عبادت کے لئے جمع ہوتے۔ میری آواز میں ایک سحر تھا۔ دلکشی تھی۔ اس لئے میں گرجا کی گانے والی پارٹی کا ایک معزز ممبر تھا اور میں اسے اپنے لئے ایک بہت بڑی عزت سمجھتا تھا۔

جب میں بائیس سال کا تھا تو میں نے ایک لڑکی سے شادی کر لی جس کا نام ایڈنا تھا۔ وہ بڑی پیاری لڑکی تھی۔ اس کی بھوری آنکھیں اور سیاہ بال بہت بھلے معلوم ہوتے تھے۔ اپنے سر کو ناز سے ایک طرف جنبش دے کر کن انکھیوں سے دیکھنا اس کا ایک خاص انداز تھا۔ جب وہ مسکراتی تو اس کے خوبصورت چہرے پر چھوٹے چھوٹے گڑھے پڑ جاتے جس سے اس کے حسن میں اور اضافہ ہو جاتا۔

میں نے اسے پہلی بار گرجا میں دیکھا۔ اور ایک ہی نظر میں دل دے بیٹھا۔ وہ مانٹیر میں سیر و تفریح کے لئے اپنی سہیلیوں کے پاس آئی ہوئی تھی۔ میں جتنا وقت بھی اپنے کام میں سے بچا سکتا تھا بچاتا اور اس کی صحبت میں گزارتا۔ اسے بھی مجھ سے عشق ہو گیا تھا۔ میں ایک مضبوط۔ دراز قد اور خوبصورت بالوں والا لڑکا تھا۔ ایڈنا ہارمونیم بجاتی اور میں جذبات سے بھرے ہوئے محبت کے گیت گاتا۔ اور اس طرح ہم دونو کچھ دیر کے لئے محبت کی ایک نئی دنیا بساتے اور اس کی بے پناہ وسعتوں میں اپنے آپ کو گم کر دیتے۔

ایک اُداس شام تھی۔ میں اور ایڈنا ایک باغ میں اکٹھے بیٹھے ہوئے تھے۔ دوسرے دن ایڈنا اپنے گھر واپس جا رہی تھی۔ یہ خیال میرے لئے سوہانِ روح ثابت ہو رہا تھا۔ جدائی کا طویل زمانہ مستقبل کی تاریکیوں میں مل جل کر ایک مہیب ڈراؤنی شکل پیش کر رہا تھا۔ میں اپنے جذبات میں گم تھا۔ رات کی تاریکیاں آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھیں۔ اگست کا وسط تھا۔ پروانے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ باغ میں ہر طرف خاموشی تھی۔ مگر دور کوئی گا رہا تھا۔ دھیمی آواز تھی۔ دُکھ بھرا لہجہ تھا۔ ستاروں کی مدھم روشنی میں یہ محبت کا پُردرد گیت میرے جذبات کی دُنیا میں اور بھی ہلچل مچا رہا تھا کہ یکایک ایک ستارہ آسمان سے ٹوٹا۔ ایڈنا کانپ گئی اور خوفزدہ حالت میں میرے قریب ہوتے ہوئے بولی "جان! یہ بُری قسمت کی نشانی ہے"۔ میں نے اپنا بازو اُس کی کمر کے گرد ڈال دیا اور اُسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ وہ ایک چھوٹی سی نرم و نازک گڑیا معلوم ہوتی تھی۔ اُس کے بالوں سے رات رانی کے کھِلے ہوئے پھولوں کی سی خوشبو بکھری پڑتی تھی۔ "نہیں پیاری۔ ہرگز نہیں"۔ میں نے جذبات سے کانپتی ہوئی آواز سے کہا۔ مگر وہ اپنی ضد پر قائم تھی۔ کہنے لگی "نہیں جان یہ بدنصیبی کی نشانی ہے۔ شاید ہم پھر کبھی ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکیں"۔

میرے لئے یہ ایک اشارہ تھا۔ میں نے کہا "ایڈنا اگر تم چاہو۔ تو ہم کبھی بھی جدا نہیں ہو سکتے۔ میں تمہیں بہت چاہتا ہوں۔ کیا تم ایک کاشتکار کی بیوی بننا پسند کرو گی۔ پیاری ایڈنا میں تمہارے سوا کسی لڑکی سے شادی نہیں کرونگا"۔

اُس نے اپنے بازو میری گردن کے گرد حمائل کر دیئے اور کہنے لگی "جہاں تم ہوگے، وہاں صحرا بھی میرے لئے گلشن ہوگا۔ مگر دوسرے آدمی کے ساتھ مجھے محلات بھی سونے نظر آئیں گے"۔ ان الفاظ سے میرے جسم میں خوشی و مسرت کی لہر پ

دوڑ گئیں۔ ستارے مُسکراتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔

ہوا درختوں میں سے رباب آسا نغمے بکھیرتی ہوئی جا رہی تھی اور میں زندگی کے سہانے خواب دیکھ رہا تھا۔ مگر فراق کی تلخیاں ابھی میری قسمت میں لکھی تھیں۔ ایڈنا کے والدین مصر تھے کہ وہ ابھی شادی نہ کرے کیونکہ ابھی کمسن ہے۔ اس لئے وہ تمام سردیوں کا موسم میں نے ایڈنا کو لمبے محبت بھرے خطوط لکھنے میں گزارا اور جب اس کی یاد بہت ستاتی تو اس کے وہ مختصر سے خطوط جن کے لفظ لفظ سے شرم وحیا کے چشمے اُبلا کرتے تھے، میری تسکین کا باعث بنتے۔

موسم بہار کے آغاز میں اچانک میری والدہ کی موت واقع ہو گئی۔ ایڈنا نے جب یہ سنا تو اُس نے آ کر ہمارے گھر کے کام کاج کو سنبھال لیا اور جون کے مہینے میں ہماری شادی ہو گئی۔ زمانہ گزرتا گیا۔ مجھے کھیتوں پر سخت محنت کرنی پڑتی تھی۔ لوگ اکثر کہتے کہ میں نے شادی کرنے میں غلطی کی ہے۔ مجھے کسی مضبوط جسم کی دیہاتی لڑکی سے شادی کرنی چاہیئے تھی۔ جو میرے کاموں میں میری مدد کر سکتی۔ لیکن میرے دل میں میری نازک اور محبت سے بھری ہوئی ایڈنا کے خلاف خیال تک نہ گزرتا۔ اور میں دنیا کی مضبوط اور تندرست لڑکیاں اُس پر قربان کرنے کو تیار تھا۔ وہ کھانا بہت اچھا پکاتی تھی۔ گھر کو صاف اور ستھرا رکھتی اور میرے لئے گویا وہ سورج کی ایک سنہری کرن تھی۔ جس سے میرے گھر کی تاریکیاں دُور ہوتی تھیں۔ اس طرح چند سال بڑے عیش و آرام سے گزرے۔ اب ہمارے ہاں بچہ پیدا ہونے کی توقع تھی۔ ایڈنا ہر وقت چھوٹے چھوٹے کپڑے سینے میں مشغول نظر آتی اور انہیں دیکھ دیکھ کر بہت خوش ہوتی۔

اس سال فصلیں بھی بہت اچھی تھیں اور ہمارے مویشی بھی خوب تیار تھے۔ ہر طرف سے زندگی اپنے بیش بہا تحائف ہمارے قدموں پر ڈالتی نظر آتی تھی۔ مگر آہ۔ یہ سب کچھ ایک سطحی سکون تھا۔ جس کے اندر ہزاروں طوفان چھپے ہوئے تھے۔

جولائی کا مہینہ تھا۔ میرے والد باہر کھیتوں میں گھاس کاٹنے کے لئے گئے۔ ایڈنا نے تھوڑے عرصے کے بعد ٹھنڈے پانی کا ایک برتن اُٹھایا اور انہیں پلانے کے لئے گئی۔ لیکن اس کی حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُس نے میرے والد کو گھاس پر مُردہ پایا۔ ڈاکٹر بلایا گیا۔ جس نے معائنہ کرنے کے بعد کہہ دیا کہ موت حرکتِ قلب بند ہو جانے کی وجہ سے ہوئی ہے۔ اور سخت دھوپ میں کام کرنا مرحوم کے لئے جان لیوا ثابت ہوا ہے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس کے بعد کے تین دن کس طرح گزرے۔ ایک طرف میرے باپ کی لاش پڑی تھی اور دوسری طرف ایڈنا جسے ایک کمزور لڑکی وقت سے پہلے پیدا ہوئی تھی حیات و موت کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ میں اس وقت چوبیس سال کا تھا۔ لیکن ان تین دنوں نے مجھے بُوڑھا بنا دیا۔ میری بے پرواہنسی اور گونجتے ہوئے قہقہے سب کافور ہو گئے۔ اور زندگی ایک معمّا بن کے رہ گئی۔

میری لڑکی نے پُھولنا پھلنا شروع کر دیا۔ لیکن ایڈنا اس کے بعد تندرست نہ ہو سکی۔ اس کے اعضا میں خرابی پیدا ہو گئی۔ وہ تھوڑا سا لنگڑاتی تھی۔ اور ہر وقت ایک چھوٹی سی کرسی میں بیٹھی ہوئی سینے پرونے کے کام میں مصروف رہتی۔ ایڈنا کی ایک بوڑھی خالہ تھی جس کا نام ہلڈا تھا۔ وہ ان مصیبت کے ایّام میں ہمارے ہاں آ کر ٹھیر گئی اور گھر کا سارا انتظام اس نے اپنے ذمہ لے لیا۔ میری لڑکی رُوت جب بارہ برس کی ہو گئی تو ایڈنا کو گٹھیا کا مرض ہو گیا۔ ہم نے اس کے لئے ایک کمرہ مخصوص کر دیا۔ جہاں وہ ہر وقت بستر پر پڑی رہتی۔ مہینوں گزر نے تک بستر سے نہ اٹھتی۔ عزیز و احباب کا وہ اب بھی تبسم سے استقبال کرتی۔ لیکن اس تبسم میں ہزارہا حسرتیں جھلکتی ہوئی نظر آتیں۔ میں اس کے پاس کے کمرے میں سوتا، تاکہ وہ مجھے فوراً ضرورت کے وقت آواز دے لے۔

جب اسے درد کا دورہ نہ ہوتا تو وہ پہیوں والی کرسی پر گھر کے صحن میں چکر لگایا کرتی۔ یہ سب کچھ زندگی کو بے کیف بنانے کے لئے کافی سے زیادہ تھا۔ لیکن ان دنوں کے سوا جب ایڈنا کو زیادہ تکلیف ہو جاتی۔ زندگی میرے لئے اتنی بے لطف نہ تھی۔ ہلڈا ایک خوش مزاج عورت تھی اور ہمارا بہت خیال رکھتی تھی۔ میں کاشتکاری بھی کرتا اور دودھ بھی بیچتا تاکہ گزارہ چلتا رہے۔ ان سب تکالیف کو دور کرنے والی اور مجھ میں برداشت کی طاقت پیدا کرنے والی میری لڑکی رُوت تھی جس کی محبت میری زندگی کا سہارا تھی۔ وہ ستاروں بھرے آسمان کی طرح پیاری تھی۔ وہ ایک چھوٹی سی تیتری تھی جو موسم بہار میں پھولوں کی آوارہ خوشبوؤں میں تیرتی پھر رہی ہو۔ جس کی ہستی مجسم محبت اور الفت ہو۔ میں نے آج تک ایسا کوئی انسان نہیں دیکھا۔ جو رُوت کی طرح محبت سے بھرا ہوا اور محبت کا پیاسا ہو۔ میری محبت اس کے ساتھ پرستش کی حد تک بڑھی ہوئی تھی۔ وہ خوبصورت تھی، خوش مزاج اور نیک لڑکی تھی اور اپنی ماں کی طرح چھوٹے سے قد کی تھی۔ مگر مضبوط اور طاقتور تھی۔ میں اسے ہر ایک قسم کا آرام تو نہیں دے سکتا تھا۔ مگر جہاں تک میرے محدود ذرائع مجھے اجازت دیتے اس کی کوئی خواہش رد نہ کرتا۔ جب وہ اپنے نرم و نازک بازو بھولپن سے میرے

گلے میں ڈال کر مجھے پیار سے دیکھتی تو مجھے اپنی قربانیوں کا صلہ مل جاتا۔ میں نے اسے سکول جانے کے لئے ایک بائیسکل خرید دیا۔ وہ اچھے اچھے کپڑے پہننا پسند کرتی اور معمولی معمولی کپڑوں کو بھی اسے اس طریقہ پر سلواتی کہ وہ اس کے جسم پر بہت بھلے معلوم ہوتے

گھر کے دھندوں کے سوا مجھے دنیا میں صرف ایک دلچسپی تھی، اور وہ بھی گرجا سے۔ میری آواز میں ابھی تک رس تھا۔ اونچ تھا اور جب میں گرجا میں گاتا تو میری لڑکی بڑے فخر سے میری طرف دیکھا کرتی۔ دوسرے لوگ بھی میری اس وجہ سے عزت کرتے اور اس طرح سے اگرچہ میں اس علاقے میں کوئی مشہور آدمی نہ تھا۔ مگر اپنے اس چھوٹے سے گرجے میں ضرور اہمیت رکھتا تھا۔

قرب و جوار کی عورتیں جب میری بیوی کی عیادت کے لئے آتیں تو اس کے لئے مختلف تحائف لاتیں اور مسٹر گریل دکاندار تو مجھ پر بہت مہربان تھے۔ ایک دفعہ جبکہ مانچسٹر سے ایک ماہر ڈاکٹر میری بیوی کو دیکھنے کے لئے آئے تو ان کی فیس مسٹر گریل نے اپنی جیب خاص سے ادا کی۔ اور اگرچہ میں نے اس رقم کو واپس بھی کیا مگر مسٹر گریل نے اسے قبول نہیں کیا۔ مسٹر گریل کے ایک لڑکا پال تھا۔ وہ ایک دراز قد اور خوبصورت نوجوان تھا۔ گاؤں کی تمام لڑکیاں اسے چاہتی تھیں۔ مگر اس کی نظرِ انتخاب رُوت پر پڑی اور وہ ہمارے کھیتوں میں اکثر اُسے ملنے کے لئے آتا اور اپنی کار میں اُسے سیر کے لئے باہر لے جاتا۔ ایڈنا اور میں بہت خوش ہوتے۔ کیونکہ پال ایک شریف اور محنتی لڑکا تھا۔ وہ ڈاکٹر بننا چاہتا تھا اور اس کا باپ اس کی تعلیم کے تمام مصارف برداشت کرنے کو تیار تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ اگر رُوت اس سے شادی کرے تو اس کا مستقبل بہت شاندار ہوگا۔

ان واقعات کو ایک سال ہی گزرا ہوگا کہ مجھ پر ایک ایسا جنون طاری ہوا۔ جس کے لئے میرے پاس کوئی وجہ نہیں۔ میری بیوی اگرچہ مدت سے مریضہ تھی۔ لیکن میں نے کبھی کسی غیر عورت پر نظر نہیں ڈالی تھی۔ اگرچہ میں جوان تھا۔ لیکن سارا دن سخت کام کرنے اور ہر لمحہ گھر بار کی فکر نے میرے تمام جذبات کو دبا رکھا تھا۔ نیز مجھے اپنی لڑکی سے اتنی محبت تھی کہ مجھے کوئی عورت دلچسپ معلوم نہ ہوتی تھی۔ لیکن جب ان جذبات نے مجھ پر قبضہ کیا تو میں انہیں روکنے سے اتنا ہی مجبور تھا۔ جتنا کہ اپنے خون کی گردش کو اپنے جسم میں روکنے سے۔ اور سب سے زیادہ ندامت کی بات یہ ہے کہ اس واقعے میں جس لڑکی کا ذکر آئے گا وہ اُس رذیل اور پست طبقے سے تعلق رکھتی تھی جن کے گھروں کے نزدیک سے شریف آدمی گزرنا بھی پسند نہیں کرتے۔ وہ تقریباً رُوت کی ہم عمر تھی۔ اس لڑکی کا نام لارا گلڈنگ تھا۔ اس کا باپ مر چکا تھا۔ ماں کا بیٹی پر کوئی دباؤ نہیں تھا۔ اس لئے لڑکی آزاد اور آوارہ ہوگئی تھی۔ میں نے کبھی اس لڑکی کو دیکھا تک نہیں تھا۔ صرف اتنا جانتا تھا کہ اس نام کی کوئی لڑکی اس گاؤں میں رہتی ہے۔

اپریل کی ایک صبح تھی۔ میں اپنی چھوٹی سی کار میں حسبِ معمول خریداروں کو گاؤں میں دودھ دینے کے لئے روانہ ہوا۔ مطلع صاف تھا۔ ہوا خوشگوار تھی۔ درخت سبز پوش ہو رہے تھے۔ فضا مسرور نظر آ رہی تھی۔ ایسے میں میرا دل بھی خوشی محسوس کر رہا تھا۔ کیونکہ ایڈنا کو اب پہلے کی نسبت آرام تھا۔ اور رُوت ایک عمدہ کام پر مسٹر گریل کی سفارش سے لگ گئی تھی۔ اسے نئی پوشاک خرید کر دینے کے لئے میرے پاس کافی رقم موجود تھی۔ میں نے گانا شروع کر دیا۔ دودھ کی بوتلوں کی کھڑکھڑاہٹ اور انجن کے چلنے کا شور میری ہمنوائی کر رہے تھے۔ شائد یہ موسمِ بہار کی روح تھی جو مجھ میں نفوذ کر رہی تھی۔ میرے خون میں جوش پیدا ہو رہا تھا۔ اور زندہ دلی کے جذبات کروٹیں لے رہے تھے۔ واپسی پر واپس جانے کے لئے میرے کھیتوں کو گاؤں سے دو راستے جاتے تھے۔ ایک گرجا کے نزدیک سے ریلوے پل کے نیچے سے جاتا تھا۔ دوسرا راستہ لمبا تھا۔ جو مختلف گلیوں سے ہوتا ہوا جاتا تھا۔ چونکہ پہلے راستے میں مرمت کا کام جاری تھا۔ اس لئے میں نے کار کو دوسرے راستہ سے جانے کے لئے ایک گلی میں ڈال دیا گلی کے موڑ پر "لارا" کا مکان تھا۔ جب میں وہاں پہنچا تو دوسری طرف سے ایک اور کار آ رہی تھی۔ میں نے اپنی کار کو روک لیا لیکن جب دوبارہ چلانا چاہا تو انجن کام نہیں کرتا تھا۔ میں نیچے اترا کہ اسے ٹھیک کروں۔

انسانی زندگی میں متعدد ایسے واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں کہ انسان کو مجبوراً تقدیر کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا پڑتا ہے۔ جب مجھے ان واقعات کے سلسلے پر غور کرنے کی فرصت ملتی ہے جو انجن کے فیل ہونے سے ظہور پذیر ہوئے اور جن سے میری زندگی کے اوراق میں ایک تکلیف دہ حزنیہ باب کا اضافہ ہوا تو میں حیران ہوتا ہوں کہ آیا ان سب معاملات میں حضرتِ انسان ہی موردِ الزام ہے۔ یا کوئی دوسری زبردست طاقت ہمارے اوپر کام کر رہی ہے۔ اور ہمیں اندھا دھند ایسے کام کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

سامنے کے مکان کا دروازہ کھلا اور میں نے اوپر جو نظر اٹھائی تو دیکھا کہ لارا میری طرف آ رہی ہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ سورج کی تیز کرنوں میں اس کے گھنگریالے بال چمک رہے تھے۔ اس کی آنکھیں ہرنی

کی مانند تھیں۔ جن پر لمبی لمبی پلکیں سایہ کیے ہوئے تھیں۔ اس کا جسم سڈول اور خوبصورت تھا۔ اس کا چہرہ سرخ تھا۔ میرا خیال ہے کہ اُس نے پینٹ کیا ہوا تھا۔ اس کی ہر ادا میں جاذبیت تھی۔ دلکشی تھی۔ جس سے بچنا محال بلکہ ناممکن تھا۔ اور وہ شائد اس لئے پیدا کی گئی تھی کہ شریف آدمیوں کے ایمان پر ڈاکہ ڈالے۔ وہ میری کار کے پاس کھڑی ہو گئی۔ میں نے اُسے اس طرح سے دیکھنا شروع کیا جیسے میں نے آج تک کسی عورت کو دیکھا ہی نہ ہو اور اُس کے چہرے پر سے نظریں ہٹائے نہ ہٹتی تھیں۔ کیونکہ اس کے نازک لبوں پر ایک ایسا تبسم رقصاں نظر آ رہا تھا جس سے کائنات مسکرا رہی تھی۔

"ہیلو۔ مسٹر جان ڈیی سن" اس نے میری کار کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔

"ہیلو۔ لارا" میں نے جواب دیا۔

اس نے مڈگارڈ پر ہاتھ رکھتے ہوئے میری کار کو ہلانے کی کوشش کی اور کہا "بڑی عمدہ کار ہے۔ کبھی کبھی کسی کو سیر ہی کے لئے لے جایا کرو۔" وہ مسکرا رہی تھی۔ میں اپنے اندر ایک انقلاب محسوس کر رہا تھا اور وہ جذبہ مجھ میں بھی پیدا ہو رہا تھا۔ جسے برسوں سے میں بھولا ہوا تھا۔ یہ جوانی کی ایک ترنگ تھی، اور ایک خوبصورت عورت کے ساتھ عیش و عشرت میں دن گزرنے کی یاد۔

"مجھے تو کوئی انکار نہیں۔ اگر کوئی میرے ساتھ سیر کو جانے کے لئے تیار ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ آہ وہ مدھ بھری آنکھیں جن میں شراب کی سی مستی تھی۔ جو مجھے جوانی کی رنگینیوں کی طرف دعوت دے رہی تھی۔ میں اُن کی بے پناہ رنگینیوں میں سب کچھ کھو بیٹھا۔

میں آج تک یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ لارا نے مجھے اپنے پھندے میں پھنسانے کی کیوں کوشش کی جب کہ گاؤں میں سینکڑوں نوجوان اور موجود تھے جو اس کے ساتھ ایک شام گزار دینا گویا جنت پا لینے کے مترادف قرار دیتے تھے۔ ایک دنیا اُس کی شیدائی تھی۔ میں ایک غریب مصیبت زدہ زمیندار تھا۔ جس کے چہرے پر جوانی کے چند مٹتے ہوئے نقوش کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ روپیہ میرے پاس نہیں ہے۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ مجھے ایڈنا اور رُوت سے کتنی محبت ہے اور یہ کہ میں گرجا کو جس میں ہر اتوار میرا گانا ہوتا تھا کبھی نہیں بھول سکتا۔ لیکن ممکن ہے کہ میری کشش کے وجوہات ہی یہ ہوں اور شائد وہ اپنے ملکوتی حسن کے غرور میں ایک ایسے جانور کو نیم بسمل دیکھنا چاہتی ہو جو آج تک ایسے حسین شکاریوں کے تیروں سے زخمی نہ ہوا ہو۔ اس دن کے بعد میری زندگی میں ایک تغیر رونما ہونا شروع ہوا۔ مجھ پر ایک نشہ سا طاری رہتا۔ سب ضروری کام بھول گئے۔ صرف اسی کا خیال تھا جسے میں دل میں چھپائے لئے پھرتا تھا۔ دنیا مجھے صرف اسی کے آئینۂ حیات میں منعکس نظر آتی تھی۔

اس پہلی ملاقات کے بعد ایک شام میں گاؤں سے کچھ خریدنے کے لئے گیا۔ واپسی پر میری کار خود بخود اسی راستہ پر مڑ گئی۔ جس پر اس کا مکان تھا۔ تقدیر کی بات ہے کہ لارا مجھے راستہ میں تنہا اپنے گھر کو جاتی ہوئی مل گئی۔ میں نے اُسے کار میں بٹھا لیا۔ اور جب اس کے گھر کے سامنے موڑ کے قریب کار کو روکنے لگا۔ تو وہ بولی "جان تھوڑی دور تک اور چلو۔ دیکھو نا کتنی پیاری شام ہے!" میں نے کار کو ایک سڑک پر ڈال دیا۔ اور چند میل نکل گیا۔ فضا خاموش تھی۔ رات کی تاریکیاں گہری ہوتی جا رہی تھیں۔ آسمان پر ستارے چشمک زنی کر رہے تھے۔ لارا کا نرم جسم میرے نزدیک تھا۔ جس میں سے خوشبوئیں پھوٹ رہی تھیں۔ یہ قربت میرے لئے سخت اضطراب انگیز تھی۔ میرے تصورات کے چھپے ہوئے طوفان سر اٹھا رہے تھے۔ میں نے اس کی گردن کے گرد اپنے بازو حمائل کرتے ہوئے اُسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اور جذبات کی فراوانی سے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے اس کے نازک لبوں پر ایک بوسہ دیا۔ اب میں ایک ایسے راستے پر گامزن تھا جس سے واپسی ناممکن معلوم ہوتی تھی۔ اب وہ میری رگ رگ میں پنہاں تھی۔ اور میرے خون کے قطرے قطرے میں بس چکی تھی۔ جسے باہر نکال پھینکنا میرے قبضہ میں نہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود جو جذباتِ محبت ایڈنا اور رُوت کے لئے میرے دل میں موجزن تھے۔ وہ ان جذبات سے کہیں زیادہ بلند اور پاکیزہ تھے۔ یہ ایک جنون تھا۔ ایک وحشت اور میری طاقت سے زیادہ طاقتور۔ ہر رات کو کھانا کھانے کے بعد میں کوئی نہ کوئی بہانہ تراش کر باہر آ جاتا۔ لارا کو اپنی کار میں بٹھا کر جنگل یا کسی پارک کے تاریک کونے میں لے جاتا۔ جہاں میں اُسے آغوش میں لے کر پیار کرتا۔ حتیٰ کہ میرے خون کا ذرہ ذرہ اُبل پڑتا۔ لیکن اس کے باوجود میں اپنے اوپر ضبط رکھتا۔ اس لئے مجھے یہ معلوم نہیں کہ لارا کا اخلاقی معیار کس قدر پست تھا۔ اس تمام دیوانگی کے زمانہ میں میں نے اپنی بیوی کے حقوق سے بے وفائی نہیں کی۔ تھوڑے عرصہ کے بعد میں نے لارا کو تحائف دینے شروع کر دیئے۔ ایک دن میں نے اس کے گلے کے ایک ہار کو توڑ دیا۔ جسے وہ بہت عزیز رکھتی تھی۔ لیکن دوسرے ہی دن اُسے ایک نیا خرید دیا۔ اور اس طرح وہ رقم جو میں نے رُوت کی سالگرہ منانے کے لئے پس انداز کر رکھی تھی۔ خرچ کر دی۔ اور میں اپنی لڑکی کو کلائی کی گھڑی جس کا میں نے اُس سے

وعدہ کیا ہوا تھا نہ دے سکا۔

گھر کی زندگی میں کوئی خاص تغیر واقع نہ ہوا۔ پال اس سال کوئی کام نہیں کر رہا تھا۔ وہ اکثر میرے کھیتوں میں آتا۔ رُوت پروانہ وار اس کے ارد گرد گھومتی۔ اس کے لبوں پر تبسم ہوتا۔ اور اس کی آنکھوں میں محبت کا خمار۔

ایک دن جب مجھے کچھ اپنے تصورات سے فرصت ملی۔ تو میں نے رُوت سے پوچھا "بیٹی پال یہاں اکثر آتا جاتا ہے۔ کیا تم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہو؟" اس نے میری گردن کے گرد اپنے بازو ڈالتے ہوئے کہا۔ "ابا ایسی باتیں چھوڑو۔ محبت۔ ہاں۔ ہم ایک دوسرے کے دوست ہیں۔" لیکن کچھ دیر کے بعد جب پال کی موٹر دروازہ پر آکر رُکی تو رُوت کے چہرے پر سُرخی دوڑ گئی اور وہ ایک چھوٹی سی بِستری کی طرح اڑتی ہوئی اس کے پاس پہنچ گئی۔

میرا خیال تھا کہ ایڈنا میرے اور لارا کے رازِ محبت سے ناواقف ہے۔ اور سمجھتا تھا کہ گاؤں میں کوئی بھی میرے اور لارا کے تعلقات کو نہ جانتا ہوگا۔ یہ میری بھول تھی۔ کیونکہ دنیا میں تاڑنے والی آنکھیں اور باتیں تراشنے والی زبانیں بہت ہیں۔ اور محبت کی آگ دھواں دیئے بغیر نہیں جلتی جس کا چھپانا ناممکن ہے۔

اگست کی ایک شام کو میں اس خواب سے جگایا گیا۔ گرجا میں گانے کی مشق ہو رہی تھی کہ مسٹر گریل میرے پاس آئے اور مجھے تنہائی میں لے جا کر نہائت متانت سے کہا۔ "مہان مجھے یہ بات کہتے ہوئے خود ہی نفرت سی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن مجبوراً مجھے کہنا ہی پڑا۔ میں تمہیں بچپن سے جانتا ہوں تم پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹتے رہے ہیں۔ جس کے لئے مجھے بہت افسوس ہے۔ اور جہانتک مجھ سے بن پڑا۔ تمہاری مدد کرنے سے میں نے کبھی گریز نہیں کیا جب میں نے شروع شروع میں تمہاری بابت بُری افواہیں سنیں۔ تو مجھے یقین نہیں آتا تھا۔ اور میں انہیں لوگوں کے حسد و بغض پر محمول کرتا تھا لیکن جب یہ چرچے زیادہ عام ہوتے گئے تو میں نے تمہاری حرکات کو بنظرِ غائر دیکھنا شروع کیا اور مجھے بہت قلق ہوا جب میں نے ان کو حرف بحرف صحیح پایا۔ اس لئے گرجا کے منتظمین نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا ہے کہ یا تو تم ایسی آوارہ لڑکی سے قطع تعلق کر لو۔ ورنہ تمہارا نام گرجا میں گانے والی پارٹی سے خارج کر دیا جائے گا۔"

اس رات میں بالکل نہ سو سکا اور بستر پر پہلو بدلتے ہوئے ساری رات آنکھوں میں کاٹی لیکن صبح تک میں نے فیصلہ کر لیا اور میں نے اپنی تمام طاقت کو جمع کر کے قسم کھائی کہ میں اس عورت کے خیال کو اپنے دل سے باہر نکال دوں گا۔ اور اس جگہ کو جو میں نے گرجا میں معزز آدمیوں کے درمیان حاصل کر رکھی ہے۔ کبھی نہ چھوڑوں گا۔

اس شام کو میں لارا سے قصداً ملا تاکہ اُسے بتا دوں کہ اس کے اور میرے تعلقات اب ختم ہو چکے۔ وہ مجھے ہمیشہ محبت اور نرمی سے ملا کرتی تھی۔ لیکن میری باتوں کو سنتے ہی وہ ایک غصے سے بھری ہوئی بلی کی مانند غرائی جو اپنے پنجوں سے میری آنکھیں نکالنے کو تیار ہو۔

"تم مجھے اس طرح نہیں چھوڑ سکتے۔ ہم نے کسی کا کیا بگاڑا ہے۔ جو دنیا تمہیں مجھ سے اس طرح سے چھین رہی ہے۔ جانتے ہو کہ میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑوں گی۔ کیا تم لوگوں کی باتوں سے گھبرا گئے ہو۔ جو یوں بے وفائی کر رہے ہو۔ یاد کرو کہ تم ایک افسردہ دل انسان تھے جسے میں نے اپنی جوان محبت کی حسین اور دلکش رنگینیاں بخشیں۔ اور تمہاری زندگی کی خزاں کو بہار میں بدل دیا۔ تم اس کا صلہ مجھے یہ دے رہے ہو۔"

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "لیکن لارا! میری تو بیوی بھی ہے اور لڑکی بھی۔" اور شاید تمہیں اس بات کا علم نہ ہو کہ میں اپنی لڑکی سے اس قدر محبت کرتا ہوں کہ تمہارے ساتھ ایک ہزار سال تک زندگی گزار دینے تک بھی نہیں کر سکتا۔"

لارا آخرکار عورت تھی۔ اور اس نے عورت کا آخری حربہ استعمال کرنا شروع کر دیا۔ وہ رونے لگ گئی۔ ایک حسین عورت کے آنسوؤں سے زیادہ دنیا میں مرد کو پھسلانے کے لئے اور کوئی چیز نہیں اور پھر اُس وقت جب مرد اس سے محبت کرتا ہو یہ طوفان ثابت ہوتے ہیں۔ جس میں مضبوط سے مضبوط ارادے بھی خس و خاشاک کی طرح بہ جاتے ہیں۔ اس نے محبت سے اپنے بازو میری گردن کے گرد حائل کر دیئے۔ لیکن مجھے اپنی قسم یاد آ گئی۔ میں نے اُسے اپنے سے دُور ہٹاتے ہوئے کہا۔ "لارا۔ ان باتوں کو اب فراموش کر دو۔ میں دیوانہ تھا۔ اور اب میں ہوش میں آ چکا ہوں۔ تم حسین ہو۔ جوان ہو۔ تم کیوں اتنا غم کرتی ہو تم آسانی سے کسی دوسرے کو میری جگہ اپنا بنا سکتی ہو۔"

ان الفاظ میں خدا جانے کیا بات تھی۔ کہ اس نے فوراً رونا بند کر دیا۔ رات ڈراؤنی اور بھیانک معلوم ہو رہی تھی اور تاریکی میں اس کا چہرہ ایک دھبہ سا دکھائی دے رہا تھا لیکن جذبات کا تلاطم اس کے سانس کی تیز آمد و رفت سے بخوبی جانچا جا سکتا تھا۔ وہ ایک زخمی شیرنی کی طرح میری طرف لپکی اور میرے قریب ہوتے ہوئے بولی۔ "بہت اچھا۔ جاؤ۔ میں تمہیں کبھی نہیں روکوں گی . . . . . . لیکن ٹھیرو۔ میں اس کا انتقام ضرور لوں گی۔ عورت جب محبت کرتی ہے تو اپنا سب کچھ اپنے محبوب پر قربان کر دیتی ہے لیکن جب

اس کی محبت ٹھکرادی جاتی ہے اور اس کی حسین آرزوئیں۔ رنگین تمنائیں تمہاری طرح دل کی بجائے برف کی قاش رکھنے والے مرد پامال کردیں تو وہ دنیا کی ہر خوشی کو تیاگ دیتی ہے۔ اور پھر جب وہ انتقام پر تُل جائے تو وہ خیر و شر سے بالکل بے نیاز ہو کر ایک عالم کو درہم برہم کر دیتی ہے۔ میں بھی انتقام لونگی اور ضرور لونگی اور دنیا دیکھے گی کہ اس گاؤں کی گلیوں میں چلنے والا کوئی شخص بھی اتنا بدنصیب اور غمگین نہیں ہوگا جتنے کہ تم"۔

لارا کا خیال آہستہ آہستہ مدھم پڑتا گیا اور میں اس کے گھر کی طرف جانے سے ایسا بچتا جیسے لوگ پلیگ زدہ علاقہ میں جانے سے گھبراتے ہیں۔ سارا دن کھیتوں میں کام کرتا اور رات ایڈنا کی تیمارداری میں گزار دیتا۔ اسے درد کے سخت دَورے پڑ رہے تھے۔ اُسے سکون دینے کے لئے چھوٹی چھوٹی سفید گولیاں تھیں۔ لیکن کبھی کبھی ان کا اثر بھی نہ ہوتا تھا اور مجھے پہروں اُس کے پاس بیٹھنا پڑتا تاکہ اس کا دل بہلتا رہے۔

خزاں کا آغاز تھا۔ ہلڈا نے مجھے بتایا کہ رُوت بیمار ہے۔ وہ بہت زرد اور کمزور ہوگئی ہے اور اس کی خوراک اتنی بھی نہیں رہی جس سے ایک چھوٹا سا پرندہ بھی زندہ رہ سکے۔ یہ ایک حقیقت تھی۔ رُوت افسردگی کی تصویر تھی۔ میں نے اُسے ڈاکٹر کے پاس لے جانے کو زور دیا مگر اُس نے جانے سے انکار کر دیا۔ میرے اصرار پر ایک مردہ سی ہنسی اس کے لبوں پر ظاہر ہوئی اور اس نے کہا کہ وہ بیمار نہیں ہے۔ ڈاکٹر کے پاس جانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

لیکن کئی دفعہ مجھے ایڈنا کے پاس زیادہ دیر تک بیٹھنے کا اتفاق ہوتا تو میں اوپر کے کمرے میں رُوت کے چلنے کی آواز سنتا اور اکثر آدھی رات گزر جانے کے بعد بھی اس کے کمرے کی روشنی گُل نہ ہوئی تھی۔ پال بھی اب میرے کھیتوں میں نہ آتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ رُوت اس کے لئے غمگین ہے۔ اور یہ ایک ایسی جنگ تھی جس میں اسے خود ہی لڑنا چاہئے تھا لیکن مجھے یہ دیکھ کر بہت زیادہ رنج ہوتا کہ میری لڑکی کو اتنی چھوٹی سی عمر میں زندگی کے ان معاملات سے دوچار ہونا پڑا ہے۔

اکتوبر کی ایک رات مجھے کبھی نہ بھولے گی۔ ہوا چیختی ہوئی مکانوں اور چمنیوں میں سے گزر رہی تھی۔ بارش کی بوچھاڑ دروازوں اور کھڑکیوں سے زور آزمائی کر رہی تھی۔ ایڈنا کو سخت تکلیف تھی۔ اور وہ جاگ رہی تھی۔ اس نے وہی دو سفید گولیاں کھائی تھیں۔ لیکن تسکین نہ ہونے کی وجہ سے اور گولیاں مانگ رہی تھی۔ مگر میں ان گولیوں کو زیادہ مقدار میں دینے کی جرأت نہیں کرتا تھا کیونکہ ڈاکٹر نے مجھے متنبہ کر دیا تھا کہ ان کا مقدار سے زائد کھانا مہلک ہے۔ بہت عرصہ کے بعد ایڈنا سو گئی اور میں نے اپنے بستر پر جانے کے لئے دوسرے کمرے کا رُخ کیا۔ ہوا تھم چکی تھی۔ فضا خاموش تھی۔ میں تھوڑی دیر کے لئے راستہ میں ٹھہر گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ کوئی آہیں بھر رہا ہے۔ اُف میری پیاری رُوت اپنے دل کا غم تنہائی میں آہوں کے ذریعے نکال رہی تھی۔ میں آہستہ آہستہ اوپر چڑھا۔ اس کے دروازے پر دستک دی۔ کمرے میں فوراً خاموشی چھا گئی۔ میں کمرے میں داخل ہوا۔ لیمپ جلایا اور میرا دل دھک کر کے بیٹھ گیا۔ رُوت حسرت و یاس کی تصویر بنی بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے بال پریشان تھے۔ اور وہ میری طرف ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ جن میں حرماں نصیبی کا وہ منظر تھا۔ جو میں نے آج تک کسی انسان کی آنکھوں میں نہیں دیکھا۔ میں اس کے بستر پر بیٹھ گیا اور اُسے اپنے بازوؤں میں تھامتے ہوئے پدرانہ شفقت سے پوچھا "بیٹی۔ اپنے باپ سے کوئی بات نہ چھپاؤ۔ میں تمہاری تکلیف کو ہر ممکن کوشش سے دور کروں گا"۔ وہ میرے ساتھ چمٹ گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔ وہ کچھ نہ بولی لیکن تھوڑے عرصہ کے بعد اس نے اپنی زندگی کی سوگوار کہانی سنائی۔ یہ وہ کہانی تھی جو دنیا کی آفرینش سے اب تک ہزاروں بار سنائی گئی ہے اور لاکھوں بار دُہرائی جائے گی۔ جب تک کہ جوانی میں جوش۔ جوش میں مستی اور والہانہ پن ہے۔ جب تک جوان آدمی کی زبان میں رس ہے۔ لوچ ہے۔ اور اس کی آنکھوں میں مقناطیسی کشش ہے۔ اور جب تک جوان لڑکیاں محبت کی بھوکی انجام سے بے خبر آگ کے شعلوں سے کھیلتی رہیں گی۔ اور اپنی عزیز سے عزیز ترین متاع اس میں بھسم کر کے قربانیاں کرتی رہیں گی۔ یہ کہانی تشنۂ تکمیل ہی رہے گی۔ رُوت کو پال سے محبت تھی۔ عشق تھا۔ اور پال اس سے بے وفائی کر رہا تھا۔ پال کے لئے میرے دل میں نفرت کا جذبہ پیدا ہو رہا تھا۔ لیکن جب میں نے اپنے اعمال پر نظر دوڑائی تو مجھے مرد کی محبت کے نظریہ کے متعلق کوئی فیصلہ دینے کا حق نظر نہ آیا۔ یہاں تک کہ میں اس آدمی کی بابت جس نے میری لڑکی کو دھوکا دیا تھا۔ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ نیز اس میں میرا زیادہ قصور تھا۔ میں لارا کے حسن کا دیوانہ ہو کر رُوت کو بالکل بھول بیٹھا تھا اور جس طرح ایک باپ کو اپنی بیٹی کے معاملات میں غور و خوض سے کام لینا چاہیے میں نہیں لے سکا تھا۔ میں نے رُوت کو تسلی دی اور کہا۔ بیٹی غم نہ کرو۔ پال ایسا آدمی نہیں ہے۔ وہ اس غلطی کی ضرور تلافی کرے گا۔ اور اگرچہ وہ تمہیں دو ہفتہ سے نہیں ملا۔ لیکن

صبح میں اُس سے اور اس کے باپ سے ملوں گا اور تمہاری شادی اسی کے ساتھ ہو جائے گی۔ اچھا اب پر اعتماد رکھو اور اب سو جاؤ۔

اس رات میں بالکل نہ سو سکا۔ میرا دل غم سے بھاری تھا۔ صبح کا کھانا کھا کر میں گاؤں میں گیا۔ مجھے اس وقت تک یقین تھا کہ پال رُوت سے محبت کرتا ہے۔ میں مسٹر گریل کے مکان پر پہنچا۔ گھنٹی بجائی۔ لیکن جواب ندارد۔ میں نے دوبارہ گھنٹی بجائی اور تھوڑے عرصہ کے بعد ایک خادمہ دروازے میں ظاہر ہوئی۔ اس کے بال پریشان تھے۔ چہرہ زرد ہو رہا تھا اور اس کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ کسی سخت پریشانی میں مبتلا ہے۔ اس نے کانپتی ہوئی آواز سے کہا۔

"آپ مسٹر گریل کو نہیں مل سکتے۔ وہ بیمار ہیں۔"

میں نے کہا۔ "مجھے افسوس ہے۔ لیکن مجھے ان سے ضرور ملنا ہے۔" اور یہ کہہ کر میں اس کے پاس سے گزر کر کمرے میں داخل ہو گیا۔ مجھے پال کے مخفی کمرے میں آوازیں سنائی دیں اور میں نے اس طرف کا رُخ کیا۔ دروازے پر پہنچ کر میں یکایک رُک گیا۔ مسٹر گریل کھڑکی میں سے باہر خالی فضا کو تک رہے تھے۔ اور ان کی بیوی ایک چھوٹی سی کرسی پر بیٹھی ہوئی اپنے ہاتھوں سے سر کو تھامے ہوئے رو رہی تھی۔ میں کھانسا۔ مسٹر گریل نے میری طرف منہ موڑا۔ اس کا چہرہ بالکل سفید پڑ چکا تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں بڑے عجیب سے وقت پر آپ کو تکلیف دے رہا ہوں۔ مگر مجبور ہوں۔ مجھے آپ سے ایک نہایت ضروری کام ہے" میں نے کہا۔

"ہاں۔ کیا بات ہے جان" مسٹر گریل نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔

"میری لڑکی بڑی پریشان ہے۔ مسٹر گریل۔ اور اس کی ساری ذمہ داری پال پر ہے۔ میں آپ سے درخواست کرنے آیا ہوں کہ پال کی شادی رُوت سے کر دی جائے۔" میں نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ گریل کے چہرے پر تشنج کے آثار پیدا ہوئے اور وہ پہلے سے بھی زیادہ سفید پڑ گیا۔ اس نے خاموشی سے میز پر سے ایک لفافہ اٹھایا اور مجھے دے دیا۔ یہ تار تھا جو لندن سے کل کی تاریخ سے مسٹر گریل کے نام آیا تھا۔ میں نے اسے کھولا یہ تار پال کی طرف سے دیا گیا تھا۔ اس میں لکھا تھا۔

"میں نے پوشیدہ طور پر لارا گلڈنگ سے شادی کر لی ہے۔ اور اب ہم ماہ عسل منانے کے لئے جا رہے ہیں۔"

آہ۔ لارا نے انتقام لے لیا اور اس نے جان بوجھ کر پال کو اپنے پھندوں میں پھنسایا۔ تاکہ وہ اپنے خداداد حسن کی ستم رانیوں سے میری زندگی کو جہن بنا دے۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ رُوت مجھے جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ اور رُوت کو تکلیف پہنچانا میرے دل کو زخمی کرنا تھا۔

جس طرح سے بھی ہو سکا میں گھر پہنچا اور رُوت کو اپنی آغوش میں تھام کر اُسے سارا واقعہ سنایا اور اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی پیاری بیٹی کے نازک دل کو چُور چُور ہوتے دیکھا گیا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ میں اس کی مدد کروں گا۔ لیکن میں خود نہیں جانتا تھا کہ کیسے اور کیونکر۔

صبح کا وقت تھا۔ بارش ختم ہو چکی تھی مگر کالی کالی بدلیاں اب بھی آسمان پر دوڑ رہی تھیں۔ میں اپنے کھیتوں میں کام میں محو تھا۔ ایڈنا تکلیف کی وجہ سے کمرے میں لیٹی ہوئی تھی۔ ہلڈا نے کھانا تیار کیا۔ لیکن ہم میں سے کسی نے بھی نہ کھایا۔ رُوت کرسی پر بیٹھی آنکھوں میں یاس کا منظر لئے فضا کے خلا میں سارا دن بے معنی نظروں سے تکتی رہی۔ رات کے نو بجے کے قریب وہ اپنی ماں کے کمرے میں آئی۔ ہم دونو کو سلام کیا اور اوپر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں سیڑھیوں تک اس کے ساتھ گیا اور اسے آہستہ آہستہ چڑھتے ہوئے دیکھتا رہا۔

"مجھے امید ہے کہ تم اچھی طرح سے سوؤ گی" میں نے کہا۔

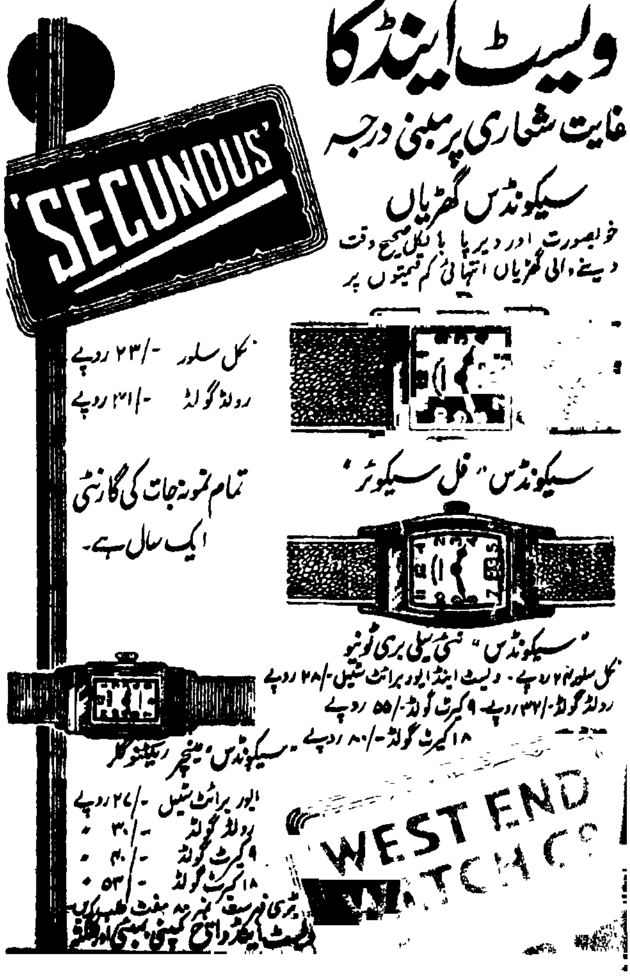
"ہاں آپ فکر نہ کیجئے میں اچھی طرح سے سوؤں گی"۔

اس نے ہنستے ہوئے میری طرف منہ موڑ کر جواب دیا۔ یہ دن میں پہلا موقع تھا کہ اس کے چہرے پر ہنسی دکھائی دی تھی۔ میں تھکان کی وجہ سے سو گیا۔ نصف شب کے قریب ایڈنا نے مجھے جگایا۔ اسے درد کی سخت تکلیف تھی۔ اس نے مجھ سے وہی سفید گولیاں مانگیں۔ میں نیم خوابی کی سی حالت میں اس کے کمرے میں داخل ہوا اور گولیوں کے بکس کو ہر طرف کمرے میں تلاش کیا۔ لیکن وہ مجھے کہیں بھی نہ ملا۔ "شام تک تو وہ یہیں پڑا تھا" ایڈنا نے کہا۔

خدا جانے کیوں۔ میرا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ نیند کا اثر اب دور ہو چکا تھا۔ اور رُوت کا سفید چہرہ میری طرف غور سے تکتا ہوا میری نظروں میں گھوم رہا تھا۔ "ہاں۔ میں اچھی طرح سے سوؤں گی" اس نے کتنی حسرت آمیز آواز سے کہا تھا۔ میں جلدی سے اوپر چڑھا اور روت کے کمرے میں داخل ہوا۔ لیمپ ابھی تک دھیمی دھیمی روشنی بکھیر رہا تھا۔ وہ اپنے بستر میں آنکھیں بند کئے لیٹی ہوئی تھی۔ چہرے پر عجیب قسم کی طمانیت برس رہی تھی۔ اس کے کالے کالے بال تکئے پر بکھرے پڑے تھے اور سفید گولیوں کا بکس فرش پر خالی پڑا تھا۔ ہاں۔ وہ سو رہی تھی اور اب وہ اس دنیا کے غم و الم سہنے کے لئے کبھی نہ جاگے گی۔

اب پھر بہار کا موسم ہے۔ پھول کھلے ہوئے ہیں۔ درخت نئی کونپلیں نکال رہے ہیں۔ میں پچھلے سال کی طرح اب بھی ہل چلاتا ہوں اور فصلیں بوتا ہوں۔ ایڈنا سارا دن بستر پر پڑی رہتی ہے۔ اس کی سیاہ آنکھیں اندر کو دھنس گئی ہیں۔ اب بھی کبھی کبھی ایک مسکراہٹ سی اس کے چہرے پر پھیلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس مسکراہٹ کے نیچے زخمی اور خون شدہ دل آہیں بھرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ہلڈا گھر کے کام کاج میں اسی طرح بھاری بھاری قدموں سے مصروف ہے لیکن رُوت جو اس گھر کی روح رواں تھی جس سے یہ زندگی زندہ رہنے کے قابل تھی۔ نہیں ہے۔

(ترجمہ) **عبدالعزیز میانوی**



رباعیات

برسات کے دریا

دریا امڈے، بہا طلا رسیال
بکھرے موجوں کے جا بجا زریں جال
انسان کی کیا مجال نظروں کا کبھی
اس پار سے اُس پار پہنچنا ہے محال

چمیلی کے پھول

تھے چادرِ ابر میں جو مستور نجوم
دلدادۂ فطرت کی نظر تھی مغموم
قدرت نے کھلا دیئے چمیلی کے پھول
پیارے پیارے حسین، نازک معصوم

مرزا عباس بیگ مشتر

سہ آتشہ

حضرتِ فراقؔ گورکھپوری نے یہ سہ غزلہ لکھ کر اسی غیر معمولی قدرتِ بیان کا ثبوت دیا ہے جو اُن کی کو شاعری میں حاصل ہے۔ اتنی طولانی اور سیر حاصل غزلیں کہنا قدیم رسم تھی جس کی طرف موجودہ شعرا بہت کم توجہ کرتے ہیں۔ اب یہ پرانی طرز بھی اپنے اندر ایک جدت رکھتی ہے۔

(۱)

نو بنو داغِ محبت کا نمایاں ہونا   خوابِ ہستی کا وہ اک خوابِ پریشاں ہونا

چاک دل چاک جگر چاک گریباں ہونا   وحشیو یہ تو نہیں عاشقِ جاناں ہونا

اُسے دیکھا بھی تو اس طرح کہ دیکھا ہی نہیں   اُف وہ سرتا بقدم عشوۂ پنہاں ہونا

بے قراروں کو ہے اب اک خلشِ پنہاں بھی   غم دوراں کو مبارک غمِ جاناں ہونا

فرشِ رہ دیدہ و دل ہیں ترے مشتاقوں کے   تیری آمد میں کوئی ساز نہ ساماں ہونا

چپے چپے میں ہے گلزار کے صد دشتِ جنوں   ذرّے ذرّے سے نمایاں ہے بیاباں ہونا

ٹھوکریں ہیں در و دیوار کی اور تیرے اسیر   سخت دشوار ہے شایستہ زنداں ہونا

نوعِ انساں کو دو عالم میں سکوں مل نہ سکا   غمِ ہستی کو نہ آیا غمِ پنہاں ہونا

اپنا انجام اگر عشق سمجھتا ہے تو پھر   حسن کا کس لئے شرمندۂ احساں ہونا

اب تو تنگ آ گئے اس کشمکشِ پنہاں سے   دل کے شیرازہ کو آیا نہ پریشاں ہونا

سازِ بے سوز سے دنیا نہیں بدلا کرتی   کارِ ہر نعرہ نہیں نعرۂ مستاں ہونا

وحشتِ عشق کا بڑھنا تو عدم ہو جانا   سمٹ آنا تو مرا پردۂ امکاں ہونا

سر بسر برقِ فنا عشق کے جلوے ہیں فراقؔ
خانۂ دل کو نہ آباد نہ ویراں ہونا

(۲)

ہے ابھی جوہرِ ہستی کو نمایاں ہونا   حسنِ آفاق کو ہے روکشِ انساں ہونا

سر بسر جسم کے امکان میں ہو جاں ہونا   رگِ ہستی کو نہ آیا ابھی لرزاں ہونا

سازِ بے سوز ہے اے عشق پئے نظمِ حیات   ان حجابوں کو سکھا شعلہ بداماں ہونا

رازِ سربستہ ہے شیرازۂ دل کی ترکیب   بیک انداز اسے یک جا و پریشاں ہونا

دلِ سوزاں شبِ غم پیکرِ بے خبری ہے   نہ شبستاں نہ اسے شمعِ شبستاں ہونا

ہم بھی یوں قول سے غالبؔ کے ہیں متفق لیکن   تا بکے حد سے بڑھے درد کا درماں ہونا

بات یہ ہے کہ ہیں آباد بھی برباد بھی ہوں   عقدۂ عشق کو دشوار نہ آساں ہونا

ذرہ اپنا بھی ہے خورشیدِ قیامت لیکن   مجھے منظور نہیں چاک گریباں ہونا

وہ سیہ کارِ محبت ہوں میں واعظ کہ کبھی   قبلۂ دیں تو کبھی کعبۂ ایماں ہونا

غفلتیں دیکھ زمانے کی نہ دیکھا ہو اگر   گیسوئے شاہدِ ہستی کا پریشاں ہونا

کس طرح عشق کی مشکل کو کوئی سہل کرے   جس میں آساں کو بھی آیا نہیں آساں ہونا

نزع میں دادِ وفا مل گئی بیمارِ دل کو   تیری تاخیر کا تاخیر پشیماں ہونا

اور عالم ہے مری وادیٔ وحشت کا فراقؔ
اسے زنداں نہ بیاباں نہ گلستاں ہونا

(۳)

خود نما ہو کے نہاں چھپ کے نمایاں ہونا   الغرض حسن کو رسوا کسی عنواں ہونا

کبھی صحرا کبھی گلشن کبھی زنداں ہونا   اور عالم کو کبھی میرا گریباں ہونا

یوں تو اکسیر ہے خاکِ درِ جاناں لیکن   کاوشِ غم سے اُسے گردشِ دوراں ہونا

حدِ تمکیں سے نہ باہر ہوئی وہ برقِ نگاہ   آج تک آ نہ سکا حسن کو حیراں ہونا

چارہ گر درد سراپا ہوں مرے درد نہیں   باور آیا مجھے نشتر کا رگِ جاں ہونا

مجھ سے بچنا ہی نہ اچھا ہے کہ اے دامنِ دوست   کیا تجھی کو ہے فقط میرا گریباں ہونا

دفترِ رازِ محبت تھا ملال دل پر   وہ سکوتِ نگہِ ناز کا پرساں ہونا

اب تو مجھ کو بھی مرے حال کا احساس نہیں   مشکلِ عشق مبارک تجھے آساں ہونا

رشکِ صد لطف و کرم ہے یہ نیاز نگِ ستم   کچھ نہیں جان سکے تیرا پشیماں ہونا

اُف وہ نیرنگِ جنوں چاک گریبانوں کے   کبھی خنداں کبھی گریاں کبھی حیراں ہونا

اسے جو کچھ کوئی سمجھے اسے جو کچھ جانے   غمِ جاناں کو مگر کفر نہ ایماں ہونا

نگہِ شوخ نے چھیڑا ہے رگِ سازِ مجاز   دیکھ اب حسنِ حقیقت کا نمایاں ہونا

ہیں امیدیں بھی تغافل سے ترے، گر یہ سچ ہے   اسے ہمراز نہ دمساز نہ پرساں ہونا

کتنی بے لاگ لگاوٹ نگہِ ناز کی تھی   یوں ملی جیسے اسے درد نہ درماں ہونا

آج در پردہ جنوں سلسلہ جنباں ہے فراقؔ
کھل گیا گیسوئے پُرخم کا پریشاں ہونا

رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھپوری

مُصوّر

"جی ہاں! آج کل اس لطیف فن کی قدر ہی نہ رہی جبھی میں اس قدر غریب ہوں"۔ مصوّر نے ایک سرد آہ بھر کر اجنبی سے کہا۔ اجنبی نے کمرے کی ہر چیز کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا۔

کمرے کا بوسیدہ اور مختصر سا سامان مصوّر کی غربت کا آئینہ دار تھا۔ جو چیز تھی میلی شکستہ اور بے ترتیب تھی اور زبان حال سے مصوّر کی پریشان حالی کی داستان سنا رہی تھی۔ ایک کونے میں ایک چھوٹی سی ٹوٹی ہوئی الماری تھی جس میں موٹے کاغذ کے چند تختے۔ آٹھ دس کتابیں۔ تین چار شیشیاں اور چار پانچ ٹوٹے ہوئے ڈبے تھے۔ دوسری طرف دیوار کے ساتھ ایک چھوٹی سی کہنہ میز دھری تھی۔ اس پر چند شیشیاں دو ایک ڈبے تین پیالیاں اور آدھ درجن کے قریب برش منتشر حالت میں پڑے تھے۔ اور اس قدر گرد آلود جیسے مہینوں سے انہیں کسی نے چھوا بھی نہ ہو۔ میز کے ساتھ ہی ایک پرانی ٹوٹی ہوئی کرسی تھی۔ جس کی ایک ٹانگ تو تھی ہی نہیں اور دوسری نیم شکستہ تھی۔ ایک طرف چارپائی تھی جس پر پھٹے پرانے کپڑوں کا ایک ڈھیر تھا۔ کھڑکی کے پاس ایک گرد آلود شمعدان تھا اور اس کے پاس ہی ایک مٹی کا چراغ فرش پر الٹا گرا ہوا۔ ایک پرانی اور بوسیدہ دری جس میں متعدد سوراخ تھے کمرے کے وسط میں بچھی ہوئی تھی۔ اس پر گرد و غبار کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا مدت سے اس کمرے کو جھاڑو کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا ہو۔ دیواروں پر گرد سے ڈھکی ہوئی چند تصویریں تھیں جن کے اوپر اور ارد گرد مکڑیوں کے بے شمار جالے لٹک رہے تھے۔ چھت میں جا بجا گرد و غبار کی جھالریں آویزاں تھیں۔

اجنبی کمرے کی ہر چیز کو بغور دیکھتا ہوا اور مصوّر کی حالت کا جائزہ لیتا ہوا دیر تک کچھ سوچتا رہا۔ اس وقت کمرے میں قبرستان کی سی خاموشی تھی۔ البتہ کبھی کبھی الماری کے پیچھے یا چارپائی کے نیچے کسی چوہے کے دوڑنے کی کھٹ کھٹ سے اس سکوت میں انتشار سا پیدا ہو جاتا تھا۔ یا چھت پر سے کسی چمگادڑ کی کرخت آواز اجنبی کی توجہ میں مخل ہوتی تھی جو کبھی مصوّر کی طرف دیکھتا اور کبھی حسرت بھری نگاہیں اِدھر اُدھر دوڑاتا۔

مصوّر شرم سے گڑا جا رہا تھا۔ اس کی شرمناک آنکھیں اجنبی کے سامنے نہ اٹھتی تھیں۔ دل میں تلاطم مچا ہوا تھا اور چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ شرمندہ تھا کہ وہ آج ایک اجنبی کے سامنے جو وضع قطع سے امیر معلوم ہوتا ہے کتنا ذلیل ہوا۔ سارا جسم پسینوں میں شرابور تھا اور خشک ہونٹوں پر بار بار زبان پھیرتا ہوا ٹھنڈی آہیں بھرتا تھا۔

اجنبی نے ایک سگار سلگایا اور ایک لمبا کش لگاتے ہوئے مصوّر سے انتہائی ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔ "اپنی تصویریں کسی نمائش میں کیوں نہیں بھیجتے؟"

مصوّر نے آنکھیں اجنبی کی طرف اٹھا کر پھر جھکا لیں اور خشک گلے کو کھانس کر تر کرتے ہوئے جواب دیا۔ "آج کل غریبوں کی کون پوچھتا ہے۔ ہر جگہ زرداروں کا بول بالا ہے"۔

اجنبی کے چہرے پر اطمینان کی جھلک سی نمودار ہوئی۔ اس نے سنجیدہ ہو کر جواب دیا۔ "درست ہے"۔

کمرے میں پھر ایک بار خاموشی چھا گئی۔ مصوّر کی آنکھیں زمین پر گڑی ہوئی تھیں اور اجنبی — وہ سگار کے کش پر کش لگا رہا تھا اور بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے سر کے بال پریشان کر رہا تھا۔ جیسے کسی بھولی ہوئی بات کو ذہن میں لانے کی کوشش کر رہا ہو۔ آخر اس نے خاموشی کو توڑتے ہوئے پھر کہا۔ "آپ کو میری ایک تجویز منظور ہو تو میں امید کرتا ہوں کہ آپ اس مصیبت سے ہمیشہ کے لئے نجات حاصل کر سکیں گے"۔

غریب مصوّر نے محسوس کیا کہ اجنبی کے ان الفاظ میں ہمدردی مہربانی اور امید مضمر ہے اُس نے شکریے کے طور پر سر جھکا کر کہا۔ "آپ کی عنایت ——— ارشاد!"

"میں تجارت پیشہ آدمی ہوں اور کم و بیش ہر شہر کے معززین میرے واقف ہیں۔ مجھے امید ہے کہ میں اپنی شہرت اور رسوخ کی بدولت

آپ کی تصویروں کے لئے قدر دان خریدار پیدا کر سکوں گا۔ آپ سر دست میرے ہی مکان پر نگار خانہ قایم کر کے مستعدی کے ساتھ کام شروع کریں۔ فی الحال آپ کو پچاس روپے ماہوار دے سکوں گا۔ اس کے علاوہ رہائش اور کھانا مفت۔"

غریب مصور کے چہرے پر مسرت کی لہر سی دوڑ گئی اور آنکھوں میں امید کی جھلک آگئی جیسے کالے بادلوں میں یکایک بجلی چمک اُٹھے۔ پچاس روپے ماہانہ! لمحہ بھر میں اُس کی امیدوں کی دنیا نئی روشنی سے چمک اٹھی۔ چشم تصور میں روشن مستقبل کا نقشہ بندھ گیا اور خشک ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہ اپنی جگہ سے اچھل پڑا اور اجنبی کے سامنے کھڑے ہو کر کہا "منظور ہے۔"

اجنبی نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے جیب سے ایک ملاقاتی کارڈ اور دس روپے کا نوٹ نکالے اور مصور کو دیتے ہوئے کہا "یہ میرا پتہ ہے۔ اور یہ سفر خرچ۔ میں ایک ہفتے تک آپ کا انتظار کروں گا۔" "بہت اچھا" مصور نے تشکر آمیز لہجے میں کہا اور ادب کے طور پر بیرونی دروازے تک اپنے محسن کے پیچھے پیچھے گیا

واپس آکر مصور نے اجنبی کا دیا ہوا کارڈ دیکھا۔ لکھا تھا "سیٹھ جمنا لال ملک الجی؟ مال روڈ لاہور"

مصور گو غریب تھا۔ لیکن قدرت نے اُسے دلفریب حسن کی دولت عطا کی تھی۔ وہ جوان تھا اور خوبصورتی اس کے پھٹے پرانے کپڑوں میں سے پھوٹ پھوٹ کر نکلتی تھی جیسے بادلوں کے پیچھے سے چاندنی۔ اس کے چہرے میں قدرتی نور پرکشش، آنکھوں میں جادو اور آواز میں شیرینی تھی۔ ہر عضو سے شباب ٹپک رہا تھا۔ مصوری کا پیشہ اُسے ورثہ میں ملا تھا اور اس فن میں اُسے کافی دسترس اور پوری مہارت حاصل تھی۔ اگر وہ ترقی اور روشنی کی دنیا سے دور ــــ ایک گاؤں میں پیدا نہ ہوتا اور وہ بھی ایک غریب کے ہاں تو شاید دنیائے مصوری میں اس کا نام بڑی عزت کے ساتھ لیا جاتا اور آج وہ بے شمار دولت اور عالمگیر شہرت کا مالک ہوتا۔ مگر اب ایک ایسے گاؤں میں جہاں اس کی حوصلہ افزائی کا ایک بھی ذریعہ موجود نہ تھا وہ فلاکت کے دن گزار رہا تھا۔ شاید اُسے خود بھی معلوم نہ تھا کہ اس کے ہاتھ میں وہ جدت اور تخیل میں وہ بلندی موجود ہے جس سے مصوری کے لطیف فن کو چار چاند لگ سکتے ہیں۔ اُسے اس قسم کے وسائل بھی بہم نہ تھے کہ گاؤں سے نکل کر ادھر اُدھر دوڑ دھوپ کر لیتا۔ ہاں البتہ جب دیوالی کے دن اس گاؤں کی ایک پہاڑی کے دامن میں میلہ لگتا اور لوگ نزدیک و دُور سے آکر یہاں جمع ہو جاتے تو یہ بھی سال بھر کی محنت کے دو چار بہترین نمونے لے کر وہاں چلا جاتا اور سو ڈیڑھ سو روپیہ کما لاتا یہی اس کا واحد ذریعۂ معاش تھا۔

سیٹھ جمنا لال ایک مشہور امیر آدمی تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ ڈیڑھ ایک کروڑ کے مالک ہیں۔ اپنے کئی کارخانے جاری تھے۔ متعدد کمپنیوں کے سرمائے میں ان کا حصہ تھا۔ اب کے جو نئی ریلوے سکیم مرتب ہوئی تھی اُس کا ٹھیکہ سیٹھ صاحب ہی کے نام منظور ہوا تھا۔ بڑی کمپنیوں کے مالک ان کے قرضدار تھے۔ ان کا عالی شان مکان اور وسیع باغ قابل دید تھا۔ مال روڈ پر کی اکثر دکانیں انہی کی ملکیت تھیں۔

سیٹھ صاحب کی نسبت دو باتیں مشہور تھیں۔ ایک یہ کہ وہ بڑے طامع ہیں اور دوسرے یہ کہ انتہا درجہ کے خوددار ہیں۔ یہ دونوں باتیں بہت حد تک درست بھی تھیں۔ کیونکہ جہاں سیٹھ صاحب کی عمر ۶۵ سال سے بھی تجاوز کر گئی تھی۔ وہاں ان کی کاروباری سرگرمیوں میں روز بروز اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ چاہئے تو یہ تھا کہ اب آخری وقت میں کمائی ہوئی دولت ہی پر اکتفا کر کے عاقبت کی فکر میں لگ جاتے خصوصاً جب ایک لڑکی کے سوا اُن کا کوئی وارث بھی نہ تھا۔ خودداری کا یہ حال تھا کہ اِسی عمر میں ان کا سر کسی کے سامنے نہ جھکا تھا۔ بے شمار دولت کمائی۔ لیکن کبھی کسی کی خوشامد نہ کی اور کسی کے زیر بار احسان نہ ہوئے۔ کوئی اُن کی ذات یا نیت پر حملہ کرتا تو اس سے بدلہ لئے بغیر دم نہ لیتے۔ اُن کے ناموس پر ذرا بھی حرف آجاتا تو شاید خودکشی پر آمادہ ہو جاتے۔

یہ سیٹھ صاحب کے طامع ہونے ہی کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے اپنے مکان میں ایک نگار خانہ قایم کرنے کی ٹھان لی تھی اور غریب مصور کے ساتھ ہمدردی ظاہر کرنے کا دراصل مطلب ہی یہ تھا کہ اُسے دولت کمانے کا آلۂ کار بنایا جائے۔ گو اس میں اُس کا فایدہ بھی ضرور تھا۔

سیٹھ جمنا لال کی نظرِ التفات اس غریب اور گمنام مصور ہی پر کیوں پڑی۔ اس میں بھی ایک راز تھا۔ جب وہ گزشتہ مہینے کسی کاروباری سلسلے میں بمبئی گئے تو حسب معمول ایک پرانے دوست چودھری رام لال کے ہاں اُترے۔ چودھری صاحب مصور تو نہ تھے لیکن اس فن کے بڑے دلدادہ تھے۔ یوں تو وہ پہلے ایک متوسط الحال آدمی تھے لیکن اب کے ان کی کایا ہی پلٹ گئی تھی۔ وہ ایک ہی سال میں اتنے امیر ہو گئے تھے کہ ایک اچھی خاصی

کوٹھی تیار کر لی تھی اور نوکر چاکر بھی رکھ لئے تھے۔

ایک رات کو چودھری جی نے باتوں باتوں میں سیٹھ صاحب کو بتایا کہ انہوں نے اس سال آل انڈیا آرٹس اگزبیشن میں ایک گمنام مصوّر سے خریدی ہوئی تصویر کی بدولت پچاس ہزار روپے کا انعام حاصل کیا۔ سیٹھ صاحب کب چوکنے والے تھے۔ طمع نے دل ہی دل میں چٹکیاں لیں آخر انہوں نے کرید کرید کر باتیں کرتے ہوئے مصوّر کا پتہ پوچھ ہی لیا۔ اور یہ سُن کر اُن کی حیرانی کی حد ہی نہ رہی کہ یہ گمنام مصوّر اُن کے اپنے وطن کے ملحق ہی ایک گاؤں میں رہتا ہے اور اس کا نام گوپال ہے۔

سیٹھ جمنالال صبح کے وقت اپنے صحن کے باغیچے میں گئے۔ اس وقت نسیم سحری کی سُبک خرامی ماحول میں ہلکا سا تبسم پیدا کر رہی تھی۔ خوشبو ہوا کے کندھوں پر اٹھکیلیاں کرتی ہوئی چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ سورج کی شعاعیں پھولوں کا عطر کھینچ رہی تھیں۔ نوخیز کلیاں گھونگھٹ کھولے نمائش حُسن میں مصروف تھیں اور خوش الحان پرندوں کے نغمے فطرت کو وجد میں لا رہے تھے۔ سیٹھ صاحب ایک روش سے دوسری روش کو کچھ گنگناتے ہوئے مستانہ وار ٹہل رہے تھے۔ اتنے میں صحن کا دروازہ کھلا اور ایک حسین نوجوان میلے کچیلے کپڑے پہنے اندر آیا۔ سیٹھ صاحب نے گوپال مصوّر کو جھٹ پہچان لیا اور اسے اپنی آراستہ بیٹھک میں لے گئے۔

دونوں آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ دروازے کی طرف سیٹھ صاحب کی پیٹھ تھی اور گوپال کا مُنہ۔ اِدھر اُدھر کی رسمی گفتگو کے بعد معاہدہ کا ذکر چھڑ گیا۔ گوپال بار بار سیٹھ صاحب کی مہربانیوں کا شکریہ ادا کر رہا تھا اور سیٹھ صاحب اسے محض انسانی فرض بتا کر اپنی کسرِ نفسی کا ثبوت دے رہے تھے۔ آخر سیٹھ صاحب گوپال کے لئے ملازمت کا حکمنامہ لکھنے لگے۔

اسی وقت ایک دوشیزۂ حسن کی تمام دلفریبیوں میں لپٹی ہوئی بیٹھک کے دروازے پر آ کر ٹھٹھک گئی۔ وہ مسکراہٹ کے پھول بکھیر رہی تھی۔ اُس کے کالے اور لمبے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ موٹی موٹی ساغر نما آنکھوں میں محبت کا سرمہ جھلک رہا تھا۔ سراپا سے شباب کی مستی ٹپک رہی تھی اور ہونٹ گلاب کی پتیوں کی مانند سرخ اور شگفتہ تھے۔ اس کی نظریں گوپال پر پڑیں تو پھول سے چہرے پر دفعتہً سرخی سی دوڑی اور دل میں میٹھی سی خلش محسوس ہوئی۔ جیسے کسی نے اس پر جادو سا کیا ہو۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اُس کے دل کی گہرائیوں میں سوئے ہوئے جذبات کو بیدار کر دیا ہو۔ گوپال نے بھی دوشیزہ کی ترچھی نگاہوں کا اپنی دزدیدہ نظروں سے مقابلہ کیا تو اُس کے سارے جسم میں میٹھی سی حرارت پھیل گئی۔ دل میں گدگدی سی پیدا ہوئی اور اُسے ایسا معلوم ہونے لگا۔ جیسے کسی نے اُس کے دل کا سکون لوٹ لیا ہو۔ دوشیزہ کی گردن پانی کی لہر کی طرح بل کھا کر جھک گئی۔ پھر وہ دفعتہً دبے پاؤں دروازے سے ہٹ گئی۔ جیسے چاند اپنا جلوہ دکھا کر بادلوں میں چھپ جائے۔ مصوّر کی آنکھیں اُسی طرف کھُلی کی کھُلی رہ گئیں۔

سیٹھ صاحب حکمنامہ لکھنے میں مشغول تھے۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ اُن کی پیٹھ کے پیچھے اور منہ کے سامنے کیا کیا گُل کھِلے۔

سیٹھ جمنالال کے مکان کے ساتھ ہی ایک وسیع باغ تھا جس میں اُس نے ایک دو طبقہ دیوانخانہ بنوایا تھا اور جہاں وہ کبھی کبھی گھر کے شور و غل سے دُور ـــــ تنہائی میں بیٹھ جاتے اور اپنے کاروبار کی نسبت پیچیدہ باتیں سوچ لیا کرتے۔ اسی دیوانخانے کی پہلی منزل میں نگارخانہ قائم ہوا اور سیٹھ صاحب نے مصوّر کو ہدایت کی کہ وہ ایک ماہ کے اندر اندر ایک ایسی تصویر تیار کرے جو اس کا شاہکار ہو۔ اور جب تک یہ مکمل نہ ہو جائے وہ نگار خانے سے باہر قدم نہ رکھے۔ گوپال کو کسی چیز سے واسطہ نہ تھا۔ روٹی وغیرہ سیٹھ صاحب کا ملازم وقت پر وہیں لے آتا۔ وہ صبح اور شام کے وقت اکثر تصویر کشی میں منہمک رہتا اور کبھی کبھی دن میں تھوڑی دیر کے لئے باغ کی سیر سے فرحت حاصل کرتا۔ یا چارپائی پر آنکھیں بند کئے ہوئے کچھ سوچنے لگتا۔ یہاں تک کہ تصوّر کی دنیا میں گم ہو جاتا۔ سچ پوچھئے تو وہ سیٹھ صاحب کا بے زنجیر قیدی تھا۔

گوپال نے اُس واقعے کو بھول جانے کی بہت کوشش کی۔ جو سیٹھ صاحب کے مکان میں قدم دھرتے ہی اُس کے پیش آیا تھا۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اپنے محسن کے ساتھ غداری کرے اور اُس کی مہربانیوں کا یہ بدلہ دے کہ اُس کی لڑکی کے عشق کا دم بھرے۔ لیکن ... ... وہ اس میں بالکل ناکام رہا۔ کیونکہ اُس حُسن اور شباب کے تڑپتے ہوئے مجسمہ کی محبت آنکھوں سے اتر کر دل کی گہرائی میں پہنچ چکی تھی اور خون کے ساتھ تحلیل ہو کر رگ رگ میں سما چکی تھی۔ وہ اُس کی یاد میں محو ہو جاتا اور پھر اٹھ کر ٹہلنے لگتا۔ رات کو اُسے ایسا محسوس ہوتا کہ وہ حسینہ اُس کے سرہانے کھڑی نور بکھیر رہی ہے۔ اور اپنے تبسم سے ماحول کو وجد میں لا رہی ہے۔

اُسے اپنی حالت کا بھی پورا پورا احساس تھا۔ گو اس نے ساری

عمر غربت میں گزاری تھی لیکن اسے اس طرح چار دیواری میں نظر بند رہنے کا کبھی موقع نہ ملا تھا۔ سیٹھ صاحب نے اُسے مکان اور باغ سے باہر قدم رکھنے سے کیوں منع کیا یہ اس کے لئے ایک معمّا تھا۔ کبھی کبھی اُسے خیال ہوتا کہ شاید وہ اس قید سے کبھی آزاد نہ ہو سکے گا اور وہ گھبرا سا جاتا۔ اس نے کئی دفعہ وہاں سے بھاگ نکلنے کا تہیہ کر لیا۔ لیکن پھر اُسے کوئی خیال سا آ جاتا اور وہ اپنا ارادہ ترک کر دیتا۔

سیٹھ جمنالال کی لڑکی رادھا اکثر شام کے وقت باغ کی سیر کے لئے نکلتی اور دیر تک وہیں گلگشت میں مصروف رہتی۔ وہ عموماً ایک سرو کے درخت کے نیچے بیٹھ جاتی جو اس نگار خانے کے بالکل قریب تھا جہاں اس وقت گوپال دین و دنیا سے بے خبر تصویر کشی میں محو ہوتا۔ وہ درخت کے سہارے اسی طرف منہ کر کے بیٹھ جاتی اور کسی خیال میں کھوئی جاتی۔ کبھی کبھی اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا اور آنکھیں روتی پڑتیں۔ اُسے ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ کوئی قیمتی چیز کھو بیٹھی ہے۔

جب ہر طرف شام کا دھندلکا پھیل جاتا۔ تاریکی ہر سو روشنی کا تعاقب کرنے لگتی اور ہر چیز اندھیرے میں گم ہو جاتی تو وہ دبے پاؤں نگار خانے کے پاس جاتی اور کھڑکی کی چلمن سے اندر جھانکتی اُس کی نظریں سیدھی اس تصویر پر پڑتیں۔ جسے گوپال سب کچھ بھول کر کھڑکی کی طرف پیٹھ کئے روشنی کے سامنے تیار کرنے میں ہمہ تن مصروف ہوتا۔ وہ دفعتہً چونک سی پڑتی۔ اس کے چہرے کی رنگت بدل جاتی اور دل بلیوں اچھلنے لگتا۔ پھر لمبے لمبے سانس بھرتی اور مڑ مڑ کر دیکھتی ہوئی لوٹ آتی۔ اس وقت اُسے ایسا محسوس ہوتا جیسے اس سے کوئی پیاری چیز چھینی جا رہی ہے۔

سیٹھ جمنالال چاہتے تھے کہ تصویر جلد تیار ہو جائے کیونکہ آل انڈیا آرٹس اگزیبیشن عنقریب کلکتہ میں منعقد ہونے والی تھی۔ جب دوپہر کو گوپال روٹی کھانے کے لئے دالان میں نکلتا تو سیٹھ صاحب اکثر اس کے پاس جاتے اور تصویر کی نسبت دریافت کرتے۔ انہوں نے نگار خانے میں جانے کی کبھی کوشش نہ کی۔ کیونکہ گوپال نے انہیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ تصویر کو تکمیل سے پہلے دکھانا قواعدِ فنِ مصوری کے خلاف ہے جب گوپال انہیں اطمینان دلاتا کہ تصویر مقررہ وقت پر ضرور مکمل ہو جائے گی تو ان کے چہرے پر مسرت کی جھلک نمودار ہو جاتی اور وہ نہایت فراخ دلی کے ساتھ معقول انعام کا وعدہ کرتے۔

جب پورے بیس دن گزر گئے تو سیٹھ صاحب شام کے وقت باغ میں گئے اور گوپال کو باہر بلایا۔ گوپال کے آتے ہی سیٹھ صاحب نے بے تابی سے پوچھا "کیوں؟ تصویر تیار ہو گئی؟ آج آخری دن ہے"۔ "جی ہاں" گوپال نے اطمینان اور سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔ "میں اسے کب دیکھ سکوں گا؟" سیٹھ صاحب نے پھر پوچھا۔ "کل صبح"۔ گوپال نے جواب دیا۔

گوپال نگار خانے میں واپس آیا تو تصویر کے سامنے بیٹھ کر اپنی قابلیت کو خود سراہنے لگا۔ وہ اپنی کامیابی پر بے حد خوش تھا۔ کیونکہ اس کے خیال میں اس کا شاہکار تیار ہو چکا تھا۔ اس کی انتہائی رعنائی اور دلکشی کو دیکھ کر وہ خود شک کرنے لگا کہ آیا ایسی لطیف اور حسین چیز واقعی اسی کے تخیل کا نتیجہ ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ سارا ماحول مسکرا رہا ہے اور اس کے درمیان وہ تصویر بھی مسکرا رہی ہے — تب — گوپال خود بھی مسکرایا۔

علی الصبح جب مرغِ سحر نے کائنات کو بیداری کا پیغام سنایا سیٹھ صاحب بستر استراحت سے اٹھے اور سیدھا نگار خانے کا رُخ کیا۔ وہاں پہنچ کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ گوپال اس وقت تصویر کے سامنے بیٹھا کچھ گنگنا رہا تھا۔ آواز سُن کر چونک سا پڑا۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ سیٹھ صاحب نے اندر آ کر بے تابی کے ساتھ پوچھا "تصویر کہاں ہے؟" گوپال نے آگے بڑھ کر تصویر پر سے پردہ اٹھا لیا اور داد لینے کی خاطر سیٹھ صاحب کے سامنے فاتحانہ انداز کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔

سیٹھ صاحب نے تصویر پر نظر ڈالی تو دھک سے رہ گئے۔ آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں غصہ سے سارے جسم میں ارتعاش پیدا ہوا اور سانس پھولنے لگا۔ نتھنے پھڑکنے لگے اور ہونٹ خزاں زدہ پتوں کی مانند ہلنے لگے۔ انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے انہیں کنوئیں میں دھکیل دیا ہو۔ انہوں نے خشم آلود نگاہوں سے گوپال کی طرف دیکھا جیسے ایک خونخوار شیر بکری کو تک رہا ہو۔ لیکن گوپال ہنس رہا تھا اور اپنی مست نگاہوں سے تصویر کی طرف ٹکٹکی باندھے کھڑا تھا۔

سیٹھ صاحب کے غصے کو وہ بالکل نہ سمجھ سکا۔ اسے خود معلوم نہ تھا کہ عشق کی بے خودی میں اس نے اُن کی بیٹی رادھا کو اپنے شاہکار کا موضوع بنا رکھا تھا اور یہ تصویر اُسی کی تھی۔

دینا ناتھ داریکو شاہد کاشمیری

جرمِ سنگین

چھوڑ اے دوست خیالی باتیں — دل بہلانے والی باتیں
اپنے نہیں یہ بیگانے ہیں — مال و زر کے دیوانے ہیں
یہ سرمایہ دار ہیں سارے — دولت کے بیمار ہیں سارے
اپنی دھن میں جھوم رہے ہیں — عیش کے پاؤں چوم رہے ہیں
اُن کے شیشوں میں جو مے ہے — جانتا ہے تو یہ کیا شے ہے
رنگِ ہوس کی گلکاری ہے — نشہ نہیں ہے بیماری ہے

دیکھ غریبوں کو تو جا کر — بیٹھے ہیں کیا ناوک کھا کر
چہرے زرد، لبوں پر آہیں — اشکوں سے نمناک نگاہیں
فاقوں سے یہ حال ہوا ہے — جینا ایک وبال ہوا ہے
راہ قضا کی دیکھ رہے ہیں — شانِ خدا کی دیکھ رہے ہیں
دیکھ کے حال اِن مظلوموں کا — بھولے بھالے معصوموں کا
روحِ سکوں مضطر ہوتی ہے — چرخ کی آنکھ لہو روتی ہے
پتھر کا دل موم بھی گر ہو — بے رحموں پر کچھ نہ اثر ہو
عیش کی گود میں جو سوتا ہے — کیا جانے غم کیا ہوتا ہے

اُن کا جرم معاف نہ ہوگا
ہوگا تو انصاف نہ ہوگا

خاور

دنیائے ادب

ادبیات ۱۹۳۶ء میں

تمام متمدن دُنیا کی پورے سال بھر کی ادبیات کا جائزہ لینا سمندر کی لہروں کو گننا ہے۔ کیونکہ نئی کتابوں کا کوئی شمار نہیں ہوسکتا۔ اور ادبی تحریکات سیاسی واقعات کی طرح نمایاں نہیں ہوتیں۔ وہ عموماً معاشرت یعنی سوسائٹی کی سطح کے نیچے کام کرتی ہیں۔ اور بہت مدت کے بعد ابھرتی ہیں۔ سالِ گذشتہ میں ادبی دنیا کی کیفیت اور حالات پر سرسری نظر ڈالنے سے کسی ایسی تحریک کا سراغ نہیں ملتا۔ جس کو خاص طور پر اس سال سے منسوب کیا جاسکے۔ اور نہ اس سال کے اندر بڑے مصنفین کی فہرست میں کسی نئے نام کا اضافہ ہوا۔ یورپ میں عام ادبیات کی روش وہی ہے۔ جو جنگِ عظیم کے بعد سے رہی ہے۔ جنگ کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ تمام دُنیا کے تجارتی، مالی اور معاشرتی انتظام میں خلل پیدا ہوگیا۔ سوسائٹی کے بعض طبقوں میں افلاس اور بےکاری بڑھ گئی اور اس کی وجہ سے وہ مخالفت جو سرمایہ دار اور مزدور جماعتوں کے درمیان پہلے سے موجود تھی اور زیادہ سخت ہوگئی۔ لیکن تعلیم یافتہ آدمیوں کو جنگ کے نتائج میں سے جس چیز کا سب سے زیادہ خیال پیدا ہوا وہ لاکھوں جانوں کا نقصان تھا۔ اور اس خیال کی وجہ سے ان کے دلوں میں امن پسندی اور صلح جوئی کے جذبات اور قوی ہوگئے۔ چونکہ کتابوں میں وہی باتیں لکھی جاتی ہیں جو انسان اپنے دل میں سوچتے ہیں۔ ان خیالات اور جذبات کا عکس یورپ کے ادبیات میں پایا جاتا ہے۔ ادبی مقاصد مختلف زبانوں میں مختلف ہوتے ہیں۔ انیسویں صدی کے آخر میں ادب کو سیاسی، اخلاقی اور معاشرتی مسائل کی آمیزش سے پاک رکھنے کا خیال بہت عام تھا۔ لیکن اب یہ بات نہیں ہے۔ اور ہر قسم کی ادبی تصانیف یہاں تک کہ شاعری، ناول اور ناٹک میں بھی ان تمام سوالات سے آگاہی اور دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے۔ جو یورپ کے اپنے معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی زندگی کی جدید تنظیم میں درپیش ہیں۔ انیسویں صدی کے مقابلے میں آج کل کے ادبی مقاصد کا ایک اور اہم اختلاف یہ ہے کہ اب عقل اور عقل کے بنائے ہوئے سائنس پر اتنا بھروسہ نہیں کیا جاتا جتنا اس وقت کیا جاتا تھا۔ بلکہ عقل کے ساتھ وجدان کو بھی جگہ دی جاتی ہے جس کو ان تمام فطری محرکات کا مجموعہ خیال کرنا چاہیئے۔ جو انسان اور دوسرے حیوانات میں مشترک پائے جاتے ہیں۔ یا جو انسان کے لئے مخصوص ہیں۔ ان محرکات میں ایک نہائت زبردست محرک جنسی کشش ہے۔ یعنی عورت اور مرد کا فطری لگاؤ جس پر یورپ کے مصنف اب ایسے کھلے الفاظ میں گفتگو کرتے ہیں جو انیسویں صدی میں خلافِ تہذیب اور خلافِ اخلاق خیال کئے جاتے۔ اس بارے میں جس مصنف کا انگریزی ادبیات پر سب سے زیادہ اثر پڑا وہ D. H. Lawrence ہے۔ اور لارنس کی وفات کو چھ سال سے زیادہ گزر گئے لیکن اس کی نظم و نثر کا اب بھی بہت چرچا ہے اور ہر سال اس کے متعلق نئی نئی کتابیں نکلتی رہتی ہیں ۱۹۳۶ء میں اس کے متفرق مضامین کا ایک مجموعہ شائع ہوا ہے جن میں سے اکثر اس کی اپنی زندگی میں اشاعت سے محروم رہ گئے تھے۔ اس مجموعے کا نام Phoenix ہے اور اس میں بہت سے ایسے مضامین ہیں۔ جن کو Lawrence کے فلسفۂ حیات اور اسلوبِ بیان کا بہترین نمونہ خیال کیا جاسکتا ہے۔

انگریزی زبان کے ایک مشہور ادیب و شاعر W.B. Yeats کا قول ہے کہ گذشتہ پچاس سال میں انگلستان میں شاعری کا جتنا زور رہا ہے وہ سوائے سترہویں صدی کے نصف اوّل کے اتنی مدت میں اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا۔ خود [illegible] کے علاوہ جن شعرا کے کلام پر ۱۹۳۶ء میں سب سے زیادہ توجہ کی گئی ہے۔ ان میں [illegible] خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اگرچہ انہوں نے اس سال کے اندر اپنی کوئی نئی اہم نظم شائع نہیں کی۔ لیکن سال کے شروع میں ان کی نظموں کا ایک مجموعہ شائع ہوا تھا۔ [illegible] کی شاعری میں علاوہ بعض فنی جدتوں کے اس زمانے کی تمام ادبی، علمی اور معاشرتی تحریکات کی جھلک موجود ہے۔ اور یہ اثر یورپ اور امریکہ سے گزر کر مشرق میں بھی محسوس ہوا ہے ہمارے ملک

میں بنگال کے بعض شاعر جو دیسی شعراء کی بہ نسبت مغربی ادبیات سے زیادہ باخبر معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً سدھندرا ناتھ دتا، مسٹر پریم اندرا ناتھ متر اور مسٹر سمر سین ہمعنلر ح کی شاعری سے بہت متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ یورپ میں ناول نئے خیالات کی ترجمانی اور اشاعت کا ایک بہت مفید ذریعہ قرار پاگیا ہے۔ اور بہت کم ناول ایسے لکھے جاتے ہیں۔ جن کا قصہ سے زیادہ کوئی مقصد نہ ہو۔ انگلستان میں گذشتہ سال جتنے ناول شائع ہوئے۔ اُن میں Sparken Broke کا Morgan اور Eyeless in Gaza کا Mr. Aldous Huxley بعض لحاظ سے شاید سب سے زیادہ وقیع خیال کیے جا سکتے ہیں۔

Mr. Morgan کا ناول بظاہر حسن و عشق کی ایک داستان ہے لیکن اس کے ضمن میں شاعر طبع انسان کی ذہنیت کا جو خاکہ کھینچا گیا ہے وہ بہت سے باریک فلسفیانہ پہلو رکھتا ہے۔ اور Mr. Aldous Huxley کے ناول کے متعلق یہ کہنا دشوار ہے کہ اس زمانہ میں سیاسی، معاشرتی اور معاشی مسائل میں سے کونسا ایسا مسئلہ ہے جس کا کچھ ذکر اس کتاب میں موجود نہ ہو۔ اگرچہ ناول کی ایجاد کا فخر انگلستان کو حاصل ہے لیکن زمانۂ حال میں اس کے بہترین نمونے غالباً اور ملکوں میں پائے جاتے ہیں۔ انیسویں صدی کے آخر میں فرانس اور روس کے ناول نویسوں کی بہت شہرت تھی۔ اس لئے یہ دیکھنا چاہیئے کہ ۱۹۳۶ء میں ناول نویسی کے فن میں ان ملکوں کا کیا پایہ ہے۔ فرانس میں Flaubert اور Balzac کے زمانے سے Realism یعنی واقعیت کا تسلط رہا ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ قصہ کے پیرائے میں روزمرہ زندگی کی تصویر پیش کی جائے جس میں زندگی کا سیاہ و سفید یعنی سب اچھی اور بُری چیزیں یکساں نمایاں ہوں۔ گذشتہ سال فرانس میں جو معرکۃ الآرا ناول شائع ہوئے ہیں۔ اُن میں یہ رنگ بدستور قائم ہے۔ ان میں شاید سب سے زیادہ دلچسپ ناول Jules Romain کا ضخیم ناول Men of good will ہے جس کے بعض حصے گذشتہ سال اور بعض اس سے قبل شائع ہوئے تھے۔ جن میں بہت سے مردوں اور عورتوں کے کردار ہیں۔ جن کو اس زمانہ کے شہر پیرس کے باشندوں کی تصویریں خیال کیا جا سکتا ہے لیکن چونکہ ابھی مصنف نے اپنے قصے کو پورا نہیں کیا۔ اس لئے یہ کہنا دشوار ہے کہ اس کا اصلی مقصد کیا ہے۔ واقعیت کے اس غلبہ کے خلاف بغاوت کے بھی کچھ آثار فرانس میں نمودار ہو گئے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۳۶ء میں کئی ایسے ناول بھی شائع ہوئے۔ جن کے مصنفین نے جو عموماً نئی پود کے لوگ ہیں۔ واقعاتِ حاضرہ سے قطع نظر کر کے یا تو محض خیالی افسانے لکھنے کی کوشش کی اور اپنے ملک کی گذشتہ معاشرت اور پرانی عمارتوں کو اپنے قصوں کی بنیاد قرار دیا۔ موجودہ دور کی اُلجھنوں سے مخلصی حاصل کرنے کا ایک طریقہ گذرے ہوئے زمانے کی یاد اور دور افتادہ ملکوں کی سیر بھی ہے۔ اور اس پر سفرناموں اور تاریخی افسانوں کی دلچسپی قائم ہے۔ ۱۹۳۶ء کے بہترین تاریخی افسانے غالباً مشہور جرمن مصنف Feucht Wanger اور اسکے ہم وطن Thomas Manne کی وہ تصانیف ہیں۔ جن کا ماخذ یہودیوں کی پرانی تاریخ ہے۔ یہ دونو مصنف یہودی نسل سے ہیں۔ جنہوں نے جرمن حکومت کی موجودہ سیاسی روش کے دباؤ سے ترکِ وطن کیا ہے۔ اس سیاسی روش اور فلسطین میں عربوں کی مخاصمانہ جدوجہد کی وجہ سے یہودیوں کی روایات، اُن کی تاریخ اور اُن کے مستقبل میں یورپ کی دلچسپی ازسرِنو تازہ ہو گئی ہے۔ اور ۱۹۳۶ء میں یورپ اور امریکہ میں بہت سی کتابیں ان مضامین کے متعلق شائع ہوئی ہیں۔ جن میں سے بعض یہودیوں کے موافق اور بعض اُن کے مخالف ہیں۔

روسی افسانہ نگاری کا آخری مشہور علمبردار M. Gorky تھا۔ جس کا ابھی حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔ گورکی اگرچہ روس کے موجودہ اشتراکی خیالات کا معتقد اور Lenin کا ذاتی دوست تھا۔ لیکن اس کی بہترین تصانیف اس معاشرت اور تمدن سے متعلق تھیں۔ جس کو بالشویکی انقلاب نے فنا کر دیا ہے۔ انقلاب کے بعد سے روسی ادبیات بالشویکی عقائد کی تبلیغ کے لئے وقف ہو گئی ہیں۔ اور کسی ایسے مصنف یا تصنیف کا نام لینا دشوار ہے۔ جس نے سالِ گذشتہ میں کوئی خاص امتیاز حاصل کیا ہو۔ دراصل اشتراکیت کسی قسم کے بھی غیر معمولی امتیاز کو پسند نہیں کرتی۔ اور اس کے حامیوں کا یہ خیال ہے کہ آئندہ اور صنعت و حرفت کے مانند تصنیف و تالیف بھی باہمی تعاون کے اصول پر کی جائے۔ یعنی یہ کہ کوئی کتاب ایک آدمی کی بنائی ہوئی نہ سمجھی جائے۔ بلکہ اس کے بنانے میں بہت سے آدمیوں کا ہاتھ ہو۔ جہاں تک مزدوروں اور کسانوں کی تنظیم کا تعلق ہے۔ روسی خیالات کا اثر دور دور کے ملکوں پر پڑا ہے۔ ۱۹۳۶ء کے آغاز سے امریکہ کی ادبیات خصوصاً مختصر افسانوں میں اشتراکی خیالات کا بہت اثر پایا جاتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ غالباً یہ ہے کہ جنگ سے پہلے امریکہ ایک مالدار ملک سمجھا جاتا تھا۔ لیکن تجارتی اور مالی نظام کی برہمی نے وہاں بھی افلاس اور بیکاری کا ناگوار مسئلہ پیدا کر دیا ہے۔ اور لحاظ سے بھی امریکہ کی ادبیات میں وہی سب میلانات پائے جاتے ہیں جن کا یورپ میں سراغ ملتا ہے۔ اور بڑے علم کے مصنفین میں Eugene O. Neill

کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اس کے مختلف ناٹکوں کی شہرت ۱۹۲۰ء سے سنی جاتی ہے۔ لیکن حال ہی میں نوبل پرائز کے مل جانے سے اس شہرت پر مہرِ ثبوت لگ گئی ہے۔ امریکہ کے مقابل بحر الکاہل کے دوسرے ساحل پر بھی روس کے اشتراکی عقائد کا کچھ پرتو دکھائی دیتا ہے۔ کیونکہ چین کے نوجوان مصنفین کے جو ترجمے یورپین زبانوں میں شائع ہوئے ہیں۔ ان میں یہ میلان خاصہ نمایاں ہے۔

انگلستان، فرانس اور جرمنی کے علاوہ یورپ کے اور ملکوں میں بھی ادبیات کو سیاسی، مذہبی اور معاشرتی معاملات سے کافی دلچسپی معلوم ہوتی ہے۔ اور جس طرح تہذیب و تمدن کے ظاہری کوائف کے اعتبار سے مغربی دنیا کی سب اقوام ایک دوسرے سے مشابہ معلوم ہوتی ہیں اسی طرح ان کے خیالات میں بھی ایک حد تک یگانگت پائی جاتی ہے۔ اُن ملکوں کے وہ مصنفین جو گذشتہ بیس پچیس سال میں ادبی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ مثلاً ناروے کی مشہور ناول نویس Sigrid Undset یا اٹلی کا ڈرامہ نویس d'Annunzio ۱۹۳۶ء میں بھی بیکار نہیں ہیں۔ لیکن ان کی کوئی تصنیف بھی جو اس سن میں شائع ہوئی ہے۔ ان کے اسلوبِ تحریر میں کسی نئے پیرائے کا اضافہ یا اُن کی شہرت میں کوئی خاص اضافہ نہیں کرتی۔

مغربی ادبیات کا ایک رجحان جو ہمارے لئے خاص طور پر دلچسپ ہے۔ مشرق اور مشرقی خیالات کا ذوق ہے۔ جو اب کئی سمت میں دکھائی دیتا ہے۔ ۱۹۳۵ء میں کرنل لارنس کی Seven Pillars of Wisdom نے جو ہل چل ادبی دُنیا میں پیدا کر دی تھی۔ وہ اس ذوق کا بیّن ثبوت ہے اور اس وقت سے لے کر آج تک اس کتاب کی مانگ برابر بڑھ رہی ہے۔ ۱۹۳۶ء میں بھی جن سفرناموں نے زیادہ مقبولیت حاصل کی اُن میں مشرقی سیاحت کی کتابوں کی تعداد غالب معلوم ہوتی ہے۔ یورپ میں مشرقیت کا شوق کوئی نئی چیز نہیں۔ لیکن پہلے یہ شوق صرف خاص لوگوں تک محدود تھا۔ اب عوام کو بھی اس سے دلبستگی ہوتی جاتی ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ یورپ کے بعض ایسے لوگ جن کو جدید ترین خیال کا ترجمان خیال کیا جا سکتا ہے۔ مشرقی نظریات خصوصاً مشرقی روحانیات کو مہذب اِنسانوں کی دماغی تربیت کے لئے مفید خیال کرنے لگے ہیں۔ Mr. Bernard Shaw اور Mr. Aldous Huxley جیسے ہر دلعزیز لکھنے والے بھی اب اپنی تصنیف کو مشرقی سامانِ آرائش سے مزیّن کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے اور بعض کم عام پسند مصنفین تو مشرقی خیالات کے بہت ہی گرویدہ معلوم ہوتے ہیں۔ مشرقیت کے ذکر نے مجھے Rudyard Kipling کی وفات کی یاد دلا دی۔ جو ۱۹۳۶ء کے شروع دنوں میں واقع ہوئی تھی۔ گو Kipling چند سال سے تصنیف و تالیف کو عمداً ترک کر چکے تھے تو بھی انگلستان کے ادبی حلقوں اور انگلستان کے باشندوں کے دل میں اُن کی خاص جگہ تھی۔ ان کا اکثر ادبی سرمایہ ہندوستان اور ہندوستانیوں کے تجربہ سے فراہم کیا گیا تھا۔ اور اگرچہ اس ملک کی تعلیم یافتہ جماعت ان کی کہانیوں اور نظموں کو نسلی تعصب کی وجہ سے ناپسند کرتی تھی۔ لیکن ہم کو یہ بات نہ بھولنی چاہیئے کہ ایک مدت تک انگلستان کے طبقۂ عوام کو ہندوستانیوں کا جو کچھ بھی علم تھا۔ وہ ان ہی کہانیوں اور نظموں کی بدولت تھا۔

"ساقی"

(پروفیسر مرزا محمد سعید صاحب ایم اے، آئی ای ایس)

رُباعی

دل کی کسی جانب رجوع ہوتا ہوں میں
سنتا ہے جو، سرِ خضوع ہوتا ہوں میں
جب مہرِ مبین غروب ہو جاتا ہے
ہمسایۂ کیفِ طلوع ہوتا ہوں میں

(جوشؔ)

"کلیم"





انعامی مقابلہ

اسماعیل کالج میں ۱۸ فروری کو جو یوم ولی منایا گیا تھا اس کو عملی و علمی صورت سے مستقل و مفید بنانے کے لئے مجمع الادب نے یہ طے کیا ہے کہ ملک کے ادیبوں، انشا پردازوں اور مضمون نگاروں سے درخواست کی جائے کہ وہ مندرجہ ذیل موضوع پر اظہار خیال فرمائیں جو مضامین سب سے اچھے سمجھے جائیں گے ان کے لئے معقول انعامات پیش کئے جائیں گے۔ انشا پردازوں کے علاوہ تمام طلبہ سے بھی درخواست کی جاتی ہے کہ وہ اس موضوع پر لکھیں طلبہ کے مضامین میں سے جو سب سے اچھے دو مضامین ہیں اول کو ایک سونے کا تمغہ اور دوسرے کو چاندی کا تمغہ دیا جائیگا موصولہ مضامین میں سے چند اچھے مضامین ایک کتاب کی صورت میں شائع کئے جائیں گے۔ مضامین مندرجہ ذیل پتہ پر یکم جولائی ۱۹۴۳ء تک آ جانا چاہئے۔ طلبہ کو اپنے کالج یا سکول کے اعلیٰ افسر کے ذریعے روانہ کرنا چاہئے۔ کوئی ایسا مضمون جو پڑھا جا چکا ہے روانہ نہ کیا جائے۔

(۱) اردو ادب و شاعری میں ولی کا درجہ

(۲) ولی سے پہلے گجرات، دکن اور شمالی ہند میں اردو کا درجہ

(۳) ولی کی لسانی، ادبی، سماجی اور شعری خدمات

(۴) موجودہ اردو ادبیات پر ولی کا اثر

مجمع الادب۔ اسماعیل کالج، جوگیشوری — حنیف اشرف ندوی

۱۰ / فروری ۱۹۴۳ء — صدر شعبہ اردو

سنگیت فلم کمپنی کا نادر شاہکار

آخری منزل

شائقین دنیائے سینما کے لئے یہ خبر بے انتہا باعث مسرت ہوگی کہ بھولانشکار کی شہرہ آفاق ایکٹرس مس حتاب اس فلم میں کام کریگی اور مسٹر شانتی دیوی اور مسٹر ماروتی راؤ پہلوان بھی اس میں کام کریں گے اور اپنے کمالات پیش کرینگے۔

کہانی کا پلاٹ بے حد تعجب خیز اور ڈائیلاگ دلکش اور موثر ہیں۔

سنگیت فلم کمپنی کا یہ نادر شاہکار دنیائے خلاق کے لئے بہترین اصلاحی سپرٹ پیش کرے گا اور سوسائٹی کی فلاح و بہبود کے لئے تعمیری خدمت کرے گا۔

حسب معمول حدن بائی صاحبہ سٹوڈیو ڈائرکشن کی نگرانی کے علاوہ، میوزک ڈائرکشن بھی کرینگی۔ اس نادر شاہکار میں ہیرو کا کام مسٹر لے حسین کریں گے جو دنیائے فلم میں بے مثل شہرت کے مالک ہیں۔ زمزمہ کوتاہ فلم ہذا ہندوستانی صنعت فلم سازی میں ایک بیش بہا اضافہ ہونے کے علاوہ سوسائٹی کے سامنے ہندوستانی معاشرتی زندگی کا ایک خاص پہلو پیش کرے گی جس میں جذبات و حالات کی کشمکش [illegible]

ڈاک کے ڈاکو } ہمارے ہیں خریداروں کی طرف سے بیسیوں شکایتیں موصول ہوتی ہیں کہ انہیں پرچہ نہیں ملا اور بیسیوں خریدار ایسے ہیں کہ حالانکہ پرچہ چھپا ہوا اور کسی خریدار کو بھیجنا پالکل بیں اور تجارتی خودکشی سے کم نہیں۔ دفتر ایسا نہیں کرتا۔ ادبی دنیا ہر ماہ کی ۲ تاریخ نہیں کرتے لیکن یہ فرض کر لیتے ہیں کہ پرچہ دفتر نے نہیں بھیجا تو سمجھ لیجئے کہ کسی ڈاک کے ڈاکو کی نذر ہوا۔ ایسی شکایتی کارڈ اپنے حلقہ کے سپرنٹنڈنٹ پوسٹ آفس کو لکھئے اور ایک ہمیں لکھئے تاکہ آپ کو پرچہ دوبارہ روانہ ہو جاتا ہے۔ اگر مہینہ کی تاریخ تک آپ کو پرچہ نہ ملے محکمہ ڈاک کے دروازہ پر پیکٹ وصول نہ کیجئے۔ مینیجر

فہرست مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہ اپریل ۱۹۳۷ء

جلد ۱۵ تصاویر:- (۱) الہام موسیقی (۲) رخصت نمبر ۶

نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	صفحہ
۱	آئینۂ عالم	ادارہ	۴۲۲
	افسانے		
۲	باپ کا گناہ	جناب منظور صاحب	۴۳۳
۳	کرشمۂ الفت	جناب سید حسن صاحب ایم اے	۴۴۲
۴	پریمیا	جناب آسی رام نگری	۴۶۰
۵	کیا وہ سب خواب بن جائینگے	محترمہ سلیمہ سلطانی بیگم صاحبہ لکھنوی	۴۶۷
	علمی وادبی مضامین		
۶	نظریۂ مادیت کی فلسفیانہ اہمیت	چودھری اکبر علی صاحب بی اے عثمانیہ	۴۲۹
۷	وہ رات	الیف ایم ساقی صاحب	۴۴۰
۸	وکٹر ہیوگو کی محبت	حضرت خلیل	۴۵۰
۹	عشق اور خودداری	سید محمد یوسف صاحب مولوی عالم بھوپال	۴۶۴
۱۰	ایک راہبہ کے محبت نامے	جناب عظیم قریشی	۴۷۳
	حصۂ نظم		
۱۱	غزل	جناب احمد ندیم صاحب قاسمی بی اے	
۱۲	امید موہوم	جناب سعید احمد صاحب اعجاز	۴۳۲
۱۳	جام صہبائی	جناب خواجہ عبدالسمیع صاحب پال اثر صہبائی	۴۴۱
۱۴	طلسم گفتار	جناب عبدالحمید صاحب عدم بی اے	۴۴۲
۱۵	قطعات	حضرت ضیا فتح آبادی ایم اے	۴۴۸
۱۶	بزم فطرت	حضرت تاجور سامری	۴۴۹
۱۷	رباعیات	جناب سید محمد عسکری طباطبائی	۴۵۷
۱۸	گلشنے جا	جناب روشن نکودری	۴۵۸
۱۹	غزل	جناب نجم ندوی بی اے	۴۵۹
۲۰	آمد صبح	"مہاراجی"	۴۶۳
۲۱	غزل	حضرت سیفی نوگانوی	۴۶۶
۲۲	دعوت عمل	حضرت ابرار احمد صاحب فاروقی حرمی	۴۷۱
۲۳	رباعیات	حضرت حرماں خیرآبادی	۴۷۲
۲۴	اعتماد	حضرت عدم	۴۷۶
۲۵	دنیائے ادب		۴۷۷
۲۶	نقد و نظر	ادارہ	۴۸۴

سالانہ چندہ مع محصول ڈاک اور وی پی پانچ روپے (صہ) ممالک غیر سے دس (۱۰) شلنگ

(گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام صلاح الدین احمد پرنٹر و پبلشر چھپکر دفتر ادبی دنیا کمرشل بلڈنگس مال روڈ لاہور سے شائع ہوا۔)

آئینۂ عالم

سوٹ کیس میں پوری لائبریری

ایک وکیل اپنی پوری لائبریری سوٹ کیس میں بند کرکے حاضر عدالت ہو سکتا ہے۔ قصبے کا چھوٹے سے چھوٹا اسکول برٹش میوزیم کی تمام کتابیں خرید سکتا ہے۔ ابھی سے اچھی کتاب دو ڈھائی آنے میں فروخت کی جا سکتی ہے۔

لاسوئیر مشین گوئی کر رہے ہیں کہ مائکرو فوٹوگرافی کے ذریعے سے یہ انقلاب عنقریب آنے والا ہے۔ ۱۹۶۳ء میں ہی یہ عمل تجارتی حیثیت اختیار کرے گا اور آیندہ دو ہزار صفحات کی کتاب کا حجم ایک صفحہ کے برابر ہو جائے گا۔ ابھی سے نیو یارک پبلک لائبریری، برٹش میوزیم اور لاس انجلیز کی ہنٹنگڈن لائبریری نے اس کا استعمال شروع کر دیا ہے۔

واشنگٹن کا محکمۂ مردم شماری ۱۹۶۰ء کی مردم شماری کے ۵۰۰۰۰۰۰۰ ناموں کی فہرست کو ایک چھوٹی سی جلد میں منتقل کر رہا ہے۔ کتاب کا ورق کھول کر ایک متحرک گاڑی پر رکھ دیا جاتا ہے جو افقی پر رکھے ہوئے کیمرے کے نیچے ایک لائن پر چلتی ہے۔ کیمرے میں سے ایک لیمپ کتاب پر روشنی کی عمودی کرن ڈالتا ہے۔ ایک رولی کیمرے کو صحیح بلندی پر لاتی ہے۔ دو مسودات کی دو بتیاں روشن کرتی ہے اور ایک ہتھے کو دباتی ہے۔ ایک "کرک" کی آواز آتی ہے اور کیمرا دوسرے صفحے کی طرف حرکت کر جاتا ہے۔ اسی طرح آگے اور پیچھے کیمرہ حرکت کرتا رہتا ہے تاآنکہ پوری کتاب کی تصاویر اتر آتی ہیں۔

بڑی سے بڑی لغات کے دگنے حجم کی کتاب جس کا وزن ۱۲½ سیر ہے اور جس میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۷ نام ہیں، چار انچ قطر کی فلم میں سما جاتی ہے اس طرح مردم شماری کا پورا ریکارڈ چھوٹی سی الماری میں سما جائے گا۔ پرانے اخبار اور اس قسم کے دوسرے ریکارڈ مائکرو فوٹوگرافی کے ذریعے سے محفوظ کئے جا رہے ہیں۔ نیو یارک کی پبلک لائبریری میں لوگ نیو یارک "ہیرلڈ ٹریبیون" کی پوری اشاعت چند فٹ لمبی فلم پر سے پڑھ سکتے ہیں۔ یہ فلم ایک مشین میں داخل کی جاتی ہے جس کی شکل متحرک تصاویر کے کیمرے سے مشابہ ہوتی ہے اس کا عکس کیمرے کے پیچھے ایک پردہ پر ظاہر ہو جاتا ہے جو اصلی سائز سے بڑا اور اتنا ہی صاف دکھائی دیتا ہے۔

یہ مشین اتنی گراں قیمت نہیں کہ چھوٹے چھوٹے کتب خانے اسے خرید نہ سکیں۔ واشنگٹن کی "سائنس سروس" ایک سنٹ فی صفحہ کے حساب سے عکس اتار دیتی ہے۔ اگر یہ اجرت زیادہ سمجھی جائے تو تصویر اتارنے اور پڑھنے کی دونوں مشینیں ۵۰ ڈالر میں خریدی جا سکتی ہیں۔

بڑے بڑے اداروں کے لئے سب سے قیمتی آلہ پانچ ہزار ڈالر کا ہے۔ فلم پڑھنے کے لئے خوردبینی آلہ ابھی سے بازار میں فروخت ہو رہا ہے۔ ۲½ ڈالر میں فرانس کا بنا ہوا آلہ دستیاب ہو جاتا ہے اور امریکہ کی ایک کمپنی بڑھیا قسم کا آلہ ۵ ڈالر میں فروخت کر رہی ہے۔ ایسٹ مین کوڈک کمپنی کا آلہ جو اس وقت نیو یارک لائبریری میں زیر استعمال ہے ۱۸۵ ڈالر کا ہے اور یہ اپنی قسم کا بہترین آلہ متصور ہوتا ہے جو پتلی سے پتلی فلم کے الفاظ کو نہایت صفائی سے واضح کرتا ہے۔ ان آلوں میں پردے پہلے سے لگے ہوئے ہیں لیکن کم قیمت آلوں میں پردے نہیں ہوتے بلکہ ان میں خوردبین کی طرح جھانکنا پڑتا ہے۔

ہیروں کے اجارہ دار

لندن کے ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے دو شخص دنیا کی سب سے بڑی تجارت یعنی روئے زمین کے ہیروں کے واحد اجارہ دار ہیں۔

ڈائمنڈ کارپوریشن کی دلچسپ داستان اور اس کے حصوں کی روز افزوں مانگ کی وجہ ذیل میں درج کی جاتی ہے۔ اخبار کے ایک نمایندہ کو بتایا گیا ہے کہ ہیروں کی مانگ دن بدن کیوں بڑھ رہی ہے اور "صنعتی بادشاہ" کس طرح دولت کے انبار لگا رہے ہیں۔ یہی وہ دو شخص ہیں جو ۱۲۰۰۰۰۰۰ روپے کے ہیرے بازار میں بیچ کر دنیا کو ششدر کر رہے ہیں۔

سر ارنسٹ آپن ہیمر گول چہرے والے خاموش طبیعت انسان جنوبی

افریقہ کے رہنے والے ہیں اور مشہور زمانہ ہیرے "جانکر" کے سابق مالک ہیں۔ آپ لائبریری کی کتابیں مسلسل پڑھتے رہتے ہیں۔

مسٹر جیک برنیٹو جوئل، ۷۴ سالہ کروڑ پتی اور گھوڑ دوڑ کے گھوڑوں کے مالک ہیں۔ آپ جنوبی افریقہ کے آباد کار بارنے برنیٹو کے بھانجے ہیں۔

یہ دو اصحاب اور ان کے مددگار دنیا کے ہیروں کی قیمتیں مقرر کرتے ہیں اور روئے زمین کے ہیروں کی پیداوار میں ۹۵ فی صدی کے مالک ہیں۔

انہیں کے اعلیٰ انتظام کی وجہ سے بڑے بڑے انقلاب اور جنگ و خونریزی کے زمانے میں بھی ہیرا روپے کی بہترین ضمانت سمجھا جاتا ہے

سلطنتوں کے تختے الٹ جائیں۔ سکوں کی قیمتیں بدل جائیں لیکن ہیرے کی قدر و قیمت اپنی جگہ پر قائم رہتی ہے۔

اس کارپوریشن کو ہیرے کی برآمد پر بھی قابو حاصل ہے۔ چنانچہ مانگ سے زیادہ ہیرا بازار میں نہیں لایا جاتا اور یہ امر محال ہے کہ کسی وقت ہیرے کی بہتات اس کا نرخ گرا دے۔

اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس وقت روئے زمین کے مجموعی ہیروں کی قیمت قریباً ۴ کھرب پونڈ ہے اور تمام کے تمام ۱۲ مربع فٹ کے ایک ڈبے میں بند کئے جا سکتے ہیں۔ دنیا میں ہیروں کے سب سے بڑے ذخیرے ہندوستانی ریاستوں میں ہیں۔

کارپوریشن کے بڑے دفتر میں کانوں سے آئے ہوئے ٹکڑے اپنی قدر و قیمت کے لحاظ سے مختلف درجوں میں تقسیم کئے جاتے ہیں۔ دنیا کے تمام حصوں سے ہیروں کے دلال جو ہیروں کو تراشنے اور آب دینے والے کارخانوں کے نمائندے ہوتے ہیں خصوصاً انٹورپ اور ایمسٹرڈم کے کارخانوں کے، کارپوریشن کے دفتر میں جمع ہو کر ہیروں کو "دیکھتے" ہیں۔

قیمتوں کے متعلق کوئی دلیل یا عذر نہیں سنا جاتا کیونکہ ہر ٹکڑے کی قیمت پہلے سے مقرر ہوتی ہے۔ دلال "خریدیں یا چھوڑ دیں"۔

وہ ہیرے جو کیمیائی طور پر خالص کاربن پر مشتمل ہوتے ہیں عورتوں کے زیورات میں استعمال ہوتے ہیں۔ آج کل تجارتی فروغ اور شہنشاہ انگلستان کی تاجپوشی کی وجہ سے ہیروں کی مانگ بڑھ گئی ہے۔

گزشتہ چند سالوں سے صنعتی ضروریات کی وجہ سے ہیرے کی مانگ قریباً دگنی ہو گئی ہے۔ بے آب اور بدرنگ ہیروں کے سب سے بڑے خریدار صنعتی کارخانے ہیں۔ ہیرا چونکہ دنیا کی سخت ترین چیز ہے اس لئے شیشے اور دھات کے کاٹنے اور سخت چیزوں پر کھدائی کے علاوہ تار کھینچنے، بجلی کے لیمپ کی بتی بنانے، سنگ خارا میں سوراخ کرنے اور انجینئری کے ایسے ہی ہزاروں کاموں میں استعمال کئے جاتے ہیں۔

جاپانی گیشاؤں کی سٹرائک

کچھ عرصے سے دنیا کے ہر حصے میں اور کاروبار کے ہر شعبے میں سٹرائک کا دور دورہ ہو رہا ہے لیکن جاپان کی ۳۰۰ گیشا لڑکیوں نے، پہاڑ کی چوٹی پر بنے ہوئے ایک مندر میں پناہ گزیں ہو کر سٹرائک کرنے والوں میں ایک نئے طبقے کا اضافہ کیا ہے۔

یہ لڑکیاں اپنے مرد دوستوں کو خود منتخب کرنے کا حق طلب کر رہی ہیں اور اپنے مالکوں کے احکام کے ماتحت ہر کہ و مہ کو باریاب کرنے کے خلاف احتجاج کر رہی ہیں۔ اس کے علاوہ گیشا یونین کو تسلیم کرنے کا مطالبہ کرتی ہے۔

بیکار امیروں کے "عیش مقام" یعنی اوساکا سے نکل کر یہ لڑکیاں فرازکوہ پر گیا کوزو کے مندر میں پناہ گزیں ہو گئی ہیں۔ مندر کے پروہتوں نے ان کی حمایت پر آمادگی ظاہر کی ہے۔ لڑکیوں کو کھانا، شراب، سٹرائک کی تنخواہ اور سابق عشاق یہاں بھی مہیا ہیں اور وہ اپنا وقت اپنے مستقل خریداروں کو محبت آمیز خطوط لکھنے میں صرف کرتی ہیں۔

ہر روز علی الصباح گیشائیں نزدیک کے جنگلوں میں جا کر کنوؤں کے یخ بستہ پانی میں برہنہ ہو کر اپنے بدن کو پاک کرنے کے لئے نہاتی ہیں۔

فکوکومیا موٹو نامی ایک حسین ترین گیشا جس کی عمر ۲۲ سال تھی ننگی گیشاؤں کو مہاتما بدھ کی پرستش کرتے ہوئے دیکھ کر اتنی متاثر ہوئی کہ اس نے چپکے سے شہر جا کر زہر کھا لیا۔ اس کی لاش پولیس کو ایک قہوہ خانے میں سے ملی ہے۔

تمام گیشاؤں نے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ ان کی بہن کا جنازہ جو جاپانی تاریخ میں عورتوں کی سب سے پہلی سٹرائک کی اولیں ہیروئن ہے، قومی اعزاز کے ساتھ اٹھایا ہے۔

گیشا کا جنازہ بے وزا دھوم سے نکلے

بے شمار لوگ گیشا لیڈر کی تقریر سننے کے لئے مندر میں آئے تقریر کا ملخص یہ تھا کہ "گیشائیں سستے جاپانی کھلونے نہیں ہیں"۔

خیال کیا جاتا ہے کہ یہ سٹرائیک جاپان کے طول و عرض میں پھیل جائے گی۔

بیماریوں کے علاج اور جڑی بوٹیاں

محمد عالم قندھاری کو آسٹریلیا سے باہر بہت کم لوگ جانتے ہیں لیکن یہی وہ شخص ہے جو نہایت کامیابی کے ساتھ طب جدید اور جراحی کو ہر جگہ شکست دے رہا ہے۔ یہ شخص جنوبی آسٹریلیا کے باشندوں کی آنکھ کا تارا ہے ۵۴ سال سے متواتر وہ ہر قوم، فرقہ اور مذہب کے بے شمار مرد، عورت اور بچوں کا جڑی بوٹیوں کے ذریعے سے علاج کر رہا ہے۔ بنی نوع انسان کے دکھوں کو دور کرنا اس کا نصب العین ہے۔ ہر روز وہ چھ سو مریضوں کو دیکھا کرتا ہے جن میں دنیا کی تمام بیماریوں کے مریض ہوتے ہیں۔

پہلے پہل آسٹریلیا کے اخبارات نے اسے کوئی وقعت نہ دی لیکن اس کے بڑھتے ہوئے طالعوں نے طبیبوں کو بیخ پا کر دیا اور اسے بدنام کرنے کے لیے ہر قسم کے ذرائع استعمال ہونے لگے لیکن وہ اپنے مریضوں کے دلوں کو مسخر کر چکا تھا کیونکہ ان میں سے ایک بھی ناکام و نامراد واپس نہ جاتا تھا۔ اس کے علاج کے نتائج میں "افاقہ" اور "عارضی صحت" کے الفاظ کبھی استعمال نہیں ہوتے۔ اپریشن یا ناخوشگوار ادویات کا کبھی نام تک نہیں سنا چند منٹ کی تشخیص، چند بوٹیاں بس یہ علاج ہے اور اس کے نتیجے میں شفائے کلی

اس کے مریضوں کی فہرست میں بڑے بڑے اُمرا، آسٹریلیا کے سیاستدان اور حاکم موجود ہیں جن میں سے ایک ایڈلیڈ کا پولیس کمشنر بھی ہے

طبقہ اطبا کی شدید مخالفت کی وجہ سے کچھ عرصے کے بعد وہ آزردہ ہوگیا اور اپنے وطن قندھار کو واپس چلا گیا۔ آسٹریلیا کے باشندوں نے ایک عظیم الشان عرضداشت جس پر انیس ہزار آدمیوں کے دستخط تھے اسے واپس بلانے کے لئے قندھار بھیجی۔ اس عرضداشت پر آسٹریلیا کے گورنر کی بیوی اور کمشنر پولیس کے دستخط بھی ثبت تھے۔ اس عرضداشت سے وہ بے حد متاثر ہوا اور اپنے گوشۂ عافیت سے نکل کر ایک دفعہ پھر آسٹریلیا میں وارد ہوا۔

لوگ کہتے ہیں یہ انسان ہے یا مجسم معجزہ۔ وہ طب جدید اور جراحی کو علی الاعلان دعوت مقابلہ دیتا ہے۔ اس کے مطب میں مرد اور عورتوں کا اتنا ہجوم رہتا ہے کہ سارے سٹریٹ کے ماہر اطبا مجموعی طور پر بھی اتنے مریضوں کا خواب نہیں دیکھ سکتے۔ اگر اس کی دواؤں کا اثر فوری، یقینی اور مستقل نہ ہوتا تو شاید اب تک وہ کئی مرتبہ عدالت میں رگید دیا گیا ہوتا۔

تھوڑے ہی دن ہوئے توہین عدالت کے جرم میں ایڈلیڈ کی عدالت میں اس پر مقدمہ چلایا گیا۔ لیکن جج نے اسے ۲۶ پونڈ خرچہ دلائے جانے کا فیصلہ کیا۔ اس نے اپنے وکیل کو عدالت سے روپیہ وصول کرنے سے روک دیا، یہاں تک کہ وکیل کو بل میں سے بھی وہ رقم وضع نہ کرنے دی اور پورا بل ادا کر کے چلا آیا۔

وہ آسٹریلیا کے ایک غریب ترین علاقہ میں رہتا ہے اور اس وقت تک اٹھارہ ہزار پونڈ خیرات کر چکا ہے۔

وہ اپنی ادویات کی قیمت بھی وصول نہیں کرتا۔ اس کے میز پر ایک برتن پڑا رہتا ہے جس میں مریض اظہار تشکر کے طور پر چند سکے ڈال جاتے ہیں اور وہ انہیں جمع کر کے غربا میں تقسیم کر دیتا ہے۔

محمد عالم اب تک کئی پیشے اختیار کر چکا ہے۔ مغربی آسٹریلیا میں سونے کی کانوں پر وہ خاکچہ لگاتا تھا۔ وسطی آسٹریلیا میں ساربانی کا کام کرتا رہا ہے۔ کوئینس لینڈ میں قلی اور چوکیدار رہا ہے۔ ملاحی اور کان کنی کا کام بھی کر چکا ہے۔

وہ قندھار کے ایک معزز خاندان کا فرد ہے اور گزارے کے لئے اس کے پاس کافی سہارا ہے۔ اس وقت اس کی عمر ۷۷ سال ہے لیکن بمشکل ۵۰ سال کا معلوم ہوتا ہے۔ وہ دن میں بیس گھنٹے کام کرتا ہے، اسلام کا سچا پیرو ہے اور کسی طرح بھی امیر بننے پر رضامند نہیں ہوتا۔

جوانی کے دنوں میں بھی وہ بڑا مخیر تھا اور جڑی بوٹیوں کے علاج میں بہت دلچسپی لیتا تھا۔ ہندوستان میں اس وقت بھی بہت سے لوگ بوٹیاں جمع کرتے ہیں لیکن نیم حکیموں نے اخلاص سے کام کرنے والوں کو بھی بدنام کر رکھا ہے

افغانستان میں ہندوستان کی طرح یہ علم سینہ بہ سینہ نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتا چلا آتا ہے محمد عالم کا ایمان ہے کہ خدا نے ہر مرض کے لئے بوٹیوں میں تاثیریں ودیعت کر رکھی ہیں اور جراثیمی یا ادویاتی ٹیکوں، دواؤں اور عمل جراحی کی ضرورت ہی نہیں۔ اس نظریے کو ثابت کرنے کے لئے انہوں نے طب جدید کو دعوت عام دے رکھی لیکن ابھی تک کسی شخص نے اس دعوت کو قبول نہیں کیا۔

اُن کو یقین ہے اور انہوں نے لاکھوں مریضوں کے علاج میں

پیدا ہو جاتا کر دیا ہے کہ بوٹیوں کا اثر براہ راست بیماری پر حملہ کرتا ہے اور اسے جڑ سے اکھیڑ کر ہمیشہ کے لئے تباہ کر دیتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب نیولے کو سانپ ڈستا ہے تو وہ بھی بوٹی کی تلاش میں دوڑتا ہے تاکہ اس تریاق کے ذریعے سے سانپ کے زہر کو باطل کرے۔ سائنسدان بھی اس بوٹی کی تلاش میں رہے ہیں لیکن ابھی تک اسے حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔

عالم کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ مریض کو بیماری کے متعلق سوالات نہیں کرتے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تیز سی نگاہیں جسم کو چیر کر بیماری کو تلاش کر لیتی ہیں۔

آسٹریلیا سے رخصت ہوتے وقت آپ نے فرمایا:۔

"لوگ اکثر مجھے ساربان کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ہمیشہ نئی سے نئی سرزمین میں "خدا کی ان نعمتوں" کی تلاش میں پھرتا رہا ہوں۔ میں نے دنیا کے ہر حصے سے بوٹیاں جمع کی ہیں اور ان کی شفا بخش تاثیر کا ثبوت یہ ہے کہ میرے زیر علاج آج دس ہزار مریض ہیں۔

"میری محنت رائگاں نہیں گئی کیونکہ اس وقت میرے پاس ہزار ہا سرٹیفکیٹ موجود ہیں۔ قدرت نے ہمارے دکھوں کے لئے خود علاج تجویز کیا ہے بوٹیاں خود بخود پیدا ہوتی ہیں اور ہر سال خود بخود سوکھ کر ہمارے استعمال کے لئے تیار ہو جاتی ہیں۔ اس جراثیمی مواد کی طرح جو بے زبان جانوروں پر ظلم ڈھا کر حاصل کیا جاتا ہے اور جس نے بنی نوع انسان کے دکھوں کو مٹانے میں ابھی تک کوئی کامیابی نہیں دکھائی یہ جڑی بوٹیاں ادویات ایسے کسی ظلم کا نتیجہ نہیں ہیں۔

"زندہ جانوروں کو چیر پھاڑ کرنے والا امر وہ ہے۔ وہ سفر ذریعہ جس کے ذریعے لوگوں کو یقین دلایا جاتا ہے کہ جراثیمی مواد یا عمل جراحی فوری اثر دکھلاتے ہیں۔ بالکل غلط ہے۔ ان کا نتیجہ پہلے سے زیادہ سخت بیماری کی صورت میں نکلتا ہے۔

"جسم انسانی میں ان ادویات اور زہروں کا اثر یقیناً فوری ہوتا ہے۔ اطبا کی جیبیں پر کرنے میں کافی مدد دیتا ہے لیکن بنی نوع انسان کے دکھ اور درد میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔

"جراثیمی مواد ایک بیکار چیز ہے۔ صرف بیکار ہی نہیں بلکہ نقصان دہ ہے۔ میں کتابوں کو سائنسدانوں کے دماغ جو اسے ترقی دینے پر غور کر رہے ہیں غلط راستہ پر گامزن ہیں۔ طب کے اس شعبے کو صفحۂ گیتی سے اس طرح مٹا دینا چاہئے جس طرح آج سے سو سال پہلے کے بیماروں کو بیہودہ گندہ دواؤں اور فضولیات کے نام مٹا دئے گئے تھے۔

"مختلف افراد اور ادارے اندھا دھند اور دیوانہ وار انعام و اکرام کی خواہش میں ہزاروں اور لاکھوں بے زبان جانوروں پر شب و روز بے پناہ ظلم ڈھا رہے ہیں۔ کیا اس کے نتیجے میں بنی نوع انسان کا کچھ بھلا ہوا ہے؟

اور اگر کچھ نتائج پیدا ہوئے ہیں تو میرے خیال میں وہ ایک غریب خرگوش کی جان کا بدل بھی نہیں ہیں۔ برلن، پیرس، بوڈاپسٹ اور دیانا میں جراثیمی علاج نے مرض کی شدت میں کوئی فائدہ نہیں دیا۔ اس لئے ہوشیار ہو جاؤ اور ان افعال شنیعہ سے احتیاط برتو، اپنے اجسام کی حفاظت کرو اور صحت کے قدرتی طریقے اختیار کرو جو شافی مطلق نے ہمارے لئے تجویز کئے ہیں اور یقیناً وہ انسانی طبیبوں سے زیادہ حاذق ہے۔"

چند سال ہوئے آپ دوبارہ قندھار چلے گئے لیکن اس دفعہ پچاس ہزار باشندگان آسٹریلیا نے عرضداشت بھیج کر آپ کو واپس بلا لیا۔

محمد عالم کے پاس اس وقت تیس ہزار سے زیادہ سندات ہیں اور آپ ان میں سے کسی ایک کو غلط ثابت کرنے پر پانچ سو پونڈ خیرات کے لئے دینے کا اعلان کرتے ہیں۔ ایسے بے شمار واقعات ہیں جہاں ڈاکٹروں اور جراحوں نے مریض کو لا علاج کر دیا لیکن آپ کے علاج سے مریض صحت یاب ہو گیا۔

محمد عالم شہرت اور دولت کے بھوکے نہیں ہیں۔ اُن کے گزارہ کے لئے جدی جائیداد کافی ہے۔ وہ صرف غریبوں کے دکھ دور کرنا چاہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کی گاڑھے پسینے کی کمائی نام نہاد دواؤں کے عوض لٹی نہ جائے۔

ایڈلیڈ میں آپ شہر کے غریب ترین حلقہ میں رہتے تھے اور یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ سوائے جمعہ کے جس روز آپ چھٹی کرتے تھے ہر روز آپ کے پاس پچھتر سو سے زائد مریض آتے تھے۔ آپ کے دروازے پر آپ کے نام کا بورڈ تک نہیں تھا اور یہ مشہور تھا کہ آپ سے ملنے کے لئے لوگوں کے انبوہ کے پیچھے پیچھے چلے جاؤ۔"

آپ ادویات خود بناتے ہیں جس کا اثر فوری ہوتا ہے یہاں تک کہ سخت سے سخت بیماری چند ہفتوں کے استعمال سے رفع ہو جاتی ہے۔

آپ کا مقصد زندگی "خیر کثیر اور تعداد کثیر" ہے۔
آج کل آپ مکہ جا رہے ہیں

دنیا کے امیر اور غریب

حال ہی میں امریکی سینیٹ میں ایک اعلان ہوا ہے جس کے ضمن میں کئی ہزار ایسے امریکنوں کے نام معلوم ہوئے ہیں جنہوں نے ۱۵۰۰۰ ڈالر سے زیادہ بقوم تنخواہ، بونس یا کمیشن کے طور پر ۱۹۳۵ء میں کمائی ہیں۔

سب سے زیادہ آمدنی رکھنے والے پہلے دس نام یہ ہیں:۔

۱ ولیم رینڈلف ہرسٹ، ناشر	۵۰۰۰۰۰ ڈالر
مے ویسٹ، اداکارۂ فلم	۴۸۰۸۳۳ "
۳ سی ڈبلیو گنٹزبرگ، لوہے کا بیوپاری	۳۹۸۸۰۸ "
۴ الفریڈ پی سلون، جنرل موٹرز کا صدر۔	۳۷۴۵۰۵ "
۵ مارلین ڈٹریش، اداکارۂ فلم	۳۶۹۰۰۰ "
۶ ونفیلڈ شیہن، فاکس فلم کا صدر۔	۳۴۴۲۲۰ "
۷ ولیم نڈسن، جنرل موٹرز کا نائب صدر۔	۳۲۵۸۶۹ "
۸ بنگ کراسبی، گویا	۳۱۸۹۰۷ "
۹ بی۔ ڈی ملر، وولورتھ کمپنی کا صدر	۳۰۹۸۰۸ "
۱۰ تھامس جے واٹسن صدر انٹرنیشنل بزنس مشین کارپوریشن	۲۹۶۵۲۸ "

انگلستان میں ۱۰۰۰ پونڈ سالانہ کمانے والوں کی تعداد دن بدن بڑھ رہی ہے۔ اس وقت ۳۰۹۰۰۰ آدمی ایسے ہیں جو ۱۰۰۰ پونڈ سالانہ سے زیادہ کما رہے ہیں۔ ایک لاکھ اور نوے ہزار آدمی ۱۰۰۰ سے ۲۰۰۰ پونڈ تک سالانہ کماتے ہیں۔ ایک لاکھ کی آمدنی ۲۰۰۰ سے ۱۰۰۰۰ پونڈ تک ہے۔ دس ہزار کی آمدنی ۱۰۰۰۰ پونڈ سے زیادہ ہے۔

ان میں سے کئی اصحاب اب Super Tax کی زد میں آنے والے ہیں کیونکہ نئے بجٹ کی رو سے ۲۰۰۰ کی بجائے ۱۵۰۰ کی آمدنی پر Super Tax عائد ہوا کرے گا۔

ایک ہزار پونڈ سالانہ سے زیادہ آمدنی رکھنے والی عورتوں کی تعداد بھی بڑھ رہی ہے۔ اگرچہ ان کی صحیح تعداد ابھی تک معلوم نہیں ہو سکی لیکن اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ تجارت اور صنعت و حرفت کے انتظامی شعبے سے تعلق رکھنے والی عورتوں کی آمدنی چار ہندسوں تک پہنچ رہی ہے۔

دس ہزار پونڈ سالانہ سے زاید آمدنی رکھنے والوں میں ایسے لوگ بھی شامل ہیں جن کی آمدنی ۵۰۰۰۰ سے ۱۰۰۰۰۰ تک ہے۔ ان کی اوسط آمدنی بیس ہزار پونڈ بنتی ہے

ادنیٰ طبقوں میں پانچ لاکھ افراد سے زائد ایسے ہیں جو ۱۰۰ سے ۲۰ پونڈ ہفتہ وار کماتے ہیں۔ ۵ سے ۱۰ پونڈ تک ہفتہ وار کمانے والوں کی تعداد پندرہ لاکھ سے زائد ہے۔

ان کے نیچے ۲½ پونڈ سے ۵ پونڈ تک ہفتہ وار کمانے قریباً ۵۰۰۰۰۰ (پانچ لاکھ) ہیں اور ان سے بھی نیچے قریباً ایک کروڑ بیس لاکھ ایسے ہیں جن کی آمدنی ۲½ پونڈ ہفتہ وار سے کم ہے۔

شہنشاہ حبشہ جلاوطنی میں

سنڈے ایکسپریس کے ایک نامہ نگار نے شہنشاہ کے پست قامت اور چاق و چوبند سیکرٹری نے معذرت آمیز انداز میں استقبال کرتے ہوئے کہا "معاف کیجئے کہ ہم آپ کی مہمانداری کے فرائض پوری طرح سر انجام دینے سے معذور ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام دربار روزے سے ہے اور سوٹ میں بھی ہے۔ پچھلے دنوں ہم نے چالیس یوم کا روزہ رکھا تھا، لیکن اب کے صرف دو یوم کا ہے۔ ہر ہفتے ہم دو روز کا مسلسل روزہ رکھتے ہیں۔

عنقریب ہی ہم ایسٹر کا سالانہ روز کا روزہ شروع کرنے والے ہیں اس دوران میں سوائے تھوڑی سی ابلی ہوئی سبزی کے اور کچھ نہ کھایا جائے گا اور پینے کے لئے سادہ پانی۔ امید ہے کہ آپ ہمیں معذور تصور کریں گے۔

میں نصف گھنٹہ تک فیر فیلڈ کے برآمدے میں کھڑا رہا یہی سابق شہنشاہ حبشہ کا موجودہ مکان ہے۔ باتھ سے دو میل کے فاصلے پر۔

سیکرٹری کا نام سیرک ہیر دے ہے۔ آپ شہنشاہ کے وزیر خارجہ کے ۲۶ سالہ نوجوان فرزند ہیں۔

جنگ حبشہ کے دوران میں آپ ابے سینیا کے دفتر خارجہ میں اہم خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔

مسٹر ہیر دے نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

انگریزی، فرانسیسی اور اطالوی اخبارات فرش پر بکھرے پڑے تھے۔ ان کے عنوانات دربار کے سوگ میں ہونے کی تشریح کر رہے تھے۔ ان میں شہنشاہ کے داماد راس دستا کے قتل کی خبر شائع ہو رہی تھی جو شہنشاہ کے آخری سرداروں میں سے تھے اور ابھی تک اطالویوں کے خلاف مصروفِ پیکار تھے۔

مسٹر ہیروئے نے مجھے ایک سگرٹ پیش کرتے ہوئے کہا "یہاں کا ماحول اداس ہے۔ ہمارا گھر حقیقی معنوں میں غمخانہ بنا ہوا ہے۔ ہمارے راس دستا کی موت کے قطع نظر بھی اس گھر میں مسرت کا وجود ناپید ہے اور ہم بے خانماں لوگوں کے دلوں میں مسرت آئے بھی کیسے! ہم زیادہ تر صرف شہنشاہ کے بچے مسرور رہیں۔"

اس کے بعد مسٹر ہیروئے نے مجھے بتایا کہ اس وقت اس بادشاہ ہول کے بادشاہ کا دربار کن کن افراد پر مشتمل ہے۔

آپ نے فرمایا:۔

شہنشاہ یہاں اپنی ملکہ کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان کا بارہ سالہ بچہ شہزادہ ہرار باتھ کے بورڈنگ سکول میں ہے اور ہر ہفتے چھٹی گزارنے کے لئے یہاں آتا ہے۔ وہ فٹ بال کھیلتا ہے، مکہ بازی اور بائیسکل چلانے کا شوقین ہے اور انجن ڈرائیور بننا چاہتا ہے۔ شہزادہ کا چھوٹا بھائی جس کی عمر پانچ سال ہے یہیں رہتا ہے اور اس کی بہن جو لندن کے ایک ہسپتال میں نرس کا کام سیکھ رہی ہے کبھی کبھی یہاں آتی ہے۔

شہنشاہ کا نواسہ یعنی راس دستا کا بیٹا ناٹن کے سکول میں پڑھتا ہے اور ہفتہ وار چھٹی گذارنے یہاں آتا ہے۔ شاہی خاندان کے دوسرے بچوں کے علاوہ ہمارے ساتھ راس کاسا بھی رہتے ہیں جو جنگ کے دنوں میں سپہ سالار تھے۔ آپ پکے مذہب پرست ہیں اور جلاوطنی کی مصیبت کو سب سے زیادہ محسوس کر رہے ہیں۔ بہت سے لوگ شکست کا تمام تر الزام انہیں کے سر تھوپتے ہیں۔"

فیرفیلڈ کے حلے کے متعلق سوال کرنے پر مسٹر ہیروئے نے کہا ہمارے پاس ایک انگریزی خانساماں ہے لیکن ہمارے متواتر روزوں کی وجہ سے اس کا کام بہت ہلکا رہ گیا ہے۔ تین موٹروں کے لئے ایک انگریز شوفر ہے اور ایک انگریز مالی۔ باقی عملہ حبشیوں پر مشتمل ہے جن میں چار مرد تین خدمتگار عورتیں ہیں اور ان کے علاوہ میں اور میرا ایک دوسرا سیکرٹری۔ سب جلد سو جاتے ہیں اور علی الصبح اٹھتے ہیں۔ وہ صبح اٹھتے ہی اپنی سیاہ ٹوپی اور سیاہ کیپ (cape) میں ملبوس سڑکوں پر سیر کرنے نکل جاتے ہیں۔ ۹ بجے کے قریب وہ خط و کتابت میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

ایک غریبانہ سے ناشتے کے بعد دو گھنٹے تک دعا اور مراقبے میں مشغول رہتے ہیں۔ تیسرے پہر ملاقاتیوں کو باریاب فرماتے ہیں اور پھر خطوط پر دستخط کرتے ہیں۔

شاہِ اشوریا کے خطوط

شاہ زمریلین کے خطوط کا ترجمہ حال ہی میں ایک فرانسیسی عالم ایم۔ ڈوس نے علمائے کتبیاتِ قدیمہ کی ایک مجلس کے سامنے پیش کیا ہے۔ زمریلین ولادت مسیح سے ایک ہزار سال پہلے اشوریا پر حکمران تھا۔ یہ کتبے تل ہریری کے مقام سے مشہور ماہرِ آثارِ قدیمہ ایم پیرٹ نے برآمد کئے تھے۔ کسی زمانے میں اس مقام پر شہر ماری آباد تھا۔

ایم ڈوسن کا بیان ہے کہ اب یہ خطوط جو ممالک غیر کے حکمرانوں، درباریوں اور ایلچیوں کے نام لکھے گئے تھے آسانی کے ساتھ پڑھے جا سکتے ہیں اور اسی طرح پرانے تاریخی حالات اور تجارتی معاہدے علماء کے مطالعے کے لئے آسان ہو گئے ہیں۔ ان معلومات کی مدد سے اشوریا کی تین ہزار سال قبل کی جیتی جاگتی تصویر اتاری جا سکتی ہے۔

ادارہ

غزل

جاتے ہوئے اک بار تو جی بھر کے رُلائیں ۔۔۔ ممکن ہے کہ ہم آپ کو پھر یاد نہ آئیں

ہم چھیڑ تو دیں گے ترا محبوب فسانہ ۔۔۔ کھنچ آئیں گی فردوس کی مدہوش فضائیں

پھر تشنہ لبی زخم کی دیکھی نہیں جاتی ۔۔۔ پھر مانگ رہا ہوں ترے آنے کی دعائیں

پھر بیت نہ جائے یہ جوانی، یہ زمانہ ۔۔۔ آؤ تو یہ اجڑی ہوئی محفل بھی سجائیں

پھر لوٹ کے آئیں گے یہیں قافلے والے ۔۔۔ اُٹھتی ہیں افق سے کئی غمناک صدائیں

شاید یہی شعلہ مری ہستی کو جلا دے ۔۔۔ دیتا ہوں میں اڑتے ہوئے جگنو کو ہوائیں

اے کاش ترا پاس نہ ہوتا مرے دل کو ۔۔۔ اُٹھتی ہیں پہ رک جاتی ہیں سینے میں صدائیں

اک آگ سی بھر دیتا ہے رگ رگ میں تبسم ۔۔۔ اس لطف سے اچھی ہیں حسینوں کی جفائیں

معبود ہو اُن کے ہی تصور کی تجلی ۔۔۔ اے تشنہ لبو آؤ اِنیا دیر بنائیں

ہم سنگِ درِ یار پہ بے ہوش پڑے ہیں ۔۔۔ کہہ دے کوئی جبریل سے بہتر ہے نہ آئیں

ہاں، یاد تو ہوگا تمہیں راوی کا کنارا ۔۔۔ چاہو تو یہ ٹوٹا ہوا بربط بھی بجائیں

توبہ کو ندیمؔ آج تو قربان کروگے

جینے نہیں دیتیں مجھے ساون کی گھٹائیں

احمد ندیم قاسمی بی اے



امام موصدقی



نظریۂ مادیت کی فلسفیانہ اہمیت

مادیت سے میری مراد وہ وجودیاتی (ontological) نظریہ ہے جو حقیقت کے وجود اور ماہیت کے سوال کا جواب دیتا ہے کہ حقیقت بذاتِ خود ایک جسم ہے جس کے صفات امتداد (Extension) اور عدمِ تداخل پذیری (Impenetrability) ہیں۔ اس کی فعلیت کی ابتدائی اور اصلی صورت حرکت ہے۔ لہٰذا اسی اصول سے حقیقت کے تمام افعال و اعمال کی اور خاص کر شعور کے حالات کی توجیہہ ہونی چاہئے۔ مادیت اس بات کا دعویٰ کرتی ہے کہ تعدد مظاہر (Multiplicity) کی توجیہہ مبداء واحد (جو اس کے نزدیک مادہ ہے) سے ہو سکتی ہے۔ مادہ تمام چیزوں کی اصل ہے روح کا وجود مادے سے علیحدہ نہیں۔ روح یا ذہن یا نفس اس دائم التغیر مادے کی بے شمار صورتوں میں سے ایک صورت ہے۔ مادیت کا اہم جزو ذہنی اعمال کی عضوی یا مادی اعمال میں تحویل ہے۔ مادیت کی حمایت میں مندرجہ ذیل ثبوت پیش کئے جاتے ہیں۔

۱۔ طریقیاتی ثبوت (Methodical Proof)

یہ مفروضہ کہ ہم میں ایک غیر مادی روحی جوہر ہے جو جسم کا محتاج نہیں اور اس سے علیحدہ ہے اور دائم الوجود ہے غیر حکیمانہ ہے اور ایام جاہلیت کی نشانی ہے۔ اس نظریے کا ماننے والا وحشیوں کی سی ذہنیت رکھتا ہے جو فطرت کے ہر عمل کو ایک غیر مرئی دیوتا کا عمل تصور کرتا ہے۔ تجربے سے ہمیں سوائے جسم اور اس کے اعضا کے اور کسی چیز کا پتہ نہیں چلتا اس عضویت کے ہر عمل کو اور جو بھی اس عضویت میں گذرے ان تمام کو خود اسی عضو کے مختلف اعضاء کے تفاعلات (Functions) خیال کرنا چاہئے۔ ایک روحانی جوہر کا مفروضہ مابعد الطبیعاتی ادعا ہے جو نا قابلِ یقین اور بے معنی ہے۔ سائنس کو چاہئے کہ اس کو ہر تعلیم یافتہ کے ذہن سے دور کر دے۔ ہر سائنس کے طریقے کو اُس طریقِ عمل سے جو سائنس سے پہلے استعمال کیا جاتا تھا محض اس طرح ممیز کر سکتے ہیں کہ سائنس مظاہر کی توجیہہ انواع، قوات و حیلان (Essences & Powers) سے نہیں کرتی بلکہ مقدم (Antecedent) یا متوالی (Contiguous) مظاہر سے کرتی ہے۔ اب حالاتِ شعور بھی مقدم یا متوالی مظاہرِ دماغ اور نظامِ عصبی کے عضوی اعمال ہیں۔ حکیمانہ نفسیات دراصل عضویات (Physiology) ہے جو ذہنی اعمال کو محض عضوی اعمال تصور کرتی ہے۔ وہی عضوی قوت جو معدے کے ذریعہ غذا حاصل کرتی ہے۔ دماغ کے ذریعے فکر کرتی ہے۔ پروفیسر کارل واٹ فکر کی تعریف میں کہتا ہے "دماغ فکر کو اسی طرح پیدا کرتا ہے جس طرح کہ جگر صفرے کو اور گردے پیشاب کو۔ دماغ سب سے زیادہ عجیب و غریب سب سے زیادہ نازک اور لطیف عضو ہے اس کا وظیفہ یا عمل مخصوص فکر ہے لہٰذا نفس و حیات، فکر و ضمیر تمام مادے کی پیداوار ہیں اور اگر کوئی خدا ہے تو وہ بھی بقول ہیکل گیسی ریڑھ دار ہے۔"

۲۔ آلی ثبوت (Mechanical Proof)

مادیت کی حمایت میں دوسرا آلی ثبوت پیش کیا جاتا ہے جو علوم فطریہ کا مسلمہ اصول ہے۔ اس اصول کا حاصل یہ ہے کہ کائنات میں قوت یا انرجی کی مقررہ مقدار پائی جاتی ہے جو نہ زیادہ کی جا سکتی ہے اور نہ کم بلکہ ہمیشہ اتنی رہتی ہے۔ اس کو قانونِ بقاءِ توانائی کہتے ہیں۔ آلی اصول کی صداقت میں کسی کو شک نہیں ہو سکتا تکون (Change) اس توانائی کی محض دوسری صورتوں میں تقسیم ہے۔ مثلاً حرکت حرارت میں بدل جاتی ہے اور حرارت حرکت میں۔ ایک مقناطیسی رو کو اگر پانی میں سے لے جائیں تو کیمیائی نتائج پیدا ہوتے ہیں اور یہ مفروضہ کہ نئی توانائی کی تخلیق ناممکن ہے کائنات کی تمام میکانیت (Mechanism) کو بہت سادہ اور صریح بنا دیتا ہے۔ اب اگر ہم ایک دوسرے جوہر کا وجود فرض کریں جو جسم سے علیحدہ شے ہو اور جو اعصاب میں تناؤ پیدا کرتا ہو تو لازم آئے گا کہ دنیا کی موجودہ انرجی میں اضافہ ہو رہا ہے اور نئی انرجی کی تخلیق ہو رہی ہے لہٰذا یہ مفروضہ قانونِ بقاء توانائی کے خلاف ہے جس کو علوم فطریہ

(Natural Science) نے قبول کیا ہے۔ اس لئے یہ غیر حکیمانہ ہونے کی وجہ سے قابل تردید ہے۔

۴۔ کونیاتی ثبوت (Cosmological Proof) کسی زمانے میں ہماری زمین محض ایک روشن گیسی سحاب (Nebula) کی صورت میں تھی۔ ایسی حالت میں حیاتِ عضوی کا وجود ناممکن تھا لیکن جب زمین رفتہ رفتہ سرد ہوتی اور حیاتِ عضوی کے موافق حالات پیدا ہوئے تو نباتاتی اور حیوانی زندگی کا وجود ممکن ہوا اور بعد میں چل کر انسان بھی جلوہ نما ہوا۔ لہٰذا ذہنی زندگی عضوی زندگی کے ساتھ پیدا ہوئی ہے اور اپنے شرائط کے لحاظ سے عضوی زندگی کے ساتھ محدود ہے۔ یہ فرض کرنا کہ ذہن عضویت سے کوئی علیحدہ شے ہے بے معنی ہے کیونکہ اس کی ابتدا کا تعلق عضویت سے ہے اور دونوں ایک ساتھ فنا ہوں گے لہٰذا ظاہر ہے کہ حقیقی وجود صرف مادے اور حرکت کا ہی ہے اور جس عجیب و غریب لباس میں حرکت چند لمحوں کے لئے نمودار ہوتی ہے وہ کائنات کے لئے کچھ نہیں ایک لمحہ کا دوروزہ رقص ہے جو ابدیت اور لامحدودیت کے سمندر پر ہو رہا ہے۔

تنقید

طریقیاتی ثبوت کی تردید۔ ایک روحی جوہر کے مفروضہ کی مخالفت میں جدید نفسیات مادیت کا ساتھ دے گی۔ ذہنی اعمال کا خاصہ ہے کہ یہ ہمیں محض وقائع (Occurances) کے طور پر نظر آتے ہیں۔ یہ وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ یہاں کسی محل یا جوہر کا موجود ہی ناممکن ہے۔ اگر باوجود اس کے ہم کسی روح یا جسم کا ذکر کرتے ہیں تو ہماری اس طرزِ گفتگو کا مدار ہمارے ادراک (Apperception) پر ہوتا ہے یعنی جب قوتِ تصدیق ہم میں پیدا ہوتی ہے تو ہم ہر موادِ فکر کو موضوع اور محمول کی صورت میں سوچتے ہیں جب تک نفسیات روح کے تصور کو اس معنی میں استعمال کرتی ہے جس معنی میں کہ ایک عالمِ طبیعات مقناطیست اور برقیت کو استعمال کرتا ہے۔ یہاں مقناطیسی اور برقی جواہر کا ہی صرف علم ہوتا ہے۔ جب تک روح ذہنی اعمال کا موضوع سمجھی جاتی ہے اور ایک قایم بالذات جوہر نہیں خیال کی جاتی اُس وقت تک ہم اس طرزِ گفتگو کو غیر حکیمانہ نہیں کہہ سکتے

بر جوہر ذہن کے لئے کسی نہ کسی قدر مادی پہلو رکھتا ہے خواہ کتنی ہی کوشش کے ساتھ ہر طرح کی مادیت اس سے دور کی جائے۔ جس چیز کا بھی وجود ہوگا وہ ہمارے طریقِ تفکر کی وجہ سے ضرور مکان پر حاوی ہوگی اور اس لئے مادی ہوگی۔ مادیت جس جوہر کے مفروضہ کی اس شدت کے ساتھ مخالفت کرتی ہے وہ بالآخر ہمیں مادیت کی طرف لے جاتا ہے۔ ہمیں چاہئے کہ مادی واقعات کو چھوڑ کر اپنی توجہ ذہنی اعمال و وقائع پر مرکوز کریں اور کسی روحی جوہر کو فرض نہ کریں۔ صرف یہی وقائع جن کا کوئی محل نہیں مادے سے اصلاً مختلف ہو سکتے ہیں۔

سائنس کے سخت طریقہ کو اگر مد نظر رکھا جائے جو صرف واقعات کو بیان کرتا ہے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ہمارے حسی تجربات اور عمیق جذبات میں کوئی شے ایسی ضرور ہے جو ہر مدرک بالحواس شے اور ہر مادی شے سے اصلاً مختلف ہے لہٰذا معلوم ہوا کہ جس طریقۂ علم کی طرف مادیت اپیل کرتی ہے وہ ہمیں اس نظریے کے خلاف راہ دکھلاتا ہے۔

ا۔ مادیت کا دعوے ہے کہ حالاتِ شعور دماغ کے مادی حالات کے سوا کچھ نہیں یا

ب۔ حالاتِ شعور مادی حالات کے نتائج ہیں

ا۔ اول الذکر خیال مہمل ہے کیونکہ مادی حالات حرکت کی صورتیں ہیں لیکن شعور حرکت کی صورت نہیں۔ ممکن ہے کہ ذہنی حالات اور عضوی حالات میں معیت (Co-existence) ہو لیکن معیت کا علاقہ عینیت (Identity) کا علاقہ نہیں ہو سکتا۔ سایہ متحرک گاڑی کے ساتھ ساتھ دوڑتا ہے لیکن سایہ گاڑی نہیں۔ اسی طرح افکار گو دماغی حالات کے ساتھ چلتے ہیں لیکن اُن سے عینیت کا رشتہ نہیں رکھتے۔ کسی چیز کا تصور، تصویر کی طرح امتداد نہیں رکھتا اور نہ ہی وہ دماغی مکثرات (Molecules) کا مجموعہ ہو سکتا ہے۔

ب۔ لہٰذا مادئین دوسرے خیال پر اتر آتے ہیں کہ حالاتِ شعور اور دماغی افعال میں عینیت تو نہیں مگر اول الذکر ثانی الذکر کا نتیجہ ہیں لیکن یہاں بھی وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شعور کے بعض مادی شرائط ضرور ہیں۔ دماغ میں چند عضوی اعمال کے وقوع کے بغیر شعور ناممکن ہے لیکن شرائط علت نہیں ہو سکتے۔ ہم شعور کی توجیہہ محض مادی شرائط سے ہرگز نہیں کر سکتے کیونکہ یہ بنیادی قانون ہے کہ معلول اپنی علت سے متوافق[۱] ہونا چاہئے لیکن حالاتِ شعور دماغی حالات سے مختلف ہوتے ہیں۔ دماغ کا اعلیٰ ترین علم بھی ہم کو سوائے مادے کے (جو حرکت میں ہے) اور کسی چیز کا علم نہیں بخشتا لہٰذا یہ کہنا کہ شعور محض دماغی فعل کا نتیجہ ہے بالکل ناقابلِ فکر ہے

۱؎ Commensurate

میکانکی ثبوت کی تردید۔ عوام اور حکما کی اکثریت اس ثبوت کو بہت یقین آفریں خیال کرتی ہے لیکن یہ ثبوت بالکل کمزور ہے۔ قانونِ بقاءِ توانائی کا اطلاق صرف طبعی اور کیمیائی اعمال پر ہوتا ہے اور یہ قانون انہی کی حد تک صحیح ہے بلکہ بعض مشہور علمائے طبیعات ایسے بھی ہیں جو اس دائرے میں بھی اس قانون کی پوری صداقت کو نہیں مانتے بہرحال یہ قانون حیاتیاتی اعمال (Vital functions) کی توجیہ کے لئے بالکل ناکافی ہے۔ عضوی موجودات کی مرکبی عضویتوں کے تمام حصص کا مقصدِ واحد کے لئے آپس میں تطابق یہ ایسی چیزیں ہیں جو طبعی کیمیائی حدود میں نہیں سمجھائی جا سکتیں۔ حتیٰ کہ عضویت کا حیاتی ارتقا تخلیقی فعلیت کو ظاہر کرتا ہے اور جب ہم ذہنی اعمال کے ارتقاء پر غور کرتے ہیں تو اس امر پر مجبور ہوتے ہیں کہ وونٹ (Wundt) کے ساختہ نفسی توانائی کے ازدیاد کو بطور اصولِ موضوعہ مان لیں۔ کیونکہ قانونِ بقاءِ توانائی کو، ذہنی ارتقا پر منطبق کرنے کی کوشش، تجربے کے بعض بدیہی واقعات کی توجیہ نہیں کر سکتی۔

سچ تو یہ ہے کہ مادئین نے جو میکانکی ثبوت پیش کیا ہے اسے اگر اچھی طرح پرکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ ثبوت نہیں بلکہ ایک مفروضِ سابق (Pre-supposition) ہے کیونکہ اگر ہم پہلے ہی سے فرض کر لیں کہ ہر عمل (حیاتی نفسی وغیرہم) طبعی وکیمیائی قوانین کے موافق سمجھایا جا سکتا ہے تب کہیں قانونِ بقاء ازجی کی خلاف ورزی کا احتجاج درست ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر ہم واقعات پر نظر کریں اور اُن کے مطابق عمل پیرا ہوں بجائے اس کے کہ کسی خاص نظریے کو پہلے سے ہی فرض کر لیں تو ہم کو ماننا پڑے گا کہ قانونِ بقاءِ ازجی سے ان واقعات کی مطلقًا کوئی توجیہ نہیں ہو سکتی جو نفسی اور عضوی اعمال کے دائرے میں پائے جا سکتے ہیں۔ جن واقعات کو اب تک ثابت کیا گیا ہے اور ذہنی ارتقا اب تک جس درجے کو پہنچا ہے ان تمام کی توجیہ کے لئے ایک بالکل مختلف اصول کی ضرورت ہے۔ اس کا اعتراف بعض مشہور حکماء نے بھی کیا ہے۔ چنانچہ وونٹ کہتا ہے کہ "یہاں ایک ترکیب تخلیقی سرگرم عمل ہے جس کی ماہیت اور جس کے اصول کے متعلق زیادہ غور و فکر سے تحقیق کی جانی چاہیئے۔ میکانکی ثبوت کی قوت بالکل جاتی رہتی ہے جب ہم مادی مفروضات کو ترک کر کے تجربے کے نامدفوع واقعات پر غور کرتے ہیں۔

کونیاتی ثبوت کی تردید۔ کونیاتی ثبوت ایسے مفروضہ سے بحث کرتا ہے جس کی تصدیق بہت مشکل ہے۔ حیاتِ ذہنی کی تکوین (   ) اور اُس کی غائت کا تجربہ نہیں ہو سکتا اگر ہم یہ ثابت بھی کر دیں کہ حیاتِ نفسی کے لئے بعض مادی شرائط ضروری ہیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ صرف انہی شرائط کے تحت پائی جاتی ہے ایک بات تو یقینی ہے کہ حیاتِ نفسی۔ حیاتِ من حیث الکل کی طرح خود اپنے قوانین پر چلتی ہے جن کو ہم لاعضوی (Inorganic) مادے سے حاصل نہیں کر سکتے۔ آیا کبھی کائنات بغیر حیاتِ نفسی کے ہوگی اور کیا اس طرح کی کائنات کا وجود ممکن بھی ہے ایسی باتیں ہیں جو ہمارے تجربے سے ماوراء ہیں۔

"تنقیدِ بالا سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تمام براہین ذہنی اعمال کے وجود پر جن کو ہم مادی اعمال سے بالکل مختلف پاتے ہیں کسی قسم کا اثر نہیں کرتے برگساں نے اس مسئلے کو اچھی طرح سمجھایا ہے اور ایسے امور بیان کئے ہیں جو ان اعمال کے سمجھنے میں بے حد مدد دیتے ہیں۔ جن لوگوں نے ذہنی اعمال کا اچھی طرح مطالعہ کیا ہے وہ کسی طرح مادیت سے مطمئن نہیں ہو سکتے۔ مادیت نہ صرف ایک بنیادی اصول کے ناقابلِ قبول ہے بلکہ یہ اپنے نتائج کے لحاظ سے بھی سخت مایوس کن ہے۔ یہ ہر قسم کے مذہب کے مخالف ہے اس کا میلان الحاد کی طرف ہے۔ کیونکہ یہ مادہ کے سوائے ہر چیز کا انکار کرتی ہے۔ مادہ سے علاوہ فضا میں دیوتاؤں، ارواح اور شیاطین کی قطعًا کوئی گنجائش نہیں۔ مادیت کے ایک مصنف کا قول ہے کہ مافوق الفطرت واقعات کی اصل، مشاہدۂ فطرت کے اصلی طریقوں میں التباس و توہم اور پادریوں کے دھوکوں کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس کے نتائج اخلاق کے لئے سخت تباہ کن ہیں۔ مذہب کی بیخ کنی کے ساتھ یہ اخلاق اور نصب العین کے تعین کا بھی خاتمہ کئے دیتی ہے۔ مادیت کا عملی نتیجہ یہ ہے کہ اس کے نزدیک نیکی ایک بے معنی چیز ہے ضمیر ایک جنون ہے۔ قانونِ اخلاق پادریوں کی ایجاد ہے۔ اصل دانائی یہ ہے کہ زندگی خوشی سے بسر کی جائے اور جو کچھ لذت ہمیں حاصل ہو سکے اٹھائی جائے۔

(چودھری) **اکبر علی** بی اے

(عثمانیہ)

اُمیدِ موہوم

اے سراسر سحرِ رنگیں! اے سراپا دلبری! — اے کہ تجھ کو دیکھ لینا ہے سرورِ سرمدی
اے کہ تجھ سے دُور رہنا موت سے کچھ کم نہیں — اے کہ تیرا قرب ہے اک جاودانی زندگی
اے کہ تیری انگلیوں کے لوچ کی لمسِ خفیف — اک اِرم مدہوشیوں کا اِک بہشتِ بےخودی
اے ترے انفاس میں پوشیدہ وہ موجِ طرب، — خشک شاخیں زندگی کی جس سے ہوتی ہیں ہری
اے ترے اندام میں خوابیدہ وہ نازِ حیات، — بخشتا ہے جو محبت کو حیاتِ دائمی
اے ترے لبہائے شیریں پر وہ حرفِ شکّریں — انگبیں جس کی سماعت سے ہے تلخِ زندگی
اے تبسم تیرا ہے جس روح کو ایمائے رقص — اے تکلم تیرا جاں کو دعوتِ رامش گری
اے تری رفتار جس سے آرزوئیں پائمال، — اے تری گفتار جس سے زخم کی چارہ گری
اے کہ تو دوشیزۂ فطرت کا اک خوابِ حسیں — اے کہ تو تخئیلِ شاعر کی مجسّم دلکشی
اے سراپا رنگ و بُو! اے پیکرِ حسن و جمال! — اے غرورِ دلربائی نازشِ سیمیں بری
کس قدر بدمست وہ شب ہوگی جس شب ناگہاں — خواب سے بیدار ہوگی میری خفتہ اختری؟

بے تکلف تو مرے پہلو میں ہوگا محوِ ناز

اور مرے شانوں پہ مچلے گی تری زُلفِ دراز!

سعید احمد اعجاؔز

باپ کا گناہ

(ایک سچی کہانی)

ندلن کا قصبہ جہاں مجھے بطور ڈسٹرکٹ نرس کام کرتے ہوئے آٹھ سال ہو گئے ہیں ایک وادی میں واقع ہے اس وادی کے ہر چہار طرف بلند پہاڑ ہیں جنھوں نے اس جگہ کے باشندوں کی روحوں کو گویا مقید کر رکھا ہے۔ بظاہر یہ لوگ نہایت خاموش اور خود پسند ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے نشیب و فراز سے واقف نہیں اور جذبات سے بالکل معرا ہیں۔ لیکن میرا ذاتی مطالعہ یہ ہے کہ ان کے پہلو میں بھی ایک دل ہے اور اس میں محبت اور نفرت کے احساسات اسی طرح موجزن ہیں جس طرح ہم باقی دنیا والوں کے دلوں میں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہم ان جذبات کا اظہار فی الفور کر دیتے ہیں۔ یہ ان کو ایک عرصے تک دبائے رکھتے ہیں۔

ان میں سب سے زیادہ دلچسپ ماں بیٹے کا وہ جوڑا تھا، جو ہر اتوار گرجے میں عبادت کے لئے آتا تھا۔ مجھے نہ تو ان سے بات کرنے کا کبھی موقعہ ملا اور نہ کبھی مجھے ان کے گھر جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ دونوں بریلے خاندان کے فرد تھے۔ ماں مسز بریلے ستر سال کی تھی اور لڑکا جان بریلے تقریباً پچاس برس کا تھا۔ ہر اتوار جان بریلے اپنی ماں کو گرجا لاتا، عبادت کے بعد اسے سہارا دے کر اپنی گاڑی میں بٹھاتا اور واپس لے جاتا۔ کسی نے آج تک انہیں آپس میں بولتے نہ دیکھا تھا اور نہ ہی کبھی میں نے ندلن والوں کو ان کا تذکرہ کرتے سنا جس کا مطلب شاید یہ تھا کہ ان کے لئے یہ بات تعجب انگیز تھی۔

ایک رات دس بجے کا وقت تھا، میں اپنی خواب گاہ کی طرف سونے کے لئے جا رہی تھی کہ میرے دروازے پر موٹر کے رکنے کی آواز سنائی دی۔ کچھ دیر میں ٹام ہیپسن میرے سامنے کھڑا کہہ رہا تھا۔ مس براؤن جلد میرے ساتھ آیئے۔ ڈاکٹر صاحب کہیں باہر گئے ہوئے ہیں جان بریلے موٹر کے نیچے دب کر مر گیا ہے اور اس کی موت کی اطلاع اس کی ماں تک آپ ہی کو پہنچانی ہو گی۔ کوئی مرد یہ جرأت نہیں کر سکتا کہ اس ضعیفہ کو اس کے بیٹے کے مرنے کی اطلاع دے۔"

میں ٹام کی موٹر پر سوار ہو کر مسز بریلے کے گھر پہنچی۔ میری دستک سے پہلے ہی دروازہ کھلا اور پتلی دبلی بڑھیا مسز بریلے نے ہاتھ میں چراغ لئے ہوئے دروازہ کھولا یعنی وہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ ایسے بے وقت میرا وہاں کیا کام تھا

مسز بریلے، میں نے کہا۔ میں تمہیں بہت بری خبر دینے کے لئے آئی ہوں۔

اس نے میری طرف غور سے دیکھا اور کچھ جواب نہ دیا۔

تمہارے لڑکے کے ساتھ ایک حادثہ ہو گیا ہے۔ اس کی گاڑی کا تصادم ایک موٹر کے ساتھ ہوا۔ جس سے اس کی گاڑی الٹ گئی۔ لوگ اس کے پاس صرف ایک گھنٹہ ہوا پہنچے ہیں۔ وہ۔ وہ"

"میں جانتی ہوں وہ مر گیا ہے، اس نے نہایت سکوت سے جواب دیا "وہ مر گیا ہے۔ یہی نا،

جان بریلے کی لاش گھر لائے جانے کے بعد میں تمام شب مسز بریلے کے ساتھ رہی۔ ڈاکٹر کو مسز بریلے کی اس خاموشی سے خدشہ تھا کہ مبادا اس کا دماغ اس صدمے کا متحمل نہ ہو سکے۔

چونکہ میں وہاں کی ڈسٹرکٹ نرس تھی۔ اس لئے لاش کے پاس تمام رات بیٹھنا میرا ہی فرض تھا۔ لیکن خلاف قیاس جب نشستگاہ کے پردے گرا دیئے گئے تو مسز بریلے مجھے سونے کے کمرے کی طرف لے چلنے کے لئے اٹھی۔

اس کی خبر گیری میں کر دوں گی، اس نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ میں موت سے خوف نہیں کھاتی۔ مس براؤن لاش کے پاس آپ کے بیٹھنے کی ضرورت نہیں۔

میں نہ سمجھ سکی کہ اسے کیا جواب دوں۔ اس ضعیفہ کا سکوت کچھ بے تعلقی پر مبنی معلوم ہوتا تھا۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ میں سو جاؤں اور اسے

لاش کے پاس اکیلا بیٹھنے کے لئے چھوڑ جاؤں۔

مجھے حیران دیکھ کر اس نے پھر اپنی پہلی بات دہرائی اور کہنے لگی تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ جان اور میں آپس میں تیس برس سے نہ بولے تھے۔

تیس برس! میں نے تعجب سے پوچھا

ہاں کامل تیس برس بعض آدمی بوڑھے ہو کر مر جاتے ہیں اور بعض عین شباب میں ہی مر جاتے ہیں لیکن انہیں زندہ رہنا پڑتا ہے۔ جان آج نہیں مرا بلکہ اسے مرے آج تیس سال ہو گئے ہیں۔"

میرا خیال تھا کہ شدتِ غم سے بڑھیا کے دماغ کا توازن غلط ہو گیا ہے لیکن وہ اپنا سر ہلا کر مسکرائی جس کا مطلب تھا کہ اس نے میرے خیالات کو بھانپ لیا ہے۔

میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں۔ اس نے کہا کہ جان دراصل میرا بیٹا نہ تھا۔

جان تمہارا بیٹا نہ تھا! مسز بریلے یہ تم کیا کہہ رہی ہو

ہاں۔ وہ میرا بیٹا نہ تھا۔ اسے مجھ سے دور کا تعلق بھی نہ تھا لیکن اگر میں آج زندہ ہوں تو اسی کی وجہ سے۔ اس نے میری جان بچائی تھی۔ اب شاید تم سمجھ سکو تیس برس خیال تو کرو۔ کتنا لمبا عرصہ ہے۔ اب میں اس سزا کو اور زیادہ برداشت نہ کر سکتی تھی۔ ہم دونوں کو آپس میں گفتگو کئے تیس سال گذر چکے ہیں سچ تو یہ ہے کہ اس وقت کے بعد بولنے کی چنداں حاجت بھی نہ رہی تھی۔ ایک مردہ آدمی کو بولنے کی خواہش نہیں ہوتی مس براؤن کیا تم میرے ساتھ متفق نہیں۔"

"بہتر ہوتا تم مجھے لاش کے پاس بیٹھا رہنے دیتیں" میں نے کہا

"نہیں میں دیوانی نہیں" اس نے جواب دیا "اگر تم بیٹھنا فرض سمجھتی ہو تو آؤ نیچے اتر آؤ۔ میں تمہیں جان کی موجودگی میں بتاؤں گی۔ آخر مجھے بھی کسی نہ کسی سے کہنے کا حق ہے۔ شاید وہ سن سکے۔ وہ مرنے کے بعد بھی تیس سال زندہ رہا۔

میں اس کے ساتھ ہی نیچے اتر آئی۔ جب وہ اپنی کہانی ختم کر چکی تو صبح نمودار ہو چکی تھی۔

میں اس کی کہانی کا صرف خلاصہ پیش کر سکتی ہوں جو اسی کے الفاظ میں ہوگا لیکن اگر میں نے کبھی انسانی دل کو پہلو سے چیرا ہوا اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھا ہے تو وہ نظارہ میرے روبرو اسی رات پیش ہوا۔

مسز بریلے کی کہانی اسی کی زبانی

جب میں نے بریلے سے شادی کی۔ میری عمر انیس سال کی تھی۔ میرے ماں باپ ولٹشائر میں خوشحال زمیندار تھے سکول کی تعلیم ختم کرنے کے بعد میرے والد کا ارادہ تھا کہ میں کالج میں داخل ہو کر معلمہ بننے کی اہلیت پیدا کروں۔ لیکن عین اس وقت میری رائے بریلے سے ملاقات ہوئی۔ ہم دونوں کو پہلی ہی ملاقات میں ایک دوسرے سے عشق ہو گیا تھا۔ وہ مجھ سے عمر میں چھ سال بڑا تھا۔ وہ مردانہ حسن کی تصویر تھا۔ ہمارے قصبہ میں وہ ایک زراعتی مشین بنانے والی کمپنی کا نمائندہ بن کر آیا تھا۔ وہ یہاں چار دن ٹھیرا جس کے دوران میں اس نے مختلف زمینداروں سے مشینیں خریدنے کے آرڈر لئے۔ اس کا طرزِ عمل کچھ ایسا تھا کہ عورت اور مرد اس کی طرف کھنچے جاتے تھے۔ میرے والد نے اسے پانچ سو پاؤنڈ کا آرڈر دیا۔

ہمارے گاؤں میں کوئی ایسی لڑکی نہ تھی جو سراسر اس کی محبت میں گرفتار نہ ہو۔ رائے میں ایک خاص انداز کی بے نیازی اور جوش تھا جس کو دیکھ کر بے اختیار یہ جی چاہتا تھا کہ تن من دھن اس پر نچھاور کر دیا جائے۔ اس کی ہمراہی میں میرا کوئی ایسا لمحہ نہ گذرتا۔ جب میں یہ احساس نہ کرتی کہ میں نے دنیا میں وہ چیز پائی ہے جس کی قیمت متعین نہیں کی جا سکتی۔

میرے والد نے اسے شام کے کھانے پر مدعو کیا ہوا تھا۔ اس نے پہلی ہی ملاقات پر میرا منہ چوم لیا۔ اس نے مجھے کہا کہ وہ ایک مہینے کے اندر اندر پھر واپس آئے گا اور اس میلہ میں مجھے لے چلے گا جو کچھ دنوں میں وہاں منعقد ہونا تھا۔

اس کے چلے جانے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ اس نے میرے علاوہ کئی اور لڑکیوں سے بھی یہ حرکت کی تھی۔

یہ اطلاع پا کر اوّل اوّل تو مجھے بہت غصہ آیا اور میری غیرت کو سخت ٹھیس لگی۔ میں نے حلف اٹھایا کہ میں رائے کو اس حرکت کا مزا چکھا کر رہوں گی۔ پہلے اس کا دل مٹھی میں لوں گی اور پھر اس کا تمسخر اڑاؤں گی تم ایک ۱۹ برس کی لڑکی کے جذبات کا اندازہ لگا سکتی ہو۔

رائے نے میلہ پر میرے ساتھ چلنے کا وعدہ کیا تھا۔ رائے میں یہ وصف بدرجہ اتم تھا کہ خواہ کچھ بھی ہو وہ اپنے وعدے کو ضرور پورا کرتا

اصلاح کے ایفاء میں کوئی جذبہ۔ احساس۔ فرض۔ ذمہ داری حائل نہ ہو سکتی تھی۔

میرے والد کی ذاتی رائے یہ تھی کہ اس نے رائے جیسا ایماندار آدمی کبھی نہ دیکھا تھا یہی وجہ تھی کہ اس نے رائے کو ایسی بھاری رقم کا امانتدار بنایا۔ رائے صاف گو تھا اور اپنی بات کا دھنی۔ جب وہ کہتا کہ وہ ایک بات کرے گا تو وہ کر کے رہتا۔ وہ جوانی کے نشے میں مخمور رہتا اور زندگی اس کے لئے ایک کھیل تھی۔

رائے اپنے وعدے کے مطابق واپس آیا۔ میرے والد نے اس کا استقبال اس طرح کیا۔ جیسے کوئی ہمارا دیرینہ شناسا ہو۔ میں جس انتقام کے منصوبے اتنے عرصے سے باندھ رہی تھی، اس کے دیکھتے ہی بھول گئی۔ اب مجھے صرف یہ احساس تھا، کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں اور کوئی چیز مجھے اس سے باز نہیں رکھ سکتی۔ میں یہ سن کر پھولی نہ سماتی تھی کہ وہ خاص طور پر اس لئے آیا ہے، کہ مجھے اپنے ساتھ میلے میں لے چلے۔

اس میلے میں کوئی لڑکی ایسی نہ تھی جو رائے کو اپنا دل نہ دے چکی ہو۔ مجھے رائے کی ہمراہی میں دیکھ کر ہر ایک کو رشک آ رہا تھا۔ شام سے قبل ہی وہ میری زندگی کا ایک اہم جزو بن گیا۔ جب وہ کسی دوسری لڑکی سے مصروف گفتگو ہوتا، میں کن انکھیوں سے اسے دیکھتی اور فخر کرتی ہمیں ایک دوسرے سے محبت تھی۔ گو اس محبت کا نشان صرف وہ پہلا بوسہ ہی تھا۔

رائے اس رات ہمارا مہمان تھا۔ جب میلہ ختم ہو گیا تو ہم گاڑی میں بیٹھ کر واپس گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ آدھے فاصلے تک ہم دونوں خاموش رہے۔ یکایک اُس نے گھوڑے کی لگام تھام لی اور میری کمر میں باہیں ڈال کر کہنے لگا۔ کیونی مجھے بوسہ دو،

'کیوں، میں نے جواب دیا، تم یہاں کئی ایک لڑکیوں کا بوسہ لے چکے ہو!'

'اوہ! وہ اور بات تھی۔ اس نے کہا۔ مجھے تم سے محبت ہے کیا تمہیں مجھ سے نہیں!'

'ضرور ہے، میں نے کہا' لیکن میں اس وقت تک تمہیں بوسہ نہ دوں گی۔ جب تک تم مجھ سے شادی نہ کر لو گے'۔

یہ بات مجھ پر اب واضح ہوئی ہے کہ مجھ سے شادی کرنے کا خیال اس کے دماغ میں کبھی نہ آیا تھا۔ اس وقت میں اس بات سے واقف تھی کہ رائے کے لئے یہ زندگی محض ایک دلچسپ کھیل کی حیثیت رکھتی ہے۔

'کیوں نہیں'، اُس نے مجھے جواب دیا 'میں ضرور تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ دیگر لڑکیوں کا اور تمہارا مرتبہ میرے دل میں ایک ہی ہے۔ کیا وہ تمہارے رتبے کو پہنچ سکتی ہیں ان کا بوسہ لینا تو محض ایک خوش آیند مذاق تھا۔ اس کے بعد میں ایسا نہ کروں گا'۔

میرے ہونٹ اس کے ہونٹوں سے پیوست ہو گئے اور میں اپنا انتقام بھول گئی۔

دو ماہ کے بعد ہم دونوں کی شادی ہو گئی۔ ہنی مون گذارنے کے بعد ہم دونوں بوسٹن میں جہاں اس کی فیکٹری تھی۔ ایک گھر لے کر رہنے لگ گئے۔ گو میں اس وقت نہ جان سکی، لیکن اب مجھ پر یہ روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ شادی کے بعد بھی میں رائے کی محبت کما حقہٗ اپنی طرف مبذول نہ کر سکی تھی اس کے لئے میں ان لڑکیوں میں سے ایک تھی جن کا منہ اس نے پہلے دن ہمارے گاؤں میں آ کر چوما تھا۔ اس کے دماغ میں یہ خیال کبھی نہ آیا تھا کہ شادی سے ایک مرد پر ایک ذمہ داری عاید ہو جاتی ہے۔ اس کے لئے محبت محض ایک جسمانی کشش کا نام تھا۔

رائے ملازمت کے سلسلے میں زیادہ عرصہ باہر رہتا۔ لیکن بالعموم وہ ہفتہ کے دن گھر پہنچ جاتا۔ ہم دونوں بہت خوش تھے۔ اس کا سلوک میرے ساتھ نہایت شریفانہ رہا۔ جب کبھی ہم دونوں اکٹھے سیر کو نکلتے تو وہ ایک نہایت خوش کن ہمراہی ثابت ہوتا۔ اس کا دھیان ہر وقت میری طرف رہتا۔ اس کی طبیعت میں شامل تھا کہ وہ اپنی ہمراہی میں دوسرے کو بشاش رکھے اور یہ بات کچھ میرے لئے مخصوص نہ تھی۔ ایک مرد ہمراہی کے ساتھ بھی اس کا سلوک ایسا ہی ہوتا۔ اس کے جذبات ابھی بیدار نہ ہوئے تھے۔ میں اپنا عندیہ صرف الفاظ میں ہی بیان کر سکتی ہوں۔

ان تمام باتوں کے باوجود میرے دوست مجھ پر رشک کرتے۔ میں خیال کرتی تھی کہ شاید شادی اسی کو کہتے ہیں۔ محبت کی کمی جو میں شروع ہی سے رائے کی طرف سے محسوس کر رہی تھی اب بھی ویسی ہی تھی لیکن میں نے اپنے آپ کو اس بات سے تسلی دے لی تھی کہ ایک آدمی ہر چیز اپنی خواہش کے مطابق حاصل نہیں کر سکتا۔ میرے لئے تو کافی کچھ مہیا تھا۔ کاش میں رائے کی اصل شخصیت پہچان سکتی۔ ماسٹے کی طرف سے

دوپہری بعض وقت میرے لئے پریشان کن ثابت ہوتی۔ لیکن جب مجھے احساس ہوا کہ میں ایک بچے کی ماں بننے والی ہوں تو میں سب کچھ بھول گئی اور اس وقت کے خواب دیکھنے لگی جب یہ بچہ میری گود میں ہوگا اور رائے کی طرف سے جو محبت کی کمی ہے اسے پورا کر دے گا۔

مجھے معلوم نہیں کہ کس شخص نے مجھے اخبار سے کاٹ کر وہ کترن بھیجی جس نے میرا تمام خیالی قلعہ یک لخت زمین پر گرا دیا۔ رائے کو باہر گئے ہوئے دو ہفتے ہوئے تھے۔ اس کترن سے ظاہر تھا کہ ایک لڑکی نے رائے پر دعویٰ دائر کیا ہے کہ وہ اس کے بچہ کا، کے لڑکے کا باپ ہے۔ رائے کا پتہ اور نام اس وضاحت سے چھپا ہوا تھا کہ شک کی گنجائش ہی نہ تھی۔

اگرچہ عدالت سے دعویٰ خارج ہو چکا تھا۔ لیکن رائے کا تعلق اس لڑکی کے ساتھ ثابت تھا۔

رائے چوتھے دن واپس آیا۔ میں نے یہ تین دن نہایت اضطراب میں گزارے۔ مجھے دیکھ کر اس نے متعجب ہو کر پوچھا۔ "کیوں تم اداس کیوں ہو؟" اور مجھے بغل میں لے لیا۔

میں نے جھٹکا دے کر خود کو اس سے علیحدہ کیا اور میز پر پڑے ہوئے اخبار کی کترن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، ذرا پہلے اسے پڑھ لو۔

میں اس خیال میں تھی کہ وہ اسے دیکھ کر گھبرا جائے گا۔ لیکن وہ خوب زور سے ہنسا۔ "وہی پرانی بات۔ میں چاہتا تو نہ تھا کہ تمہیں اس کا علم ہو۔ یہ تو اس زمانے کی بات ہے جب میں نے تمہیں دیکھا بھی نہ تھا۔ یہ میرے خلاف پیش نہیں کی جا سکتی۔"

"کیوں نہیں،" میں نے جواب دیا "میں تمہارے پاس پاک دامن آئی تھی اور شادی کے وقت میں اپنے خاوند سے بھی یہی امید رکھتی تھی۔"

اس پر رائے نے ایک اور قہقہہ لگایا۔ جیسے میں نے اسے ایک بہترین لطیفہ سنایا ہو۔

"اگر تمہارا یہ خیال ہے،" اس نے کہا "تو معلوم ہوتا ہے کہ تم زندگی کی اصلیت نہیں سمجھتیں۔ اگر میں فرشتہ ہوتا تب شاید یہ ممکن تھا۔ لیکن فرشتے دنیا میں موجود نہیں۔ جان من! بے وقوف مت بنو۔"

اس نے مجھے آغوش میں لے لیا۔ رائے میں ایک کشش تھی جیسا کہ میں بیان کر چکی ہوں۔ جس سے گریز ناممکن تھا۔ اس کے لئے یہ بات باعث شرم نہ تھی۔ اسی لئے اس نے معافی کی ضرورت بھی نہ سمجھی۔ میں یہ محسوس کرنے لگی کہ میں اس کے سامنے قدیم زمانے کے پادری کی حیثیت میں کھڑی ہوں جسے صرف احمق تسلیم کر سکتے ہیں۔

جوں جوں دن گزرتے گئے، اس واقعہ کی اہمیت کم ہوتی گئی اور میں نے فرض کر لیا کہ تمام مرد ایسے ہی ہوتے ہیں اور رائے اس بات میں کچھ ایسا زیادہ مورد الزام نہیں گردانا جا سکتا۔

کچھ دن بعد میرے ہاں لڑکی پیدا ہوئی۔ میں نے اپنی لڑکی کا نام ... رکھا۔ ابتدا سے ہی رائے کو اس کے ساتھ بہت محبت تھی اور وہ بھی اس کی ایسی گرویدہ ہو گئی کہ دو سال ہی کی عمر میں وہ رائے کو اپنی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیتی۔ بعض اوقات تو میں خود اس کی اس بڑھتی ہوئی محبت سے حسد کرنے لگتی۔

اس دوران میں مجھے ایک بات مشوش کئے رکھتی تھی۔ گو رائے کی تنخواہ کمیشن ملا کر خاصی معقول رقم پر مشتمل تھی۔ بایں ہمہ گھر میں کسی قسم کی فارغ البالی نہ تھی۔ رائے نہ تو شرابی تھا اور نہ ہی جوا باز۔ اس کے دوست بھی بظاہر شریف معلوم ہوتے۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ میرے پاس کبھی اس کی تنخواہ سالم کی سالم نہ آتی تھی۔ جب کبھی میں اس کے متعلق دریافت کرتی، رائے مجھے ٹال دیتا۔ کبھی کہتا فلاں چیز کی قیمت اس ماہ ادا کی گئی۔ کبھی یہ کہ اس نے اس ماہ اپنے ماتحتوں کو پارٹی دی ہے۔ غرض میں اس دن کے انتظار ہی میں رہتی جب میں اس کی پوری تنخواہ لوں گی اور خرچ کر سکوں گی۔

میری شادی کا پانچواں سال تھا۔ میری بچی مشکل سے تین سال کی تھی کہ ایک دن رائے جب گھر واپس آیا تو اسے شدت سے بخار تھا۔ اس کے چہرے سے بشاشت مفقود تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ مشکل سے گھر پہنچ سکا ہے۔ ڈاکٹر کی تشخیص تھی کہ بخار نے تپ محرقہ کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اس کے مشورے کے مطابق رائے کو ہسپتال میں لے گئے۔ شروع ہی سے اس کے اس بیماری سے عہدہ برآ ہونے کی کوئی امید نہ تھی۔

تیسرے ہفتے ایک رات مجھے اطلاع دی گئی کہ رائے صبح تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ جب میں اس کے پاس پہنچی اس کے حواس کلیتہً بجا تھے۔ میں اس کے پلنگ کے پاس دو زانو ہو کر بیٹھ گئی۔ میں نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر از راہِ محبت دبا دیا۔ یہ قدرت کا ایک عجیب کرشمہ ہے کہ میں رائے کو اگر سمجھ سکی اس کے آخری وقت میں۔

جو کچھ اس رات اس نے بسترِ مرگ پر مجھ سے کہا، وہ ایک حکایت سی تھی۔ یہ موقع اس سے ناراض ہونے کا نہ تھا۔ کون آدمی ایسا دنیا میں ایسا سنگ دل ہے جو دوسرے سے اس وقت ناراض ہو سکے جب وہ

بستر پر پڑا اپنے آخری سانس گن رہا ہو۔

"جان من" اس نے کہا "اگر میں جانبر نہ ہو سکا تو میں تم سے ایک فرض کی ادائیگی چاہتا ہوں تم یہ سن کر خفا تو ہو گی۔ لیکن مجھے اور کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ تمہیں بابی کو اپنے پاس رکھنا ہو گا اور اس کی پرورش کی تم متحمل ہو گی۔"

"بابی کون" میں نے استفسار کیا۔

"میرا لڑکا" اس نے جواب دیا۔ اس کی ماں اس کی پیدائش کے چند ماہ بعد ہی مر گئی تھی۔ یعنی گھبراؤ نہیں۔ یہ برداشت کرنے کی کوشش کرو۔"

"تو کیا بابی کی ماں تمہاری منکوحہ تھی" میں نے پوچھا۔

"نہیں، میں اس سے ضرور شادی کر لیتا لیکن شادی کی مقرر کردہ تاریخ سے دو ہفتے پہلے میری تم سے ملاقات ہو گئی۔ وہ کوشش کرتی رہی کہ مجھے تم سے علیحدہ کر دے۔ لیکن اس کی یہ کوشش رائیگاں گئی۔ میں طبعاً کمزور واقع ہوا ہوں۔ میں نے اس سے قطع تعلق کر لیا۔"

"اس وقت بابی کی کیا عمر ہے"

"وہ میسی سے چند ماہ ہی پہلے پیدا ہوا تھا" اس نے جواب دیا "میں لاچار تھا۔ کچھ نہ کر سکتا تھا۔" "ہاں بیشک تم اس کا چارہ نہ کر سکتے تھے" میں نے اس سے متفق ہو کر کہا۔

اس لمحہ میں مجھ پر یہ روشن ہوا کہ کیوں رائے کی تنخواہ میں ہر ماہ کمی ہوتی تھی۔ بابی اپنی خالہ کے ہاں پرورش پا رہا تھا اور اس کے اخراجات کا کفیل رائے ہی تھا۔

"میری خواہش ہے" رائے پھر بولا "کہ تم میسی کے ساتھ ہی اس کی پرورش کرو اور کبھی اس پر اس کی پیدائش کا حال ظاہر نہ کرو۔ اس کو یہ یقین دلانا کہ تم نے اسے گود لیا ہے۔ لیو نی تم مجھ سے وعدہ کرتی ہو نا!"

آخری وقت میں بھی اس کا ذاتی سحر مجھ پر اپنا وار کر گیا اور میں نے اسے اپنا قول دے دیا۔

صبح سے پہلے ہی رائے اس دنیا کو خیرباد کہہ گیا۔

رائے کے مرنے کے بعد میں بابی کو اس کی خالہ سے لے آئی اور رائے کی زندگی کے بیمہ کی رقم سے میں نے کیوبک میں ایک ہوٹل جاری کیا اور یہاں میں دونوں بچوں یعنی میسی اور بابی کے ساتھ رہنے لگی۔ مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ مجھے بابی سے شروع میں انتہائی نفرت تھی۔ اسے دیکھ کر میں اس کی مرحوم ماں سے حسد کرنے لگتی۔

موسم سرما کے آغاز میں دونوں بچے سکول میں داخل کر دئیے گئے۔

بابی جوں جوں بڑھتا گیا، اس کی رائے سے مشابہت زیادہ ہوتی گئی۔ بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا کہ رائے ہی ایک بچے کی شکل میں میرے سامنے چل پھر رہا ہے اور یہی ایک بات تھی جو میرے لئے سب سے زیادہ تکلیف کا موجب تھی۔ میں اس صدمے سے گو دیوانی نہ ہوئی لیکن میرے دماغ پر ایک غبار سا چھا گیا جس کا دور کرنا میرے لئے امر محال تھا۔ میری ہمیشہ سے یہ خواہش تھی کہ میں مرحوم رائے کی خدمت کرتی۔ لیکن رائے کو یہ کبھی منظور نہ ہوا اور اب جبکہ رائے میرے سامنے بابی کی صورت میں ایک چھوٹا بچہ بن کر آ گیا تھا۔ میرا وہ جذبہ رفتہ رفتہ عود کرنے لگا اور بابی سے میری وہ ابتدائی نفرت الفت میں تبدیل ہوتی گئی۔

میں نے آغاز ہی سے اس پر واضح کر دیا تھا کہ میں نے اس کو گود لیا ہے اور وہ مجھے ممی کہہ کر پکارے۔ تھوڑے ہی عرصے میں میری ننھی میسی اور بابی یک جان دو قالب ہو گئے۔ جب میں ان کو سکول اکٹھا جاتے دیکھتی تو کسی موہوم سی وجہ سے میرا دل مٹھی میں آ جاتا اور وہ غبار جس کا میں ذکر کر چکی ہوں۔ میرے دماغ پر چھا جاتا۔ گو میں اس وقت یہ پوری طرح نہ سمجھ سکی تھی لیکن جو خطرہ مستقبل میں ظہور پذیر ہونے والا تھا میری آنکھوں کے سامنے پھر جاتا۔ میں محسوس کرتی کہ کسی نہ کسی طریق پر رائے کی معصیت کا کفارہ اس کے یہ دونوں بچے ادا کریں گے۔

میسی اور بابی دونوں نے سکول کی تعلیم سے فراغت پائی۔ اس کے بعد بابی کا خیال تھا کہ وہ قانون پڑھے گا اور میسی نے میرے پاس رہ کر مجھے ہوٹل کے انتظام میں مدد دینے کا ارادہ ظاہر کیا۔ وہ نامعلوم سا خطرہ جسے میں اس وقت تک محض اپنے دماغ کی اختراع سمجھتی تھی مجھے اکثر مجبور کرتا۔ اور میں کئی ایک نوجوانوں کو میسی کی توجہ کا مرکز بنانے کی کوشش کرتی۔ میں اندرونی طور پر خوش بھی تھی کہ بابی ہم سے جدا ہو رہا ہے۔

کبھی تم نے اپنی زندگی میں ایک المیہ ڈرامہ کا افتتاح دیکھا ہے۔ کیسی عام سی بات ہمارے سامنے پیش ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ہی کیسی لاعلاج اور یہی ڈرامہ اب میرے روبرو شروع ہونے والا تھا۔

جب بابی پہلے سال تعطیلات میں واپس گھر آیا اور میسی نے اس کا استقبال کیا تو اسی وقت سے ان کے اطوار سے ظاہر ہو رہا تھا کہ ان دو ہستیوں کو جدا کرنا ناممکن ہے۔

باب کے جسم میں مرحوم رائے بس رہا تھا اور مینی گویا میری ہی ذات کا دوسرا نام تھا۔ ہماری زندگی کے ڈرامے میں ہماری اپنی ہی اولاد کا کاسنہ مجھے ان دونوں کی محبت محذوف کئے دیتی تھی۔ وہ وقت قریب آرہا تھا جب مجھے ان دونوں کو یا ان میں سے ایک کو حقیقت سے آشنا کرنا ہی ہوگا۔ میں دست بدعا رہتی کہ ان دونوں کی محبت وقتی ثابت ہو۔

میں جان بوجھ کر دوسرے نوجوانوں کو مینی سے محبت کرنے کے لئے کہتی لیکن مینی کسی طرح بھی انہیں قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ اس کے دل میں باب کے سوا دوسرے کی جگہ ہی نہ تھی۔

بتدریج ہم دونوں یعنی میرے، وہ مینی کے دلوں میں کدورت پیدا ہونے لگی مینی کو یہ علم تھا کہ میں اس کی اس محبت کو ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھتی ہوں گو نہ تو اس نے کبھی مجھ سے اس کا تذکرہ کیا تھا اور نہ میں ہی نے میں کبھی یہ جرات پا سکی کہ اس ذکر کو چھیڑوں۔ لیکن یہ المیہ ڈراما بتدریج مختلف مراحل طے کرتا گیا۔

باب کو پھر دوسری تعطیلات پر واپس آنا تھا۔ اس دفعہ پھر قدرت مخالف سامان مہیا کر رہی تھی۔ ہوٹل کے تمام کمرے رک چکے تھے، اور لامحالہ ہم تینوں کو یک جا گذر کرنا تھا۔ باب آیا اور جس گرم جوشی سے مینی اس سے بغلگیر ہوئی۔ وہ ان کے اندرونی جذبات کو ظاہر کر رہی تھی۔ لیکن میں دل میں کہہ رہی تھی، نہیں نہیں تم ایک دوسرے کے لئے پیدا نہیں کئے گئے۔ میں اندھی نہیں۔

مینی نے میری طرف دیکھ کر کہا، ماں تمہیں مدت سے علم ہے کہ میں اور باب ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ تم نے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ ہم دونوں کو علیحدہ کر دو۔ تم چاہتی ہو کہ میں تمہارے پاس اس غلیظ اور بے ہنگام ہوٹل میں رہ کر تمہاری مدد کرتی اور سڑتی رہوں۔ تم ظالم ہو۔ بدطینت ہو،

باب میرے ساتھ تھوڑی دیر کے لئے باہر آؤ۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں، میں نے بابی کو مخاطب کر کے کہا۔ باب میرے ساتھ باہر آیا ہم دونوں ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔

'پچی' اس نے مجھ سے سوال کیا۔ آخر یہ کیا معاملہ ہے،

اور جب میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تو میرے سامنے گویا مرحوم رائے بیٹھا تھا۔ ہاں وہی رائے جو جوانی میں اس قدر بے باک۔ خندہ رو اور نیرزہ۔ دار تھا۔

'تم' میں نے اس کو کہا 'کسی صورت میں مینی سے شادی نہیں کر سکتے۔ مجھے تم سے آخر کہنا ہی پڑا تمہارے باپ نے مرتے وقت مجھ سے یہ عہد لیا تھا کہ میں کبھی تمہیں اس راز سے آگاہ نہ کروں۔ کاش میں ایسی حماقت سے کام نہ لیتی اور تمہیں بچپن ہی سے خبردار کر دیتی۔

"میرا باپ" باب نے کہا' میرا خیال ہے کہ میرا باپ تو مجھے تمہارے گود لینے سے پیشتر ہی مر گیا تھا،

' تمہارا باپ' میں نے کہا 'وہی تھا جو مینی کا باپ اور میرا خاوند تھا'

اس کے بعد ایک سکوت سا چھا گیا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر باب کی طرف دیکھا۔ پھر وہی رائے میرے سامنے تھا۔ لیکن ایک نئے وجود میں جس سے میں واقف نہ تھی اور جس کے دل میں قدرے رحم اور زندگی کی تلخی کا احساس پیدا ہو چکا تھا۔

'ماں میں سمجھ گیا'، باب نے آہستگی سے جواب دیا لیکن کاش مجھے یہ علم پیشتر سے ہوتا، اس کے چہرے پر حقارت آمیز تبسم کھیل رہا تھا۔

میں گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور میں نے چلا کر کہا' باب تم کیا کرنا چاہتے ہو،

'کچھ نہیں' اس نے بے تعلقی سے جواب دیا' صرف مینی کو حقیقت حال سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں، آخر یہ حق تو مجھ سے نہیں چھینا جا سکتا۔ بچی! کچھ دیر کے لئے ہم دونوں کو علیحدہ رہنے دو میں اس کو آخری سلام کہنا چاہتا ہوں۔

'باب' میں نے کہا' یقیناً تم مجھ سے بغیر ملاقات کئے رخصت نہ ہوگے

'ماں بغیر تمہاری ملاقات کئے نہیں'،

اس نے اپنے دونوں ہاتھ میرے کندھے پر رکھ دئے اور میری پیشانی کو بوسہ دیا۔ کہنے لگا' تم نے اس معاملے میں نہایت خوش اسلوبی سے کام لیا ہے۔ لیکن میں تم سے بہتر طریق پر مینی کو اس امر کے متعلق اطلاع دے سکتا ہوں۔ ہم دونوں کو کچھ وقت کے لئے اکٹھا رہنے کی اجازت دو'

اس نے اپنا منہ پھیر لیا اور جانے لگا اس کے کشادہ شانے اور چلتے وقت پیچھے کی طرف سر جھکانا رائے کی خصوصیتیں تھیں۔ میرے سامنے رائے چلا جا رہا تھا۔

یہ خیال میرے دماغ میں اس وقت نہ آیا کہ ان دونوں کو یک جا چھوڑنا غلطی ہے۔ میں وہیں درخت کے نیچے بیٹھی اپنے خیالات میں مستغرق تھی۔ اب اس المیہ ڈرامے کا آخری سین تھا۔ اب تو مینی کو ضرور

اصلیت سے واقف ہونا تھا۔ میری رائے میں معاملہ اتنا نہیں بگڑا تھا کہ سلجھ نہ سکے۔ وہ جلد ہی ایک دوسرے کو بھول جائیں گے۔ جس وقت میں گھر جاؤں گی۔ باب آ شتی پر آگیا ہوگا لیکن میسی اس کے متعلق مجھے یقین نہ تھا۔ لیکن میسی بھی بھول ہی جائے گی۔ وہ ابھی بالکل نو عمر ہے اور نو عمر جلد بھول جایا کرتے ہیں۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ میں ہوٹل جانے کا ارادہ کر رہی تھی کہ دور سے مجھے ایک کشتی جھیل میں جاتی دکھائی دی۔ بظاہر یہ معمولی بات تھی۔ بابی جو کشتی کو جھیل میں لا رہا تھا ایک ماہر ملاح تھا۔ لیکن میں پھر بھی خوفزدہ تھی میں دوڑ کر کشتی کے پاس پہنچی۔ میسی کشتی میں بیٹھی تھی اور بابی کا ایک پاؤں کشتی کے باہر اور ایک اس کے اندر تھا۔

دونوں نے میری طرف دیکھا۔ شام کے دھندلکے میں وہ دونوں غیر مرئی معلوم ہو رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں کچھ ایسی چمک تھی کہ میرا دل بیٹھ گیا۔

میں ان کی مرضی معلوم کئے بغیر کشتی میں ان دونوں کے درمیان بیٹھ گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پر معنی نظروں سے دیکھا اور باب کشتی چلانے میں مصروف ہو گیا۔

دوسرے لمحے ہوا کشتی کو جھیل کے وسط میں لے چلی۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا،

رہ رہ کر میرے دماغ میں یہ سوال اٹھتا کہ ایسے وقت ان کا کشتی میں نکلنا کیا معنی رکھتا ہے۔ کیا ان کا ارادہ خودکشی کرنے کا تھا۔ کچھ بھی ہو میرے آنے سے ان کے تمام ارادے درہم برہم ہو گئے تھے۔ میں خاموش بیٹھی تھی اور کشتی ہمیں جھیل کے عین وسط میں لے جا رہی تھی

آخر میں نہ رہ سکی میں نے باب کو پکارا، باب تم کہاں جا رہے ہو آور آگے جانے کا کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ ہم پہلے ہی کنارے سے بہت دور آچکے ہیں۔

باب نے میری طرف مڑ کر دیکھا اور کہنے لگا۔ ہاں چچی تم ٹھیک کہتی ہو۔ آگے جانا بے سود ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ باب کے ان الفاظ میں ایک خاص مطلب پنہاں تھا۔ اس نے جلدی سے کشتی کا رخ کنارے کی طرف پھیرا۔ اچانک شمال کی طرف سے ایک طوفان اٹھا اور باب کی کوشش کے باوجود کشتی بے قابو ہو کر الٹ گئی اور میں اور میسی برف جیسے سرد پانی میں کشتی کے نیچے دب گئے۔

باب غوطے کھاتا ہوا میرے پاس پہنچا اور مجھے بلند آواز سے پکار کر کہنے لگا "چچی سنبھلو ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دو میں تمہیں کنارے پر بحفاظت پہنچا دوں گا،

پھر میسی کو چلا کر کہا "میسی تم خود کو سنبھالے رکھنا۔ میں چچی کو کنارے پر پہنچا کر ابھی آیا۔

میسی اچھی خاصی تیراک تھی۔ لیکن میں تیرنے میں بالکل نا اہل تھی۔

میں نے سنا کہ میسی باب کو یقین دلا رہی تھی "باب میں خیریت سے ہوں تم فکر نہ کرو،

جب میں کنارے پر پہنچی۔ سردی سے نیم جان ہو چکی تھی۔ بمشکل تمام باب کو میسی کے بچانے کی ہدایت کر سکی۔ باب مجھے چھوڑ کر پھر جھیل میں غوطہ زن ہوا اور میں نے اسے میسی میسی پکارتے سنا۔ اس کے تیرنے کی آواز میرے کان میں آئی۔ اس کے بعد میں بیہوش ہو گئی۔

ایک عرصے کے بعد باب کے ہلانے پر مجھے ہوش آیا۔ میں نے میسی کے متعلق دریافت کیا۔ لیکن باب نے بجائے جواب دینے کے ایک کالے ڈھیر کی طرف اشارہ کیا جو کچھ فاصلے پر پڑا تھا۔

میں گھسٹتی ہوئی۔ اس ڈھیر کے پاس پہنچی۔ میں نے میسی کے چہرے کو چھوا اور جان لیا کہ وہ اب اس خواب سے بیدار نہ ہوگی۔

باب نے مجھے ایک طرف دھکیل دیا اور خود میسی کے ہاتھ پاؤں کو حرکت دیتا رہا۔ وہ اس عمل کو نہ معلوم کب تک جاری رکھتا۔ لیکن میں جا کر ایک ڈاکٹر کو بلا لائی۔ جس نے بصد مشکل باب کو میسی کی موت کا یقین دلا کر اسے اس بے سود کوشش سے باز رکھا۔

میسی مر چکی تھی اور اس نے اپنے باپ کے اس ظلم کا کفارہ ادا کر دیا تھا۔ جو اس کے باپ نے باب کی ماں کے ساتھ روا رکھا تھا۔

میسی کے تجہیز و تکفین کے بعد میں نے ہوٹل بیچ دیا اور باب اور میں ہارلٹن میں آ گئے۔ یہاں پہنچتے ہی کھیتی باڑی کا کام شروع کر دیا۔

یہاں ہر شخص اس کو جان برینلے کے نام سے جانتا تھا اور میرا لڑکا سمجھتا تھا۔ ہم اور وہ سب ہمارے آپس میں نہ بولنے پر حیران تھے۔

اس رات سے جس رات میسی مری۔ میرے اور باب کے درمیان کبھی گفتگو نہ ہوئی۔ سچ تو یہ ہے کہ کوئی موضوع ایسا رہ بھی نہ گیا،

تھا جس کے متعلق ہم آپس میں بولتے۔

اکثر اوقات میں سوچتی ہوں کیا وہ دونوں جھیل میں خودکشی کرنے کے لئے جا رہے تھے۔ لیکن اب یہ سوچ بے فائدہ ہے۔ باپ نے میری جان بچائی تھی اور میں نے میری خاطر اپنی جان دی تھی۔ بس یہی میری رام کہانی ہے۔

لیکن جیسا تمہیں اب واضح ہو گیا ہو گا۔ باپ آج نہیں آج سے بیس برس پیشتر مر چکا تھا آج باپ نہیں بلکہ جان پہلے مرا ہے وہ میرے جسم اور خون کا حصہ نہ تھا۔

خدا اس کی روح کو آسودگی بخشے۔

منظور ڈیرہ غازیخاں

وہ رات!

وہ رات!
میرے پیارے محبوب
کتنی حسین تھی وہ رات
جب ہماری روحیں
محبت کے شفاف نور سے روشن ہو چکی تھیں ہمارے دھڑکتے دل ایک دوسرے کے قریب تھے

ہاں میرے محبوب
کتنی رومان انگیز تھی وہ تاریکی رات جب قدرت کی شہزادی
انسانی وادیوں کو سنہری چادر میں لپیٹ چکی تھی۔
جب یہ دنیا سونے کے دریا میں ڈوبا ہوا
سنہرا کھلونا معلوم ہوتی تھی

ہاں میری روح کے معبود
کتنی سحر آفریں تھی وہ رات جب جھلکتے ستاروں
اور آسمان پر جگمگاتے چاند کی حکومت میں ہماری روحیں محبت کے پر لگائے
پہاڑوں کی چوٹیوں۔ گھاٹیوں
زلف کی طرح بل کھاتی ندیوں
شفاف چشموں۔ گوہر بار آبشاروں
آبشاروں کے شیریں نغموں
مشکبار و عطر بیز ہواؤں
لالہ زاروں کی جلوہ ریز فضاؤں
سے گزر رہی تھیں
ہاں میرے مقدس دوست
کتنی دلکش تھی وہ سنہری رت
جس کے تصور میں اب
میرا دل ہے سوگوار
میری آنکھیں بھری بھری

الف ایم ساقی

رباعی

خمخانۂ آسماں میں اک جام ہے چاند
یا بزمِ فلک میں ایک گلفام ہے چاند
ہے روح فزا اس کی اک ایک کرن
[illegible] عشق کا پیغام ہے چاند

اثر صہبائی

جام صہبائی

(۱)

مے عیش و نشاط کی پلاتی آئی
خم کیف و سرور کے لنڈھاتی آئی
دامانِ جہاں ہے بھر لیا پھولوں سے
یوں فصلِ بہار مسکراتی آئی

(۲)

پھولوں سے بھرا ہوا ہے دامانِ بہار
پابندِ جمال میں ہے طوفانِ بہار
ہر پھول دھلا ہوا ہے کوثر میں اثرؔ
فردوس سے ہو رہا ہے بارانِ بہار

(۳)

باغوں میں نہیں ہے کہساروں میں نہیں
سورج میں نہیں ہے چاند تاروں میں نہیں
وہ حسن کہ ہے تیوروں میں جس کا جلوہ پیرا
فطرت کے حسین ترین نظاروں میں نہیں

(۴)

ہنگامۂ فصلِ گل سے ہنگامۂ رنگ
ہے ربطِ رنگ سے فراوانِ نغمۂ رنگ
مینا شدۂ رنگ سے گلستانِ جہاں
ہم ساغرِ رنگ ہے صبا بادۂ رنگ

اثر صہبائی

طلسمِ گفتار

سرد آہیں بھروں گا، تو جوانی میں بھروں گا
مرنے کا ہے موسم یہی، جی بھر کے مروں گا

تو پیکرِ انساں میں، مرے سامنے آجا
یارب میں تجھے صدق بھرا سجدہ کروں گا

جو بات چھپاتا ہوں، وہ ہے پہلے ہی رسوا
لیتے ہیں ترا نام کہ میں آہ بھروں گا

آجاتی ہیں خود لب پہ مرے، آپ کی باتیں
اندیشہ ہے، میں آپ کو بدنام کروں گا

مرنا ہے تو پھر مرگِ حسیں کیوں نہ خریدوں
جاں دے کے عدم عشق کی تکمیل کروں گا

اے عشق! وہ بت رونقِ بت خانہ بنا دے
جو ہستیٔ یزداں کو بھی افسانہ بنا دے

ہے عشرتِ دیوانگیٔ عشق عجب چیز
دیوانہ بنا دے، مجھے دیوانہ بنا دے

ہر فکرِ جگر سوز کی بنیاد خرد ہے
اے دوست مجھے عقل سے بیگانہ بنا دے

گمنام ہوں، ناپید ہوں، گویا کہ نہیں ہوں
کیا دیکھ رہا ہے! مجھے افسانہ بنا دے

ہو سکتا ہے افسانے کا گر تو متحمل
پھر مجھ کو بڑے شوق سے افسانہ بنا دے

اے زاہدِ کم فہم! تجھے علم بھی ہے کچھ؟ ق
دل کعبہ نہیں ہے اسے بتخانہ بنا دے

اللہ بھی اک بت ہے، بتِ اعظم و یکتا
اس رازِ دل آویز کو افسانہ بنا دے

دل مانگا تھا یارب یہ تجھے کس نے کہا تھا
پہلو میں مرے چھوٹا سا غم خانہ بنا دے

یہ آپ کی دزدیدہ نگاہی کہیں یوں ہی
دل میں مرے اک شہرِ تمنا نہ بنا دے

ہستی مری رہ جائے نہ جز نشہ و مستی
یوں دیکھ مجھے لغزشِ مستانہ بنا دے

اے جانِ عدم آ مری گفتار میں ڈھل جا
ہر شعر صنم رنگ کو بت خانہ بنا دے

عدم

کرشمۂ الفت

ذیل کی سطور روس کے مشہور ناول نگار ایوان الگزنڈر دوچ گون چاروف (۱۸۱۲ء۔۱۸۹۱ء) کے ناول ابلوماف (جو ہیرو کے نام سے منسوب ہے) کے ایک باب کا ترجمہ ہے۔ ابلوماف، مصنف کا غیر فانی کردار ہے، اُس نے اپنے کرداری تصویر اس سچائی، ہمدردانہ ظرافت اور صفائی سے اتاری ہے کہ دنیائے ادب میں شیکسپیئر کے ہملٹ اور ترگنیف کے تارتوف کی طرح ابلوماف بھی ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے، روسی ادب میں "ابلومافیت" ایک بیماری کا نام ہے جو کاہلی، آرام طلبی اور بے عملی کی عادت کا ہم معنی ہے، اس میں شک نہیں کہ ماقبل انقلاب روس کی یہ مخصوص بیماری تھی، لیکن اگر تجسس کیا جائے تو ہر قوم میں چند ایسے افراد نظر آئیں گے جن کی زندگی میں ابلومافیت کا ایک مکمل عکس نظر آتا ہے، ابلوماف ایسا کاہل انسان تھا جس کا عملی پہلو بالکل مردہ تھا۔ جہاں تک بن پڑا اس نے ہر کام کو کل پر اٹھا رکھا، نہ کرنے کا عذر ڈھونڈا، بہانہ تلاش کیا۔ ارادے کئے لیکن کسی کو پورا نہ کیا، بستر اس کا رفیق، ڈریسنگ گاؤن اس کا مونس اور ہیند اس کی دولت تھی، بستر سے ہم آغوش ہو کر وہ دن کو خواب دیکھا کرتا، اور اس لذت پر اس نے ہر چیز روح جسم، جوانی، زندگی، مال اور دولت سب کو بھینٹ چڑھا دیا، اس کے نیم روسی دوست اسٹولٹز نے اس کی زندگی کے عملی پہلو کو بیدار کرنے کی سعی کی اور اُس المناک انجام سے جو قسمت نے لکھے کی طرح ناگزیر تھا بچانا چاہا، اولگا کو اس کی نجات کا وسیلہ سمجھ کر اس کا ابلوماف سے تعارف کرایا اولگا بہت زیادہ حسین نہ تھی، لیکن اُس کے متناسب اعضا میں ایسی بے پناہ دلفریبی تھی جس کی کشش سے کوئی انسانی قلب محفوظ نہیں رہ سکتا تھا، اس کی آواز میں ایک جادو تھا، جو آہستہ آہستہ دماغ کو مسحور کر کے انسان کو از خود رفتہ بنا دیتا تھا، جب وہ گانے لگتی تو ابلوماف کے مردہ دل میں ایک ہیجان برپا ہو جاتا، اس کی روح وجد کرنے لگتی اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری ہو جاتا، ایک ایسے ہی لمحے میں جبکہ اولگا نے اپنے سحر انگیز نغمہ سے ابلوماف کو مسحور کر دیا تھا، وہ ایک عالم وارفتگی میں اولگا سے اپنی محبت کا اظہار کر دیتا ہے، اور پھر ہوش آتے ہی احساس ندامت سے اولگا کے پاس سے اٹھ کر چل دیتا ہے، ذیل کا واقعہ اسی کے بعد کا ہے۔

اس واقعے کے بعد چند دنوں تک ابلوماف اور اولگا کی پھر تنہائی میں ملاقات نہ ہوئی، جب کبھی ابلوماف کی نگاہ اولگا پر پڑ جاتی تھی تو وہ اسکول کے ایک طالب علم کی طرح چھپ جاتا، اولگا کا رویہ بھی بدل گیا تھا، حالانکہ وہ اُس سے نہ اجتناب کرنا چاہتی تھی اور نہ سرد مہری ہی سے پیش آتی تھی، البتہ ذرا خاموش سی ہو گئی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ یہ سوچ کر فکر مند تھی کہ ایسا واقعہ کیوں رونما ہوا جس کی وجہ سے وہ اس لطف سے محروم ہو گئی جو اُسے ابلوماف کو اپنی مستفسرانہ نگاہوں سے ستانے اس کی کاہلی پر نیک نیتی سے طعنہ زنی کرنے اور اس کی آرام طلبی دیکھ کر اس پر لعنت ملامت کرنے میں حاصل ہوتا تھا، ابلوماف کی ہنسی اڑانے میں اُسے ایک خاص مزہ ملتا تھا، لیکن اس کے تمسخر میں عداوت کا کوئی پہلو نہ تھا، بلکہ یہ ہنسی اس مسکراہٹ کے برابر تھی جو ایک ماں کے لبوں پر اپنے بیٹے کو مسخرے کے لباس میں ملبوس دیکھ کر پیدا ہو جاتی ہے۔ اسٹولٹز بھی جا چکا تھا اور اب وہاں کوئی ایسا شخص موجود نہ تھا جس کو وہ اپنی نغمہ سرائی سے محظوظ کر سکے، اس کا پیانو بند پڑا تھا، دونوں کے دلوں پر احساس تنہائی سے ایک افسردگی سی چھائی ہوئی تھی، اولگا کے دل میں رہ رہ کر یہ خیال آتا تھا کہ دونوں کے ابتدائی مراسم کس قدر خوشگوار تھے، دونوں میں کتنا جلد تعارف ہو گیا تھا اور کس آسانی سے دونوں دوست بن گئے تھے، اسٹولٹز کی نسبت ابلوماف زیادہ سادہ مزاج اور نرم دل واقع ہوا تھا، یہ صحیح تھا کہ اسٹولٹز کی طرح ابلوماف اولگا کی دل جوئی نہیں کر سکتا تھا، لیکن اس کی فطری حرکتوں سے اولگا کا دل بہل جاتا تھا، پھر وہ ہمیشہ اس کے تمسخرانہ ہنسی کو معاف کر دینے کے لئے تیار رہتا تھا، اس کے علاوہ اسٹولٹز نے چلتے وقت اولگا کو تاکید کر دی تھی کہ وہ ابلوماف کی خبر گیری کیا کرے اور اسے گھر میں پڑے رہنے سے باز رکھے اولگا نے اپنے ذہن میں ترکیبیں ایجاد کر لی تھیں کہ کس طرح وہ ابلوماف کو کھانے کے بعد سونے نہیں دے گی، بلکہ دن کے وقت اُسے لیٹنے کا موقع ہی نہ دے گی، جو وعدہ اس نے اسٹولٹز سے کر لیا تھا اُسے پورا کر کے رہے گی، وہ خواب دیکھا کرتی کہ وہ ابلوماف کو اُن کتابوں کو پڑھنے کی رغبت دلائے گی جنہیں اسٹولٹز

چھوڑ گیا تھا، اُس سے اختیار پیدا کرے گی. دیہات کے کارندوں کو خط لکھنے
گی۔ زمینداری کے انتظام کا خیال دلائے گی. باہر چلنے کے لئے آمادہ
کیا کرے گی، کسی طرح بھی اُسے بے کار بیٹھ کر اونگھنے نہ دے گی، اور
ہر وقت ایک نہ ایک کام اُس کے سامنے پیش کر دیا کرے گی، اُن چیزوں
کا ہوش دلائے گی جن سے وہ رفتہ رفتہ غافل ہو گیا تھا۔ غرض وہ اس کی
عادتوں میں اس قدر تغیر پیدا کر دے گی کہ واپس آنے پر اسٹولٹنز اس کو
پہچان نہ سکے گا. وہی شرمیلی سی خاموش طبیعت والی لڑکی اولگا جس نے
ہنوز دنیاوی زندگی میں قدم نہیں رکھا تھا جس کی اطاعت کے لئے ہنوز کسی
نے سر خم نہیں کیا تھا. دنیا کے سامنے ایک معجزہ پیش کر دے گی! اور وہ
تبدیل فطرت کا باعث بن جائے گی، اس نے اپنی تجویز پر عمل کرنا بھی
شروع کر دیا تھا، اور ابلوماف میں اُسی دن سے تبدیلی سی پیدا ہونے
لگی تھی جس دن اس نے اولگا کو گاتے سنا تھا. اب اس میں زندگی آ جائے
گی اور دنیا کی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے گا، وہ اس احسان کے لئے اولگا
کو دعائیں دے گا، مردہ جسم میں روح پھونکنا! اگر اس ڈاکٹر کی جو ایک
مایوس مریض کو دوبارہ تندرست کر دیتا ہے بے انتہا تعریف و توصیف
ہوتی ہے تو پھر اس عورت کی کیا کم تعریفیں ہوں گی جس نے ایک روح
و دماغ کو جو اخلاقی حیثیت سے مردہ ہو رہے تھے، از سر نو زندگی بخشی؛
اس خیال سے شادمانی اور فخر کی ایک کپکپی اس کے سارے جسم میں محسوس
ہوتی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ قدرت نے اسے اس فرض پر مامور کیا تھا، اُس نے
اپنے تصور میں ابلوماف کو اپنا سیکرٹری اور اپنی لائبریری کا محافظ بنا رکھا
تھا. اب اس کی ساری امیدوں کا خاتمہ ہونے والا تھا، وہ حیران تھی کہ کیا
کرے، لہذا جب اس کا سامنا ابلوماف سے ہو جاتا تھا تو اُسے چپ سی
لگ جاتی تھی۔

ابلوماف کے لئے یہ خیال سوہان روح ہو رہا تھا کہ اُس نے اولگا
کو آزردہ خاطر کر دیا تھا، جب وہ اسے دور سے دیکھتا تو اُس کی برق
پاش نگاہوں اور غفلت شعاری کے خوف سے لرزہ براندام ہو کر الگ ہٹ
جاتا، وہ ٹہلنے کے لئے جنگل کی طرف چلا جاتا یا دیہات کو نکل جاتا اور وہاں
کسی جھونپڑی کے دروازے پر بیٹھ کر بچوں کو کھیلتے اور بطخوں کو تالاب میں تیرتے
دیکھتا رہتا۔ اُس کے مکان کے نزدیک ایک بڑا پارک تھا، وہاں وہ اس خوف
سے نہیں جاتا تھا کہ مبادا اولگا کا سامنا ہو جائے، وہ سوچتا تھا کہ میں نے کیوں
ایسی بات منہ سے نکالی؟" لیکن کبھی اس نے دل میں یہ غور نہیں کیا کہ آیا اس کے

الفاظ میں صداقت تھی یا نہیں؟ وہ دل کی گہرائیوں سے نکلے تھے یا صرف لمحہ
کے عارضی اثر کی پیداوار تھے۔ افسردگی، اور ندامت جسے وہ ذلت کا مترادف
سمجھتا تھا اُسے اتنا موقع بھی نہ دیتی تھی کہ وہ اپنے الفاظ کا تجزیہ کرے یا یہ سوچے
کہ اولگا سے اس کا کیا تعلق تھا، وہ یہ بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ کون سی چیز
اس کے دل کے اندر داخل ہو گئی تھی، ایک بار تھا جو اس سے قبل وہاں
موجود نہ تھا، اس کے سارے جذبات ندامت کے احساس سے مغلوب
ہو گئے تھے، لیکن جب ایک لمحے کے لئے بھی وہ اولگا کا خیال دل میں لاتا
تو اُس کی نگاہ تصور کے سامنے اولگا کی تصویر آ کر کھڑی ہو جاتی جو سکون،
زندگی اور مسرت کا مجسمہ معلوم ہوتی تھی، "آہ! یہ میں نے کیا کر لیا" وہ سوچتا
"میں نے سب بنا ہوا کھیل بگاڑ دیا، شکر ہے کہ اسٹولٹنز یہاں موجود نہیں
اولگا کو اس سے کہنے کا موقع نہ ملا، نہیں تو میں زمین میں سما جانے کی دعائیں
کرتا، محبت، آنسو . . . نہیں یہ میرا شیوہ نہیں، اولگا کی خالہ نے آج
مجھے نہ اپنی خیریت کہلا بھیجی اور نہ چائے ہی پر بلایا، اولگا نے ضرور کہہ دیا
ہوگا۔ اے میرے اللہ!" ان خیالات میں مستغرق وہ پارک کے درمیان
ایک روش پر چل رہا تھا۔

اولگا کو صرف مشکل یہ تھی کہ وہ ابلوماف سے ملے گی کس طرح، کیا
اس واقعے کے متعلق اُسے کچھ کہنا چاہئے یا اس طرح پیش آنا چاہئے کہ
جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی تھی! لیکن آخر وہ بولے گی کیا! آیا اُسے ترش روئی
برتنا چاہئے یا معذورانہ انداز اختیار کرنا چاہئے، یا اُس کے چہرے کی طرف
دیکھے بغیر روکھے پن اور سختی سے اتنا کہہ دینا چاہئے کہ "مجھ کو تم سے ایسی امید
نہ تھی" اس نے اولگا کو کیا سمجھ کر اس قدر گستاخی سے گفتگو کی تھی، لیکن کیا
یہ واقعی گستاخی تھی! اُس نے اپنے دل سے پوچھا، "اگر اس کے جذبات
میں اصلیت تھی تو پھر ان کو ظاہر کر کے اُس نے کون سا قصور کیا، . . . .
لیکن بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے! ابھی تو میری اور اس کی اچھی طرح شناسائی
بھی نہیں ہوئی، وہ میری طبیعت سے اچھی طرح واقف بھی نہیں ہے، کوئی مرد
کسی عورت کو صرف تین چار بار کی ملاقات کے بعد ایسی بات نہیں کہہ سکتا،
اور نہ کوئی اس قدر جلد محبت میں گرفتار ہو سکتا ہے، اس طرح کی باتیں صرف
ابلوماف سے ہی ممکن ہیں" لیکن اب اُسے یاد آیا کہ اُس نے پڑھا تھا کہ کبھی کبھی
محبت اپنا اثر جلد دکھاتی ہے، "وہ جذبہ سے مغلوب ہو گیا تھا، جذبات کی
ایک رو اُسے اچانک بہا لے گئی، اب وہ میرے نزدیک آنے سے ڈرتا ہے
اور نادم معلوم ہوتا ہے، لہذا یہ اس کی گستاخی نہ تھی، پھر یہ قصور کس کا ہے؟"

وہ حیران تھی، اس نے سوچا کہ بے شک سارا قصور اسٹولٹز کا تھا۔ کیونکہ اسی نے اولگا کو گانے پر آمادہ کیا تھا، لیکن ابلوماف تو پہلے سننا نہیں چاہتا تھا، وہ آزردہ ہو گئی تھی اور اس نے اس بات کی کوشش ۔ ۔ ۔ ارشدت غیرت سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا، ہاں اُس نے حتی الامکان کوشش کی کہ اس کے جذبات کو بیدار کر دے، اسٹولٹز نے اُس سے کہا تھا کہ ابلوماف دنیا کی ساری چیزوں سے بیزار ہو گیا ہے، وہ کسی چیز میں بھی دلچسپی نہیں لیتا ہے اور اس کے اندر سارے حسیات مردہ ہو چکے ہیں، اس لئے اولگا نے آزمانا چاہا کہ واقعی ایسا ہے یا نہیں اور اس نے ایسا گایا کہ اس سے قبل کبھی نہیں گایا تھا"!

"آہ، یہ میرا قصور تھا، مجھے اس سے معافی مانگنی چاہیئے ۔ ۔ ۔ لیکن کس لئے ؟" اُس نے دل سے سوال کیا "میں اس سے کیا کہوں گی، مسٹر ابلوماف، قصوروار میں ہوں، میں ہی نے تمہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی، کس قدر ذلت کی بات ہے، نہیں نہیں یہ جھوٹ ہے" وہ چیخی اور غصے سے زمین پر پیر ٹپکنے لگی "کس کی اتنی ہمت ہے کہ یہ گمان کر سکے ۔ ۔ ۔ بھلا مجھے کیا خبر تھی کہ وہ اس طرح متاثر ہو جائے گا، اگر ایسا نہ ہوتا، اگر اس کے منہ سے ایسی بات نہ نکلتی تو کیا ہوتا، میں نہیں کہہ سکتی" اس نے سوچا، اسی شام سے اس کے دل میں عجیب قسم کے جذبات پیدا ہو رہے تھے، اُسے بے حد صدمہ پہنچا تھا، اُسے حرارت سی معلوم ہوتی تھی اور اس کا گال تمتمایا ہوا تھا، ۔ ۔ ۔ اعصابی ہیجان ۔ ۔ ۔ خفیف حرارت" ڈاکٹر کی یہی تشخیص تھی، "یہ سب ابلوماف کا کیا ہوا ہے، آہ! میں اُسے ضرور سبق سکھاؤں گی تاکہ پھر ایسی حرکت کا اعادہ نہ ہو، میں خالہ جان سے کہہ دوں گی کہ وہ اُسے اپنے گھر نہ آنے دیں، اُسے اپنی حقیقت کو بھولنا نہیں چاہیئے اُس نے جرأت کیسے کی" ان خیالات میں ڈوبی ہوئی، وہ پارک میں معروفِ خرام تھی، غیظ و غضب میں اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

یکایک اُس نے کسی کی آہٹ سنی۔

"کوئی آ رہا ہے" ابلوماف نے سوچا

دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے۔

"اولگا سرجیونا!" ابلوماف نے کہا، اس کا بدن پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔

"ابلوماف!" اولگا نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا،

دونوں ٹھٹک گئے

"خیر الصباح" ابلوماف نے کہا

"خیر الصباح" اولگا نے جواب دیا

"تم کہاں جا رہی ہو؟" اُس نے پوچھا

"کسی خاص جگہ نہیں" اُس نے اپنا سر اٹھائے بغیر جواب دیا

"میری وجہ سے تمہیں خلل تو نہیں ہوا؟"

"نہیں، مطلق نہیں" اولگا نے اپنی متجسسانہ نگاہوں سے بسرعت دیکھ کر جواب دیا

"تو کیا میں تمہارے ساتھ چل سکتا ہوں؟" اُس نے اچانک اولگا پر ایک مستفسرانہ نگاہ ڈال کر پوچھا

دونوں ایک روش پر خاموشی کے ساتھ ٹہلتے رہے، جس شدت کے ساتھ آج ابلوماف کا دل دھڑک رہا تھا اُستاد کے ڈنڈے کے ڈر سے بھی نہیں دھڑکا تھا، وہ کچھ کہنا چاہتا تھا، اور اُس نے بولنے کی انتہائی کوشش کی، لیکن زبان حرکت نہ کرتی تھی، صرف اُس کا دل خوفناک طریقے پر دھڑک رہا تھا، گویا اُس پر کوئی مصیبت آنے والی ہے۔

"اسٹولٹز کے یہاں سے کوئی خط آیا ہے؟" آخر اولگا نے دریافت کیا۔

"ہاں ایک خط آیا ہے"

"کیا لکھا ہے؟"

"اُس نے مجھے پیرس بلایا ہے"

"تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟"

"میں جاؤں گا"

"کب؟"

"کچھ دنوں بعد ۔ ۔ ۔ نہیں، کل ۔ ۔ ۔ جس قدر جلد میں تیار ہو سکوں گا"

"اس قدر جلد کیوں؟" اس نے پوچھا

ابلوماف نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"کیا تمہیں اپنا مکان پسند نہیں ہے! ۔ ۔ ۔ بتاؤ، تم کیوں جانا چاہتے ہو؟"

"ڈھٹائی تو دیکھو کہ یہاں سے جانا چاہتا ہے" اس نے دل میں سوچا

"کسی چیز نے مجھے مکدر اور بدحال بنا رکھا ہے جس کی وجہ سے میں نہایت اذیت میں مبتلا ہوں" اُس نے دبی آواز میں اولگا کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ وہ

چپ تھی، پھر اُس نے لیلاخ کے پھولوں کا ایک گچھا اٹھا کر اُسے سونگھنے کے بہانے اپنا چہرہ ڈھک لیا۔

"ان کی بو کتنی بھینی بھینی ہے، ہے نا؟" اُس نے اپنی ناک ہی ڈھک کر پوچھا۔

"یہاں ہماری کے نیلوفر بھی ہیں، ٹھہرو، میں چند پھول تمہیں چن کر دیتا ہوں" گھاس کی طرف جھکتے ہوئے اُس نے کہا "ان کی بو زیادہ خوشگوار ہے، ان میں فطرت زیادہ نمایاں ہے، لیلاخ کے پودے ہمیشہ مکانوں کے قریب اُگتے ہیں اور اُن کی شاخیں کھڑکیوں کے اندر گھس جاتی ہیں، ان کی بو بھی بہت تیز ہے، ذرا ان نیلوفر کے پھولوں کو دیکھو، شبنم سے اب تک نم ہیں"

اُس نے چند پھول اولگا کے ہاتھوں میں دے دئے

"کیا تمہیں پسند ہے؟" اُس نے پوچھا

"نہیں، اس کی بو بھی بہت کڑی ہے، مجھے نہ گلاب پسند ہے نہ کیا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ پھولوں سے مجھے زیادہ شوق نہیں، باغوں میں خیر ایسے بُرے نہیں، لیکن مکان کے اندر تکلیف کا باعث ہوتے ہیں... پھولوں کی کثرت تمام گندگی ..."

"تمہیں اپنے کمروں کی صفائی زیادہ عزیز ہے؟" اُس نے شرارت سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا "تم سے گندگی برداشت نہیں ہوتی؟"

"نہیں، میرا ملازم ایسا ..." وہ بڑبڑایا اور دل ہی دل میں اُس نے جملہ کو پورا کیا "بدمعاش ہے"

"تم سیدھے پیرس جاؤ گے؟" اولگا نے دریافت کیا

"ہاں، اسٹولٹس کئی دن سے میرا انتظار کر رہا ہے"

"تم اس سے ایک خط لے لینا، میں اس کو ایک خط لکھنا چاہتی ہوں"

"تو آج ہی دے دو۔ کل میں شہر کو چلا جاؤں گا۔"

"کل ہی؟" اُس نے پوچھا "اس قدر جلد کیوں۔ یہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی تمہیں نکال رہا ہے"

"ہاں"

"کون؟"

"ندامت ..." اُس نے دبی آواز سے کہا۔

"ندامت" اولگا نے بے اختیاری طور پر دُہرایا، وہ سوچنے لگی "اب میں اُس سے کہوں گی کہ مسٹر ابلوماف مجھے یہ توقع نہ تھی ..."

"ہاں اولگا سرجیونا" آخر اُس نے دل کڑا کر کے کہا "میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں تعجب ہوا ہوگا ... بلکہ غصہ ..."

اب وقت آگیا ہے ... بس یہی سوچ رہی ہے ... ہائیں کا دل دھڑکنے لگا "اُف میں نہیں کہہ سکتی"

ابلوماف نے جھک کر اس کے چہرے کا جائزہ لینا چاہا کہ ان باتوں کا اس پر کیا اثر ہوا ہے، لیکن وہ لیلاخ اور نیلوفر کے پھولوں کو سونگھ رہی تھی اور خود بھی حیران تھی کہ وہ کس طرح شائستہ ہے اور اُسے کیا کہنا اور کرنا چاہئے، "آہ! میں کس قدر بیوقوف ہوں، میں کسی معاملہ میں صحیح فیصلہ نہیں کر سکتی" اُس نے مایوس ہو کر سوچا

"تم بالکل ہی بھول گئی تھیں ..." اُس نے کہا

"یقین مانو کہ میں بالکل بے بس تھا، مجھے اپنی زبان پر قابو نہ رہا اور بے اختیاری کے عالم میں وہ الفاظ میرے منہ سے نکل گئے ..."

اُس کی ہمت بتدریج بڑھتی جا رہی تھی "اگر آسمان سے بجلی گر پڑتی اور میرے قدموں تلے کی زمین پھٹ پڑتی تو بھی میں کچھ بغیر نہ رہتا، کوئی قوت بھی مجھے ایسا کرنے سے باز نہیں رکھ سکتی تھی، خدا کے لئے یہ خیال نہ کرنا کہ میں نے قصداً ... ایک منٹ کے بعد بڑی سے بڑی قیمت ادا کر کے بھی اپنے الفاظ واپس لینے کو تیار رہتا"

وہ اپنا سر جھکائے پھولوں کو سرگشتی چل رہی تھی۔

"اُسے بھول جاؤ" اُس نے اپنے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا "اُسے بھول جاؤ خصوصاً جبکہ اس میں صداقت نہ تھی ..."

"صداقت نہ تھی؟" دفعتہً پھولوں کو ہاتھ سے گرا کر اور سر اٹھا کر اُس نے سوال کیا۔

اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں، اور ان میں حیرت و تعجب کی ایک چمک پیدا ہو گئی تھی،

"صداقت کیوں نہ تھی؟" اُس نے اپنا سوال پھر دُہرایا۔

"ہاں، خدا کے لئے تم اسے بھول جاؤ اور خدا را میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں ایک لمحے کے لئے از خود رفتہ ہو گیا تھا، تمہارا گانے کی وجہ سے ..."

"صرف گانے کی وجہ سے؟"

اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا تھا، اس کے گالوں کی سرخی دور ہو گئی تھی اور آنکھوں کی چمک بھی جاتی رہی تھی،

"تو سب ختم ہو گیا!" اُس نے اپنے الفاظ واپس لے لئے، اب خفگی کے اظہار کا کوئی موقع نہ رہا، معلوم ہوتا ہے مجھے کوئی پریشانی کی کوئی وجہ نہیں

ہے پہلے کی طرح ہم پھر آپس میں گفتگو اور ہنسی مذاق کر سکتے ہیں" وہ سوچ رہا تھا چلتے چلتے اس نے ایک شاخ کو پکڑ کر کھینچا اور اُسے توڑ کر ایک پتہ کو دانت سے کاٹنے لگی، دفعتہً اُس نے شاخ اور پتہ دونوں کو روش پر پھینک دیا

"تم خفا تو نہیں ہو گئیں؟ تم نے بھلا دیا ہے؟" ابلوماف نے اس کی پشت کی طرف سے جھک کر پوچھا۔

"لیکن یہ کیا؟ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو" اُس نے لرزتے ہوئے جواب دیا، بلکہ وہ جز بز ہو کر اس کی طرف سے ہٹی جا رہی تھی۔ "میں نے سب کچھ بھلا دیا ہے۔ . . . اب مجھے کچھ یاد نہیں رہا"

ابلوماف چپ ہو رہا، وہ نہیں جانتا تھا کہ کیا کرے، اُس نے اولگا کو دفعتہً آزردہ ہوتے دیکھا، لیکن اس کی وجہ معلوم کرنے سے قاصر تھا۔

"خدایا" اولگا نے سوچا "اب تلافی ہو گئی، وہ منظر ہی محو ہو گیا، خدایا تیرا شکر . . . پھر یہ کیا، اب اس کا کیا مطلب ہے؟"

"اب میں گھر جاتی ہوں" اُس نے دفعتہً کہا اور اپنی رفتار کو تیز کر کے ایک دوسری روش پر مڑ گئی۔

اس کے گلے پر ایک بار تھا، اور اُسے خوف تھا کہ وہ رو پڑے گی۔

"وہ راستہ اچھا نہیں ہے، یہ زیادہ قریب ہے" ابلوماف نے کہا، وہ مایوسی سے سوچنے لگا "احمق، اس عذر معذرت کا کیا فائدہ ہوا، اب وہ اور بھی بیزار ہو گئی۔ مجھے اس واقعے کی یاد نہیں دلانا چاہئے تھی خود آئی گئی بات ہو جاتی، اب سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں رہا کہ میں اُس سے معافی مانگوں"

"میں سمجھتی ہوں کہ میرے کبیدہ خاطر ہونے کی وجہ یہ ہے" وہ سوچ رہی تھی "کہ مجھے یہ کہنے کا موقع نہ ملا کہ مسٹر ابلوماف میرا ہرگز یہ خیال نہ تھا کہ تم اتنی جرأت . . . وہ میرے عندیہ کو پہلے ہی تاڑ گیا تھا، ہو نہ ہو صداقت نہ تھی، تو وہ جھوٹ بھی بول رہا تھا، کیسے جرأت ہوئی اُس کی!"

"کیا یہ سچ ہے کہ تم نے بھلا دیا ہے؟" ابلوماف نے آہستہ سے پوچھا۔

"ہاں، سب کچھ" اُس نے گھر جانے کی جلدی میں جواب دیا۔

"اچھا تو یہ دکھانے کے لئے کہ تم مجھ سے رنجیدہ نہیں ہو اپنا ہاتھ مجھے دو"

ابلوماف کی طرف نگاہ کئے بغیر اولگا نے اپنی انگلیوں کو بڑھا دیا لیکن جیسے ہی اُس نے انہیں چھوا اولگا نے کھینچ لیا۔

"نہیں، تم ابھی تک رنجیدہ ہو" اُس نے سرد آہ کے ساتھ کہا "آہ! تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ یہ ایک لغزش تھی، میں ہرگز جرأت نہیں کر سکتا تھا . . . نہیں، بس، اب میں پھر کبھی تمہارا گانا نہیں سنوں گا . . ."

"مجھے یقین دلانے کی تمہیں ضرورت نہیں، اور نہ مجھ کو تمہاری معذرت کی خواہش ہے" اُس نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا "میں کسی صورت سے بھی نہیں گاؤں گی"

"بہت اچھا، میں کچھ نہ کہوں گا، خدا کے لئے مجھ سے اس طرح علیحدہ نہ ہو ورنہ میرے دل پر ایک بار معلوم ہو گا"

وہ آہستہ آہستہ اس کی باتوں کو غور سے سنتی ہوئی چل رہی تھی۔

"اگر یہ سچ ہے کہ تمہارے گانے کے بعد اگر میں نہ روتا تو تم بھی نہ روتیں تو اس مرتبہ میں . . . اگر تم بغیر مسکرا دئے، بغیر اپنا ہاتھ میری طرف دوستانہ طور پر بڑھائے چلی جاؤ گی تو . . . مجھ پر رحم کرو، اولگا سرجیونا، میری طبیعت بگڑ جائے گی، میرے گھٹنے کانپ رہے ہیں۔ میں بمشکل کھڑا ہو سکتا ہوں . . ."

"کیوں؟" اولگا نے دفعتہً اُس کی طرف دیکھ کر پوچھا

"مجھے خود نہیں معلوم" اُس نے کہا "اب ندامت کا احساس مجھ سے جاتا رہا، میں اپنے الفاظ پر نادم نہیں ہوں . . . میں سمجھتا ہوں کہ وہ . . ."

اُس نے اپنے دل کے اندر پھر ایک کپکپی محسوس کی، پھر وہاں ایک بار معلوم ہوا، اور اولگا کی مہربان اور متجسسانہ نگاہیں پھر اُسے تڑپانے لگیں، وہ کس ادا کے ساتھ اس کی طرف مخاطب ہو کر اس کے جواب کا بے صبری سے انتظار کر رہی تھی۔

"وہ . . . کیا؟" اس نے بے چینی سے دریافت کیا

"نہیں، مجھے کہتے ڈر معلوم ہوتا ہے، تم پھر مجھ سے خفا ہو جاؤ گی"

"بولو" اُس نے آمرانہ لہجے میں کہا

وہ چُپ تھا

"بولو"

"اس وقت تمہیں دیکھ کر میرے دل میں آنسو بہانے کی بے اختیار

خواہش پیدا ہو رہی ہے، ۔ ۔ ۔ تم دیکھتی ہو کہ مجھ میں غرور نہیں، میں اپنے جذبات سے نادم نہیں ہوں ۔ ۔ ۔"

"لیکن آنسو بہانے کا سبب؟" اُس نے نرمی سے پوچھا، گال پھر تمتا گئے تھے۔

"تمہاری آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے، ۔ ۔ ۔ میں پھر محسوس کرتا ہوں کہ ۔ ۔ ۔"

"کیا؟" اُس نے پوچھا، اب اس کے گلے پر بار نہ تھا، اور وہ سراپا انتظار بنی ہوئی تھی،

دونوں اولگا کے مکان تک پہنچ گئے۔

"میں محسوس کرتا ہوں کہ ۔ ۔ ۔" ابلوماف اپنی بات جلد ختم کر دینا چاہتا تھا، لیکن وہ اتنا کہہ کر رک گیا۔

وہ آہستہ آہستہ زینے پر چڑھ رہی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُسے چڑھنے میں تکلیف ہو رہی ہے۔

"وہی نغمہ ۔ ۔ ۔ وہی ۔ ۔ ۔ جذبہ ۔ ۔ ۔ وہی احساس ۔ ۔ ۔ مجھے معاف کر دو، مجھے معاف کر دو، مجھے معاف کر دو، میں سچ کہتا ہوں کہ میں بالکل مجبور ہوں ۔ ۔ ۔"

"مسٹر ابلوماف" اولگا نے سخت لہجے میں کہنا شروع کیا، لیکن یکایک اس کا چہرہ ایک تبسم سے منور ہو گیا، "میں رنجیدہ نہیں ہوں۔ میں تمہیں معاف کرتی ہوں۔" اُس نے نرمی سے کہا "ہاں صرف آئندہ ۔ ۔ ۔"

اپنا رُخ سامنے کئے بغیر اولگا نے ایک ہاتھ ابلوماف کی طرف بڑھا دیا، اُس نے تھام کر ہتھیلی کا بوسہ لے لیا، اولگا نے بھی آہستہ سے اپنی ہتھیلی کو اس کے لبوں پر دبا دیا اور فوراً شیشے کے دروازے کے پیچھے غائب ہو گئی اور ابلوماف مورت کی طرح جہاں کا تہاں کھڑا رہ گیا۔

سید حسن ایم اے

قطعات

سب تیری جفائیں ہیں گوارا مجھ کو
کافی ہے وفاؤں کا سہارا مجھ کو
آخر تو گزر جائے کا دورِ نکبت
جینے دو کوئی روز خدارا مجھ کو

ناکام ہے ہر سعی الٰہی توبہ
یہ میری امیدوں کی تباہی توبہ
دنیا میں قیامت بھی کبھی آئے گی!!
ملتی ہے سزائے بے گناہی توبہ

ضیا
فتح آبادی ایم اے

بزمِ فطرت

(جنگل میں ایک شام)

مہرِ روشن چھپ گیا ضَو ماند پڑ جانے لگی ۔۔۔ پھر شفق کی ساحرہ نیرنگ دکھلانے لگی
طائروں کے زمزموں سے گونج اٹھے دشت و جبل ۔۔۔ اک سیہ بدلی سی ہر سُو گیت برسانے لگی
پھر گئی جلووں پہ اک مدہم سی تاریکی کی رَو ۔۔۔ اور فضا میں زلف سی ظلمت کی لہرانے لگی
اک سہانا نشہ سا ہر چار سُو چھانے لگا ۔۔۔ خامُشی کو جاگ اور شورش کو نیند آنے لگی
نغمۂ عشق آفریں چھیڑا کسی دہقان نے ۔۔۔ دُور سے بنسی کی وجد آور صدا آنے لگی
تیرگی بڑھنے لگی گہرا دھندلکا چھا گیا ۔۔۔ اک سیہ چادر تلے ہر شے سمٹ جانے لگی
جوئباروں سے ترنم کی صدا اُٹھنے لگی ۔۔۔ دشت کی ہر چیز کالِ وجد میں آنے لگی

آہ یہ خلوت پہ جنگل کی فضائے عشق زا ۔۔۔ قلبِ محزوں کو کسی کی یاد تڑپانے لگی
چشمِ دل کو منظرِ فطرت ہوا خارِ مغیل ۔۔۔ آہ تنہائی میں اب تو رُوح گھبرانے لگی

تاجورؔ اٹھو خدا کے واسطے اب گھر چلو
بزمِ فطرت پر بھیانک خامُشی چھانے لگی

تاجور سامری

وکٹر ہیوگو کی محبت

یہ داستان وکٹر ہیوگو کی سیاسی سرگرمیوں، اس کی کامیابیوں اور ناکامیوں اور اس کے ادبی کارناموں سے کچھ تعلق نہیں رکھتی، دنیائے ادب میں جو افسانوی شاہکار اس نے باقی چھوڑے ہیں نہ صرف فرانس بلکہ ساری دنیا ان پر فخر کر رہی ہے، اس نے وطن کی آزادی کے لئے ایک سرگرم جماعت تیار کی اور اس جماعت میں روح پھونک دی اور روح پھونک کر حیاتِ جاوداں بخش دی، لیکن یہ داستان جو ہم آپ کو سنانے والے ہیں ان سرگرمیوں سے بالکل الگ ہے، یہ محبت کا رومان ہے جو اس کی زندگی کا اہم ترین اور رنگین واقعہ ہے، یہ وہ درد بھرا افسانہ ہے جس کے اختتام پر اس کی شگفتہ زندگی کا تابناک دور ختم ہوا اور اس کی ادبی اور سیاسی زندگی کا المناک سلسلہ شروع ہوا۔

جب وکٹر ہیوگو سیاسیات کے چکر میں پھنسا تو قدرتاً اس کے مزاج میں فرق آگیا، وہ حد درجہ خود پسند، ہرجائی اور بگڑا سا ہو گیا۔ لیکن جب وہ ایڈل فوشر سے محبت کی پینگیں بڑھا رہا تھا تو بالکل ایک بچے کی طرح تھا، ایک جواں سال شاعر جس کی رگ رگ میں بچپن کی پاکیزگی دوڑ رہی ہو، وہ مایوسی اور دنیا کی تنگ ظرفیوں سے بالکل بے بہرہ تھا، ابھی تک اس کے ملوِ تخیل نے اس سے خراج نہیں لیا تھا، ابھی تک اس کی غیرفانی مستبد او کی کرنیں پردہ سحر کو چاک کرنے نہ پائی تھیں، وہ ابھی تک ناوانستہ طور پر ایک تخیل پرست انسان تھا جو حسن و محبت کی وادی میں اپنے آرٹ کی پرورش کے لئے سرگرداں تھا اور جہاد کرتے ہوئے یہ ثابت کر دینا چاہتا تھا کہ اس کی زندگی محض محبت کے لئے ہی معرضِ وجود میں آئی تھی،

انسانی جذبہ جہاں دنیا بھر کے شاعروں کے لئے اہم ترین موضوع بنا رہا ہے۔ وہاں یہ الہام ربانی کا صحیح ترین سرچشمہ بھی ہے اور انسانی آبادی میں صرف شاعر اور مطرب اس جذبے کی تصویر دوسروں کے سامنے پیش کر سکتے ہیں کیونکہ وہ محبت کی زبان سمجھتے ہیں، شاعر کی محبت دراصل شاعر کا خواب ہوتا ہے جس کے ساتھ متعدد دلکشیاں وابستہ ہوتی ہیں، معصوم فضا کی تازگی میں جو محبت وکٹر ہیوگو نے کی ــــــ وہ وکٹر ہیوگو جو دنیا کے بلند ترین شاعروں میں سے تھا اور سوائے شیکسپیئر کے ہم کسی کو اس سے بلند تصور نہیں کرتے ــــــ اس کی داستانِ عشق کس قدر دلآویز ہوگی۔

ایڈل فوشر ہی ایک ایسی لڑکی تھی جو وکٹر ہیوگو کے تخیل پر چھا سکتی تھی، نہ صرف یہ کہ وہ حسین تھی بلکہ اس میں ایک پنہاں جاذبیت بھی تھی جو جذبات میں ہیجان اور تخیل کو تحریک دیتی رہتی تھی، ایک طویل اخلاص بھرے معاشقے کے باوجود وکٹر کو ہمیشہ یہ کھٹکا سا کہ کہیں ایڈل اس کو چھوڑ نہ دے، وہ اپنی رگ رگ میں قوت اور زندگی پیدا کرتا رہا تاکہ وہ ایڈل کی پرستش کے قابل ہو سکے، ایڈل ہمیشہ اس کی آغوش سے دور رہی اور قدرے بے اعتنائی سے کام لیتی رہی، اور اسی قسم کی جاذبیتوں کی وجہ سے عورت زمانے کی دست برد سے بچی رہتی ہے اور یہ ایک ایسا حسن تھا جس کے لئے وکٹر عمر بھر گیت گاتا رہا، مردوں میں شکار کرنے کا فطری خاصہ ہے اور اگر شکار آسان ہو تو خواہ وہ عورت ہی کیوں نہ ہو، وہ اس سے نفرت کرتا ہے۔

ایڈل اور وکٹر گہوارے میں بھی ایک دوسرے کے ساتھی تھے کیونکہ ان کے والدین کی آپس میں بہت محبت تھی اور بے تکلفی سے ملنے چلے آتے تھے، بوڑھے اپنی گزشتہ زندگیوں کے متعلق گفتگو کر رہے ہوتے تو اس وقت وہ ننھے منے، بچے معصومانہ جذبات کو لئے ہوئے دوش بدوش مسرت بھری فضا میں کھیل کود رہے ہوتے، چونکہ ان کی عمروں میں صرف ایک سال کا تفاوت تھا، اس لئے وہ ہر جگہ اور ہر وقت اکٹھے رہ سکتے تھے۔

وہ صرف ساتھی ہی نہ تھے، وکٹر بچپن سے ہی خواب و خیال کی دنیا میں گم رہتا تھا، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایڈل اس کے خواب

کا احساس سب کچھ ایڈل میں پا لیا تھا، وہ دونوں اپنے سینوں میں
رومانیت سے لبریز زندگی کو لئے ہوئے قدیم ترین صحن چمن کی فضا میں
بیجاؤں کی نکہت کی طرح آوارہ رہتے تھے۔
وکٹر اسی نوخیزی کے عالم میں لکھا کرتا تھا۔
"ایڈل کی آنکھیں بڑی بڑی اور رنگیلی تھیں۔ گیسو دراز لٹیں، چہرے
کی چمک اور تاباں رنگت، لبیں، ہونٹ اور رخسار گلابی سے تھے!
پھر لکھتا ہے۔ ہماری مائیں کو سنے پہچاننے کے لئے ہمیں باہر
بھیجا کرتیں لیکن ہم سیر کو ترجیح دیتے۔ ہمیں کہا جاتا کہ ہم دوسرے بچوں کی
طرح کھیلیں لیکن ہم باتوں میں وقت بسر کرتے، ہم ایک ہی عمر کے بچے
تھے گو ہم جنس نہ تھے۔ اس پر بھی . . . ہم اپنی طاقت کے تجربات
کر لیا کرتے تھے، ایک دفعہ میں نے اس کے ہاتھ سے ایک پلاسیب چھین
لیا تھا، اور دوسری دفعہ میں نے اُسے تھپڑ رسید کیا کیونکہ وہ مجھے اپنے
کا گھونسلہ نہیں دیتی تھی . . .
"ایک وقت وہ بھی آیا کہ وہ میرے بازو پر دُہری ہو کر چلتی اور
میں مغرور تھا اور مجھ میں تازہ کیفیتیں پیدا ہونے لگیں، ہم آہستہ آہستہ
چل رہے تھے اور اس کی نرم و نازک آواز میرے کانوں تک پہنچ رہی
تھی، اس نے اپنا رومال گرا دیا تو میں نے اٹھایا، ہمارے ہاتھ ایک
دوسرے سے چھو کر کانپ گئے، وہ ننھے ننھے پرندوں، ستاروں،
درختوں کے عقب میں شفق کی سرخی، بجلیوں، فراک اور فیتوں کے
متعلق گفتگو کرنے لگی، نہایت معصومانہ لہجے میں ہم بالکل معمولی چیزوں پر
بحث کرنے لگے اور لطف یہ کہ ہم دونوں کے چہروں پر حیا کی سرخی
دوڑنے لگی، کیونکہ ایڈل اب جوانی کے قریب تر پہنچ چکی تھی"۔
ایک عرصے تک یہ معصوم محبت نہایت اطمینان اور مسرت کی وادی
میں کھیلتی رہی، لیکن ۱۹۱۸ء میں جبکہ وکٹر ہیوگو سولہ برس کا اور ایڈل پندرہ
کی تھی، ہیوگو خاندان میں کشیدگی پیدا ہوئی، جنرل ہیوگو اور اس کی بیوی ایک
سیاسی تنازعہ کی بنا پر ایک دوسرے سے الگ ہو گئے، مادام ہیوگو ساتھ
رہتی تھی۔ بوربن جماعت کا جنرل ہیوگو چونکہ گورنمنٹ سے پنشن پا رہا تھا۔
اس لئے یہ کبھی بھی برداشت نہ کر سکتا تھا۔
مادام ہیوگو (وکٹر کی ماں) نے اپنے خاوند سے قطع تعلق کر لیا اور
اپنے دونوں بچوں کے ساتھ ایک معمولی سا مکان کرائے پر لے کر رہنے سہنے
لگی، لیکن وہ مادام فوشر (والدہ ایڈل) کو نہ بھول سکی اور ہر شام اپنے دونوں
لڑکوں کو ساتھ لے کر اس کے مکان پر جاتی۔
یوجین (وکٹر کا بڑا بھائی) اس قسم کے میل ملاپ کو پسندیدہ نگاہ
سے نہ دیکھتا تھا، لیکن وکٹر کے لئے وہ سنہری لمحے ہوتے تھے، اس
کی نگاہیں ایڈل پر جمی ہوتی تھیں، وہ نگاہیں اتنی دیر تک اس کے چہرے
پر پیوست رہتیں کہ بے چاری ایڈل شادماں بھی ہوتی لیکن ساتھ ہی گھبرا
بھی جاتی، وہ جاننا چاہتی تھی کہ ان نگاہوں کے کیا معنی ہو سکتے ہیں لیکن
وکٹر بہت شرمیلا تھا، اتنا شرمیلا کہ اسے خود بھی معلوم نہ تھا کہ ان نگاہوں
کا کیا مطلب ہو سکتا ہے، صرف ایک دھندلا سا احساس پیدا ہوا کہ اس
کی زندگی میں ایک انقلاب سا برپا ہو رہا ہے اور بس۔
اب خاموش پوجا کی منزل طے ہو چکی تھی،
ایڈل بھی جرات کے ساتھ اس کی گھورنے والی آنکھوں کا مقابلہ
کرتی تھی جس سے اس کی نگاہوں میں ایک پنہاں سی روشنی نمودار ہوتی اور
شاعر کا سینہ مسرت سے لبریز ہو جاتا، محبت کا سوز اب وہ زیادہ دیر
تک برداشت نہ کر سکتے تھے، چنانچہ ایڈل نے ایک دن اسے تنہا ملنے کا
اہتمام کیا۔
یہ ۲۶ اپریل ۱۹۱۹ء کا دن تھا۔
ایڈل نے نرم و نازک آواز میں کہا "وکٹر! مجھے یہ معلوم ہے کہ
ایک بہت بڑا راز تمہارے سینے میں پوشیدہ ہے۔ اگر وہ تم مجھے بتا دو
تو میں بھی تمہیں ایک راز بتاؤں گی"۔
وکٹر نے بلا تکلف کہہ دیا "میں تم سے محبت کرتا ہوں!" حسین
ایڈل نے جواب دیا "میں بھی تم سے محبت کرتی ہوں"!
ان دو مختصر فقرات سے ان کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا
محبت کا دیوتا ان پر سادگی اور معصومی کے پھول برسا رہا تھا، انہوں نے
پیمانِ زندگی باندھا جسے وہ محبت کہنے لگے لیکن ان کا خیال تھا کہ ان کے
والدین اسے معصومانہ حماقت سے زیادہ وقعت نہ دیں گے۔ چنانچہ اسی لئے
انہوں نے اس راز کو اپنے سینوں تک ہی محدود رکھا، آنے والا کل ان
کی شیریں زندگی پر اثر انداز نہ ہو سکتا تھا، نگاہیں، ہاتھ کا دبانا، بوس و کنار،
خفیہ ملاقاتیں، ان کو رومانی زندگی میں لئے پھر رہی تھیں، آہستہ آہستہ ان کے
سینوں میں محبت کا اہم ترین راز بیدار ہوا۔
موسم خزاں ختم ہوا تو حسبِ معمول فوشر خاندان کے لوگ واپس چلے
گئے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ شہر پیرس سے بہت دور نہ تھا لیکن وکٹر

کی والدہ کے لئے ہر روز وہاں جانا بالکل ناممکن تھا۔ ڈکٹر اکیلا وہاں جانا نہ چاہتا تھا کیونکہ اس طرح راز افشا ہونے کا خطرہ تھا چنانچہ وہ پیرس میں بالکل اکیلا رہ گیا، فراق کی روح فرسا گھڑیاں اس کے دل و دماغ پر چھا گئیں اور اُٹھتے بیٹھتے ہر وقت ایڈل اس کی آنکھوں کے سامنے رہنے لگی، کیا وہ بھی اسے یاد کرتی تھی! —— ڈکٹر کو اب معلوم ہوا کہ محبت بچوں کا کھیل نہ تھا جبکہ وہ لطیف جذبہ ایک ایسا شعلہ تھا جو بجھائے نہ بجھ سکتا تھا، اسے محبت کی عظمت کا احساس ہوا، موسم سرما کے ابتدا میں جب ایڈل لوٹ کر آئی تو ہیوگو اور ایڈل نادان بچے نہ رہے —— ایک عورت اور ایک مرد جو محبت کے عقدۂ لاینحل میں پھنس چکے تھے،

جب کبھی ایڈل کی والدہ باہر جاتی تو وہ دونوں باغ میں درختوں کے نیچے سرگرم گفتار ہوتے، یا جب کبھی ایڈل خرید و فروخت کے لئے بازار جاتی تو وہ دونوں گلیوں میں کھڑے ہو کر محبت کی لگائی ہوئی آگ کو ٹھنڈا کرتے لیکن ان کے لئے یہ کافی نہ تھا چنانچہ وہ ہر روز ایک دوسرے کو خط لکھنے لگے۔

ڈکٹر جس کو یہ یقین ہو چکا تھا کہ اس کی محبت ہمیشہ جواں رہے گی اور اپنی استقامت پر اسے پورا اعتماد تھا اس واقعے کو ایک بلند ترین رومان تصور کر رہا تھا، لیکن ایڈل محبت کو پوشیدہ رکھنے میں ایک توہین سی خیال کرنے لگی، اور ہر ایک بے لوث اور خوددار حسینہ اس احساس میں حق بجانب ہے۔ ایڈل کی خواہش تھی کہ وہ اپنی ماں کو اپنا ہمراز بنائے لیکن اسے جرأت نہ ہوتی تھی کیونکہ وہ انجام سے تو باخبر ہی تھی

ایک روز مادام فوشر نے ایڈل کے پاس شعروں کی ایک کتاب دیکھی جو ہیوگو نے اسے بھیجی تھی، ایڈل کی ماں اس سے بہت ناراض ہوئی اور اسے تنبیہ کی کہ وہ ایسے شخص سے جس سے وہ شادی نہیں کر سکتی کسی قسم کا تحفہ خواہ وہ تو جیسی کیوں نہ ہو قبول نہ کرے، کیونکہ ایسا کرنے سے وہ اپنا وقار کھو بیٹھے گی اور جہاں وقار باقی نہ رہے وہاں محبت بھی نہیں رہتی،

ایڈل گویا چونک اُٹھی، اسے محسوس ہونے لگا کہ واقعی وہ ڈکٹر کو جرأت دلا کر اپنے وقار کو صدمہ پہنچاتی رہی ہے، اس خیال سے اسے اس قدر تکلیف ہوئی کہ محبت کی فراوانی بھی اُسے تسکین نہ دے سکی، ڈکٹر ہیوگو نے ایک خط میں لکھا۔

"میں تمہیں کیا بتاؤں کہ میرے لئے تم کیا ہو! اگر میں یہ کہوں کہ میں تمہیں اپنی زندگی سے بھی بڑھ کر محبت کرتا ہوں تو یہ بالکل معمولی بات ہوگی

تم جانتی ہو کہ میں زندگی کو بالکل عزیز نہیں سمجھتا . . . . .

تم اس قسم کی باتیں مجھ سے کیوں کرتی ہو کہ میں تم سے نفرت کرتا ہوں یا تمہاری توقیر میرے دل میں نہیں، کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ میں تمہارے وقار کے احساس کے بغیر ہی تم سے محبت کرتا رہا ہوں، تم اندازہ نہیں کر سکتیں کہ تمہارے اس الزام نے مجھے کس قدر دکھ دیا ہے . . . کیا تم نہیں جانتیں کہ مجھے تم سے کتنی پاکیزہ اور بے لوث محبت ہے، میں تمہارا خاوند ہوں، کم از کم میں تو ایسا ہی خیال کرتا ہوں۔

"تم جانتی ہو کہ ایک خیال سے میری مسرت کی انتہا نہیں رہتی! ان تمام رکاوٹوں کے باوجود میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ ممکن ہے مجھے تمہارا خاوند بننے کی اجازت دے دی جائے خواہ ایک دن کے لئے کیوں نہ ہو۔ فرض کرو کہ میری اور تمہاری آج شادی ہو جائے اور دوسرے دن میں خودکشی کر لوں، اس طرح کم از کم ایک دن کے لئے تو میں اپنی مسرت کی انتہا دیکھ لوں گا، اس کے بعد تمہیں کوئی ملعون نہیں کر سکتا، لوگ یہی کہیں گے "یہ اس مرحوم کی بیوہ ہے" پیاری ایڈل! کیا ایسے ہو سکتا ہے۔ . . . صرف ایک دن کے لئے، ایک دن کی مسرت عمر بھر کے اندوہ و غم سے بہتر ہے!"

لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک دن کی مسرت بھی ان کے مقدر میں نہ تھی، محبت کا راستہ کبھی صاف نہیں ہوا کرتا چنانچہ ان معصوم روحوں پر مصیبتیں لوٹ پڑیں۔

جب سے ایڈل کی ماں کو اس کتاب کا قصہ معلوم ہوا تو وہ اپنی بیٹی کی حرکات کا نہایت غور سے مطالعہ کیا کرتی تھی، اس کے دل میں شکوک پیدا ہو گئے جو جلد ہی پایۂ یقین تک پہنچ گئے، اور اس نے ایڈل پر نہایت سختی سے سوالات کی بوچھاڑ کر دی، ایڈل خوفزدہ ہو گئی اور اس نے تمام باتوں کا اعتراف کر دیا، اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ اس کی ماں اس اعتراف پر غضبناک نہیں ہوئی بلکہ وہ نہایت ہمدردی اور پیار کے ساتھ تمام باتیں سنتی رہی اور آخر میں کہا۔

"بیٹی! میں اس معاملے پر غور کروں گی اور تمہارے باپ سے بھی مشورہ کروں گی۔"

ایڈل خوشی سے تمتما اٹھی، اس کے باپ نے بھی اس معاملے میں رضامندی کا اظہار کیا، وہ ڈکٹر کی خداداد قابلیت کی ہمیشہ تعریف کیا کرتا تھا اور اس کی سعادتمندی کی وجہ سے اسے بہت پسند کرتا تھا،

۲۶ اپریل ۱۸۲۱ء کو موسیو فوشر اپنی بیوی کو ساتھ لے کر مادام ہیوگو کے پاس گیا تاکہ اس رشتہ کی سلسلہ جنبانی شروع ہو جائے۔

مادام ہیوگو کے لئے یہ خبر بالکل نئی تھی اس لئے وہ حیران رہ گئی۔

"وکٹر محبت کر رہا ہے!"

اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی،

"وہ تو ابھی بچہ ہی ہے، ایسے وقت میں آپ لوگوں کو نہ آنا چاہیئے تھا"۔

اس کے بعد وہ دیر تک ہنستی رہی، اس کی ہنسی بالکل مایوس کن تھی کہ اس کا بچہ جو بالکل معصوم تھا کس طرح ایک لڑکی کو محبت کرنے لگا۔ مجھے تو کہہ دینا، دنیا بھر میں صرف اسی سے محبت کرتی ہوں میرے لئے سب کچھ وہی ہے لیکن وہ مجھے بھلا کر کس طرح ایک الہڑ لڑکی کے جال میں پھنس گیا، ماں کو بھی غم حاصل ہے کہ ایسے موقعوں پر رشک کو اپنے دل میں جگہ دے، وہ بے قرار ہو گئی اور فوشر خاندان کو برا بھلا کہنے لگی، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جنرل ہیوگو کا بیٹا فوشر خاندان کی لڑکی گھر میں لائے، اس کے علاوہ اس نے اور بہت سی باتیں کہیں جس پر موسیو فوشر بھی تیز ہو گیا کہ فوشر خاندان فرانسیسی معاشرت میں ہیوگو سے کسی صورت میں بھی کم نہیں ہے ہم تمغے ہمارے پاس موجود ہیں، ہماری فوجی خدمات تم لوگوں سے زیادہ ہیں، کافی عرصے تک یہ بک بک ہوتی رہی بالآخر یہ قرار پایا کہ دونوں خاندانوں کے تعلقات ہمیشہ کے لئے منقطع ہو جائیں۔

وکٹر کو بھی اس وقت بلا لیا گیا، وہ ماں کے سامنے ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا، سر جھکائے خاموش سنتا رہا لیکن جب ایڈل کے والدین چلے گئے تو وہ بے اختیار ہو کر اپنی ماں کی گود سے باہر بھاگ نکلا اور اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے زار زار رویا کہ اس کی آنکھوں میں کوئی آنسو باقی نہ رہا، اس کی ماں اسے بہت سمجھاتی رہی لیکن وکٹر کو محسوس ہو رہا تھا کہ ایڈل کو اب وہ کھو چکا ہے، اس کی ماں نے اس کی معصوم امیدوں کو خاک میں ملا دیا۔

اسے محبت کی فراوانی کا بھی آج ہی اندازہ ہوا، اس کے بغیر اب زندگی کیا رہے گی! تاریکی —— خوفناک تاریکی —— موت ——

ایک اٹھارہ سالہ معصوم نوجوان کے سینے میں دہشت انگیز مایوسی گھر کرنے لگی،

ایڈل بھی عجیب مصیبت میں مبتلا تھی کیونکہ اسے اصل گفتگو سے مطلع نہ کیا گیا، صرف اتنا کہا گیا کہ وہ وکٹر کا خیال دل سے نکال دے بلکہ نام بھی زبان پر کبھی نہ لائے کیونکہ وہ ایڈل کے بالکل قابل نہ تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اتنا کہہ دینے سے ایڈل اپنی محبت کو بھول جائے گی۔ چنانچہ انہوں نے ایڈل کے لئے کوئی رشتہ تلاش کرنے کی سلسلہ جنبانی شروع کر دی،

لیکن ایڈل وکٹر کو کیسے بھول سکتی تھی، اسے یقین نہ آتا تھا کہ وکٹر کبھی اس سے دغا کرے گا، وکٹر تو اس کا اپنا تھا وہ کیسے چھوڑ سکتا تھا، کئی ہفتے گزر گئے وکٹر کی طرف سے اسے کوئی خط نہ ملا، ایڈل کی ماں نے اس کے لئے بہت سی نئی دلچسپیوں کے سامان مہیا کئے، اسے خوش رکھنے کے لئے سو طرح کی تدبیریں کیں لیکن سب بے سود۔ ایڈل محسوس کر رہی تھی کہ اس سے ایک ایسی چیز چھن گئی ہے جو اس کی تمام مسرتوں کی بنیاد تھی، رقص، پارٹی، تھیئٹر اس کے لئے بالکل بے کیف سی چیزیں بن کر رہ گئیں، صرف تنہائی اسے تسکین دینے لگی کیونکہ وکٹر کی محبت کا تخیل وہ صرف تنہائی میں پا سکتی تھی، وکٹر کو اپنے دماغ سے وہ کیسے نکال سکتی تھی؟ اس کے جواب کے لئے وہ ہر روز خلوت میں اس کے گذشتہ خطوط پڑھا کرتی، اور اس کا آخری خط جس پر اس کے پورے دستخط تھے ایڈل کو رلا دینے کے لئے کافی تھا، فضا میں وہ الفاظ اس کی آنکھوں کے سامنے تھرا رہے تھے۔

"پیاری ایڈل! میرا یہ وعدہ اٹل ہے کہ میں سوائے تمہارے کسی اور کو اپنی بیوی نہ بناؤں گا۔ . . ہمیں دنیا اکٹھا نہ ہونے دے تو نہ سہی لیکن میں تمہارا ہوں اور ابد تک تمہارا —— وی ایم ہیوگو"

وفورِ محبت کی وجہ سے وہ دونوں امید کا دامن نہیں چھوڑ سکتے تھے، وکٹر جب پہلے صدمے سے ذرا سنبھلا تو اس نے ارادہ کر لیا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے روپیہ کما کر ایڈل کو جیتے گا، چنانچہ اس نے ادبی کاوشوں کی طرف مکمل توجہ دی، اس زمانے میں اس نے بے نظیر ادبی شاہکار پیدا کئے کیونکہ ان کے پس پردہ اسے ایڈل نظر آ رہی تھی جو اسی راستے سے اس کی ہو سکتی تھی، چنانچہ قسمت نے اسے ایک موقع دیا۔

موسیو فوشر نے ایک کتاب شائع کی جس میں فوجی بھرتی کے متعلق چند فنی باتیں تھیں اور چند ذاتی فوجی تجربات بھی تھے، ہیوگو نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اس نے فوراً اپنے رسالہ LeConservatexr Litteraire

میں ایک پورے صفحے کا تبصرہ لکھا گویا کہ وہ دنیائے ادب کا بہترین شاہکار تھا، اور اس رسالے کی ایک کاپی براہ راست موسیو فونشر کے پاس بھیجی۔ موسیو فونشر اس ریویو کو پڑھ کر جامے میں پھولا نہ سمایا لیکن کشیدگی کی بنا پر اس کا شکریہ ادا نہ کر سکتا تھا، اس کے باوجود اس کے دل میں وکٹر کی قدر و منزلت پیدا ہو گئی، وکٹر اس کی خاموشی سے مایوس نہ ہوا، چنانچہ جب شاہ فرانس کے ہاں بیٹا پیدا ہوا جس کی آرزو تمام ملک میں ہو رہی تھی وکٹر نے ایک قصیدہ لکھا اور پمفلٹ کی صورت میں شائع کر کے موسیو فونشر کے نام پر معنون کیا، محبت میں انسان کیا کچھ نہیں کرتا جواں سال شاعر کو خیال تھا کہ ممکن ہے یہ الفاظ اس کی محبوبہ ایڈل کی نظر سے گزریں اور اس طرح کشیدہ تعلقات از سر نو خوشگوار ہو جائیں

موسیو فونشر اب خاموش نہ رہ سکتا تھا وکٹر اس کی پبلک میں عزت افزائی کر رہا تھا اور اس وقت شکریہ ادا نہ کرنا بالکل غیر مناسب تھا۔ اس نے براہ راست تو وکٹر کو کچھ نہ لکھا البتہ مادام ہیوگو کو چند سطریں لکھیں۔

"میں وکٹر کا بہت ممنون ہوں کہ اس نے میری کتاب پر ایک نہایت حوصلہ افزا تبصرہ کیا اس کے بعد شہزادے کی پیدائش پر جو نظم لکھی اور میرے نام پر معنون کی اس کا بھی شکرگزار ہوں، میری بیوی بھی مرہون منت ہے۔ کیونکہ ہم دونوں اس نظم سے انتہائی لطف اندوز ہوئے۔"

اس کے بعد دونوں خاندانوں کے تعلقات خوشگوار ہونے لگے لیکن ایڈل اور وکٹر پر کڑی نگہداشت رہنے لگی اور انہیں والدین کی موجودگی میں بھی اکٹھے بیٹھنے کی اجازت نہ تھی، اس کے باوجود وکٹر اور ایڈل ایک دوسرے کو خط لکھتے رہے، لیکن وکٹر ملاقات کے لئے نہایت بے قرار تھا، ایک دن اسے معلوم ہوا کہ ایڈل مصوری سیکھنے لگی ہے۔ چنانچہ اس نے فوراً وہ اسکول معلوم کر لیا اور صبح دم اس کے راستے میں چھپ کر بیٹھ گیا، وہ دن وکٹر کو نہیں بھول سکا کیونکہ اس طویل فراق کے بعد جب وہ ایڈل سے ملا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ اسے اب تک نہ بھولی تھی، اس کی محبت ویسے ہی جوان تھی، وکٹر کو محسوس ہوا کہ اس کی زندگی کی روشن ترین شعاع اس کے نزدیک آگئی ہے اور اب پھر دنیا اس قابل ہو گئی ہے کہ وہ اس میں زندہ رہ سکے۔

اس طرح وہ خفیہ خفیہ ایک دوسرے سے ملتے رہے حسین دہشتوں اور رنگین بے قراریوں کے ساتھ ایک سال اور گزر گیا۔

۲۶ اپریل ۱۸۲۱ء کے دن وکٹر نے ایڈل کو لکھا

"پیاری ایڈل! کیا تمہیں یاد ہے کہ یہ دن ہماری سالگرہ کا دن ہے! میری زندگی کی ابتدا اسی دن سے ہوئی تھی، . . . اوہ! بتاؤ کہ تم بھی وہ دن ابھی تک نہیں بھولیں، میری مسرتوں اور حسرتوں کا آغاز اسی دن سے ہوتا ہے، میں اسی روز سے اپنے آپ کو زندہ تصور کرتا ہوں اور آج تک اسی دن کو ذہن میں رکھ کر سانس لے رہا ہوں . . . صرف تمہاری صورت میرے سامنے ہے؛ میری زندگی کی ابتدا اور انتہا تم ہی ہو . . . "

۲۷ جون کو مادام ہیوگو راہی ملک عدم ہوئی تو اب وکٹر کے لئے ایڈل کے سوا دنیا میں کوئی نہ تھا، وکٹر اپنی ماں سے بے حد محبت کرتا تھا، باوجودیکہ ایڈل کے معاملے میں وکٹر کو مصیبت میں ڈالنے کا وہی باعث ہوئی تھی لیکن پھر بھی وہ اس کی پرستش کرتا رہا، وکٹر کے لئے اس کی ماں ایڈل سے بھی بڑھ کر قابل احترام ہستی تھی، جب اوائل مئی میں وہ بیمار ہوئی تو وکٹر نے دنیا کے تمام کاروبار چھوڑ دیئے اور ماں کی خدمت میں ہمہ تن مصروف ہو گیا، یہاں تک کہ ایڈل کی طرف بھی متوجہ نہ ہو سکا، متواتر دو مہینے تک وہ بستر مرگ پر پڑی رہی اور اس دو مہینے میں وکٹر اس کی تیمارداری میں مصروف رہا، اس عرصے میں اس نے ایک دفعہ بھی ایڈل کو خط نہ لکھا، اتنی تیمارداری کے باوجود اس کی ماں زندہ نہ رہ سکی اور اپنے بیٹے کو اس دنیا میں تنہا چھوڑ کر چلی گئی۔

نوجوان وکٹر غم سے نڈھال ہو گیا، اس کو اپنی ماں کی صحیح قیمت کا اندازہ اس کی موت کے بعد ہوا، مدت ہوئی اس کا باپ انہیں چھوڑ چکا تھا اپنے بھائی کے متعلق اسے کچھ علم نہ تھا اور اب وہ بالکل بے خانماں سا ہو کر رہ گیا، وہ حیران تھا کہ وہ کدھر جائے؟ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ ایڈل نے بھی اسے چھوڑ دیا ہے۔

آہ! ماں کے چلے جانے سے وہ دنیا کو ویرانہ سمجھ رہا تھا۔

اس کی ماں کی تکفین کی تیاریاں ہو رہی تھیں وہ فرط غم سے گھبرایا ہوا باہر نکل گیا، وہ یہ منظر برداشت نہ کر سکتا تھا، شام کی تاریکی میں ایک غمزدہ روح گلیوں میں سے ٹھوکریں کھاتی ہوئی جا رہی تھی ——— بلا ارادہ اور بلا مقصد وہ ایک ہوٹل میں جا پہنچا، برآمدے سے گزر رہا تھا کہ موسیقی کی آواز اس کے کانوں میں پڑی، وہ بھاگا ہوا اور مڑ گیا، ایک دروازے کے شیشے سے جھانک کر اندر دیکھا، ایڈل رقص کر رہی تھی اس نے اپنا ہاتھ

بہتے پھکتا ہوا چہرہ شیشے پر رکھ دیا، جبکہ ازاں وہ ایک خط میں ایڈل کو لکھتا ہے۔

"پیاری ایڈل! اس دن تمہارا وکٹر نافی لباس پہنے ہوئے تمہیں حیران ہوکر دیکھ رہا تھا، میں حیران تھا کہ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے، اس دن میرا دل ٹوٹ گیا . . . میں اس مسرت گاہ میں ایک بھوت کی طرح تھا، وہاں ہر ایک شادماں اور فرحاں نظر آ رہا تھا، ہر ایک ——— یہاں تک کہ میری ایڈل بھی مسرور تھی اور دوسروں کی مسرت میں حصہ لے رہی تھی ——— مجھ سے یہ برداشت نہ ہو سکا، میں اپنی حماقتوں کے خواب سے بیدار ہوا اور آہستہ آہستہ سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا، اور شکست خوردہ قمار باز کی طرح واپس گھر پہنچ گیا، اپنی ماں کی لاش کے قریب دو زانو ہوکر میں نے تمہارے لئے دعا کی ——— اس وقت غالباً تم رقص کر رہی ہوگی ———"

واقعہ یوں ہے کہ ایڈل کو وکٹر کی ماں کے مرنے کی خبر اس وقت تک نہ پہنچی تھی، ایڈل کے والدین نے مصلحت اسی میں خیال کی کہ وہ ایڈل کو اس واقعے کی اطلاع نہ دیں چنانچہ جب یہ بات واضح ہوئی تو اس نے وکٹر کو خط لکھا تھا کہ مجھے علم ہوتا تو میں دنیا کے تمام خطرات کو پھاند کر تمہارے غم میں آکر شریک ہوتی۔

یہ الفاظ وکٹر کے سینے میں زندگی کی حرارت پیدا کرنے کے لئے کافی تھے، ایڈل نے اپنے والدین کو اس اخفا پر بہت برا بھلا کہا جب مادام فوشر ماتم پرسی کے لئے ہیوگو کے پاس گئی تو معصوم نوجوان کے چہرے پر امید کی جھلک نمایاں ہو گئی، تھوڑے دنوں بعد ایڈل اپنے والدین سمیت پہاڑی مقام پر چلی گئی اور اس دفعہ وکٹر نے ان کے پیچھے جانے کی جرات کی، بے چارے کے پاس پیسہ تو تھا نہیں اس لئے وہاں تک وہ پیدل چلتا گیا، تین دن اور تین راتوں کے بعد وہ وہاں پہنچا، تکان سے وہ بالکل چور ہو چکا تھا لیکن وہاں پہنچتے ہی اسے ایڈل اور اس کا باپ سیر کرتے ہوئے مل گئے، اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا وہ آج تک پیدل چلا ہی نہ تھا، انہیں دیکھ کر شاعر نے ایک مصنوعی تعجب کا اظہار کیا اور ایک سرائے میں پہنچ کر اس نے موسیو فوشر کو خط لکھا۔

"میں یہاں اپنے ایک دوست سے ملنے آیا تھا لیکن وہ مجھے نہیں مل سکا اس لئے میں نے یہاں دو چار روز ٹھہرنے کا ارادہ کیا، قسمت کا کھیل دیکھئے، میں آپ کو یہاں دیکھ کر ششدر رہ گیا، میں سوچتا ہوں کہ کیا یہ خواب تھا، لیکن آپ میری گستاخی کو معاف کر دیں گے اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ آپ کے ساتھ ایڈل کو دیکھ کر میری مسرت کی انتہا نہ رہی، مجھ میں اتنی جرات پیدا ہو گئی ہے کہ میں آپ سے براہِ راست کہہ دوں کہ میں ایڈل کو اپنی روح کی تمام طاقت کے ساتھ محبت کرتا ہوں اور میری تنہائی اور غم کی تاریکی میں صرف ایڈل کا خیال مجھے زندہ رہنے پہ مجبور کر دیتا ہے۔"

موسیو فوشر وکٹر کے اس شاندار جھوٹ پر مسکرایا تو ضرور ہوگا لیکن اس کو وکٹر کی حالت پر ترس آ گیا اور اس نے اجازت دے دی کہ کسی تیسرے آدمی کی موجودگی میں وہ ایک دوسرے سے "لکسمبرگ" باغ میں ہفتہ میں ایک دفعہ مل سکتے ہیں، نیز وکٹر کو یہ جتا دیا گیا کہ جب تک اس کی مالی حالت درست نہ ہو جائے وہ کسی صورت میں بھی اپنے منسوب ہونے کا اعلان نہیں کر سکتا اور نہ ہی اس دوران میں وہ ایک دوسرے سے خط و کتابت کریں۔

وکٹر خط لکھنے کے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ چنانچہ وہ ایڈل کے باپ کو محبت بھرے خط لکھ کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیا کرتا تھا، مثال کے طور پر وہ خط لیجئے جو اس نے ۲۸ جولائی کو لکھا،

"مجھے ایڈل اپنی زندگی سے بھی زیادہ محبوب ہے۔ میں اس کی مسرت کے لئے زندہ ہوں اگر وہ میرے بغیر خوش رہ سکتی ہو تو میں آج کسی دور دراز ملک کی طرف چلا جاؤں ——— یہ امید لئے ہوئے کہ ممکن ہے ہم ایک دوسرے کو پھر مل سکیں۔"

کچھ دنوں بعد اس نے پھر لکھا۔

"ایک خفیف سی رکاوٹ عظیم ترین ہمت کے راستے میں روڑا نہیں اٹکا سکتی، اس میں شک نہیں کہ مستقبل میں میں بہت سے خطرات محسوس کر رہا ہوں لیکن میری بہادر ماں نے مجھے یہ سکھایا تھا کہ مصیبتوں سے انسان کیسے سینہ سپر ہو سکتا ہے، بہت سے آدمی سنگلاخ زمین پر چلتے ہوئے لڑکھڑاتے ہیں لیکن وہ شخص جس کی ذہنیت شفاف ہو اور جس کا مقصد اعلیٰ ہو خطرناک زمین پر بھی قدم رکھتے ہوئے نہیں جھجکتا اور اس کے پاؤں کو لغزش نہیں ہو سکتی۔"

اب وکٹر کے سینے سے محبت کے جوش کھاتے ہوئے چشمے پھوٹ کر بہہ رہے تھے جن کا رکنا محال نظر آتا تھا، ایڈل کا باپ وکٹر کی محبت دیکھ کر رضامند ہو گیا، وکٹر کی زندگی درخشاں نظر آنے لگی، اس کامیابی کے جوش میں وہ اپنی مالی حالت کو سدھارنے کے لئے پوری جدوجہد کرنے لگا،

محسوس کرنے لگا کہ جو دقتیں نہایت اٹل نظر آ رہی ہیں شبینہ روز محنت سے دور ہو جائیں گی۔

"ایڈل! تم میرے وفورِ جوش پر مسکرا رہی ہو تم ہی تو ایک ایسی ہستی ہو جس نے میری روح میں طاقت پھونک دی ہے۔ تم اپنے آپ کو اس رنگ میں کیوں نہیں سمجھتیں جیسا کہ تم ہو تم وکٹر کے لئے ایک فرشتہ، ایک روح، ایک شعر کی مانند ہو۔ تم اسی حد تک زمین پر رہنے والی فانی چیزوں سے تعلق رکھتی ہو جس حد تک کہ تم اس شخص کی قسمت میں حصہ لو جس کے ساتھ صانعِ ازل نہیں وابستہ کرنے والا ہے۔"

ایڈل اور اس کے والدین کی رضا مندی کے باوجود ابھی بہت سی رکاوٹیں باقی تھیں، سب سے پہلے یہ کہ وہ اپنے بیٹے کی مستقل آمدنی کا ذریعہ بن سکے۔ دوسری یہ کہ اس عقد کے لئے اس کے باپ کی رضا مندی ضروری تھی، فرانسیسی قانون کے مطابق وہ والد کی اجازت کے بغیر شادی نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ پچیس برس کی عمر کے بعد یہ قید باقی نہ رہتی تھی، اس معاملے میں ایڈل کا باپ نہایت سختی سے اڑا ہوا تھا اور اس کے متعلقین اسے پہلی رکاوٹ پر بھی توجہ دلا رہے تھے نیز وہ اس بات پر زور دے رہے تھے کہ جوان لڑکی کو پانچ سال تک بٹھائے رکھنا کہاں کی عقلمندی ہے، ان کے نزدیک ہیوگو اس معصوم لڑکی کے لئے بالکل مناسب بر نہیں تھا جس کی نہ تو مالی حالت ہی اچھی تھی اور نہ ہی وہ اپنے باپ کو رضا مند کر سکتا ہے، سارے رشتے دار اس بات پر تلے ہوئے تھے کہ ہیوگو کے ساتھ رشتہ نہ ہو۔

نوجوان فرانسیسی شاعر کو ان طعنوں سے ایک صدمہ پہنچا، لیکن وہ کر بھی کیا سکتا تھا، بار بار اس کے ذہن میں یہ خیال آتا تھا کہ وہ اپنے باپ کی رضا مندی کیسے حاصل کرے اور اب اس کی مستقل آمدنی ہو گی؟ ایک موہوم سا مستقبل اس کے سامنے تھا اور وہ ان سوالات کا جواب مطلق نہیں دے سکتا تھا، چنانچہ وہ ایڈل کو تسکین دیتا رہتا اور یہ کہتا۔

"پیاری ایڈل! ایک وقت آنے والا ہے کہ تمہارا وکٹر ایک وکٹر ہیوگو بنے گا، اور مجھے یقین ہے کہ ایک مستقل آمدنی کا ذریعہ میرے سامنے کھلنے والا ہے۔"

چنانچہ ایسا ہی ہوا، شاعر کا خواب جھوٹا ثابت نہ ہوا ۱۸۲۲ء میں گورنمنٹ نے اس کی خدمات کے معاوضہ میں اس کی پنشن مقرر کر دی، کچھ زیادہ پنشن نہ تھی، صرف ۱۲۰۰ فرانک سالانہ لیکن اسے اتنی تسلی تھی کہ یہ مستقل آمدنی ہے، اس نے ایڈل کو لکھا۔

"ایڈل! میری ایڈل!! میں خوشی سے دیوانہ ہوا جاتا ہوں، اس ہفتے میں ایک بلائے آسمانی کا انتظار کر رہا تھا لیکن خدا نے مجھ پر مسرتوں کا دروازہ کھول دیا ہے۔"

اب صرف جنرل ہیوگو کی اجازت کی ضرورت باقی تھی، لیکن یہ بہت مشکل کام تھا، وکٹر کو اس بات کا علم تھا کہ وہ کبھی بھی اجازت نہ دے گا، اس کے دماغ میں اپنے باپ کی ہیبت چھائی ہوئی تھی، وہ اس سے یہ سوال ہی نہ کرنا چاہتا تھا کیونکہ اگر ایک بار اس نے انکار کر دیا تو پھر سوائے پانچ سال اور ٹھہرنے کے اور کوئی راستہ نہ رہے گا، اور اسے یہ بھی احساس تھا کہ ایڈل کے والدین اتنی مدت انتظار نہ کر سکیں گے، روز بروز وہ اس فیصلہ کن سوال کو ملتوی کرتا رہا، آخر کار ۲۰ مارچ کے روز اس نے خط لکھنے کی جرأت کر ہی دی، اس نے ایڈل کو لکھا۔

"میں نے وہ خط لکھ دیا ہے جس پر میری قسمت کا فیصلہ ہو گا، ہم دونوں کو اس لمحے کا منتظر رہنا چاہئے کیونکہ اس وقت ہم اپنی زندگیوں کے نازک ترین دور میں سے گزر رہے ہیں، معاف کرنا میں اپنی زندگی لکھ رہا ہوں کیونکہ میں اپنی بدقسمتی کے چکر میں تمہیں بھی ساتھ ساتھ گھسیٹ رہا ہوں، لیکن جب میں یہ دیکھوں گا کہ میری زندگی سے تمہاری مسرتوں کا خون ہو رہا ہے، تو میں فوراً اپنا خاتمہ کر دوں گا۔

ممکن ہے حالات ہمارے حق میں ہو جائیں، تمہاری محبت میں مجھے کئی بار مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑا ہے، اس وقت بھی میں مایوس نہیں ہوں گو امید کا بہت ہی تھوڑا امکان ہے، میری امیدیں نہایت قیمتی اور نہایت شیریں ہیں . . . دیکھیں قسمت ہمارے لئے کیا کرتی ہے!"

ایک ایک دن گنتے ہوئے ایک ہفتہ گزر گیا، اس انتظار میں وکٹر کی عجیب حالت تھی، آخر کار آٹھویں دن جواب آ گیا جس نے دو دلوں میں خوف طاری کیا ہوا تھا، کانپتے ہوئے ہاتھوں سے وکٹر نے خط کھولا تو اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آتا تھا۔

جنرل ہیوگو نے بخوشی اجازت دے دی تھی۔

اور ناراض ہو جانے کی بجائے اس نے اپنے بیٹے سے التجا کی کہ وہ اسے معاف کر دے،

"میں نے تمہاری ماں کو بہت دکھ پہنچایا ہے۔ میں نے ایک اور عورت سے شادی کر لی ہے اور غالباً اس عورت کی وجہ سے تمہاری

ان کا دل ٹوٹ گیا تھا، میری یہ دلی خواہش ہے کہ میں تمہیں خوش دیکھوں غالباً میری اس خواہش سے تمہاری ماں کی روح بھی خوش ہو گی۔"

وکٹر مسرت سے اچھلنے لگا، لیکن اپنے باپ کی دوسری شادی کی خبر سن کر اُسے صدمہ ہوا، وہ ایڈل کو لکھتا ہے۔

"میں نے آج اپنے باپ کو خط لکھا ہے جس میں میں نے اپنے درد کا اظہار بھی کیا ہے"

۱۲ اکتوبر کے دن ان کی شادی قرار پا گئی، جس دن انہوں نے محبت کا عہد وپیمان کیا، اس دن سے پورے اڑھائی سال بعد ان کی شادی ہوئی۔

شادی سے چند روز پیشتر وکٹر نے ایڈل کو لکھا۔

"پیاری ایڈل! تمہیں اس بات پر تو شک نہیں ہو گا کہ ہماری زندگیاں ایک عجیب گردش میں رہیں۔ ہماری روحوں کی گہرائی میں مسرتیں کھیل رہی ہیں جو زمین اور آسمان دونوں سے جدا کی گئی ہیں۔ ہماری ہونے والی شادی عوام کو بتانے کے لئے ایک رسم ہو گی، ورنہ ہم خدا کے سامنے مدت ہوئی ایک مقدس معاہدہ کر چکے ہیں، وہی ہماری شادی تھی، اسی عہد کو آج لوگوں کے سامنے بیان کیا جا رہا ہے۔"

. . . . .

افسوس یہ شادی ایک مقدس معاہدہ ثابت نہ ہو سکا۔ ایڈل ہمیشہ وفادار بیوی رہی لیکن وکٹر صحیح راستے سے بھٹک گیا، ایڈل نے کبھی شکایت نہ کی، وہ جانتی تھی کہ اس نے ایک طباع انسان سے شادی کی ہے اس لئے خاموشی کے ساتھ وہ سارے دکھ سہتی رہی۔

محبت کے آغاز کے دن ایڈل کی ساری زندگی کو تروتازہ رکھنے کے لئے کافی تھے۔

(ترجمہ)

خلیل

رباعیات

ناکام ہے جان کامیابی ہو جا
آزاد ہے اسیری و گلابی ہو جا
ہو دور لوائے عمل سے اتنا سرشار
بے منت جام و مے شرابی ہو جا

نام و نمود سے گریزاں ہو جا
گوشے میں چراغ زیر داماں ہو جا
گو شمع نفس خوب تاباں ہے فروغ
شعلہ سے ... تا حد وہم نمایاں ہو جا

بہ جھنکیسری لابالی

گائے جا!

روح افسردہ سی ہے، بہلائے جا
جسم میں اک لہر سی دوڑائے جا
خود تڑپ اوروں کو بھی تڑپائے جا
گائے جا غم آشنا دل گائے جا

چٹکیاں لیتا ہے شوقِ جستجو
گدگداتی ہے کسی کی آرزو
ذکرِ الفت سے مجھے گرمائے جا
گائے جا غم آشنا دل گائے گا

ربطِ باہم کا نہ ٹوٹے سلسلہ
محو ہو جائے نہ یادِ دلربا
بیٹھے بیٹھے درد سے گھبرائے جا
گائے جا غم آشنا دل گائے جا

چھیڑتا ہوں روز میں سازِ شباب
دیکھتا ہوں روز میں رنگین خواب
رازہائے زندگی سمجھائے جا
گائے جا غم آشنا دل گائے جا

روشن نکودری

غزل

فصلِ گل دیتی ہے طعنے ترے دیوانے کو
دھجیاں جیب کی ملتیں نہیں نذرانے کو

علم واعظ کو کہاں، آئیں جو سمجھانے کو
ہم تو ہیں دل میں چھپائے ہوئے بتخانے کو

واسطہ دَیر سے کچھ ہے نہ حرم سے مطلب
اک ترے در سے غرض ہے ترے دیوانے کو

دل ہوا ان کا طرفدار تو اپنا کیسا
ہم تو پہلو میں جگہہ دیں گے نہ بیگانے کو

مستیاں لیتی ہیں جھک جھک کے بلائیں سرِ راہ
تم تو آنکھوں میں لئے پھرتے ہو میخانے کو

وہ کہاں فرق نشیں اور یہ پامال خرام
دل صد چاک سے تشبیہہ نہ دو شانے کو

نام رہتا ہے شہیدانِ وفا کا زندہ
عمر خضری ہے میسر مرے افسانے کو

عالمِ جذب میں کیا جانئے کیا بک جائے
کوئی للہ نہ چھیڑے ترے دیوانے کو

موت کا ایک سبب فرطِ مسرت بھی ہے
کیوں گلے شمع لگا لیتی ہے پروانے کو

خاکساری کا عوض دہر میں ملتا ہے ضرور
ہو کے مٹی لقبِ نخل ملا دانے کو

نثر میں بھی وہی اشعار کی موسیقی ہے
گاتے پھرتے ہیں عنادل مرے افسانے کو

شب جو محفل میں انہیں مشقِ ستم کی سوجھی
شمع جلووں کے جلاتے رہے پروانے کو

کیا ستم ہے کہ پپیہے سرِ تربت آکر
چھیڑتے رہتے ہیں بھولے ہوئے افسانے کو

سخت جانی سے مری ہے متحیر قاتل
دیکھتا ہے کبھی خنجر کبھی دندانے کو

میکدے میں ہیں کیا جانئے کیا یاد آیا
رو پڑے دیکھ کے ٹوٹے ہوئے پیمانے کو

نجم ہر لفظ میں اک درسِ وفا پنہاں ہے
اہلِ دل غور سے دیکھیں مرے افسانے کو

نجم ندوی بی اے

پریما

بسنت کی سہانی رات تھی۔ چاند کی روپہلی کرنیں آم کی سبز سبز ہری
پتوں سے آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔

بسنت رت کی نخل جوا پریما اور سوریش کو گدگدا کر چاند سے آنکھ
مچولیاں کھیلتے ہوئے تاروں میں سما تی تھی۔ ان دونوں پریمیوں کے دلوں
میں بیتے ہوئے دنوں اور آنے والے زمانے کی نہ جانے کتنی پہیلیاں
گنگا کی لہروں کی طرح اٹھ کر غائب ہو جاتی تھیں۔

"سوریش! ذرا دیکھنا آکاس پر ان بادلوں کی سندرتا" پریما
تاروں کی طرف دیکھ کر مسکراتی ہوئی بولی

"ہاں یہ راس لیلا تو سدا اسنسار کے من کو موہتی رہے گی لیکن
آہ ہماری یہ پریم لیلا تو چار دن کی چاندنی ہے" سوریش کسی قدر افسردہ
لہجے میں بولا۔

"یہی چار دن کی چاندنی ۔ ۔ ۔ ؟"

"تم نہیں جانتیں بھولی پریما! ہماری یہ پریم لیلا بدھاتا کو ایک آنکھ
نہیں بھاتی"

"بدھاتا ۔ ۔ ۔ ؟"

"سماج!"

"میں نہیں سمجھی"

"او ہو پریما تم کتنی بھولی ہو! اس نے تمہاری اُتم ہڈیوں کے مقابلے
میں میری ہڈیوں کو مدھم اور نیچ بنایا ہے"

"پھر اس کا نتیجہ کیا ہوگا ۔ ۔ ۔ ؟"

"آہ نتیجہ وہی ہوگا جو بھاگ میں لکھا ہوگا!"

گنگا کی چنچل لہریں نرم رو ہوا سے اٹکھیلیاں کر رہی تھیں اور چاند تاروں
کے ساتھ آنکھ مچولیاں کھیل رہا تھا۔ سوریش اور پریما دھیرے دھیرے گاؤں
کی طرف چلتے چلتے پریما کے منہ سے نکل گیا ۔۔۔ "آہ نردئے سماج!"

. . . .

پریما کے باپ کیلاش بہاری مصر لڑکا تلاش کرتے کرتے تھک
گئے۔ لیکن اونچی ہڈی کا لائق لڑکا نہ ملا۔ آخر مجبور ہو کر ایک نالائق اور
بے جوڑ ہی بر کے ساتھ پریما کو بیاہ دیا اور اس بات پر خوش تھے کہ
بر نالائق اور بے جوڑ سہی لیکن اونچی ہڈی کا تو ہے!
پریما کے پتی دیو کا نام ہری کرشن رائے تھا

. . . .

"چھی چھی۔ مرد ہو کر روتے ہو؟"

"پھر کیا کروں دل پر بھی کوئی بس ہے؟"

"دھیرج سے کام لو ۔ ۔ ۔ ۔"

"آہ یہ بھی کوئی اپنے بس کی بات ہے؟"

"مرد ہو دھیرج سے کام لو۔ کوئی لائق لڑکی دیکھ کر اپنی گرہستی
کھڑی کر لو اور ان خوشی کے دنوں میں مجھے بھی بلانا" پریما بھرائی ہوئی
آواز میں بولی۔

"یہ مجھ سے نہ ہوگا" سوریش آنسو پونچھ کر بولا۔

"پھر مجھ سے ملوگے؟" پریما اس کے ہاتھ کی انگلیاں پکڑ کر بولی۔

"ضرور ملوں گا"

"ہاں ضرور ملنا"

دونوں خاموش کھڑے تھے۔ لیکن ان کی آنسوؤں سے بھری
ہوئی آنکھیں آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔

"پریما!"

". . . ."

"پریما اتنی ادھیر نہ ہو"

"نہیں سوریش میں ادھیر نہیں ہو رہی ہوں بس تمہارے آنے
والے دنوں کی سوچ میں پڑی ہوں۔ بولو میرے نہ رہنے کی حالت میں اپنے
دن سکھ سے بتاؤ گے نا؟"

"اور تم ۔ ۔ ۔ ؟"

"میری چنتا نہ کرو سوریش۔ سنتی ہوں ان کا خاندان بڑا ۔۔۔

"میں کسی طرح اپنا دل بہلا لوں گی"
"تم کبھی کبھی خط لکھ سکو گی؟"

"ضرور ضرور۔ بھلا یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے"

"بس میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں چاہتا۔ جہاں بھی رہو سکھ سے رہو۔ میری پریما میں اسی میں سکھی رہوں گا"

"اچھا سوریش اب رخصت چاہتی ہوں اور آخری رخصت" سوریش نے دیکھا پریما کانپ رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی آبشار امڈ رہی تھی۔

"پیاری پریما! اور کوئی آرزو؟" سوریش نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"بس میری ایک ہی آرزو ہے کہ اپنے دل کے کسی کونے میں مجھے تھوڑی سی ایسی جگہ دو جہاں سے میں کبھی کبھی تمہاری یاد کے ساتھ یہی سہانا کھیل کھیل سکوں . . . ."

. . . .

پریما اب ایک نئی دنیا میں آبسی تھی۔ یہاں کا ماحول وہاں سے بالکل جدا تھا۔ قدم قدم پر قانون اور پابندیوں کا کانٹا۔ کل کی بن کی آزاد کوئل آج سماج کے پنجرے کے اندر بند تھی۔ کبھی کبھی دوسرے کو ماں کہہ کر پکارنے والی پریما اب خود ماں بن گئی تھی ——! اس حیرت انگیز انقلاب سے وہ جتنا بھی گھبراتی کم تھا۔

خطرناک صورت حالات کی موجودگی میں بھی پریما کسی نہ کسی طرح آدھا خط لکھ چکی تھی لیکن گھر والوں کی آنکھ کہاں تک بچاتی! ہری کرشن کے چھوٹے لڑکے انوپ نے اسے کئی دن لکھتے دیکھا تھا۔ بے چاری ٹہلنے گئی تھی۔ انوپ نے خط اڑا لیا اور جاکر باپ کے سامنے پڑھنا شروع کیا۔ انوپ ابھی دوسرے ہی درجے میں پڑھتا تھا۔ بھلا ہاتھ کا لکھا ہوا خط اس سے کیسے پڑھا جاتا! الٹ پلٹ کر دو چار جملے ادھر ادھر کے پڑھ رہا تھا۔ باپ نے پوچھا "کیسا کاغذ ہے انوپ؟"

"نئی ماں کی چٹھی ہے" انوپ نے خط لفافے میں بند کرتے ہوئے کہا۔

رائے صاحب کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ غصے سے ہونٹ چبانے لگے گرج کر بولے —— "پڑھ بے پڑھ . . . "

انوپ نے لفافے کے اوپر کے پتے کو پڑھنا شروع کیا —— "سو . . . ریش . . . چند . . . ر . . . میڈ . . . یکل . . . کالج . . . پٹنہ"

"بس کرو بس۔ میں سمجھ گیا۔ اُف اتنی دلیری! ڈائن ہے ڈائن" ہری کرشن رائے نے لڑکے کے ہاتھ سے خط لے کر ٹکڑے ٹکڑے کرکے پھینک دیا۔ اس کے بعد غریب پریما پر کیا گذری! یہ اس کے سوا کون جانے؟

. . . .

ڈاکٹر سوریش چندر کا سنگرام پور میں تبادلہ ہوا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ آپ ایک کامیاب اور تجربہ کار ڈاکٹر ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے ابھی تک اپنی شادی نہیں کی ہے۔ اس لئے ان کی عزت و شہرت دیکھ کر ہر روز کوئی نہ کوئی لڑکی والا ان کے پاس پہنچا ہی رہتا ہے۔ شاید ڈاکٹر ہونے کے بعد انہوں نے کسی علاج سے اپنی مدہم ہڈیوں کو اٹم بنا لیا ہے۔

لیکن ڈاکٹر صاحب کسی وجہ سے صاف انکار کرتے جاتے ہیں۔

اسی طرح کچھ دن گذر گئے۔

بسنت رُت کی دوپہر تھی۔ ڈاکٹر صاحب نسخہ لکھنے میں مصروف تھے۔ بڑی بھیڑ تھی۔ "مادھو ہوں سرکار" ایک بوڑھے نے بیل گاڑی سے اترتے ہوئے کہا اور لاٹھی ٹیکتا ہوا کمرے میں آگیا۔

"کیا ہوا ہے؟ موتیا بند؟" ڈاکٹر نے فوراً اس کی آنکھوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ہاں دکھ کا مارا ہوں سرکار۔ روگ پرانا ہوگیا ہے"۔ بوڑھے نے رو کر کہا۔

"تمہاری آنکھوں کا اپریشن ہوگا۔ تمہارے ساتھ اور کوئی ہے؟"

"لڑکے نے مار پیٹ کر الگ کر دیا ہے سرکار۔ اب اور کون ہوگا؟ وہی بڑھاپے کی لکڑی . . . "

ڈاکٹر نے بات کاٹ کر کہا —— "بات ختم کرو۔ کون ہے بلاؤ"

گاڑی سے اتر کر ایک عورت کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کا چہرہ گھونگھٹ سے ڈھکا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے بار بار دیکھا لیکن ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ آخر کمپاؤنڈر سے مریض کا بندوبست کرنے کے لئے کہہ کر چلے گئے۔ لیکن ان کے دل میں گوناگوں خیالات کا ایک ہنگامہ برپا تھا۔

وہی بسنت رُت کی شام اپنی سیاہ چادر سے دنیا کو ڈھک رہی

تھی۔ ڈاکٹر صاحب ہسپتال کے صحن میں کرسی پر بیٹھے ہوئے کچھ سوچ رہے تھے اور وہ عورت بھی برآمدے میں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

کچھ دیر کے بعد افق کی اوٹ سے چاند بھی جھانکنے لگا۔ عورت اٹھ کر دھیرے ایک طرف چلی۔

"ڈاکٹر بابو!" عورت گھونگھٹ کھول کر بولی۔

ڈاکٹر کا رہا سہا شک بھی جاتا رہا اور وہ کھڑے ہو کر پکار اٹھے

"پریما ——!"

عورت چپ چاپ ان کی طرف دیکھتی رہی۔

ہر چند کہ گردشِ زمانہ سے پریما کے رنگ روپ میں زبردست تغیر ہو گیا تھا۔ پھر بھی اتنے قریب آ کر وہ سوریش کی آنکھوں سے چھپ نہ سکی۔

"پریما!" ڈاکٹر نے پھر کہا۔

"سو . . . ر . . . یش . . . عورت نے دھیرے سے کہا

عورت کا اتنا کہنا تھا کہ ڈاکٹر نے دوڑ کر اسے سینے سے لگا لیا اور دونوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی ابارندی امڈ پڑی۔

"آہ میری دکھ بھری کہانی سن سکو گے سوریش!" عورت سسک کر بولی۔ ڈاکٹر چپ رہا۔

"ضرور سن سکو گے۔ کیونکہ تم مرد ہو اور تمہارا دل مضبوط ہو گا اور میں دکھ کی ماری ابلا ہوں۔ لٹ چکی ہوں۔ تم سن تو سکو گے لیکن میں سنا بھی سکوں گی!" عورت سسکیاں بھرتی ہوئی بولی۔

ڈاکٹر حیران رہ گیا ——

عورت نے کہنا شروع کیا —— اچھا تو سنو —— یہ تو تمہیں معلوم ہے کہ جس وقت میری شادی ہوئی۔ اس بوڑھے کی عمر پچاس سے ڈھل چکی تھی۔ جب میں سسرال پہنچی تو گرہستی کا سارا بوجھ میرے سر پڑا۔ بوڑھے کی پہلی استری چل بسی تھی اس کے تین لڑکے تھے اور دو لڑکیاں۔ دو لڑکوں کی بہوئیں موجود تھیں۔ تیری ساس بن کر میں پہنچی گھر کا سارا بوجھ مجھے سنبھالنا پڑا اور اسی پر بس نہیں تھا سب کی کڑی بولیاں بھی سہنی پڑیں۔

یہ تو تم جانتے ہو کہ بے سمجھ بوڑھے بچے بن جاتے ہیں۔ اس کا بڑا لڑکا رامو بوڑھے کی آنکھ میں دھول جھونک کر میرے پیچھے پڑا۔ آہ سوریش سنا دوں نہیں اس پاپی کی کہانی —— !اچھا سنو۔ اس نے میرے ساتھ نامناسب رشتہ جوڑنا شروع کیا اور میرے لئے بازار سے مٹھائیاں اور بناؤ سنگار کے سامان لا کر مجھے دینے لگا۔ موقع بے موقع میرے کمرے میں بھی آ پہنچتا اور کھلے لفظوں میں اپنے دل کی بات مجھ سے کہہ بیٹھتا۔ آہ اس وقت میرے دل میں کیسی ٹھیس لگتی تھی! یہ کچھ میں ہی جانتی ہوں۔ ہاں تو وہ نیچ پاپی کبھی کبھی رات کو بھی میرے پاس پہنچتا اور مجھے اپنے قابو میں لانے کے لئے اپنی طاقت سے کام لیتا۔ جب اس طرح بھی اس کا بس نہ چلتا تو میرے اوپر ظلم کا جو پہاڑ ڈھاتا اسے تمہیں دکھاتی ہوں گا!" اتنا کہہ کر عورت نے اپنی پیٹھ کھول کر دکھائی۔ جس پر لاٹھیوں کی چوٹ کے سیکڑوں نشانات موجود تھے۔

عورت سسکیاں لیتی ہوئی کہنے لگی —— "سوریش! مجھے یہ تو نہیں یاد رہا کہ اس پر کتنی لاٹھیاں پڑی ہیں۔ لیکن یہ اچھی طرح یاد ہے کہ سات برس تک برابر اس پر لاٹھیاں برسی ہیں . . . آہ سوریش! میری رام کہانی کہاں تک سنو گے؟ اور میں کہاں تک سنا سکوں گی۔ بس اب مجھ سے نہیں کہا جاتا۔ ہائے رے بے رحم سماج . . . !"

اتنا کہتے کہتے پریما بے ہوش ہو گئی۔ ڈاکٹر نے چیخ کر نوکر کو پکار —— "رامو! رامو! اے او رامو!!"

آسی رام نگری

آمدِ صبح

دوپٹہ شب کا ڈھلکے گا!
نہ ٹھہرے گا یہ سر پر رات کی رانی کے اک پل کو؛

یہ روشن اور اجلا چاند یعنی رات کا پریمی
یہ اس کو جگمگاتے، پیلے تاروں سے
سجا کر لایا ہے گھر سے۔
مگر چنچل ہے رانی رات کی بے حد؛
دوپٹہ شب کا ڈھلکے گا!

ہے دل میں چاند کے جذبہ محبت کا،
چھپاتا ہے وہ غیروں کی نگاہوں سے اڑھا کر اک دوپٹہ اس کو تاروں کا؛
مگر چنچل ہے رانی رات کی بے حد،
فضا کے گلستاں میں پھرتی ہے اٹھکیلیاں کرتی،
ہوائیں گیسوؤں کو اس کے چھو کر دوڑ جاتی ہیں،
دوپٹہ شب کا ڈھلکے گا!

وہ لو، پیلا پڑا روشن سا چہرہ چاند کا بالکل!
اُسے افسوس! اندیشوں نے گھیرا ہے،
اُسے خطرہ ہے غیروں کا،
ہے جذبہ اُس کے دل میں تند چاہت کا،

مگر چنچل ہے رانی رات کی بے حد،
وہ اِن کیفیتوں کو دل میں لاتی ہی نہیں بالکل!

دوپٹہ شب کا ڈھلکا، ہاں وہ ڈھلکا جس طرح نغمہ
کسی راگی کے دل سے اٹھ کے اک دم بیٹھ جاتا ہے!

پرندے چہچہاتے ہیں،
وہ لو، سورج بھی اپنی سیج پر اب جاگ اٹھا ہے!
گئی رات اور دن آیا!

"میراجی"

قطع محبت کرے۔

اسی قصیدہ میں آگے چل کر اپنی محبوبہ نوار سے خطاب کرکے کہتا ہے۔:-

(۳) أَوَلَمْ تَكُنْ تَدْرِي نَوَارُ بِأَنَّنِي ✦ وَصَّالُ عَقْدِ حَبَائِلٍ جَذَّامُهَا

اے نوار! تو مجھ سے قطع تعلق کرکے چلی گئی اور تونے یہ نہ جانا کہ میں جو محبت اور مواثیق عشق کا بڑا جوڑنے والا اور نیز توڑنے والا ہوں یعنی جو مجھ سے بے رحمی کا برتاؤ نہ کرے اس کے لئے مجسم وفا ہوں اور جو بے رخی برتے اسکو فوراً چھوڑ دیتا ہوں

(۴) تَرَّاكُ أَمْكِنَةٍ إِذَا لَمْ أَرْضَهَا ✦ أَوْ يَرْتَبِطْ بَعْضَ النُّفُوسِ حِمَامُهَا

کیا نوار نے یہ بھی نہ جانا کہ میں ان مقامات کو جنہیں میں پسند نہ کروں اور جو میرے لئے سازگار نہ ہوں (یعنی ذلت کی جگہوں کو) فوراً ترک کر دیتا ہوں مگر یہ کہ میری موت آ جائے کہ اس وقت میں وہاں کے قیام پر مجبور ہوتا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ میں جیتے جی ذلت برداشت نہیں کر سکتا اور ذلت کے مقابلہ میں موت کو ترجیح دیتا ہوں۔

ایک اور مشہور شاعر امرء القیس جس کو عربی شاعری کا علمبردار تسلیم کیا جاتا ہے۔ اپنی محبوبہ کے ساتھ اپنی گذشتہ صحبتوں کو یاد کرکے کہتا ہے:-

(۵) وَيَوْمًا عَلَى ظَهْرِ الْكَثِيبِ تَعَذَّرَتْ ✦ عَلَيَّ وَآلَتْ حَلْفَةً لَمْ تُحَلَّلِ

"اور اس معشوقہ نے ایک دن جبکہ ہم ایک ٹیلہ کی پشت پر بیٹھے ہوئے تھے مجھ پر بڑی سختی کی اور مجھ سے جدائی کی قطعی قسم کھائی اور انشاء اللہ بھی نہ کہا کہ اس قسم کے توڑنے کا موقع رہے"

اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد اپنی محبوبہ کو مخاطب کرکے کہتا ہے:-

(۶) أَفَاطِمَ مَهْلًا بَعْضَ هَذَا التَّدَلُّلِ ✦ وَإِنْ كُنْتِ قَدْ أَزْمَعْتِ صَرْمِي فَأَجْمِلِي

اے فاطمہ! اگر تیرا یہ عمل از راہ ناز تھا تو اپنے اس ناز کو کسی قدر چھوڑ دے اور اگر تو نے مجھ سے علیحدگی کا پختہ ارادہ کر لیا ہے تو اسے اچھائی کے ساتھ کر یعنی شریفانہ طور سے مجھ سے علیحدہ ہو جا۔

(۷) أَغَرَّكِ مِنِّي أَنَّ حُبَّكِ قَاتِلِي ✦ وَأَنَّكِ مَهْمَا تَأْمُرِي الْقَلْبَ يَفْعَلِ

بے شک تجھ کو میرے اس امر نے دھوکہ میں ڈال دیا ہے کہ تیری محبت میری قاتل ہے اور تو میرے دل کو جو حکم کرتی ہے وہی کرنے لگتا ہے۔

اس کے بعد کیسا اچھا شعر کہا ہے:-

(۸) وَإِنْ تَكُ قَدْ سَاءَتْكِ مِنِّي خَلِيقَةٌ ✦ فَسُلِّي ثِيَابِي مِنْ ثِيَابِكِ تَنْسُلِ

اگر تجھ کو میری کوئی عادت بری معلوم ہوئی ہے تو میرے دل کو اپنے دل سے نکال دے اور جدا کر دے تاکہ میں تجھ سے علیحدہ ہو جاؤں اور تو مجھ سے بے غم ہو جائے یعنی اگرچہ میں یہ خوب جانتا ہوں کہ تجھ سے علیحدگی میری ہلاکت کا سبب ہوگی لیکن چونکہ تو مجھ سے محبت نہیں کرتی ہے اور مجھ سے علیحدگی اختیار کرنا چاہتی ہے۔ اس لئے میں اسی کو پسند کرتا ہوں۔ عاشقانہ خودداری اور تسلیم کی بہترین مثال ہے۔

سید محمد یوسف مولوی عالم از بھوپال

غزل

ہر ایک بات تھی گو حسبِ مدعا تیری
ہوئی نہ میرے موافق کبھی فضا تیری

بُھلا تو دیتی ہے باتوں کو وقت کی رفتار
یہ مجھ کو بھولنے دیتی نہیں وفا تیری

مری زبان کو مانع ہے پاسداریِ راز
تجھے بھی روکتی ہے بات سے حیا تیری

نگاہ روک کے ہاتھوں سے دل پکڑتا ہوں
کہیں سے کان میں آتی ہے جب صدا تیری

قرار دیتی تھی اس دل کو بے قراری میں
کہاں ہے صبر و تحمل بھری ادا تیری

یہ بات کیا ہوئی سیفیؔ برا نہ تھا آغاز
ہوئی ہے قابلِ افسوس انتہا تیری

سیفیؔ

کیا وہ سب تھا بھول جانے کے لئے

(۱)

ستمبر کا خوشگوار مہینہ تھا۔ آسمان پر بادل نام کو نہ تھے۔ جہاں تک نظر کام کرتی تھی نیلم سی نیلا آسمان تھا۔ البتہ چیلیں کثرت سے منڈلایا کرتی تھیں سورج کی تمازت ذرا بھی ناگوار نہ گذرتی۔ ہاں! دوپہر کے وقت اکثر تیز ہوا چلتی تھی۔ گلابوں کا موسم تھا۔ سرخ۔ گلابی۔ زرد۔ زعفرانی۔ سب ہی رنگوں کے گلاب جابجا نظر آتے۔ سورج مکھی کے پھول بھی کھلنا شروع ہو گئے تھے۔ امرود کے درختوں پر چپکادڑیں آنے لگی تھیں۔

ایسے پیارے موسم میں میں جواں بخت کے اسکول میں داخل ہوئی۔ جواں بخت ایک خوشرو نوجوان تھا۔ وہ اوپر کی منزل یعنی کالج میں پڑھتا تھا اور میں نچلی منزل یعنی اسکول کی ایک چھوٹی کلاس میں تھی۔

ایک روز اتفاق سے ماسٹر صاحب نہ آئے تھے اور ہم لوگ دل کھول کر شرارتیں کر رہے تھے۔ کمرے کے دروازے بند کر لئے تھے تاکہ دوسری کلاس میں شور کی آواز نہ جائے۔ اس لئے نہیں کہ ہمیں دوسری کلاسوں کے طالب علموں کے حرج کا خیال تھا بلکہ یہ ڈر تھا کہ کہیں دوسرے ماسٹر صاحب آکر خفا ہوں اور ہمیں کوئی کام دے جائیں تو یہ ساری چہل پہل خاک میں مل جائے گی۔ ایک لڑکے نے میری کاپی میں سے دو تین سوالات زبردستی نقل کر لئے۔ مجھے انتہائی غصہ آیا، کیونکہ وہ مجھے اپنی کاپی نقل کرنے کے لئے کبھی نہ دیتا تھا۔ میں جھنجھلا کر کلاس سے باہر چلی آئی اور اوپر کالج کی لائبریری میں پہنچ گئی۔ وہاں جواں بخت کسی کتاب کی تلاش میں الماری کے خانے میں منہ دئیے کھڑے تھے۔ میں نے کرسی میز کی طرف اس زور سے گھسیٹی کہ جواں بخت نے چونک کر پیچھے دیکھا اور مسکرانے لگے۔ اس کے جواب میں میں نے ایک قہقہہ لگایا، پھر باہر دیکھنے لگی۔ کھڑکی سے باغ نظر آ رہا تھا۔ گل اشرفی کا درخت ہوا سے جھوم رہا تھا۔ سرخ سرخ پھول زمین پر بکھرے پڑے تھے۔ میں نے اپنے آپ کو سنجیدہ بنانے کی کوشش کی۔ سوچا کہ باغ کے خوشنما منظر میں اپنی ہنسی بھول جاؤں۔ بڑی مشکل سے تھوڑی دیر خاموش رہی۔ ایک بار جواں بخت کی طرف دیکھا اور پھر ہنسی آ گئی۔ دوسری طرف منہ پھیرا تو کتابوں کی شیشے کی الماری میں اپنی ہنستی ہوئی صورت نظر آئی۔ اب تو مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ مجبوراً نیچے بھاگ آئی۔ بس یہ تھی میری اور جواں بخت کی پہلی ملاقات!!!

اس ملاقات کے بعد میں جواں بخت کو قریباً ہر روز دیکھتی تھی لیکن کبھی باتیں کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اس روز کے واقعہ کا خیال آتا تو بے اختیار ہنس دیتی۔ وہ بھی مسکرانے لگتے۔

(۲)

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ جواں بخت میرے والد کے ایک دوست کے لڑکے تھے۔ ایک روز والدہ جواں بخت کی بھاوج سے ملنے گئیں۔ میں بھی ساتھ گئی۔ یہ میرے لئے جواں بخت کے گھر جانے کا پہلا اتفاق تھا۔ اس وقت وہ گھر پر موجود نہ تھے۔ میں ان کے کمرے میں پہنچی۔ کتابوں کی الماری میں چند انگریزی رسائل رکھے تھے۔ میں نے نکال کر الٹنا پلٹنا شروع کئے۔ اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ جو تصاویر پسند آئیں قینچی سے کاٹ لیں۔ پھر کاپیوں پر ہاتھ صاف کیا۔ جگہ جگہ پنسل سے جواں بخت کی تصویریں بنائیں اور لکھ دیا۔ "جواں بخت کو سزا مل رہی ہے"۔ "جواں بخت کان پکڑ کر اٹھ بیٹھ رہے ہیں"۔ "جواں بخت کرکٹ میچ ہارنے کے بعد"۔

میں نہایت اطمینان سے تصویریں بنا رہی تھی کہ اتنے میں وہ کمرے میں داخل ہوئے۔ خدایا!!! خوف کے مارے میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ جواں بخت گھبرا کر میرے قریب آئے۔ میں آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔ "جواں بخت! معاف کیجئے"۔

وہ مسکراتے ہوئے بولے "کیا معاف کر دوں؟ لیکن تم چیخ

یوں پڑی تھیں!"

بیٹھے بعد دیکھے میں نے تمام کاپیاں ان کے سامنے رکھ دیں۔ تصویریں تو ایسی ابھی نہ تھیں کہ دیکھنے سے سمجھ میں آ جائیں۔ لیکن نیچے لکھے ہوئے الفاظ تشریح کر رہے تھے۔ جواں بخت اپنے آپ کو ہر رنگ میں دیکھ کر بہت ہنسے۔ میں ڈر رہی تھی کہ دیکھئے کیا کہتے ہیں۔ لیکن انہوں نے پیار سے میرے سر پر ایک چپت رسید کی اور کہا "تم بے حد شریر ہو! اسکول میں بھی شرارتیں کرتی ہو اور گھر پر بھی باز نہیں آتیں۔"

ان کی خوش مزاجی دیکھ کر میرا ڈر جاتا رہا۔ میں نے جمع کی ہوئی تصویریں بھی ان کے آگے رکھ دیں۔

وہ میرے بالوں سے کھیلتے ہوئے بولے "اچھا تم بہت کچھ کر چکی ہو! تم نے سارے رسالے خراب کر ڈالے۔ لیکن خیر نہیں پسند ہیں تو لے لو۔"

میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ان کا شکریہ ادا کیا اور بے تکلفی سے کرسی پر بیٹھ گئی۔ جواں بخت خاموش بیٹھے تھے۔ میں ان کے گلابی گلابی ہونٹوں کو دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی۔ دفعتاً انہوں نے گل دان سے بنفشہ کے دو نیلے نیلے پھول نکال کر میرے بالوں میں لگا دئے۔

میں نے کہا "یہ کیا! گل دان میں اچھے خاصے رکھے تھے۔ ان میں سے کیوں نکال لئے؟"

کہنے لگے "تمہارے بالوں میں زیادہ اچھے معلوم ہوتے ہیں۔"

سورج نصف النہار سے گذر چکا تھا۔ روشن دان سے عجیب کیف پرور کرنیں آ رہی تھیں۔ خوشگوار ہوا سے جواں بخت کے بال اڑ رہے تھے۔ وہ اس وقت نہایت غور سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ لیکن میں مصنوعی سنجیدگی کے ساتھ ان کے بالوں کا تماشا دیکھ رہی تھی وہ بے حد خوب صورت معلوم ہو رہے تھے۔ اتنے میں والدہ نے مجھے پکارا اور میں کمرے سے بھاگ گئی۔

اس ملاقات کے بعد مجھے اپنا احساس اچھی طرح ہونے لگا تھا کہ مجھے جواں بخت کے ساتھ غیر معمولی دلچسپی ہے۔

(۳)

سردیوں کا موسم آہستہ آہستہ گذر گیا۔ خزاں اور بہار میں باہم جنگ ہو رہی تھی۔ بعض درختوں میں کونپلیں پھوٹ آئی تھیں۔ بعض کے پتے زرد ہو کر گر رہے تھے۔ چڑیاں دھوپ کی تیزی کی وجہ سے اکثر سائے ہی میں پھدکتی پھرتیں۔ گلہریاں سوکھی پتیوں پر دوڑ دوڑ کر ایک لطیف کھڑکھڑاہٹ پیدا کر رہی تھیں۔

سات مارچ کو اسکول اور کالج کا سالانہ اجتماع Social gathering تھا۔ ہم لوگوں نے کئی دن پہلے سے تیاری شروع کر دی تھی۔ کلاس کو اچھی طرح سجایا۔ دو ایک لڑکوں نے نظمیں یاد کی تھیں پوری کلاس مل کر ایک ڈراما کرنے والی تھی۔ دوسری کلاسیں بھی تیاری کر رہی تھیں لیکن ایسے موقعوں پر چھوٹی کلاسیں زیادہ دلچسپی سے کام لیتی ہیں۔ ہم لوگ بہت محنت سے تیاری کر رہے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ بے چینی سے اس روز کا انتظار بھی تھا۔ اس مرتبہ تجویز ہوئی تھی کہ مختلف طلبا تمام استادوں کی نقل کریں۔ جواں بخت نے مجھ سے کہا "تم عربی کے مولوی صاحب کے وعظ کی نقل کرنا بڑا لطف رہے گا!"

میں راضی ہو گئی۔ اب تو مجھے واقعی شوق پیدا ہو چلا تھا۔ مولوی صاحب کی نقل بیشک تو اچھی ہو گی۔

کالج کے باغ کے ایک کونے میں جواں بخت مجھے وعظ کی مشق کراتے۔ تھوڑا سا استادی اور شاگردی کا حال بھی ملاحظہ ہو۔

جواں بخت۔ کہو۔ بچو۔ میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ مذہب کی طرف سے بہت بے پروا ہوتے جا رہے ہو۔ بس دنیا ہی میں نیک نامی اور عزت حاصل کرنا چاہتے ہو۔"

اس کے جواب میں میں کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

جواں بخت۔ "دیکھو بھئی ہنسو نہیں!"

میں نے شرماتے ہوئے آہستہ سے کہا "بچو! میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ مذہب کی طرف سے . . . "

جواں بخت۔ ذرا آواز اونچی کرو۔"

"اونہہ آپ تو بیچ میں ٹوک دیتے ہیں۔ پورا جملہ بھی نہ کہنے دیا۔ ہم نہیں کہتے۔" یہ کہہ کر میں نے جواں بخت کی طرف سے منہ موڑ لیا اور قریب کی جھاڑی سے گلاب توڑ کر اس کی پنکھڑیاں گھاس پر بکھیر دیں۔

جواں بخت "پھولوں پر کیوں غصہ اتار رہی ہو۔ اچھا بھئی! پورا جملہ ختم ہونے کے بعد بتایا کروں گا۔"

میں ہنس کر جواں بخت کی طرف مڑ گئی اور پھر کہنا شروع کیا۔

اسی طرح روٹھ روٹھ کر مشق کرتی رہی۔ جس دن اچھی طرح کہہ لیتی تو مجھ سے زیادہ جواں بخت خوش ہوتے۔ کئی دن بعد مولوی صاحب کا

پیرا اختیار کرلیا مولوی صاحب کی ایسی آواز تو بنا نہ سکتی تھی۔

بہار کی خوشگوار رات تھی۔ جوہی اور بیلے کی بھینی بھینی خوشبو سے چاندنی کی ساری فضا معطر ہو رہی تھی۔ آسمان پر کہیں کہیں ہلکے ہلکے بادل بھی تھے۔ مجھے نیند نہ آتی تھی۔ کیونکہ صبح سالانہ اجتماع کا روز تھا۔ خوشی، شوق اور بے تابی نیند اڑائے دیتی تھی ہیں۔ کبھی وعظ کے جملے دہرانے لگتی اور کبھی مولوی صاحب کی شکل یاد کر کے خود ہی مسکرا دیتی۔ کم عمری میں ایسے موقعوں پر بڑی مشکل سے نیند آتی ہے۔ بس وہی حال میرا تھا۔ گیدڑ بڑی ڈراونی آواز سے چیخ رہے تھے۔ اس وجہ سے تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد میرے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ جاتا۔ صبح کے قریب آنکھ لگی۔

اسکول میں صبح سے بڑی چہل پہل تھی۔ دن بھر نہایت پرلطف پروگرام ہوتے رہے۔ شام کو میری باری آئی۔ میں کچھ مسکراتی، شرماتی اور جھجکتی ہوئی سٹیج پر جا پہنچی۔ پھر نہایت سنجیدہ منہ بنا کر کہنا شروع کیا

"بچو! میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ مذہب کی طرف سے بہت بے پرواہ ہوتے جا رہے ہو۔ بس دنیا ہی میں نیک نامی اور عزت حاصل کرنا چاہتے ہو۔ یہ دنیاوی باتیں کسی کام نہ آئے گی۔ (زانو پر ہاتھ مار کے) یاد رکھو! ایک دن تمہیں سب کو اس کے حضور میں جانا ہے اور اپنے اعمالوں کا جواب دینا ہے۔ ڈرو اس خدا سے کیونکہ وہ رحمٰن و رحیم ہے لیکن قہار بھی ہے ذرا سوچو کہ وہ تم کو پل میں کیا سے کیا بنا سکتا ہے۔ کیا تم کو نوح کا طوفان یاد نہیں! اس کا حکم ہے کہ نماز پڑھا کرو۔ نماز پڑھنا کتنا آسان کام ہے لیکن اس کی فضیلت بڑی ہے۔ افسوس ہم میں سے بہت سے ایسے بھی ہیں جو ایک وقت کی نماز بھی پابندی سے نہیں پڑھتے۔ نماز پڑھنے سے چہرے پر نور رہتا ہے۔ اس کی زندہ مثال ہمارے مولوی صاحب ہیں۔"

(مولوی صاحب کی شکل نہایت بھونڈی تھی، لہٰذا اس جملے کے ساتھ ہال میں ایک مسلسل قہقہہ گونجا۔ بس اسی طرح کا ٹوٹا پھوٹا وعظ کہا۔ لیکن وعظ کے دوران میں ہنستا تو کیا معنی مسکرائی تک نہیں۔ مجھے خود اپنی سنجیدگی پر تعجب ہو رہا تھا۔ وعظ ختم ہونے پر سارا ہال قہقہوں اور تالیوں سے گونج اٹھا۔ پرنسپل صاحب نے فرط مسرت سے گود میں اٹھا کر مجھے پیار کیا اور ایک کہانیوں کی کتاب دینے کا وعدہ کیا۔ میری اتنی ہمت تو نہ پڑی کہ دیکھتی کہ مولوی صاحب پر کیا گزری۔ لیکن جواں بخت نے بتایا۔ کہہ رہے تھے۔

"لڑکی کو گستاخ بنا دیا ہے۔ استغفراللہ! قرآن شریف اور حدیث کی باتوں کا مضحکہ اڑایا جائے!"

ہمارا اسکول دریا کے کنارے تھا۔ رات کو دریا میں متعدد ننھے ننھے چراغ بہائے گئے۔ عجیب پر رونق چراغاں تھا۔ ہم لوگ ٹولیاں بنا کر مختلف کشتیوں میں دریا کی سیر کرنے روانہ ہوئے۔ بڑا اچھا وقت تھا۔ کسی کی کشتی میں بانسری بجائی جا رہی تھی کہیں صرف گانا ہو رہا تھا۔ ہماری کشتی میں ایک لڑکا ٹھمری گا رہا تھا۔ اسی کشتی میں جواں بخت بھی تھے۔ کشتی کے اور لوگ گانے کی طرف متوجہ تھے کہ جواں بخت نے مجھے اٹھا کر گود میں بٹھا لیا۔ اس رات کو میں بے حد مسرور تھی۔ وہ رات! اس رات کا کیف! دریا میں چراغوں کی روشنی! پھر نغموں سے مدہوش فضا آج تک یاد ہے۔ میرا سر خود بخود جواں بخت کے شانے پر جھک گیا۔ میرے اللہ!!! جواں بخت نے مجھ سے آہستہ سے کہا۔

"لڑکی جلدی سے بڑی ہو جاؤ اور محبت کرنا سیکھو۔"

میں نے بے معنی مسکراہٹ کے ساتھ سر جھکا لیا۔

گھر واپس آ کر لباس تبدیل کیا اور سونے چلی گئی۔ دن بھر کی مصروفیات کی وجہ سے تکان تو بے حد تھی۔ لیکن پھر بھی نیند نہ آتی تھی۔ یا اللہ! یہ محبت کیا ہوتی ہے؟ محبت کرنا کیسے سیکھتے ہیں؟ اماں مجھے کتنا چاہتی ہیں۔ مجھ سے بے حد محبت کرتی ہیں۔ میں بھی اماں سے محبت کرتی ہوں تو کیا یہی محبت ہے؟ لیکن جواں بخت اماں تو نہیں جو ان کو چاہنے لگوں پھر میں نے اماں کے لئے محبت سیکھی تو نہیں۔ وہ تو ہمیشہ ہمیشہ سے میرے دل میں ہے نہیں نہیں یہ تو بہت ہے میں بھی کس قدر پاگل ہوں۔ ابھی تھوڑے دن ہوئے "شیریں فرہاد" فلم دیکھا وہ محبت تھی۔ فرہاد نے کتنے مشکل کام کئے تھے اور پھر خود ہی مر گیا تو کیا محبت میں مرجانا پڑتا ہے؟ توبہ! اتنی محنت کی اور پھر مر گئے۔ میں بھی محبت میں مرگئی تو اماں، ابا، اپنا گھر، یہ سب کہاں ملیں گے؟ شیریں نہیں زندہ دفن ہو گئی تھی۔ کیا مجھے بھی ایسا ہی کرنا پڑے گا؟ مجھ سے تو کبھی نہ ہو گا۔ فرہاد نے پہاڑ کھودا تھا اور یہاں تو ایک کیاری کھودنے سے ہاتھوں میں چھالے پڑ جاتے ہیں۔ مجھ سے اچھا تو مالی ہی ہے۔ وہ دن میں کئی کیاریاں تیار کر لیتا ہے۔ اللہ! جب محبت اتنی مشکل چیز ہے تو میں کیسے سیکھ سکتی ہوں۔ بھلا اس میں بڑے ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ خدا جانے میں کب بڑی ہو جاؤں گی۔ کیا اس وقت مجھ سے اتنے مشکل کام ہو سکیں گے؟"

ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آنے لگے۔ گزری رات کی تکان تھی ہی۔ پلکیں بھاری ہوئیں۔ پھر آنکھ لگ گئی اور محبت کا معصوم فلسفہ ختم ہوا۔

(۴)

ایک دن میں دریا کے کنارے خربوزوں کی باڑی میں کھڑی کچے پکے خربوزے توڑ رہی تھی۔ باڑی کا مالک مجھے منع کر رہا تھا لیکن میں کب ماننے والی تھی۔ اتنے میں جواں بخت آ گئے۔

"اوہ! اس چلچلاتی دھوپ میں تم یہاں ہو۔ تمہیں اس وقت یہاں آنے کی کس نے اجازت دی! لو بھی چل رہی ہے۔ فوراً گھر چلو۔"

ہم دونوں گھر کی طرف چل پڑے۔

"اور، جواں بخت! آپ خود اس دھوپ میں اتنی دور کیسے آ گئے؟"

"مجھے ایک ضروری کام تھا۔ اس طرف اپنے ایک دوست کے گھر گیا تھا۔ واپسی میں سوچا کہ کچے راستے سے چلا جاؤں۔ اتنے میں تم نظر آئیں۔"

"میں کیا کروں۔ دوپہر کو گھر میں سب سو جاتے ہیں۔ میرا دل گھبرانے لگتا ہے۔ اس لئے چلی آئی تھی۔"

"ایک بات پوچھوں؟ بتاؤ گی؟"

"کہیے!"

"تم میرے ساتھ شادی کرو گی؟"

مجھے ہنسی آ گئی لیکن میں نے اپنے سے بڑی لڑکیوں کو شادی کے نام سے شرماتے دیکھا تھا۔ مجھے تو ذرا بھی شرم نہ آئی۔ ہنسی ضرور آئی۔ میں نے منہ پر رومال رکھ لیا اور گردن نیچی کئے کر راستہ طے کرنے لگی۔ میں سوچ رہی تھی "شادی! سرخ سرخ کپڑے۔ عطر اور ابٹن میں لپی ہوئی دلہن۔ بارات کے باجے۔ دولہا کا جگمگ جگمگ سہرا۔ زرق برق کپڑے۔ باغ بہاری کا لٹنا۔ آتش بازی کی بہار۔ سسرال میں دلہن کی منہ دکھائی۔ دلہن ایسی دلچسپ چیز" بس اس وقت میرے لئے شادی کا مفہوم صرف یہی باتیں تھیں۔

جواں بخت نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "بولو!"

میں نے زمین کو گھورتے ہوئے "ہاں" کہہ دیا۔

تھوڑی دیر میں ہم لوگ گھر پہنچ گئے۔ لیموں کا شربت پیا اور ایک ٹھنڈے کمرے میں بیٹھ گئے۔ باہر خوب لو چلتی رہی۔ بگولے بھی اٹھ رہے تھے۔ ہم لوگ برقی پنکھا لگائے بڑے مزے سے باتیں کرتے رہے۔ شام کو جواں بخت اپنے گھر چلے گئے۔

(۵)

موسم گرما کی تعطیلات آ گئیں۔ زیادہ تر وقت بیکاری میں گزرنے لگا۔ پڑھائی کی مصروفیتیں، اس کے بعد اتنی طول طویل فرصت [illegible] سے دن کٹتا تھا۔

ایک دن میں دریا پر نہا رہی تھی۔ [illegible] دیر پہلے کا وقت تھا۔ آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ کرنیں دریا کے پانی کو سنہرا بنا رہی تھیں۔ کچھ دریا پار پہاڑوں پر پڑ رہی تھیں۔ آفتابی ذرہ نیا کی [illegible] خیز موجوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ دن بھر کے تھکے ماندے پرندے سست رفتار سے اپنے آشیانوں کی طرف جا رہے تھے۔ دریائی چڑیاں مایوس آواز سے بول رہی تھیں۔ گائے بھینسیں جنگل سے شہر کی طرف واپس آ رہی تھیں اور میں اُتھلے پانی میں کھڑی ہوئی نہایت انہماک کے ساتھ ناچ رہی تھی۔ میرے سامنے دیہاتی عورتیں اور دھوبنیں کھڑی تھیں۔ میں کہہ رہی تھی۔

"دیکھو! ہم نے سینما میں ایک عورت دیکھی تھی وہ اس طرح تالاب میں ناچتی تھی۔"

دیہاتی عورتیں ہنس ہنس کر دیکھ رہی تھیں۔ جب میں ذرا تھک گئی تو سر اٹھا کر دیکھا۔ میرے اللہ! امیری روح نکل گئی۔ سر چکرا گیا۔ پگ ڈنڈی پر جواں بخت مع اپنے چند دوستوں کے مسکرا مسکرا کر میرا تماشا دیکھ رہے تھے۔ ڈوب مروں! جسم پر صرف تیرنے کا لباس تھا وہ بھی بھیگا ہوا۔ وہیں بیٹھ گئی۔ گردن جھکا لی۔ کپڑے اتنی دور تھے کہ زمین پر کافی چلنا ہوتا اور پانی سے نکلنے کے بعد میں ان لوگوں کے لئے ایک اور مضحکہ خیز سین پیش کرتی۔

اپنی کم سنی کے زمانے میں شاید اسی روز مجھے سب سے زیادہ اور حقیقی معنوں میں شرم کا احساس ہوا۔ یا یوں کہئے جی چاہتا تھا ہیں ڈوب مروں۔ جواں بخت نے مجھے یوں دیکھیں اور پھر وہ بھی ناچتے ہوئے

تھوڑی دیر میں ڈرتے ڈرتے نگاہ اٹھائی تو [illegible] میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ کپڑے پہن کر لڑکھڑاتی ہوئی چال سے گردن نیچی کئے گھر آئی۔ لیکن حیا سے عرق عرق ہوئی جاتی [illegible] تھی اللہ بچائے۔

اس دن سے میری ہمت نہ پڑی کہ [illegible] کے گھر جاؤں۔

چاندنی چھٹیوں کے دن تھے۔ جی بھی بہت چاہتا تھا۔ لیکن اس شام کا خیال آتے ہی قدم رک جاتے۔

(۶)

اکثر شام کے وقت میں ایک چمپا کے درخت کے پاس بیٹھ جاتی تھی۔ وہاں سے ساحل اور دریا اچھی طرح نظر آتے تھے۔ جواں بخت کا انتظار کرتی کہ شاید اس طرف سے کبھی گذریں۔ چند روز بعد میں نے سنا کہ وہ چھٹیاں گذارنے اپنے وطن جا رہے ہیں۔

اسی روز شام کو میں نے ساحل پر انہیں دیکھا۔ وہ میرے ہی گھر آ رہے تھے۔ بڑی ہمت کر کے میں خود ان کے پاس چلی گئی۔ ملنے آئے تھے کہنے لگے

"چھٹیوں کے بعد فوراً ہی آؤں گا۔ تم مجھے یاد تو نہیں کرو گی؟"

"کیوں نہیں — ضرور یاد کروں گی۔ آج کل چھٹیوں میں تو وقت بھی نہیں کٹتا!"

کچھ مسکرا کر بولے "اچھا تو پھر میں جلد آنے کی کوشش کروں گا۔ تم انتظار کرنا خدا حافظ۔ مجھے اور جگہ بھی ملنے جانا ہے دوست انتظار کر رہے ہوں گے"

"خدا حافظ! ذرا جلد آئیے گا!"

(۷)

ان واقعات کو سالہا سال گذر گئے۔ چمپا کا درخت اپنی جگہ بدستور کھڑا ہے میں ہر روز شام کو جواں بخت کا انتظار کرتی ہوں۔ سورج دریا پر نور کی بارش کرتا ہوا غروب ہو جاتا ہے شفق کی دلفریب سرخی میں کبھی امید اور کبھی نا امیدی کی جھلک نظر آتی ہے۔ کسی کسی دن وہی سرخی ہوتی ہے جیسی جواں بخت کے جانے کے روز تھی۔ ایسے دن مجھے امید ہوتی ہے کہ شاید جواں بخت اب آتے ہوں۔ یہی رنگت ایک دن انہیں یہاں کھینچ لائی تھی۔

اونچے اونچے پہاڑ شاید میرے ناکام انتظار پر ہنسا کرتے ہیں۔ شام کی اداس سیاہی میں پرندے اپنے آشیانوں کا رخ کرتے ہیں۔ سرد ملکوں کے پرندے ہر چھ ماہ بعد آتے ہیں۔ لیکن جواں بخت نہیں آتے۔ دریائی پرندے سیٹی بجا کر مجھے میری مایوسی کا احساس دلاتے ہیں۔ دریا میں طغیانی آتی ہے اور میرے آنسو مسلسل بہنے لگتے ہیں ستاروں بھری راتیں اب بھی آتی ہیں۔ دنیا والے دریا کی سیر کا لطف اٹھاتے ہیں لیکن آہ! شاید میری دریا کی سیر اسی روز ختم ہو گئی تھی۔ جواں بخت! آ جاؤ! دیکھو اب میں کتنی بڑی ہو گئی ہوں۔ شاید اب تمہیں مجھ سے محبت کرنا

سلیمہ سلطانی بیگم لکھنوی

دعوتِ عمل

زندگی کیا ہے؟ نمودِ پیچ و تاب!
موت کیا شے ہے؟ جمودِ انقلاب!

سرِ عیشِ جاودانِ پاستاں!
سوز و سازِ عشق و جرأت کا شباب!

روحِ محفل! بادہ و رقص و سرود!
ورنہ ہیں بے سود طاؤس و رباب!

"ہر چہ در خود داشتی! در باختی"
تجھ کو خوش آئی نہ افرنگی شراب!

دل کی غفلت، موت! بیداری، حیات!
اس کی جنبش، شورِیم! سکنت، سراب!

"گوہرِ شہوار بر ساحل مجو!"
تیشہ زن بر صدف و یم منزل بیاب!

ابرار احمد فاروقی عزمی

رباعیات

(۱)

فطرت نہیں کوئی بات سننے کے لئے
ہے دل کی بات کہنے کے لئے
بے چین ہے نغمۂ حیراں
دے حکم سخن لبوں کو ہلنے کے لئے
اب وقت نہیں خموش رہنے کے لئے

(۲)

محفل میں ملے گا وہ، نہ تنہائی میں
بن میں ہے نہ گل کی رعنائی میں
کہسار میں ہے نہ یم میں
تو جس کی تلاش میں ہے شب و روز
آ دیکھ وہ میرے دل کی گہرائی میں

(۳)

ہر چیز کو بے نقاب دیکھا نہ گیا
ذرہ کوئی بے آفتاب دیکھا نہ گیا
کچھ سوچ کے منہ چھپا لیا پردوں میں
آپ اپنا ہمسر جواب دیکھا نہ گیا

(۴)

بندش سے دل کو بے پر کر دو
بر جادہ کی زندگی کو دوبھر کر دو
کرتے ہیں جو جبر و شقاوت پہ رضی
ان سنگدلوں کو اور پتھر کر دو

حرماں خیرآبادی

ایک راہبہ کے محبت نامے

(تعارف)

اس سے پیشتر کہ ہم ان خطوط کا مطالعہ شروع کریں، یہ جاننا ازبس ضروری معلوم ہوتا ہے کہ وہ خاتون کون تھی جس کی طرف سے یہ خطوط لکھے گئے، اور ان کا مخاطب کون تھا!

ان خطوط کی لکھنے والی پرتگال کی ایک راہبہ تھی، جس کا نام میری آنا الکافاریدو تھا، اور اِن کا مخاطب ایک فرانسیسی نوجوان نوئل باوٹن ڈی شامیلی تھا جو بعد میں مارکوئس آف شامیلی کے نام سے مشہور ہوا

خطوط کی اصل زبان جس میں یہ لکھے گئے، پرتگالی ہے، انگریزی زبان میں ترجمہ ہوکر یہ خطوط اس قدر ہر دلعزیز ہوئے اور پسند کئے گئے، کہ تقریباً بیس مرتبہ کتابی صورت میں اشاعت پذیر ہوئے

ایک فاضل نقاد لکھتا ہے "اسپین اور پرتگال کی باہمی کشمکش اور جنگ و جدل سے جو بہترین اور بیش بہا خزانہ دنیا کے ہاتھوں میں آیا، وہ ایک پرتگالی راہبہ کے محبت نامے" ہیں!!

اس سے پہلے کہ ان خطوط پر تنقیدی نگاہ ڈالی جائے، ہمارا شوق ہمیں یہ جاننے کے لئے مجبور کرتا ہے، کہ محبت کا وہ رومانی ڈراما کیسے شروع ہوا، جس کی وجہ سے یہ غیر فانی محبت نامے وجود میں آئے! ۱۶۶۱ء میں نوئل باوٹن ڈی شامیلی جو سینٹ لیگر کا کاؤنٹ بھی تھا۔ شاہِ فرانس کے اشارے سے فرانسیسی فوجوں کا سپہ سالار بن کر پرتگال کی سرحد پہ آکر ٹھیرا۔ یہ نوجوان سپہ سالار اس وقت عین عنفوانِ شباب میں تھا، اور میری آنا اس وقت بیجا (پرتگال کا ایک چھوٹا سا قصبہ) کے ایک معبد میں راہبہ کی حیثیت سے اپنی خاموش اور پُرسکون زندگی گزار رہی تھی، کہ ناگاہ اس نوجوان کپتان نے اپنی مداخلت سے بہ یک جنبشِ نظر معصوم راہبہ کی زندگی کے مطمئن خوابوں کو درہم برہم کر دیا! وہ تقریباً ہر روز معبد کے گرد آکر طواف کرتا، جس کا نتیجہ یہ ہوا، کہ آہستہ آہستہ اس نے اس راہبہ کو اپنے دامِ محبت میں پھنسا کر ہی دم لیا، جسے بعد میں وہ تنہا آتشِ عشق کے ساتھ کھیلنے کے لئے اور اپنے ہجر میں تا عمر سسکیاں بھرنے کے لئے چھوڑ کر اپنے وطن یعنی فرانس چلا گیا!!

فرانس جا کر اس رنگیلے نوجوان نے پھر بدنصیب میری آنا کی طرف رُخ تک بھی نہ کیا، یہاں تک کہ اُسے بالکل فراموش کر دیا!! لیکن مظلوم میری آنا نے اپنے اس بے وفا عاشق کو جسے عاشق کہنا سراسر محبت کا خون کرنا ہے۔ مرتے دم تک اپنے دل سے نہ بھلایا، اور اس اولین محبت کو فطرت کا ایک غیر فانی عطیہ تصور کرتی رہی!!

اُس نے ایک معمولی دنیا دار انسان کی طرح نہیں بلکہ اپنا مذہب اپنا ایمان جان کر اپنے جذبۂ محبت کی پرستش کی!!

وہ محبت کو اپنی زندگی کی حقیقی مسرت خیال کر کے اپنے مایوس اور تلخ مستقبل کو بھلاتی رہی!!

اُس نے کبھی اس گمان کو اپنے دل میں جگہ نہ دی کہ محبت ناشکر گذار، بے رحم اور بے مروت بھی ہوتی ہے!! اُس نے اپنے عاشق کی سخت سے سخت لغزشوں کو بھی بھول جانے کی کوشش کی اور ساری عمر اسی خام امید میں جیتی رہی ؎

باشد کہ باز بینم آں یارِ آشنا را!!

اس کا ذکر کرنا بھی ہمارے لئے نہایت ضروری ہے کہ اُس مظلوم و بدنصیب راہبہ کی سچی اور پاکیزہ محبت کا ذرا سا احساس بھی کئے بغیر اس کے بے وفا عاشق نے فرانس کے ایک معزز اور متمول گھرانے کی لڑکی سے شادی بھی کر لی!! یہ کوئی نئی بات نہیں، ایسا اکثر ہوتا رہتا ہے دنیا میں اس نوع کے قصوں کا فقدان نہیں! — آہ، سچی محبت کے لئے دنیا ردّی بھی ہے، — اور ساتھ ہی ساتھ اُس کا مذاق بھی کس خوبصورتی سے اڑاتی ہے!!!

کیا دنیا کی کوئی عورت جسے غریب میری آنا کی محبت کا تلخ انجام

معلوم ہو۔ اپنی جنس کے جذبۂ حمایت سے متاثر ہو کر مارکوئس ڈی شاٹیلی کے اس قصور کو کبھی معاف کر سکتی ہے!

. . . .

ان محبت ناموں کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک محبت کی راندی ہوئی خاتون کی لطیف نگارش کے مرہونِ منت ہیں، اور ایک یاس خوردہ اور دل شکستہ روح کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں!!

ان محبت ناموں کا کوئی جملہ ایسا نہیں جس میں درد و الم کی چنگاریاں ملفوف نہ ہوں اور جملے کا کوئی لفظ ایسا نہیں جو ایک رقت انگیز خلش اپنے اندر نہ لئے ہوئے ہو!! ہر ایک محبت نامے سے گدازِ محبت کے انگارے ابل رہے ہیں!! (ان محبت ناموں کی تعداد پانچ ہے)

سب سے آخری محبت نامہ اس مظلوم راہبہ کی بدنصیب محبت کا فیصلہ ہے گو ناکام!! اور اس بے رحمانہ صلے کا نتیجہ ہے، جو اُسے اپنے بے وفا اور سفاک عاشق سے اپنی پرخلوص محبت کے عوض میں ملا۔

مترجم

پہلا خط!!

آہ! اے مظلوم میری آنا تو کتنی نادان رہی کہ اپنی محبت کی اصلیت کو بھی نہ جان سکی اور آہ! اے بدقسمت انسان! تونے خود بھی فریب کھایا اور مجھے بھی جھوٹی امیدوں کی دنیا سونپ دی۔

محبت کا وہ اولین معصوم جذبہ جو ہم دونوں کی مسرتوں کا ایک رنگین خواب تھا! اب اس میں ایک ابدی محرومی کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ جدائی کے بے رحم لمحوں نے محبت کی دوامی بہار لوٹ لی۔

آہ! کیا یہ جدائی جس نے میری محبت کی دنیا کو پریاس بنا دیا! اب مجھے تم سے کبھی نہ ملنے دے گی۔ کیا میں ان آنکھوں کا نظارہ اب نہ کر سکوں گی۔ جن کی حسین شعاعیں میری محبت کی آفرینش کا خلاق بنیں اور جن کی کیف آور مستیوں نے میری روح کو قرار و سکون کے ساتھ ہمکنار کیا۔

افسوس اُس دل میں جس سے کبھی میں تمہاری پرستش کیا کرتی تھی اب سوائے ناامیدیوں اور حسرتوں کے کچھ نہ رہا۔ یہ معلوم کر کے کہ تم نے اب مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا رہنے کی قسم کھالی ہے! مجھ پر غم و اندوہ کا ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے اور میرے حواس گم ہو گئے ہیں۔ آہ تمہاری جدائی کا صدمہ میں زندہ رہ کر کیونکر برداشت کر سکوں گی!

تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میری آرزوؤں کو خاک میں ملانے والے صرف تم ہی ہو۔ میں نے پہلی بار دیکھتے ہی تمہیں اپنا سب کچھ دے دیا! اب بھی میں اپنی زندگی کی تمام تر رنگینیاں تم پر نثار کرنے کے لئے تیار ہوں۔ میں دن بھر تمہاری محبت کے خواب دیکھتی رہتی ہوں! اور روتی رہتی ہوں۔ میرے غمزدہ دل کی خاموش آہیں تمہیں تلاش کرنے جاتی ہیں۔ مگر تمہاری جانب سے ناکام ہو کر لوٹ آتی ہیں۔ میری سینہ کوبی کی دلیل اس سے زیادہ اور مایوس کن کیا ہو سکتی ہے کہ اپنے مظلوم و ستم رسیدہ دل کو خود ہی سمجھاتی ہوں۔

بدنصیب میری آنا! آنسو نہ بہا! آہیں نہ بھر! ناحق اپنے دل کو غم سے پاش پاش نہ کر۔ تو جس محبوب کی جستجو میں پریشان ہو رہی ہے۔ وہ تجھے اب کبھی حاصل نہ ہو سکے گا۔ وہ تجھ سے جدا ہو کر سنگدلی کی انتہا سے بھی پرے چلا گیا ہے۔ وہ فرانس کی بزمِ طرب میں مصروفِ عیش و نشاط ہے وہ تیرے خلوص تیری محبت اور تیرے جنوں سے بالکل بے پروا ہے۔ وہ تیری آہ و زاری کو بھولا ہوا ہے اُس کا دل تیرے معصومانہ اعترافِ محبت سے ہرگز ہرگز گداز نہ ہو سکے گا!!

مگر نہیں، میں تمہاری محبت کو اس قدر سنگدلی سے مجرم قرار نہیں دے سکتی میں نے تم سے بے انصافی کی۔ تم بے قصور ہو، بے گناہ ہو، میں یہ کیسے مان لوں کہ تم نے مجھے بھلا دیا ہے۔ یہ صرف میرے دل کے شکوک ہیں اور اُن کی فریب کاریاں جن کی وجہ سے میں رنجیدہ ہو رہی ہوں۔ آہ، میں اُن تکلیفوں اور رکاوٹوں کو جو تم نے میری محبت کو آسان بنانے میں برداشت کیں کیسے بھلا سکتی ہوں۔

تمہاری محبت کی سرگرمیوں اور خلوص نے ہی مجھے تمہارا شیدا بنایا تھا، یقیناً یہ ناشکرگزاری ہوگی۔ اگر میں بھی تمہیں ان ہی صمیم جذبوں کے ساتھ نہ چاہوں جن سے تم نے میرے ساتھ محبت کی۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایسے مسرور کن لمحوں کی یادگار اس قدر تلخ ہو! مگر گزشتہ لطف و نشاط کی ساعتیں مجھے جس دم یاد آتی ہیں میں بے قرار ہو جاتی ہوں۔

یقین جانو کہ تمہارے پہلے محبت نامے کو پڑھ کر میں مضطرب

دل کو ہوا اور میرے ذہن کے ساتھ جو گزری وہ حالت نہایت روح فرسا اور ناقابل بیان ہے! جی چاہتا تھا کہ میں اپنے دل کی اسی خستگی و پشیمانی کے ہمراہ تمہاری تلاش میں نکل پڑوں۔ مجھ پر یاس و ناامیدی کے مجروح کن جذبات نے اتنا غلبہ پایا کہ میں تقریباً تین گھنٹے تک بالکل بے ہوش پڑی رہی۔ کاش! میں اسی بے ہوشی اور بے حالی کی حالت میں ہی مر جاتی! اور اپنی اس زندگی کو جسے ہر وقت تمہارے قدموں میں نچھاور کرنا چاہتی ہوں تمام خوشیوں کو تمہاری محبت کے غم میں سمجھ پاتی۔ تھوڑی دیر کے بعد جب مجھے ہوش آیا میں نے اپنے دل کو اس خیال سے تسلی دی کہ میں تمہاری محبت میں جان توڑ رہی تھی اور ساتھ ہی یہ جان کر مسرور بھی ہوئی کہ اب میرا دل تمہاری مفارقت کے غم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہا ہو جائے گا!!

بعد ازاں الفت کے ابتدائی لمحات سے لے کر اب تک میں تمہاری جدائی کی گھڑیوں میں تڑپ رہی ہوں اور جب تک تم مجھے نظر نہ آؤ گے یوں ہی تڑپتی رہوں۔

تمہاری فرقت کے غم میرے لئے مسرت کے پیغام ہیں کیونکہ وہ میری پریاس و حرماں خلوت میں تمہاری طرف سے دل خوش کن نغمے ہوتے ہیں جن کی رنگینیوں میں میرا دل محبت کے سنہری خواب دیکھتا ہے!!

آہ کیا میری پرخلوص محبت کا انعام یہی ہے کہ میں تمہارے ہجر کے شعلوں سے ہی اپنے آپ کو خوش کرتی رہوں! مجھے تم سے کسی قسم کا صلہ نہیں چاہیئے کیونکہ میں نے اب عہد کر لیا ہے کہ میں دنیا میں تمہارے سوا اور کسی سے محبت نہ کروں گی! میں صرف تم کو ہی اپنی آرزوؤں کا مرکز بنانا چاہتی ہوں اور اپنی یہ ناکام زندگی تمہارے ہی لئے وقف کر چکی ہوں!!

کاش میں بھی یہ امید کر سکتی کہ تم بھی میرے سوا اور کسی کو پیار نہ کرو گے کسی اور کو نہ چاہو گے اگر میں پوچھتی ہوں۔ کیا تم میری محبت میں اتنے سرگرم اور ثابت قدم ہو جتنی کہ میں ہوں تمہیں یقیناً دنیا میں مجھ سے جسے تم کئی بار اپنی نظروں سے خوب صورت کہہ چکے ہو زیادہ حسین و جمیل صورتیں مل جائیں گی۔ مگر محبت سے خالی۔ . . اور ظاہر ہے کہ محبت کے بغیر حسن کی لطافتیں یکسر بے رنگ و بے کیف ہیں!

خط میں اس قسم کی باتیں لکھ کر کے میں تمہیں یاد کیا کروں۔ میرا دل نہ جانے کیوں کہتا ہے کہ میں تمہیں کبھی نہیں بھول سکتی۔ تم نے مجھے یہ امید دلائی ہے کہ تم مجھ سے ملنے کے لئے آؤ گے اور کچھ دن میرے پاس رہو گے بھی کیا میں اس کا شکوہ کروں . . . میری دلی آرزو ہے کہ تم اپنی ساری کی ساری زندگی میرے پاس گزار دو۔ کاش اگر یہ ممکن ہو سکے کہ میں اس کمبخت معبد کو چھوڑ سکوں تو میں سرزمین پرتگال میں بیٹھ کر تمہارے عہد و پیمان کی تکمیل کی کبھی بھی منتظر نہ رہوں۔ اپنے انجام سے بے خبر ہو کر میں تمہاری جستجو میں چل پڑوں تم چاہے کہیں بھی ہو میں تمہارا تعاقب کرتی رہوں اور تمہیں محبت کرتی جاؤں! مگر آہ، یہ تو سب دل کے بہلانے کی باتیں ہیں۔ ایسا کیوں ہونے لگا میری امیدیں کبھی بار آور نہ ہوں گی مجھے فطرت نے صرف غم جھیلنے کے لئے ہی پیدا کیا ہے خوشیوں کے لئے نہیں اتنا غنیمت ہے کہ میرے بھائی کی وساطت سے مجھے یہ موقع ملا کہ میں تمہاری طرف یہ لکھ کر بھیج سکوں۔ اس خیال نے میرے غم کے بار کو کچھ نہ کچھ ہلکا کر دیا اور عارضی طور پر کچھ لمحوں کے لئے میں اپنے غم کو بھول بھی رہی!

میں تمہیں قسم دلا کر پوچھتی ہوں کہ جب تم جانتے تھے کہ میرا ساتھ نہ نبھا سکو گے تو تم نے مجھے اس قدر رجھانے اور اپنا بنانے کی کوششیں کیوں کیں، اور مجھے اتنی بے رحمی سے تباہ و برباد کیوں کیا تم نے میرا رہبانہ سکون مجھ سے کیوں چھینا میری روح کا اطمینان کیوں لوٹا! کیا میں نے کبھی تمہیں کوئی تکلیف دی تھی!!؟

مگر آہ، مجھے معاف کرو میں تمہیں کوئی الزام دینا نہیں چاہتی میں نے تم سے انتقام نہیں لینا میں اس معاملے میں صرف اپنی رو سیاہ قسمت کو ہی سزاوار ٹھہراتی ہوں اس ظلم پیشہ ساحرہ نے ہی ہمیں ایک دوسرے سے جدا کیا۔ اس نے ہماری مسرتوں کو تاراج کیا۔ اس نے ہماری محبت کو مجروح اور پائمال کیا!!

خیر قسمت خواہ کیسی ہی سخت گیری سے ہم پر مظالم ڈھائے، ہمارے دل کبھی جدا نہیں ہو سکتے۔ محبت نے جو ہر طرح قسمت سے زیادہ پائیدار ہے۔ ہمارے دلوں کو زندگی بھر کے لئے ایک کر دیا ہے۔

اگر تمہیں بھی مجھ سے کچھ محبت ہے تو مجھے خط کے ذریعے ہی کبھی کبھی یاد کر لیا کرو۔ کیا مجھے یہ حق حاصل نہیں کہ میں بھی تم سے تمہارے دل کا حال پوچھوں اور کم از کم تمہارے ماحول کی سرگرمیوں سے ہی آگاہ ہوتی رہوں!

اچھا اب ان باتوں کو چھوڑو اور سب سے پہلے مجھے بتاؤ کہ تم مجھے ملنے کے لئے کب آ رہے ہو! جی نہیں چاہتا کہ اس کاغذ کے پرزے کو ہاتھوں سے چھوڑوں۔ اس لئے کہ اس نے تمہارے ہاتھوں کو چھونا ہے۔ کاش مجھے بھی ایسی خوش قسمتی حاصل ہوتی!

دیکھا! اتنی احمق ہو گئی ہوں! جب کہ مجھے اس کا خوب علم ہے کہ میرے ایسے نصیب کہاں! الوداع . . . اب مجھ سے کچھ نہیں لکھا جاتا سوائے اس کے کہ تم مجھے اپنی نہ بھولنے والی محبت سے ہمیشہ چاہتے رہو اور میرے مظلوم دل کی خلش کو بڑھاتے رہو!!!

عظیم قریشی

اعتماد

مضحکہ خیز نظر آتی ہے یہ بات مجھے
کر رہے ہیں ہدفِ یورشِ آفات مجھے

کیا جوانی کی روایات سے آگاہ نہیں
یہ ستمگر مگر اس بات سے آگاہ نہیں

کہ بلند عرش سے جرأت کا علَم رکھتے ہیں
سینۂ مہر پہ ہم لوگ قدم رکھتے ہیں!

اس پہ حیراں ہوں کہ ہے برق کوئی ایسی بھی
جس کی فطرت میں ہو شوریدہ سری ایسی بھی

کہ مری راہ میں ڈٹ جائے جگرداری سے
موت سے آ کے لپٹ جائے جگرداری سے

کوئی بپھرا ہوا طوفان ہے ایسا بھی مگر
جس کا دم توڑ کے رکھ دے نہ مرے غیض کا ڈر

کارواں مست جوانی کا جدھر جاتا ہے
زلزلے ڈال کے ہر سمت گزر جاتا ہے

یہ چٹانوں کو الٹتے ہوئے دریا کیا ہیں
آندھیاں کیا ہیں، دہکتے ہوئے صحرا کیا ہیں

جس کو چھو جائے تنفّس بھی، وہ مر جاتا ہے
موت کے دیو کا چہرہ بھی اتر جاتا ہے

گردشِ شام و سحر حکم پہ سر دھنتی ہے
بات جو کہتے ہیں فطرت اُسے خود سنتی ہے

اہرمن سجدۂ تعظیم بجا لاتا ہے!
ہم جہاں جاتے ہیں ہمراہ خدا جاتا ہے

جدم

دنیائے ادب

شہر قدیم پومپیائی

دنیا میں بعض ایسے نفائس موجود ہیں کہ ان کا تعلق کسی خاص قطعہ یا ملک سے نہیں ہے۔ بلکہ حقیقتاً وہ تمام اہل دنیا سے تعلق رکھتے ہیں اور جس شخص کو کچھ بھی علم یا آرٹ سے مس ہو، وہ ان کے خراب یا معدوم ہونے سے افسوس ظاہر کرتا ہے اور ان کے دیکھنے یا کم از کم ان کا حال نہایت شرح و بسط کے ساتھ سننے سے خوشی محسوس کرتا ہے۔ آج ہم ناظرین کو اٹلی کے ایک قدیم تاریخی شہر کی سیر کرائیں گے۔ اس شہر کا نام پومپیائی ہے، جو تقریباً سترہ سو برس خاک کے نیچے دبا رہا ہے۔ اس کے تمام ظاہری آثار مٹ گئے تھے کہ اتفاق سے زمین کے نیچے سے اس کے چند نشانات ظاہر ہوئے اور اس طرح دنیا کو اس شہر کا حال معلوم ہوا۔

پومپیائی ولادت مسیح کے اوائل میں ایک چھوٹا سا خوبصورت شہر تھا اور اٹلی کے مغربی ساحل پر کوہ ویسیوویس کے جنوبی دامن میں مشہور شہر ناپل سے چار پانچ میل مشرق کی جانب واقع تھا۔ سلطنت روما کے اشراف و امیان گرمی کا موسم اسی مقام پر گزارتے تھے۔ اس شہر کی آبادی بیس ہزار نفوس تھی۔ لوگ آسائش کی زندگی بسر کرتے تھے اور اس حقیقت سے بالکل بے خبر تھے کہ اس پر نشاط وادی کے نیچے شرربار آگ شعلہ زن ہے اور کسی دن سخت پتھروں کو پھاڑ کر آتش باری شروع کر دے گی۔ جدید کشفیات علمی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوہ ویسیوویس نہایت قدیم زمانے میں آتش فشاں رہا ہے۔ لیکن اُس زمانے میں جس کا ذکر ہم کر رہے ہیں نہایت سرسبز اور دلکش پہاڑ تھا۔ اس کے جاں بخش اور روح افزا مناظر دور دور سے لوگوں کو کھینچ لاتے تھے۔ لیکن آتش فشانی کے کوئی آثار بھی نظر نہیں آتے تھے۔ چنانچہ جغرافیائے عمومی میں لکھا ہے کہ اس پہاڑ کے سرسبز دامن میں مغربی جانب ایک دریا بہتا تھا، پہاڑ کی چوٹی تک تمام زمین مزروعہ تھی اور کسی شخص کو بھی یہ گمان نہ ہو سکتا تھا کہ اس سرسبز اور پھولوں سے پُر سرزمین کے شکم میں آگ خوابیدہ ہے۔

۲۴ اگست ۷۹ء کی رات کو اچانک پہاڑ آتش فشاں ہوا۔ کوہ آتش فشاں جس کو یورپین زبانوں میں والکان[1] کہتے ہیں کی شکل ایک مخروطی مینار کی مانند ہوتی ہے۔ اس کی چوٹی سے ہمیشہ دھواں اور بخارات خارج ہوتے رہتے ہیں اور کبھی اس طرح ہیجان میں آتا ہے کہ ابلتا ہوا پانی، پتھر اور دوسرے پگھلے ہوئے مادے نہایت شدت سے اس میں سے نکلتے ہیں اور بعض اس قسم کے پہاڑ ہیں کہ ہمیشہ حالت ہیجان میں رہتے ہیں۔ قدیم زمانے میں بہت سے پہاڑ آتش فشاں تھے۔ جو اب خاموش اور جامد ہو گئے ہیں۔ ان میں سے دکن کی سطح مرتفع بھی ہے۔ جو گزشتہ زمانے میں آتش فشاں تھی، اور اب بالکل خاموش ہے۔ اس وقت بھی روئے زمین پر تقریباً ۱۲۲۰ آتش فشاں پہاڑ موجود ہیں۔ ان میں سے ۲۷۰ زیادہ اہم ہیں۔ ۴۰۰ سے بھی زیادہ ہیں کہ اس وقت خاموش ہو گئے ہیں۔ آتش فشاں پہاڑوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ ہیجان میں آنے سے پہلے ان سے بعض علامات ظاہر ہوتی ہیں اور دوسری یہ کہ بغیر کسی قسم کی علامات متنبہ کے ناگہانی طور پر آتش فشانی شروع کر دیتے ہیں۔ جو علامات قسم اوّل میں ظاہر ہوتی ہیں۔ زیادہ تر بادل کی گرج کی مانند آوازیں ہوتی ہیں، جو اندرون زمین سے سنی جاتی ہیں یا قرب و جوار کی زمین میں زلزلہ آتا ہے اور ہوا اتنی ساکن ہو جاتی ہے کہ سانس لینا بھی دشوار ہوتا ہے۔ چشمے خشک ہو جاتے ہیں اور اس کے بعد اس قدر بھیانک آواز اور تیزی سے آتش فشانی شروع ہوتی ہے جیسے یک دم کئی توپیں داغی جائیں۔ اس وقت اس کے دہانے سے

[1] والکان والکانوس سے جو آتش و فلزات کے دیوتا کا نام ہے، ماخوذ ہے اور قدیم یونانی یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اس دیوتا نے اپنی دھونکنی اور بھٹی کو اس پہاڑ کے نیچے رکھا ہوا ہے اور اسے دھونکتا ہے جس کی وجہ سے یہ آتش فشانی ہوتی ہے۔

بخارات اور غلیظ و کثیف دھواں باہر نکلتا ہے۔ بجلی کڑکتی ہے اور زمین کا مواد لاوے کی صورت میں بڑے بڑے پتھروں کے ساتھ باہر گرتا ہے۔ آخر کار مواد ذائبہ پگھلے ہوئے رہے کی مانند ہوا میں ایک فوارے کی شکل میں اچھلتا ہے اور زمین پر بہہ نکلتا ہے۔ اس ہیجان کے کچھ عرصہ بعد پہاڑ میں سکون ہو جاتا ہے لیکن پھر جلد ہی اسی طرح پہاڑ کے دہانے سے دھواں اور بخارات بلند ہوتے ہیں اور دوسرے ہیجان تک بلند ہوتے رہتے ہیں۔ آتش فشاں پہاڑوں کی قوت اور مادے کی مقدار جو ان کے دہانے سے خارج ہوتا ہے اس قدر ہے کہ ایک جاہل شخص کو ان کے تسلیم کرنے میں تامل ہوگا۔ چنانچہ جزیرہ سسلی میں جو پہاڑ آتنا ہے وہ جب ہیجان میں آیا تو ایک ہی آتش فشانی میں اس نے قریباً تین ہزار مکعب میٹر مواد آتشیں باہر نکال پھینکا اور اسی کوہ ویسیوویس سے جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں ایک موقع پر اتنا لاوا نکلا کہ جب وہ منجمد ہو گیا تو اس کا حجم تقریباً دس ہزار مکعب میٹر تھا اور یہاں تک کہ ایک دوسرے ہیجان میں مادہ ۱۴ ہزار مکعب میٹر تک پہنچ گیا اور اسی طرح جزیرہ آئیسلانڈ میں ایک پہاڑ سے ۱۷۸۳ء میں لاوے کے دو بڑے بڑے آتشیں دریا جاری ہوئے۔ ان میں سے ایک کا طول سات کوس اور عرض دو کوس اور دوسرے کا طول بارہ کوس اور عرض چار کوس تھا۔ ان کی گہرائی بیابانوں میں تین گز اور دروں میں قریباً بیس گز تھی اور کبھی کبھی بڑی بڑی چٹانیں اور پتھر کہ ان میں سے ایک ایک کا وزن بیس بیس من تھا ، دو تین میل کے فاصلے پر پڑے ملے۔ یہاں تک دیکھا گیا ہے کہ کوہ ویسیوویس نے بڑے بڑے پتھروں کو ہوا میں ۱۲۰۰ گز کی بلندی تک اچھالا ہے۔

شہر پومپائی جس کا ہم ذکر کر رہے تھے جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے۔ میلاد مسیح کے اوائل میں بہت عمدہ اور صاف شہر تھا۔ ہر طرف سے روم کے اعیان و اشراف تفریح اور عیش و مسرت کے لئے یہاں آتے تھے۔ چنانچہ تاریخ میں لکھا ہے کہ ۵۹ء میں یعنی اس شہر کے برباد ہونے سے بیس سال پہلے اس کے ایک تماشہ خانہ میں شہریوں اور ان تماشائیوں میں جو کہ اطراف شہر سے تماشہ دیکھنے کے لئے آتے تھے ایک جھگڑا پیدا ہو گیا۔ طرفین کے بہت سے آدمی مجروح ہوئے اور مارے گئے۔ حکومت روم نے اہل شہر کی تنبیہ کے لئے حکم دے دیا کہ شہر مذکور میں دس سال تک کوئی کھیل یا تماشہ نہ دکھایا جائے۔ آج جبکہ شہر کے کھنڈرات خاک اور خاکستر کے نیچے سے کھود دیے گئے ہیں تو ایک مکان کی دیوار پر اس جھگڑے اور بگڑا دھکڑ کی تصویر منقوش ملی جو نہایت صاف دکھائی دیتی ہے۔

۶۳ء میں اس شہر میں ایک سخت زلزلہ آیا جس سے بہت سی عمارات اور مکانات منہدم ہو گئے اور لوگ اس ناگہانی قہر سے اس قدر خوفزدہ اور سراسیمہ ہوئے کہ روم کی مجلس اعیان (سینیٹ) نے مکانات کی دوبارہ تعمیر و ترمیم روک دی۔ لیکن شہر والوں نے آہستہ آہستہ اجازت حاصل کر لی۔ اور جیسا کہ موجودہ کھنڈرات سے نتیجہ نکالا جاتا ہے انہوں نے ویران شدہ عمارات کو تعمیر کرنے کا کام ابھی شروع کیا ہی تھا کہ ناگہاں ۲۴ اگست ۷۹ء کی رات کو کوہ ویسیوویس نے آتش فشانی کا آغاز کیا اور پومپائی کو دو اور قریب کے شہروں کے ساتھ جن کا نام ہرکولانیم اور استابی تھا نہایت قلیل مدت میں مکمل طور پر منہدم اور ویران کر دیا اور مٹی، راکھ اور مادے کے بلند طبقات کے نیچے پنہاں کر دیا۔

اس وحشت ناک واقعے کی تفصیل یوں ہے کہ مذکورہ رات کو پہاڑ کی چوٹی سے دھواں نکلنا شروع ہوا۔ کبھی روشنی ہو جاتی تھی اور کبھی تاریکی۔ خاک اور پگھلا ہوا مادہ اس سے بلند ہوتا تھا اور ریت اور بڑے بڑے پتھروں کی بارش برستی تھی جس نے شہر کو ایک گز کی گہرائی تک ڈھانپ لیا۔ بہت سے اہالیان شہر اسی ہنگامے میں ہلاک ہو گئے اور بعض جو بھاگ نکلے انہیں موت نے راستے میں ہی جا لیا۔ بعض ایسے جسم خاک کے نیچے سے برآمد ہوئے ہیں جو اسی بھاگنے کی حالت میں ہاتھ میں نقدی کی تھیلیاں لئے صدیوں مٹی کے نیچے دبے رہے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ اسی حالتِ فرار میں پنجۂ اجل میں گرفتار ہو گئے۔ غرضیکہ اس قدر پگھلا ہوا مادہ، مٹی، راکھ اور ابلتا ہوا پانی شہر پر گرا کہ ان کے طبقات کی گہرائی سات گز تک پہنچ گئی اور شہر مکمل طور پر اس میں چھپ گیا اور روئے زمین سے ایک عرصے کے لئے مفقود ہو گیا۔ ہرکولانیم میں بھی اس مادے کی گہرائی تین گز سے زیادہ تھی۔

کوہ ویسیوویس کی آتش فشانی کی تفصیل پلینیوس خورد مشہور رومی ناثر نے اپنے دو خطوط میں جو اس نے اسی زمانے میں اپنے دوست اور مشہور رومی مورخ تاسیت کو لکھے تھے خوب وضاحت سے قلمبند کی ہے لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ باوجودیکہ اس کا چچا پلینیوس قدیم اس موقع پر شہر ناپل کے نزدیک ایک بندرگاہ میں ایک جہاز کے امیر البحر کی حیثیت سے ٹھہرا ہوا تھا اور ان مقتول شہروں میں سے وہ استابی شہر کے باشندوں کو بچانے کے لئے نہایت سرعت سے روانہ گیا تھا اور

اسی کوشش میں گندھے بخارات کے اثر سے خود بھی مسموم ہو گیا تھا۔

جب وہ کہ دلیسیدولیس کی آتش فشانی کا ذکر کرتا ہے تو پومپیائی، ہرکولانوم اور استابی کے متعلق ایک کلمہ بھی نہیں لکھتا۔ لیکن ایک دوسرے یونانی مورخ نے جس کا نام دیون کاسیوس تھا، اپنی مشہور تاریخ روم میں ان شہروں کی بربادی کا حال بھی لکھا ہے۔ یہ مورخ تیسری صدی عیسوی کے آغاز میں ہوا ہے۔ اس کی تفصیلات بہت دلچسپ ہیں۔

اس واقعے کے پندرہ سو برس گزر جانے کے بعد جب یہ ہولناک سانحہ لوگوں کے دلوں سے کلی طور پر فراموش ہو چکا تھا۔ دسویں صدی ہجری کے اوائل میں اتفاقاً ایک مکان کی بنیاد کھودتے ہوئے دو کتبے برآمد ہوئے لیکن یہ کتبے لوگوں کی توجہ اچھی طرح اپنی طرف منعطف نہ کرا سکے اور کسی نے انہیں کوئی وقعت نہ دی۔ بعد ازاں ایک کنواں کھودنے کے موقع پر پومپیائی کا اصلی مرکز معلوم ہو گیا۔ لیکن اس کے کھودنے کے لئے جو قدم اٹھایا گیا وہ ۱۱۶۱ھ میں تھا۔ لیکن پھر بھی کام کسی اصول یا نقشہ کے مطابق نہ تھا اور کہا جا سکتا ہے کہ حقیقت میں کھدائی ۱۲۷۷ھ میں شروع ہوئی۔ ۱۲۷۷ھ سے ایک منظم اسی آدمیوں پر مشتمل عملہ سمجھدار اور قابل آثار قدیمہ کے ماہروں کے تحت نظر کھدائی میں مشغول ہے۔ اس وقت تک انہوں نے شہر کا ۳/۵ حصہ خاک کے نیچے سے کھود لیا ہے۔ سب سے پہلے جو چیزیں برآمد ہوئیں۔ ان میں سے قابل ذکر چار ڈھانچے ہیں جو اسی حالت میں بغیر کسی قسم کی تبدیلی کے اس وقت تک پڑے ہوئے تھے اور اب انہیں ناپل کے عجائب گھر میں رکھا گیا ہے۔ ان چار ڈھانچوں میں سے ایک عورت کا ڈھانچہ ہے، جس کے پہلو میں اس وقت کے ۹۱ مختلف سکے، دو چاندی کے پیالے، ایک چابیوں کا گچھا اور جواہرات پائے گئے تھے اور بظاہری طور پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے انہیں اٹھایا ہوا تھا تاکہ انہیں لے کر بھاگ جائے اور اسی حالت میں ہلاک ہو گئی۔

یہ عورت ڈھانچوں کے بائیں طرف پڑی ہوئی تھی۔ اس کے سر پر نقاب اور انگلیوں میں دو انگوٹھیاں تھیں۔ اس کے پہلو میں ایک اور عورت، ایک لڑکی اور ایک مرد پڑے ہوئے تھے۔ اس کے بعد بتدریج اور بہت سے انسانی جسم برآمد ہوئے اور اب بھی ہو رہے ہیں۔ اسی طرح اور بہت سے آثار قدیمہ [illegible] ستونوں، عمارات، محلات، تمام مکانات، عبادت گاہوں، میدانوں، حماموں اور دکانوں کی صورت میں کھودے گئے ہیں۔ ان میں سے بہت سی ایسی چیزیں جنہیں محل و نقل کیا جا سکتا ہے اب ناپل کے عجائب گھر میں پڑی ہیں۔

پومپیائی شہر کی سڑکیں اور گلیاں عموماً سیدھی اور مستقیم ہیں اور ان میں اور بہت سے پرانے شہروں کی گلیوں کی طرح کوئی پیچ و خم نہیں۔ ... ان کی چوڑائی ۴ سے ۹ فٹ تک ہے اور ان پر پتھر کا فرش لگا ہوا ہے پیدل چلنے والوں کے لئے الگ پٹڑیاں بنی ہوئی ہیں جو سڑک کی سطح سے قدرے اونچی ہیں اور چوڑائی میں دو فٹ سے زیادہ نہیں۔

ارکان سلطنت میں سے قابل ذکر وہ محل ہے جس کا نام ہے، کازوال فونو کا محل، اس کی دیواروں کی منڈیر پر نہایت عمدہ خاتم کاری سے بہت دلکش تصویریں منقش کی ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک مشہور تصویر ہے جو سکندر اعظم اور دارائے سوم بادشاہ ایران کی جنگ کا نقشہ ظاہر کرتی ہے اس تصویر کا انکشاف ۱۲۴۷ھ میں ہوا اور تاریخی و علمی لحاظ سے بہت گراں بہا ہے۔ کیونکہ اغلب ہے کہ یہ تصویر یا تو خود سکندر کے عہد میں یا اس سے کچھ عرصہ بعد کندہ کی گئی ہے۔ اس تصویر کی تمام جزئیات لباس، گھوڑوں کے ساز و سامان، اسباب جنگ اور ہتھیاروں کی حیثیت سے بالکل واقعہ کے مطابق ہیں۔ اس تصویر کے بائیں طرف سکندر کے روبرو دارا سوم بادشاہ ایران ایک جنگی رتھ پر بیٹھا ہے۔ اس کے اردگرد ایرانی لشکر ہے جو سکندر کے لشکر کے ہجوم کرنے کی وجہ سے بھاگ رہا ہے۔ دارا کے پیچھے ایک سوار درفش کاویانی ہاتھ میں اٹھائے کھڑا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ خاتم کاری کا یہ حصہ خاص طور پر شکستہ ہے جس کی وجہ سے جھنڈا اچھی طرح ظاہر نہیں۔ لیکن اس کے باوجود جھنڈے کا بالائی حصہ اور نیزے کی نوک جس سے جھنڈا بندھا ہوا ہے اور اسی طرح وہ حصہ جہاں سجاوٹ کے لئے رنگا رنگ کی جھنڈیاں لٹکی ہوئی ہیں۔ خوب نمایاں ہیں۔

لارڈ لٹن مشہور انگریزی نثر نگار نے ایک ناول "لاسٹ ڈیز آف پومپی آئی" کے نام سے لکھا ہے۔ یہ ناول پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ کیونکہ مصنف مذکور نے نہایت محنت اور کوشش سے معلومات تاریخی اور کشفیات تازہ کو جمع کر کے اس زمانے کی حیات اجتماعی کو مجسم کرنے کی سعی کی ہے اور حقیقت میں اس نے اپنے کام کی ذمہ داری کو پورا پورا ادا کیا ہے۔

(ترجمہ)

"شاہکار"

عبدالرشید صدیقی

غزل

غم دینے والا شاد رہے پہلو میں ہجوم غم ہی سہی
لب اُن کے تبسم ریز رہیں آنکھیں میری پُرنم ہی سہی

گر جذبِ عشق سلامت ہے یہ فرق بھی مٹنے والا ہے
وہ حُسن کی اک دنیا ہی سہی میں حیرت کا عالم ہی سہی

ان مست نگاہوں کے آگے پینے کا ذکر نہ کر ساقی
میخانہ ترا جنّت ہی سہی، پیمانہ جامِ جم ہی سہی

ملتا نہیں جب مونس کوئی اس وقت یہی یاد آتا ہے
اپنا دل پھر بھی اپنا ہے خوگر وہ ذوقِ رم ہی سہی

جب دونوں کا انجام ہے اک پھر چون و چرا سے کیا حاصل؟
تدبیر کا میں قائل ہی سہی، تقدیر کا تو محرم ہی سہی

بندوں کے ڈر سے تجھے پوجوں؟ میں ایسی ریا سے باز آیا
دل میں ہے خوف ترا یا رب! سر پائے صنم پر خم ہی سہی

آغازِ محبت دیکھ لیا، انجامِ محبت کیا ہوگا!
قسمت میں حفیظِ بیکس کی آوارگی پیہم ہی سہی

"ہمایوں" — حفیظ ہوشیارپوری

پیامِ بہار

زمیں اُگل دے گی گنجِ پنہاں جہاں میں دورِ بہار ہوگا
کلی کلی عطر بیز ہوگی چمن سراپا نگار ہوگا

فلک پہ چھا جائینگی گھٹائیں چلیں گی فردوس کی ہوائیں
شجر شجر جھومنے لگے گا چمن چمن بادہ خوار ہوگا

فلک نے بنیاد ڈال دی ہے جہاں میں اک باغ دلکشا کی
کسے یہ معلوم ہے کہ کس کس کا خون صرفِ بہار ہوگا

تلاشِ منزل کو آپ ہوگی ہمارے گم گشتہ کارواں کی
نہ دورِ گردوں خلاف ہوگا نہ بخت ناسازگار ہوگا

کسی کا قصرِ بلند مٹ کر ملے گا کیونکر غبارِ رہ میں
اسے وہ دانا سمجھ سکے گا جو چرخ کا رازدار ہوگا

عجب ادا سے مرے سرہانے کھڑی ہیں مینا بدوش حوریں
زباں سے کہتی ہیں یاالٰہی یہ مست کب ہوشیار ہوگا

فرات پر کل تری رضا میں جو تشنہ لب سر کٹا دیا ہے
تو آج بھی تیرے آستاں پر نثار یہ جاں نثار ہوگا

غمِ محبت میں میرے دل کو ہر اک تڑپ میں نیا مزا ہے
خود اس کی چارہ گری کرو گے تو اور بھی بے قرار ہوگا

نواحِ یثرب میں دے ہی دیں گے نظیرؔ دو گز زمیں مجھے بھی
اُسی چمن کا ہزار ہوں میں اُسی چمن میں مزار ہوگا

"انقلاب"

نظیر لودھیانوی

مظلوم بچّہ

بحسرت مالک کے حکم سے اک ناتواں بچہ
جھکا میداں میں جھاڑو دے رہا ہے یکہ و تنہا

سحر کا وقت ہے، شادابیاں ہیں نرم جھونکوں میں
گلی سے آ رہی ہیں کھیل کی مخلوط آوازیں

پیاپے کھیل کا میدان جب آواز دیتا ہے
ذرا سا سر اٹھا کر مالک کو دیکھ لیتا ہے

صدائیں کھیل کی آ آ کے جب اوسان کھوتی ہیں
اسے اپنے جگر پر ٹھوکریں محسوس ہوتی ہیں

تقاضا کم سنی کا دل میں جب دھومیں مچاتا ہے
لرز اٹھتا ہے گردن موڑتا ہے، سر کھجاتا ہے

دمادم جب گلی سے گیند کی آواز آتی ہے
رخِ طفلی پہ اک بیچارگی سی دوڑ جاتی ہے

غریب افلاس بچہ کو دھیان میں لاتی نہیں دنیا
ترے معصوم بچوں تک کو بہلاتی نہیں دنیا

جوش

کلیم

عام پسند مغالطے

۱۔ ہم میں سے کتنے ہیں جو اُن امور میں اپنی واقفیت کا دعویٰ کرتے ہیں جن سے وہ ناواقف نہیں ہوا کرتے ہیں جو ان امور میں اپنی عدم واقفیت کا اظہار کرتے ہیں، جن سے وہ واقف ہیں۔

۲۔ ہم اچھوں کا روپ بھر کر سامنے آتے ہیں اور ہماری ذات میں سوائے اس کے صرف اتنی ہی خوبی پائی جاتی ہے کہ ہمارا ظاہر بہت خوشنما ہوتا ہے۔

۔ ہم اب ایسے نقطۂ زوال تک آپہنچے ہیں کہ صرف شکل و شمائل کی تو عزت کر سکتے ہیں لیکن معنوی و حقیقی محاسن تک ہماری نظر نہیں پہنچتی۔ کیا ظاہر کو ابھارنے اور باطن کو چھپانے کا فن ہم اچھی طرح حاصل نہیں کر چکے ہیں! کیا ہم پر عیب نہیں ہیں؟ اور ہم نے اُسی کے ساتھ ساتھ ہنر نہیں سیکھا ہے! کیونکہ ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ عیب کے چھپانے کے لئے بھی ہنر کی ضرورت ہوتی ہے۔

(۱) ریاکاری غالباً اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ نسلِ انسانی اور سب سے پہلے ریاکار کو اس فن کی باریکیوں میں کمال حاصل ہونا چاہیئے۔ یہ پہلا ریاکار کون تھا؟ اور وہ کیوں ریاکار تھا؟

(۲) انسان اپنی زندگی کے چند ابتدائی سال گویائی حاصل کرنے میں صرف کر دیتا ہے، اور اس کے بعد کیا وہ اپنی تمام بقیہ زندگی کے ماہ و سال اس سعی میں صرف نہیں کر دیتا کہ وہ کیونکر خاموش رہے۔

(۵) انسان عملی زندگی میں اپنے قائل کئے جانے پر صرف ناک بھوں ہی نہیں چڑھاتا بلکہ جو شخص اُسے قائل کر دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے، وہ اُس سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ اسی طرح نظری طور پر کیا یہ ایک اچھا مشغلہ نہیں ہے کہ کسی جاہل انسان کے قائل کرنے کی سعی کی جائے؟

(۶) چند افراد ایسے ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ در اصل انہیں کس چیز کی ضرورت ہے، اور وہ چیز انہیں مل جاتی ہے بعض یہ جانتے ہوئے بھی کہ انہیں کس چیز کی ضرورت ہے، اس چیز کو حاصل نہیں کر سکتے۔ لیکن کیا ایسے بھی لاتعداد انسان موجود نہیں ہیں جو درحقیقت یہ جانتے ہی نہیں کہ انہیں اصل میں کس چیز کی ضرورت ہے۔ اور ہمیشہ اس چیز سے محروم رہتے ہیں؟

(۷) کیا یہ ہر شخص کے لئے طے کرنے کی بات نہیں ہے کہ آیا اس پتھر کو جو اس کی راہ میں حائل ہے، سنگِ راہ کی صورت میں وہیں پڑا رہنے دیا جائے یا اُسے تراش کر زینے میں تبدیل کر لینا چاہیئے!

(۸) جب کوئی غیر متوقع اور خلافِ امید امر پیش آجائے تو اُس سے ایسا ہی سلوک کیوں نہ کریں گویا وہ سراسر حسبِ توقع اور حسبِ امید واقع ہوا ہے!

"کلیم"

نقد و نظر

انقلاب روس

مصنفہ جناب کشن پرشاد صاحب کول، ممبر سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی لکھنؤ۔

صفحۂ ہستی پر سیکڑوں نہیں ہزاروں ہی انقلاب آئے ہوں گے اور فرزند آدم پر لاکھوں مرتبہ مصیبت کے پہاڑ ٹوٹے ہوں گے۔ ہماری موجودہ تاریخ نے بیسیوں سلطنتوں کو تاخت و تاراج ہوتے دیکھا ہے لیکن جو نقشہ انقلاب روس نے پیش کیا ہے اس کی مثال تاریخ عالم میں ڈھونے سے نہیں ملتی۔

یہ انقلاب سابقہ حکومت اور تخت و تاج پر ہی نہیں آیا بلکہ اس نے نہ صرف حکومت اور طرز حکومت کو، اور افراد اور ان کی قسمت کو منقلب کر دیا ہے بلکہ رعایا کی ذہنیت، مذہب اور معاشرت کو بدل کر رکھ دیا ہے۔

فاضل مصنف نے کتاب کو پانچ مبسوط حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

حصہ اول میں روس کے ابتدائی حالات، جنگ عظیم اور زمانہ مابعد جنگ تک کے تاریخی حالات درج ہیں۔

حصہ دوم میں سوشلزم کے نشو و نما، ہنگامۂ انقلاب اور اس کے اسباب و علل پر بحث کی گئی ہے۔

حصہ سوم، دستور حکومت اور آئین و قوانین کے متعلق ہے۔

حصہ چہارم ملکیت او صنعت و حرفت، زراعت اور کوآپریشن کی تفاصیل پر منطبق ہے

حصہ پنجم میں تعلیم، مذہب اور طرز معاشرت پر بحث کی گئی ہے۔

کتاب کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی تدوین و تالیف میں کافی تحقیق سے کام لیا گیا ہے لیکن اس کے باوجود پیرایۂ بیان اس قدر دلآویز ہے کہ کسی دلچسپ افسانے کا شبہ ہوتا ہے۔

کتاب عربی ٹائپ کے حروف میں شائع ہوئی ہے اور بڑے سائز کے زائداز ۵۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے مجلد تین روپے۔ ہندوستانی اکیڈیمی، الہ آباد سے طلب فرمائیے۔

تمدن عتیق

مصنفہ جناب ابوظفر عبدالواحد صاحب ایم اے و جناب عبدالرحمن صاحب بی۔ اے سٹی کالج، حیدرآباد دکن۔

فاضل مؤلفین نے سائنس کی جدید تحقیقات کی روشنی میں کرۂ ارض کے معرض وجود میں آنے اور اس پر زندگی کے اولین نمو سے لے کر حضرت انسان کے ورود اور اس کے معاشری اور تمدنی ارتقا پر بحث کی ہے اگرچہ جو نتائج مستنبط کئے گئے ہیں انہیں قطعی اور آخری نہیں کہا جا سکتا لیکن فرسودہ توہمات اور قیاسات کے مقابلے میں ان کی دلائل واقعات اور شواہد کی استوار بنیادوں پر قائم ہیں۔ انداز بیان شستہ اور عام فہم ہے۔

کتاب $\frac{20\times30}{16}$ کے ۲۲۴ صفحات پر مشتمل ہے قیمت بے تصویر ایڈیشن دو روپے با تصویر ایڈیشن تین روپے۔ مصنفین سے براہ راست طلب فرمائیے۔

عجائبات سائنس

مصنفہ ڈاکٹر محمد عبدالحق صاحب ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ میکنیکل سکول، لاہور۔

مادہ، توانائی اور سائنس کے دیگر نظریوں پر عام فہم زبان میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب علمی نقطۂ نظر سے اچھی ہے اور ان لوگوں کے معلومات میں جو انگریزی سے بے بہرہ ہیں اس ضمن میں کافی اضافہ کر سکتی ہے۔ بعض جگہ نقشے اور تصاویر سے بھی مدد لی گئی ہے۔

$\frac{20\times30}{16}$ سائز کے ۱۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ قیمت بلا جلد بارہ آنے ۱۲ مجلد ایک روپیہ

ڈاکٹر صاحب موصوف سے براہ راست طلب فرمائیے۔

(ادارہ)

حسن و جمال ——— خدا کی نعمت ہے

موناویکس

چہرے کی خوبصورتی ——— کا حقیقی راز

آپ کا رنگ کالا ہرگز نہیں رہ سکتا کیونکہ آپ کی جلد کے نیچے سفید جلد موجود ہے۔ موناکمپلیکشن ویکس کے متواتر استعمال سے آپ کی کالی اور کھُردری جلد دور ہو کر نیچے سے سفید جلد نکل آنے لگتی۔ موناویکس کے اجزا چہرہ کی جلد پر نہایت خوشگوار اثر پیدا کرتے ہیں۔ جلد کو ملائم سفید اور صاف کرتے ہیں۔ موناویکس دوسری کریموں کی طرح آپ کی جلد پر سطح نہیں بنائے گی بلکہ یہ آپ کے جلدی مساموں میں داخل ہو کر دن بھر کی گرد و غبار کے ذرّوں کو نکال کر آپ کے چہرے کو ایک نئی جاذبیت بشاشت اور روح افزا تر و تازگی سے مالامال کرے گی موناویکس کے متواتر استعمال سے آپ کے چہرے کی رونق دوبالا ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ جھریاں۔ چھائیاں دھبے کالے اور سفید داغ سب کافور ہو جائیں گے۔ تھوڑی سی توجہ سے آپ اپنے چہرہ اور رنگت کی دلآویزی میں موناویکس کے استعمال سے اضافہ کرسکتے ہیں۔ آج ہی موناویکس خرید کر استعمال کریں اور فائدہ اٹھائیں۔

سول ایجنٹس

نیلی رام اینڈ برادرز انارکلی۔ لاہور

یونائیٹڈ انڈیا لائف انشورنس کمپنی لمیٹڈ

قایم شدہ ۱۹۰۶ء ——— شاہراہ ترقی پر ——— صدر دفتر مدراس

کل بزنس جاری شدہ زائد از

۴،۰۰،۰۰،۰۰۰ (4 کروڑ روپیہ)

سال ۱۹۳۶ء کا مکمل شدہ کام زائد از ——— ۹۰،۰۰،۰۰۰ (90 لاکھ روپیہ)

سالانہ آمدنی زائد از ——— ۲۲،۰۰،۰۰۰ (22 لاکھ روپیہ)

امتیازی خصوصیات

صرف ہماری کمپنی نے ہی کمپاؤنڈ ریورشنری بونس کا قاعدہ جاری کیا ہے۔

پنجاب۔ صوبہ سرحد۔ سندھ اور بلوچستان کیلئے

لاہور برانچ وسیع پیمانہ پر آرگنائزیشن سکیم جاری کر رہی ہے۔

ضرورت ہے۔ مندرجہ بالا علاقہ کے واسطے آرگنائزروں اور ایجنٹوں کی۔

مزید تفصیلات کے خط و کتابت کریں

الیف سی۔ کوہلی۔ اسکوائر برانچ منیجر نمبر ۱۲ میکلوڈ روڈ لاہور — فون نمبر ۳۷۸۴

امتحان کے بعد بجلی کا کام سیکھئے

کیونکہ اس کام کے جاننے والوں کی ضرورت پنجاب۔ یو۔ پی وصوبہ سرحد کے ہائیڈرو الیکٹرک ڈیپارٹمنٹ میں دن بدن بڑھتی جارہی ہے "سکول فار الیکٹریشنز لدھیانہ" بہترین درسگاہ ہے جو گورنمنٹ ریکگنائزڈ بھی ہے اور ایڈڈ بھی۔ ہر قابلیت اور مذہب و ملت کے طلبا کے لئے یہ سکول کھلا ہے گورنمنٹ سے مالی امداد ملنے پر سکول کمیٹی نے فیس میں ایک تہائی کی رعایت کردی ہے جو ماہوار لی جاتی ہے۔

پراسپکٹس مفت

مینیجر

ڈاک کی گڑبڑ [illegible] ... اور ہم خریداروں کو پوچھنا [illegible]
[illegible] ... ڈاک کی نذر ہو [illegible] ایک شکایتی کارڈ اپنے حلقے کے
سپرنٹنڈنٹ پوسٹ آفس کو لکھئے اور کارڈ ہی میں لکھئے تاکہ آپ کو پرچہ دوبارہ بھیجا جائے اور جگہ ڈاک کے دروازے پر ایک اور دستک دی جائے (مینیجر)

فہرستِ مضامینِ ادبی دنیا لاہور

بابت ماہ اگست ۱۹۳۷ء

جلد — نمبر ۱۰

تصاویر: (۱) ساون آیا (۲) جاپان میں برسات

نمبر شمار	مضمون	صاحبِ مضمون	صفحہ
	بزمِ ادب		
۱	سرراس مسعود مرحوم	ادارہ	۶۷۷
	آئینۂ عالم		
۲	مانٹی کارلو کا قمار خانہ	جناب مظفر احمد صاحب	۶۷۸
	افسانے اور ڈرامے		
۳	گوہل	جناب کرشن چندر ایم اے	۶۸۷
۴	ہم خاندانِ آفتاب	ادارہ	۶۹۴
۵	اچھے چاول	حضرت وقار انبالوی	۷۰۴
۶	کیوپڈ کی فتح	جناب جاوید قصری	۷۲۴
	علمی و ادبی مضامین		
۷	ہندوستان کی لنگوا فرینکا	حضرت سرخوش	۶۸۴
۸	ایک راہبہ کے محبت نامے	جناب عظیم قریشی بی اے	۷۰۸
۹	جذبۂ محبت	جناب توکل حسین صاحب	۷۱۶
۱۰	ضرب الامثال کے قصے	جناب سید عباس بخاری پشاوری	۷۲۸
	حصۂ نظم		
۱۱	حسن نظر	جناب تاجور سامری	۶۸۱
۱۲	غزل	جناب سعید الہ آبادی	۶۸۰
۱۳	گم شدگی	جناب عبدالحمید صاحب عدم بی اے	۶۸۳
۱۴	زوری	حضرت جوش ملیح آبادی	۶۸۶
۱۵	تقدیرِ عشق	حفیظ ہوشیارپوری	۶۹۲
۱۶	غزل	حضرت حرماں خیرآبادی	۶۹۳
۱۷	ذوقِ سفر	جناب خواجہ عبدالسمیع صاحب پال اثر صہبائی ایم اے	۷۰۳
۱۸	درسِ عبرت	عبرت مرحوم	۷۰۶
۱۹	مرگِ رندانہ	جناب خاور سہامی	۷۰۷
۲۰	رباعیات	جناب اختر مرادآبادی	۷۱۳
۲۱	عزمِ حیات	جناب شہید ابن علی	۷۱۴
۲۲	غزل	جناب لطیف انور گورداسپوری	۷۱۵
۲۳	شاعر سے خطاب	حضرت علی منظور حیدرآبادی	۷۲۲
۲۴	مناظرِ قدرت	جناب اندرجیت شرما	۷۲۴
۲۵	کوئل	جناب مسعود شاہدی (اسلامیہ کالج)	۷۲۷
۲۶	غزل	حضرت شاد عارفی	۷۳۰
۲۷	رباعیات	جناب اختر مرادآبادی	۷۳۱
	دنیائے ادب		
۲۸	اردو زبان کی وسعت اور ہمہ گیری	ادارہ	۷۳۲
۲۹	محبت اور راہبہ	جناب چراغ حسن حسرت	۷۳۸
۳۰	نقد و نظر	ادارہ	۷۳۹

سالانہ چندہ مع محصول ڈاک اور وی پی پانچ روپے (۵) ممالکِ غیر سے دس شلنگ

الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام صلاح الدین احمد پرنٹر و پبلشر چھپ کر دفتر ادبی دنیا ... بلڈنگ مال روڈ لاہور سے شائع ہوا۔

بزم ادب

سر راس مسعود مرحوم

پچھلے مہینے سید راس مسعود کے انتقال سے ہمارے ملک کے علمی اور تعلیمی حلقوں میں جو ممتاز جگہ خالی ہوئی ہے، وہ یقیناً کبھی پُر نہیں ہوگی۔ انتقال کے وقت سید مرحوم کی عمر صرف ۴۸ برس تھی۔ اس مختصر سی زندگی میں آپ نے ملک و قوم کی جیسی شاندار علمی خدمات انجام دیں۔ اُن کے پیش نظر بلا پس و پیش کہا جا سکتا ہے کہ آپ کو جینے کی کچھ اور مہلت ملتی تو آپ بھی اپنی پختہ سالی میں ویسے ہی زرّیں اور بلند پایہ علمی کارنامے انجام دے جاتے جو آپ کے دادا سر سید مرحوم نے اپنی آخری عمر میں پایہ تکمیل کو پہنچائے تھے۔

سر راس مسعود ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے ۱۹۰۶ء تک علی گڑھ میں تعلیم پاتے رہے۔ اس کے بعد آپ نے پانچ برس تک انگلستان میں تعلیم کی تکمیل کی اور آکسفورڈ یونیورسٹی کی ڈگری اور بیرسٹری کی سند لے کر ۱۹۱۱ء میں واپس ہندوستان آئے۔ یہاں پہنچ کر آپ نے پٹنہ میں پریکٹس شروع کی لیکن اپنی بلند سیرت کے تقاضے سے آپ پیشۂ وکالت سے جلد ہی دست بردار ہو گئے۔ آپ یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ اپنی پریکٹس کے سلسلے میں آپ سے نادانستہ بھی حق کی مخالفت اور ناحق کی حمایت میں کوئی غلطی ہو جائے۔ چنانچہ ۱۹۱۲ء میں آپ وکالت ترک کر کے امپیریل ایجوکیشنل سروس میں شامل ہو گئے، اور کٹک کالج میں پروفیسری کی خدمات انجام دیتے رہے۔ تعلیمی مشاغل سے آپ کو دلی مناسبت تھی اور اس میدان میں آپ نے ایسی ناموری حاصل کی کہ ۱۹۱۶ء میں حضور نظام کی نگاہِ مردم شناس نے آپ کو حیدر آباد کے تعلیمی امور کی قیادت کے لئے انتخاب کر لیا۔ چنانچہ آپ ۱۹۲۸ء تک حیدر آباد میں ناظم تعلیمات رہے اسی عرصے میں عثمانیہ یونیورسٹی جسے حضور نظام کا زرّیں ترین کارنامہ کہا جا سکتا ہے ظہور میں آئی اور عثمانیہ یونیورسٹی کی تشکیل سے زبانِ اردو کے بقا و استحکام کی عملی صورت پیدا ہو گئی۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے تخیل اور تشکیل میں سر راس مسعود نے نہایت قابل قدر حصہ لے کر قومِ مسلم اور زبان پر جو احسان کیا، وہ یقیناً ابد تک یاد رکھا جائے گا۔

بارہ سال تک حیدر آباد کی تعلیمی خدمت کے بعد جب آپ سبکدوش ہوئے تو قوم نے مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری آپ کی خدمت میں پیش کی۔ مسلم یونیورسٹی کے انتظامی امور بے حد پیچیدہ ہو رہے تھے۔ آپ نے اصلاحِ امور کے لئے پانچ سال تک مردانہ وار جد و جہد کی۔ آخر میں کچھ دل برداشتہ سے ہو گئے تھے لیکن یونیورسٹی کے فلاح و بہبود سے دنیا میں کوئی چیز آپ کو عزیز تر نہ تھی۔ اس اثنا میں آپ کی صحت بھی بگڑ گئی۔ لیکن آپ شب و روز یونیورسٹی کے وقار کی بحالی کے لئے کوشاں رہے ۱۹۳۴ء میں ہز ہائی نس نواب صاحب بھوپال آپ کو کمال اصرار سے اپنے ساتھ بھوپال لے آئے اور تعلیمات اور امورِ عامہ کے محکمے آپ کی تفویض میں دے دئیے۔

یہاں پر آپ کو نسبتاً سکون و عافیت کی زندگی ملی اور آپ ہمہ تن بھوپال کی تعلیمی و معاشرتی ترقی کی کوششوں میں منہمک ہو گئے لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا اور ابھی آپ نے فراغت کے تین سال بمشکل گذارے تھے کہ اجل کا پیغام آن پہنچا۔ مرحوم نے حیدر آباد کے عہدِ ملازمت میں جاپان کا سفر کیا۔ مدعائے سفر وہاں کے تعلیمی حالات کا مطالعہ تھا۔ واپسی پر آپ نے جاپان کے نظامِ تعلیم پر ایک بے نظیر کتاب لکھی مسئلۂ تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب اور وہ مقتدر لوگ جن کے ہاتھ میں مختلف تعلیمی محکموں اور اداروں کی باگ ہے۔ اس بیش بہا کتاب کے مطالعہ سے اپنے دائرہ عمل سے کئی مفید اور نئی راہیں نکال سکتے ہیں۔

سر راس مسعود ایک نامور دادا کے پوتے اور ایک نامور باپ کے بیٹے تھے اور حق یہ ہے کہ انھوں نے اپنی خاندانی روایات کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ انہیں چار چاند لگائے۔ افسوس اب جبکہ ان کے تجربے اور ان کے تبحر سے فائدہ اٹھانے کا موقعہ آیا تھا موت نے انہیں ہم سے چھین لیا۔ دعا ہے کہ ان کی روح کو سکون ابدی نصیب ہو۔

(ادارہ)

آئینۂ عالم

مانٹی کارلو کا قمار خانہ

ہر سال موسم کے شروع ہوتے ہی فرانس اور دوسرے ممالک کے اخبارات ایسے لوگوں کے سنسنی خیز واقعات سنانے لگ جاتے ہیں جنہوں نے قمار بازی کے دوران میں مانٹی کارلو کے خزانے خالی کر دیے ہوں۔ بعض اوقات واقعات اس کے برعکس بھی رونما ہوتے ہیں یعنی جنوبی امریکہ کا کوئی جاگیردار یا ہالی وُڈ کا کوئی مشہور و معروف ایکٹر یا ایکٹریس اپنا تمام اندوختہ ہار کر اپنے عالی شان محلات کے کوڑے کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے یا پھر بلقان کے کسی مشہور مہندس کے متعلق خبر آتی ہے کہ اُس نے اپنی حکمت و دانائی کے بل بوتے اصول وضع کئے کہ ایک ہی رات میں کروڑوں روپے جیت کر امیر الامرا بن گیا۔

یہ سب باتیں جھوٹ ہوتی ہیں اور قمار خانے کی عیارانہ نشر و اشاعت کے علاوہ ان کو کوئی وقعت نہیں دینی چاہئے۔

حقیقت یہ ہے کہ مانٹی کارلو کا خزانہ آج تک کبھی خالی نہیں ہوا جب کسی ایک چوکی پر نقد روپیہ ختم ہو جاتا ہے تو کھیل چند منٹوں کے لئے رُک جاتا ہے تاآنکہ خزانے سے مزید روپیہ نہ آ جائے۔ اس کے بعد جوا پھر شروع ہو جاتا ہے۔

اس کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایسے لوگ بھی موجود ہیں جنہوں نے اسی کاسینو میں ڈھیروں دولت جیت لی ہے — بعض نے محض قسمت کی یاوری سے اور بعض نے کھیل کے باقاعدہ مطالعہ سے ان کی چند غیر معمولی مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں:۔

نیویارک کے ایک ہوٹل کے خدام کا جمعدار مسٹر ڈارن برو جس نے اپنی ملازمت کے دوران میں ۲۵۰ پونڈ کی حقیر پونجی جمع کر رکھی تھی، نیویارک سے مانٹی کارلو آیا اور اسی رات سیدھا کاسینو میں آن وارد ہوا۔ چوکی پر بیٹھتے ہی اس نے جیتنا شروع کیا اور پھر متواتر ہر بازی میں جیتتا ہی چلا گیا۔ کاسینو کے پرائیویٹ جاسوس جو ہر وقت ایسے شاطر کھلاڑیوں کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں جو ہاتھ کی صفائی، دھوکا بازی یا کسی اور ناروا طریقے سے جیت رہے ہوں قدرتی طور پر مسٹر ڈارن برو کے آگے نقدی کے ڈھیروں کے ڈھیر جمع ہوتے ہوئے دیکھ کر چوکنے ہو گئے۔ جاسوسوں نے اپنی باریک بین نگاہوں سے بہتیرا کام لیا لیکن وہ اس کے کھیل میں کسی قسم کا سقم معلوم نہ کر سکے۔

مسٹر ڈارن برو کی خوش بختی نے کاسینو کے معزز سرپرستوں کی توجہ کو فوراً اس کی طرف منعطف کر دیا۔ چنانچہ بڑے بڑے سرمایہ داروں اور دوسرے امرا کے علاوہ کاسینو کی حسین ترین پریاں جو ہر وقت ایسے مردوں کی تلاش میں رہتی ہیں جن پر دولت کی دیوی مہربان ہو یک دم اس پر پل پڑیں۔

لیکن مسٹر ڈارن برو نے کمال دانشمندی سے کام لیتے ہوئے امرا کی دوستی کی پیشکش کو ٹھکرا دیا اور حوائی جنّوں کی زاہد فریب نگاہوں کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ وہ سب سے بیگانہ رہ کر نہایت خاموشی سے اپنا کام کرتا رہا چنانچہ گیارہ دن کے عرصے میں اس نے ۸۰۰۰۰۰ فرانک (اسّی لاکھ) جیت لئے۔ اس کے بعد ہوٹل کے خادموں کا یہ جمعدار کمال دانائی سے اپنا تمام سرمایہ جمع کر کے جس خاموشی سے آیا تھا اسی خاموشی سے رخصت ہو گیا۔ اس نے کاسینو کے ملازم کو "خدا حافظ" کہنے کی زحمت بھی گوارا نہ کی۔

اس قمار باز کے غیر معمولی اور تعجب انگیز طرزِ عمل سے جس نے نہ صرف کاسینو کے خزانے سے ایک معتد بہ رقم جیت لی تھی بلکہ جسے یہ بھی معلوم تھا کہ کھیل کس وقت ختم کر دینا چاہیئے، حکام اس قدر متاثر ہوئے کہ اس واقعے کو حکمران تک کے گوش گزار کیا گیا۔ اس ننھی مملکت کا حاکم تمام روئیداد سن کر مسکرا دیا اور بولا۔

"یہ اسی لاکھ فرانک بہت قلیل رخصت پر گئے ہیں اور رخصت کے

ایام گزارنے کے بعد مانٹی کارلو میں واپس آجائیں گے۔"

لیکن عالم کی یہ پیشین گوئی غلط نکلی۔ مسٹر ڈامرن برونے واپس جاتے ہی کیلے فورنیا میں ایک رفیع الشان محل خریدا اور اس میں وہ نہایت عیش و آسائش کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ وہ آج تک مانٹی کارلو میں دوبارہ نہیں آیا۔

اس کے بعد مسٹر آرتھر کورسی بور کا قصہ ہے۔ یہ بے چارہ چلنے سے معذور تھا اور بیماروں کی پہیئے دار کرسی میں بیٹھ کر کاسینو میں آیا کرتا تھا۔ مسٹر کورسی بور علم و فضل کے لحاظ سے چوٹی کے علماء میں شمار ہوتا تھا اور قماربازی کو ایک فن کے لحاظ سے اس نے سالہا سال تک زیر مطالعہ رکھا تھا۔ اسی وسیع مطالعے کے ذریعے سے اس نے داؤں لگانے کا ایک باقاعدہ طریقہ تجویز کر رکھا تھا جس پر اسے بدرجۂ اتم اعتماد تھا۔ وہ اس اعتماد میں حق بجانب بھی تھا کیونکہ نہایت تھوڑی مدت میں اس نے ......۴۰ (چالیس لاکھ) فرانک جیت لئے تھے۔ دوسرے کھلاڑی بھی اس کی کامیابی سے متاثر ہو کر مریض کی کرسی کے گرد جمع رہتے اور جس ہندسے پر وہ داؤں لگاتا اسی ہندسے پر داؤں لگا کر جیتتے رہتے۔

مسٹر کورسی بور ان طفیلیوں کے ہر وقت چمٹے رہنے سے چڑ گیا اور ان سے مخلصی حاصل کرنے کے لئے اس نے اپنے مجوزہ قاعدے کے خلاف ایک بہت بڑی رقم ہارنے کے لئے نمبر ۲۷ پر لگا دی۔ اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب بجائے ہارنے کے نمبر ۲۷ جیت گیا اور پھر متواتر جیتتا ہی چلا گیا۔ چنانچہ اس کے پیرو بھی جو اس کی ہر حرکت کی نقل کر رہے تھے بیش بہا رقمیں جیتنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کرب و اضمحلال کا اندازہ لگائیے جو مسٹر کورسی بور کو نہ صرف اپنے ارادے میں ہزیمت اٹھانے سے ہوا بلکہ جو انہیں اپنے مجوزہ کلیے کے غلط ثابت ہونے سے برداشت کرنا پڑا۔ چنانچہ دوسرے ہی روز وہ اپنی خطیر رقم کو وصول کر کے مانٹی کارلو سے رخصت ہو گیا اور اپنے "طریقے" کو دوبارہ مکمل کرنے میں ایک سال اور صرف کر دیا۔ اگلے سال وہ اپنے نئے "طریقے" اور کافی نقدی سے مسلح ہو کر پھر مانٹی کارلو میں آن دھمکا۔ تین ہفتے کے اندر اندر اس نے اپنی تمام دولت ہار دی اور اس کے علاوہ ......۵ (پانچ لاکھ) فرانک کا مقروض ہو گیا۔ شاید کسی جگہ اس سے غلطی ہو گئی لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے اعصاب خراب ہو گئے اور اسے ہسپتال پہنچا دیا گیا۔

اعلیٰ پیمانے پر قماربازی چند اور مقامات پر بھی ہوتی ہے۔ مثلاً کینز میں چند سال کا ذکر ہے کہ امریکہ کا ایک مشہور کروڑپتی اپنے ذاتی جہاز میں سوار ہو کر کینز گیا۔ چند ہی دنوں کے اندر اندر اس نے اپنی تمام دولت ہارنے کے علاوہ کافی قرضہ بھی اٹھا لیا۔ آخر اس نے اپنا خوبصورت اور بیش قیمت جہاز رہن کر دیا لیکن اس سے حاصل شدہ روپیہ بھی چند لمحوں میں ضائع ہو گیا۔ پھر اس نے جہاز بیچ دیا لیکن یہ رقم بھی اسی کھاتے میں جا پڑی اور بے چارہ کروڑپتی پیسے پیسے کو محتاج ہو گیا۔ جہاز کے نئے مالک نے اس کی حالت پر رحم کھا کر پیرس تک جانے کے لئے اسے ریل گاڑی کا ٹکٹ تحفتہً پیش کیا۔

— قماربازی کا ایک اور اوڑھ ڈیوویلے ہے۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ایک یونانی جس کا نام وگلیالو تھا اپنی ہر بازی میز پر رکھ کر لگا رہا تھا شیکاگو کا مشہور ساہوکار مسٹر کیسلر جو وہیں موجود تھا بولا:۔

"زیادہ سے زیادہ کتنے کی بازی لگاؤ گے"؟

"جو تم چاہو" یونانی نے جواب دیا

"دس لاکھ فرانک"

"منظور"! یونانی نے بے پروائی سے جواب دیا اور وہ ہار گیا

مسٹر کیسلر نے آہستہ سے کہا "دگنا کرو گے"؟

وگلیالو نے منظور کر لیا اور پھر ہار گیا۔ کیسلر نے ۲۰ لاکھ فرانک میز پر ڈھیر کر دیئے۔ یونانی پھر ہار گیا۔ چنانچہ ایک منٹ کے عرصے میں مسٹر کیسلر ۷۰ لاکھ فرانک کما کر اٹھا۔ ایک بڑا سیگار سلگا کر کاسینو کے دفتر میں داخل ہوا اور اپنے تمام روپے کی ہنڈی پیرس کے ایک بنک کے نام بنوالی۔ اس سے اگلے روز وہ سیدھا پیرس کو سدھارا اور چند روز تک پیرس میں داد عیش دینے کے بعد شکاگو چلا گیا۔ اس نے آج تک پھر جوا نہیں کھیلا۔

میڈم ڈاروتھی، مانٹی کارلو کی ایک مشہور میزبانہ جسے دوسری خواتین کے مقابلے میں جوئے کے بہت سے اہم واقعات یاد ہیں کہتی ہیں کہ سب سے زیادہ عجیب و غریب روسی گرینڈ ڈیوک کا واقعہ ہے۔ یہ واقعہ اگرچہ صلح و امن کے ایام میں پیش آیا لیکن اپنی نوعیت کے لحاظ سے قابل شنید

ہے۔ روسی گرینڈ ڈیوک ایک میز پر کھیل میں مشغول تھا اور میڈم ڈارتھی اس کے پشت کی طرف کھڑی تھی۔ اتفاقاً بلا ارادہ اس نے اپنا ہاتھ گرینڈ ڈیوک کی کرسی کی پشت پر رکھ دیا۔ گرینڈ ڈیوک غضب ناک ہو کر پیچھے کو مڑا لیکن جونہی اس کی نظریں میڈم ڈارتھی کے چہرے پر پڑیں اس کی پیشانی کے شکن دور ہو گئے اور نہایت نرمی سے میڈم ڈارتھی کے ہاتھ پر ہاتھ پھیر کر ملتجیانہ انداز میں بولا "آپ یوں ہی میرے پاس ٹھہری رہیں"۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میڈم ڈارتھی کی موجودگی گرینڈ ڈیوک کے حق میں جادو کا کام کر رہی ہے کیونکہ وہ لگاتار جیتتا چلا گیا۔ ہر ہزار فرانک کے جمع ہونے پر وہ نصف حصہ میڈم ڈارتھی کو دے دیتا تھا۔ اس طرح میڈم ڈارتھی نے اس ایک رات کے دوران میں ۵۰۰۰ فرانک جمع کر لیے۔ اس کی خوش قسمتی کا ستارہ صرف اس وجہ سے چمکا کہ اس نے اتفاقاً اپنا ہاتھ گرینڈ ڈیوک کی کرسی پر رکھ دیا تھا۔ پو پھٹ رہی تھی جب گرینڈ ڈیوک اپنے میز سے اٹھا، میڈم ڈارتھی کو جھک کر سلام کیا اور رخصت ہو گیا۔ اگلے روز دوپہر کے وقت میڈم ڈارتھی نے گرینڈ ڈیوک کو ایک باغ میں ٹہلتے ہوئے دیکھا وہ فوراً اس کے پاس گئی اور اس کی گزشتہ رات کی فیاضی کا شکریہ ادا کرنے لگی۔ کھلاڑی کے ذی وجاہت خد و خال سے حیرت و استعجاب کا اظہار ہونے لگا اور وہ بولا۔

"محترم خاتون! معلوم ہوتا ہے آپ کو پہچاننے میں غلطی ہوئی ہے۔ میں نے آپ کی صورت اس وقت سے پہلے کبھی نہیں دیکھی"۔

گرینڈ ڈیوک اپنے خیال میں اس قدر مگن تھا کہ اس کے دماغ میں اس عورت کی صورت یا اس کی موجودگی کا احساس تک بھی باقی نہ تھا جسے اس نے پچاس ہزار فرانک دے ڈالے تھے۔

کاسینو کے ارباب اختیار اس دلچسپ شیج کے حزنیہ کردار کو ہمیشہ پس پردہ رکھنا چاہتے ہیں لیکن ایسے اتفاقات بھی پیش آتے ہیں کہ یہ سنسنی خیز خبریں ہزار کوشش کے باوجود نشر ہو جاتی ہیں۔ ایسا ہی ایک واقعہ ایک انگریزی جنگی جہاز کے کمانڈر کا ہے جو ایک روز مانٹی کارلو کے قریب لنگر انداز ہوا۔ ایک رات کپتان خشکی پر آیا اور کاسینو میں داخل ہو کر کھیل میں مشغول ہو گیا۔ شاید اس کا ستارہ برج زحل میں تھا کیونکہ وہ کوڑی کوڑی ہار گیا۔

قماربازی کے بے رحم بھوت نے اسے اپنے چنگل میں دبوچ لیا۔ وہ اپنے جہاز کو واپس گیا اور جتنا سرکاری روپیہ اس کی تحویل میں موجود تھا سب کا سب لے آیا۔ ابھی پورا ایک گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ وہ تمام روپیہ دے بیٹھا۔ وہ پھر جہاز کو واپس لوٹا اور صورت حالات پر غور کرنے لگا آخر کار اس نے کاسینو کے مہتمم کی طرف ایک خط بھیجا کہ کل ۱۱ بجے دوپہر تک تمام ہارا ہوا روپیہ واپس کر دے اور اگر ساڑھے گیارہ بجے تک اس کی تعمیل نہ ہوئی تو جنگی جہاز کی توپوں کے آتش فشاں دہانے کاسینو پر کھول دئے جائیں گے۔

گیارہ بج گئے لیکن روپیہ نہ آیا۔ شاید الٹی میٹم کو قابل اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ جنگی جہاز کے کمانڈر نے ثابت کر دیا کہ وہ بے معنی دھمکی نہیں دے رہا تھا۔ چنانچہ پہلا گولہ جو کاسینو پر آ گرا اس نے ساحل کے خوب صورت ترین درختوں کے پرخچے اڑا دئے۔ کاسینو کی طرف ایک اور ایلچی دوڑایا گیا جس کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک پرزہ تھا اور اس پر صرف دو لفظ لکھے تھے۔

"آخری تنبیہ"

اس کے ۱۰ منٹ بعد ایک موٹر کشتی ساحل سے جہاز کی طرف تیزی کے ساتھ جاتی ہوئی دیکھی گئی۔ اس کشتی میں سے کاسینو کا ایک ڈائرکٹر اترا اور جہاز کے عرشے پر چڑھ گیا اس کے قبضے میں کمانڈر کی ہاری ہوئی رقم تھی۔ کمانڈر نے تمام روپیہ خزانے میں رکھ کر جہاز اپنے نائب کی تحویل میں دے دیا۔ اس کے بعد اپنے کیبن میں داخل ہو گیا، ایک گولی چلنے کی آواز آئی اور کمانڈر تختۂ جہاز پر خاک و خون میں تڑپتا ہوا دکھائی دیا۔

ایک اور مشہور کھلاڑن ایک نہایت ہی خوب صورت عورت تھی جو کئی سال سے مانٹی کارلو میں رہتی تھی۔ اس کے بیش بہا جواہرات کا ہر جگہ چرچا تھا۔ ان دنوں یہ افواہ بہت گرم تھی کہ یہ خاتون زار روس کی داشتہ ہے۔ آج اس کی حالت کیا ہے! وہ اس وقت بھی زندہ ہے، بڈھی، بدصورت اور قلاش ــــ اور نائیس کے محتاج خانے میں رہتی ہے۔

جنگ عظیم سے پہلے روسی یورپ کے قمار خانوں میں عام طور پر دکھائی دیتے تھے۔ لیکن آج کل ریویرا میں صرف ایک روسی نظر آتا ہے جس کا نام ایم۔ بورس وبڈل ہے اور جو قمار خانوں کے جاسوسوں کا افسر اعلیٰ

ہے۔ یہ شخص زار کی حکمرانی کے زمانے میں سلطنت روس کی خفیہ پولیس کا افسر تھا۔ اب اس کے فرائض یہ ہیں کہ وہ کیسینو کے سرپرستوں میں دھوکہ بازوں اور عیاروں کو گھسنے نہ دے۔ کیسینو کے منتظمین کو ایسے لوگوں کے ہتھکنڈوں سے محفوظ رہنے کے لئے نہایت دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان کے پاس ایسے تمام عیاروں کے فوٹو ان کے حالات اور اُن کی مخصوص عیاریوں کی تفاصیل محفوظ ہیں۔ مسٹر بورس وڈیل کی یادداشتیں نہایت دلچسپ ہیں چند کا ملخص پیش کیا جاتا ہے۔

ایک دفعہ ہالی وڈ کی مشہور ترین ایکٹرس پرل وہائٹ نے اپنی تمام دولت ڈیوویلے کے کاسینو میں ہار دی تھی ہیلن ویکر جو اتنی امیر تھی کہ اس نے زار روس کے جواہرات کا ایک معتدبہ حصہ خرید لیا تھا۔ بہت بڑی بڑی رقموں کی بازی لگایا کرتی تھی یہ خاتون ایک روز یک بیک غائب ہوگئی اور آج تک اس کا سراغ نہیں ملا

بعض اوقات کاسینو کے چلانے سے لاکھوں کی رقم صرف ذرا سی بدانتظامی یا کھیل کے اوزاروں کی طرف سے ذرا سی بے احتیاطی کی وجہ سے دینی پڑ جاتی ہے۔ مثلاً کیپٹن ایلن جگارو نے ایک رات میں بیس لاکھ فرانک جیتے۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ گھومنے والے پہیے میں کچھ خرابی ہوگئی تھی جسے کیپٹن موصوف نے بھانپ لیا تھا لیکن کاسینو والوں کو اس کی خبر اس وقت ہوئی جب کپتان مذکورہ رقم جیت چکا تھا۔ کاسینو والوں نے کوئی اعتراض نہ کیا کیونکہ کیپٹن صاف کھیل کھیلتا رہا تھا اور مشین کا نقص ان کی اپنی غلطی سے تھا۔

آج کل کھلاڑیوں کا رجحان بجائے مانٹی کارلو کے کینز کی طرف زیادہ ہوگیا ہے۔ چنانچہ آغا خاں، امریکی کروڑپتی نائیکو زگرافوس وغیرہ اب یہیں آتے ہیں۔ زگرافوس وہ شخص ہے جس کے داؤں کی رقم ہمیشہ غیر محدود ہوتی ہے۔

منظر احمد

غزل

سنتا ہے کون حال پریشاں ترے بغیر
سونی پڑی ہے انجمن جاں ترے بغیر

تیرے بغیر کچھ بھی نہیں لذتِ حیات
منزل ہے مجھ کو شامِ غریباں ترے بغیر

کس سے کریں سوال کسے دیں دعائے خیر
ویراں ہے آج محفلِ رنداں ترے بغیر

ڈر ہے کہیں فضا میں نہ رہ جائے گونج کر
ٹھہرا ہا ہے نعرۂ مستاں ترے بغیر

تیرے بغیر جان بھی کس طرح دے سعید
دشوار ہے یہ مشکلِ آساں ترے بغیر

سعید
الہ آبادی

حُسنِ نظر

ہر ذرّے پہ اک حُسن نیا دیکھ رہا ہوں
ہر گُل میں نرالی مَیں ادا دیکھ رہا ہوں

ہر سمت نظر آتا ہے اک طور کا عالم
حیران ہوں میں آج یہ کیا؟ دیکھ رہا ہوں

یہ صبح کے انوار کے پردوں سے نمایاں
کس برقِ تجلّیٰ کی ضیا دیکھ رہا ہوں

خورشید کے پرتو میں نظر آتا ہے یہ کون
مہتاب میں وہ کس کو چھپا دیکھ رہا ہوں

وہ کون ہے تاروں کے حسیں ساز پہ شب کو
مدت سے جسے نغمہ سرا دیکھ رہا ہوں

ہنگامۂ ہستی میں یہ تحریک ہے کس کی
اِن جلوؤں میں کیا صبح و مسا دیکھ رہا ہوں

سچ پوچھو تو میں شاہدِ فطرت میں نمایاں
محبوبِ حقیقی کی ادا دیکھ رہا ہوں

تاجور سامری



طاون آبا



جاپان میں دیہات

گم شدگی

(منصور کے یک آہنگ ولا نہایت سکوت کا ایک مطلع)

جستجوئے شوق میں اک نوجواں کھویا گیا ایک پروانہ بہ سوزِ قلب و جاں کھویا گیا
میں نہ مانوں گا بقولِ حامدِ نکتہ شناس ظلمتوں میں وہ شرارِ جاوداں کھویا گیا
ہوگیا نظروں سے غائب اک ستارہ ٹوٹ کر ایک شعلہ تھرتھرا کر ناگہاں کھویا گیا
کہہ رہی تھی اِک فسانہ فطرتِ شوریدہ سر اتفاقاً از نباطِ داستاں کھویا گیا
باکمال انساں کا مرجانا ہے نقصانِ خدا! کچھ خدا کا بھی تو، مرگِ ناگہاں! کھویا گیا
ہر نفس تھا جس کا اک افسانۂ مہر و وفا آج سنتے ہیں کہ وہ افسانہ خواں کھویا گیا

کل پیا تھا اے عدم منصور کی صحت کا جام[1]
اس سے جو حاصل ہوا تھا لطفِ جاں کھویا گیا

عدم

[1] گذشتہ سال منصور احمد مرحوم کشمیر سے صحت یاب ہو کر لاہور واپس تشریف لائے تو حضرت عدم نے منصور کی صحت کا پہلا جام کے عنوان سے ایک نظم لکھی تھی (م-ح)

ہندوستان کی لنگوا فرنیکا

(ضروری نہیں کہ ایڈیٹر کو مضمون نگار کی رائے سے اتفاق ہو)

زبانِ اردو لے خواہ دکن میں تسلیم کیا یا پنجاب میں۔ یہ اب تمام قلمرو ہند میں رائج ہے۔ اور اسی خصوصیت کی بنا پر اس کو اس ملک کی لنگوا فرنیکا کہا جاتا ہے۔ فرانسیسی زبان میں لنگوا فرنیکا سے مراد ایک عام بول چال یا ایسی ملی جلی زبان ہے جو یورپ کی بعض کثیر الاستعمال زبانوں کے خاص خاص الفاظ کی باہم آمیزش سے وضع کی گئی ہو۔ چنانچہ اس میں فرانسیسی۔ ہسپانی۔ یونانی اور اطالوی لغات کی ملاوٹ بہت پائی جاتی ہے اور وہ اب براعظم یورپ کے مغربی حصے میں جو مشرقی کی بہ نسبت بہت زیادہ تہذیب یافتہ اور تجارت وسیر و سیاحت کا مرکز ہے خاص طور پر رائج ہے۔ اسی طرح اردو بھی زیادہ تر شمالی ہندوستان۔ اضلاع متحدہ آگرہ و اودھ اور دکن میں نہ صرف بولی بلکہ لکھی پڑھی بھی جاتی ہے۔ اور اسی عمومیت کی وجہ سے اس زبان کا نام ہندوستان کی لنگوا فرنیکا رکھا گیا ہے۔ یورپ کی لنگوا فرنیکا تو مغربی سیاحوں کی آمد ورفت اور تجارت کی ضرورتوں سے پیدا ہوئی تھی اور یہ ہماری لنگوا فرنیکا ہندو مسلم اقوام کی باہمی معاشرت اور حکام وقت کی سیاسی ضرورتوں کے اقتضا سے آغاز پذیر ہوئی تھی۔ چنانچہ اب یہ امر پوری طرح پایۂ تحقیق کو پہنچ چکا ہے کہ مسلمانوں نے اس ملک میں قدم رکھتے ہی فارسی۔ عربی کو ہر مقام کی مقامی ہندی میں ملا جلا کے بولنا شروع کیا تھا۔ اور یہی ضرورت انگریزوں کو بھی لاحق ہوئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں کلکتہ کے فورٹ ولیم میں مسلمانوں کے لئے اردو زبان کی کتابوں کو فارسی رسم الخط میں ترتیب دیا گیا اور ہندوؤں کے لئے یہی زبان ناگری حروف میں لکھی گئی۔ اس لحاظ سے اردو بطور لنگوا فرنیکا اب ناگری اور فارسی دونوں طرح کے حروف میں لکھی پڑھی جاتی ہے۔ تاہم اس کی بول چال ایک ہی ہے اور بظاہر اس میں کوئی فرق ممکن نہیں مثلاً ذیل میں سید انشا کی رانی کیتکی کی کہانی کا ایک اقتباس دیکھئے۔ آپ اس کو خواہ ناگری حروف میں لکھیں یا فارسی رسم الخط میں۔ یہ دونوں طرح ایک ہی معلوم ہوتی ہے اور اسی کا نام خالص اردو ہے۔ یہ خالص اردو ہی گویا اس ملک کی لنگوا فرنیکا ہے:

"اس کہانی کا کہنے والا یہاں آپ کو جتاتا ہے اور جیسا کچھ لوگ اسے پکارتے ہیں کہہ سناتا ہے۔ اب دہنا ہاتھ منہ پر پھیر کر آپ کو جتاتا ہوں۔ جو میرے داتا نے چاہا تو وہ تاؤ بھاؤ اور آؤ چاؤ۔ کود پھاند اور لپٹ جھپٹ دکھاؤں۔ جو دیکھتے ہی آپ کے دھیان کا گھوڑا جو بجلی سے بھی بہت چنچل ہے اچھلاہٹ میں ہرنوں کے روپ اپنی چوکڑی بھول جائے۔"

اب ہم ایک اور اقتباس جو بہت کچھ اسی قسم کی اردو سے ملتا جلتا ہے بطور ذیل میں درج کرتے ہیں۔ یہ انتخاب ایک پنڈت صاحب اجودھیا سنگھ اپادھیا کی تحریر سے کیا گیا ہے:-

ایک گیارہ برس کی لڑکی اپنے گھر کے پاس کسی پھلواری میں کھڑی ہوئی کسی کی باٹ دیکھ رہی ہے۔ سورج ڈوبنے پر ہے۔ بادل میں لالی چھائی ہوئی ہے۔ بیار (نسیم شام) جی کو ٹھنڈا کرتی ہوئی دھیرے دھیرے چل رہی ہے۔ تھوڑی بیر میں سورج ڈوبا۔ کچھ جھٹپٹا سا ہو گیا۔ پھلواری کی ایک اور سے کوئی آتا دکھائی پڑا جس اور وہ لڑکی کھڑی تھی۔ کچھ بیر میں وہ آکر اس لڑکی کے پاس کھڑا ہو گیا۔ لڑکی نے دیکھ کر کہا دیونندن! اب تک کہاں تھے۔ میں بہت بیر سے یہاں کھڑی تم کو اگور رہی ہوں (اگورنا پیشوائی کرنا)

باوجودیکہ یہ عبارت بھی خالص اردو زبان میں ہے۔ تاہم بیار۔ اگور اور اگورنا وغیرہ کے خالص ہندی الفاظ اس کو سید انشا کی ٹھیٹھ بول چال سے قدرے مختلف کر دیتے ہیں۔ اب اس سے بھی کچھ اور مختلف اقتباس ملاحظہ

دیا۔ تیج ا۔

"کسی منشیا کے دو پتر ا تھے۔ ان میں سے چھوٹکے نے پتا سے کہا ہے پتا دا سے باپ اپنی سمپتی (جائداد) میں سے جو میرا اس حصہ ہو سو مجھے دیجئے۔ تب اس نے اس کو اپنی سمپتی بانٹ دی۔ کچھ دنان بیتے مے تو اس چھوہرے نے اپنی سب سمپتی لچپن میں اڑادی"

۔۔۔ یہ خالص بنارس کی اردو ہے۔ ذرا دیکھو اس میں ہندی الفاظ کس کثرت سے ملائے گئے ہیں۔ مگر کیوں؟ بنارس ہندوؤں کی متبرک جگہ ہے۔ اس لئے اکثریت کی زبان پر سنسکرت کا غلبہ ہے۔

۔۔۔ اب ہم ایک خاص فقرے کو یہاں منتخب کرتے ہیں اور دکھاتے ہیں کہ وہ کس کس طرح تمام ہندوستان میں بولا جاتا ہے۔۔۔

"وہ اس درخت کے نیچے گھوڑے پہ بیٹھا ہے" یہ جملہ خالص اردو زبان کا ہے جو اگر اسی طرح کہا سنا جائے تو ہمارے کانوں کو بہت بھلا معلوم ہوتا ہے لیکن بڑی مشکل یہ ہے کہ بطور لنگوا فرنیکا یہ فقرہ تمام اطراف ملک میں اس طرح نہیں بولا جاتا۔ مثلاً بمبئی کے عام مسلمان بلکہ دکنی ہندو بھی اس کو یوں کہیں گے۔ "وہ اس جھاڑ کے تلے گھوڑے پو بیٹھا ہے یا بیٹھیا ہے" اور دوآبہ گنگ وجمن کے بعض اقطاع میں "او۔ اس رکھ کے تلے گھوڑے یا گھوڑے پہ چڑھا بیٹھا اسے" مگر بانگڑو بولی میں جو کہ رہتک جیند اور حصار وغیرہ میں رائج ہے کہیں گے "وہ اک گھوڑے پر اس رکھ کے تلے بیٹھا سے"

۔۔۔ اسی طرح آگرہ و متھرا وغیرہ کی مشہور برج کہا اس جملہ کو یوں ادا کرے گی "وہ گھوڑے پر وا پیڑ کے نیچی بیٹھو بھو اہے" قنوجی ۔ یا کان پوری بولی کہے گی "واہو ایک ٹٹو اپر وا رکھ کے تارے بیٹھو ہے" لیکن بندیلی زبان سب سے جدا ہو کے یوں پکارے گی "بو یو برکھ کے نیچے گھرٹوا پارے کے بیٹھو ہے" اسی طرح علاقہ گوالیار کی بول چال میں "با

گھوڑا پہ چڑھو بٹھا ہو ہے پیڑ نیچے"۔

لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔ یہ اردو زبان ہے کہ ملک بابل کا قدیم منار جس کی نسبت انجیل کا بیان ہے کہ اس منار میں بہت سے سنگ الہٰی لوگ جمع تھے۔ خدا نے ان کو سزا دینے کے لئے ہر ایک کی زبان دوسرے کی زبان سے بہت مختلف کر دی تو وہ لوگ سخت پریشان ہو کے رہ گئے۔

دراصل یہی حال ہمارا بھی ہوتا لیکن محمد شاہی دور کے اردو شعرا کی دور اندیشانہ طبع کوشا باش کہ انھوں نے ہندی ریختہ کی یہ گمبھیر زبان ترک کر کے اردوئے معلیٰ کی بنیاد ڈالی۔ جو ولی سے کر اقبال کے زمانے تک کام دے رہی ہے۔ اور یہی وہ اردو ہے جس میں اساتذہ ادب مثلاً ذوق۔ غالب۔ مومن۔ حالی۔ شبلی۔ رتن ناتھ سرشار اور اکبر۔ سرسید اپنی اپنی ادبی یادگاریں باقی چھوڑ گئے لیکن یہ واضح ہے کہ ان مصنفین کی زبان کا سکہ اقلیم علم و ادب میں رائج ہے۔ ورنہ اردو بطور لنگوا فرنیکا ابھی کچھ عرصے تک اس وسیع ملک میں اسی طرح رائج رہے گی جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا۔ اور یہ بھی بہت غنیمت ہے کیونکہ بول چال کی زبان ادبی زبان سے کچھ مختلف بھی ہوا کرتی ہے اور سچ پوچھو تو ہر ایک زبان پہلے اسی طرح عام بول چال کے طور پر مستعمل ہوتی اور پھر آہستہ آہستہ علمی و ادبی زبان بن جاتی ہے یعنی اگر کوئی زبان بری یا بھلی کسی طرح بولی نہ جائے تو پھر یہ تحریر میں بھی نہیں آتی اور نہ اس سے کوئی خاص علم ادب وضع ہو سکتا ہے لہٰذا یہ بات نہایت ضروری ہے کہ اب اس ملک میں اردو بطور لنگوا فرنیکا جس جس طرح پر مستعمل ہے اس کی قدر کی جائے اور مقامی محاورات میں سے جو جو زیادہ مفید و مستعمل ثابت ہوں ان کے اضافے سے اردو زبان کا ذخیرۂ الفاظ بڑھانے کی کوشش کی جائے۔

سرخوش

رباعی

ہر بو نہیں بد بوں کو ہوس سے کیا چھیڑو
جنت اسی دنیا کو بنا کر چھیڑو
پھولوں سے محبت سے جنابِ
دوزخ کو عداوت سے بچا کر چھیڑو

از جگر مرادآبادی

دُوری

یہ بُعد ہے سراسر یہ محض فاصلہ ہے
جلووں کو جو یہاں کے رنگیں بنا رہا ہے

دنیا کی ہر وہ صورت دل کو لُبھا رہی ہے
جو دور سے تجلّی اپنی دکھا رہی ہے

ہر چند کچھ نہیں ہے افتادگی کی ہستی
جب دور ہو زمیں سے دل کھینچتی ہے پستی

ہر دُور کی صدا میں اک دُھن ہے ایک گت ہے
اس بُعد کو نہ جانے کس سے مناسبت ہے

اہلِ خرد کی باتیں کب رِند مانتے ہیں
رازِ اس کشش کا ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں

پردے میں اس کشش کے اک پاک آرزو ہے
انساں میں یہ خدا کی پوشیدہ جستجو ہے،

دُنیا کی ہر وہ صورت دل کو لُبھا رہی ہے
جو دور سے تجلّی اپنی دکھا رہی ہے

جوشؔ ملیح آبادی

گوماں

نام ہے گومتی، پنڈت جی پیار سے گوماں کہا کرتے ہیں۔ کہتے ہیں مجھے اس سے ایک طرح کا اُنس ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس سے پیار کرتے ہیں، اس کی محبت کا دم بھرتے ہیں، اس کے چاہنے والوں میں سے ہیں، اپنا نام اس کے جاں نثاروں میں لکھواتے ہیں۔ اس طرح کہ لوگ انہیں گومتی کا عاشق تصور کریں، مجھ سے کئی بار اس معاملے پر بحث کر چکے ہیں۔ "دیکھو بھئی، میں مفت میں بدنام ہو رہا ہوں لوگ طعنے دیتے ہیں اس بے چاری کو، لیکن اگر سچ پوچھتے ہو تم جانتے ہو میں تم سے کوئی بات نہیں چھپاتا، دھرم سے کہتا ہوں اور تم جانتے ہو مجھے دھرم سے بڑھ کر اور کوئی چیز پیاری نہیں، مجھے گومتی سے اُنس ہے، بس، اُس اُنس میں گناہ کا شائبہ تک بھی نہیں، لوگ یوں ہی بدنام کرتے ہیں"۔ ایک لمبی سانس لے کر ——— "میرا کیا ہے اکیلی جان ہوں کچھ کٹ گئی ہے۔ کچھ کٹ جائے گی، مجھے تو اس بے چاری کی فکر ہے، اور اگر اس کے خاوند کو پتہ لگ جائے تو پھر کیا ہو، تم جانتے ہو مرد کتنے شکی مزاج ہوتے ہیں اور عورتوں کو اپنا ناموس کس قدر عزیز ہے، گو میری محبت پاکیزہ ہے، تم جانتے ہی ہو سانچ کو آنچ نہیں، پھر بھی ——— خلق کا منہ کون بند کر سکتا ہے۔ تم جانتے ہی ہو، اچھا چھوڑو، اس معاملے کو۔ لوگ یوں ہی شوشے چھوڑ دیا کرتے ہیں۔ ہمارا دل صاف ہے، لوگ جو چاہیں بکیں، آؤ چائے پئیں"

اور پھر ہم چائے پینے میں مشغول ہو جاتے

پنڈت جی بڑے مشہور ڈاکٹر ہیں۔ قصبہ کے اور آس پاس گاؤں کے تمام ڈھور ڈنگر اُن کے پاس بغرض علاج آتے ہیں۔ ان کا پورا نام ہے پنڈت بام دلیا اگنی ہوتری آف سلوتری ہیں۔ میں نے انہیں اکثر اسی طرح دستخط کرتے دیکھا ہے، لوگ انہیں صرف "پنڈت جی" کہہ کر پکارتے ہیں۔ یوں بھی دیکھنے میں اچھے خاصے بدصورت ہیں اور انہیں اپنی کم مائگی کا اتنا ہی احساس ہے جتنا ایک حسین کو اپنے حسن کا۔

ایک دن آئینہ سامنے رکھے مونچھوں کو تیل لگا رہے تھے، یکایک بول اُٹھے، "لال حسین تمہیں پتہ ہے کنکریٹ کیا ہوتا ہے"؟

میں نے جواب دیا "نہیں۔ تو"

"دیکھو، ہم تمہیں بتلائے دیتے ہیں، کنکریٹ وہ مسالہ ہے جس سے خالق باری نے بیسویں صدی کے انسان بنائے، یہ بات سائنسدانوں نے بڑی کھوج کے بعد دریافت کی ہے، انہوں نے اس مسالہ کو تیار بھی کر لیا ہے گر اس سے وہ انسان نہیں تیار کر سکے، اگر وہ ایسا کر سکیں تو ان میں اور پرمیشر میں کیا فرق رہ جائے، سچ ہے نا"

"سچا فرمایا آپ نے"

"تو دیکھونا، ہم تم سب اس مسالے سے بنے ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ خدا نے آپ لوگوں کو پہلے بنایا اور مجھے سب سے آخر۔"

"وہ کیسے"؟

"بڑی سیدھی بات ہے، دیکھونا، جب خدا سب لوگوں کو بنا چکا تو جو بچا کھچا مسالہ پڑا تھا اُسے دیکھ کر سوچ میں پڑ گیا آخر اس کا کیا کیا جائے بہت غور و خوض کے بعد اُس نے یہ فیصلہ کیا کہ اس سے ایک ایسا مجسمہ تیار کیا جائے جو سب سے انیلا ہو، اپنی نظیر آپ ہو جس کے رعب حسن سے عورتیں غش کھا جائیں، بچے ماؤں کی گودیوں میں چھپ جائیں، جس کے جلال سے مردوں کے پیٹ میں بل پڑ جائیں ہنستے ہنستے قولنج ہو جائے، وہ نوری مجسمہ میں ہوں، ذرا دیکھو تو ——— ناک اندر دھنسی ہوئی، چیچک کے داغ، ہاہاہا، اور یہ ہونٹ پکے ہوئے انجیر کی طرح پھٹے ہوئے۔" یہ کہہ کر آپ نے آئینہ زور سے میز پر پٹخ دیا اور لگے اپنے آپ کو گالیاں دینے۔

پھر کچھ دیر ٹھہر کر گنگنانے لگے "عشق تیرے میں صنم۔ میں صنم بول سنے کس کس کے۔

کس کس کے! ! کس کس کے!!!"

آدمی کے مزاج میں تلون کو کتنا دخل ہے، یہ دیکھ کر میں بے اختیار ہنسنے لگا۔ پھر وہ بھی میرے ساتھ ہنسنے لگے، ! ! ! !

. . . .

گومتی حسین ہے۔ مگر اس کا حسن اکبرے کا فارمولا نہیں، ایک فن کار اس میں ہزاروں نقائص دیکھ سکتا ہے، اس کے سینکڑوں عیب بیان کر سکتا ہے، یہ ہوتے ہوئے بھی اُس کے حسن میں کچھ ایسی دلکشی و جاذبیت ہے جو دل کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے، مجھے اس کی آنکھیں بہت پسند ہیں۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، ناگوری گائے کی طرح سست اور پنڈت جی کو اس کی ٹھوڑی اور وہ شیریں لوچدار آواز پسند ہے جسے سن کر اُن کا دل کسی نامعلوم مسرت سے کانپنے لگتا ہے۔ قصبہ کے حاکم اعلیٰ یعنی نائب تحصیلدار صاحب بھی اُسے اکثر تعریفی نگاہوں سے دیکھا کرتے ہیں، گومتی ان تعریفی نگاہوں سے خوش ہو جاتی ہے یہ خیال کہ وہ حسین ہے اور لوگ اُسے چاہتے ہیں۔ اُسے ہر دم مسرور رکھتا ہے وہ اپنے خاوند پر حکومت جتا سکتی ہے، اُس سے ایک نئے زیور کی فرمائش کر سکتی ہے، روٹھ جاتی ہے اور پھر چاہتی ہے کہ اُس کا خاوند اُسے منائے۔ وہ تین بچوں کی ماں ہے۔

اس کا خاوند ایک غریب دُکاندار ہے قصبے کے چھوٹے سے بازار میں ایک سرے پر چھوٹی سی دکان ہے۔ نمک آٹا تیل، کھدر اور گجرے وغیرہ بیچتا ہے۔ قد ٹھگنا، منحنی صورت، زن مرید۔ گومتی کو اُس سے کیسے محبت ہو سکتی ہے۔ یہ بات میری سمجھ میں آج تک نہ آئی۔ اُس کے کپڑے عموماً میلے رہتے ہیں۔ بیچارہ ہر وقت دُکان پر بیٹھا رہتا ہے۔ ہمارے قصبہ کی دکانیں شام کے چھ بجے بند ہو جاتی ہیں، مگر بارہا جب ہم سیر کر کے شام کو آٹھ، ساڑھے آٹھ بجے گھر کو لوٹے ہیں، گومتی کے غریب خاوند کو ہم نے دُکان پر ہی بیٹھا پایا ہے اور اس وقت شمع کی جھلملاتی ہوئی لو میں اس کا چہرہ کتنا عجیب نظر آتا ہے۔ وہ بودھوں کے دلائی لامہ کی طرح خاموش، صمٌ بکمٌ بیٹھا ہوتا ہے۔ نہ کیا سوچتا ہے! شاید وہ سوچتا ہی نہیں، یا شاید وہ کسی گاہک کا انتظار کر رہا ہے۔ ایسے گاہک کا جو کبھی آئے گا ہی نہیں۔ ——— یا شاید وہ الف لیلہ کا ایک بونا ہے کہ محفل ہزار داستان سے اُٹھ کر ہماری اس خاموش، خشک، رومان سے خالی دنیا میں چلا آیا ہے اور انتظار کر رہا ہے اُس زمانے کا جس کی حقیقت آج محض افسانوی ہے منتظر ہے اُس کائنات کا جس میں ہارون الرشید، ابوالحسن، الہ دین، امینہ اور کیبار رہتے ہیں۔ کبھی اسکی دکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے یکلخت ٹھٹھک کر رہ جاتا ہوں، اور جب وہ اپنے شانے سکیڑے گردن نیچی کئے ہوئے بیٹھا ہوتا ہے تو مجھے ایسا احساس ہوتا ہے کہ کوئی منتر پڑھ رہا ہے زمین پر کچھ پڑھ کر پھونک رہا ہے جس کے سحر سے یہ زمین ابھی پھٹ جائے گی اور ایک جن نمودار ہو گا جو رعد کی سی آواز میں بولے گا "کیا چاہئے؟" ——— مگر ایسا کبھی نہیں ہوتا، اس رومانیت سے خالی دنیا میں ایسا کبھی نہیں ہوتا، بلکہ ہر بار یہی ہوتا ہے کہ وہ غریب بنیا بول اٹھتا ہے،

"کیا چاہئے، بابو جی!"

اور میں جلدی سے گھبرا کر جواب دیتا ہوں، "تین انڈے مرغی کے!"

اور پھر مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ الف لیلہ کا بونا نہیں، ایک غریب دکاندار ہے، گومتی کا خاوند، گومتی جسے میں اور نائب تحصیلدار صاحب تعریفی نگاہوں سے دیکھا کرتے ہیں اور بس ——— اس دنیا میں حسن ہے، مگر رومان نہیں۔ محبت ہے، مگر مجنوں ناپید، شاید یہی سوچ کر عمر خیام کو دنیا کے نامکمل ہونے کا احساس ہوا ہو گا۔

. . . .

پنڈت جی دن میں دو بار آٹھ آٹھ آنہ تول افیم کی چسکی لگتے ہیں، افیم کی اتنی مقدار غالباً ہندوستان کے آٹھ دس بے کار نوجوان گریجوایٹوں کو ابدی سکون عطا کر سکتی ہے اور ہندوستان کی بڑھتی ہوئی آبادی کو گھٹانے میں ضبطِ تولید سے زیادہ ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ ہند کے اصلاح پسندوں کو مصنوعی اور غیر قدرتی طریقے چھوڑ کر اس نعمتِ خداداد کی طرف رجوع کرنا چاہئے، کیا عجب کہ اسی سے قوم کا بیڑا پار ہو جائے، پنڈت جی سے پوچھئے، چسکی لگا کر کیسی روح پرور باتیں کرتے ہیں اور پھر لالہ سے چودہ چھٹانک دیسی شراب پی کر کس طرح ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو جاتے ہیں، اس وقت دنیائے سیاست کی باگیں اُن کے ہاتھ میں ہوتی ہیں، اور کل کائنات کے اسرار و رموز ان کے نطق میں۔ ایسی حالت میں جو دوا وہ تجویز کر دیں۔ بیمار حیوانوں پر اکسیر کی طرح اثر کرتی ہے۔ اس وقت کتنے ہی لوگ کہ جن کے ڈھور ڈنگروں نے اُن سے شفا حاصل کی ہے اُن کے جان و مال کو دعائیں دے رہے ہیں، کسی پیر سادھو کے آستان کی طرح شفاخانے میں لوگ آپ ہی آپ دودھ، مکھن، پنیر، پھل لئے

آدمی ہیں، پنڈت جی نیک آدمی ٹھہرے جو چیز دلی عقیدت سے پیش کی جائے اُسے کس طرح نہ قبول کریں۔ طرفہ یہ کہ اکیلی جان، کیا کھائیں اور کیا نہ کھائیں، چنانچہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ دودھ، مکھن، پنیر اور پھلوں کا بیشتر حصہ گوماں کے گھر پہنچا دیا جاتا ہے۔ ویسے بھی انہیں گومتی کی لڑکیوں رانی اور بلا سے بہت الفت ہے۔ یہ سب اشیا بچوں کے لئے بھیجی جاتی ہیں اور غالباً اسی لئے قبول کی جاتی ہیں۔ رانی بڑی شوخ و طرار ہے۔ پنڈت جی سے ہر روز کسی نہ کسی چیز کی فرمائش کر دیتی ہے، مگر یہ فرمائشیں اکثر شکر کی ڈلی سے لے کر سیب کی گڑیا تک ہی محدود رہتی ہیں۔ صبح سیر کرتے ہوئے وہ راستے میں گومتی کے گھر سے رانی یا بلا کو اٹھا کر سیر کے لئے لے جاتے ہیں، اور شام کو ایک ہی کھاٹ پر بیٹھ کر گوماں سے گلچھرے اڑاتے ہیں۔ ان دونوں کو اس طرح بیٹھے دیکھ کر بوٹیشیو کے شاہکار "حسن اور حیوان" کا تصور آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے، گوماں کی وہ نشیلی نگاہیں پنڈت جی کے رخ صحرائی پر ابر رحمت بن کر برستی ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اُن نگاہوں کی لامتناہی وسعتوں میں کھو دیتے ہیں اور اکثر بالکل بے خود ہو کر شام کو جھومتے ہوئے واپس گھر آتے ہیں۔

ایک شام کا ذکر ہے، میں آتشدان کے قریب پاؤں پھیلائے اونگھ رہا تھا، مینہ برس کر بادل مغرب کے قریب شفق سے گلرنگ ہو گئے تھے، جلتی ہوئی لکڑیاں چٹخ چٹخ کر مجھے لوری دے رہی تھیں اور قریب تھا کہ میں یہ دلفریب لوری سنتا سنتا اُن کی آغوش میں گر جاتا اگر باہر کسی کے قدموں کی آہٹ نے مجھے چونکا نہ دیا ہوتا، اٹھ کر دیکھتا ہوں کہ پنڈت جی شانے سکیڑے چہرے کو اپنے پرانے اوورکوٹ کے اٹھے ہوئے کالروں میں چھپائے کھڑے ہیں۔

"کیا بات ہے پنڈت جی؟"

جواب ندارد

"چپ کیوں ہو گئے؟ کیا اداس ہو؟"

کامل سکوت

"کہیں بے بھاؤ کی تو نہیں پڑیں، دوست؟"

کوٹ کے اٹھے ہوئے کالروں سے ایک قہقہہ بلند ہوا، سکڑے ہوئے شانے سیدھے ہو گئے اور خمیدہ گردن نے اپنے آپ کو اونچا کیا، میں چہرہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا، یہ گوماں تھی ــــ ہنس رہی تھی اور ہنسی ہوئی دہری ہوتی جا رہی تھی۔

میں جلدی سے ٹانگیں جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا، اور فرط حیرت سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

کچھ توقف کے بعد میں نے گوماں سے پوچھا "آپ یہاں کیونکر آئیں؟ ــــ پنڈت جی ــــ پنڈت جی کہاں ہیں؟"

"نالے میں پڑے، آپ کی راہ تک رہے ہیں"

"ہائیں" میں نے گھبرا کر کہا، "کیا ہوا، کہیں ــــ"

وہ جلدی سے قطع کلام کر کے بولی، لیکن اب اُس کی دلکش ہنسی غائب ہو چکی تھی۔

"ہونا کیا تھا، خاک" اُس نے تیز تر لہجہ میں کہنا شروع کیا، "وہ آپ کا دوست، پنڈت جی، پنڈت جی! ــــ بدمعاش کہیں کا۔ ۔ ۔ لچا۔ ۔ ۔ مگر نہیں" ایک دم اس کا لہجہ بدل گیا اور وہ تاسف انگیز لہجہ میں بولی، "یہ سب میرا ہی قصور ہے"

کچھ دیر چپ چاپ سر جھکائے کھڑی رہی، پھر اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا، بولی، "بھائی، میں اُسے کچھ اور ہی سمجھے ہوئے تھی۔ دنیا کچھ کہے، میری نظروں میں وہ میرا بھائی تھا۔ میں نے اس کے لئے خاوند کی گھڑکیاں سہیں، رشتہ داروں کے طعنے برداشت کئے مگر اُس سے غیروں کا سا سلوک نہ کیا۔ آج اس کا صلہ یہ ملا کہ اُس نے پکڑ کر میرا منہ چوم لیا۔ ۔ ۔ میں۔ ۔ ۔ میں" یہ کہہ کر وہ رونے لگی اور اسی طرح روتی ہوئی اُس نے پنڈت جی کا اوورکوٹ اتار کر مجھے دے دیا اور اسی طرح سسکیاں بھرتی ہوئی رخصت ہو گئی

. . . .

"اور اُس کمبخت نے میرے بال نوچ ڈالے" پنڈت جی آہستہ آہستہ کہہ رہے تھے اور میں اُن کی پیٹھ پر مالش کر رہا تھا "میں تو بھلا شرابی تھا، نشے میں چور تھا" ــــ اب وہ نشہ کدھر ہرن ہو گیا تھا ــــ "مگر اُس نے میرا قطعاً کوئی خیال نہ کیا ــــ اس نے مجھے گالیاں دیں، میرا اوورکوٹ اتار لیا، اور مجھے کان سے پکڑ کر نالے پر لے آئی، بارش بھی ہو رہی تھی، کم بخت، آہ، بند بند دکھ رہا ہے۔ اس نے میری رتی بھر پروا نہیں کی۔ آہ وہ پھلوں کے ٹوکرے دودھ کے گلسے، مکھن کے گولے"

میں اُن کی دلچسپ باتیں سن رہا تھا اور خوش ہو رہا تھا، میرے کانوں میں کے۔ سی۔ ڈے کا وہ دلفریب الاپ گونج رہا تھا "دل لگانے کا نتیجہ مل گیا"

اُن کے کوچہ میں جو تو اسے دل گیا
دل لگانے کا نتیجہ مل گیا

. . . .

...ل اکثر اداس رہتا ہے۔ پنڈت جی نے اپنی رونی صورت کو دائمی شکل دے لی ہے۔ دوستوں سے بے رخی، نوکروں سے خفگی اور مریضوں سے بے اعتنائی اختیار کر لی ہے۔ بات بات پر غصہ، بات بات پر ناراض۔ وجہ؟ صلح کی سب کوششیں ناکام رہی ہیں، دودھ کے ڈول لوٹا دئے گئے ہیں، پھلوں کے ٹوکرے بغیر ہاتھ لگائے واپس بھیج دئے گئے ہیں، مکھن ایک بال نکالے بغیر پھیر دیا گیا ہے۔ کریں تو کیا کریں۔ قریب کے ایک گاؤں کا نمبردار نورحسن اپنی خوبصورت گابھن گائے کو لے آیا کہنے لگا "پنڈت جی اسے دیکھئے، شاید سردی لگ گئی ہے بدن کانپتا ہے، نتھنوں سے ریشہ جاری ہے کبھی کبھی کھانستی بھی ہے اور پچھلا دایاں پاؤں بار بار اٹھاتی ہے، پنڈت جی کوئی اچھی سی دوا دو، ابھی ایک مہینہ ہوا اسے کشتواڑ سے لایا ہوں آپ کا بھلا ہو گا" پنڈت جی جلے بھنے اٹھے، جلدی سے ایک شیشی اٹھا لائے، گائے کا منہ کھول کر اور سینگ چڑھا کر دوا انڈیل دی، پلانا تھا گیو کسچر، جلدی میں پلا گئے ٹنکچر آیوڈین۔ گائے نے راستے میں ہی پران دے دئے۔ نورحسن کو شبہ ہوا۔ گابھن گائے، خوب صورت گائے، نئی خریدی ہوئی، ناگوری نسل، تھانے میں رپٹ لکھوا دی۔

. . . .

شومیٔ قسمت، پنڈت جی کو تو خود ہی اس "گو ہتیا" کا بہت افسوس تھا، اس پر پولیس والوں نے تنگ کرنا شروع کیا اصل میں یہ تھانے والے دوسروں کے جذبات اور احساسات سے قطعاً بے پرواہ ہوتے ہیں کبھی بھولے سے بھی ان کے دل میں یہ خیال نہیں گذرتا کہ وہ اپنے طرزِ عمل سے دوسروں کے نازک جذبات کو کتنی ٹھیس پہنچا رہے ہیں۔ پنڈت جی کو دیکھو، بے چارے آپ ہی آپ شرم کے مارے مرے جا رہے ہیں، اب بھلا پولیس کو دخل درمعقولات کی کیا ضرورت تھی، گائے تو نورحسن کی مری یا ماری گئی، بھلا یہ تھانیدار صاحب کیوں پرائے پھٹے میں ٹانگ اڑاتے ہیں اور ہمارے ان کے تعلقات کتنے برسوں سے خوشگوار چلے آ رہے ہیں، جبکہ یہ تھانیدار صاحب ابھی سرینگر میں سارجنٹ ہی ہوا کرتے تھے، خود میں نے کئی دفعہ ان کی بھینس کی مرہم پٹی کی سنے کہ

جب سکول کے لونڈوں نے اسے پتھر مار مار کر ادھ موا کر دیا تھا اور آج یہ ہم سے تین سو روپیہ رشوت میں مانگتے ہیں اور طرفہ یہ کہ دھمکی دیتے ہیں جیل پہنچانے کی، حوالات کی، کیوں؟" یہ کہہ کر پنڈت جی میری طرف تکنے لگے، میں نے نگاہیں نیچی کر لیں اور بوٹ کی نوک سے زمین کریدنے لگا گویا تین سو روپے وہیں گڑے ہوئے تھے۔

۔۔۔ اور بھلا کرتا بھی کیا تین سو روپیہ کہاں سے لاتا پنڈت جی نے تو کبھی پھوٹی پائی بھی نہ رکھی تھی۔ تنخواہ اور "بالائی آمدنی" کے علاوہ ہمیشہ ادھار مانگ کر کھایا کرتے تھے، زیادہ نہیں تو کم از کم ساڑھے تین چار سو تک انہیں قصبہ کے دکانداروں کا دینا تھا، اور ان سے اب کچھ مزید ملنے کی توقع نہ تھی ۔۔۔ میں غریب آدمی ٹھہرا، ادھر ادھر سے مانگ تانگ کر پچاس روپیہ اکٹھے کئے مگر یہ تو آٹے میں نمک کے برابر بھی نہ تھا تھانیدار صاحب حرص و آز کے دانت تیز کئے ہوئے تھے۔ تین سو سے ایک پائی کم لینے کو تیار نہ تھے۔ بڑی مشکل کا سامنا تھا، اسی حیص بیص میں کئی دن گزر گئے، آخر ایک دن تھانیدار صاحب میرے پاس آئے، کہنے لگے "کیوں بھئی، پھر کیا صلاح ہے، چالان کر دوں، آخر کب تک چپ بیٹھا رہوں گا، نورحسن بھی بگڑا ہوا ہے، فرض کی بجا آوری تم جانتے ہی ہو"

قرائن سے معلوم ہوتا تھا، کہ نورحسن نے آج تھانیدار صاحب کی مٹھی گرم کی تھی، فرض کی بجا آوری اتنے دن خاموش رہنے کے بعد آج پھر چمک اٹھی تھی۔

کوئی جواب نہ پا کر تھانیدار صاحب اٹھ کھڑے ہوئے، "اچھا تو چلتا ہوں، اگر آج شام تک کچھ بن جائے تو بہتر، ورنہ کل تو معاملہ میرے اختیار سے باہر ہو گا"

پنڈت جی کو ساتھ لئے رات کے بارہ بجے تک در بدر گھوما کسی نے آس نہ بندھائی۔ رات ساری جاگتے کٹی۔ اور صبح میلے کچیلے بادلوں کا لبادہ اوڑھے نمودار ہوئی۔ رات کو یہ خبر قصبہ میں آگ کی طرح پھیل گئی تھی کہ پنڈت جی کو صبح گرفتار کیا جائے گا۔ صبح لوگ جوق در جوق آنے شروع ہوئے۔ ٹولیاں بنا کر، دو دو، چار چار کھڑے تھے۔ کوئی کچھ کہتا، کوئی کچھ، کوئی پنڈت جی کی "گئو ہتیا" پر نفرین کرتا تو کوئی تھانیدار صاحب کی رنگ رلیوں کا تذکرہ کرتا جتنے منہ اتنی باتیں۔ گھر کے اندر پنڈت جی چپ چاپ بیٹھے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ جب چاروں طرف سے ناامیدی نے گھیر لیا ہو، اندھیرے میں کہیں بھی

مطلعِ امید نہ دکھائی دیتی ہو، اس وقت طبیعت میں اپنے آپ سکون پیدا ہو جاتا ہے۔ قلب میں دلیری اور ہر مشکل کا سامنا کرنے کی جرأت پیدا ہو جاتی ہے۔ پنڈت جی تو یوں بھی بے پروا، بے فکر، نتائج و عواقب سے بے نیاز طبیعت کے مالک تھے جو کچھ ہوگا، دیکھا جائے گا۔ صبر کر کے بیٹھ رہے۔ تھانیدار صاحب کی راہ دیکھ رہے تھے کہ آئیں تو کم از کم مغلظات سنا کر ہی اپنے دل کی بھڑاس نکال لیں۔

یکایک کسی کے بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی اور باہر لوگوں کی چہ مے گوئیاں بھی یکایک بند ہو گئیں، میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ یہ تھانیدار صاحب تھے۔ وردی پہنے ہوئے دراتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ اُن کے بعد پولیس کے تین سپاہی اور ان کے بعد بیس تیس ہمارے قصبہ کے بھائی بند۔ تھانیدار صاحب نے ایک اڑتی ہوئی نگاہ سے میری طرف دیکھا اور سب کچھ سمجھ گئے۔ میں نے انہیں اندر لے جا کر تخلیہ میں بات چیت کی گڑگڑایا، پنڈت جی نے اُن کے پاؤں بھی پکڑ لئے۔ مگر وہ خدا کا بندہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ پچاس روپے میں وہ معاملہ کیسے دبا سکتا تھا۔ اکیلا نور حسن ہی بہ مشکل ڈیڑھ دو سو لے کر راضی ہوگا۔ مقدمہ بالکل صاف تھا۔ گواہ موجود تھے۔ تھانیدار صاحب کو خود بہت رنج تھا۔ کیا وہ پنڈت جی کی گرفتاری کو پسند کرتے تھے؟ ہاں وہ اتنا کر سکتے تھے کہ پنڈت جی کو ہتھکڑی لگائے بغیر گرفتار کرتے۔

جب تھانیدار صاحب اپنا منشا ظاہر کر چکے تو پنڈت جی نے اٹھ کر اپنا اوورکوٹ اوڑھا اور نگاہیں نیچی کر کے بولے، "چلئے، جدھر لے چلئے، چلتا ہوں۔"

میرا دل بھر آیا۔ پنڈت جی لاکھ برے سہی، پھر بھی میرے دوست تھے۔ بس چلتا تو اس کمبخت تھانیدار کی بوٹی بوٹی نوچ لیتا، مگر کیا کرتا، اپنے بس کی بات نہ تھی۔ زہر کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ پنڈت جی جیسے آگے آگے تھانیدار صاحب تھے، اس کے بعد پنڈت جی سر جھکائے ہوئے، ان کے بعد پولیس کے سپاہی۔ لوگ آنگن میں کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ اہل قصبہ میں ایسا کون شخص تھا کہ جس کے مال مویشی کی خدمت پنڈت جی نے نہ کی تھی۔ اُس آنگن میں رلدو رام شاہ بھی کھڑے تھے اور گھسیٹا مل بھی، چودھری پیر بخش بھی تھے اور ملک سردار خاں بھی۔ مگر کسی کو ترس نہ آیا، نہ خوفِ خدا۔ سب اہل تماشا بنے کھڑے تھے۔ تھانیدار صاحب ابھی بہ مشکل آنگن میں چار قدم چلے ہوں گے کہ دروازے پر کسی نے روک لیا اور کسی کی مہین آواز سنائی دی، ٹھہرئے،

مجھے کسی کی میلی کچیلی ساڑھی کا پلو نظر آیا، آگے بڑھ کر دیکھا، گومتی تھی، سمٹی جا رہی تھی، تھانیدار صاحب ایک طرف ہو گئے۔

گومتی نے پنڈت جی کی طرف دیکھا، وہ سر جھکائے گم صم کھڑے تھے۔ پھر اُس نے میری طرف دیکھا اور آنکھیں جھکا کر بولی، "بھائی — میرے بھائی کو چھڑا دو۔" یہ کہہ کر اُس نے آہستہ سے ایک روپوں سے بھری ہوئی تھیلی میری طرف بڑھا دی۔

عورت نشہ ہے، فریب ہے، سراب ہے، رسوائی ہے، اور وہ سب کچھ ہے جو انسان کو بدی کی طرف راغب کرتا ہے۔ عورت پاکیزگی ہے، عصمت ہے، سراپا تقدیس ہے اور سب کچھ ہے جو انسان کو انسانیت کے معراجِ کمال پر لے جاتا ہے۔ جس آسانی سے یہ ایماں کو غارت کر سکتی ہے، اُسی آسانی سے یہ اُسے عطا بھی کر سکتی ہے گومتی کے اس ایک جملے نے پنڈت جی کی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا۔ انھوں نے مجھے ہاتھ کے اشارہ سے روپے لینے سے روک دیا اور آگے بڑھ کر گومتی کے پاؤں چھو لئے اور نمناک لہجہ میں بولے، "بس بہن تمہارے روپے مجھے پہنچ گئے۔ میں قید سے آزاد ہو گیا ——" پھر تھانیدار صاحب کی طرف دیکھ کر پرجوش آواز میں بولے۔ "چلو، اب اب دیر کیوں لگا رکھی ہے!"

. . . .

پنڈت جی چھ مہینے سے جیل میں ہیں۔ وہاں افیم ملتی ہے نہ شراب۔ خوب مزے میں ہیں۔ کہتے ہیں گوماں نے مجھے سدھار دیا۔

کرشن چندر ایم اے

تقدیرِ عشق

حُسن نے رکھی ہے بنیادِ جہاں میرے لئے ‎ ‎ یہ زمیں میرے لئے یہ آسماں میرے لئے

موت کی پرواز سے ہے دُور میرا آشیاں ‎ ‎ زندگانی ہے حیاتِ جاوداں میرے لئے

میں قناعت کر نہیں سکتا جہانِ تیرہ پر ‎ ‎ جادۂ راہِ طلب ہے کہکشاں میرے لئے

میری خاکِ راہ کا ہر ذرّہ ہے نوکِ سناں ‎ ‎ ہر قدم پر ہے نیا اک امتحاں میرے لئے

میری ہیبت سے ہر اک مغرور کا نیچا ہے سر ‎ ‎ جھک کے ملتا ہے زمیں سے آسماں میرے لئے

میں اگر قائم رہوں اپنی خودی پر اے حفیظؔ
وہ بدل سکتا ہے تقدیرِ جہاں میرے لئے

حفیظ ہوشیارپوری

غزل

کاش کچھ بہتر ہوا انجام سفر میرے لئے　　رات دن گردش میں ہیں شمس و قمر میرے لئے

کیا یہی ہے حاصل لیل و نہارِ زندگی　　شام سے اک کشمکش ہے تا سحر میرے لئے

آج کس رفعت پہ ہوں تیری نگاہِ لطف سے　　سر بہ سجدہ ہو نہ جائیں بام و در میرے لئے

ایک نظّارے نے اس کے دل کے ٹکڑے کر دئے　　آج قاتل بن گئی میری نظر میرے لئے

کون سن سکتا ہے اس دل کے دھڑکنے کی صدا　　ایک اک آواز ہے جادو اثر میرے لئے

صاف اوجھل ہے نگاہوں سے وہ حسنِ بے نقاب　　کس قدر دشوار ہے تابِ نظر میرے لئے

آج اُس راہِ محبت میں قدم رکھتا ہوں میں　　ذرّہ ذرّہ ہے جہاں سینہ سپر میرے لئے

کون ہے میرے سوا حرماں تڑپنے کا مجاز
اک عطائے خاص ہے دردِ جگر میرے لئے

حرماں خیرآبادی

"ہمہ خاندان آفتاب"

(ایک ایکٹ کا مزاحیہ ڈراما)

یہ ڈراما اپنی طرز کی نئی تکنیک ہے ... کہ اس کا کوئی خاص پلاٹ نہیں لیکن ابتدا سے آخر تک ایک دلچسپ ربط قائم ہے۔ عوام میں غلط الفاظ کے استعمال اور غیر ذمہ دارانہ طریق گفتار کی جو عادت پائی جاتی ہے یہ ڈراما اس پر ایک لطیف طنز ہے۔ امید ہے کہ اب اردو میں اب اس طرز کے ڈرامے بھی لکھے جائیں گے۔ ایڈیٹر

افرادِ تمثیل

۱۔ طلبا نواز بیگ۔ ایک سانولے قد کا ... ایک اقامت خانے کا مہتمم
۲۔ شجر حیات خاں ــــ ایک لمبا چوڑا بھاری جسم شخص، بڑے رتبے کا ...
۳۔ معتبر حسین ــــ طلبا نواز اور شجر نواز کا ہم جماعت، پرانی دوستی کا آدمی
۴۔ غوں غوں بیگ ــــ طلبا نواز کا بڑا لڑکا
۵۔ چوں چوں بیگ ــــ ،، چھوٹا لڑکا
۶۔ بٹیلی ــــ شجر حیات کی بیوی
۷۔ شریرہ ــــ ،، کی لڑکی
۸۔ استاد ــــ چوں چوں بیگ کا ماسٹر
۹۔ داروغہ ــــ شجر حیات خاں کا داروغہ
۱۰۔ گڑبڑ ــــ شجر حیات کا پالتو

پہلا منظر: (طلبا نواز بیگ کا مکان۔ ایک کمرے میں طلبا نواز بیگ کرسی پر بیٹھا ہے۔ مقابل میں منشی صاحب حساب کے کاغذات اور رجسٹر وغیرہ لئے بیٹھے ہیں۔ طلبا نواز کاغذات کو دیکھتے ہوئے گفتگو کر رہا ہے)

طلبا نواز: صیب! یہ کیا چقپش ہے۔ ایسا اگڑ بگڑ حساب تو میری سمجھ میں نہیں آتا۔

منشی: میں دو روز سے رخصت پر تھا۔ محرر صاحب نے یہ گڑبڑ کر دی ہے آج سب ٹھیک کر دوں گا

طلبا نواز: صیب یہ تیس روپے کا ہے کے ہیں۔

منشی: آپ نے کاغذ منگوانے کا حکم دیا تھا۔

طلبا نواز: تو پھر آپ نے لکھا کیوں نہیں کیسے معلوم ہو کہ کتنے تھان کاغذ آیا ہے۔

منشی: تین رم آئے تھے۔

طلبا نواز: تو پھر کیجئے نا اندراج رجسٹر۔

منشی: بہت خوب۔

طلبا نواز: صیب! کل کی دعوت بڑی زور شور کی ہے ذرا انتظام اچھا کر،

منشی: آپ خاطر جمع رکھیں سب انتظام نہایت سلیقے سے کروں گا

طلبا نواز: دیکھئے صیب بہتر تو یہ ہوگا کہ ہم ہر ایک دعوتی کی جائے مخصوص پر چٹھے لگا دیں۔

منشی: جی ہاں ہر کرسی پر نام کی چٹھی باندھ دیں گے۔

طلبا نواز: صیب اب آپ جائیے۔ میں ذرا دوسرے کام کی خبر لیتا ہوں ... میں شجر حیات خاں صاحب کے خانے جا رہا ہوں۔ اگر مجھ ... کسی فعل کی ضرورت لاحق ہو تو وہاں آنا۔

منشی: میں پھر کب حاضر ہوں۔

طلبا نواز: جب آپ کا جی چاہے ٹھیک چار بجے [منشی چلا جاتا ہے]

دوسرا منظر

[شجر حیات خاں کا دیوان خانہ۔ شجر کا پاگل ملازم گڑبڑ گنگناتے ہوئے

فرنیچر صاف کر رہا ہے۔ شجر باہر سے داخل ہو کر گڑبڑ کے قریب جاتا ہے]

شجر۔ [قریب جا کر] گدھا

گڑبڑ۔ [چونک کر] آں ں ں ٹپ آباد شجر سے ٹکرا کر بے ترتیبی کے ساتھ گر پڑتا ہے۔ شجر غصے میں آ کر بے تحاشا ڈانٹ ڈپٹ شروع کرتا ہے۔ یہ سن کر شجر کی بیوی داخل ہوتی ہے۔ دوڑتی ہوئی پریشانی کی حالت میں آ کر وہ بھی شوہر سے ٹکرا کر گرتی ہے۔ گڑبڑ اٹھتا ہوا نکل جاتا ہے۔ شجر بڑبڑاتا ہوا اپنی بیوی کو اٹھنے میں سہارا دیتا ہے۔ پھر اس کو ایک صوفے پر لے جا کر لٹا دیتا ہے۔ ہٹیلی کراہ رہی ہے]

شجر۔ اس طرح لیٹنے میں شاید تکلیف ہو گی [گڑبڑ داخل ہوتا ہے]

گڑبڑ۔ ڈرائیور صیب آئے ہیں۔

شجر۔ اندر بلا کر لا [گڑبڑ جاتا ہے۔ شجر ہٹیلی کو کروٹ بدلنے میں مدد دے رہا ہے۔ طلبا نواز بیگ مسکراتے اور رومال ہلاتے ہوئے داخل ہوتا ہے] آیئے تشریف لائیے بھائی صاحب۔

طلبا نواز۔ کیوں صیب۔ یہ آپ کا زنان خانہ کچھ کر وٹ بدل رہا ہے۔

شجر۔ جی ہاں ابھی ابھی گر پڑی تھیں تکلیف کے باعث کراہ رہی ہیں۔

طلبا نواز۔ چوٹ پوٹ تو نہیں آئی۔

شجر۔ پاؤں کو مار لگا ہے۔

طلبا نواز۔ شاید گھٹنے کے ٹیلے پر۔

ہٹیلی۔ اوہ ہوں گھٹنے کی ہڈیں۔

طلبا نواز۔ کیوں صیب۔ یہ کیسے چت پٹ ہو گئیں۔

شجر۔ وہی حرامزادہ گڑبڑ ——————

ہٹیلی۔ نہیں بلکہ آپ کے پیٹ کے نقارے سے ٹکرا گئی۔

شجر۔ اجی اسی کی وجہ سے تو یہ سب کچھ ہوا۔

طلبا نواز۔ تو پھر تو صیب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو چوٹوں پر چوٹیں لگی ہیں۔

[شریر اور غوں غوں بیگ داخل ہوتے ہیں]

شریر۔ کیا ہوا امی

شجر۔ کیا خاک ہوتا۔

غوں غوں۔ شاید گر پڑی ہیں۔

شجر۔ اور کیا

شریر۔ کیسے۔

طلبا نواز۔ صیب کیسے کیا معنی آپ کے اس لفنگا گڑبڑ کا فعل ہے۔

غوں غوں۔ چوٹ بڑی بھاری بھرکم معلوم ہوتی ہے۔

شریر۔ ابا حرامزادے کے پیٹ سے پیچھا چھڑا دو۔

طلبا نواز۔ نہیں صیب ایسا نہ کرنا آخر وہ آپ ہی کے گھر کا پردہ در ہے نا۔

غوں غوں۔ بس ابا آپ تو ہمیشہ ان گدھوں کی پتیسیاں لیتے رہتے ہیں۔

شجر۔ بیگم کیوں اب تکلیف کیسی ہے (ہٹیلی کراہتی ہے)

طلبا نواز۔ کیا صیب یہ بھی کوئی پرسش کرنے کی بات ہے دیکھیے گھٹنے کا ٹیکہ کتنا موٹا ہو گیا ہے درد ہو گا ضرور

شریر۔ اف کتنا نازک مقام ہے۔ چپٹی کی مار ہے بس آنسو ہی ٹپک پڑتے ہیں۔

غوں غوں۔ معلوم ہوتا ہے مار گھٹنے کے ٹخنے پر بھی زور دار ہے۔

ہٹیلی۔ اور گھٹنے کی وادی میں بھی چوٹ آئی ہے۔

طلبا نواز۔ صیب تب تو انہیں اندر لے جا کر چوپائے پر لٹا دینا چاہیے۔

شجر۔ جی ہاں میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔

شریر۔ امی چلو اندر چل کر آرام کرو [شریر اور غوں غوں اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں]

طلبا نواز [شجر سے] صیب آپ بھی اُن کی گردن میں ہاتھ دیجئے [شریر اور غوں غوں ہٹیلی کو لے جاتے ہیں]

شجر۔ آیئے ادھر تشریف رکھئے بھائی جان۔

طلبا نواز۔ نہیں صیب آپ اپنی جائے مخصوص پر بیٹھئے۔ آپ کا مزاج شریف

شجر۔ دعا سے اچھا ہوں۔ بھائی صاحب معاف کرنا کہ میں خود آپ سے ملنے حاضر نہ ہو سکا۔

طلبا نواز۔ کیا مضائقہ۔ میں خود تشریف لایا ہوں نا۔

شجر۔ افسوس ہے کہ معافی کی چٹھی تک روانہ نہ کر سکا۔

طلبا نواز۔ صیب چٹھی چپٹی کی کیا ضرورت ہے جب کبھی ضرورت ہو فون سے اطلاع کر دینا۔

شجر۔ کیا آپ نے فون لے لیا۔

طلبا نواز۔ نہیں دفتر پر ہے۔

شجر۔ بھائی صاحب یہ بھی بڑے آرام کی چیز ہے۔

طلبا نواز۔ ہاں صیب سچ ہے مگر متعدی پریشانیاں اور کچھ معاشرتی مشکلات سے مجبور ہوں۔

شجر۔ بھائی جان آپ فکر نہ کیجئے آج کل فون بڑے ہی سستے ہو گئے ہیں۔

طلبا نواز۔ تو صیب پھر آپ خود کیوں نہیں خرید لیتے۔ جاپانی فون بڑے سستے داموں مل جائے گا

شجر۔ جی ہیں انگریزی تو کچھ کچھ جانتا ہوں مگر جاپانی مطلق نہیں آتی پھر جاپانی فون لگا کر کیا کروں۔

طلبا نواز۔ واہ صیب کیا آپ نے فون پر کبھی گفتگو نہیں کی۔ میں سمجھتا ہوں ایکسیوں دفعہ آپ نے گفتگو کی ہوگی۔

شجر۔ جی ہاں۔

طلبا نواز۔ فون پر جو بھی زبان کروگے وہی سنائی دے گی۔

شجر۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے گزشتہ کے دفتر پر جو فون ہے وہاں ہمیشہ انگریزی ہی میں گفتگو ہوتی ہے اور انجمن ہندوستانی کے دفتر پر جو فون ہے وہاں صرف ہندوستانی ہی زبان میں بات چیت کرتے ہیں۔ اسی طرح انگلستان میں سب فون انگریزی افرانس میں فرانسیسی، جرمن میں جرمنی اور اٹلی میں اٹالین زبان کے استعمال ہوتے ہیں۔

طلبا نواز۔ [سر کھجاتے ہوئے] صیب بات تو ٹھیک ہے انگلستان کی حد تک میں بھی تائید کروں گا۔ وہاں میں نے فون پر کوئی دوسری زبان نہیں سنی۔ یہ بتائیے کہ آپ خاص انگلستان میں کتنے عرصے تک رہے۔

شجر۔ پورے پاؤ کم سوا دو سال۔

طلبا نواز۔ تب تو آپ کو وہاں کی ہر چیز دیکھنے کا موقع ملا ہوگا۔

شجر۔ مصروفیت کے باعث بعض چیزیں ویسی ہی رہ گئیں۔

طلبا نواز۔ کیا مضائقہ ایسے اتفاقات تو پیش در پیش آتے ہی رہتے ہیں۔ چنانچہ خاص لندن میں مجھے عرصے تک رہنے کا اتفاق ہوا لیکن ٹیمس نہ دیکھ سکا۔

شجر۔ یہ ٹیمس کیا بلا ہے۔ کیا یہ کوئی ٹیک دو ڈوٹیس کا بھائی ہے۔

طلبا نواز۔ [مسکرا کر] نہیں صیب نہیں ٹیمس تو بہت ہی بڑا سمندر ہے۔

شجر۔ آہا تو وہ بہت بڑا تالاب ہے۔

طلبا نواز۔ کیوں صیب وہاں کا آب و دانہ کیسے ہے۔

شجر۔ کیا کہئے [گڑبڑ دیوانہ وار داخل ہوتا ہے]

گڑبڑ۔ ٹرٹار ٹرٹار۔ [پر یہ بڑی ڈاڑھی ہے نام آتے ہیں۔

شجر۔ بلالا۔

طلبا نواز۔ صیب! یہ مخل سر پر ڈاڑھی کیا بکتا تھا۔

شجر۔ جی نہیں وہ دراصل ڈاڑھی پر سر کہنا چاہتا تھا [ایک پرانی وضع کے نواب لکڑی ٹیکتے داخل ہوتے ہیں۔ دونوں اٹھ کر اس کی تعظیم کرتے ہیں]

شجر۔ چچا جان آپ نے کیوں زحمت کی میں خود حاضر ہونے والا تھا۔

معتبر۔ مجھے افسوس ہے کہ کل تم جب آئے تھے میں مکان پر موجود نہ تھا

شجر۔ کیا مضائقہ میں آپ کی واپسی تک منتظر رہا لیکن ایک بجے دن میں ڈنر پر جانا تھا اس لئے چلا گیا۔

طلبا نواز۔ صیب بڑوں کے گھر گئے تو اتنا جلد چٹ پٹ نہ ہونا چاہئے۔

معتبر۔ کہو میاں طلبا نواز اب تمہارا قارورہ کیسا ہے۔

طلبا نواز۔ چند روز ہوئے میرے گھٹنے کو نزلہ ہو گیا ہے۔

معتبر۔ ہاتھ میں درد سر جو ہو رہا تھا وہ تو اب کم ہے نا۔

طلبا نواز۔ جی ہاں وہ تو کم ہو گیا تھا مگر اس کے بعد ہی سر میں متلی اور ناک میں سے پسینہ بہنے کی شکایت شروع ہو گئی تھی۔ اس کے بعد سے یہ نیا مرض لاحقہ ہو گیا ہے آپ کا مزاج شریف

معتبر۔ کیا بتاؤں میاں بوڑھاپے کی ضعیفی کا زمانہ ہے۔ کچھ نہ کچھ شکایت رونمائی کیا کرتی ہے۔ چنانچہ چند روز کے عرصہ دراز سے بغل میں گردے کا درد شروع ہو گیا ہے۔

طلبا نواز۔ جلد ہی بغل کٹوا دیجئے ورنہ مرض منعدد ہو جائے گا۔

معتبر۔ ہاں یہاں میں بھی یہی سوچ رہا ہوں [شجر سے] کہو شجر و بہال سفر کیسا معقول رہا۔

شجر۔ کیا کہوں قبلہ ——

طلبا نواز۔ [شجر سے] صیب بزرگ بڑوں کو ہمیشہ قبلہ و کعبہ کہنا چاہئے۔

شجر۔ یوں تو بہت سی نئی چیزیں دیکھنے میں آئیں لیکن وہاں کے زو میں ایک عجیب قسم کا درخت نظر آیا میں اس کا بیج لے کر آیا ہوں۔

معتبر۔ ابھی یہ تو بتاؤ کہ وہاں دولت کی فرعونی کیسی ہے اور لوگ کتنے مالدار ہیں۔

شجر۔ اس میں کیا شک ہے یوں تو بہت سے لوگ مالدار ہیں۔ لیکن مسٹر ڈٹ کے برابر کسی کی بھی جائیداد نہیں۔ جہاں اور جس محلے میں دیکھو اس کے نام کی ایک آدھ تختی ضرور نظر

آئے گی۔

طلبا نواز۔ [مسکراتے ہوئے] صیب ان کی ملوکیت یہاں بھی تو ہے۔

معتبر۔ نہیں میاں وہ ٹوٹ کوئی اور رشتہ ہوں گے۔

شجر۔ آپ ٹھیک فرماتے ہیں قبلہ ——

طلبا نواز۔ صیب کتنی بار کہوں قبلہ و کعبہ کہئے کہ۔

شجر۔ حضرت چچا جان قبلہ و کعبہ —— میں آپ کا بہت ممنون ہوں کہ آپ جیسے غائبانے کے زمانے میں گھر کی خبر لیتے تھے۔

معتبر۔ ہاں میاں آجاتا تھا۔ ارے بھئی تیرا چھوٹا بچہ تو بڑا ضدی ہے۔

شجر۔ کیوں چچا جان۔

معتبر۔ ایک مرتبہ میں بڑے باغ کو لے گیا۔ تاپل کو دیکھ کر مچل گیا کہ پسلئے بغیر نہ رہوں گا۔ بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کر گھر لے گیا۔

شجر۔ قبلہ بچہ ہی تو ہے۔ خرگوش سمجھ کر بولا ہوگا۔

طلبا نواز۔ واہ صیب خرگوشت کیسے بارش کا بڑا مینڈک سمجھا ہوگا۔ جو آسمان سے زمین پر اُڑتے ہیں۔

معتبر۔ شاید ہوگا میاں۔ شجر و میاں تمہارا چھوٹا بھائی گھر میں کیوں نہیں ہے۔

شجر۔ حضرت میں اس کو منقطع کر چکا ہوں۔

طلبا نواز۔ نہیں صیب کہئے کہ اس کو قطع و برید کر چکا ہوں۔

معتبر۔ پرسوں بھئی ایک دعوت میں ملا تھا۔ اس وقت میں نے پوچھا تھا کہ میاں آج کل تو کہاں پر سکونت ہے تو جواب دیا کہ فنیانس کے دفتر میں ملازم ہوں۔ کیسا بے وقوف نکلا ہے بھئی۔

شجر۔ آخر آپ کا بچہ ہی تو ہے۔ در اصل اس کو کہنا چاہئے تھا کہ چچا اس سائٹ پر معمور طلب ہوں۔

طلبا نواز۔ نہیں صیب بلکہ ان کو کہنا چاہئے تھا کہ میرا مزاج پر سکونت سر بھرا ہوا ہے۔

معتبر۔ اچھا میاں اب میں جاتا ہوں۔

طلبا نواز۔ کیوں صیب اس قدر جلد چلے۔ یورپ کے کچھ اور واقعات نوش جان فرما کر جائیے۔

معتبر۔ نہیں میاں بہت پیٹ بھر سن چکا۔

طلبا نواز۔ جی نہیں ابھی تو آپ نے عشرِ عشیر بھی نہیں سنا ہے [معتبر جاتا ہے]

شجر۔ کیوں بھائی جان چائے نوش جان فرمائیں گے۔

طلبا نواز۔ جی نہیں آج کل مجھے گرمی کا دورہ دورہ ہو رہا ہے۔ چائے پینے سے شاید گرمی شدید مدید ہو جائے اور ممکن ہے کانوں کی بصارت پر بھی اثر پڑے اس لئے معافی چاہنے کا خواستگار ہوں۔

شجر۔ زیادہ نہیں تو تھوڑی سہی۔

طلبا نواز۔ جی نہیں۔ دو نوالے بھی نہیں پیوں گا۔

شجر۔ آپ کی مرضی۔

طلبا نواز۔ اچھا اب میں حاضر و ناظر ہوتا ہوں۔

شجر۔ بہت خوب [طلبا نواز ہاتھ ملا کر جاتا ہے] پھر کب ملاقات ہوگی۔

[طلبا نواز پلٹ کر آتا ہے]

طلبا نواز۔ [قریب آکر مسکراتے ہوئے] صیب ہمارے [گلے پر انگلی رکھ کر بتاتے ہوئے] اس دماغ کا گدہ کچھ لڑ بھڑ گیا ہے معلوم ہوتا ہے ہم آئے کس فعل کے واسطے تھے اور سکندر اعظم کی طرح چل بسے تھے۔

شجر۔ فرمائیے۔ تشریف رکھئے بھائی صاحب [طلبا نواز بیٹھ جاتا ہے]

طلبا نواز۔ صیب آپ جانتے ہیں ہمارا غٹرغوں آج کل بازار میں کود رہا ہے۔

شجر۔ خوب میں سمجھا۔ ابھی شریر بھی تو درخت پھاند رہی ہے۔

طلبا نواز۔ تو پھر صیب اب دونوں کا اتصال کر دینا چاہئے۔

شجر۔ ٹھیک تو ہے مگر ہیٹلی کو منوانا پڑے گا۔

طلبا نواز۔ واہ صیب آپ تو بس زن مرتد معلوم ہوتے ہیں۔

شجر۔ نہیں وہ بڑی ضدی عورت ہے۔

طلبا نواز۔ نہ مانے تو ڈنڈے سے حجامت بنائیے بہر حال صیب اب ہمارے بچے کی شادی ہونا چاہئے۔

شجر۔ ٹھیک ہے۔ میری بھی یہی خواہش ہے۔ کوشش کروں گا۔

طلبا نواز۔ کوشش سے کام نہ چلے گا۔ بغیر کوشش کے کیجئے۔

شجر۔ آج کل تو ہماری بیگم کی طبیعت کچھ ناساز ہے آپ چند روز انتظار کریں تو بہتر ہے۔

طلبا نواز۔ دیکھئے صیب چند دن میں [پاؤں کی طرف بتا کر] ہاتھوں کی انگلیوں پر گنتا رہوں گا۔

شجر۔ بہت بہتر [طلبا نواز ہاتھ ملا کر چلا جاتا ہے]

تیسرا منظر

[طلبانواز بیگ کا مکان۔ باہر کے کمرے میں ایک نوجوان شخص ٹہلتے۔ مکان میں سے غوں غوں بیگ آتا ہے۔ سلام علیک ہوتی ہے]

غوں غوں۔ [دروازے کی طرف پٹ کر] چوں چوں بیگ۔

چوں چوں [مکان میں سے] جی بھائی جان

غوں غوں۔ ماسٹر صاحب آئے ہیں۔

چوں چوں۔ ابھی آیا

[غوں غوں چلا جاتا ہے اس کے بعد چوں چوں بغل میں چند کتابیں دبائے آتا ہے۔ استاد کو سلام کر کے بیٹھ جاتا ہے]

استاد۔ ہاں میاں آج پہلا گھنٹہ کیا ہے۔

چوں چوں۔ جغرافیہ۔

استاد۔ پڑھو۔ [چوں چوں کتاب کھول کر پڑھنا شروع کرتا ہے]

چوں چوں۔ [پڑھتا ہے] بنگال میں مختلف قسم کے اجناس خصوصاً چاول کثرت سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ سن کی کاشت بھی بہت زیادہ ہوتی ہے۔

استاد۔ سمجھے موسن کس کو کہتے ہیں۔

چوں چوں۔ ہاں ماسٹر صاحب وہی نا جس کے چاول کے لفافے تیار کیے جاتے ہیں۔

استاد۔ ایں یہ چاول کے لفافے کیا بات۔

چوں چوں۔ جی ابا یہی کہتے ہیں۔

استاد۔ ابھی چاول کے چھلکے کہو چھلکے۔ خیر آگے بڑھو۔

چوں چوں۔ کلکتہ بنگال کا صدر مقام ہے جو کسی زمانے میں ہندوستان کا پایہ تخت تھا۔

استاد۔ پایہ تخت کس کو کہتے ہیں۔

چوں چوں [کچھ سوچتا ہے] جی ابھی کہتا ہوں [پھر ذرا غور کرتا ہے] ہاں ماسٹر صاحب وہی نا کل ابا نے کہا تھا۔ پایہ تخت ایک ایسا تخت ہے جس کے پورے چار چوپائے ہوں۔

استاد۔ خاموش یہ کیا بک بک کرتے ہو۔

چوں چوں۔ نہیں ماسٹر صاحب ابا نے یوں ہی کہا تھا۔

[طلبانواز باہر سے داخل ہوتا ہے۔ استاد اٹھ کر سلام کرتا ہے]

طلبانواز۔ کیوں صیب! آج کل ان کی رفتار گفتار کیسی ہے

استاد۔ انہیں اپنا سبق مطلق یاد نہیں۔ پایہ تخت کی تعریف پوچھتا ہوں تو کہتے ہیں کہ پایہ تخت ایک ایسا تخت ہے جس کے پورے چار چوپائے ہوں۔

طلبانواز۔ [ہنس کر پھر خفگی سے] کیوں جی تم کو یاد دلانے پر بھی یاد نہیں کرتے۔ کل میں نے کیا بتایا تھا۔ پایہ تخت ایک ایسا تخت ہے جس کے پائے ہوں۔ یہ چوپائے تم نے کہاں سے بڑھا دئے [استاد غور سے طلبانواز بیگ کی صورت دیکھتا ہے۔

طلبانواز استاد کی طرف پٹ کر] صیب آج کل مجھے فرصت کم ہے۔ اقامت خانے کے طلبا کو ایک دوسرے سے منطبق کرنے میں مصروف ہوں ورنہ ان کا تو چکمبر ہی نکال دیتا۔ اس سلسلے میں صیب پرسوں میں آپ سے مجلس کرنا چاہتا تھا آپ کو بلوایا تھا مگر ملازم نے آکر کہا کہ آپ کا مکان مقفل ہے۔

استاد۔ جی ہاں۔ میں باہر گیا ہوا تھا۔ مکان کی تلاش تھی چنانچہ اب میں وہاں سے منتقل بھی ہو گیا ہوں۔

طلبانواز۔ کیا آپ وہاں سے منفعل ہو گئے صیب۔

استاد۔ جی ہاں۔

طلبانواز۔ پھر اب کہاں خانہ بدوش ہیں۔

استاد۔ پارسی گلی میں شہر یار کاؤس جی صاحب کے پچھواڑے

طلبانواز۔ کون وہ ہمارے شہر یور صاحب نا جو کبھی کبھی ہمارے پاس وار دات ہوا کرتے ہیں۔

استاد۔ جی ہاں وہی جو آپکے پاس وار د ہوا کرتے ہیں۔

طلبانواز۔ اچھا صیب اب آپ اس کے ساتھ شغل فرمائیے [جاتا ہے]

استاد۔ [چوں چوں کو دیکھ کر] تب تو تم اپنے باپ کے واقعی بیٹے ہو۔ اچھا آگے پڑھو۔

چوں چوں۔ کلکتہ ہندوستان کا سب سے بڑا شہر ہے جہاں ایک ملین آدمی بستے ہیں۔

استاد۔ کیوں کیا آپ کو جلاب کی ضرورت ہے جو ملین یاد آرہا ہے

چوں چوں۔ نہیں ماسٹر صاحب جلاب تو میں نے کل ہی لیا تھا۔

استاد۔ کل ہی لیا تھا۔ ارے ملین کہو ملین۔

چوں چوں۔ ملین کہو ملین۔
استاد۔ ہوں صرف ملین کہو ورنہ کچومر نکال دوں گا۔
چوں چوں۔ [دبی آواز میں] ملین۔
استاد۔ جانتے ہو ملین کس چڑیا کا نام ہے۔
چوں چوں۔ جی ہاں۔ مینا کی بہن ہوگی شاید۔
استاد۔ [خفگی سے اٹھ کر] میں تم کو نہیں پڑھاتا۔ بے وقوف کہیں کے
چلو اپنے ابا سے کہہ دو کہ میں کل سے نہیں آؤں گا۔ [چلا جاتا ہے]

چوتھا منظر

[معتبر حسین کا دیوان خانہ۔ فرش پر معتبر حسین اور شجر حیات خاں بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ معتبر حقہ پی رہا ہے]

معتبر۔ بھئی اب تم شام کا کھانا ہمارے ہی پاس کھا لینا۔
شجر۔ قبلہ مجھے کوئی عذر نہ تھا مگر آج بازار جانا ضروری ہے۔
معتبر۔ ایسی کیا مشکل ضرورت آن پڑی بھیا۔
شجر۔ جی ہاں چھوٹے میاں کے لئے ہنڈی کیپ خریدنے جانا ہے۔
معتبر۔ یہ ہنڈی کیاپ کیا بلا ہے بے درباں کا اسم گرامی ہے
شجر۔ میں خود نہیں جانتا۔ کل شام میں جب میں بیٹھا ہوا تھا وہ کرکٹ کا بیٹ لے کر آیا ہی اداس آیا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اگر اس کو ہنڈی کیپ مل جاتا تو وہ جیت جاتا۔ اسی لئے آج کھیل سے پہلے اس کو ہینڈی کیپ خرید کر دے دینا چاہتا ہوں۔
معتبر۔ بھیا میں یہ تو دریافت کرنا بھول ہی گیا کہ کل تم میں اور منجھلے میاں میں کیوں جھڑپ ہو گئی۔
شجر۔ جی نہیں کوئی جھڑپ وغیرہ نہیں بلکہ محض گفتگو تھی۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ کل ہم جنگل کی طرف گئے تھے۔ جب ایک تالاب پر پہنچے تو منجھو نے کہا۔ بھائی جان اتنا بڑا تالاب سوکھ کر کانٹا ہو گیا ہے آخر اس میں کی سب مچھلیاں کہاں گئی ہوں گی۔ اس پر ہمارے عقلمند چھوٹو نے کہا۔ کہاں جائیں گی۔ کیکر کے انہیں درختوں پر چڑھ گئی ہوں گی۔ تب میں نے کہا آخر ہمارے چھوٹے ہی تو ہو۔ یہ سب تجربے کی باتیں ہیں تم کیا جانو۔ میاں یہ مچھلیاں تھیں جو درختوں پر چڑھ جاتیں۔ بلکہ پانی آنے تک ہوا میں اُڑتی پھریں گی۔

معتبر۔ واہ جی شجر و میاں بات تو بڑی معقول بتائی۔ کیوں نہ ہو بھئی ایک عبارہ دا ہی تو ہو [دستک]
معتبر۔ کون۔
داروغہ۔ حضور میں داروغہ ہوں۔
شجر۔ اندر آؤ۔ [داروغہ آ کر ادب سے سلام کرتا ہے] سنو جی ہم تم سے بہت خفا ہیں۔
داروغہ۔ جی حضور۔
شجر۔ کل میں نے کیا کہا تھا۔
داروغہ۔ حضور سوتی والا وسن کا گولا کہیں نہیں ملا۔
شجر۔ [معتبر سے مخاطب ہو کر] دیکھ رہے ہیں قبلہ آپ۔ کتنا کم عقل آدمی ہے [داروغہ کی طرف پلٹ کر] اجی سو کا نہیں ملا تو پونسو یا پچاس ہی بارس پور کا گولا لے آنا تھا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آج کل تمہارا انتظام کچھ ٹھیک نہیں ہے۔
داروغہ۔ سرکار میں تو ہر خدمت تن دہی سے انجام دیتا ہوں۔
شجر۔ خاک بھی نہیں۔ کل چار بجے جب میں باغ پر سے گزر رہا تھا۔ سب مالی اصطبل کے دیوان خانے میں بیٹھے گپ شپ لگا رہے تھے۔
داروغہ۔ ٹھیک ہے حضور۔ اس وقت انہیں کوئی کام ہی نہ تھا۔
شجر۔ کام نہ تھا کیا معنی۔ درختوں کو پانی پلانا کیا کوئی کام نہیں ہے۔
داروغہ۔ مگر حضور اس وقت تو بارش ہو رہی تھی۔
شجر۔ تو کیا ہوا۔
داروغہ۔ بارش میں پانی ——
شجر۔ بس بس یہی ہے تمہاری عقل۔ ارے کیا چھتری پکڑ کر پانی نہیں ڈالا جا سکتا تھا۔
داروغہ۔ جو حکم حضور آئندہ موسلا دھار بارش بھی ہو تو ایسا ہی کروں گا۔
شجر۔ کیا وہ آم کے درخت کے پاس کا گڑھا بھروا دیا گیا۔
داروغہ۔ بڑے مالی سے معلوم ہوا کہ وہ باہر سے مٹی منگوا رہا تھا تو آپ نے منع فرما دیا۔
شجر۔ کیا میں نے یہ بھی کہا تھا کہ کام بند کر دو۔ اس بے وقوف سے تو یہ کہا تھا کہ مٹی اتنی دور سے کیوں منگواتا ہے۔ اس گڑھے کے بازو سے کھود کر بھر دینا۔ اس پر اس نے کہا کہ وہاں گڑھا

ہو جائے گا بات معقول تھی اس لئے میں یہ بولا کہ اس کے بازو سے کھود کر ذرا بہت گڑھے کو بھر دینا مگر یہ کب کہا تھا کہ کام ہی روک دیا جائے۔ ہم لوگوں کو تو بس مارا مرنا ہی ہے۔ دیکھ لیا قبلہ آپ نے۔

معتبر۔ ٹھیک ہے میاں ان لوگوں کے بھروسے کیا خاک ہو سکتا ہے۔

شجر۔ کیا کیا کہوں چچا جان قبلہ ابھی پرسوں ہی کا واقعہ ہے کہ میں سینما میں بیٹھا کھیل دیکھ رہا تھا یک دم آگ لگ گئی۔ میں دوڑتا ہوا باغ پہنچا سب مالی مالیوں کو گھڑے بھر کے لانے کے لئے کہا اور خود خود لوٹا بھر پانی لے کر سینما آگیا۔ سینما جل جانے کے بعد یہ عقلمند صاحب چار پانچ بنڈیوں گھڑے رکھ کر لائے تھے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ پانچ بنڈی گھڑے بھرنے تک کتنی دیر نہ ہوئی ہوگی۔ خیر اب آپ کیوں تشریف لائے ہیں۔

داروغہ۔ منجھلے میاں آج میٹنی شو دیکھنا چاہتے ہیں اس لئے آپ کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔

شجر۔ سنو۔ جا کر ان سے کہہ دو کہ اس وقت مجھے بہت سے کام ہیں اگر چاہو تو میں ان کے ساتھ سکنڈ شو کی میٹنی میں چل سکتا ہوں۔ سمجھے۔

داروغہ جی ہاں حضور۔ سکنڈ شو کی میٹنی [سلام کر کے جانا چاہتا ہے]

شجر۔ دیکھو جی۔

داروغہ۔ جی حضور

شجر۔ ہمارا ریڈیو سٹ بن کر آگیا۔

داروغہ۔ جی ہاں۔ فٹنگ ہو رہی ہے۔

معتبر۔ کیا میاں آپ نے بھی ریڈیو کا باجا خریدا ہے۔

شجر۔ جی ہاں [داروغہ سے] اچھا اب تم جا سکتے ہو [داروغہ سلام کر کے چلا جاتا ہے]

معتبر۔ کیا عقل حیران ہے میاں۔ فرنگی بچے بھی عجیب کمال کرتے ہیں۔ انگریزی میں تھا سو تھا اب دیکھو ہندوستانی میں یہ باجا نکل گیا۔ خوب بھئی خوب [دستک] آئیے [طلبا نواز بیگ داخل ہوتے ہیں۔ سلام علیک کے بعد معتبر کے مقابل میں آکر بیٹھ جاتے ہیں] میاں مرزا بھئی یہاں تو تمہیں بڑی تکلیف ہوتی ہوگی

نہ میز نہ کرسی فقیرانہ ٹھاٹ ہے۔

طلبا نواز۔ صحیب میز کرسی گھر میں نہ ہو تو کیا ہے۔ چیز تو قرین قیاس سے رکھی ہوئی ہے [شجر کی طرف دیکھ کر] کیوں صحیب آپ کے مزاج الشریفہ کیسے ہیں۔

شجر۔ عنایت اور جناب کا مزاج۔

طلبا نواز۔ جی بندگی نوازی سے اچھا ہوں [معتبر کی آستین دیکھ کر] صحیب صحیب دیکھئے تو آپ کے پائینچے پر کچھ لال ڈلا سا نظر آتا ہے [معتبر پاجامہ دیکھتا ہے] نہیں صحیب پائینچے پر پائینچے پر دیکھئے [معتبر پھر دیکھتا ہے] نہیں صحیب قمیص کا پائینچہ دیکھئے قمیص کا۔

معتبر۔ اوہو قمیص کا پائینچہ۔ یہ تو پان کے تھوک کا دھبہ ہے۔

طلبا نواز۔ شاید لال پان کا دھبہ ہے تب ہی تو اتنا خون کا ڈلا سا نظر آتا ہے۔

شجر۔ کیوں بھائی جان غوں غوں نے موٹر خرید لی۔

طلبا نواز۔ نہیں صحیب۔ حال میں ان کے بچے کا عقیقہ ہوا تھا اس لئے رقم میں گڑھا پڑ گیا ہے اس لئے اب وہ موٹر سیکل خریدنا چاہتے ہیں

معتبر۔ الاماں کہ موٹر سیکلوں کی بھی کیا کثرت۔

طلبا نواز۔ صحیب کیوں نہ ہو۔ امریکہ میں ان کی کاشت بہت ہو رہی ہے اس لئے وہ چیل کی طرح پھدکتی نظر آتی ہیں۔

شجر۔ بھائی صاحب موٹر سیکل تو کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتی۔

طلبا نواز۔ صحیب آپ کیا جانیں۔ غوں غوں کوئی ہلکی پھلکی نہیں خرید رہے بلکہ سات کینڈل پور کی۔

معتبر۔ میاں مرزا سب سامان پہنچ گیا بھئی مگر وہ برقی پنکھا نہیں آیا شاید قلی لانا بھول گئے۔

طلبا نواز۔ نہیں صحیب اس کا تن و توش بہت بڑا ہے قلقلی کہاں سے لا سکتے۔ میں موٹر میں بٹھال کر لایا ہوں۔

معتبر۔ میاں تمہیں تو بڑے نفیس ہیں بھئی۔

طلبا نواز۔ صحیب نئے نہیں ہیں بلکہ قلعی سے ان کی حجامت بنائی گئی ہے تب ہی تو انسان بن گئے ہیں۔

معتبر۔ میاں مرزا یہ سن کر مجھے بہت افسوس کہ کہ اس سال چوں چوں امتحان میں مرحوم ہو گیا۔

طلبا نواز۔ کیا کہوں صحیب میں پہلے ہی سے [پیشانی کو تتا کر] یہ سینہ

کہتا تھا کہ ڈبل روٹی پر موشن نہ ہونا چاہئے مگر اس نے ایک
نہ سنی۔ آخر فیل ہو کر ہی رہا۔ اگر وہ گاؤدم ترقی کرتا تو آپ دیکھتے
کہ ہاں ہیں سے مکھن کی طرح پاس ہو جاتا۔
معتبر۔ ہاں ٹھیک تو ہے
طلبا نواز۔ [شجر سے] صاحب ہم نے اخبار میں سنا ہے کہ آپ کی شرکت
زندگی میوزیشن کلب کی رکن ارکان بن گئی ہیں۔
معتبر۔ ابھی یہی نہیں بلکہ عورتوں کے وائی۔ ایم سی۔ اے کی بھی
ممبرشپ بن گئی ہیں۔
طلبا نواز۔ کہئے کیسے گذرتی ہے۔
شجر۔ بڑی اچھی طرح سے [داروغہ داخل ہوتا ہے]
طلبا نواز۔ صاحب یہ کیسے آدمی کے نیچے ہیں بغیر دستخط دئے وارد
ہو جاتے ہیں۔
شجر۔ سلیقہ نہیں ہے [داروغہ سے] کہو پھر کیوں آئے ہو [داروغہ
تار دیتا ہے] بھائی جان ذرا یہ تار پڑھ دیجئے [طلبا نواز تار سے
کر جیبیں ٹٹولتا ہے] کیوں کیا دیکھ رہے ہو۔
طلبا نواز۔ صاحب چاپشتی کے لئے جیب کھنگال رہا ہوں [عینک نکال کر
لگاتا اور تار پڑھتا ہے]

FELL SERIOUSLY ILL COMING this Evening

سمجھے صاحب یعنی بیماری کا جنازہ نکل چکا ہے اور آج شام کی
گاڑی سے آرہا ہوں۔
شجر۔ تار کس کے پاس کا ہے۔
طلبا نواز [دیکھ کر] اہلیہ صاحب یہ تو آپ کی شرکت زندگی کا ہے
شجر۔ تو کیا وہ مر گئیں۔
طلبا نواز۔ نہیں نہیں صاحب بلکہ سخت علالت سے ہیں [شجر تار لیکر دیکھتا ہے]
شجر۔ مگر یہ تحریر ان کی نہیں ہے
طلبا نواز۔ واہ صاحب یہ بھی خوب تار کی ہینڈ رائٹنگ تو مشین کی ہوتی ہے۔
شجر۔ [داروغہ سے] دیکھو جی ٹھیک چھ بجے اسٹیشن آجانا مگر ساتھ ایک
ٹیکسی لیتے آنا۔
داروغہ۔ سرکار پٹرول کا نرخ بڑھ جانے سے آج موٹریں پہلا گھنٹہ
تین روپے اور دوسرا دو روپے سے ہے۔
شجر۔ اچھا تو دوسرے گھنٹے والی گاڑی لانا۔ جانتے وقت بیگم صاحب
کون سے درجے سے گئی تھیں۔
داروغہ۔ سکنڈ لاس
شجر۔ تو ہمارے لئے ایک سکنڈ کلاس پلاٹ فارم ٹکٹ بھی خرید رکھنا۔
معتبر۔ شجر و میاں طبیعت بڑی پریشان ہے بھئی نہ معلوم کیا مرض
تعجب لاحق ہوا ہوگا۔
شجر۔ نہ معلوم میں خود پریشان ہوں۔
طلبا نواز۔ صاحب حفظ ماتقدم کے لئے ہماری گاڑی بھی منگوا لینا۔
شجر۔ کیا ضرورت ہے صرف گھنٹے بھر کا کام ہے ٹیکسی خرید کر منگوا
رہا ہوں۔ دوسرے گھنٹے والی گاڑی آئے گی تو دو روپے
کرایہ چلا جائے گا۔ اچھا تم اب جاؤ [داروغہ سلام کرکے
چلا جاتا ہے]
معتبر۔ کیوں میاں تمہاری گاڑی کیا ہوئی تم گاڑی میں نہیں آئے۔
شجر۔ گاڑی ہی میں آرہا تھا رستے میں یک دم رک گئی۔ شوفر نے
کہا کہ موشن ٹوٹ گیا ہے اس لئے میں ٹہلتے ہوئے آگیا اور
اس کو موشن خرید کر لانے کے لئے بھیج دیا۔ اچھا قبلہ اب مجھے
اجازت دیجئے۔ ممکن ہو تو کل پھر حاضر ہوں گا [شجر اٹھتا ہے
طلبا نواز بیک بھی اٹھتا ہے]
معتبر۔ کیوں میاں مرزا آپ کیوں چلنے بیٹھے۔ ابھی تو آئے ہو۔
طلبا نواز۔ صاحب مجھے معاف و اف کیجئے۔ آج مکان کو آہک پاشی کا
رنگ کرانا ہے پھر اس کے بعد فرش کا غسل بھی کرانا ہوگا۔
[دونوں سلام کرکے چلے جاتے ہیں]

پانچواں منظر

[غوں غوں بیگ کا کمرہ۔ ایک صوفے پر غوں غوں بیٹھا سگریٹ کے
کش لگا رہا ہے۔ دوسرے صوفے پر شریرا اور چوں چوں
بیٹھے ہیں]
شریرا [چوں چوں سے] اب تم کس جماعت میں ہو۔
چوں چوں۔ پانچویں۔
شریرا۔ تاریخ پڑھتے ہونا۔
چوں چوں۔ جی ہاں
شریرا۔ کہو بابر نے کس سن میں حملہ کیا تھا [چوں چوں دانت میں انگلی

پکڑ کر سونگھتا ہے] کیوں بھول گئے۔

چوں چوں۔ [خوشی سے] جی نہیں یاد آگیا سنئے۔ ۱۹۲۶ میں بڑے باغ کے پنجرے کو توڑ کر ببر باہر آگیا تھا اور ایک مالن پر حملہ بھی کیا تھا [شریر اور غوں غوں ہنستے ہیں]

شریر۔ جغرافیہ بھی پڑھتے ہونا

چوں چوں۔ جی ہاں۔

شریر۔ بتاؤ کہ اس کی کیا تعریف ہے۔

چوں چوں۔ راس زمین کا وہ دبلا پتلا جسم جو بہت دور تک پانی کے غار میں چلا گیا ہو۔ جیسے راس دستا

شریر۔ واہ صاحب کیا کہنے

غوں غوں۔ ایسے راس کا سا بھی ہو سکتا ہے

شریر۔ کیوں نہیں [گڑ بڑ داخل ہوتا ہے]

گڑ بڑ۔ ٹرٹار ٹرٹار ٹرٹار ٹرٹار

شریر۔ ارے وہ سرکار کے نیچے بولتا کیوں نہیں لگایا ہے ٹرٹرٹرٹر

گڑ بڑ۔ ہماری بوٹی ٹرٹار لی ٹوٹے ٹرٹار نو بلا ڑیں۔

غوں غوں۔ بے ایمان کہیں کا ایک معمولی بات کا افسانہ بنا دیا۔

گڑ بڑ۔ ٹلوٹو وں ٹو وں میاں [چوں چوں سلام کر کے گڑ بڑ کے ساتھ چلا جاتا ہے]

غوں غوں۔ کہو شریر تمہاری یہ شرارت کب تک رہے گی۔

شریر۔ جب تک کہ تم غٹر غوں کرنا نہ چھوڑ دو۔

غوں غوں۔ خیر یہ سب تفنول فضولیات ہیں اب کچھ معاملے کی باتیں بتاؤ۔

شریر۔ کیا یہ ساہوکاروں کا دربار خانہ ہے جو معاملے کی باتیں ہوں۔

غوں غوں۔ پھر وہی الٹی پلٹی قیل و قال سنو میں تمہیں دل و گردے سے چاہتا ہوں۔

شریر۔ چاہا کرو مجھے اس سے واسطہ۔

غوں غوں۔ نہ سنو گی تو سر پر پتھر پھوڑ کر ۔۔۔۔ سمجھ گئیں۔

شریر۔ مجھ سے کیا کہتے ہو ابا سے کہو [طلبا نواز اور شجر حیات داخل ہوتے ہیں۔ دونوں اٹھ کر تعظیم دیتے ہیں]

طلبا نواز۔ [شجر سے] صحیب یہاں تو کچھ عشق و عاشقی معلوم ہوتی ہے۔

شجر۔ ان کی شادی جلد کر دی جائے تو اچھا ہے۔

طلبا نواز۔ صحیب میں بھی تو یہی چاہتا ہوں کہ جلد خاتمہ ہو جائے تو اچھا ہے۔ خیر انتیس تاریخ مقرر سمجھو۔

[دونوں مکان کے اندرونی حصے میں چلے جاتے ہیں]

غوں غوں۔ [شریر سے فرط محبت سے لپٹ کر] اب کیا ہے ۲۹ انتیس کو تو ہمارا عقد ہو جائے گا [جاتے ہیں]

"آوارہ"

رباعی

چھپتی نہیں دونوں کی ہمناری ہے
اور ساتھ ہی آپس کی رواداری ہے
یہ دونوں ہیں ایک جان دو قالب جگر
بنیاد یہ ہے آبادی و بیداری ہے

جگر مرادآبادی

ذوقِ سفر

منزل کی آرزو نے کیا مجھ کو بے قرار
سر پر جنون دشت نوردی ہوا سوار

برپا فضائے روح میں اک ہاؤ ہو رہی
شام و پگاہ مجھ کو یہی جستجو رہی

اتنی سرور خیز رہی لذتِ سفر
سرمستیوں میں ڈوب گئی کلفت سفر

ہر ذرہ راہِ شوق میں تھا جامِ زندگی
تھا ایک ایک گام میں پیغامِ زندگی

میں وادیٔ طلب میں کچھ اس طرح کھو گیا
منزل کی آرزو ہی سے بیگانہ ہو گیا

ہر چند مضطرب ہوں مگر شادماں ہوں میں
اب اضطرابِ شوق سے ہر دم رواں ہوں میں

ذوقِ سفر عزیز ہوا اس قدر مجھے
منزل کے نام سے بھی اب آتا ہے ڈر مجھے

اثر صہبائی

اچھے چاول

(۱)

نئے تھانیدار نے ایک تحکم آمیز نظر سے دیکھا اور کہا۔ "ہاں تو ڈیہر یہاں سے کتنی دور ہے جناب؟" نمبردار نے جواب دیا کوئی چھ کوس ہوگا۔

تھانیدار نے ادائے طنز سے سر ہلاتے ہوئے کہا "چھ کوس کی منزل واقعی چوبیس دن سے ادھر طے نہیں ہو سکتی!"

نمبردار کہنے لگا۔ نہیں حضور۔ پہلی جھڑی پڑنے کی وجہ سے چاولوں کی پود بوئی جا رہی تھی پھر کچھ بادل وغیرہ روز ہی آتے رہے۔ ساونی کی فصل گھنٹوں میں ہی چوپٹ ہو جاتی ہے۔ اس خیال سے نکل نہ سکا اور بارش کی امید میں یہ دن گزر گئے۔ نہ برسا۔ نہ بوئی گئی۔ تھانیدار نے سر نیچا کر کے کہا۔ اوہو۔ یاد آیا۔ سردار صاحب نے بھی مجھے کئی مرتبہ لکھا تھا کہ اس علاقے میں موضع ڈیہر کے چاول نہایت عمدہ ہوتے ہیں۔ ہاں تو آپ نے چاول کتنے بیگھے بوئے؟

نمبردار نے کسی قدر اطمینان سے جواب دیا۔ پود تو کوئی ساٹھ بیگھہ کی ہے۔ لیکن پانچ چار بیگھہ کی پود مانگ تانگ میں چلی جاتی ہے پچاس بیگھہ زمین تیار ہے۔ دس بیگھہ میں باس متی بیس بیگھہ میں دیسی۔ کچھ دہان۔ کچھ سیلا۔ کچھ سانٹھی۔

تھانیدار نے بات کاٹ کر کہا۔ اچھا تو پانچ من باس متی . . . !

نمبردار نے جھٹ جواب دیا۔ بہت اچھا حضور اور مسکرایا۔

تھانیدار نے کہا۔ خیر چاول تو ہوئے۔ لیکن نئے افسر کی آمد پر تین ہفتے تک غیر حاضری درست نہیں۔ مجھے اس طرف آنا بھی تھا اور اب اگلے ہفتے دورہ کر دوں گا۔

(۲)

ڈیہر کی زمین کسی قدر نشیبی تھی اور ساونی کی فصل میں چاول کثرت سے ہوتے تھے۔ یہاں کے چاول تھے بھی بہت اچھے۔ دور دور مشہور تھے اور کوئی دس فی صدی چاول سوغات میں چلے جاتے تھے۔ اس سال بارشیں دیر سے شروع ہوئیں تو یک لخت کام آن پڑا۔ پہلی جھڑی کے بعد بارشیں ہوتی رہیں تو کام بٹ جاتا ہے لیکن جب کچھ دن خالی جا کر یکلخت بارشیں ہوں تو چھپیت کے ڈر سے ہر کسان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ سب سے پہلے نبٹے۔ دیہات میں ایسے موقعہ پر مزدور مہنگا ہو جاتا ہے اور دس دس بارہ بارہ کوس تک ڈھونڈے بھی نہیں ملتا۔ نمبردار تھانہ سے نکلا تو بارش نے آ لیا۔ اور وہ موسلا دھار پانی پڑا کہ جل تھل ایک ہو گیا اُسی بارش میں گرتا پڑتا گاؤں پہنچا۔ کھیتوں میں چاروں طرف آدمی ہی آدمی نظر آتا تھا اور بیگھہ بیگھہ دو دو بیگھہ پود لگ چکی تھی۔

نمبردار بہت جز بز ہوا کہ آج تک بارش کی امید پر بیٹھا رہا۔ نہ ہوئی آج گھر سے نکلا تو اور لوگ اپنے کام پر لگ گئے۔ مزدور تمام کھیتوں میں پہنچ گئے۔ آج بھی پود نہ لگی تو پھر نہ معلوم کب بارش ہو اور کتنی چھپیت پڑے بارش ابھی ہو رہی تھی بھینی بھینی ہوا سر سرا رہی تھی۔ دیہاتی گیت ایک سماں باندھ رہے تھے۔ مزدور مرد عورتیں گھٹنوں گھٹنوں پانی میں جھکی ہوئی پود لگا رہی تھیں اور ملہار گا رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قدرت اپنی تمام دلچسپیوں سے انسان کا جی بہلا رہی ہے لیکن نمبردار بھیگا سمٹا چلا جا رہا تھا۔ اُسے کسی بات کا ہوش نہ تھا۔ بس یہی فکر تھی کہ پود کیونکر لگے گی۔ بارش۔ ہوا اور گیت سب اس کے لئے بے معنی تھے۔ لوگوں کی سبقت اس کی نظروں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہی تھی۔ تھانہ تحصیل کا کام نہ کرے تو مشکل اور کرے تو یہ مصیبت۔ اسی ادھیڑ بن میں وہ گھر جا پہنچا۔ مردانہ میں پود دھلی دھلائی رکھی تھی۔ ایک ہی لڑکا تھا۔ کوئی دس گیارہ برس کا۔ مزدور اس کے بس نہ تھے۔ اکیلا کام نہ کر سکتا تھا۔ نمبردار نے پہلے پود کو دیکھا۔ پھر لڑکے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ مزدور!

لڑکے نے سہم کر جواب دیا۔ مزدور سب کام پر چلے گئے۔ نواح کے مزدور مل ملا کر بھی پورے نہ ہوئے سارے گاؤں میں گھمو چمار اور اُس کی

ٹ چوماسہ کی پہلی بارش۔ اصل میں پہلا جھالا تھا جو جیٹھ کے اخیر میں برستا ہے۔

بیوی خالی ہیں۔ میں گیا تھا۔ کہتے تھے بچہ بیمار ہے۔

(۳)

بھیگی ہوئی چادر کو نچوڑتے ہوئے مکھو نے بیمار بچے کے سرہانے بیٹھی ہوئی بیوی کی طرف دیکھا اور کہا۔ حکیم نے دوا تو دے دی لیکن بہت جھڑک جھڑک کر۔ پانچ پیسے اس کے جوں کے توں سر ہیں اور ساجھی[1] نے تو ظلم کر رکھا ہے۔ کہتا تھا ابھی بھیجو

بیوی نے اکتائی ہوئی آواز میں کہا۔ میں تو اس اساڑھ میں سر پٹخ رہی کہ اس ساجھی سے نہیں نبھے گی۔ تمہیں نے نہ مانا۔

چمار بولا۔ پھر وہ اٹھائیس روپے قرض کے کیسے ادا ہوتے اور کوئی زمیندار اس وقت تیس روپے پیشگی دینے کو تیار نہ تھا۔ میں کیا کرتا اب تک یہ کوٹھڑا بھی نیلام ہو گیا ہوتا۔

چماری بولی۔ نمبردار بیس روپے دے رہا تھا۔ وہی اچھے تھے۔ آٹھ روپے ساہوکار کے بھر چلے جاتے۔

چمار نے مسکرا کر کہا۔ بھلی مانس۔ وہ آٹھ بھی اٹھائیس ہو کر جاتے۔ اور پھر نمبردار اکیلا آدمی۔ آج تھانہ ہیں۔ آج تحصیل میں۔ سارا کام مجھ اکیلے کے سر پڑتا۔

چماری نے کہا پھر اب کیا ہوگا۔ ادھر بچہ بیمار۔ میں چار دن سے پٹی سے لگی بیٹھی ہوں۔ تمام بدن دکھ رہا ہے یہ چار پیسے کمانے کے دن تھے۔ تم اٹھائیس روپے میں بندھوا ہو گئے۔

مکھو بولا۔ گھبراؤ نہیں۔ میں ساجھی کے ہاں جاتا ہوں۔ راستے میں نمبردار ملا تھا۔ تم بچے کو دوا پلا کر ان کے ہاں چلی جاؤ۔ اُسے ساتھ لے جانا اور سائے میں کسی بنڈھ پر لٹا دینا۔

چماری نے گھبرا کر کہا۔ اس کا پنڈا پھنک رہا ہے۔ میرا یہ حال ہے نہ جاتے بنے نہ ٹھہرتے بنے۔ اچھا یہ کہہ کر اس نے ایک آہ بھری اور چھت کی طرف دیکھ کر سر پھوڑ لیا۔

گیلے کپڑوں کو ذرا ہوا لگی تو اسی طرح بھیگی چادر اوڑھ کر مکھو لاٹھی لئے باہر نکل گیا۔ چماری نے بیمار بچے کو جوشاندہ پلایا۔ کئی پھٹے پرانے کپڑوں میں لپیٹا اور برستے پانی میں نکل کھڑی ہوئی۔

(۴)

نمبردار کے کھیت میں پود لگ رہی تھی۔ لیکن یہاں مزدور چپ چاپ کام کر رہے تھے اس لئے کہ کوئی مزدور تندرست نہ تھا۔ کسی کو زکام اور کھانسی نے گھیر رکھا تھا۔ کسی کو ہلکا ہلکا بخار تھا اور مکھو کی بیوی کا تو یہ حال تھا کہ دو دو لوے لگاتی اور پھر مڑ کر بیمار بچے کی طرف دیکھتی جو ایک کیکر کی جڑوں میں چیتھڑوں میں لپٹا پڑا تھا۔

آس پاس کے کھیتوں میں خوب رونق تھی۔ قہقہے۔ چھیڑ چھاڑ اور ملہار کی تانیں۔ کبھی کبھی آپس میں تکرار اور تو تو میں میں بھی۔ شام تک یہی حالت رہی۔

"اب کے سال خوب رہے گا" ایک مزدور بولا

"سمال تو خوب رہے گا۔ لیکن بھگوان جانے۔ دیکھے گا کون"

"جس سے آن زیادہ ہو۔ تن رکھیا رہتے ہیں"۔

"ہاں یار۔ جسے دیکھو وہی بیمار"

"چاول تو کھائیں گے۔ مگر بڑا کشٹ اٹھانا پڑا ہے"۔

"بھئی کشٹ بنا تو کچھ بھی نہیں ملتا"۔

نمبردار کے کھیت میں اس قسم کی باتیں ہو رہی تھیں۔ نیم بیمار مزدور جو مجبوری سے کام پہ لگے تھے۔ اس وقت باتیں کرتے ہوئے اچھے خاصے فلاسفر معلوم ہو رہے تھے۔ زندگی اور موت۔ دکھ سکھ۔ محنت اور آرام۔ خدا اور انسان ان لوگوں کی گفتگو کا موضوع تھا جنہیں دنیا جاہل کہتی ہے اور گفتگو کا انداز دل اور جسم دکھنے کی وجہ سے ایسا سنجیدہ تھا کہ باید و شاید۔

ایک چیخ کی آواز آئی نمبردار کے مزدوروں نے مڑ کر دیکھا کہ مکھو کی بیوی کیکر کے نیچے بچے کو چھاتی سے لگائے چیخ رہی ہے۔ ہائے میرا بچہ چلا۔ ہائے میرا لال چلا۔

تمام مزدور کھڑے ہو گئے۔ سب نے نمبردار کے چہرے کی طرف دیکھا۔ گویا کیکر تک جانے کی اجازت چاہتے ہیں۔ اتنے میں نمبردار کیکر کی طرف چلا اور مزدور پیچھے پیچھے ہو لئے۔ نزدیک جا کر معلوم ہوا کہ بچہ بخار کی شدت سے دم توڑ رہا ہے۔ نمبردار نے گھبرا کر کہا

"چل اسے گھر لے جا"

"ہائے اب کس چیز کو گھر لے جاؤں" اب یہ جنگل ہی بسلے گا۔ ہائے میرا بچہ"

"دیکھ کام میں ہرج ہوتا ہے یا تو چپ بیٹھی رہ یا اسے گھر لے جا"

[1] گاؤں میں چمار جن زمینداروں کے ہاں ہلی کا کام کرتے ہیں انہیں ان کی اصطلاح میں ساجھی کہتے ہیں۔

یہ کہہ کر نمبردار مزدوروں کو کھیت میں لے آیا اور پھر اُسی انہماک سے تمام مزدور پود لگانے لگے۔

نکھو کی بیوی بچے کی لاش ہاتھوں پہ لئے ہوئے گاؤں کی طرف چل دی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی تھی قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتی تھی۔ لیکن کام کی افراتفری میں کوئی اس کی دل دہی کے لئے پاس تک نہ جا سکتا تھا اور جاتا بھی تو اس جنگل اور موسلا دھار بارش میں کیا کرتا۔

(۵)

چاول کی فصل تیار تھی۔ تھانیدار صاحب حسب دستور دورہ پر آئے۔ ان کے ساتھ اس مرتبہ ایک نئے افسر تھے نمبردار کے مردانہ میں قیام ہوا۔ دو بوری چاول تھانے تک پہنچانے کا بندوبست ہو رہا تھا۔ تھانیدار نے نئے افسر سے نمبردار کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ یہاں کے چاول بہت اچھے ہوتے ہیں سامنے گلی میں نکھو کی بیوی جا رہی تھی اُس نے تھانیدار کے لفظ سنے تو اُسے ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے اس کے کلیجے میں چھری بھونک دی۔

وقار انبالوی

رباعی

راحت کا ہر اک جان کی ساماں بن جا
ہو درد جہاں تو وہیں درماں بن جا
اتنی تو مری مان ہی لے اے اخگرؔ
صورت میں ہے سیرت میں بھی انساں بن جا

اخگر مرادآبادی

درسِ عبرت

سدا اک آ رہا اک جا رہا ہے
زمانے کا یہی نقشہ رہا ہے
یگانہ میں رہا بیگانگی میں
پرایا غم سے مجھے اپنا رہا ہے
نمود و بود اک ناچیز شے ہے
عبث اس پر بشر اترا رہا ہے
مزا پایا اُسی نے زندگی کا
جو مر مر کر یہاں جیتا رہا ہے
سمجھ کی اب یہ حالت ہے ہماری
ہمیں نافہم بھی سمجھا رہا ہے
اسی نے ٹھوکریں در در کی کھائیں
جو دنیا میں سگِ دنیا رہا ہے
جو ہونا ہے وہ اک دن ہو رہے گا
دلِ ناداں تو کیوں گھبرا رہا ہے
وہی دنیا میں ہم سب دیکھتے ہیں
مقدر ہم کو جو دکھلا رہا ہے
ذرا دیکھو تو اپنا حال عبرتؔ
ہے اب کیا اور پہلے کیا رہا ہے

عبرتؔ مرحوم
(والد فراقؔ گورکھپوری)

مرگِ رندانہ

(ایک بیمارِ مے نوش کا اصرار)

فلک پہ ابرِ جنوں زا کو دیکھ کر ساقی — فضا کو ساحلِ دریا کو دیکھ کر ساقی
مرے بجھے ہوئے دل میں اُبال آیا ہے — عجیب کیف بھرا اک خیال آیا ہے

سرور و کیف میں بھیگی ہوئی فضائیں ہیں — فرازِ چرخ پہ اُڈی ہوئی گھٹائیں ہیں
کہاں ہے! گردشِ ساغر کو تیز کر ساقی! — مچل کے جھوم کے لہرا کے جام بھر ساقی!

گھٹا کے دامنِ تر کی مجھے قسم ساقی! — نشے کے لطف و اثر کی مجھے قسم ساقی!
گلوں کے شوقِ تبسّم کی ہے قسم مجھ کو — کلی کے ذوقِ تکلم کی ہے قسم مجھ کو

قسم ہے بے خودی و سرشار زندگانی کی — قسم ہے تیری مہکتی ہوئی جوانی کی
پیوں گا اور بڑی شان سے پیوں گا میں — پیوں گا اور دل و جان سے پیوں گا میں

مرے حواس میں واژوں تو کیا ہوا ساقی — مرے جگر میں نہیں خوں تو کیا ہوا ساقی
نحیف و زار ہوں بیمار ہوں تو فکر ہے کیا؟ — مرے مزاج کا، طبعِ حزیں کا ذکر ہے کیا؟

بہک نہ جاؤں کہیں میں تو یہ سوال نہ کر — مرا خیال ہے تجھ کو؟ مرا خیال نہ کر!
مرے جنوں سے نہ کر آج اجتناب پلا — پلا خدا کے لئے اور بے حساب پلا

پلا کچھ ایسی کہ نشے میں اس کے کھو جاؤں
سکوتِ مرگ سے میں ہمکنار ہو جاؤں

خاور سہامی

ایک راہبہ کے محبت نامے!!!

پانچواں خط

(جولائی کے ادبی دنیا میں سب اڈیٹر کی غلطی سے لکھا گیا تھا چوتھا اور آخری خط" درحقیقت موجودہ خط اس دلکش سلسلہ کا آخری کڑی ہے۔ اب یہ سلسلہ کتابی صورت میں شائع ہوگا)

یہ تمہاری طرف میرا آخری خط ہوگا۔ اس خط کی تحریر کے لب و لہجے میں تمہیں اچھی طرح آگاہ کر دینا چاہتی ہوں۔ چونکہ تم نے مجھے اس بات کا پورا پورا یقین دلا دیا ہے کہ تم مجھ سے محبت نہیں کرتے، اس لئے یہ اب ضروری ہو گیا ہے کہ میں بھی تمہاری محبت سے دست بردار ہو جاؤں!!

تمہاری جو جو چیزیں میرے پاس محفوظ ہیں وہ میں اپنی پہلی فرصت میں ہی تمہیں واپس بھیج دوں گی۔ تم اس بات سے نہ ڈرنا کہ میں اب کبھی تمہیں کچھ لکھوں گی، میں ان چیزوں کے پلندے پر تمہارا نام تک بھی نہ لکھوں گی!!

میری سہیلی ڈونا برآنش [جس پر مجھے ہر قسم کی رازداری کا بھروسہ رہا ہے، اور جسے میں اپنے سے زیادہ قابل اعتبار سمجھتی ہوں] اس کام کو سرانجام دے گی، وہ ہر طرح کی احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ مجھے یہ اطمینان دلا دے گی، کہ اس نے تمہاری تصویر اور بازو بند [جو تم نے مجھے نشانی کے طور پر دے رکھے تھے] تم تک پہنچا دئے ہیں۔ میں تم پر یہ بھی ظاہر کر دینا چاہتی ہوں کہ پچھلے دنوں میں تمہاری ان محبت کی کئی نشانیوں کو [جو مجھے کسی وقت اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھیں] ضائع کرنے لگی تھی۔ لیکن چونکہ میں نے تمہیں اپنی محبت میں سخت کمزوریاں دکھائی ہیں اس لئے شاید تم میرے اس سنجیدہ اقدام کا اعتبار نہ کرو!!

مجھے ان چیزوں کے جدا ہونے کا بہت افسوس ہے لیکن تم یقیناً مسرور ہوگے اور اپنی فتح پر نازاں ہو کر میری شکست پر اطمینان کا ٹھنڈا سانس لوگے۔ ہم دونوں کی باہمی خفت و شرمندگی کی بنا پر میں یہ اقرار کئے بغیر نہیں رہ سکتی کہ میں ان معمولی سی چیزوں کی واقعی بہت قدر کرتی رہی ہوں لیکن جب مجھے اس بات کا خیال آیا کہ تمہارے اور میرے درمیان اب کسی قسم کا تعلق اور رشتہ نہیں رہا تو میں نے دل کڑا کر کے یہ فیصلہ کر لیا کہ ان سب چیزوں کو ایک ایک کر کے تمہیں واپس کر دوں گی، جب کسی شخص کے پاس کسی مقصد میں کامیاب ہو جانے کے لئے معقول وجوہات ہوں تو وہ یقیناً کامیاب ہو جاتا ہے!! اور اب میں آخر کار ان سب چیزوں کو ڈونا برآنش کے حوالے کر رہی ہوں!!

میری محبت کے اس آخری فیصلے نے میری روح کو کتنا صدمہ پہنچایا ہے اس کا اندازہ کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ غیر ممکن بھی ہے جذبات کی بے شمار تلخیوں اور انتہائی مشکلات کے بعد [جن کا تمہیں یقیناً کوئی احساس نہیں ہو سکتا اور جن کی کیفیت میں تمہارے سامنے پیش کرنا بھی نہیں چاہتی!!] میں نے اس سے [ڈونا برآنش] یہ درد بھری گزارش کی ہے کہ وہ ان چیزوں کا مجھ سے اب کبھی ذکر بھی نہ کرے اور میرے اس اصرار پر کہ میں ان کو ایک بار پھر دیکھوں وہ مجھ کو ان کے دیکھنے کی اجازت بھی نہ دے اور مجھے اطلاع دئے بغیر وہ ان سب کو تم تک پہنچا دے!!

میں نے اپنی محبت کا درماں ڈھونڈنے کی کوششوں میں صرف اپنی محبت کی بے انتہا شدت اور زیادتی کو محسوس کیا ہے، آہ اگر مجھے شروع میں ہی اپنی ان مشکلات اور محبت کے ان تلخ نتائج کا [جنہیں میں محسوس کر رہی ہوں] پتہ چل جاتا، تو میں تمہاری محبت میں کبھی بھی گرفتار نہ ہوتی!!

یہ بلاشبہ درست ہے کہ تمہاری محبت کو برقرار رکھنے کی نسبت

[آہ کس درجہ ناشکر گزار ہو تم!] مجھے تمہاری محبت سے علیٰحدہ ہو جانے سے ایک ناقابل بیان تکلیف کا احساس ہوگا!! میری محبت کا جذبہ مجھے تم سے زیادہ عزیز و محبوب رہا ہے۔ اپنی محبت کے اس خود دار جذبے کو کامیاب بنانے میں مجھے دکھ بھی تو بہت جھیلنے پڑے ہیں اور آہ آخر کار تمہارے ناروا اور زبون اطوار نے خود بخود مجھے اس بات پر مجبور کر دیا ہے کہ میں اب اپنے اُسی جذبۂ محبت کو نفرت اور استہزا سے بدل ڈالوں!!!

میری نسوانی کم ہمتی نے مجھے کبھی مدد نہیں دی کہ میں تمہارے خلاف کسی قسم کا قدم اٹھا سکتی!!

آخر کار میں بھی دنیا کی دوسری عورتوں کی طرح ایک عورت ہی ہوں میرے پاس بھی دل ہے اور دل کے اندر جذبۂ خودداری ایک عورت دنیا میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہے مگر اس سے وہ جلن یقیناً برداشت نہیں ہو سکتی جو اس کے محبوب کے کسی اور عورت سے تعلقات اس کے لئے پیدا کر دیتے ہیں!!

میں نے تمہاری محبت کی ذلتیں سہی ہیں تمہاری جانب سے ہر قسم کی نفرت و ملامت برداشت کرتی رہی ہوں۔ آہ کسی نہ کسی طرح یہ جلن بھی سہہ سکنے کے قابل ہو جاتی، اگر تم اتنے بے مروت اور سنگدل نہ ہوتے!!

تمہاری جھوٹی فریب کاریوں اور تمہارے آخری خط کی معمہ خیز اور بے معنی سادگی نے مجھ پر ظاہر کر دیا ہے کہ میرے تمام خط تمہیں ملے اور ان سب کو پڑھ کر تمہارے دل پر ذرا بھی اثر نہ ہوا کتنے ناسپاس انسان ہو تم! میرا بھولاپن دیکھو کہ میں اس جھوٹی آس سے ہی اپنا دل بہلاتی رہی ہوں کہ وہ خطوط تمہیں پہنچائے ہی نہیں گئے یا تمہیں ملے ہی نہیں۔!!!

میں تمہاری اس سادہ پُرکاری سے اب حد درجہ متنفر ہو چکی ہوں کیا میں نے تم سے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ تم مجھے اس بارے میں سچ سچ لکھو؟ آہ تم نے مجھے اُس حالت میں [جس میں میں رہنا چاہتی تھی] کیوں نہ رہنے دیا؟ تمہارے لئے یہ بہت آسان تھا کہ تم مجھے خطوں کے نہ ملنے کی بابت کچھ لکھتے ہی نہ کیونکہ میں اس معاملے کی صداقت سے باخبر ہونا نہیں چاہتی تھی!!

میں نے آج تک تمہاری ہر بات پر اعتبار کیا اپنی سادگی اور بے وقوفی سے تمہاری ہر ریاکاری کو سچ جانتی رہی مگر آہ اب میں اس قابل نہیں رہی کہ تمہارے قصوروں کو جھٹلا کر تمہیں سزاوار ٹھیراؤں۔ مجھ پر یہ راز اچھی طرح سے عیاں ہو گیا ہے کہ تم میری محبت کے بالکل نااہل تھے۔ تمہاری صفاتِ قبیحہ کا مجھے بخوبی علم ہو گیا ہے، میں نے جو کچھ تمہاری خاطر کیا اگر اس پر نظر رکھتے ہوئے تم میری اس گذارش کو ٹھکرا نہ دو تو میں تم سے صرف ایک آہ فقط ایک ہی التجا کرتی ہوں کہ تم مجھے اب آیندہ کبھی کچھ نہ لکھنا!! میری اتنی ہی مدد کرو تاکہ میں اب تمہیں ہمیشہ کے لئے بھلا سکوں!!!

اس خط کو پڑھ کر اپنے جذبۂ رحم کو میرے لئے تھوڑا سا بھی متحرک نہ کرنا۔ کہیں میں پھر فریب میں مبتلا نہ ہو جاؤں۔ مگر نہیں میرے جذبۂ ناراضگی میں اب کمی ہونا ناممکن ہے۔ میں اپنے جذبۂ الفت کو دبا دینا چاہتی ہوں، اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دبا دینا چاہتی ہوں!!

میں نے جو کچھ بھی اب کرنے کے لئے قدم اٹھایا ہے تم اس میں خلل انداز نہ ہونا۔ مجھے ڈر ہے کہ تم پھر اُسی طرح [جس طرح کہ تم نے شروع الفت میں میرے دل کی دنیا کو تہ و بالا کر دیا تھا] میرے مقاصد میں اپنی بے رحمانہ شرکت سے اب بھی کہیں ہلچل نہ ڈال دو!!!

اس خط سے تم پر جیسا بھی اثر پڑے میں اسے جاننا تک نہیں چاہتی میں اپنے مستقبل کے لئے جو راہ ڈھونڈ رہی ہوں تم اس کی نگینی کو ضائع نہ کرو۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ جو حالت تم میری مایوسیوں کے لئے بنانا چاہتے تھے وہ تمہاری اپنی ہی رضامندی کے مطابق بن گئی ہے!!!

میری ناکامیوں سے مجھے محروم نہ کرو مجھے امید ہے کہ کسی نہ کسی وقت مجھے ان سے ضرور سکون نصیب ہوگا!!!

میں تم سے یہ وعدہ کرتی ہوں کہ تمہیں کبھی نفرت سے نہ دیکھوں گی کیونکہ میرے پاس اب وہ جذبہ ہی نہیں رہا جس سے میں تمہیں نفرت کر سکنے کے قابل ہو سکوں!!!

میں یہ بہت یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ مجھے اس سرزمین میں تم سے زیادہ وفادار عاشق مل تو جائے گا مگر آہ میرے دل میں محبت کا جذبہ کون پیدا کرے گا!!! کیا کسی دوسرے مرد کی محبت کا جذبہ اب مجھ پر کچھ اثر ڈال سکے گا؟ افسوس میری محبت کا جذبہ تم کو مغلوب نہ کر سکا!!!!

آہ وہ زخم خوردہ دل جو ایک بار محبت کے غم سے شکستہ و پامال ہو چکا ہو، محبت کے اولین خوابوں کو اور آہ ان کی مسرتوں سے وہ تمام عمر محروم رہا کبھی بھلا سکنے کی کوشش کر سکتا ہے؟ محبت کے اُن رنگین تصورات کو جو روح پر نقوش ہو چکے ہوں کیا کبھی فراموش کیا جا سکتا ہے!!

محبت اولین کی زرکار شعاعوں کو لوح دل سے ہرگز ہرگز مٹایا نہیں جا سکتا! اور نہ محبت اولیں کے شیریں زخم صحت و تازگی سے ہم کنار ہو سکتے ہیں!!

پہلے پیار کی سب کے اندر دبی ہوئی خاموشیوں کو بیدار کرنا محال ہے، محبت کا سویا ہوا بے ہوش نشہ جذبۂ مسرت سے بیدار نہیں ہو سکتا!!

الفت رفتہ کے پہلے غم آلود لمحے ہی کچھ دل کو پیارے ہوتے ہیں، اُس کے لئے کوئی نیا نغمۂ مسرت بے کار ہے۔ محض بے کار!!!

میں تم سے یہ پوچھتی ہوں کہ تم نے مجھے محبت کے اس ناتمام اور ناتسلی بخش جذبے کے ساتھ ہمکنار کیوں کیا جو کبھی جاوداں نہیں بن سکتا تھا!!!؟

آہ تم نے مجھے محبت کے اس ہلاکت خیز سمندر میں کیوں غرق کر دیا جس کے تلاطم میں تم خود ڈوبنا نہیں چاہتے!!؟

آہ ہمیں یہ ناہنجار اور بے رحم فطرت اور ہماری محبت کا یہ اندھا جنون انگیز جذبہ کس لئے مجبور کر دیتا ہے کہ ہم اُس محبوب ہستی کا تصور دل میں جمالیں جس کا مسلک صرف ہرجائی پن ہوتا ہے اور بس!!؟

مجھے امید ہے کہ میں اپنی زندگی کے لئے کوئی دوسرا باوفا ساتھی حاصل کر کے ضرور خوش و خرم رہ سکوں گی!!

تمہاری محبت سے چونکہ مجھے کافی عبرت مل چکی ہے اس لئے میں اب اس معاملے میں بہت احتیاط سے کام لوں گی، میں نہیں چاہتی کہ جس طرح تم نے مجھے تباہ و برباد کیا ہے اسی طرح کسی غریب انسان کی زندگی کو میں بھی تلخ اور سوگوار بناؤں!!

میرے پاس تمہارے ترک محبت کے لئے فی الحال کوئی معقول وجہ نہیں۔ سچ جانو کہ میں تم سے کسی قسم کا بے رحمانہ انتقام نہ لوں گی، لیکن ابھی سے میں تمہیں اس کا پورا پورا یقین بھی نہیں دلا سکتی کیونکہ اس کا انحصار صرف میرے مستقبل کے احساسات کی تبدیلی پر ہے!!!

میں کوشش کر رہی ہوں کہ تمہاری تمام ترلغزشوں کو بھول جاؤں اور تمہیں معاف کر دوں، آہ، اب میری سمجھ میں یہ بخوبی آ گیا۔ کہ ایک "راہبہ" واقعی محبت کئے جانے کے قابل نہیں۔ لیکن ساتھ ہی میرا یہ خیال بھی غلط نہیں کہ اگر کوئی مرد خلوص دل کے ساتھ محبت کرنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہو تو دوسری عورت کے مقابلے میں "ایک راہبہ کی محبت اس کے لئے بدرجہا بہتر ہے!!! کیونکہ وہ اندھی بن کر اپنے جذبۂ محبت کی تکمیل کرتی ہے اُس کو صرف اپنی محبت کا غم ہی محبوب و مرغوب ہوتا ہے دنیا کی دوسری دلکشیوں اور رنگینیوں سے وہ لطف اندوز ہونا نہیں جانتی، سوسائٹی کی رنگین صحبتوں سے وہ بالکل بے پرواہ ہوتی ہے!!! مرد فطرتاً عیش پسند ہے وہ چاہتا ہے۔ کہ اس کی محبوبہ ہر وقت محبت کے ماتم میں ہی مصروف نہ رہے بلکہ اس کے لباس کے متعلق گفتگو کرے سیر و تفریح اور دوسرے رسمی ہنگاموں کے بارے میں باتیں کرے!!۔ لیکن ایک "راہبہ" کی حالت اس کے برعکس ہوتی ہے۔ اُسے مکار بن کر دل لبھانا نہیں آتا اُسے جھوٹی نمائشوں سے پیار کرنے کے ڈھنگ نہیں آتے، وہ محبت کا احترام کرتی ہے، سچائی اور صداقت کے ساتھ!! اس کی فطرت سادہ اور روح بے لوث ہے، وہ سادگی پر مرجاتی ہے اور انجان بن کر اپنے عاشق پر (چاہے وہ اعتماد کے قابل نہ ہو) اعتبار کر لیتی ہے!! اور اُس سے کسی حالت میں بھی بدظن نہیں ہوتی!!!

میں ان باتوں سے تم پر یہ ثابت نہیں کرنا چاہتی کہ تمہیں مجھ سے محبت کرنی چاہئے تھی! آہ یہ واقعی میرا ایک مذموم اور ذلت آمیز انداز ہوگا۔ تم سے اپنی محبت کا اعتراف کرانے کا! حالانکہ میں پیشتر کئی بار ہزار دلکش اور مناسب طریقوں میں اس بات کی ناکام کوششیں کر چکی ہوں! اور ہمیشہ ناامید رہی ہوں!! اپنی قسمت کی سیہ بختیوں سے مجھے یہ اب کبھی بھی امید نہیں ہو سکتی کہ تمہارے دل میں میری محبت کا جذبہ پیدا ہو۔ میں عمر بھر بدنصیب رہی اور رہوں گی۔ آہ جب میں تمہیں ہر روز دیکھ لیا کرتی تھی تو اس وقت میری کیا حالت تھی! تمہاری ملاقاتیں تمہارے فراق سے زیادہ میرے لئے اندوہگین تھیں یہ خطرہ میرے دل کو ہر وقت محسوس ہوتا تھا کہ تم میری محبت میں ثابت قدم نہ رہ سکو گے، میری آرزو تھی کہ تم ہر وقت میری نگاہوں کے سامنے رہو مگر یہ ممکن نہ تھا۔ تم کانونٹ (معبد) میں مجھ سے ملنے آیا کرتے تھے اس ڈر سے بھی میں کانپا کرتی تھی اور جب تم اچانک مجھے چھوڑ کر فوج کے ہمراہ چلے گئے تھے، میرا جینا دوبھر ہو گیا تھا مجھے اپنی نااہلیت (جو مجھے تمہارے مقابلے میں

محسوس ہوتی تھی یا کا بھی احساس تھا۔ یہ خیال مجھے بہت پریشان رکھتا تھا کہ میں زیادہ خوبصورت نہیں ہوں اور تمہاری محبت کے لائق نہیں ہوں!!

میں اکثر یہ سوچ کر شکستہ خاطر ہو جایا کرتی تھی کہ میرے اور تمہارے درمیان جو محبت کا رشتہ قایم ہو گیا ہے اس سے کہیں تم پر حرف نہ آئے، مجھے یہ کمی بھی محسوس ہوتی تھی کہ میں تم سے پوری طرح محبت نہیں کرتی، میں نے اپنے والدین کی ناراضگی پر تمہاری محبت کو ترجیح دی۔ در اصل میں اس موجودہ حالت [جس میں کہ میں اب گرفتار ہوں] اس وقت زیادہ خراب و خستہ حال تھی!!!

آہ اگر تم اس وقت [جب تم نے پرتگال چھوڑا ہے] تھوڑا سا بھی مجھے اس بات کا یقین دلا دیتے کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے تو میں ہر ممکن طریقے سے کوشش کر کے اس جگہ کو چھوڑ دیتی، میں اس کراس کانونٹ [معبد] سے بھاگ نکلتی اور جب تک تمہارے قدموں میں نہ پہنچ جاتی، اطمینان کا سانس نہ لیتی!!! اور آہ اگر تم میرے اس ایثار پر بھی مجھ سے بے پرواہی رہتے تو میری اس وقت کی تباہی کا نقشہ متصور نہیں کیا جا سکتا، میرے لئے دنیا میں کیا ہوتا، صرف ذلت اور رسوائی!! آہ ایسا کر کے کیا میں اپنے عزیز و اقارب کے [جو اس حالت میں کہ میں تمہاری محبت سے منہ موڑ رہی ہوں اب مجھے پہلے سے کئی درجہ زیادہ عزیز ہو گئے ہیں] تمام وقارِ خاندانی کو خاک میں نہ ملا دیتی!!!؟

یہ بہت ممکن ہے کہ اب میری حالت پہلے سے ابتر و تباہ حال ہو جائے آہ میں کس قدر سادگی اور سچائی سے اپنی آیندہ مظلومیت کا اظہار تم سے کر رہی ہوں، اور وہ بھی ہمیشہ کے لئے صرف آخری بار!!

خیر میری حالت خواہ کچھ بھی ہو جائے تم تو میری اس پستی پر خرم و شاد ہو جاؤ گے۔ میری اس بے چارگی سے تم تو دل میں مسرت کے جوش سے پھولے نہ سماؤ گے۔ لو میں پھر احمق بن گئی، جب مجھے تم سے کسی قسم کا سروکار ہی نہ رہا تو پھر مجھے یہ جاننے کی ضرورت کیا کہ تم میری حالت سے متاثر ہو کر خوش ہو گے یا ناخوش!!!

میں نے تم سے پہلے بھی درخواست کی ہے کہ تمہاری جانب سے اب میری طرف کوئی خط نہ آئے اور اب دوبارہ پھر یہی استدعا کرتی ہوں۔

آہ، کیا تم نے کبھی اس بات پر بھی غور کیا کہ تم نے میرے ساتھ کس کس قسم کے سلوک کئے۔ آہ کیا یہ تمہیں کبھی محسوس بھی نہیں ہوتا کہ تم دنیا میں سب سے زیادہ میرے صرف میرے زیرِ احسان ہو۔ میں نے تم سے اپنے دل کی تمام تر دیوانگی، اپنی روح کی تمام تر گہرائی کے ساتھ محبت کی، میں نے کبھی بھی تمہیں نفرت کی نگاہ سے دیکھنے کی کوشش نہیں کی، مگر تمہارا رویہ آہ تمہارا رویہ میرے ساتھ کس قدر معیوب اور کتنا غیر شریفانہ رہا!! اگر تمہیں میرے ساتھ کوئی فطری لاگ یا عداوت تھی، نہیں تو تم مجھ سے مزید والہانہ محبت کرتے، میری سادگی دیکھو، میں تمہاری ادنیٰ ادنیٰ سی صفات کی گرویدہ بن گئی ادھر تم نے میرے دل کو خوش کرنے کے لئے کیا کیا، میری خاطر کیا ایثار کیا؟ ہاں ہاں ذرا منہ سے بولو تو، میں بھی تو سنوں کہ تم نے میرے لئے کیا کیا دکھ جھیلے!! میری ان تمام باتوں کا جواب تمہارے پاس نفی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ تم نے صرف اپنے دل کو بہلانے کی خاطر ہزاروں قسم کے مشاغل ڈھونڈے، دنیا کے عیش و طرب میں حصہ لیتے رہے۔ فوج کا افسر بننا تمہیں مجھ سے زیادہ مرغوب ہوا اور آخر کار میری تمام تر التجاؤں کے باوجود تم نے میری دعوتِ محبت کو بھی ٹھکرا دیا!!!

تم نے پرتگال [جہاں تم فرانس کی نسبت زیادہ عزت کی نگاہ سے نگاہ سے دیکھے جاتے!!] میں رہنے کے لئے اپنی ذرا سی بھی تو خواہش ظاہر نہ کی!!

بھائی کے خط آنے پر کسی قسم کا تامل کئے بغیر تم مجھے ایک دم چھوڑنے پر راضی ہو گئے اور خوشی خوشی فرانس کی طرف جانے والے جہاز پر سوار ہو گئے۔

اب مجھے احساس ہوا کہ میں نے بھی تم سے بے پروائی اختیار کیوں نہ کی! آہ یہ کتنا احمق پن تھا میرا کہ میں نے آغازِ محبت میں ہی تم پر ظاہر کر دیا کہ میں اپنی روح کے تمام تر ایمان و ذوق کے ساتھ تمہاری پرستش کرتی ہوں، انسان کو محبت کے باب میں تھوڑا سا چالاک بھی ہونا چاہیئے تاکہ دوسرے کے دل میں بھی وہ محبت کے شعلے کو بھڑکا سکے اور اس طرح اپنی محبت کا خراج وصول کر سکے۔!!!

تم نے اپنے دل میں پہلے سے ہی ٹھان رکھی تھی کہ میں اکیلی ہی تم سے محبت کرتی جاؤں اور تم مجھے بے وقوف بناتے رہو اور ظاہر ہے۔

کہ تم اپنے اس ارادے میں کلی طور پر کامیاب بھی رہے۔

میرا جذبۂ محبت تمہیں ضرور متاثر کر لیتا اگر تمہیں بھی میرا تھوڑا سا خیال ہوتا۔ مگر تمہیں خود پریشان ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ جب تم یہ دیکھتے تھے کہ تم نے مجھ کو مغلوب کر ہی لیا ہے۔ اس لئے تم نے میری اس کمزوری سے جتنا بھی چاہا فایدہ حاصل کیا !!!!

آہ کس درجہ بے رحمی! اور آہ کتنا جبر !!

کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ تم نے مجھ سے اس قسم کا سلوک کر کے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا؟

اگر کبھی کوئی ایسا موقع پیش آجائے کہ تم پر نکال آؤ تو میں اعلانیہ طور پر تمہیں آگاہ کرتی ہوں کہ دنیا میں سب سے پہلے انسان تم ہو گے جو میرے خاندان کے جذبہ انتقام کا نشانہ بنو گے !!!

میں ایک طویل و دراز مدت تک ایک سنگین جلا وطنی اور فریب کا توہم میں مبتلا رہی ہوں اور اپنی غلطیوں کا خمیازہ اٹھاتی رہی ہوں۔ جن کا تصور بھی اب میرے لئے سخت دہشتناک ہے !!!

میرے انفعالِ محبت میں اب رحم کی طلب باقی نہیں رہی !!!

تمہاری محبت کو ترک کرنے پر (میرے اس جرم کے یقیناً تم ہی محرک ہو) مجھے سخت پشیمانی اور افسوس ہے سوائے اس کے اور میں اب کر بھی کیا سکتی ہوں۔ میرے پاس اب وہ دل ہی نہیں رہا جس کی مدد سے میں اپنے ان تاثراتِ قلبی کو مغلوب کر سکتی !!!

یہ ذہنی کشمکش مجھے کب تک اس دل گرفتگی کی حالت میں رکھے گی آہ میں کب تک اسی طرح پریشان خاطر رہوں گی! میں اپنی مظلومیتوں کے باوجود تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ میں تمہارے لئے کبھی برا نہ سوچوں گی اور حتی الامکان کوشش کروں گی کہ تم خوش رہو! مگر آہ تم خوش کیونکر رہ سکتے ہو جب تمہارے سینے میں وہ دل ہی نہیں جو خوشی کا آرزومند ہو سکے !! میری جانب سے آیندہ خبر تمہیں میری فتح مندی کا پیغام پہنچائے گی اور تم پر یہ ظاہر کرے گی کہ میری بدقسمتیوں کے لمحے اب ختم ہو چکے ہیں اور یہ کہ اب میری روح امن و سکون کے ساتھ ہمکنار ہو گئی ہے !!!

میرا دل اس وقت مسرور ہو گا جب مجھے یہ یقین ہو جائے گا کہ نہ اب مجھے تم سے کوئی شکایت ہے اور نہ تمہاری بے انصافی کا کوئی گلہ !!

میں اس وقت اپنی کامیابی پر نازاں ہوں گی، جب مجھے اچھی طرح سے اس بات کا احساس ہو جائے گا کہ اب میرے دل سے تمہاری محبت بالکل فنا ہو چکی ہے ـــــ میں بھی تمہاری جانب سے قطعی بے پروا ہو چکی ہوں ـــــ اور تمہارے مظالم تمہارے تشدد کو بالکل فراموش کر چکی ہوں !!!

میں اس وقت اپنے آپ کو فتحمند تصور کروں گی۔ جب مجھے یہ محسوس ہونے لگے گا کہ اب میں اپنی محبت کی تمام مسرتیں اپنی محبت کے سارے غم بھول چکی ہوں اور تمہیں یاد کرنا اب صرف میری اپنی رضامندی پر موقوف رہ گیا ہے۔ جب چاہوں تمہیں یاد کر لوں اور جب چاہوں تمہیں بھلا دوں !!

میں اس حقیقت کو تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتی کہ تمہیں میری زندگی کے ساتھ بہت حد تک تعلق رہا ہے، تم نے میری روح کو ایک ایسے جذبۂ رنگین سے ہمکنار کیا جو میرے دل و دماغ کے تمام احساسات پر غالب آگیا تھا لیکن تمہیں اپنی اس فتح مندی پر زیادہ ناز نہیں کرنا چاہئے اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ میں جوان تھی اور ساتھ ہی نادان بھی تھی

میں کانونٹ معبد کی غیر رنگین فضا میں بچپن ہی سے مقید کر دی گئی تھی مجھے کبھی ایسا موقع نہ مل سکتا تھا کہ میں کسی خوبصورت اور نوجوان مرد کو دیکھ سکوں !!

اس سے پیشتر کہ میں نے تمہیں نہ دیکھا تھا، مجھے اپنے حُسن کی قدر و قیمت معلوم نہ تھی! تم نے جب میرے حسن کی دلکشی کے نغمے گائے، میری خوبصورتی کی تعریفیں کیں۔ اُس وقت، آہ اُس وقت مجھے یہ احساس ہوا کہ میرے جمال کی تمامتر جلوہ باریاں میری لطافتِ حُسن کی ساری رعنایاں اور رنگینیاں صرف تمہارے آہ صرف تمہارے ہی لئے فطرت نے مجھے عطا کی ہیں !!!!

چونکہ میں نے بھی چاروں طرف تمہاری ہی شہرت کا چرچا سنا، ہر اک کی زبان کو تمہاری ہی تعریف میں رطب اللسان پایا، اس لئے تمہاری شخصیت کے رعب سے متاثر ہو کر مسحور ہو گئی !!!

لیکن اب میں اُس فریبِ طلسم سے بیدار ہو چکی ہوں۔ تم نے یقیناً مجھے میری کمزورِ فطرت کے سمجھنے میں بہت مدد دی جس کے لئے میں تمہارا شکریہ ادا کرتی ہوں !!!

میں تمہارے سب کے سب خطوط واپس بھیج رہی ہوں۔

لیکن میں نے تمہارے دو آخری خط اپنے پاس محفوظ رکھ لئے ہیں۔ میں انہیں بار بار پڑھنا چاہتی ہوں تاکہ وہ آیندہ میرے لئے مشعلِ ہدایت کا کام

دیں اور میں کہیں پہلے کی طرح محبت کی کمزوری میں مبتلا نہ ہو جاؤں !!!

تمہاری محبت میرے لئے کتنی مہلک ثابت ہوئی، آہ میں کس درجہ خوش نصیب ہوتی۔ اگر تم مجھے صرف اتنا کرنے دیتے کہ میں تم سے ہمیشہ محبت کرتی رہتی !!!

مجھے اب تم سے کوئی شکایت نہیں رہی! تمہاری بے وفائی کو میں اب بھلا چکی ہوں!! میری حالت چند دنوں میں بحال ہو جائے گی اور مجھے امید ہے کہ اس سے پہلے کہ میں اپنے لئے کوئی خطرناک راستہ تجویز کروں (جس کی خبر تمہارے لئے یقیناً مسرت کا باعث ہوگی) کچھ روز اور جی سکنے کے قابل ہو سکوں گی !!!

جب مجھے تم سے کوئی سروکار ہی نہیں رہ سکتی پاگل ہوں میں کہ تم سے پھر وہی ذکر بار بار کر رہی ہوں !!!

ہاں میں نے تمہیں بھلا دیا ہے، اور میں اب تمہیں کبھی بھی خط نہ لکھوں گی اور نہ ہی تمہیں کبھی یاد کروں گی !!

خدا حافظ

حسرت نصیب

میری آنا

(جملہ حقوق محفوظ)

عظیم قریشی

نوٹ:۔

"ایک راہبہ کے محبت نامے" یکجا طور پر عنقریب کتابی صورت میں شائع ہونے والے ہیں۔ کتاب کے ساتھ حضرتِ حفیظ ہوشیار پوری ایم اے مدیر رسالہ "ادبی دنیا" کا مقدمہ بھی شامل ہوگا۔

رباعیات

(۳)

دکھ درد میں اوروں کا جو غمخوار نہ ہو
بے یار و مددگار کا جو یار نہ ہو
جنت تو ملے اس کو مگر اے اکبر
جنت میں خدا کا اسے دیدار نہ ہو

(۴)

مومن ہے تو کچھ نیک کمائی کر لے
اچھا ہے بروں سے بھی بھلائی کر لے
اکبر کرمِ عام خدا کی ہے صفت
اس بندگی میں کچھ تو خدائی کر لے

اکبر الٰہ آبادی

عزمِ حیات

مشرق سے یونہی پھوٹیں گے انوار کے دھارے — یہ کوثر و تسنیم سے معمور گھٹائیں
چمکیں گے یونہی رات کو چاند اور ستارے — یہ تند، سبک سیر، جہاں گرد ہوائیں
دیکھے گا زمانہ یہ دل افروز نظارے — یہ چاند یہ خورشید یہ تارے یہ فضائیں
اس بزم جہاں میں مگر اک میں ہی نہ ہوں گا — سب ہوں گی مگر آہ! فقط میں ہی نہ ہوں گا

برسات میں گھر گھر کے یوں ہی چھائیں گے بادل — رفعت سے اترتی ہوئی ندیوں کا ترنّم
اور دامنِ کہسار پہ لہرائیں گے بادل — جھونکوں سے ابھتے ہوئے غنچوں کا تبسّم
دنیا کو نئے خلد میں نہلائیں گے بادل — یہ دشت یہ میدان، یہ کہسار یہ قلزم
اس بزم جہاں میں مگر اک میں ہی نہ ہوں گا — سب ہوں گے مگر آہ! فقط میں ہی نہ ہوں گا

ابلیں گے کہستان سے یونہی نور کے چشمے — لیکن نہیں، میں مردِ جواں عزم بنوں گا
ابھریں گے یوں ہی سینۂ عشاق سے نغمے — اس ہستیٔ فانی کو میں جاوید کروں گا
چمکیں گے بیاباں میں یونہی ریت کے ذرّے — گر موت بھی آئے گی تو میں مر نہ سکوں گا
اس بزم جہاں میں گر اک میں ہی نہ ہوں گا — مر مر کے بھی میں زندۂ جاوید رہوں گا

ہو جائیں گے نابود یہ میدان یہ کہسار
یہ بحر یہ دریا یہ بیابان یہ گلزار
یہ چاند یہ خورشید یہ افلاک یہ سیّار
لیکن کسی طاقت سے بھی میں مٹ نہ سکوں گا
مٹ مٹ کے بھی میں زندۂ جاوید رہوں گا

شہید ابنِ علی

غزل

وہ بے نقاب تھا اے دل کہ بے نقاب نہ تھا　　تجھے تو ہوش بھی اے خانماں خراب نہ تھا

مری نگاہ میں محدود تھی مری ہستی　　ترے حضور میں جب تک میں باریاب نہ تھا

بجا ہے دل کو مرے تیرے عشق کا دعوے　　کہ اس سے پہلے کبھی اتنا پیچ و تاب نہ تھا

اسی گروہ میں از راہِ لطف شامل کر　　کہ دو جہان میں جن پر ترا عتاب نہ تھا

جمالِ یار کا ہوتا نہ کیوں یہاں چرچا؟　　وہ ماہتاب نہ تھا؟ یا وہ آفتاب نہ تھا؟

نظر نے دیکھ لیا کیوں جگہہ جگہہ تجھ کو　　دل و جگر میں اگر جوشِ اضطراب نہ تھا

ہماری خاک ہی جاتی تمہارے دامن تک!　　کہ اس سے آگے کوئی اور انقلاب نہ تھا

قبولِ عام کا رتبہ مجھے ملا انورؔ!
کہ میرے رنگِ سخن کا کوئی جواب نہ تھا

لطیف انور گورداسپوری

جذبۂ محبّت

(مغربی نقطۂ نظر سے)

ہماری زندگی میں محبت اور صرف محبت ہی ایک ایسا جذبہ ہوتا ہے جو ایک انسان کو اس کی فطرت کے عین خلاف سوسائٹی سے بغاوت کرنے پر مجبور کر دیتا ہے اور اس کے بنے بنائے قدیمی اور رسمی اصولوں کو تہس نہس کر دیتا ہے۔ عام طور پر واقعات کے بعد واقعات اپنی نمایاں اور رنگیں تبدیلیوں کے ساتھ اور بالکل ہماری توقعات کے مطابق ظہور میں آتے رہتے ہیں لیکن جو غیر معمولی احساس اور طوفانی جوش و خروش اس جذبہ کے تحت میں پایا جاتا ہے وہ اور کسی کیفیت میں ہرگز نہیں پایا جاتا۔ ہماری زندگی کے بہت سے واقعات اور تجربات ہمارے خیالات کا بالکل اُسی طرح عکس ہوتے ہیں۔ جس طرح ایک تصویر سے اُس کے بیک گراؤنڈ کی مناسبت اور ہم آہنگی اور ایک ساز کی سوز سے ہمنوائی۔ اُسی بنا پر ہم عام طور سے "لکیر کے فقیر" کے مصداق اپنے مستقبل کا دار و مدار بھی ماضی اور حال کی اٹل رفتار پر رکھتے ہیں۔ ایک شخص اپنے آپ کو احباب اور آشناؤں کی وابستگی کے سراب بے دھوکا دیتے رہنے کا عادی ہو سکتا ہے اور وہ خود بھی جواب میں اپنی وابستگی کے جذبے کو دوسروں کے لئے وقف کر دینے کا خیال کر سکتا ہے لیکن حقیقتاً خالص محبت کے موتی کو تلاش کرنے کے لئے احباب کے طرزِ عمل اور ذاتی خود فریبی کے سمندر کی گہرائیوں میں غوطہ لگانا نہ صرف لا حاصل ہے بلکہ حقیقی جستجو کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کرنا ہے۔ انسان نے اس "جذبۂ محبت" کے متعلق جو کچھ بھی اب تک سوچا ہے اور لکھا ہے وہ سب اپنے ذاتی خیالات اور تجربات کی بنا پر ہے حالانکہ اس کے بر خلاف حقیقت یہ ہے کہ یہ جذبہ اپنی جگہ پر دنیا کے تمام تجربات پر حاوی ہے اور انسان کے سارے اصول اور تجربات اس کے سامنے سرنگوں اور بے بس نظر آتے ہیں۔ مجھے ایک فرانسیسی عالم کا قصہ یاد ہے کہ وہ اپنے دائرہ احباب میں بیٹھا ہوا اس نکتہ پر نہایت سرگرمی سے بحث کر رہا تھا اُس صحبت میں سے کسی صاحب نے اعتراض پیش کر دیا کہ وہ خود محبت کے جذبے سے ذاتی طور پر کہاں تک واقف ہے؟ بس اسی پر وہ فوراً مجلس سے اٹھ کر گیا اور پختہ ارادہ کر کے اٹھا کہ جب تک وہ اعتراض کی اس کمی کو پورا نہ کر لے گا۔ اس وقت تک وہ ہرگز اس مجلس میں واپس نہ آئے گا اور جب وہ دوبارہ اس مجلس میں داخل ہو تو یہ کہتا ہوا۔ "لیجئے صاحبان میں اپنی پرانی بحث کو اب پھر سے جاری رکھنے کے لئے تیار ہوں" بہت ممکن ہے کہ وہ اس جذبے کی حقیقی باریکیوں سے کامل طور پر نہ واقف ہوا ہو لیکن قصے کے انداز سے "ذوقِ سلیم" کا ضرور اندازہ ہو جاتا ہے، اور شاید یہی بات اس مضمون کے پڑھنے والوں کے لئے بھی ایک اصلاحی چیز ثابت ہو۔

جب ایک شخص محبت کی مسرت آمیز خلش میں مبتلا ہوتا ہے اور اس کی حقیقی روشنی کو اپنے اندر چمکتا ہوا پاتا ہے تو وہ اپنے اندر تبدیلیاں دیکھ کر ہرگز متعجب نہیں ہوتا اور اب وہ ان وقتی تاثرات سے کہ جن کا اثر وہ کبھی کبھی قبول کرتا رہا تھا۔ کہیں بڑھ چڑھ کر اپنے اندر ایک خالص جذبہ کا پیدا ہو جانا محسوس کرتا ہے۔ اب وہ اس درد اور اُن کیفیتوں سے دو چار ہوتا ہے کہ جن سے وہ اپنی زندگی کو اس سے پیشتر خالی پاتا تھا۔ "جذبۂ محبت" میں مبتلا ہو جانا سوسائٹی کے اور بہت سے تفریحی ہنگاموں سے یقیناً بالکل مختلف خیال کیا جاتا ہے اور غریب گرفتار شدہ شخص کو جن بے مہریوں اور رسوائیوں سے واسطہ پڑتا ہے وہ بھی پوشیدہ نہیں ہیں۔ سوسائٹی میں ایسے شخص کی زندگی کو بالکل ایسی طرح بے بنیاد اور بے اصول سمجھا جاتا ہے، جس طرح ببول کے درخت سے آم پیدا کرنے کی توقع۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ دو شخص جن میں ایک بھی قبول صورت نہ ہو، آپس میں ملتے رہتے بھی ہوں۔ ان میں گفتگو کا سلسلہ بھی رہا ہو اور دونوں کی آنکھیں بھی متعدد دفعہ چار ہوتی ہوں، اور اس قسم کی ملاقات ایک دفعہ نہیں بلکہ بیسیوں مرتبہ ان کے درمیان ہوئی ہو، اور پھر بھی کوئی نتیجہ خاص برآمد نہ ہوا ہو لیکن جب محبت کا پرکیف درد کسی کے قلب میں شعلے بن کر بھڑکنے لگتا ہے

تو ضرور دنیا بدل جاتی ہے۔ پھر وہ لوگ رفتہ رفتہ وہ درجہ اختیار کر لیتے ہیں کہ ایک کو دوسرے میں کائنات کی تخلیق کا مقصدِ اول نظر آنے لگتا ہے پھر تو وہی معمولی مسکراہٹ ایک دوسرے کے لئے وہ اہمیت رکھتی ہے کہ جہاں محبت کے متعلق دنیا بھر کے تجربات اور مقولے سرنگوں اور متزلزل نظر آتے ہیں، عاشق کی آنکھیں اپنے مطلوب کے سوا دنیا کی کسی دلچسپ سے دلچسپ چیز کو بھی دیکھنا پسند نہیں کرتیں، اس کے ذہن میں صرف ایک خیال ہوتا ہے اور اس کے قلب میں صرف ایک تمنا۔ ان کے تمام احباب اور شناسا اپنی جگہ پر تعجب کرتے ہیں اور آپس میں چہ مے گوئیاں کرتے ہیں کہ آخر فلاں مرد کو فلاں عورت میں اور فلاں عورت کو فلاں مرد میں ایسی کیا خصوصیت اور کشش نظر آتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے لئے اس قدر بے چین ہیں۔ میرے دوستو! میں اس موقع پر یہ ظاہر کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ میں اس معاملے میں عورتوں کے احساسات کو پیش کرنے سے بالکل قاصر ہوں۔ بہت ممکن ہے کہ ایک عورت کا جذبۂ محبت اسی وقت جوش میں آتا ہو اور اسی وقت اس کی تسکین ہو سکتی ہو کہ جب وہ یونانیوں کے خدا اپولو کے بت میں جان پڑنے کے بعد اس کو جسمانی شکل میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔ لیکن جہاں تک ہم نا اہلوں کا کہ جو اپنے آپ کو انسان کہنے کا دعوے رکھتے ہیں تعلق ہے اور جو کھانے کی میز پر خوب خوب اور طویل قہقہوں کے ساتھ خوش گپیاں کرتے ہیں، میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جہاں تک میرے مطالعہ اور مشاہدے کا تعلق ہے، ان میں سے کوئی بھی اس قابل نہیں ہوتا کہ وہ کسی عورت کے دل میں اپنے لئے کوئی جگہ پیدا کر سکے۔ ہاں لیونارڈو ڈاونسی[1] اور گیٹے کے جوانی کے زمانے کے متعلق ضرور سنا جاتا ہے کہ یہ لوگ اس قابل تھے کہ ایک عورت کے احساسات کو بیدار کر سکتے تھے۔ میں عورتوں کی اس حس کے بارے میں یقیناً دوسرا خیال رکھتا ہوں لیکن بوجہ جنسی فرق ہونے کے صحیح حالات کی صورت میں پیش نہیں کر سکتا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہماری زندگی میں بہت سے ایسے واقعات بھی پیش آ جاتے ہیں کہ جب انسان تقدیر کو بھی بے بس و مجبور بناتا نظر آتا ہے اور بالکل اپنی خواہش کے مطابق اس سے کام لیتا معلوم ہوتا ہے۔ اسی بنا پر اگر ایک انسان ہمت اور صبر سے کام لے تو وہ یقیناً بہت سے ایسے کام کر سکتا ہے، جن میں محنت اور مشقت، بلند خیالی، اور باریک بینی اور جوش و خروش کا پہلو نمایاں طور سے نظر آئے گا لیکن 'جذبۂ محبت' جیسے جذبے میں اپنے آپ کو قصداً اور ارادتاً مبتلا کر لینا ہرگز ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ سب جانتے ہیں کہ شیکسپیر جیسے ماہر فن کو ملکہ ایلزبتھ کی خواہش کے مطابق فال اسٹاف کو جذبۂ محبت میں مبتلا کرنے کے لئے کیسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ مجھے تو یقین نہیں آتا کہ "ہنری فیلڈنگ"[2] بھی کبھی اس جذبے سے واقف ہوا ہو، سوائے اس کے کہ اس کے ناول پڑھ کر ایک دو موقعوں سے کوئی رائے قائم کر لی جائے ورنہ میں تو اسکاٹ کے بارے میں بھی یہی خیال رکھتا ہوں۔ یہ سب لوگ اپنی جسمانی خوبصورتی، تندرستی، اور آزاد خیالی کے لحاظ سے اس قابل تھے کہ ان کا جذبۂ محبت میں مبتلا ہونا دائرہ یقین و امکان سے باہر نہ تھا اور جب یہی لوگ اس جذبے کی حقیقی کیفیتوں سے واقف نہ ہو سکے تو اس دنیا کی زمین پر ان گنت مردہ صورت اور کوئی خاص وقار نہ رکھنے والے لوگوں سے یہ امید رکھنا کہ وہ جذبۂ محبت، جیسے نازک جذبے کی حقیقت کو سمجھے ہوں گے، عین حماقت ہے جس طرح ایک شخص گیلے کپڑے پہنے ہوئے آگ میں سے بغیر کسی گزند اور تکلیف کے گذر جاتا ہے اور جس طرح ایک نابینا کے لئے دنیا کا دلفریب سے دلفریب اور جاذب نظر نظارہ بھی کسی قسم کی فرحت و راحت مہیا نہیں کر سکتا، اسی طرح روئے زمین پر بسنے والے لوگوں کی زیادہ تعداد ایسی ہوتی ہے کہ وہ اس جذبے کی حقیقی کیفیتوں کو سمجھنے کی ہرگز اپنے آپ میں اہلیت نہیں رکھتے بہت سے مرد اور بہت سی عورتیں کہ جن میں اس قسم کی اہلیت موجود ہوتی ہے۔ وہ یا تو ایک دوسرے سے زندگی میں کبھی ملنے نہیں پاتے اور یا ایسی منحوس ساعت اور بری گھڑی میں ملتے ہیں کہ روح کی اولین آرزو یعنی محبت ان میں اس وقت موجود نہیں ہوتی۔ اسی باعث بہت سی ممکن صورتیں نامکمل رہ جاتی ہیں۔ شرم اور مصلحت وقت کی بنا پر بھی بہت سے تعلقات آدھی دور تک ہی پہنچ کر رہ جاتے ہیں۔ اس منزل کو طے کرنے کے لئے نہایت درجہ مستقل مزاجی اور صبر و رضا کی ضرورت ہے کوئی غیر معمولی انسان ہی اپنی آرزوؤں کی پامالی کو ایک دفعہ نہیں بلکہ متعدد دفعہ دیکھ سکتا ہے، حتیٰ کہ وہ اپنے عجز و نیاز اور ایثار کے زور سے محبوب کو

[1] ایک ماہرِ علمِ موسیقی۔ [2] ایک قابل قدر ناول نویس۔

اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ میں اس سلسلہ میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ ایک عورت یقیناً اس مرد کے ساتھ الفت سے پیش آتی ہوگی جو مستقل مزاج اور رعایا بھی ہوگا۔ اسی وجہ سے جو شادیاں ایک دوسرے کی ناپسندگی کی بنا پر ہوتی ہیں ان کا انجام یقیناً خراب ہوتا ہے اور ان کی ازدواجی زندگیاں بھی غیر خوشگوار رہتی ہیں۔ محبت ایک ازلی بشارت ہے اور اس کی مسرتیں ابدی ہوتی ہیں ان دو کے تعلقات کس قدر قابل قدر اور کیسے قابل رشک ہیں جنہوں نے اس منزل کو پورے علم و ہوش کے ساتھ قدم بہ قدم طے کیا ہو ان کی مثال بالکل ان دو چھوٹے بچوں کی سی ہوتی ہے کہ جو ایک اندھیرے کمرے میں اپنی منزلِ مقصود کو ڈھونڈتے ہوئے جا رہے ہوں۔ ایسے لوگ ملتے ہی ایک دوسرے کا دم بھرنے لگتے ہیں اور ایک کو دوسرے کی خوشی اور پریشانی اپنی خوشی اور پریشانی معلوم ہونے لگتی ہے اور پھر تو رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہنچ جاتی ہے کہ ایک اپنی ذاتی تکلیف کے احساس کو دوسرے کی آنکھوں میں دیکھنے لگتا ہے۔ یہ سب احساسات نہایت خاموشی سے پرورش پاتے رہتے ہیں اور کچھ عرصے کے بعد دونوں اس قدر ہم آہنگ ہو جاتے ہیں کہ جو کچھ محبوب کے دل میں ہوتا ہے بالکل وہی خیال عاشق کے دل میں بھی ہوتا ہے۔

اس جذبۂ محبت میں مبتلا ہو جانا جہاں تعجب خیز ہے وہاں سودمند اور مفید بھی ضرور ہے۔ اس جذبے کو زیادتی عمر سے کوئی سروکار نہیں ہوتا بلکہ یہ ہر انسان کے سوتے ہوئے احساسات کو بیدار کر دیتا ہے۔ جب تک ایک شخص اس جذبہ میں مبتلا نہیں ہوتا اس وقت تک وہ محبت کی پرکیف لذات سے زندگی کو خالی خیال کرتا ہے، وہ اس راز کو اس جذبے میں مبتلا ہو جانے کے بعد ہی سمجھ سکتا ہے کہ کائنات کی کوئی مسرت محبت کی کاوشوں سے بیش قیمت نہیں ہے۔ ایک بے حس شخص زندگی کے اس مقدس ترین جذبے کی کیفیتوں کے مزے سے ناآشنا رہ کر محض فرسودہ اور غیر دلچسپ باتوں کے درمیان ہی اپنی زندگی گزارنے کا عادی ہو جاتا ہے، وہ ایک محرومِ مسرت شخص کی طرح خشک زندگی بسر کرتا رہتا ہے جس میں نہ کوئی رنگینی ہوتی ہے اور نہ کوئی امنگ۔ ایسا شخص زندگی بھر سوسائٹی کے قدیمی اور رائل اصولوں کی کورانہ پرستش میں معروف رہنے کو اپنا ایمان سمجھتا ہے اور چونکہ اس میں روشن خیالی اور انسانی ہمدردی کا فقدان ہے اس لئے اپنے محدود اور مقررہ راستے سے ہٹ کر سکون اور راحت کے سامان کو اور کہیں تلاش کرنا خیال خام سمجھتا ہے لیکن جب وہی شخص غیر اختیاری طور پر جذبۂ محبت میں مبتلا ہو جاتا ہے تو پھر تو وہ اپنی مردہ دلی، بے بسی اور خود غرضی کو اسی طرح خیرباد کہہ دیتا ہے کہ جس طرح سینٹ پال ایک کٹر یہودی نے عیسائیت قبول کرنے کے بعد کیا تھا۔ اس کی دل کی وہی حرکت جو گزشتہ سالہا سال تک نہایت صحیح اور سچے وقت کی پابندی کے ساتھ قایم رہی تھی، اب اس جذبے میں مبتلا ہونے کے بعد بے انتہا بڑھ جاتی ہے اور اس کا دل بغیر کسی پابندی کے اس کے سینے میں بلیوں اچھلنے لگتا ہے، اس کے قلب کی دھڑکن میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے۔ اب وہ ایسا محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس نے اس قسم کی پرلطف کیفیت اس سے پیشتر کبھی محسوس نہ کی تھی۔ اب اُسے اپنی تمام گزشتہ زندگی کو خواب کی سی حالت میں بسر کرنے کا یقین ہو جاتا ہے۔ اب وہ اپنے کو دنیا کی عجیب و غریب مخلوق خیال کرنے لگتا ہے۔ وہ تنہائی میں اکثر مسکراتا رہتا ہے اور چاند اور ستاروں کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھنے کا خاص طور سے عادی ہو جاتا ہے۔ ہر چند ایک عاشق کی ذہنی اور قلبی کیفیات کو کامل طور پر بیان کرنا ایک ہوشیار سے ہوشیار ادیب کے بس کی بھی بات نہیں لیکن پھر بھی جو کچھ لکھا گیا ہے اور ہمارے مطالعے میں آسکا ہے وہ یقیناً قابل قدر ہے۔ جرمن شاعر کی نظم ایلی لیڈ، ٹینی سن کی نظم ماڈ اور ہینرح ہین کے بہت سے گیتوں میں اس کیفیت کو نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ شیکسپیئر نے بھی اپنے ڈراما رومیو اور جولیٹ میں رومیو اور جولیٹ کو ہیرو اور ہیروین بنا کر اس جذبے کی کیفیت کا خوب خوب اظہار کیا ہے، حالانکہ چند جرمنی نقادانِ فن نے اس پر اعتراضات بھی کئے ہیں۔ اس کے علاوہ شیکسپیئر نے ڈراما انطونی اور قلوبطرہ میں بھی انطونی کو قلوبطرہ کا پرستار بنا کر اس کیفیت کے اثرات کا خوب خوب نقشہ کھینچا ہے۔ وکٹر ہیوگو کے ناول [illegible] اور اسی طرح جارج لینڈ اور جارج میریڈتھ نے اپنے اپنے ناولوں میں بہت سے کرداروں کو جذبۂ محبت میں مبتلا کر کے اس کیفیت کو خوب خوب بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی اس مسئلہ پر پڑھنے کے لئے اور مواد موجود ہے۔ ان تصانیف کے مطالعے کے بعد ایک جوان شخص

کی تمام خوابیدہ تمناؤں کا بیدار ہو جانا بہت کچھ امکان میں ہے
ایک عاشق کی کیفیات کا جو اس پاک جذبے کے تحت میں طاری ہوتی ہیں، وضاحت سے بیان کرنا آسان بات نہیں ہے۔ یہ جذبہ بالکل غیر اختیاری طور پر خدا جانے کس طرح یکایک انسان پر چھا جاتا ہے اور پھر وہ اپنے آپ کو نہ صرف ایک خاص نشے کی سی کیفیت میں سرشار پاتا ہے بلکہ اپنے وجود کو بھی دوسروں کے لئے مفید اور سود مند خیال کرتا ہے۔ اس کو کسی کے عشق میں مبتلا ہونے کے بعد سونے میں، چلنے میں، حرکت کرنے میں حتیٰ کہ سانس تک لینے میں ایک خاص قسم کا مزہ حاصل ہونے لگتا ہے۔ اس جذبہ سے متاثر ہونے والے بہت کم پسند کرتے ہیں کہ یہ کیفیت انہیں تک محدود رہے۔ وہ اس بات کی خواہش کرنے لگتے ہیں کہ اُن کے احباب اور شناساؤں کو بھی اس مزہ سے ناآشنا نہ رہنا چاہئے۔ ایک دوسرے کے پرستار جب آپس میں گفتگو کر کے خاص قسم کا حظ حاصل کرتے ہیں تو وہ اس بات کے متمنی نظر آتے ہیں کہ آخر تمام دنیا کے لوگ بھی اس مقدس جذبے میں کیوں نہیں مبتلا ہو جاتے۔ اُن کی خودداری یہاں تک بڑھ جاتی ہے کہ وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ جو آسمان نیلا ہے اور یہ جو سورج چمکتا ہے محض اُن کے وجود اور اُن کی محبت کی خاطر، اور اتفاق بھی یہی ہوتا ہے کہ عام طور سے پرستار اور محبوب ایک دوسرے سے ایسے ہی خوشگوار اور دلفریب و دلکش موسم میں ملتے ہیں، ہر چند ایسے لوگ اپنے دوسرے ہم جنسوں کے ساتھ نہایت التفات اور خوش خلقی سے پیش آتے ہیں لیکن پھر بھی اپنی امتیازی شان کو ضرور علیحدہ قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ دنیا والوں کے نزدیک عام طور سے حکمرانی اور مذہبی پیشوائی کو بہت بڑا درجہ حاصل ہے اور اس ممتاز جگہ پر پہنچ جانے والے اسے اپنے لئے انتہائے عروج و کمال سمجھتے ہیں لیکن عاشق اور محبوب کے نزدیک محبت کرنا اور محبوب بننا ہی وہ وقار اور رتبہ ہے جس کے سامنے دنیا کی تمام مادی ترقیاں ہیچ ہیں۔ اسی وجہ سے ایسے لوگ دوسروں سے ذرا وجاہت آمیز طریقے سے گفتگو کرتے ہیں اور یہی وجاہت اور امتیازی شان کا جذبہ انہیں سادگی اور انکساری کی طرف مائل نہیں ہونے دیتا۔ ہر چند وہ عورتوں کے متعلق نہایت نیک و پاک خیالات رکھتے ہیں، جیسے کہ وہ تمام اُن کی نظروں میں جون آف آرکس ہی ہوں، لیکن اُن کے طرزِ عمل اور برتاؤ سے ہرگز یہ بات نہیں پائی جاتی کیونکہ وہ ان کے ساتھ اکثر ترشروئی اور بدگمانی سے بھی پیش آتے ہیں۔ میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ آیا عورتیں مردوں کے اس قسم کے طرزِ عمل کو پسند کرتی ہیں یا نہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جارج ایلٹ کے ناول ڈینیل ڈیرانڈا کے مطالعے کے بعد میں نے ان کی پسندیدگی اور غیر پسندیدگی کے متعلق سوچنے کی کوشش کرنا ہی ترک کر دی ہے۔

لوگ محبت کے جذبے کو جہاں بلند خیال کرتے ہیں وہاں اسے حماقت سے پُر بھی سمجھتے ہیں لیکن اگر محبت سے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا تو کم از کم محبت میں مبتلا ہونے والے دو پرستاروں کا وجود اُن کی سکون و راحت کی زندگی، دوسرے لوگوں کے لئے باعثِ برکت ضرور ہوتی ہے۔ غیر شخص بھی اُن کی آپس کی وابستگی اور بے لوثی کو دیکھ کر ضرور خوش ہو جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ جذبہ اپنی جگہ پر نہایت بلند اور مفید ہے۔ اسی دلیل کی بنا پر اس جذبے کو بے حقیقت اور بے بنیاد سمجھنا عین حماقت ہے۔ ہم مذاقوں اور ہم خیالوں کی ایک اچھی خاصی جماعت سی قائم ہو جاتی ہے، اس جماعت کے لوگ آپس میں ایک دوسرے کو رشک کی نگاہوں سے بھی دیکھتے ہیں۔ ایک جوڑا دوسرے جوڑے کو دیکھ کر اُن کے احساسات اور اُن کے بے لوث تعلقات کی قدر تو ضرور کرتا ہے لیکن ساتھ ہی ان کے مقابلے میں اپنے احساسات کو زیادہ بلند سمجھتا ہے اور دوسروں کے احساسات کو اپنے احساسات کی نقالی خیال کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ جب اسٹیج پر کسی کھیل کے دوران میں تعشق کا اظہار ہوتا ہے تو پھر حاضرین میں سے بھی ایک معمولی مرد و دراصل ایک معمولی عورت کو اپنے جذبات پر قابو پانا مشکل ہو جاتا ہے۔ بہت سی باریکیوں اور گتھیوں کو سمجھنے اور سلجھانے کے لئے انسان کو اپنی عقل اور اپنے تخیل اور ذہن کی قوتوں سے کام لینا پڑتا ہے اسی عقل کی مدد سے اس کو یہاں بھی سمجھ لینا چاہئے کہ محبت کرنے والے اور محبت کرانے والوں کا وجود خلقِ خدا کے امن و سکون میں ہرگز مخل نہیں ہو سکتا۔ ہر چند ایسے لوگ اپنے احساسات کے مقابلے دوسروں کے احساسات کو پست ضرور خیال کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی وہ اس جذبے کی تبلیغ کے خواہشمند بھی نظر آتے ہیں۔ اکثر اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ قدرت بھی اپنی

پوری فیاضیوں کے ساتھ انسان کو مجبور کر دیتی ہے کوئی کتنا ہی بے حس اور سخت دل نہ ہو لیکن جس طرح ایک حد درجہ مصروف کار شخص کے لئے بھی شام کے وقت سورج غروب ہونے کا نظارہ دلکش اور دلفریب بن سکتا ہے اسی طرح اس بے حس انسان کو بھی اپنے جذبات پر قابو پانا یقیناً مشکل ہو جائے گا۔ جب وہ اس جذبے کی رنگین کیفیت کتابوں میں پڑھے گا اور دیا دو افراد کو کسی خوبصورت اور ٹھنڈے سبزہ زار میں محبت کے جذبات سے سرشار راز و نیاز کی گفتگو میں مصروف پائے گا۔

دنیا والے 'جذبۂ محبت' میں مبتلا ہونے والے لوگوں کے باب میں جو چاہے خیال کریں لیکن وہ خود کم از کم اپنے وجود اور اپنے طرز زندگی کو ضرور بہتر و برتر خیال کرتے ہیں۔ دوسروں کے ساتھ نیکی کے ساتھ پیش آنا اور اپنے جذبات کی حقانیت کی تبلیغ کرنا ان کا مذہب بن جاتا ہے۔ ہر وہ چیز جو محبوب کو عزیز ہوتی ہے، عاشق بھی اسی کا فریفتہ نظر آتا ہے۔ دونوں اپنے وجود کو ایک دوسرے کے لئے باعث تقویت سمجھتے ہیں۔ اس جذبے کے تحت میں جود جاہت، خودداری اور دوستی کے مختلف احساسات انسان پر چھا جاتے ہیں، ان کو علٰحدہ علٰحدہ پیش کرنا نہ صرف مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے۔ ایسے لوگوں کو خود آرائی، خوشنمائی، اور بڑھ بڑھ کے باتیں بنانے کا شوق محض اس خواہش کی بنا پر ہی نہیں ہوتا کہ اس سے اُن کے دائرہ احباب میں ان کا وقار بڑھتا ہے بلکہ ایسا کرنے سے اُن کو اپنے محبوب کی خاطر بھی منظور ہوتی ہے عاشق کی زبان پر صرف ایک نام ہوتا ہے جو چشمے کی طرح اس کے دل کی گہرائیوں سے اُبلتا ہے اور لبوں پہ آکر رکتا ہے وہ ہر جگہ اور ہر وقت اسی کا ورد کرتا ہے۔ اُس کا تمام وقت اسی کوشش میں گزرتا ہے کہ کسی طرح سے اس کے محبوب کا دل میلا نہ ہونے پائے۔ عاشق اپنے محبوب کے سامنے اپنی بعض کمزوریوں کا تنہائی میں اقرار کرنے سے بھی بڑا خوش ہوتا ہے اور چشم پوشی اور دل نوازی کی اپنے محبوب سے اُمید رکھتا ہے۔ وہ اس بات کا آرزومند نظر آتا ہے کہ اُس کا محبوب اس کو کسی خاص خوبی کی وجہ سے پسند نہ کرتا ہو بلکہ اس کی محبت اس کی ذات خاص کے لئے وقف ہو۔

ایک عاشق اپنی موجودہ زندگی کے مقابلے میں گزشتہ زندگی کی باتوں کو بالکل بے حقیقت خیال کرنے لگتا ہے اور اس کی بدمزگی کا اُسے پورا پورا یقین ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی گزشتہ زندگی کی تمام اچھی اور بری خواہشات اور اس زندگی سے متعلقہ واقعات اور احساسات پر نفرین کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو لعنت ملامت کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ اُسے گزشتہ زندگی کے ایام میں موجودہ دلچسپیوں کے بغیر کیونکر چین اور صبر آگیا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی ایک عاشق یہ ہرگز برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا ہے کہ اس کا محبوب بھی اپنے گزشتہ تعلقات پر ایک ایسی ہی نگاہ ڈالے۔ وہ اس گتھی کو سلجھانے سے اپنے آپ کو قاصر پاتا ہے کہ اُس نے اپنی گزشتہ زندگی کے دن جب کہ وہ بالکل بے کیف اور بے حقیقت تھی، کیسے گزارے۔ وہ اپنی انتہائی بے خودی اور اپنے جنون و جوش کے عالم میں قدرت پر بھی الزام دھرنے سے نہیں چوکتا ہے اور کہتا ہے کہ جبکہ خدا قادر مطلق اور رحیم و فہیم ہے تو اس نے مجھے اور میرے محبوب کو کچھ عرصے کے لئے بھی کیوں دور دور رکھا؟

بہت سے لوگ "حسد" کو اس بنا پر رد کرتے ہیں کہ جہاں وہ ایک مصنوعی جذبہ ہے وہاں عملی طور سے پُر قباحت بھی ہے ان لوگوں کا یہ خیال بمشکل صحیح ٹھہرایا جاتا ہے اگر لوگوں کا اعتراض اس بنا پر ہے کہ "حسد" بعد کی اختراع اور پیداوار ہے اور اس جذبے کو بنی نوع انسان کے وجود میں آنے کے وقت سے کوئی تعلق نہیں ہے تو ان کی یہی دلیل وفاداری، حب الوطنی، محبت اور دیگر عمدہ اور لطیف جذبات کے بارے میں بھی پیش کی جا سکتی ہے اور "حسد" کا ہم پلہ جذبہ "بدمزاجی" بھی بعد ہی کی پیداوار ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ سب کیا دھرا حضرت انسان ہی کا ہے۔ محبت کے جذبے کے لئے تاریخ کی ورق گردانی کرنا ہرگز مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ یہ جذبہ جہاں ان سب باتوں سے بے نیاز ہے وہاں اپنی جگہ پر ناقابل اعتراض اور عدیم المثال بھی ہے۔ اگر کوئی صاحب یہ دریافت کرنے لگیں کہ اس جذبہ کا فلاں عہد میں اور فلاں ملک میں، مثال کے طور پر ملک یونان میں کیا رنگ تھا تو اس کے جواب میں دماغ شکوک کے وہ انبار لگا دے گا کہ اصل معاملے کی اہمیت خواب و خیال ہو کر رہ جائے گی۔

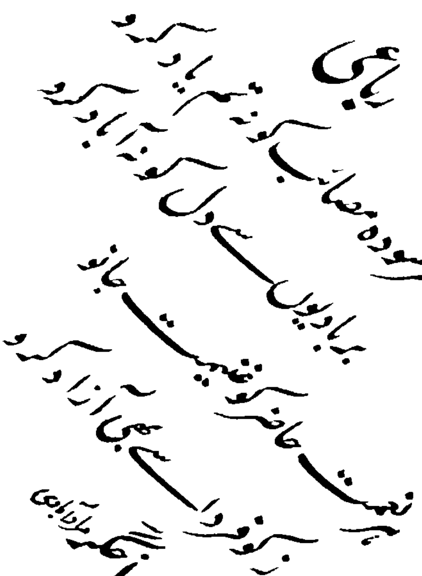
بہر صورت محبت میں "حسد" لازمی اور منطقی طریقے سے شامل ہے۔ آپ پسند کریں یا نہ کریں لیکن ہے ضرور۔

وہ حسد صحیح معنوں میں بالکل "حسد" نہیں ہوتا جب کوئی عاشق اپنے محبوب سے علیحدہ گزشتہ زندگی پر نگاہ ڈال کر ایک خاص قسم کا جذبہ محسوس کرتا ہے۔ ہر چند اُس کے قلب پر چوٹ سی ضرور لگتی ہے لیکن اس پر بھی ان خطوط کا تصور جو گزشتہ دنوں میں اس نے اپنے کسی دوسرے محبوب کو بھیجے تھے اس کی موجودہ وابستگی میں مخل نہیں ہوتا۔ پرستار اور محبوب خالص محبت کے تحت میں ہرگز ایک دوسرے کے بارے میں بُرے اور نا مہذب خیالات دل میں نہیں لاتے ہیں بلکہ دونوں اپنی اپنی جگہہ پر گزشتہ زندگی کا خیال کر کر کے کُڑھتے ہیں۔ وہ اس بات کے آرزومند اور خواہشمند نظر آتے ہیں کہ قدرت نے کیوں نہ اُنہیں ایک ہی وقت میں اور ایسے ہی احساسات کے ساتھ پیدا کیا۔ ایسی صورت میں اُن کا تعلق خالص اور مکمل ہوتا اور کسی قسم کی بدگمانی سے بھی اُن کے قلوب پاک رہتے اور وہ اُن کی گزشتہ زندگی کے بہت سے اذیت دہ واقعات کو ایک دوسرے سے چھپائے بغیر اپنی زندگیاں بے خوف و خطر اور بغیر کسی بدگمانی کے بسر کرتے ان لوگوں کو اپنی ملاقات سے پیشتر گزشتہ جدائی کا بھی اسی طرح قلق ہوتا ہے جس طرح موت کے بعد اٹل جدائی کا۔ کسی نے لکھا ہے کہ محبت کا جذبہ انسان کو حیات ابدی، پر اعتقاد اور یقین کرنے کے لئے مجبور کر دیتا ہے کیونکہ یہ بات بعید القیاس معلوم ہوتی ہے کہ ایسے بلند مرتبہ اور خالص جذبے کو بھی قدرت اس مختصر سی زندگی کے ساتھ ہی فنا کر دینا گوارا کر لیتی ہو۔ آسمان سے زمین پر اترنے والی چیزوں میں محبت سب سے زیادہ معصوم ہے۔ محبت غیر فانی ہے اور محبت والے بھی۔ ہر چند یہ یقین اپنی جگہہ پر غیر ممکن اور بعید الفہم سا نظر آتا ہے لیکن اگر ہم روائتوں اور مثالوں پر نگاہ ڈالیں تو اس میں کوئی غیر ممکن بات اور کم فہمی نظر نہ آئے گی۔

دنیا کے اس طلسم خانہ میں کون رہا ہے جو محبت اور محبت کرنے والے ہی رہ جاتے۔ وقت نے سب کو نیچا دکھایا ہے۔ وقت کی پامالیاں اٹل ہیں۔ زندگی کی بے ثباتی کا یہ عالم ہے کہ اُدھر تو وہ اندھا تیر انداز یعنی محبت کا دیوتا کیوپڈ ہنس ہنس کے بے شمار تیر چلا رہا ہے اور اِدھر اجل کے فرشتہ نے اُن تیروں سے گھائل ہونے سے پیشتر ہی نشانہ کو اٹھا لیا۔ دوسرا بھی گھائل ہی ہوتا ہے ایک زخمی شکار کے مانند تڑپ کر اور خاک و خون میں لت پت ہو کر اپنی جان دے دیتا ہے۔ اسی باعث محبت اور محبت کرنے والوں کے واقعات محض افسانہ اور خواب و خیال ہو کر رہ گئے ہیں۔ اب جبکہ ایک نسل کا فاصلہ ہو چکا ہو، نہیں سال کے باہمی اور بے لوث تعلقات کا خاتمہ ہو چکا ہو، کون کہہ سکتا ہے کہ ان پرستاروں اور محبوبوں کا کہ جو اپنی محبت کو دائمی سمجھتے تھے اور جو اپنے جذبات کی حقانیت کے دھن میں "موت" تک کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے، کیا حشر ہوا؟ وہی جو وقت کیا کرتا ہے۔ اگر ان کی زندگیوں کی یاد دلانے کے لئے کوئی چیز باقی رہ جاتی ہے تو اُن کے دل سے نکلے ہوئے چند گیت، کچھ قربانیاں اور چند بچے جو عادت اور مزاج میں اُن سے بہت مشابہ ہوتے ہیں۔

"ٹینی سن"

توکّل حسین



شاعر سے خطاب

مرحبا اے شاعرِ روشن ضمیر   حبذا اے پرتوِ اسمِ خبیر
آفریں اے "بینش افروزِ فقیر"   شاد باش اے "دانش آموزِ امیر"
فاش تیرے دل پہ ہر اک راز ہے
دانش آموزی تری اعجاز ہے

اب کہاں وہ روح پرور وادیاں   وہ جہانِ قدس کی شہزادیاں
کیا کہیں کیسی ہیں یہ آبادیاں   وہ زمانے اب نہ وہ آزادیاں
اپنی اپنی رو پہ ہم کو چھوڑ دے
ہو سکے تو بند سب کے توڑ دے

تو ہے آمر جو ترے فرمان ہیں   قوم کی تشکیل کا سامان ہیں
تو ہے شاعر جو ترے عنوان ہیں   اجتماعی زندگی کی جان ہیں
حکم دے تیرے سوا آمر ہے کون
شعر کہہ تیرے سوا شاعر ہے کون

ہاں، وہی پھر شاعرانہ التفات   ہاں، وہی پھر "فاعلاتُ فاعلات"
تیری ہر اک بات ہے قند و نبات   شعر تیرے چشمۂ آبِ حیات
زندگی کی لہر دوڑا دے ابھی
راز "خود فہمی" کا سمجھا دے ابھی

آتے ہیں جو تیرے آگے بار بار　　شاعرانہ جوش لے کر مُستعار
کرا نہیں تُو کم نگاہی کا شکار　　جن کی "نے واری" ہے تجھ کو ناگوار
شعر اُن کے شاعری کی نقل ہیں
عُمر کھوتے ہیں یونہی، بے عقل ہیں

مانعِ تفصیل یہ اجمال ہے　　تیرا بد اندیش ہر نقال ہے
پھر بھی تو خوش حال تھا خوش حال ہے　　نکتہ سنجوں کا ہر اک جا کال ہے
سب کو حاصل انہماک ایسا نہیں
مدح و ذم کی اب تجھے پروا نہیں

فطرتاً تو شاد وہ رنجور ہے　　اپنی فطرت سے عدو مجبور ہے
رشک سے تیری طبیعت دُور ہے　　اس سے راز شاعری مستور ہے
دل کسی قابل جنہیں پاتا نہیں
رشک اُن پر واقعی آتا نہیں

آتی ہے ان کی جگہ خالی نظر　　کر گئے اُستاد دنیا سے سفر
بیٹھ تو حیثیت اپنی دیکھ کر　　لیکن اپنا رُخ نہ کر ہرگز اُدھر
دل سے شوقِ جانشینی دُور کر
قدر اپنی اے علیؔ منظور کر!

علی منظور حیدرآبادی

کیوپڈ کی فتح

(یونانی مائی تھالوجی کا ایک دلفریب افسانہ)

طاقت کا مغرور اور متکبر دیوتا اپالو، ظالم، خود بیں اور بے رحم اپالو اپنی سنہری آتشیں رتھ میں بیٹھ کر جب مشرق سے مغرب کا سفر کرتا تو دریا کی ننھی منی معصوم پریاں اپنا رقص و سرود چھوڑ کر اس کے دلفریب حسن کا نظارہ کرنے لگ جاتی تھیں اور ہر خوب صورت پری اس بات کے لئے کوشاں رہتی کہ خود بیں اپالو ایک بار صرف ایک بار اس کو دیکھ لے اور اپنا دیوانہ بنا دے لیکن ظالم اور جابر اپالو، طاقت کا مغرور دیوتا اپالو اپنے رتھ کو ہانکتا ہوا نکل جاتا اور ایک نگاہ غلط انداز بھی ان نازک حسین پریوں پر نہ ڈالتا یہی نہیں بلکہ وہ اس قدر سنگ دل واقع ہوا تھا کہ ذرا بھی خیال نہ کرتا اور حسین پریوں کے اُن نازک لطیف اور دلکش پھولوں کو بالکل روند ڈالتا جو وہ اس پر عقیدت مندانہ انداز میں نثار کرتی تھیں وہ وہاں سے روز نکلتا مگر اسے اِن غریب پریوں پر کبھی رحم نہ آتا، وہ ہمیشہ اپنے تاج کو اپنے سر پر ٹیڑھا رکھے ہوئے بے پروائی سے نکل جاتا

کیوپڈ، اندھا اگرکس کیوپڈ، اپنے زرّیں تیر و کمان سمیت حُسن اور طاقت کے متکبر دیوتا سے ملنے جایا کرتا تھا . . .

ایک دن معمول سے زیادہ متکبرانہ لہجہ میں اپالو نے عشق کے دیوتا سے کہا "اے اندھے اور کمزور لڑکے تیری کمان کس قدر وزنی ہے اور تیرے ہاتھ کمزور پھر تو کیوں اپنی ہنسی اس طرح اڑواتا ہے لا یہ کمان اور تیر مجھے دے کہ میرے قوی اور توانا ہاتھ اس لایق ہیں کہ اس وزنی کمان کو اٹھا سکیں۔"

اندھے لڑکے نے حقارت آمیز ہنسی ہنستے ہوئے کہا "کیا خوب! اپنی طاقت کا کتنا اچھا اظہار . . . ہے۔" اپالو بگڑا اور نہایت کرخت آواز میں کہا "او ناسمجھ اور ذلیل چھوکرے آج سے میں دیکھوں گا تیرا یہ تیر میرا کیا کرسکتا ہے، اپنی طاقت پر اس قدر ناز! یاد رکھ کہ تیرا ننھا تیر سورج کے طاقتور دیوتا پر خاک بھی اثر نہ کرے گا . . . . "

"اچھا دیکھا جائے گا . . ." کیوپڈ نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا . . . .

حسین ڈائنا کی پیاری سہیلی ڈیفنی یونان کی زہرہ تمثال لیکن معصوم دیوی اپنی لے میں سحر سامری کا اثر رکھتی تھی، چار دانگ عالم میں مشہور تھا کہ جنگل کے درندے بھی اس کے نغموں سے مسحور ہو جاتے ہیں۔ وہ ہمیشہ اپنی لے پر گاتی اور جب وہ گاتی تو کیفِ مسرت سے کوہ البیس کا گوشہ گوشہ چپّہ چپّہ بے خود ہو جاتا، اس کے جلوہ بے پناہ اور اُس کی لے نوازیوں نے لاکھوں دلوں کو دیوانہ بنا دیا تھا۔

. . . ایک صبح جب حسین ڈیفنی اپنی لے نوازی سے ایک عالم کو وجد میں لا رہی تھی، وادیاں اُس کی نغمہ پرور لے سے مدہوش تھیں اور ہر ذی حیات پر عالم وجد و سکوت طاری تھا . . . سبزہ خوابیدہ پر عالمِ وجدان ہر طرف شہر خموشاں کا منظر تھا . . . حسین ڈیفنی کی دل نواز تانیں فضائے عالم کے سکوت میں ہیجان برپا کر رہی تھیں . . .

بکایک مشرق کی سمت سے ایک سیلاب نور امنڈتا ہوا نظر آیا، ایک طوفان ضیابار اٹھا جس نے طلسم سکوت کو توڑ کر تمام حسین اور دلکش مناظر اپنے میں جذب کر لئے . . . آہ اس طوفان میں عجیب طرح کی کشش تھی، تمام خوب صورت لڑکیوں نے سر اٹھا اٹھا کر اس جلوۂ بے پناہ کی طرف دیکھنا شروع کیا حُسن کا دیوتا خراماں خراماں آرہا تھا . . . .

دفعتہً حسین اور معصوم ڈیفنی کی سحر آمیز آواز اُسے سنائی دی، کچھ جھوما . . . کچھ کیف طاری ہوا . . . اُس نے ایک محبت آمیز نظر اُس کے دل کش چہرہ پر ڈالی ننھے کیوپڈ نے جلدی سے اپنا ترکش سنبھالا

ور ایک زریں تیر نکل کر مضبوط اپالو کے سینے کو نشانہ بنا دیا۔
"کمان کڑکی اور تیر اپالو کے سینے میں تھا"

اب حسین ڈیفنی کی باری تھی، ایک جست کے زنگ آلودہ تیر سے اس نے ڈیفنی کو بھی نشانہ بنا دیا . . .

ادھر مضطرب اپالو حسن ڈیفنی کی جانب بڑھا، نہایت انکساری سے اپنا سر ڈیفنی کے قدموں پر جھکانا چاہا مگر . . . خوب صورت ڈیفنی . . . مجبور تھی کہ اپالو کی محبت کو ٹھکرا دے کیونکہ جست کے تیر کی یہی تاثیر تھی . . . !

دن گزرے، ہفتے گزرے، مہینوں اور سالوں تک نوبت پہنچ گئی۔ اپالو کی محبت بڑھتی گئی، مگر اپالو جتنی محبت کرتا اتنا ہی ڈیفنی نفرت کرتی۔ وہ ایک مجبور انسان کی مانند پریشان حال خوبصورت ڈیفنی کا انتظار، جنگل کے گھنے درختوں کے سائے میں کیا کرتا تھا مگر . . . وہ ظالم نہ آتی . . . اس کے انتظار کی گھڑیاں ہمیشہ لمبی ہوا کرتی تھیں، وہ اپنے دل کو سلوں بہلانے کے لئے اس کا انتظار کرتا اگر کبھی جب وہ اُسے دیکھ پاتا۔ اس کے دل کی پریشانی اور بڑھ جاتی۔ آخر ایک دن اس نے ہمت کی اور خوب صورت ڈیفنی کو ایک مرغزار میں پا لیا وہ ایک درخت کے نیچے مصروف گلگشت تھی مجبور اپالو لرزتا ہوا اس کی جانب بڑھا وہ اب بھی کانپ رہا تھا اور اس کے پیر ڈگمگائے جا رہے تھے۔

بدبخت اپالو . . . ابھی قریب نہ پہنچا تھا کہ ڈیفنی نے مڑ کر دیکھا اور ہراساں ہو کر بھاگنے پر تیار ہوئی اُس کا یہ ارادہ جان کر وہ آگے بڑھا اور افسردہ لہجے میں اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہا "ٹھہر اے حسن کی ملکہ ٹھہر! دیکھ تیرا ایک دیوانہ تجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے ایک تمنا تیرے روبرو لایا ہے ایک التجا . . . دیکھ! سورج کا طاقت ور دیوتا، وہ دیوتا جس کا سر دنیا کی کسی ہستی کے آگے نہ جھکا تھا۔ آج تیرے قدموں پر جھک رہا ہے، دیکھ میری حالت دیکھ
"ڈیفنی مجھے تجھ سے محبت ہے"

حسین ڈیفنی بھاگی، بہت تیز ایسی تیز جیسے ابابیل مگر . . . اپالو تیز یا اپالو اُس کے نزدیک ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اب ڈیفنی اُس کے آغوش میں تھی . . . !

مگر . . . افسوس . . . اُس کی ساری آرزوئیں اور تمنائیں خاک میں مل گئیں . . . وہ دیوانہ ہو گیا . . . بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا۔ کیونکہ حسین ڈیفنی کی ٹانگیں لانبی جڑوں میں تبدیل ہو کر زمین میں پیوست ہو چکی تھیں اور اس کا حسین جسم ایک نازک اور دلکش درخت میں تبدیل ہو گیا تھا۔

ہائے . . . بدنصیب اپالو یہ منظر دیکھ کر محو حیرت تھا، اس کی سرخ آنکھوں سے دو آنسو نکل کر اس کے دلفریب گالوں پر بہتے ہوئے دلکش اور خوبصورت پتوں میں جذب ہو گئے اور اُس نے پر درد آواز میں کہنا شروع کیا:-

"آہ یونان کی حسین ترین پری، خدا حافظ! اے سب سے زیادہ حسین شہزادی خدا حافظ۔ یاد رکھ کہ اب بھی میں تیری محبت کا تیر دل میں رکھتا ہوں۔ خیر اگرچہ اب میں تجھے زینت آغوش نہیں بنا سکتا مگر اے دلفریب ملکہ . . . تیری یاد قائم رکھنے کے لئے میں تیری ایک شاخ اپنے تاج میں لگاؤں گا اور ہر وہ انسان جو میری پرستش کرے گا تیری بھی کرے گا۔" یہ کہہ کر اس نے ایک پتلی سی شاخ اپنے تاج میں لگائی۔ کیوپڈ مسکرایا، ہنسا اور فضا عشق کے غمناک اور دل سوز نغموں سے لرزنے لگی۔

ماخوذ

جاوید قصری

رباعی

[illegible] ضبطِ فغاں نہ اٹھے
[illegible] کا افسانہ اٹھے
دینداری و [illegible] سے جھک کر
اٹھ اٹھ کے ساقی [illegible] مے شبانہ پیمانہ اٹھا

سید عسکری طباطبائی

مناظرِ قدرت

نمو فشانی صبحِ خنداں سے ہے   جلوہ ریزی حسنِ یزداں سے ہے
لالہ زاروں میں بھی تبسم ہے   آبشاروں میں بھی ترنم ہے
گلشنوں کی عجب ہے کیفیت   دشت و صحرا ہیں رشکِ جنت
ہے چمن پر بہار کا عالم   کس غضب کا نکھار کا عالم

جام پیتا ہوں میں جوانی کا
لطف حاصل ہے زندگانی کا

منظرِ شام ہے مسرت خیز   ذرہ ذرہ ہے کیف سے لبریز
روح پرور شفق کی رنگینی   آسماں نے یہ کی ہے گلچینی
یہ سماں بھی ہے کس قدر پیارا   دلکشا ہے ہر ایک نظارہ
کیف آور شرابِ ہستی ہے   روحِ عالم پہ جوشِ مستی ہے

جام پیتا ہوں میں جوانی کا
لطف حاصل ہے زندگانی کا

انجمن گرم ہے ستاروں کی   حسنِ فطرت کے رازداروں کی
ٹکٹکی باندھ کر جو تکتے ہیں   ساغرِ نور سے چھلکتے ہیں
ان کی آنکھوں کے جو ستارے ہیں   رات کی زیست کے سہارے ہیں
کہکشاں ہے کہ اک طلسمِ راز   ماہِ تاباں کا ہے عجب انداز

جام پیتا ہوں میں جوانی کا
لطف حاصل ہے زندگانی کا

آتے جاتے ہیں چرخ پر بادل   گھر کے چھاتے ہیں چرخ پر بادل
جوش پر ہے شبابِ فطرت کا   بج رہا ہے ربابِ فطرت کا
ننھی ننھی ٹپکتی ہیں بوندیں   سرزمیں پر ٹپکتی ہیں بوندیں
طائروں کی نوائیں دلکش ہیں   مطربوں کی صدائیں دلکش ہیں

جام پیتا ہوں میں جوانی کا
لطف حاصل ہے زندگانی کا

روئے صحرا پہ کیا ہی غازہ ہے   راحت افزا ہوائے تازہ ہے
رنگ دنیا نیا بدلتی ہے   ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا جو چلتی ہے
چشمِ نظارہ بیں کو دعوت ہے   اور دل قلزمِ مسرت ہے
شکوۂ رنج و غم نہیں باقی   دل میں خارِ الم نہیں باقی

جام پیتا ہوں میں جوانی کا
لطف حاصل ہے زندگانی کا

اندرجیت شرما

کوئل

امروز خدا ساز ازل چھیڑ رہا ہے
فطرت کا ہر اک رازِ نہاں فاش ہوا ہے

ہر ذرہ چمک اٹھا ہے مہتاب کی صورت
کلیوں کے چٹکنے سے چمن جاگ اٹھا ہے

آ دیکھ ہرے پتوں پہ شبنم کا مچلنا
سیماب ہے جو زنگ پہ بے تاب ہوا ہے

شاخِ گلِ تر جھوم کے کہتی ہے اِدھر دیکھ
منہ کھول کے حیرت سے کلی کہتی ہے کیا ہے؟

تو غنچے کو دیکھے جو بیں برگ تو کہہ دے
جنت کے دریچے سے خدا جھانک رہا ہے

پانی کی یہ نہریں ہیں کہ ہیں جدول سیمیں
جو صفحۂ اخضر پہ کوئی کھینچ رہا ہے

کس درجہ غم انگیز ہیں کوئل کی صدائیں
یہ دیکھ کے کچھ دل کا عجب حال ہوا ہے

کم بخت کی ہر ہوک مرے دل کی ہم آہنگ
کم بخت کی ہر کوک مرے دل کی صدا ہے

ظالم کے گلے میں ہے بھری آتش دوزخ
ہر نوحۂ غم اس کا بلاہل میں بجھا ہے

تعمیر ہے اس عالمِ کہنہ کی الم سے
اس ساز کا ہر تار ہے پر نوحۂ غم سے

مسعود شاھد

ضرب الامثال کے قصے

گربہ کشتن روزِ اول

رعب پہلے ہی دن جم سکتا ہے۔ اس کا قصہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ دو دوستوں نے ایک ساتھ شادی کی۔ اتفاق سے دونوں کی بیویاں بدمزاج نکلیں پہلے ہی روز ایک کی بیوی جب اس کے ساتھ کھانا کھانے دسترخوان پر بیٹھی تو خاوند نے بلی کو بھاگ جانے کا اشارہ کیا۔ مگر وہ نہ بھاگی۔ اس پر وہ طیش میں آگیا اور اٹھتے ہی بلی کو ایک وار میں تمام کر دیا بیوی نے خاوند کا مزاج جب اپنے آپ سے بڑھا ہوا پایا تو اس خیال سے کہ کہیں اسی طرح میری شامت بھی نہ آجائے دم بخود رہ گئی۔ دوسرے دوست پر اس کی بیوی شیر تھی۔ ایک روز تنگ آکر اس نے اپنے دوست سے پوچھا کہ تمہاری بیوی کے فرمانبردار ہونے کی کیا وجہ ہے۔ اس نے سب ماجرا کہہ سنایا ترکیب کا پتہ لگتے ہی ان صاحب نے گھر آتے ہی اپنی بلی کو چلے جانے کا حکم دیا اور حکم عدولی پر گردن اڑا دی۔ مگر اس نسخہ پر عمل کرنے کے بعد بھی ان کی بیوی رام نہ ہوئی اس پر انہوں نے اپنے دوست سے اس واقعہ کا ذکر کیا تو وہ بولا گربہ کشتن روزِ اول۔

گٹھری اِدھر اور میں اُدھر

یہ مثل ایسے سادہ لوح کے متعلق استعمال کرتے ہیں جس کے منہ سے بے ساختہ ایسی بات نکل جائے جس سے وہ خود ملزم ثابت ہو سکے۔ اس کی ابتدا اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ ایک احمق کو کچھ روپوں کی ضرورت پڑی۔ ہزار سوچا کہ یہ عقدہ کسی طرح حل ہو جائے مگر سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ آخر تدبیر سوجھی تو یہ اور صلاح ٹھہری تو یہ کہ آج رات ساتھ کے متمول ہمسایہ کے گھر درمیانی دیوار پر سے کود کر حاجت برآری کی جائے۔ چنانچہ آدھی رات کو یہ صاحب ادھر کود گئے اور خوب قیمتی قیمتی زیورات اور سامان کی ایک گٹھری باندھ لی۔ ابھی کوٹھے پر نہ پہنچے ہوں گے کہ مالک مکان پاؤں کی آہٹ سے جاگ اٹھا اور چور چور کا شور مچانے لگا۔ یہ گٹھری سر پر رکھ کر بھاگے۔ مگر دیوار پھاندتے وقت گٹھری سر پر سے گر گئی۔ یہ خیر ہوئی کہ کسی نے انہیں دیکھ نہیں لیا۔ صرف گری ہوئی گٹھڑی مالک مکان نے اپنے قبضے میں کر لی۔ صبح کو چوری کی تحقیقات کے لئے تھانیدار آیا۔ محلہ کے لوگوں نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق اظہار رائے کر دیا۔ مگر یہ صاحب گویا ہوئے۔ تھانیدار صاحب، میرے خیال میں چور اس بیچ والی دیوار کود کر آیا ہوگا اور اسباب کی گٹھری باندھ کر اسی دیوار پر سے پھاندنا ہی چاہتا ہوگا کہ گھر والے جاگ اٹھے اس کے آگے یہ کہنا چاہتے تھے کہ کودنے میں گٹھری ادھر گر پڑی اور چور گھبراہٹ میں ادھر کود گیا جو زبان سے نکل گیا "بس جناب گھبراہٹ میں گٹھری اِدھر اور میں اُدھر" تھانیدار نے مسکرا کر کہا۔ ہاں صاحب، ٹھیک فرمایا گٹھری ادھر اور میں اُدھر مگر اب تو آپ بھی آجایئے ادھر۔ یہ کہتے ہوئے تھانیدار نے سپاہی کو اشارہ کیا جس نے اقبالی مجرم کو ہتھکڑی لگا لی۔

کھچڑی کھاتے پہنچا اترتا ہے

اس مثل کے استعمال کا موقع یہ ہے جب نہایت معمولی کام کرتے ہوئے اتفاقاً بڑی تکلیف محسوس کی جائے۔ نازک طبع لوگوں کے لئے یہ مثل عموماً بولی جاتی ہے اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ ایک نواب صاحب تھے بڑے بیٹھو۔ ان کی ایک وقت کی خوراک پندرہ سیر تھی۔ ایک روز ان کی طبیعت جو علیل ہوئی تو حکیم صاحب نے خوراک میں کھچڑی تجویز کی۔ کھچڑی پکا کر نوکروں نے ایک لگن میں نواب صاحب کے سامنے لا دھری۔ اِدھر اشتہا کا غلبہ تھا۔ فی الفور نواب صاحب نے پہنچے تک اپنا ہاتھ کھچڑی میں ڈال دیا۔ کھچڑی بھی گرم گرم ہاتھ جو جلا تو فوراً کھچڑی سے باہر نکالا پھر بھی کچھ کھچڑی ہاتھ

پر لگی رہ گئی۔ اس کے دور کرنے کے لئے ہاتھ کو جھٹکا دیا۔ تو پنجا اڑ گیا جو آخر کار بڑی مشکل سے اپنی جگہ آیا۔

کہوں تو ماں ماری جائے نہ کہوں باپ کتا کھائے

اس کا مطلب کسی نے فارسی زبان میں یوں ادا کیا ہے۔

مرا دردیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد ✤ وگر دم درکشم ترسم کہ مغزِ استخواں سوزد

مطلب یہ کہ نہ کہہ سکتا ہوں نہ دل میں چھپائے رکھ سکتا ہوں۔ اس کی حکایت ذرا دلچسپ ہے۔ سنا جاتا ہے خاوند اور بیوی میں گھر کے معاملات پر آئے دن تو تو میں میں ہوتی رہتی تھی۔ دونوں کی زندگی سخت تلخ ہو چکی تھی۔ عورت بھی تھی عقل کی پوری آئے دن خاوند کی مار پیٹ سے تنگ آ کر اس کے علاج شافی کی تلاش میں سرگرداں تھی۔ ہمسائے کی ایک شریف عورت نے اسے بتایا کہ اگر تو خاوند کو کتے کا گوشت پکا کر کھلائے تو تمام عمر تیرا ہاتھ باندھا غلام ہو جائے۔ اندھے کو کیا چاہئے دو آنکھیں۔ جھٹ ہمسائی کی وساطت سے ایک کتا منگوا ذبح کر کے خوب مزیدار شوربا پکا لیا گیا۔ میاں صاحب جب دفتر سے تشریف لائے تو حسب دستور ان کے آگے کھانا پیش کیا گیا۔ ساتھ ہی فرزند ارجمند بیٹھا تھا جو باوجود صغر سنی کے ماں کی سب کرتوتوں کو بہ نظر غور دیکھتا رہا تھا۔ برخوردار نے سوچا اگر باپ سے کہوں مت کھاؤ کتے کا گوشت ہے تو والدہ کی شامت آ جائے گی۔ اور اگر چپ رہوں تو میاں جی کتا کھا جائیں گے۔ یہ سوچتا رہا۔ مگر جب اس نور نظر کو اور کوئی راستہ نہ مل سکا تو جو دل میں تھا دبی زبان سے ادا ہونا شروع ہوا۔

"کہوں تو ماں ماری جائے نہ کہوں تو باپ کتا کھائے"۔

والد بزرگوار نے بیٹے کو اس حالت میں پایا تو پوچھا نور چشمی کیا بات ہے جو آج تم بیکل ہو کر ایک ہی رٹ لگا رہے ہو۔ صاحبزادے نے تمام ماجرا کہہ سنایا۔ ہم اب یہ ناظرین کے تخیل پر چھوڑتے ہیں کہ آگے بیوی کے ساتھ کیا بیتی۔

چور کی داڑھی میں تنکا

کہتے ہیں ایک گاؤں میں ایک چوری کی واردات ہوئی صبح کو نمبردار نے تمام مشتبہ آدمیوں کو جمع کیا جن میں اتفاق سے چور بھی تھا۔ اب نمبردار بولا دیکھو چور کی داڑھی میں تنکا نظر آئے گا اصل میں جو چور تھا اس نے اس خیال سے کہ تنکا ہوا تو میری ہی داڑھی میں ہوگا اپنی داڑھی کو ہاتھ لگایا۔ نمبردار نے فی الفور اسے گرفتار کروا دیا۔

ٹیڑھی کھیر سے مراد مشکل کام ہوا کرتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی ایک اندھے سے ایک شخص نے پوچھا حافظ جی! کھیر کھاؤ گے۔ نابینا نے دریافت کیا۔ کھیر کیسی ہوتی ہے جواب ملا۔ سفید۔ سفید۔ اندھے نے پوچھا سفید کیسی؟ اس نے کہا جیسے بگلا۔ اندھے نے مکرر پوچھا بگلا کیسے ہوتا ہے تو ظریف طبع شخص نے ہاتھ ٹیڑھا کر کے بتایا کہ ایسا۔ حافظ جی نے اپنے ہاتھ سے اس کے ہاتھ کو ٹٹول کر کہا یہ تو بڑی ٹیڑھی کھیر ہے ہم سے نہیں کھائی جائے گی۔

غت ربود کرنا

یعنی مطلب خبط کرنا۔ ایک بے وقوف بوستان پڑھ رہا تھا۔ جب سعدی کے اس شعر پر پہنچا ؎

کہ سعدی کہ گوئے بلاغت ربود ✤ در ایام بوبکر بن سعد بود

تو اپنے استاد سے دریافت کیا کہ غت ربود کے کیا معنی ہوئے۔ لفظ بلاغت میں سے بلا کو جدا کر کے غت کو ربود سے ملا کر غت ربود بنا دیا۔

ناؤ میں خاک اڑانا

یہ بھی ایک محاورہ ہے جس کا مطلب ہے جھوٹا الزام لگانا کہتے ہیں۔

ایک شیر اور بکری دونوں ایک کشتی میں سوار تھے۔ شیر نے بکری کو ہڑپ کرنے کے ارادے سے کہا تو یہاں کیوں خاک اڑا رہی ہے بکری نے جواب دیا۔ حضور یہاں کشتی میں خاک کہاں جسے اڑاؤں۔ شیر نے کہا اچھا تو میری بات کو جھٹلاتی ہے ٹھہر تجھے مزہ چکھاتا ہوں۔" یہ کہہ کر شیر بکری کو ہڑپ کر گیا۔

سید عباس بخاری پشاوری



غزل

سلامت اگر عشق ایذا طلب ہے، یہی رنج دائم رہے گا جو اب ہے،

بجا! خواہش دید بیجا ہے لیکن جو ہم جانتے ہیں وہ ہونا بھی کب ہے،

تغافل تجاہل سے آتا ہے عاجز مرا کچھ نہ کہنا بھی حسنِ طلب ہے،

تمہیں دیکھ کر مسکرا دینے والے محبت مسبّب، محبت سبب ہے،

تنعّم، تبسّم، تکلّم، ترنّم محبت! محبت کی دنیا عجب ہے،

وہی ہم وہی اضطراب جدائی سکونِ تمنا جب تھا نہ اب ہے،

یہی اختیاراتِ ہستی ہیں یارب؟ نہ مرنے پہ قدرت نہ جینے کا ڈھب ہے،

اٹھاتا ہوں روئے حقیقت سے پردہ

مری شاعری شادؔ جانِ ادب ہے،

شادؔ عارفی

رباعیات

(۱)

اردو نے کہا گلشنِ حالی ہوں میں
پوربی نے کہا پھولوں کی ڈالی ہوں میں
پنجاب ہنسا اور کہا ان سے آگے
حق یہ ہے کہ اس باغ کا مالی ہوں میں

(۲)

تو بغض کی آتش کو ڈبو دیتی ہے
تو زنگ کو آئینوں کے کھو دیتی ہے
اے ابرِ کرم سخن میں تو تیرا اقبال ہوں
تو تخم و بہ ہمیں کو سمو دیتی ہے

(۳)

سچ ہے کہ ہے اردو کی سہیلی ہندی
ساتھ اس کے ہمیشہ سے کھیلی ہندی
کس طرح نہ ہو اس سے زیادہ بھی
اردو سے پینگ کی ہے بیلی ہندی

(۴)

دنیا سے تو عیب اپنے چھپا لیتا ہوں
باتیں بھی میاں سب سے بنا لیتا ہوں
پر دل سے مری ناپاکی ظاہر جب ہے
آنکھ اپنی ندامت سے جھکا لیتا ہوں

اخگر مرادآبادی

دنیائے ادب

اردو زبان کی وسعت اور ہمہ گیری

(لکھنؤ سسلول کا نقطۂ نظر)

ابتداءِ وقت ہجری ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے آغاز سے لے کر غدر ۱۸۵۷ء تک دفاتر سرکاری میں فارسی بحیثیت زبان عدالت وحکومت بدستور رائج رہی۔ قوانین فارسی زبان میں تھے۔ فرامین واحکام فارسی میں جاری ہوتے تھے۔ انگریز حکام جو ہندوستان بھیجے جاتے تھے فارسی داں ہوتے تھے اور مقدمات کی تجاویز فارسی زبان میں لکھا کرتے تھے۔ اگر ایک طرف سنسکرت اور ہندی بھاشا کا دور دورہ تھا تو اس کے ساتھ دوسری طرف عربی اور فارسی کا بھی عام رواج تھا ہندو حضرات میں ایک سے ایک قابل اور یکتائے روزگار فارسی داں موجود تھے مسلمانوں میں بھی کوئی ایسا نہ تھا جسے ہندی بھاشا سے بیگانگی ہو۔ ہندوؤں میں بڑے بڑے قابل فخر فارسی ادیب اور مشاہیر پیدا ہوئے اور نام ونمود کے علاوہ شاہی دربار میں معزز اور ممتاز عہدوں پر سرفراز ہوتے رہے۔ مسلمانوں میں ہندی بھاشا میں کمال لازوال اور شہرت حاصل کرنے والے بھی معدوم نہ تھے۔

مسلمان فاتحین کی زبان مادری فارسی تھی۔ اسلامی فوج کی زبان مادری فارسی تھی۔ اردو کے معنی فوج یا لشکر ہیں۔ فوجی بازار کا نام اردو بازار تھا۔ آپ کے مشاہدے میں بارہا آچکا ہوگا کہ ہندوستانی تجارت پیشہ اور کاروباری افراد جنہیں گوروں کی فوج سے معاملت کا موقع حاصل ہوتا ہے اگرچہ وہ ایک حرف بھی انگریزی نہیں جانتے مگر کسی نہ کسی طرح کچھ انگریزی کچھ اردو الفاظ ملا کر اپنا مفہوم ادا کرلے جاتے ہیں۔ طالب العلمی کے زمانے میں اپنے کانوں سنا ہوا ایک امرود فروش اور ایک فوجی گورے کے مکالمے کا ایک فقرہ مجھے کبھی نہ بھولے گا۔ جو امرود فروش نے آخر دق ہو کر کہہ دیا تھا۔

" Two Pice 1 Take کھوسی ہو Take کھوسی ہونہ Take" اسی قبیل کے مخلوط اور بے ربط مکالمے اردو زبان کی تعمیر کے سنگِ بنیاد تھے جو فارسی اور ہندی بھاشا کے اختلاط سے عالم وجود میں آئے تھے لیکن اس سے کیا نتیجہ اخذ ہوتا ہے؟ خریداروں کی زبان فارسی تھی سودا بیچنے والوں کی زبان ہندی بھاشا تھی، ہندی بھاشا کو فارسی کے ساتھ مخلوط کر کے بولنے والا کون تھا! بلاشبہ ہندو۔ آخر نتیجہ یہی نکلا کہ اردو ہندوؤں کی زبان ہے نہ کہ مسلمانوں کی۔ اسی مخلوط زبان کا نام اردو یعنی افواج سے گفتگو کرنے کی زبان رکھا گیا اور آگے چل کر ہندو مسلمانوں کی مشترکہ مساعی جمیلہ سے اردو زبان بن گئی جو آج ہم آپ سب بولتے، لکھتے پڑھتے، اور سمجھتے ہیں۔

دنیا کی آبادی کا ہر حصہ جہاں ہندوستانی پہنچ گئے ہیں وہاں اُن کے ساتھ ہی ساتھ اردو زبان بھی گئی ہے۔ آپ لندن جائیں یا پیرس یا چین، جاپان، آسٹریلیا کی سیر کریں، ہر جگہ آپ کو کوئی نہ کوئی حصہ آبادی کا ایسا ضرور مل جائے گا جو یا تو اردو بول اور سمجھ سکتا ہوگا یا کم سے کم سمجھ ہی سکتا ہوگا انگلستان۔ امریکا اور فرانس میں اردو والوں کے مقابل میں فارسی دانوں کی تعداد بدرجہا کم نظر آئے گی۔ ایران اور افغانستان سے قطع نظر کر کے جہاں اول الذکر ملک میں سارے ملک کی زبان فارسی ہے اور آخر الذکر میں اعلیٰ اور تعلیم یافتہ طبقے کی زبان فارسی ہے۔ بقیہ اسلامی ممالک، سلطنت عثمانیہ، عرب، مصر میں فارسی کا رواج کم وبیش بدرجہ مساوی ہے یعنی کم سے کم ہے۔ بقیہ ساری دنیا کا اوسط لینے پر فارسی کے مقابلے میں کچھ عجب نہیں اگر اردو کا رواج زیادہ ثابت ہو سکے۔

اردو زبان کی ہمہ گیری کا تھوڑا بہت اندازہ اس سے بھی کیا جاسکے گا

کہ ابتدائے حکومت انگلشیہ سے آج تک کتنے اردو الفاظ انگریزی زبان میں داخل ہو کر جزو زبان بن چکے ہیں اور کتنے انگریزی الفاظ اردو زبان نے جذب کر لئے ہیں، جیسے

آبکاری۔ آہا (Aha) آیا۔ بابو۔ بہادر۔ بھتّا (Batta) بنگلا BUNGALOW کباب Cabab بیگم Begam بگھی Buggy کارواں Caravan عرق Arack جنگل Jungle

سیکڑوں انگریزی الفاظ تقریباً اپنی اصلی ہیئت میں اردو زبان میں موجود ہیں جو اردو زبان کا جزو بن چکے ہیں۔ مثلاً:۔

کلکٹر۔ کمشنر۔ اسسٹنٹ۔ ڈپٹی کلکٹر۔ ہیڈ کلرک۔ پولیس۔ انسپکٹر۔ میجر۔ سارجنٹ۔ جنرل۔ ڈرائیور۔ موٹر کار۔ لاری۔ سول سرجن۔ کمپاؤنڈر۔ پرسنل اسسٹنٹ۔ کمانڈر انچیف۔ گورنر۔ وائسرائے سول سروس۔ ریلوے۔ ٹائپ رائٹر۔ گراموفون۔ ریکارڈ۔ سینما۔ لکچر۔ رسٹ واچ۔ کلاک۔ بریک۔ جج۔ فاؤنٹین پن۔ بٹن۔ نب۔ ہک۔ ایکسرے۔ ہائی کورٹ۔ چیف کورٹ۔ پریوی کونسل۔ اپیل۔ ٹکٹ۔ سائنس۔ سول لسٹ۔ سائن بورڈ۔ گزٹ۔ گارڈ۔ پارسل۔ سرکلر۔ بائیسکل۔

اسی طرح سیکڑوں انگریزی الفاظ بدلی ہوئی صورت میں داخل زبان ہو چکے ہیں۔ مثلاً کپتان۔ لفٹنٹ۔ کرنیل۔ جرنیل۔ کارتوس[1]۔ لالٹین۔ الپین[2]۔ پارلیمنٹ۔ کمان افسر۔ بسکٹ۔ ٹماٹر۔ انجن۔ فری پان۔ ربڑ۔ تارپیڈو۔ اردلی۔ واسکٹ۔ باڈی Bodice وغیرہ۔

انگریزی الفاظ کا اردو ترجمہ ہو کر بہت سے الفاظ داخل زبان ہوئے ہیں۔ مثلاً مقیاس الحرارت، Thermometer آبدوز کشتی، Submarine طیارہ Aeroship کلدار توپ Machine Gun رکن، Member جارحانہ اور دفاعی حملے Offensive Defensive warfare بھک سے اڑ جانے والا مادہ، explosive آتشگیر مادہ Inflamable رائے Vote اسیر جنگ Prisoner of War مشقت تعزیری بحالت قید Penal servitude فوجی قسم، اقرار صالح Parole آلہ نشر الصوت، Radio set قرطاس ابیض، White Paper خوردبین Microscope دوربین، Telescope

کہا جاتا ہے کہ انگریزی، فارسی، عربی، ہندی بھاشا کے الفاظ بکثرت داخل کر لینے سے اردو زبان میں وسعت پیدا ہو جائے گی اور زبان ترقی کرے گی۔ ایک حد تک یہ خیال صحیح ثابت ہو سکتا ہے، بشرطیکہ توازن اور مذاق صحیح کی روشنی آغاز سے انجام تک ہماری راہ نما رہ سکے۔ ہر مہذب قوم اور ملک نے زبان کی ترقی کو قومی ترقی کا پیش خیمہ تسلیم کیا ہے اور اس کام کی اہمیت کا صحیح اندازہ کر کے قوم اور ملک کے بہترین تربیت یافتہ دماغوں کی متحدہ قوت سے کام لیا ہے۔ ہر غیر ذمہ دار اور بے شعور شخص یا ایسے دو چار، سو پچاس افراد کو سادہ چک دے دینے سے یہ کام کبھی نہیں بن سکتا بلکہ بگڑ جائے گا۔ مذاق صحیح، کہنے کو تو، ایک لفظ ہے مگر سمجھنے والے سمجھتے ہیں کہ اس کوزے میں دریا بند ہے۔ ظاہر ہے کہ جو کام ہمارے بہترین دماغوں کی متحدہ قوت سے کئے جانے کا ہے وہ کسی شخص واحد یا چند اوسط درجے کی معلومات رکھنے والے افراد کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہی ایک نکتہ ہے جو غور کرنے کے قابل ہے اور جس پر کافی توجہ نہیں کی جاتی۔

اسی طرح رائے ظاہر کی جاتی ہے کہ اردو زبان میں سلیس، سادہ عام فہم، روزمرہ کے الفاظ استعمال کئے جایا کریں۔ ہر سمجھ دار شخص تسلیم کرے گا کہ روزمرہ کی گفتگو اور خط و کتابت میں واقعی ایسے ہی الفاظ کا استعمال ہنر ہے اور اس کے برعکس ثقیل اور مشکل الفاظ کا استعمال جس طرح انگریزی یا فارسی زبان میں داخل عیب ہے اسی طرح اردو میں بھی ہے۔ مثال کے طور پر ایک سچا واقعہ عرض کروں گا۔

ایک عالم صاحب کا کمسن چھوٹا بھائی کئی روز سے بخار میں مبتلا

---

[1] یہ انگریزی نہیں ہے بلکہ ان لفظوں میں سے ہے جو ہمیں سترھویں اور اٹھارھویں صدی عیسوی میں فرانسیسیوں یا اس سے بھی پہلے پرتگالیوں سے ہاتھ آئے تھے۔ فرانسیسی cartouche (تلفظ، کارتوش، معروف و کے ساتھ) تھا جس کے ش کو ہندوستانی سپاہیوں نے س کر دیا۔ اسی طرح فرانسیسی Commandant (تلفظ، کوماں داں) ہمارے ہاں "کمیدان" ہوا اور فرانسیسی bouton (تلفظ: بوتوں، پہلا و معروف، دوسرا مجہول) ہمارا "بوتام" ہو گیا۔ انگریزی لفظوں کمان ڈنٹ، اور بٹن سے "کمیدان" اور "بوتام" کو کوئی واسطہ نہیں۔ (ادارہ)

[2] یہ لفظ پرتگالی alfinete سے ہے۔ انگریزی pin سے اسے تعلق نہیں۔ (ادارہ)

تھا۔ مریض کی والدہ تیمارداری میں مصروف تھیں۔ مریض نے پانی مانگا۔ بیٹی کے پاس لوٹا رکھا ہوا تھا۔ بڑی بیگم سے پانی انڈیل کر پیش کرنا چاہا۔ عالم صاحب گھبرا کر چلا اُٹھے۔

"تپ کی حالت میں استعمال ماء بارد تمام اطبا کے نزدیک ممنوع ہے"۔ بیگم حیران تھیں کہ کیا کہا گیا۔ حسن اتفاق سے عالم صاحب کے دوسرے بھائی وہیں موجود تھے۔ سمجھا دیا کہ بخار میں ٹھنڈا پانی منع ہے اور یہ واقعہ ایک قہقہے پر ختم ہو گیا۔

سلیس اردو نظم نے زمانہ حال میں دو بیش بہا اور لافانی کارنامے دنیائے ادب میں پیش کئے ہیں۔ پہلی چیز جناب آرزو کی خالص اردو شاعری ہے اور دوسری جناب شوق قدوائی مرحوم کی بے اضافت نظم "عالم خیال" ہے ان دونوں کارناموں پر اردو زبان جتنا فخر کرے کم ہے

دراصل شدید ضرورت اس امر کی ہے کہ بول چال، خط و کتابت قصے کہانیاں، ناول اور افسانے دونوں زبانوں اردو اور ہندی میں ایسی آسان اور سادہ عبارت میں لکھے جائیں کہ بے تکلف محض صورت الفاظ بدل دینے سے اردو دوشیزہ کے جامہ زیب قد و قامت پر ہندی حروف کا لباس موزوں اور دلکش نظر آئے اور ہندی معشوقہ کی نازنینی پر اردو الفاظ کا جامہ بار خاطر نہ ہو۔ لیکن یہ انتہائی حد ہے جس سے آگے قدم رکھنا اگر غیر ممکن نہیں تو سخت دشوار ضرور ہے۔ مثال کے طور پر انگریزی، فارسی، عربی، سنسکرت زبانوں سے علمی کتابوں کے ترجمہ کرنے کے کام پر نظر ڈالئے۔ فلسفہ، طب، منطق، علم اقتصاد، نجوم، ریاضی، وغیرہ علوم کی مستند کتابوں کے ترجمے پیش نظر فرمائیے۔ میں بلا خوف تردید عرض کر سکتا ہوں کہ اس میدان میں نہ خالص سلیس عام فہم اردو کے ذخیرے میں ایسے الفاظ کا ہونا ممکن ہے اور نہ خالص ہندی کے ذخیرے میں مجبوراً ہندی کو مشکل پسند بھاشا اور سنسکرت سے مدد لینا پڑے گی۔ اور اردو کو فارسی عربی سے، اور یہ موقع شکایت کا بھی نہیں ہو سکتا۔ عوام الناس بے علم یا کم علم طبقے کو ان علوم سے کوئی سروکار نہ کبھی تھا نہ آج ہے، اور نہ آیندہ ہو سکتا ہے۔ یہ اہل علم کے کام کی چیزیں ہیں اور وہ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ یہ مشکل پسندی بے ضرورت اور عمداً نہیں روا رکھی گئی، بلکہ ہم مجبور تھے، اور سوا اس صورت کے کوئی دوسرا چارۂ کار تھا ہی نہیں۔

نظر بحالات موجودہ زبان کی ترقی، ترویج، اور اشاعت کے ذرائع شعبہ جات ذیل کی ہم آہنگی اور استحاد عمل پر تمام تر موقوف ہیں۔

(۱) علمی مرکز کا صحیح انتخاب اور اس کا اتباع۔
(۲) مدارس، اسکول، کالج، یونیورسٹیاں۔
(۳) کتابیں جن میں تالیفات و تصنیفات نظم و نثر شامل ہیں۔
(۴) میگزین، اخبار۔
(۵) ریڈنگ روم اور کتب خانے۔
(۶) اکیڈیمی۔
(۷) علمی انجمنیں، کانفرنسیں، بڑی بڑی قومی اور ملکی مجالس۔
(۸) مشاعرے۔
(۹) مسلسل، باقاعدہ، بے لوث تنقید۔

ان تمام شعبوں کی جان علمی مرکز، اس کا صحیح انتخاب اور کامل اتباع ہے۔

مشکلات: اگرچہ ولی دکنی اردو شاعری کے چاسر تھے لیکن بلاشبہ اردو کی جائے پیدائش دہلی تھی۔ اردو دہلی میں پیدا ہوئی اور وہیں ہوش سنبھالا لیکن اس کا شباب اُس کی جوانی اس کی ترقی اُس کی نشو و نما لکھنؤ ہی میں ہوئی۔ اس اجمال کی تفصیل آگے عرض کروں گا۔ یہاں اسی قدر عرض کرنا کافی ہے کہ اردو ممالک متحدہ کے ہندو مسلمانوں کی مادری زبان ہے اور جتنی صاف صحیح اور شستہ اردو اس صوبے میں رائج ہے ہندوستان کے کسی دوسرے حصے میں نہیں ہے۔ خواہ وہ دہلی ہو یا پنجاب یا حیدرآباد دکن۔ ہندوستان کا ملک، ملک نہیں ایک براعظم ہے۔ ایسی حالت میں کچھ عجب نہیں اگر ہر صوبے بلکہ جزو صوبہ کا لب و لہجہ ایک دوسرے سے مختلف ہو، زبان اور طرز ادا میں فرق ہو۔ ان حالات کے اندر شدید ضرورت اس امر کی ہے کہ زبان کو اپنی اصلی صورت میں قائم رکھنے اور سارے ملک میں اتحاد عمل جاری رکھنے کے لئے ہم ایک صحیح اور بہترین علمی مرکز تجویز کر لیں اور جو مرکزی حیثیت ادبی اعتبار سے انگلستان میں آکسفورڈ کو حاصل ہے وہی حیثیت ہمارے منتخب کردہ مرکز کو حاصل ہو جائے اگر ہم یہ نہ کریں گے تو اس کا نتیجہ انتشار ہوگا، اور اردو زبان کے لئے سم قاتل ہوگا۔ پنجابی اردو، حیدرآبادی اردو کا حال دیکھئے اور غور فرمائیے کہ آخر اس کا کیا انجام ہونے والا ہے۔ ہمیں مرکز کے انتخاب میں زیادہ زحمت اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ قدرت نے لکھنؤ کو پہلے ہی سے اردو زبان

کامرکز بنا رکھا ہے۔ ہمارا کام محض اتنا ہی ہے کہ زبان اور محاورے کے معاملے میں لکھنؤ کا اتباع اختیار کر لیں۔ اگر ہم ایسا نہ کریں گے تو پنجابی اردو پنجاب سے نکلے گی۔ حیدرآبادی اردو حیدرآباد سے اور دہلی کی اردو دہلی سے اور ایک زندہ اور ترقی کرنے والی زبان کے لئے جس ہم آہنگی اور یکسانی کی ضرورت شدید ہے وہ ہمیشہ کے لئے ہاتھ سے جاتی رہے گی، اور زبان کی نام نہاد ترقی دراصل زبان کا تنزل ثابت ہوگی۔

ہمیں واقعات کی روشنی میں اس اہم مسئلے پر نظر ڈالنا ہے اور واقعات یہ ہیں۔

مشکلات اور ان کا علاج اس میں شک نہیں کہ اردو کی تمام ابتدائی نشوونما دہلی میں ہوئی اور دہلی کے آخری اسلامی تاجدار بہادر شاہ "ظفر" کی سلطنت کا خاتمہ دراصل دہلی میں اردو زبان کی ترقی کا خاتمہ تھا۔ دہلی پر زوال آیا۔ لکھنؤ کی ترقی کا ستارہ آسمانِ اقبال پر طلوع ہوا۔ شاہانِ اودھ کی غرباپروری عدل گستری، سیرچشمی، فیاضی، سخاوت، علم دوستی، ادب نوازی کا شہرہ دور دراز تک پہنچا۔ دہلی کے باکمال مشاہیر، ہر علم ہر فن کے اساتذہ جوق درجوق لکھنؤ آنا شروع ہوگئے۔ دہلی اجڑ گئی لکھنؤ بس گیا۔

لکھنؤ پہنچ کر اردو زبان نے دن دونی رات چوگنی ترقی شروع کر دی۔ حتیٰ کہ مرحوم بہادر شاہ کے زمانے کی اردو اور آج کی اردو میں جتنا بین فرق ہے اہل نظر پر روشن ہے۔ بدقسمتی سے دہلی والے اپنی اسی پرانی کرم خوردہ "قلعۂ دہلی" کی زبان کے دائرے کے اندر مقید رہ گئے۔ انہوں نے اس طلسمی حصار کے باہر قدم رکھنا کفر سمجھا ہمیشہ اپنی زبان کو مستند زبان سمجھتے رہے اور آج بھی یہی سمجھ رہے ہیں۔

وہ آنکھیں کھول کر دیکھنا پسند نہیں کرتے کہ زمانہ حال کی مروجہ انگریزی ملکہ وکٹوریہ کے زمانے کی انگریزی سے کتنی مختلف ہے۔ وہ سننا نہیں پسند کرتے کہ اٹلی میں لاطینی زبان کی جگہ مروجہ اطالینی زبان نے لے لی ہے۔ وہ نہیں سوچتے کہ گلستاں بوستان والی فارسی اب ایران میں نہ کوئی لکھتا ہے، نہ بولتا ہے، نہ سمجھنا چاہتا ہے۔ کیا اردو بھی کوئی مردہ زبان تھی جو کم وبیش ایک صدی گزر جانے پر بھی قلعۂ معلّٰی کی بوسیدہ چار دیواری کے اندر قیامت تک مقید رہتی اور ایک قدم بھی آگے نہ بڑھتی! آخر کس ناقابل معافی جرم کی پاداش میں اس کے لئے یہ حبس دوام کی سزا تجویز فرمائی گئی تھی؟

لکھنؤ اسکول نے شاہ راہ ترقی پر گھڑ دوڑ شروع کی۔ دہلی نے اس دوڑ میں کوئی حصہ نہیں لیا اور اسی قدیم حصار "قلعۂ معلّٰی" کی حدود کے اندر اطمینان سے بیٹھ کر پرانی لکیر پیٹتی رہی اور آج اسے یہ روز بد دیکھنا نصیب ہوا کہ دہلی کو اب تک خبر بھی نہیں ہے کہ بیسویں صدی اپنا پہلا ربع ختم کر کے دوسرے ربع کی گیارھویں منزل پر بسرعت تمام گامزن ہے حتیٰ کہ یکم جنوری ۱۹۳۷ء سے اس دوسرے ربع کی بارھویں منزل میں قدم رکھ چکی ہے۔ مگر اہل دہلی ابھی تک اسی پرانی انیسویں صدی کی تقویم پارینہ کے پرستار ہیں اور اپنے زعم باطل میں نہ محض ادیب بلکہ دنیائے ادب کے رہبر، مقتدی، ہادی اور پیش امام بنے بیٹھے رہ گئے اور آج دہلی اسکول کی زبان کو لکھنؤ اسکول کی زبان سے وہی نسبت ہے جو ملکہ معظمہ وکٹوریہ کے زمانے کی انگریزی کو شاہ جارج ششم کے زمانے کی انگریزی سے نسبت ہے یا جو نسبت سعدی شیرازی کے زمانے کی فارسی کو رضا شاہ پہلوی کے زمانے کی فارسی سے ہے[1] کاش مجھے کافی وقت ملا ہوتا اور میں اس اجمال کی تفصیل کر سکتا۔

واقعہ یہ ہے کہ دہلی اسکول نے مطلق ترقی نہیں کی۔ اس نے زمانے کا ساتھ چھوڑا۔ زمانے نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ فطرت کا اٹل قانون ہے کہ قوی ترین، مستعد ترین، تندرست ترین ہستی زندہ رہ سکتی ہے جو ہستی اس شدید ترین معیار کی رفعت تک پہنچنے کے قابل ثابت نہ ہوگی اسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ دہلی کی زبان اس قانون کی زد کے اندر آ گئی تھی۔ زمانے نے اس زبان کو مردہ زبانوں کی فہرست میں داخل کر دیا۔ دہلی کے نصیب میں پھر دارالحکومت بننا تھا۔ وہ پھر ہندوستان کا پایۂ تخت بنی۔ تجارتی منڈی تو تھی ہی تجارت کو اور بھی فروغ ہوا۔ تجارت اپنے ساتھ ساتھ تجارت پیشہ افراد کی ایک مخلوط فوج لائی جس نے دہلی کا محاصرہ کر لیا۔ دہلی اس کثیر التعداد فوج کا مقابلہ کیوں کر کر سکتی تھی۔ ایک مدت مدید تک محصور رہی لیکن تابکے! اس کے تمام ترضروریاتِ زندگی پر محاصرین قابض تھے اور وہ اُن کی محتاج تھی۔ آخر اُسے ہتھیار ڈالنا پڑے اور آج یہ صورت حال ہے کہ اگر آپ چاندنی چوک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک ایک دکان کا جائزہ لینا شروع کر دیں

---

[1] یہ مسئلہ اس آسانی سے طے ہوتے نظر نہیں آتا۔ اس ساری تقریر میں جہاں جہاں دہلی کا نام ہے، وہاں لاہور اور حیدرآباد والے دہلی کے ساتھ لکھنؤ کا نام شامل کر کے اسے اپنے دعوے کی دلیل بنائیں گے۔ (ادارہ)

واٹپ دیکھیں گے کہ اس مخلوط مردم شماری میں کم وبیش نصف تو نیم تعلیم یافتہ اہلِ پنجاب ہیں اور باقی نصف میں ممالکِ متحدہ کے مختلف شہروں اور دیہاتوں کے قریب قریب جاہل حرف شناس قابض ہیں اور سڑکوں کا بھی یہی حال ہے۔ سڑکوں کے بعد شہر کے اندر کی آبادی میں بھی علیٰ ہذاالقیاس انہیں دکانداروں کے مسکن ہیں۔ خالص دہلی کے قدیم باشندے اس مخلوط آبادی کے ساتھ وہی نسبت رکھتے ہیں جو نمک کو دال کے ساتھ یا سفیدی کو ہرے ماش کے ساتھ ہوسکتی ہے اور آج جس کا نام دہلی کی زبان ہے۔ اسی مخلوط آبادی کی زبان ہے۔ میں نہیں کہتا کہ دہلی میں زبان داں نہیں ہیں، لیکن جو حضرات اہلِ زبان کہے جاتے ہیں ان کی زبان آخر کتنی مدت تک صحیح اور درست رہ سکتی ہے جب دن رات ان کے کانوں میں غلط اور بے محاورہ زبان گونجتی رہتی ہو۔ مسٹر اسٹد آنجہانی نے جو اپنے زمانے کے ممتاز ترین ادیب اور انگلستان کے مایۂ ناز مشاہیر میں تھے، آج سے کم وبیش چالیس برس پہلے اپنے شہرۂ آفاق "ریویو آف ریویوز" میں فریاد کی تھی کہ اب عمائدِ لندن ایسی انگریزی بولنا شروع کر رہے ہیں جسے گورے حبشیوں کی زبان کہنا بے جا نہ ہوگا۔ اِن کا نوحہ تھا کہ بے شمار غیر ملکی افراد لندن میں ہمہ وقت موجود رہتے ہیں اور اُن کی غلط اور بے محاورہ زبان دن رات ہمارے دل ودماغ کا محاصرہ کئے رہتی ہے، حتیٰ کہ جو زبان ہم ہر وقت سنتے رہتے ہیں رفتہ رفتہ وہی ہم بھی بولنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ قیاسات نہیں ہیں، واقعات ہیں۔ انسانی فطرت جو لندن میں کارفرما ہے دہلی میں بھی ہے۔ اگر لندن کی زبان گورے حبشیوں کی تھی تو ہر شخص جسے شعور ہے اور جسے اللہ نے مذاقِ صحیح عطا فرمایا ہے آنکھیں کھول کے دیکھ سکتا ہے کہ زمانۂ حال کی دہلی کی زبان کالے حبشیوں کی زبان ہے! کاش مجھے کافی وقت ملا ہوتا اور مشاہیرِ دہلی کی مطبوعہ تحریرات کے نمونے اپنے دعوے کی دلیل میں پیش کرسکتا۔

اِن حالات کے اندر کون امید رکھ سکتا ہے کہ متبعین دہلی کی زبان لکھنؤ کے مستند اہلِ زبان کے دربار میں شرفِ قبولیت حاصل کرسکتی ہو۔ متبعین دہلی نے اُسی زبان میں نظم ونثر لکھنا اختیار کر دیا جو زمانۂ حال کی مروجہ اور ترقی یافتہ زبان سے بالکل مختلف تھی۔ شعرا نے فخریہ اپنا کلام داد پانے کے شوق میں پیش کیا۔ مولانا اودھ پنچ نے جائزہ لینا شروع کر دیا۔ سچی بات ہمیشہ کڑوی ہوتی ہے۔ اختلاف پیدا ہوا۔ اختلاف نے ترقی کر کے بغض وعناد کی خبیث صورت اختیار کی اور بیرونجات کے ناواقف شعرا کی، جو زبان اور محاورے سے اجنبی تھے، ایک مخالف پارٹی تیار ہوگئی جسے لکھنؤ کی زبان، لکھنؤ کی شاعری، اور لکھنؤ سے بغض للّٰہی پیدا ہوگیا ہے اور جو جا وبے جا برمحل اور بے محل آفتاب پر خاک ڈالنے کی سعیٔ لاحاصل میں منہمک ہو رہی ہے۔ یہ پہلی مشکل ہے۔

دوسری مشکل یہ ہے کہ ٹکسٹ بک کمیٹیاں درسی کتابوں کے انتخاب میں سخت بے پروائی سے کام لے رہی ہیں۔ اور کتب مشروطۂ امتحان رائج الوقت میں سے شاید ہی کوئی ایسی اردو کتاب دستیاب ہوسکے جو عیوب اور نقائص سے پاک اور ہر صورت میں قابلِ سند ہو۔ وجہ یہ ہے کہ طریقِ انتخاب غلط ہے۔ پبلشر پر سارا دارومدار رکھ دیا گیا ہے۔ پبلشر عموماً زبان اور ادب کے معاملے میں مذاقِ صحیح نہیں رکھتے۔ محض ایک ہی مقصد اُن کے پیشِ نظر ہوسکتا ہے اور ہے، یعنی روپیہ کمانا۔ وہ کسی نہ کسی بازاری آدمی کو پکڑ لاتے ہیں جو اردو میں تھوڑی بہت شدبد رکھتا ہو۔ یہ شخص اپنی، اپنے عزیزوں، اپنے دوستوں کی بے مغز بکواس منتخب کرکے پیش کر دیتا ہے یا خود مذاقِ صحیح سے اجنبی محض ہونے کی وجہ سے کانٹ چھانٹ کرا کے اپنے آپ کو پانچوں سواروں میں داخل کر لیتا ہے۔ جب تک پبلشروں کے ہاتھ میں انتخاب کی کل ہے، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ اونٹ کس کل بیٹھے گا۔ فقیر کے نزدیک اصلاح کی بہترین صورت یہ ہوسکتی ہے کہ ٹکسٹ بک کمیٹی میں ایسے لوگ شامل کئے جائیں جو اردو زبان میں نیک وبد کی بخوبی تمام تمیز کرسکتے ہوں، اور بجائے ایک نیم تربیت یافتہ پبلشر کے چند مستند ادیب حضرات کی کمیٹی بنا دی جائے جو انتخاب کیا کرے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کمیٹی کا ہر سال نیا انتخاب ہوا کرے۔

تیسری مشکل جو اردو کی ترقی میں سدِ راہ ہے وہ اسکول اور کالجوں کے لئے اساتذہ اردو کے قواعدِ انتخاب ہیں۔

کالجوں کے لئے اردو کی ایم اے کی ڈگری لکچرار کے عہدے کے لئے پروانۂ راہ داری ہے میں تسلیم کرتا ہوں کہ اگر ان طلبہ کو علمی تحقیقات (ریسرچ) کی قرار واقعی تربیت دی جائے تو نہایت بیش قیمت سمجھی جاسکتی ہے، لیکن کتنے طلبہ کو ایسی مکمل تربیت دی جاتی ہے؟ اور کب اور کہاں دی جاتی ہے! تھوڑی دیر کے لئے ہم تسلیم کئے لیتے ہیں کہ دی جاتی ہے۔ بہت بہتر، مگر ذرا غور تو فرمائیے کہ جو شخص زبان اور ادب میں بالکل ہی کورا ہو، جو مذاقِ صحیح سے کوسوں دور ہو ایسے شخص کو ایسی تعلیم کہاں تک اور کس حد تک فائدہ پہنچا سکتی ہے؟ اور وہ اپنے تلامذہ کو بامِ ہوش سے

کس کنگرے تک پہنچا سکے گا؟ عقل کی بات تو یہ تھی کو بجائے ایم اے کی ڈگری کے اردو زبان کی مسلمہ استعداد کی شرط رکھی جاتی اور اسی کے ساتھ انگریزی استعداد بھی مشروط رہتی۔ اردو ایم اے نہ تو اردو ہی جانتا ہے نہ انگریزی ہی۔ اس کی ساری کائنات اس کا ڈپلوما اور گون ہے۔ نہ وہ انگریزی میں کوئی اعلیٰ درجے کا مضمون لکھ سکتا ہے نہ اردو ہی میں۔ وہ اردو دانوں کی صحبت میں انگریزی دانی کی اور انگریزی دانوں کی صحبت میں اردو دانی کی داد پا جاتا ہے اور یہی اس کی روح کی غذا ہے۔

اس کے علاوہ جو لوگ زبان اردو سے اجنبی اور نابلد محض ہیں اُن کا ایک عام حیلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ زبان دہلی جانتے ہیں جس کے معنی دوسرے الفاظ میں صرف یہی ہو سکتے ہیں کہ وہ اردو جانتے ہی نہیں۔

اساتذہ کے انتخاب میں نہایت ضروری امر یہ ہے کہ استاد زبان لکھنؤ میں کامل دستگاہ رکھتا ہو تا کہ قدیم اساتذۂ دہلی کی تصانیف پر لکچر دیتے وقت وہ تلامذہ کو سمجھا سکے کہ جو فقرہ کتاب میں زبان دہلی میں ادا کیا گیا ہے اگر یہی لکھنؤ کی زبان میں ادا کیا گیا ہوتا تو کیوں کر ادا کیا گیا ہوتا۔ اگر استاد اتنی قابلیت بھی نہیں رکھتا ہے تو وہ نہ اردو جانتا ہے اور نہ اس قابل ہے کہ اردو کا معلم مقرر کیا جائے۔

صحیح اور مستند زبان ملک میں رائج کرنے کی راہ میں سب سے پہلی منزل یہ ہے کہ لکھنؤ کی مرکزیت تسلیم کر لی جائے اور زبان لکھنؤ کا اتباع فوراً کر دیا جائے۔ ہمارے بچوں کو صحیح اور بامحاورہ زبان سکھانے کے لئے اگر ایسے اطراف کے اساتذہ مقرر کئے جائیں جو لکھنؤ کی زبان یعنی صحیح اور بامحاورہ اردو سے واقف نہ ہوں، تو ان کے لئے جس طرح طریق تعلیم سکھانے کے علحدہ مدارس کھولے گئے ہیں جہاں تعلیم حاصل کر لینے پر .C. T اور .B. T کی اسناد دی جاتی ہیں اسی طرح اس مرکزی تعلیم کی اسناد بھی دی جایا کریں اور جب تک کسی اردو سکھانے والے کے پاس ایسی سند نہ ہو اُسے کوئی مستقل جگہ اردو پڑھانے کے لئے نہ دی جایا کرے۔

زبان ترقی نہیں کر سکتی جب تک مسلسل باقاعدہ اور منضبط طریقے پر ایک تنقید کا شعبہ قایم نہ کیا جائے۔ نقادانِ فن کا ایک طبقہ نہ قایم کیا جائے جو ایمان اور انصاف سے حق بات کہنے پر ہمیشہ آمادہ اور مستعد رہیں، جو نہ کسی سے رنج، کاوش، بغض، عناد رکھتے ہوں، نہ ملاقات، دوستانہ مراسم یا دوستوں کی سعی و سفارش پر کسی کی بے جا پاسداری یا رعایت کر سکتے ہوں، جن کا قول قولِ فیصل ہو جو ہر واقعی اچھی کتاب کے مصنف یا اچھے اخبار یا رسالے کے ایڈیٹر کا دل بڑھائیں۔ جن کے قلم کے خوف سے لغو، بے ربط، اخلاق پر برا اثر ڈالنے والی تصانیف کا سد باب ہو سکے ایسی کتابیں جیسی انگریزی زبان میں KING'S ENGLISH ہے یا ایسے رسالے جیسا BLACKWOOD MAGAZINE یا Literary Digest London ہے، عالم وجود میں آئیں۔ انگریزی ضرب المثل ہے کہ سلطنت روما ایک ہی دن کے قلیل عرصے میں پوری نشو و نما پر نہیں پہنچی تھی۔ یہ کام صبر اور استقلال کا ہے۔ آج ہی تکمیل نہیں پا سکتا:۔

ع۔ عمرے باید کہ یار آید بکنار

لیکن نیک کام کو شروع کر دینا ہی کامیابی کی منزل پر پہلا قدم رکھنا ہے۔ لکھنؤ کی فرح بخش فضا اس کام کے لئے بے حد موزوں ہے۔ الحمد للہ کہ جو پودا جناب سجاد حسین صاحب مرحوم لکھنؤ میں نصب کر گئے تھے اور جو انہیں کے عالم حیات میں بخوبی تمام بار آور ہو چکا تھا اُس کی آبیاری جناب حکیم ممتاز حسین عثمانی صاحب مرحوم نے نہایت ہی نمایاں اور شاندار کامیابی کے ساتھ کی۔ زمانے کے ظالم ہاتھ نے ہمیں اُن سے جدا کر دیا اور اُن کی جدائی نے ادب اردو کو جو ناقابل تلافی صدمہ پہنچایا ہے اس کا داغ ساری عمر ہمارے قلوب سے مٹ نہیں سکتا۔ جناب عثمانی اگرچہ ہم میں آج موجود نہیں ہیں لیکن اُن کا لافانی کارنامہ اودھ پنچ فضل الٰہی سے اب تک زندہ ہے ہمیں اودھ پنچ کے بازوؤں میں قوت پہنچانا ہے۔ شکر ہے کہ لکھنؤ میں آج بھی بڑے بڑے باکمال ادیب اور اہل فن موجود ہیں۔ ایک دو ہوں تو نام بتائے جائیں۔ دو چار بزرگوں کے نام لینے سے باقی اہل کمال کا نام ترک کر دینا ترک ادب ہے۔ ایک طرف اودھ پنچ اپنا فرض ادا کرے گا۔ دوسری جانب ہم اکیڈیمی سے اور اسی طرح جناب منشی دیا نرائن صاحب نگم اور جناب اڈیٹر صاحب الناظر سے درخواست کریں گے کہ اپنے اپنے رسالوں میں ادبی تنقیدات کے لئے چند صفحات مخصوص فرما دیں۔ یہ ابتدا کوئی بری ابتدا نہیں کہی جا سکے گی۔

مجھے امید ہے کہ اردو زبان کی یہ مشکلات ہماری متحدہ قوت اور سرگرمیوں سے رفتہ رفتہ حل ہو جائیں گی۔ دنیا میں کوئی کام ایسا نہیں ہے جس کے انجام دینے کے لئے مشکلات سے مقابلہ نہ کرنا پڑتا ہو۔ جو کام جتنا اہم ہو گا ہو گا مشکلات اتنی ہی شدید ہوں گی۔ تجربہ یہی سبق دے رہا ہے۔ ہمیں ہمت نہ ہارنا چاہئے۔ کسی قوم یا کسی فرد واحد کی بے لوث اور پر خلوص محنت کبھی رائگاں نہیں ہوتی اور ہمیں قوی امید ہے کہ ہماری محنت بھی رائگاں نہ ہو گی۔

"ہندوستانی"

اظہر علی آزاد

محبت اور امید

(ٹامس مور کی ایک نظم کا ترجمہ)

سمندر کے ساحل پہ صبحِ بہار بجاتی تھی کرنوں کا زرّیں ستار
نمایاں ہوئے یک بیک بادباں سمندر میں تھی ایک کشتی رواں
جہاں غرق تھا نورِ خورشید میں محبت تھی آغوشِ اُمید میں
چمکتی ہوئی جگمگاتی ہوئی ستاروں سے آنکھیں لڑاتی ہوئی
محبت اُٹھی مسکراتی ہوئی تبسم کی بجلی گراتی ہوئی
یہ دولت کی تھی کشتیٔ زرفشاں مگر اس میں نورِ محبت کہاں

اٹھی اور کشتی پہ ہو کر سوار یہ بولی کہ ہمراہِ موجِ بہار
سنہری جزیروں کو جاتی ہوں میں ابھی شام تک لوٹ آتی ہوں میں

نظر آیا ایک اور اُس کو جہاز کہ تھی دوستی جس میں سرگرمِ ناز
لئے ہاتھ میں شمعِ عالم فروز سکھاتی تھی وہ شیوۂ ساز و سوز
مگر اس میں اُلفت کی رنگت نہ تھی محبت کی اس میں حرارت نہ تھی

فریبِ تبسم میں آئی اُمید زباں پر شکایت نہ لائی اُمید
رہا اس کو دن بھر فقط ایک کام کہ لکھتی رہی ریت پر اُس کا نام
کبھی لہر جس کو بہا لے گئی کبھی موجِ صرصر اڑا لے گئی

اسی شغل میں ہو گیا دن تمام سمندر پہ لہرا گئی زلفِ شام
ہوئے بحر و بر تیرگی میں نہاں نہ آیا نظر پھر کوئی بادباں

ہوا روز امید یوں ہی بسر
محبّت پلٹ کر نہ آئی مگر

حسرت کاشمیری

"شیرازہ"

نقد و نظر

ایک مفید علمی خدمت

دنیائے نشر و اشاعت و ترویج علوم و فنون میں جتنی گراں بہا خدمات تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور نے سر انجام دی ہیں ہندوستان میں بہت کم اداروں نے کی ہیں۔ ادارہ مذکور اپنے صاف لین دین۔ نفاستِ کام۔ پابندیٔ اوقات اور دیگر بہترین تجارتی خصوصیات کی بنا پر شہرۂ آفاق حیثیت حاصل کر چکا ہے۔ اشاعتِ قرآن کریم کے ساتھ ادارہ ہٰذا کی طرف سے دورِ حاضرہ کے بلند پایہ ادبا کی تصانیف کے علاوہ چوٹی کے شاعروں کا کلام بھی شائع کیا گیا ہے۔ غرضیکہ لٹریچر کی ترویج و اشاعت کے لئے کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا گیا۔

بد قسمتی سے ہندوستان میں مالی مشکلات کی بنا پر علم دوست و ادب نواز طبقہ فراخ دلی سے اپنے ذوق کی تکمیل کے لئے . . . . روپیہ خرچ نہیں کر سکتا۔ اس وجہ سے ہزارہا تعلیم یافتہ حضرات اپنی تشنگیٔ ذوق کو فرو نہیں کر سکتے۔

یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور نے ان مشکلات کا ازالہ کرنے کی غرض سے کتابیں قسطوں پر مہیا کرنے کی ایک سکیم جاری کی ہے۔ انگریزی پبلشرز کی مشہور فرمیں اس طریق پر عمل پیرا ہو کر اپنے خریداروں کو کتابیں منگوانے میں سہولتیں دے رہی ہیں۔ ہندوستان میں تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور کا یہ اقدام ادب نواز طبقے کی تشنگیٔ ذوق کی تسکین کے لئے بہترین تجویز ہے۔ اس طرح ان اصحاب کو بھی بہترین کتابوں سے مستفید ہونے کا موقع ملے گا۔ جو یک مشت ساری قیمت نہیں ادا کر سکتے۔ اشد ضرورت ہے کہ مصنفوں کو ان کی کوششوں کی صحیح قیمت ادا کرنے کے لئے اور ترویج علوم و فنون کے لئے علم دوست طبقہ تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور کی اس سکیم سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائے۔

اس سکیم کی باقاعدہ تفصیلات دی تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور سے طلب فرمائیں

لاہور میں صنعتی نمائش

ڈائرکٹر صاحب محکمہ انڈسٹریز (صنعت و حرفت) کی طرف سے ہمیں ایک خوبصورت پمفلٹ موصول ہوا ہے جس میں آیندہ دسمبر میں منعقد ہونے والی صنعتی نمائش کی تفاصیل دی گئی ہیں۔ پمفلٹ کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ حکومت پنجاب دسمبر کے آغاز سے جنوری ۳۹ء کے تیسرے ہفتہ تک منٹو پارک لاہور میں ایک عظیم الشان نمائش منعقد کرے گی جس میں ہندوستان بھر کی صنعت و حرفت۔ زراعت اور تجارت کے کاریگری اور مصوری کے بیش بہا نمونے دکھلائے جائیں گے۔ اور جو جو ترقیاں ان مختلف شعبوں میں ہوئی ہیں انہیں منظر عام پر لایا جائے گا۔ تاکہ ملکی صنعت اور کاروبار اور زراعت کو مزید تقویت پہنچے اور ناظرین جو جو اچھی باتیں یہاں سے دیکھ کر جائیں۔ انہیں اپنے اپنے حلقۂ عمل میں رائج کریں۔ نمائش میں تفریح اور کھیلوں کا بھی خاص اہتمام کیا جائے گا اور دوکانداروں کو ان کے مال کی فروخت اور شہرت دینے میں بہت مدد دی جائے گی۔ مفصل حالات ادبی دنیا کا حوالہ دے کر سکرٹری صاحب آل انڈیا نمائش لاہور سے دریافت کریں۔

ادارہ

تصحیح

ادبی دنیا کی اشاعت گذشتہ میں میسرز بجاج ٹریڈنگ کمپنی رتن چند روڈ امرتسر کے اشتہار میں غلطی سے ایک لفظ پٹاخوں کی بجائے چھرے لکھا گیا ہے۔ صحیح الفاظ یہ ہیں

"فالتو پٹاخے ایک روپیہ فی سینکڑہ" ناظرین کرام تصحیح فرمالیں۔

جوہر وسمہ مہندی کی مقبولیت

دنیا کی متفقہ رائے کا خلاصہ

سفید بالوں کو سیاہ کرنیوالا نایاب تحفہ

اِس ایجاد کی صداقت کو دُنیا مان گئی ہے

معززین کی رائے

اخبار شیعہ لاہور جوہر وسمہ مہندی رجسٹرڈ کی ایک صد شیشی ہمارے دفتر میں برائے ریویو موصول ہوئی۔ جس نے اس کو ایک بار کے سفید بالوں پر غور کیا آناً فاناً اس کے بال سفید بغیر کسی تکلیف کے قدرتی سیاہ ہو گئے۔

صوفی اینڈ کو رجسٹرڈ راولپنڈی نے وقت کی قدر و قیمت کو مدِنظر رکھتے ہوئے ایک ایسا جوہر تیار کیا ہے کہ آپ وسمہ مہندی لگا کر ضعف دماغ و نگاہ کی تمام دقتوں کو رفع کر لیتے ہیں۔ اور مضر سامان خضابوں سے ہندوستان کو نجات دلا کر ملک کی گرانقدر خدمت انجام دی ہے۔ بعض دھوکا باز نقال اس قابل قدر جوہر کی نقل بنا کر جوہر وسمہ مہندی کو بدنام کرنے کی ناپاک کوشش کر رہے ہیں۔ خریداروں کو ہوشیار رہنا چاہیئے۔

فاضل اجل بلند اقبال صاحبزادہ سید حافظ محمد حسین شاہ صاحب نقشبندی علیپوری مدظلہ العالی ۔۔ جوہر وسمہ مہندی لاجواب ایجاد ہے۔

میں نے اپنے حلقۂ احباب میں جوہر وسمہ مہندی کی تعریف کی کافی تعریف کی ہے۔ کیونکہ یہ چیز اس لائق ہے۔ میرے دوست اس کے مداح ہیں۔

شیخ عبدالحکیم صاحب گجراتی دفتر تبلیغ اسلامیہ دہلی ایک کامیاب چیز ہے اور خضابوں کا سرتاج ہے۔ جوہر وسمہ مہندی کو ہر ملک کے افراد نے پسند کیا۔

جناب بابو جوالا پرشاد صاحب محلہ بسنت پورہ گورکھپور یو۔پی جوہر وسمہ مہندی استعمال کیا جس سے طبیعت بہت خوش ہوئی اس کے مقابلہ میں تمام خضاب فضول ہیں۔ اس نئی ایجاد خضاب نے خوب دلوں پر قبضہ جمایا ہے۔

عالیجناب حضرت مولانا سید رسول شاہ صاحب جیلانی سجادہ نشین۔ ایم۔ ایل۔ اے لمونگی ضلع سکھر جوہر وسمہ مہندی کا بہترین خضاب ثابت ہوا ہے۔

جناب ۔۔ کے مشہور فوٹو گرافر سید رحیم صاحب فیروزپوری

آغا خانی داؤد خاں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس

حضرت مولانا مولا بخش صاحب خطیب

مولانا محمد عرفان صاحب

عالیجناب سردار عبدالخالق خانصاحب

چوہدری غلام حیدر خانصاحب

جناب حاجی انوار الحق صاحب

میاں عبدالعزیز صاحب

جناب سردار کرم سنگھ صاحب

جناب ٹھاکر لاجپت سنگھ صاحب انسپکٹر پولیس

جناب محمد حیات صاحب نمبردار

مشہور فوٹو گرافر پنڈت امیر چند صاحب

عالیجناب ابرار احمد خانصاحب

جناب لالہ بھگت رام صاحب

اسٹیشن ماسٹر حضرت محمد عبدالحق صاحب

عالیجناب راؤ محمد رسول خانصاحب

جناب راجہ سوار خانصاحب داروغہ

حضرت رضوی بھوپال

مولانا فخر الدین احمد صاحب

سردار گوردت سنگھ صاحب

خلیفہ شجاع الدین صاحب

عطاء اللہ شاہ بخاری

التماس گذارش

امیر ریاست لاہور

سیاست لاہور

احسان لاہور

شہباز لاہور

مسلمان لاہور

سفید بال بالا



آپ کے سفید بال خواہ کسی وجہ سے ہوں اور کتنی ہی بڑی عمر سے سفید کیوں نہ ہوں جادو اثر ویولین رسٹورر بالوں کی جڑوں سے سفید بال جوانی کی طرح سیاہ قدرتی چمکدار رنگ اور اصلی شان پر ہمیشہ کے لئے آجاتے ہیں کے خضاب کی ضرورت نہیں۔ ویولین جڑ سے کالا کرنے والے تیل کا استعمال آج ہی شروع کیجئے۔ کم مدت کے سفید بالوں کیلئے چھوٹی بوتل قیمت ۱۲؍ پرانے سفید بالوں کے لئے بڑی بوتل قیمت تین روپے۔ ۳ شیشی کے خریدار کو محصول معاف

ڈسٹری بیوٹرز سائنٹفک پلیٹنگ کمپنی رمیڈیکل ڈیپارٹمنٹ بھولی پور، کلکتہ

پنجاب ایجنٹ۔ ڈاکٹر بی سنگھ اینڈ سن دی مال روڈ لاہور۔ سٹاکسٹ۔ رام برادرز انارکلی لاہور کراچی۔ جے تیرتھ اینڈ کمپنی بندر روڈ امرتسر دیوان چند اینڈ برادرز ہال بازار دہلی ریڈی کیمیکل اینڈ کمپنی کمیشن فتح پوری پشاور شہر میڈیکل سٹورز کچہری گیٹ۔ حیدرآباد دکن پریکھ برادرز سلطان بازار۔

جرمن پستول

چوروں اور ڈاکوؤں کو ڈرانے کے لئے بہترین ہتھیار ہے چلانے پر بالکل بڑے پستول کی طرح آواز دیتا ہے۔ باہر کھیلنے اور بچاؤ کے لئے پاکٹ سائز بالکل موزوں ہے۔ میگزین میں دس نشانے ہوتے ہیں۔ خود بخود ریپیٹ ہوتا ہے۔

اس کے لئے لائسنس کی ضرورت نہیں۔

فالتو پٹاخے ایک روپیہ فی سینکڑہ کے حساب سے مل سکتے ہیں

قیمت۔ فی پستول معہ نشانے صرف تین روپے علاوہ محصول۔

مینیجر

جرمن ٹریڈنگ کمپنی پوسٹ بکس نمبر ۱۳۶ بمبئی

امتحان کے بعد بجلی کا کام سیکھئے

کیونکہ اس کام کے جاننے والوں کی ضرورت پنجاب یوپی۔ صوبہ سرحد کے ہائیڈرو الیکٹرک ڈیپارٹمنٹ میں دن بدن بڑھتی جارہی ہے سکول فار الیکٹریشنز لدھیانہ بہترین درسگاہ ہے جو گورنمنٹ ریکگنائزڈ بھی ہے اور ایڈڈ بھی ہر قابلیت اور ہر مذہب و ملت کے طلبا کے لئے یہ سکول کھلا ہے گورنمنٹ سے مالی امداد ملنے پر سکول کمیٹی نے فیس میں ایک تہائی کی رعایت کردی ہے جو ماہوار لی جاتی ہے۔

پراسپکٹس مفت

مینیجر

ایک ہزار روپیہ نقد انعام

عمل محبت کے شائقین جو سب طرف سے مایوس ہو چکے ہوں آخری مرتبہ ہمارا "موہنی کرن جنتر" منگا کر اپنے دل کی مراد حاصل کریں اس کو اپنے پاس رکھ کر آپ اپنے دل میں جس کسی کا نام لیں گے خواہ وہ کیسا ہی پتھر دل مغرور اور سخت کلام کیوں نہ ہو۔ جہاں کہیں بھی ہوگا آپ سے ملنے کے لئے تڑپنے لگے گا اور پھر تمام عمر آپ کی جدائی ہرگز گوارا نہ کرے گا نیز حاکم یا مالک کو اپنا بنانا اور دشمن کو زیر کرنا اس جنتر کے خاص اوصاف ہیں۔ سورج مشرق کی بجائے مغرب سے نکل سکتا ہے مگر اس جنتر کا اثر خالی نہیں جاسکتا۔ معاوضہ صرف ایک روپیہ چار آنے (۱؍۴) علاوہ خرچ ڈاک

نوٹ

ہزارہا اصلی سرٹیفکیٹ موجود ہیں۔ غلط ثابت کرنے والے کو ایک ہزار روپیہ نقد انعام دیا جائے گا۔ پتہ

پروفیسر جی شنکر پوسٹ بکس نمبر ۶۷ رتن چند روڈ لاہور

Round Trip FARES to HILL STATIONS



Spend your holiday in the Hills this summer in brilliant northern sunshine. The trouble-free Rail-cum-Road trip will thrill you, and you will have ample time to enjoy the scenery during the journey to your destination

Northern India Hill Stations and Kashmir offer the holiday maker every kind of diversion -Golf on championship courses, Trout fishing (in Kulu) Riding, Swimming, Trekking, Tennis, Dancing, Motoring and Polo.

Ask for planned itineraries which will gladly be sent without obligation And remember, holiday and travelling costs have never been so low





KULU
MANDI
MURREE
KATRAIN
SRINAGAR
DALHOUSIE

Write to The Chief Commercial Manager or Telephone No 3299, Lahore

Rail-cum-Road Return Tickets, available for six months, are issued from most of the important stations on the North Western Railway

NORTH WESTERN RAILWAY

Printed & Published by Salah-ud-din Ahmad at the Gilani Press, Hospital Road, Lahore
The Title & pictures printed at the Victoria Press, Railway Road, Lahore.
Issued from office of the Adabi Dunya Commercial Building The Mall, Lahore.

India's Premier Magazine

The ADABI DUNYA
LAHORE

بہ یادگار
منصور احمد مرحوم



ادبی دنیا

ادارہ

عاشق حسین بٹالوی
بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی

حفیظ ہوشیارپوری
ایم۔ اے

شیرازہ میں کیا ہوتا ہے؟

بلندپایہ و متین ظرافت ——

ادب و انشار کے جواہر پارے ——

بے لاگ ادبی تنقیدیں ——

عہد حاضر کے ادبی رجحانات پر تبصرے ——

مدیر انقلاب حضرت سالک کے "واردات و افکار" ——

شعرائے قدیم و جدید کے کلام کا انتخاب ——

دنیا کے بہترین افسانوں کے تراجم ——

یورپ کی ڈاک ——

مشاہیر اہل قلم کی بلاک کی تصاویر ——

غرض جس پرچے کے روح رواں سندباد جہازی ہوں

اس میں جو کچھ بھی ہو تھوڑا ہے۔

نئے انتظام کے مطابق ہر جمعہ کی صبح کو شائع ہوتا ہے۔

چندہ سالانہ صرف تین روپے۔ فی پرچہ ایک آنہ۔

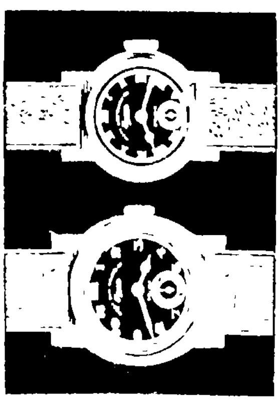
دفتر شیرازہ دل محمد روڈ۔ لاہور

دی سیمنٹ مارکیٹنگ کمپنی آف انڈیا

مکانوں کی تعمیر کے لئے مختلف ضروریات میں سے سیمنٹ سب سے زیادہ ضروری چیز ہے کیونکہ مکان کی عمر اور پختگی کا دار و مدار صرف اسی کی اس قوت پر ہے جس میں ایسے واقعات و حادثات کا مقابلہ کرنیکی پوری طاقت موجود ہے جن سے مکانات کے انہدام تک کے امکانات ہیں۔ دی سیمنٹ مارکیٹنگ کمپنی آف انڈیا کا تیار کردہ سیمنٹ ہندوستان بھر میں بہترین ثابت ہو چکا ہے جسے نہ صرف مختلف افراد ہی استعمال کر چکے ہیں بلکہ گورنمنٹ کے دفاتر اور بہت سی فرموں کے دفاتر بھی اسی سے تعمیر کئے گئے ہیں فی الحقیقت اس سیمنٹ سے بنے ہوئے مکانات و دفاتر ان تمام خطروں سے پوری طرح محفوظ ہیں جن میں انسانی جانیں بھی تلف ہو جاتی ہیں۔

ہم ناظرین ادبی دنیا جنہیں ایسی ضروریات درپیش ہیں پرزور سفارش کرتے ہیں کہ وہ ضرور دی سیمنٹ مارکیٹنگ کمپنی آف انڈیا کا تیار کردہ سیمنٹ استعمال کریں جس کے لئے ان کے ایجنٹس دی برڈ اینڈ کمپنی لاہور سے خط و کتابت کریں۔





ویسٹ اینڈ کی جدید "آل پروف" گھڑی کے ساتھ اس قسم کے خدشوں کا خطرہ نہیں

بہت سی اچھی گھڑیاں دھکوں اور جھٹکوں جیسے اتفاقیہ حادثوں کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ لیکن ویسٹ اینڈ کی آل پروف اسادوریا ان جیسے نہیں۔ کیونکہ یہ خاص مضبوط پرزوں سے ہر قسم کے دھکوں اور جھٹکوں کا مقابلہ کرنے کے لئے بنائی گئی ہے۔ شیشہ ٹوٹنے والا نہیں۔ اس کا کیس جو ایور برائٹ سٹیل کا ہے نہ ٹوٹ سکتا ہے اور نہ میل پسینہ اور دھبوں سے خراب ہو سکتا ہے سادہ پر ثابت شدہ کفایت شعاری کے ساتھ ایک عجیب و غریب گھڑی ہے قیمتیں بالکل مناسب ہیں۔ بڑی باتصویر فہرست طلب کیجئے۔

دی آل پروف اسادوریا

دھچے۔ دھکے۔ اور پانی سے محفوظ

چھوٹا سائز۔ ایور برائٹ سٹیل —— چالیس روپے

درمیانہ سائز ایور برائٹ سٹیل —— عتیس روپے

ریڈیم ڈائل اور سوئیوں کے لئے دو روپے علاوہ

ویسٹ اینڈ واچ کمپنی۔ بمبئی۔ کلکتہ

WEST END WATCH Co.

BOMBAY CALCUTTA

جرمن پستول

چوروں اور ڈاکوؤں کو ڈرانے کے لئے چھوٹا سا اوزار ہے

چلانے پر بالکل بڑے پستول کی طرح آواز دیتا ہے باہر کھیلنے اور بچاؤ کے لئے پاکٹ سائز بالکل موزوں ہے میگزین میں دس نشانے ہوتے ہیں۔ خود بخود ریپیٹ ہوتا ہے۔

اس لئے لائسنس کی ضرورت نہیں۔

فالتو پٹاخے ایک روپیہ سیکڑہ کے حساب سے مل سکتے ہیں

قیمت:۔ فی پستول معہ نشانے صرف تین روپے علاوہ محصول۔

منیجر جرمن ٹریڈنگ کمپنی پوسٹ بکس نمبر ۱۲۳ بمبئی

صرف چند کاپیاں باقی رہ گئی ہیں

اردو زبان میں مختصر افسانوں کی بہترین کتاب



مُصنّفہ

عاشق بٹالوی

دورِ حاضرہ کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی زندگی کے نشیب و فراز ان کی ذہنی و روحانی کشمکش کے مدوجزر اور ان کی بیقرار طبیعتوں کے ہیجان و اضطراب کا

حیرت انگیز مُرقع

ایسے جواں مرگ دوستوں کے قصے جنہوں نے عشق کے دیوتا کے حضور میں اپنی جان کی قربانی پیش کر دی۔ ایسے برگشتہ بخت انسانوں کی دل گداز داستانیں جو راہ راست سے بھٹک گئے اور سماج نے انہیں کبھی معاف نہ کیا۔ ایسے تخیل پرست نوجوانوں کے واقعات جو شاعرانہ افتادِ مزاج لے کر پیدا ہوئے۔ لیکن گردش لیل و نہار نے انہیں زندگی کے تلخ و تند حقائق سے دست و گریباں ہونے پر مجبور کر دیا۔ ایسی عورتوں کی کہانیاں جو زینت بازار بن کر بھی محبت کے حقیقی درد سے محروم نہ رہیں۔

ادب و انشا کے پاکیزہ نمونے۔ ساڑھے تین سو صفحات۔ اعلیٰ لکھائی چھپائی مصنف کی تصویر بھی کتاب میں موجود ہے۔

قیمت صرف ایک روپیہ

لاہور کے تمام کتب فروشوں سے مل سکتی ہے۔ یا براہ راست

دفتر رسالہ "ادبی دنیا" کمرشیل بلڈنگ لاہور سے طلب فرمائیں

ڈاک کے ڈاکو | ہر ماہ ہمیں خریداروں کی طرف سے شکایتیں موصول ہوتی ہیں کہ انہیں پرچہ نہیں ملتا اور بعض خریدار ایسے بھی ہیں جو شکایت نہیں کرتے لیکن یہ فرض کر لیتے ہیں کہ پرچہ دفتر نے نہیں بھیجا حالانکہ پرچہ بھیجا جاتا اور پھر خریدار کو نہ پہنچنا ڈاک کی ... ادبی دنیا ہر ماہ کی ۱۹ تاریخ تک شائع ہو جاتا ہے اگر بیس تک آپ کو پرچہ نہ ملے تو سمجھ لیجئے کہ کسی ڈاک کے ڈاکو کی نذر ہوا ہے۔ ایک شکایتی کارڈ اپنے حلقہ کے سپرنٹنڈنٹ پوسٹ آفس کو لکھئے اور ایک کارڈ ہمیں لکھئے تاکہ آپ کو پرچہ دوبارہ بھیجا جا سکے اور محکمۂ ڈاک کے دروازے پر ایک اور دستک دی جائے۔
(منیجر)

فہرستِ مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہِ ستمبر ۱۹۳۷ء

جلد ۱۵ — تصاویر: ۱۔ ازچین ۲۔ باغ میں — نمبر ۱۱

نمبر شمار	مضمون	صاحبِ مضمون	صفحہ
	آئینۂ عالم		
۱	چین کی ممتاز بیٹیاں	ادارہ	۷۴۱
۲	جاپان کے چند نقوش	ادارہ	۷۴۲
	افسانے		
۳	فریبِ خیال	عاشق حسین بٹالوی	۷۶۱
۴	صدمہ	حضرتِ خلیل بی اے	۷۸۷
۵	برائے فروخت	حضرتِ طاہر قریشی بی اے	۷۹۶
	علمی و ادبی مضامین		
۶	زبان کا مسئلہ	جناب پنڈت جواہر لال نہرو	۷۴۷
۷	کوریا کی قدیم شاعری	میراجی	۷۷۷
۸	اشعرا کی شاعری	جناب زین العابدین صاحب	۸۰۰
	حصہ نظم		
۹	خونابۂ دل	حضرتِ سیفی ٹونگانوی	۷۴۶
۱۰	عزمِ شاعر	جنابِ ناجور ساہری	۷۵۹
۱۱	شاخِ نبات	جناب صوفی غلام مصطفٰے صاحب تبسم ایم اے	۷۶۰
۱۲	خوابوں کی شہزادی	حضرتِ تابش صدیقی	۷۷۵
۱۳	غزل	چودھری خوشی محمد صاحب ناظر بی اے سابق منسٹر کشمیر	۷۷۶
۱۴	دعوتِ شوق	خواجہ عبد السمیع صاحب پال آخر صہبائی ایم اے ایل ایل بی	۷۸۵
۱۵	غزل	حفیظ ہوشیارپوری	۷۹۴
۱۶	غزل	حضرتِ حرماں خیرآبادی	۷۹۵
۱۷	نیرنگِ حیات	حضرتِ اسد ملتانی	۷۹۹
۱۸	غزل	جناب سکندر علی صاحب وجد	۸۰۵
۱۹	غزل	جناب مسعود حفیظ صاحب	۸۰۵
۲۰	غزل	جناب مسعود شاہد صاحب	۷۸۶
۲۱	آتش پارے	مخدوم زادہ سید ولایت حسین صاحب	۷۹۳
	دنیائے ادب		
۲۲	ادبی قیود اور ذہنی انقلاب	احتشام رضوانی	۸۰۶
۲۳	ہندوستانی زبان کا مستقبل	جناب ناقد مرادآبادی	۸۱۰
۲۴	شاعر جیل کے دروازے پر		۸۱۲
۲۵	نقد و نظر	ادارہ	۸۱۳

سالانہ چندہ مع محصول ڈاک اور وی پی پانچ روپے (۵) ممالکِ غیر سے دس شلنگ

... لاہور ... صلاح الدین احمد پرنٹر پبلشر ... دفتر ادبی دنیا کمرشل بلڈنگ لاہور سے شائع ہوا۔

آئینۂ عالم

چین کی ممتاز بیٹیاں

مارشل چیانگ کائی شیک چین کا دبلا پتلا اور طویل القامت جرنیل آج اس ملک میں سب سے بڑی طاقت ہے مگر ہر چینی جانتا ہے کہ اس قدیم ہانچو سلطنت کا حقیقی اقتدار چینی مہاجر سونگ کی تین بیٹیوں اور تین بیٹوں کے ہاتھ میں ہے۔ سب سے بڑی بیٹی میڈیم سن یاٹ سین نے جو جمہوریت چین کے پہلے صدر کی بیوہ ہے چند دن ہوئے اعلان کیا تھا کہ چین ناقابلِ تسخیر ہے اور جاپان سے اکیلا لڑ سکتا ہے لیکن مشرق کی آنے والی جنگِ عظیم کے عالمگیر میدان میں اکیلا نہیں ہوگا۔

پچاس برس ہوئے چارلی سونگ بالٹی مور امریکہ میں ایک قلاش مہاجر تھا۔ لیکن آج اس کی تین بیٹیاں اور تین بیٹے جمہوریت چین کی اہم ترین شخصیتیں ہیں اور منجھلی بیٹی میڈیم چیانگ کیشک کی وساطت سے چالیس کروڑ نیم باز آنکھوں والے چینیوں کی قسمتوں کے مالک ہیں۔

سنہ ۱۹۱۱ء کی انقلابی تحریک عظیم میں جو جمہوریت چین کے قیام کا باعث ہوئی۔ مہاجر سونگ نے چین واپس آ کر نہایت جلیل القدر انتظامی خدمات انجام دیں اور امن قائم ہونے پر پریزیڈنٹ سن یاٹ سین کا سیکرٹری مقرر ہو گیا۔ یہاں سے اس کے خاندان کا عروج شروع ہوتا ہے۔ ایک بیٹی پریزیڈنٹ کی بیوی تھی۔ دوسری نے کینٹن کی فوج کے بلند اقبال جرنیل چیانگ کیشک سے شادی کر لی اور تیسری کا عقد نانکن کے وزیر مالیات ڈاکٹر کونگ سے انجام پایا۔ سونگ کے دو بڑے بیٹے مشرقِ بعید کے سب سے بڑے ساہوکاروں اور ماہران مالیات میں تسلیم کئے جاتے ہیں اور تیسرا چیانگ کیشک کی حکومت کا وزیر تجارت ہے۔

چارلی سونگ کی انقلاب پسند بیٹیوں نے شادی کے بعد مشرقی دستور کے مطابق اپنے شوہروں کے ہاں گھریلو زندگی کی خاموشیوں میں گم ہو جانا پسند نہ کیا اور قدیم روایات سے سرتابی کرتے ہوئے وہ قومی معاملات میں سرگرم حصہ لینے لگیں اور بہت جلد ان کا شمار مشرق کی سب سے متقدر خواتین میں ہونے لگا۔

میڈیم سن یاٹ سین ۱۹۲۶ء کے متحدہ محاذ کی پشت پناہ تھی اور تب سے اشتراکی چین کی فرمانروائی پر اس کا نمایاں اثر رہا ہے۔ اشتراکی حلقوں میں اس کا نام نہایت عزت سے لیا جاتا ہے اور اس کی رائے کی بے حد قدر و قیمت کی جاتی ہے۔ اس نے جارجیا (امریکہ) کے ویزلین کالج میں تعلیم پائی ہے۔ نہایت سنجیدہ مزاج رکھتی ہے۔ اور سیاست کے میدان میں آنے سے پہلے طب میں خاص امتیاز حاصل کر چکی ہے۔ پہلے اس قدر شرمیلی طبیعت رکھتی تھی کہ بیماری میں مرد ڈاکٹر سے علاج کرانا پسند نہیں کرتی تھی۔ لیکن بعد میں اس دبلی پتلی خاتون نے پریزیڈنٹ سن یاٹ سین کی موت پر چینی رسم و رواج کے مطابق گوشۂ عزلت اختیار کرنے سے انکار کر کے تمام چین کی رائے عامہ کو دعوت مبارزت دے دی لیکن اپنے بے نظیر اثر و رسوخ کے بل پر وہ اس عام مخالفت پر غالب آ گئی اور قومی مجلسِ منتظمہ کی رکن منتخب کی گئی اور ردِ عمل کے سارے عہد میں وہ ان گنتی کے چینیوں میں تھی جو مارشل چیانگ کیشک کی مخالفت کر سکتے تھے اور جب مارشل چیانگ نے جاپانیوں کی طرف جھکنا چاہا تو میڈیم سن یاٹ نے اُسے پبلک طور پر زجر و توبیخ کرنے سے گریز نہ کیا۔

میڈیم چیانگ کیشک بھی اثر و اقتدار کے لحاظ سے میڈیم سن یاٹ سین سے کم نہیں لیکن وہ اس جیسی سادگی پسند طبیعت نہیں رکھتی۔ میڈیم چیانگ کو اگرچہ شہرت سے گریز ہے تاہم وہ اپنے حسن و جمال کی آرائش پر بے حد توجہ دیتی ہے اور غازہ و رنگ کا خوب استعمال کرتی ہے۔ اس کی بھی تعلیم و تربیت امریکہ میں ہوئی ہے۔ وہ کافی خوبصورت ہے اور چینی سیاسیات پر ایک فیصلہ کن اثر رکھتی ہے۔

جب پچھلے سال باغی جرنیل ہیو لانگ مارشل چیانگ کو لے اڑا تھا تو میڈیم چیانگ نے تمام معاملات کی قیادت خود سنبھال لی۔ ہوائی جہاز میں اڑ کر ہیو لانگ کے پوشیدہ غار میں پہنچی۔ نہایت عقل مندی سے تمام امور طے کئے اور ہنستے ہوئے اپنے شوہر کو آزادی کے ساتھ مصنوعی دانتوں کے ایک نئے سیٹ کا تحفہ بھی پیش کیا کہ مارشل اس دوڑ بھاگ میں اپنا مستقل سیٹ کہیں کھو بیٹھا تھا۔

بوڑھے چارلی سونگ کی تیسری لڑکی بھی ایک امریکن یونیورسٹی کی تربیت یافتہ ہے۔ وہ اپنے وزیر شوہر کو اپنے علم و تجربہ اور اثر و رسوخ سے بیش بہا فائدہ پہنچاتی رہتی ہے اور گذشتہ دنوں چین کی حکومت کو لندن سے دو کروڑ پاونڈ قرض دلوانے میں اس کی کوششوں کو بڑا دخل تھا۔

سونگ کے تینوں بیٹے خوبرو۔ مہذب۔ رنگین اور قابل جوان ہیں اور چین کی صنعت و حرفت اور تجارت پر بے پایاں اقتدار رکھتے ہیں چینی "تاجروں" کے حلقے میں ان کے احکام کو بے حد وقعت دی جاتی ہے۔ اور مالی امور کے متعلق وہ غور و فکر کے بعد جس رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ اس بارے میں چین کی قومی پالیسی قرار پاتی ہے۔

ان چینی خاتونوں۔ ان کے بھائیوں اور مارشل چیانگ کیشک نے جاپان کی فوجی طاقت کا بڑی احتیاط سے اندازہ لگایا ہے۔ اور اگرچہ وہ چین کی دفاعی قوت کے متعلق کسی قسم کی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہیں۔ تاہم وہ جاپان کو فوجی قوت کے لحاظ سے ایک اول درجہ کی طاقت نہیں سمجھتے ان کی رائے میں جاپان کی ظفر مندانہ روایات کے مقابلے میں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ اُسے ہمیشہ غیر منظم فوجوں سے سابقہ پڑتا رہا ہے لیکن اس کے باوجود شنگھائی میں جاپانی یلغار کو جسے اُس کے عظیم الشان تباہ کن جنگی جہازوں کی تائید حاصل تھی۔ ایک غیر تربیت یافتہ اور بے ساز و سامان چینی فوج نے ہفتوں روکے رکھا۔

اب چین کی افواج پہلے سے دس گنا طاقتور ہیں۔ ادھر پاکچو کی سرحد پر روسی مظاہرے جاپان کی آدھی فوج کی توجہ اپنی طرف کھینچ سکتے ہیں اور اُدھر چینی لشکر میں جس کی تعداد جاپانی فوج سے یقیناً زائد ہے۔ ماؤ سی تنگ کی سرخ فوج کے اڑھائی لاکھ سپاہی جو جدید اسلحہ سے آراستہ ہیں شامل ہو رہے ہیں اس متحدہ سپاہ سے حملہ آور کی یورش کا پُر زور مقابلہ کرنے کی امید کی جاسکتی ہے۔ مگر آفت یہ ہے کہ چین کے بیس لاکھ فوجی سپاہیوں میں سے پورے نصف نہایت نامکمل طور پر مسلح اور محاذ جنگ کے تجربے سے بالکل عاری ہیں۔

جاپان کے چند نقوش

(ایک ترقی یافتہ ہندوستانی خاتون کے "تاثرات)

تین ماہ ہوئے ٹوکیو میں ایک سہ پہر کو میری ملاقات ایک صاحب سے ہوئی جو پہلے ہندوستان میں کسی کالج کے پرنسپل تھے اور اب جاپانی طالب علموں کو اپنی مادری زبان انگریزی کا درس دیتے ہیں۔ وہ مجھ سے کہنے لگے تم اس مشرق کو ہندوستان سے بہت مختلف مشرق پاؤ گی میں ہمیشہ ہندوستان کو مشرق کہتا ہوں اور اس سرزمین کو اورینٹ۔

لیکن میں کہ ہندوستان سے جاپان یعنی مشرق سے اورینٹ کو گئی تھی اور اختلافات سے دو چار ہونے کے لئے تیار ہو کر گئی تھی ایسی بے شمار باتوں سے آشنا ہوئی جو دونوں ممالک میں مشترک ہیں نسلی طور پر ہم بیشک جاپانیوں سے بہت مختلف ہیں لیکن تہذیب و تمدن کے اعتبار سے ہماری بہت سی باتیں آپس میں ملتی جلتی ہیں ہندوستان نے جاپان کو بدھ مذہب دیا جو اب تک وہاں کی اکثریت کا مذہب ہے۔ آبائی دستور و آئین جو جاپان کے سارے سوشل نظام کا ڈھانچہ ہے۔ ہمارے مشترکہ خاندان کے طریقہ کے بہت مماثل ہے۔ سوائے اس فرق کے کہ جاپان میں گذشتہ بزرگوں اور اجداد کو ہندوستان کی بہ نسبت بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ جاپان میں شہنشاہ کی جو بے حد قدر و منزلت بلکہ عبادت کی جاتی ہے۔ اس کی بھی اصل وجہ یہی ہے کہ شہنشاہ کو ہر معزز جاپانی شہری کے معزز اجداد کا پیکر سمجھا جاتا ہے۔ جاپان کے ایک بہت مقبول کلاسیکل ڈرامے "سموارائی کی قربانی" میں دکھایا جاتا ہے کہ سموارائی یعنی ایک قبیلہ کا سردار اپنے اکلوتے بیٹے کا قتل ہو جانا قبول کرتا ہے تاکہ اُسے اپنے اجداد کے سامنے سرخروئی حاصل ہو

اس سے بظاہر مُردوں کے لئے زندوں کی بے فائدہ قربانی کی حوصلہ افزائی عیاں ہے۔ لیکن جاپان میں یہاں کی بہ نسبت ظاہری دنیا روحانی دنیا سے بے حد قریب واقع ہوئی ہے اور اجداد کو محض اس لئے نیست و نابود تصور نہیں کر لیا جاتا کہ وہ اس ظاہری زندگی سے انتقال کر چکے ہیں۔ موت کو بہت اہمیت نہیں دی جاتی۔ اسے صرف معزز آباؤ اجداد سے اتصال کا اور خود اس معزز گروہ میں شامل ہونے کا ایک آسان ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ ہاراکیری (جاپانی خودکشی) کی اس سرزمین میں موت بہت سستی ہے اور زندگی کا سب سے بڑا حادثہ اور مصیبت بے عزتی کو سمجھا جاتا ہے

میلے ٹھیلوں کا شوق

ذہنیت کی اس افتاد نے ہی شاید جاپانیوں کو اُن کے موجودہ درجے تک پہنچایا ہے۔ وہ بلاشبہ دنیا کی بہادر ترین اقوام میں سے ہیں۔ وہ اپنے اعصاب پر اس حد تک قابو پا لیتے ہیں کہ بعض دفعہ وہ موت کے کھیل میں بنایت دلچسپی لیتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً جاپان میں موٹر ٹیکسی پر سوار ہونے کے بعد آپ ہر لمحہ اپنے گزرے ہوئے بزرگوں سے ملاقات کی امید کر سکتے ہیں۔ ڈرائیور بے تحاشا موٹر چلاتے ہیں۔ پٹرولیا پر چڑھ جاتے ہیں۔ راستے چلنے والوں سے بال بھر کا فرق رکھ کر برق رفتاری سے گزر جاتے ہیں۔ بس اُن کا حیرت ناک اعصابی اختیار اور کمال مہارت ہی انہیں اور ان کی بے اختیار سواریوں کو موت کی آغوش میں بے تکلفانہ پھینک دئے جانے سے بچاتا ہے۔ اگر کہیں رفتار پہ پابندیاں ہیں بھی تو کوئی ان کی پروا نہیں کرتا اور اگر حادثات ہوتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس اندھا دھند موٹر بازی سے کتنے حادثات ہوتے ہوں گے تو انہیں کوئی اہمیت نہیں دی جاتی اور نہ اخبارات میں ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔ نتیجۃً زخمی ہونے یا موت واقعہ ہو جانے کی صورت میں بھی نقصان رسیدہ شخص یا اس کے ورثا کو کوئی معاوضہ نہیں دیا جاتا۔

جاپانیوں کی اجداد پرستی اور ان کی فوجی شجاعت کی قدیم روایات کو ان میلے ٹھیلوں اور قدیم قسم کے جاپانی ڈراموں سے بہت تقویت ملتی ہے جن کا جاپانیوں کو بے حد شوق ہے۔ ہر مہینے قدیم روایات کو زندہ رکھنے والے میلے منعقد ہوتے رہتے ہیں اور گھروں اور تھیئٹروں میں عہد ماضی کے بہادروں کی داستانیں ذوق شوق سے سنی اور سنائی جاتی ہیں اور ان سے متاثر ہو کر جاپانی نوجوان اپنی رگوں میں خون گرم کی روانی کا احساس کرتے ہیں جس کی انہیں دور جدید کے مشکل ترین معرکوں میں پہلے کی نسبت بہت زیادہ ضرورت ہے۔ ۵ رمئی کو جاپانی لڑکوں کے میلے کی تقریب پر میں ٹوکیو میں تھی۔ اُس دن چھوٹے لڑکوں کو ہیبت شکلوں کے کھلونے دئے جاتے ہیں تاکہ وہ اپنا ڈر دور کریں اور گھروں کی چھتوں سے نقرئی رنگ کی مچھلی کرپ کی شکل کے جھنڈے اڑائے جاتے ہیں یہ مچھلی جاپانی لڑکپن کا نشان ہے۔ کیونکہ کرپ دریا میں پانی کے بہاؤ کے خلاف تیرتی ہے اور صرف ایک ہی مچھلی ہے جو چاقو کی دھار کے نیچے تڑپا نہیں جانتی۔

خواندگی کی بلند اوسط

یہ امر کہ جاپان میں زندگی کو کم قیمت سمجھا جاتا ہے اور اپنے ماضی کو بے حد احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ جاپان کی موجودہ زمانے کی ضروریات یا مستقبل کی ممکنات سے غفلت کا باعث نہیں ہوا بلکہ جاپان اس بارے میں بے حد بیدار ثابت ہوا ہے۔ ساٹھ سال گزرے جاپان کی وہی کیفیت تھی جو تین سو سال قبل کے ہندوستان کی تھی یعنی ملک میں طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ ان ساٹھ برسوں میں جاپان اس قدر سرعت سے آگے بڑھا ہے کہ بیشتر متمدن ممالک اس سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ یہ کیفیت تعلیم کے حلقے میں بہت نمایاں ہے۔ آج دنیا بھر میں جاپان کا اوسط خواندگی بلند ترین ہے۔ جاپان کے مرد عورت لڑکے لڑکیوں میں ۹۹ فی صدی لکھ پڑھ سکتے ہیں اور انہیں ہماری الف بے تے کی طرح پچیس تیس حروف سیکھنے نہیں پڑتے۔ بلکہ ان کے حروف تہجی سینکڑوں چینی طرز کے نشانات پر مشتمل ہیں۔ حکومت کی طرف سے ہر جاپانی لڑکے اور لڑکی کے لئے چھ سال تک ابتدائی تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے۔ جب میں ٹوکیو میں تھی تو اخبارات اس بات پر زور دے رہے تھے کہ لڑکوں کے لئے دو سال کی پیشہ ورانہ تعلیم کا اضافہ کیا جائے اور یہ اُس لازمی فوجی تربیت کے علاوہ ہے جو ہر صحت مند جاپانی لڑکے کو حاصل کرنی پڑتی ہے اور جو نوجوان فوجی تعلیم کے ناقابل قرار دیا جائے وہ اسے اپنی بڑی بے عزتی سمجھتا ہے جو اسے اس کے اجداد کی نگاہوں میں ذلیل کر دیتی ہے۔

جاپان کی صنعتی عظمت اور تجارتی ترقی کے متعلق ہم نے بہت کچھ سن رکھا تھا اور جاپان نے دنیا کی تجارتی منڈیوں پر جیسا بے پناہ غلبہ حاصل کیا ہے وہ بھی سب کو معلوم ہے۔ اس کے باوجود ہندوستان سے جانے والا سیاح جاپان کے صیغہ دار سٹورز کو دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے۔

ہمارے ملک میں اس قسم کی عظیم الشان دکانوں سے ملتی جلتی کوئی چیز نہیں۔ ہر سٹور کی کم و بیش سات منزلیں ہوتی ہیں جو جاپان کی صنعتی اور تجارتی پیداوار اور آرٹ کے نمونوں سے بھرپور ہوتی ہیں۔ شوخ رنگوں کا ایک طوفان ہر طرف امڈا ہوا دکھائی دیتا ہے اور بے شمار خریداروں اور بیچنے والی لڑکیوں کی چہل پہل عجب دلکش سماں پیدا کر دیتی ہے۔ ہر منزل پر جانے کے لئے لفٹ اور متحرک سیڑھیاں موجود ہیں جو چشم زدن میں خریدار کو سٹورز کے مختلف حصوں میں پہنچا دیتی ہے۔ ان دکانوں میں تمام چیزیں جاپانی ساخت کی فروخت ہوتی ہیں۔ کہیں کہیں کوئی غیر ملکی چیز بھی دکھائی دے جاتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی جاپانی مثنیٰ بھی رکھی ہوتی ہے اور دونوں کی قیمت میں عموماً چار اور ایک کا تناسب ہوتا ہے۔ اسی لئے جاپان میں سودیشی پروپیگنڈا کی اب ضرورت نہیں رہی۔ ہر جاپانی چیز غیر ملکی کے مقابلے میں بے انتہا سستی ہے۔ ین کی ہندوستانی شرح تبادلہ ۱۳ اور ۱۴ آنے کے درمیان ہے۔ لیکن جاپان میں ایک ین کی قوتِ خرید ہمارے ملک میں ایک روپے کی قوتِ خرید سے کہیں زیادہ ہے۔ اسی لئے جاپانی عوام مقابلۃً کم آمدنیوں پر نہایت اعلیٰ درجے کی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔

اخلاق و تواضع

جاپانی انکسار و اخلاق کا صحیح اندازہ جاپانیوں میں رہے بغیر ہرگز نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اپنے سو کام چھوڑ کر بھی پردیسیوں کی راہ نمائی کرنے اور اپنی ہر قسم کی اخلاقی امداد دینے سے گریز نہیں کرتے۔ کسی دردناک واقعے کا ذکر بھی مسکرا کر کرتے ہیں تاکہ سننے والے کے احساس کو تکلیف نہ ہو۔ وہ ہر وقت مسکرانے اور شکریہ کے الفاظ استعمال کرتے رہتے ہیں۔ جب کبھی آپ کسی سے ملنے جائیں یا مل کر رخصت ہوں، ایک تبسم آمیز خیر مقدم اور خدا حافظ آپ کے لئے وقف ہوگا۔ ٹرام گاڑیوں میں کنڈکٹر نہایت نرم آواز میں لوگوں کو مختلف جگہ پہنچنے کے متعلق آگاہ کرتے ہیں۔ بلند اور کرخت آواز نکالنا ایک اخلاقی جرم تصور کیا جاتا ہے۔ مسافر جب ٹراموں سے اترتے ہیں تو کنڈکٹر نہایت مودب طریق پر ان کے بنڈے چھتریاں اور ٹوپیاں ان کو پیش کرتا ہے۔ چائے کی دکانوں اور ریسٹورنٹوں سے آپ خورد و نوش کے بعد نکلیں تو کھلانے والی خادمہ آپ سے کہے گی۔ "براہ مہربانی آئندہ بھی تشریف لائیے"۔ بل دیتے وقت وہ ہمیشہ آنکھیں نیچی رکھے گی اور اس کے چہرے پر ایک قسم کی خجالت ہوگی گویا کہ یہ بل ایک پرلطف ملاقات کی مسرت ضائع کرنے کے جرم میں خود سے شرمندہ ہو رہا ہے۔ آپ اگر کسی دکان سے بغیر کچھ لئے رخصت ہو جائیں تو بھی فروخت کرنے والے آپ کی تعظیم کے لئے جھک جائیں گے اور اگر آپ اپنی کوئی چیز دکان میں بھول جائیں تو دکان کا سائیکل سوار ملازم آپ کا پیچھا کرے گا اور آپ کو وہ چیز پہنچا جائے گا۔

ٹوکیو کے ریلوے سٹیشن کے باہر پٹڑی پر ایک اخباروں کی دکان ہے یہ جگہ بمبئی کے بوری بندر سے زیادہ پر رونق اور آباد ہے آنے جانے والوں کی ایک لامتناہی رو ہر وقت رواں رہتی ہے۔ اس دکان پر ایک کھلا ہوا طشت ریزگاری سے بھرپور پڑا رہتا ہے۔ لوگ اپنی پسند کا اخبار چنتے ہیں اور اس طشت میں قیمت رکھ دیتے ہیں۔ اگر ریزگاری پاس نہ ہو تو ین رکھ کر باقی ریزگاری اٹھا لیتے ہیں۔ اخبارات اور نقدی کے طشت کی کوئی نگرانی نہیں کرتا کیونکہ دکان میں کوئی آدمی نہیں ہوتا۔ ہجوم جس میں امیر غریب اور بہت غریب سبھی ہوتے ہیں۔ سارا دن یہاں سے گزرتا رہتا ہے۔ مگر کوئی روپے کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا اور ٹوکیو سٹیشن کی اخباروں والی دکان بدستور قائم ہے اور ہر شام اپنے مالک کو پورا پورا حساب دے دیتی ہے۔ جاپانی ہجوم کبھی بے ترتیب نہیں ہوتا۔ نہایت مرتب نہایت سنجیدہ اور نہایت با اخلاق کے الفاظ اگر کسی موصوف کے لئے ٹھیک استعمال ہو سکتے ہیں تو وہ جاپانی ہجوم ہے۔

مناظرِ قدرت سے الفت

جاپانیوں کی ایک نہایت دلکش خصوصیت خوب صورت چیزوں سے محبت ہے جس کا سرچشمہ جاپان کے لطیف اور رنگین مناظر ہیں۔ چیری اور شفتالو کے پھولوں کا ہلکا گلابی رنگ، بانس کے جھنڈوں کی دلآویز ہریاول اور چیڑ کے بلند درختوں کا گہرا رنگین پس منظر اور سب سے بڑھ کر پہاڑوں کی برف پوش چوٹیاں۔ ان سب نے مل کر جاپانیوں میں امتزاجِ رنگ کا ایک غایت درجہ لطیف مزاج پیدا کر دیا ہے جس کا اظہار اُن کی ہر قسم کی مصنوعات مثلاً جینیشل پردوں۔ چھتریوں۔ چینی کے برتنوں، رکابوں حتیٰ کہ مکانات کے در و دیوار کی آرائش میں ہوتا رہتا ہے۔ ان کے گھروں میں پھولوں کی زیبائش ایک فن کی حیثیت رکھتی ہے اور کوئی گھر اس زیبائش سے خالی نہیں ہوتا۔

جاپان کا مقبول عام پھول چیری ظاہر ہے۔ میں اپریل کے آغاز میں وہاں پہنچی تھی یہاں جب چیری کا شگوفہ کھلتا ہے لوگ ایک دوسرے سے ملاقات کے وقت موسم کی خوبی اور منظر کی خوبصورتی

پر مبارک باد دیتے تھے۔ کوہ و میدان اس نازک ترین پھول کے طوفان رنگ سے شرابور تھے اور لوگ جوق درجوق باغات اور جنگلوں میں اس طوفان میں غرق ہونے کے لئے نکل گئے تھے۔ اس پھول کی پتیاں دیکھتے ہی بکھر جاتی ہیں۔ مجھے ایک جاپانی نے نہایت شاعرانہ انداز میں کہا (چیری کے معاملے میں ہر جاپانی شاعر بن جاتا ہے) "اس پھول کی زندگی ہمارے جاپانی سپاہی کی زندگی کی مانند ہے۔ یہ مرجھاتی نہیں بلکہ بکھر جاتی ہے"۔

چیری کے درخت کو حسین ترین عورت کی روح کا پیکر سمجھا جاتا ہے

شنٹو مذہب جو بدھ مذہب سے قدیم تر ہے۔ اور جاپان میں اسی قدر رسوخ رکھتا ہے۔ ہر پھول اور پودے میں ایک زندہ روح کی موجودگی تسلیم کرتا ہے اور اس کی پرستش پر زور دیتا ہے۔ اس مذہب کی رو سے جاپان کے بہت سے دیوتا اور دیویاں ہیں اور ان میں لگاتار اضافہ ہوتا رہتا ہے یہ نئے دیوتا وہ لوگ ہوتے ہیں جو جاپان کی خدمت میں اپنی قربانی کر دیتے ہیں۔ گزشتہ اپریل میں توکیو میں دیوتا بنانے کی ایک عظیم الشان قومی رسم انجام پائی تھی جس کی رو سے ۱۴۷۸ نئی روحوں کو دیوتاؤں کی فہرست میں جگہ دی گئی ان میں سے ۱۹ اراکین حکومت، ۷ منچوریا ریلوے کمپنی کے افسر اور کارکن ۱۱ منچوکو میں بسنے والے جاپانی مہاجر۔ ۱۲۰ جنگی ملاح۔ اور ۱۹۹۸ فوجی سپاہی تھے۔ جس کے معنی ہیں کہ ایک سپاہی کے لئے کسی دوسرے شخص کے مقابلہ میں دیوتا بننے کا دس گنا امکان ہے اور ایسا ہوتا رہے گا جب تک کہ جاپان کی موجودہ فوجی روایات ایسی ہی مضبوط رہیں گی جیسی کہ وہ آج ہیں۔

ادارہ

رباعی

ہستی کی سراب ہی نئی شہر
رہا ہے شباب ہے وہ زندگی نئی شہر
روتا ہوں کہ سے غزال جہد
اے دامن کوہ ا نئی شہر
میری گزری ہوئی جوانی شہر

عباس [illegible]

خونابۂ دل

(۱)

اے علم و ادب کی جان منصور اے مرہم تلخئ جوانی
اے زیب وہ بہارِ اُردو اے روح و روانِ خوش بیانی
تکلیف ہیں دکھ ہیں درد و غم ہیں رکتی نہ تھی طبع کی روانی
یہ بار اٹھائے کون آکر موقوف تھی تجھ پہ نکتہ دانی
محروم ہوئی زبان تجھ سے ٹوٹی ہے بلائے ناگہانی
تو نے ہی سنی تھی جب سنی تھی اب کون سنے مری کہانی
سیفی کو بھی اپنے ساتھ لے چل اک بارِ گراں ہے زندگانی
کیوں درد کو آہ سے گھٹاؤں باقی ہے یہی تو اک نشانی
ممکن ہو اگر تو ڈھونڈھ لاؤں
اس نیند سے کس طرح جگاؤں

(۲)

حسرت رہی کہ تجھ کو دیکھوں چہرے سے کفن ذرا ہٹا دے
محروم رہا ہوں گفتگو سے جاتے جاتے ہی کچھ سنا دے
اے ملکِ عدم کے جانے والے کب آئے گا وقت تو بتا دے
بے یار ہیں خُلق اور مروت اِن کو کہیں راہ سے لگا دے
پھر ڈال نظر لحاظ والی بگڑی ہوئی بات پھر بنا دے
احباب ترے لئے ہیں بے چین اُن کو دیدار سے شفا دے
میری باتوں کی سادگی کو ہمت افزائی سے جِلا دے
اخلاص بھری تسلیوں سے اکھڑے ہوئے دل کو پھر جما دے
دنیا ہے وہی۔ وہی جہاں ہے
اے یارِ عزیز تو کہاں ہے

سیفی نوگانوی

زبان کا مسئلہ

گذشتہ چند ماہ سے ہندی اور اردو کا پرانا قضیہ از سر نو تازہ ہو گیا ہے اور دونوں جانب سے نہایت جوش و خروش کے ساتھ الزامات اور جوابی الزامات کا سلسلہ جاری ہے۔ افسوس ہے کہ ایسے مسئلے کو جو اپنے حل کے لئے ایک پر سکون علمی فضا عالمانہ غور و خوض اور علمی بحث کا محتاج تھا۔ بازاری شور و غوغا میں گھسیٹ لایا گیا ہے اور فرقہ دارانہ ہنگامہ آرائیوں کا مرکز بنا دیا گیا ہے اور پھر اس اکھاڑے میں جو پہلوان کودے ہیں۔ انہیں یقینی طور پر نہ اپنی زبان سے کوئی لگاؤ ہے اور نہ اس کی ادبیات سے کوئی دلچسپی۔ انہیں تو فقط سرکار کے احکام اور عدالت کے ضابطوں سے مطلب رہا ہے۔ پس وہ لوگ جو زبان سے اس لئے الفت کرتے ہیں کہ زبان تہذیب و تمدن کا پیکر لطیف خیالات کے طائر سبک پرواز کا دام رنگین۔ نازک ترین احساسات اور جذبات کا ذریعہ اظہار۔ شاہد معنی کا آئینہ ادراک انسانی کے زیر و بم کا ارگن۔ الفاظ کی دلچسپ داستانوں اور دلکش بندشوں کا شیرازہ اور زندگی اور اس کی بوقلموں کیفیتوں کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ وہ لوگ جنہیں زبان ان خصوصیات اور ایسی دیگر صفات کے باعث عزیز ہے۔ وہ ہمیشہ ان بازاری جھگڑوں کو حیرانی کی نگاہوں سے دیکھا کئے اور اپنا دامن بچا کر علیحدہ کھڑے رہے۔

بایں ہمہ ہم اس مسئلے کی طرف سے تغافل نہیں برت سکتے اور اس سے دور بھی نہیں رہ سکتے کیونکہ زبان کا مسئلہ ہمارے لئے بہت اہم ہے۔ اس کی اہمیت بعض لوگوں کی جاہلانہ چیخ پکار پر مبنی نہیں کہ ہندوستان زبان کے معاملے میں بابل کا روایتی مینار ہے جس کے بسنے والے سینکڑوں بولیاں بولتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے اور ہر صاحب بصیرت پر یہ حقیقت عیاں ہے کہ ہندوستان جیسے عظیم الشان ملک میں رقبہ کے لحاظ سے بہت کم زبانیں استعمال ہوتی ہیں اور یہ سب آپس میں بہت ملتی جلتی ہیں۔ علاوہ بریں ہندوستان میں ایک عالمگیر اور مقبول عام زبان بھی رائج ہے جس کے بولنے والوں کی تعداد دس بیس کروڑ سے کم نہیں۔ پھر بھی زبان کا مسئلہ ویسے کا ویسا ہے اور ہمیں مقابلے کی دعوت دے رہا ہے۔

اس وقت ہمیں اس مسئلہ کی طرف اس کی متعلقہ سیاسی اور فرقہ دارانہ پیچیدگیوں کے باعث بھی متوجہ ہونا پڑے گا۔ لیکن یہ ایک عارضی گزر جانے والی کیفیت ہے۔ اصل مسئلہ اس صورت میں باقی رہے گا کہ ہم تعلیم جمہور اور عوام کی تمدنی ترقی کے عام پروگرام میں زبان کے متعلق کیا طرز عمل اختیار کریں اور اپنی گوناگوں اور بیش قیمت روایات کو برقرار رکھتے ہوئے ایک قومی اتحاد کی بنیادیں کس طرح استوار کریں۔

زبان کا مسئلہ کسی قوم کے لئے ہمیشہ بہت بڑے نتائج کا حامل ہوتا ہے۔ اب سے پورے تین سو سال پہلے مشہور انگریزی شاعر ملٹن نے ایک خط میں جو اس نے فلورنس سے اپنے ایک دوست کو لکھا۔ اس اہمیت کی وضاحت یوں کی ہے "یہ امر کچھ کم نتیجہ خیز نہیں ہے کہ ایک قوم کی زبان کیسی ہے۔ خالص یا خراب۔ یا وہ لوگ اسے عام طور پر کس حد تک صحت و صفائی سے بولتے ہیں جس ملک کی زبان کے الفاظ بجائے خود کریہہ اور ناخوشگوار ہوں گے یا مسلسل غلط استعمال کے باعث ان کی شکل و صورت مسخ ہو گئی ہو گی۔ وہ نہایت واضح طور پر اس بات کا اعلان کریں گے کہ اس ملک کے رہنے والے نہایت کاہل اور بے حس و حرکت لوگ ہیں جن کے دماغ ہر قسم کی غلامی قبول کرنے کے لئے مدت سے تیار ہو چکے ہیں۔

اس کے برخلاف ہم نے یہ کبھی نہیں سنا کہ کوئی ریاست یا سلطنت جب تک کہ اس نے اپنی زبان کو اپنی محبت اور حفاظت کے سائے میں

رکھا۔ کم از کم ایک اوسط درجے کی ثروت و طاقت کی مالک نہ رہی ہو۔

(۲)

ایک زندہ زبان گویا ایک جیتا جاگتا جسم ہے جس کی رگوں میں زندگی کا خون ہر وقت رواں رہتا ہے اور یہ بمصداق ؎

جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی

ہر لحظہ بڑھتا پھیلتا اور ان لوگوں کے خیالات و جذبات کی پیہم ترجمانی کرتا رہتا ہے جو اسے بولتے اور لکھتے ہیں۔ یا اسے ایک عمارت سمجھئے کہ جس کے وسیع زیریں ایوانوں میں عوام آباد ہیں اور جس کا تنگ سہ منزلہ خواص کے تمدن کا حامل ہے۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم منازل بالا سے احکام صادر کر کے یا ریزولیوشن پاس کر کے اس کی شکل و صورت اپنی مرضی کے مطابق تبدیل کر دیں۔ لیکن ہیں اکثر اس عام خیال سے دوچار ہوا ہوں کہ اگر ہم چاہیں تو ایک زندہ زبان کو اپنی مرضی کے مطابق ایک خاص مسلک اختیار کرنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ دنیا کے جدید حالات میں پریس۔ سینما۔ ریڈیو اور اشاعت کتب کی وساطت سے جمہور میں ایک عام پروپیگنڈا اور عام تعلیم کے وسیع الاثر ذرائع کو حرکت میں لا کر زبان میں گذشتہ زمانے کی بہ نسبت بہت جلد تبدیلیاں پیدا کی جا سکتی ہیں لیکن زبان کی یہ تبدیلیاں بھی ان بڑی تبدیلیوں کی آئینہ دار ہوں گی جو خود عوام کی ذہنیتوں میں رونما ہو رہی ہیں۔ جب کبھی کوئی زبان عوام سے اپنا رشتہ توڑتی ہے تو وہ ایک بے جان اور مصنوعی چیز ہو جاتی ہے۔ حالانکہ اسے ایک زندہ طاقتور اور فرحاں و شاداں ہستی ہونا چاہئے۔ پس ایسی تمام کوششیں جو کسی زبان کو ایک خاص جانب ترقی دینے کے لئے کی جائیں گی۔ ہمیشہ اس کی صورت بگاڑنے اور اس کی روح کو کچلنے میں صرف ہوں گی

(۳)

زبان کے متعلق حکومت کی کیا پالیسی ہونی چاہئے۔ کانگرس نے اپنے "بنیادی حقوق" کے ریزولیوشن میں اسے مختصر طور پر لیکن نہایت صفائی اور وضاحت سے یوں بیان کیا ہے "اقلیتوں اور مختلف لسانی رقبوں کے تمدن، زبان اور رسم الخط کی حفاظت کی جائے گی"۔ کانگرس اس اعلان کی پابند ہے اور کسی اقلیت یا لسانی مجموعے کو اس سے زیادہ اطمینان کی ضرورت نہیں۔ علاوہ بریں کانگرس نے اپنے دستور میں اور بہت سی قرار دادوں میں بار بار اعلان کیا ہے کہ اگرچہ ملک کی مشترکہ زبان ہندوستانی قرار دی جائے لیکن صوبجاتی زبانوں کو اپنے اپنے حلقوں میں فوقیت حاصل ہونی چاہئے۔

کسی زبان کو ریزولیوشنوں کے ذریعے ملک پر عاید نہیں کیا جا سکتا۔ پس کانگرس کی یہ خواہشیں کہ ایک طرف ملک میں ایک مقبول عام مشترکہ زبان پیدا کی جائے اور دوسری جانب صوبجات میں مقامی زبانوں کو اظہار مطالب کا ذریعہ بنایا جائے اس وقت تک کوئی معنی نہیں رکھتیں اور عوام پر مطلق اثر انداز نہیں ہو سکتیں جب تک کہ وہ موجودہ حالات اور ضروریات کے مطابق نہ ہوں۔ پس ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ اس شرط کو کس حد تک پورا کرتی ہیں۔

(۴)

ہماری بڑی بڑی صوبائی زبانیں محض بولیاں نہیں ہیں۔ انہیں بعض دفعہ محض جہالت سے ایسا سمجھا جاتا ہے۔ وہ قدیم زبانیں ہیں جنہیں تہذیب و تمدن کا معقول ورثہ ملا ہے۔ ان میں سے ہر زبان کو کروڑوں آدمی بولتے ہیں اور ہر زبان اپنے حلقے میں عوام اور خواص دونوں کے جذبات و خیالات زندگی اور تمدن کے ساتھ نہایت مضبوطی سے وابستہ ہیں۔ یہ امر مسلمات میں سے ہے کہ عوام کی تعلیمی اور تمدنی ترقی ان کی اپنی زبان کے ذریعے سے ہی ممکن ہو سکتی ہے۔

پس یہ ناگزیر ہے کہ ہم صوبجاتی زبانوں کی اہمیت پر زور دیں اور اپنا زیادہ کام انہیں کے ذریعہ انجام دیں۔ کسی اور زبان کا استعمال ہر جگہ وہاں کے مختصر سے تعلیم یافتہ طبقے کو لازماً عوام سے جدا کرنے اور ان کی ذہنی ترقی کو روک دینے کا باعث ہوگا۔ جب سے کانگرس نے اپنے کام کے لئے صوبجاتی زبانوں کی وساطت اختیار کی ہے۔ ہم نے عوام سے اپنے تعلقات بہت جلد استوار کر لئے ہیں اور ملک بھر میں کانگرس کی طاقت اور وقار میں بہت اضافہ ہو گیا ہے۔ کانگرس کا پیغام ہر دور افتادہ جھونپڑی تک پہنچ گیا ہے اور عوام کا سیاسی شعور روز بروز بڑھ رہا ہے۔ پس یہ لازم ہے کہ ہمارے تعلیمی نظام اور پبلک کاروبار کی بنیاد صوبجاتی زبانوں پر رکھی جائے۔

یہ زبانیں کون کون سی ہیں۔ اول ہندوستانی اپنی دونوں صورتوں یعنی اردو اور ہندی یا اور اپنی مختلف بولیوں کے ساتھ۔ پھر بنگالی۔ مرہٹی اور گجراتی جو ہندی کی بہنیں ہیں اور اس سے ملتی جلتی ہیں، جنوب میں تامل۔ تلوگو۔ کناری اور ملیالم۔ ان کے علاوہ اڑیا۔ آسامی اور سندھی ہیں

اور شمال مغرب میں پنجابی اور پشتو۔ یہ بارہ تیرہ زبانیں سارے ہندوستان پر حاوی ہیں ان میں سے ہندوستانی سب سے وسیع الاثر ہے اور ایک لحاظ سے ملک بھر کے لئے مشترکہ زبان ہونے کا دعوےٰ رکھتی ہے۔

(۵)

صوبجاتی زبانوں کے مختلف دائروں میں مداخلت کئے بغیر ہمیں ہندوستان بھر کے لئے اظہار خیالات کے ایک مشترک ذریعے کی بھی ضرورت ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ کام انگریزی سے لیا جا سکتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ جہاں تک اونچے طبقے کی ضروریات اور ہندوستان کی مشترکہ سیاسی اغراض کا تعلق ہے۔ انگریزی سے ایک حد تک کام لیا جا چکا ہے لیکن اگر ہم جمہور کا خیال کریں تو یہ نظریہ بالکل غلط ثابت ہو جائے گا۔ ہم کروڑوں انسانوں کو ایک بالکل غیر زبان میں تعلیم نہیں دے سکتے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے گذشتہ تعلقات اور اپنی موجودہ عالمگیر اہمیت کے باعث انگریزی لازمی طور پر ہمارے لئے ایک بہت اہم زبان رہے گی۔ بیرونی دنیا سے رابطہ رکھنے میں ہمارے لئے یہ سب سے اہم زبان ہو گی اگرچہ مجھے امید ہے کہ اس مطلب کے لئے بھی یہ واحد زبان نہیں ہو گی۔ میری رائے میں ہمیں دوسری غیر ملکی زبانیں مثلاً فرانسیسی۔ جرمن۔ روسی۔ اسپینی۔ اطالوی۔ چینی اور جاپانی بھی سیکھنی چاہئیں۔ بہر حال یہ طے شدہ ہے کہ انگریزی جمہور کے لئے ہندوستان کی مشترکہ زبان نہیں بن سکتی۔ یہ امتیاز ہندوستانی اور فقط ہندوستانی ہی کو حاصل ہو سکتا ہے جسے آج بارہ کروڑ انسان بولتے ہیں اور ان کے علاوہ کروڑوں پوری طرح نہیں تو ایک بڑی حد تک سمجھ سکتے ہیں اور وہ لوگ جو ہندوستانی نہیں جانتے کسی غیر ملکی زبان کے مقابلے میں اسے نہایت آسانی سے سیکھ سکتے ہیں۔ ہندوستان کی مختلف زبانوں میں بہت سے مشترک الفاظ ہیں۔ لیکن اس امر سے بہت زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ان زبانوں کا تمدنی پس منظر، بولنے والوں کے جذبات و خیالات اور لسانی میلانات ایک ہیں۔ ان وجوہ سے۔ ایک ہندوستانی کے لئے ایک دوسری ہندوستانی زبان سیکھنا نسبتاً بہت آسان ہے۔

(۶)

ہندوستانی کیا ہے؟ ہم مبہم طور پر کہتے ہیں کہ یہ لفظ ہندی اور اردو دونوں پر جیسا کہ یہ بولی اور علیحدہ علیحدہ لکھی جاتی ہیں۔ حاوی ہے اور ہم دونوں میں سے ایک درمیانی زبان نکال لیتے ہیں اور اس اپنی دریافت کردہ اوسط کا نام ہندوستانی رکھ دیتے ہیں۔ کیا یہ اوسط محض ایک خیال بے بنیاد ہے یا اس کے واقعی کچھ معنی بھی ہیں!

ہندوستانی کی جیسا کہ وہ شمالی اور وسطی ہندوستان کے مختلف حصوں میں بولی اور لکھی جاتی ہے۔ بہت سی مختلف صورتیں ہیں جن سے کئی چھوٹی چھوٹی بولیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ مگر یہ تعلیم کی کمی کے لازمی نتائج ہیں اور جمہور میں تعلیم کے عام ہونے سے یہ غائب ہو جائیں گی اور صحتِ زبان کا ایک معیار قایم ہو جائے گا۔

رہا رسم الخط۔ تو دیوناگری اور اردو طرزِ تحریر ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں اور اس بات کا قطعی کوئی امکان نہیں کہ ان میں سے ایک رسم الخط دوسرے کو جذب کر لے گا اس لئے ہم نے یہ بہت اچھا فیصلہ کیا ہے کہ دونوں اپنی اپنی جگہ قایم رہیں اور پھولیں پھلیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس صورت میں اُن لوگوں پر جو دونوں زبانیں سیکھنا چاہیں گے ایک زائد بار پڑے گا اور ایک حد تک جداگانہ ذہنیت کی حوصلہ افزائی بھی ہو گی۔ لیکن ہمیں یہ قباحتیں برداشت ہی کرنی پڑیں گی کیونکہ اس کے سوا کوئی اور چارہ نہیں ہے۔ دونوں رسم الخط ہماری زبان کی مخصوص طبیعت کے حصے ہیں اور ان کے گرد نہ صرف ان سے مخصوص ادبیات جمع ہو گئی ہیں بلکہ جذبات کے ایسے زبردست حصار کھینچ گئے ہیں جن کی شکست و ریخت ناممکن ہے۔ میں نہیں جانتا کہ مستقبل بعید ہمارے لئے کیا کچھ لائے گا لیکن اس وقت تو دونوں کو جوں کا توں رکھنا پڑے گا۔

زبان کے متعلق ہماری بعض مشکلات کے حل کے لئے لاطینی رسم الخط کی وکالت بھی کی گئی ہے۔ تیز کام انجام دینے کے لحاظ سے یہ رسم الخط اپنے اندر بلاشبہ اردو یا ہندی دونوں سے زیادہ قابلیت رکھتا ہے ٹائپ رائٹر۔ ڈپلیکیٹر اور اس قسم کی دوسری مشینوں کے اس دور میں لاطینی طرزِ تحریر کو ہندوستان کے رسوم الخط پر واقعی بہت فوقیت حاصل ہے۔ کیونکہ موخر الذکر ان ایجادات سے پورا فایدہ نہیں اٹھا سکتے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ان فواید کے باوجود لاطینی رسم الخط کے لئے اردو یا دیوناگری کی جگہ لینے کا قطعاً کوئی امکان نہیں۔ جذبات کا حصار تو ہے ہی اور اسے مزید تقویت اس بات سے پہنچتی ہے کہ لاطینی رسم الخط ہمارے غیر ملکی فرماں رواؤں سے میل

رکھتا ہے لیکن اس کے مسترد کرنے کی اور مستحکم وجوہات بھی ہیں۔ ہمارے رسوم الخط ہماری ادبیات کے لازمی حصے ہیں۔ ان کے بغیر ہم اپنی قدیم روایات سے بالکل جدا ہو جائیں گے۔

یہ ضرور ممکن ہے کہ ہم اپنے رسوم الخط کی ایک حد تک اصلاح کر لیں ہندی اور اردو کے علاوہ اس وقت بنگالی، مرہٹی، گجراتی ایسے رسوم الخط ہیں جو دیوناگری سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ یہ بہت آسانی سے ممکن ہے کہ ان چار زبانوں کے لئے ایک رسم الخط مقرر کر دیا جائے اور ضروری نہیں کہ یہ موجودہ دیوناگری رسم الخط ہی ہو۔ اس میں قدرے تبدیلی کی جا سکتی ہے۔ مذکورہ بالا چار زبانوں کے لئے ایک رسم الخط کا قرار پا جانا ان سب کے لئے مفید ثابت ہوگا اور انہیں ایک دوسرے سے قریب تر لے آئے گا۔

مجھے معلوم نہیں کہ جنوب کی دراوڑی زبانوں کے طرز ہائے تحریر کی کسی شمالی رسم الخط سے مطابقت کہاں تک ممکن ہے یا وہ آپس میں کس حد تک مربوط ہو سکتے ہیں۔ جن اصحاب نے اس سوال کا مطالعہ کیا ہے وہ اس بارے میں ہماری رہبری کر سکتے ہیں۔

اردو رسم الخط کو موجودہ صورت پر ہی قایم رکھنا ہوگا۔ ہاں اسے کسی حد تک آسان تر بنانے کی کوشش کی جا سکتی ہے اور اس کے لئے بہت آسان ہے کہ سندھی رسم الخط کو جو اس سے بہت ملتا ہے۔ اپنے میں جذب کر لے۔

پس آگے چل کر ہمارے لئے دو رسوم الخط رہ جائیں گے۔ ہندی بنگالی مرہٹی اور گجراتی کا مربوط رسم الخط اور اردو طرز تحریر اور اگر ضرورت ہو تو ایک جنوبی رسم الخط۔ ان میں سے کسی ایک کو دبانے یا مٹانے کی ہرگز کوئی کوشش نہیں ہونی چاہئے۔ سوائے ایسی صورت میں کہ اہل جنوب و شمال باہمی رضامندی سے جنوبی زبانوں کے رسم الخط کو ایک شمالی طرز تحریر کے مطابق کر لیں۔ اور یہ طرز تحریر ہندی یا ہندی کی خفیف سی تبدیل شدہ صورت ہی ہو سکتی ہے۔

(۷)

اب ہمیں ہندوستانی پر بحیثیت شمالی اور وسطی ہند کی مادری زبان کے اور بحیثیت ہندوستان کی مشترکہ زبان کے علٰحدہ علٰحدہ غور کرنا چاہئے۔ کیونکہ یہ دونوں حیثیتیں ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ ہندی اور اردو اس زبان کی دو بڑی صورتیں ہیں اور اس میں کلام نہیں کہ دونوں کی بنیاد گریمر اور معمولی الفاظ کا ذخیرہ ایک ہی ہے اور دونوں درحقیقت ایک ہی بنیادی زبان ہیں۔ تاہم ان کے موجودہ اختلافات کچھ کم نہیں اور کہا جاتا ہے کہ ایک اپنا وجدان سنسکرت سے حاصل کرتی ہے اور دوسری کسی حد تک فارسی سے۔ ہندی کو ہندوؤں کی اور اردو کو مسلمانوں کی زبان سمجھنا حماقت ہے۔ اردو اپنی طرز تحریر کے سوا سراسر خاک ہند کی پیداوار ہے اور ہندوستان کے باہر اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں اور آج بھی شمالی ہند میں ہندوؤں کے بے شمار گھرانوں میں اردو ہی بولی جاتی ہے۔

ہندوستان کے مسلم فرمانروا اپنے ساتھ فارسی لائے اور یہی ان کے درباروں کی سرکاری زبان قرار پائی اور اس کی یہ حیثیت مغل بادشاہوں کی حکومت کے آخر تک قایم رہی اس اثنا میں شمالی اور وسطی ہند کے جمہور کی زبان ہندی ہی رہی اور چونکہ یہ ایک زندہ زبان تھی اس نے فارسی کے بہت سے الفاظ اپنے میں جذب کر لئے۔ علیٰ ہذا گجراتی اور مرہٹی نے بھی کئے۔ لیکن اصلیت کے لحاظ سے ہندی ہندی ہی رہی۔ مغل دربار کے قرب و جوار میں ہندی کی ایک مبالغہ آمیز فارسی صورت رواج پا گئی جسے ریختہ کہتے تھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لفظ اردو مغل شہنشاہوں کے عہد میں مغل چھاؤنیوں میں رائج ہوا لیکن یہ ہندی کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ اس سے ہندی کی ایک ذرا مختلف صورت بھی مراد نہیں لی جاتی تھی اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ تک اردو کے معنی رسم الخط کو چھوڑ کر ہندی ہی سمجھے جاتے تھے اور جیسا کہ سب کو معلوم ہے ہندی کے بعض بہترین شاعر مسلمان ہوئے ہیں۔ اس ہنگامہ تک بلکہ اس سے کچھ بعد تک زبان کا نام ہندی ہی رائج تھا اس میں رسم الخط کی طرف کوئی اشارہ نہیں تھا بلکہ محض ملک ہند کی زبان مراد تھی مسلمان لکھنے والے بھی جو اردو رسم الخط میں لکھتے تھے۔ زبان کو ہندی کا نام دیتے تھے۔

یہ انیسویں صدی کے وسط آخر کا ذکر ہے کہ ہندی اور اردو کے الفاظ کے دو مختلف معنی لئے جانے لگے اور یہ اختلاف روز بروز بڑھتا گیا۔

غالباً پہلے پہل ہندوؤں نے قومیت کے روز افزوں احساس سے متاثر ہو کر خالص ہندی اور دیوناگری رسم الخط کے استعمال پر زور دینا شروع کیا۔ ان کے لئے قوم پرستی شروع شروع میں لازمی طور پر ہندو قوم پرستی تھی۔ کچھ عرصہ کے بعد مسلمانوں میں بھی آہستہ

آہستہ قومیت کے جذبات بیدار ہونے شروع ہوئے اور انہوں نے مسلم قوم پرستی کی شکل اختیار کر لی اور اس کی فضا میں اردو مسلمانوں کی مخصوص ملکیت تصور کی جانے لگی۔ اب رسم الخط کی بحث چھڑ گئی اور سرکاری دفاتر اور عدالتوں میں اس کے استعمال پر کھینچا تانی شروع ہو گئی۔ پس زبان کی روز افزوں تفریق اور رسوم الخط کی باہم آویزش سیاسی اور قومی شعور کی اس بیداری کے نتائج تھے جس نے پہلے پہل فرقہ پرستی کی صورت اختیار کی لیکن جوں جوں یہ فرقہ دارانہ قوم پرستی سچی قوم پرستی میں تبدیل ہوتی گئی اور لوگوں نے مسائل کو فرقہ داری کے زاویۂ نگاہ کی بجائے خالص ملکی نقطۂ نظر سے دیکھنا شروع کیا توں توں زبان میں علیحدگی کے رجحان کو روکنے کی خواہش پیدا ہوتی گئی اور سمجھ دار لوگ اردو ہندی کی مشترک خوبیوں اور خصوصیتوں کو نمایاں کرنے کی کوششوں میں مصروف ہو گئے۔ ہندوستانی کو نہ صرف شمالی اور وسطی ہند کی قومی زبان سمجھا جانے لگا بلکہ اسے ہندوستان کی واحد مشترکہ زبان قرار دئے جانے کے تذکرے بھی شروع ہو گئے۔ لیکن بدقسمتی سے ہندوستان میں ابھی فرقہ وارانہ ذہنیت کافی اثر رکھتی ہے۔ اس لئے ملک میں اتحاد لسانی کی خواہش کے ساتھ ساتھ علیحدگی کا رجحان بھی موجود ہے ضروری ہے کہ یہ جداگانہ ذہنیت شعور قومیت کی پوری بیداری کے بعد غائب ہو جائے گی اور ہم پر نہایت وضاحت سے یہ حقیقت آشکار ہو جائے گی کہ اس خرابی کی اصل وجہ کیا ہے اب بھی اگر آپ زبان کی علیحدگی کے کسی پرجوش حامی کا بیرونی رنگ و روغن اتار کر دیکھیں تو وہ حقیقت میں فرقہ پرست بلکہ اکثر اوقات سیاسی طور پر رجعت پسند نکلے گا۔

(۸)

اگرچہ مغل دور میں ایک طویل عرصہ تک اردو اور ہندی کے الفاظ ایک معنی میں استعمال ہوتے رہے لیکن اردو سے زیادہ تر وہ مخلوط زبان مراد لی جاتی تھی جو مغل چھاؤنیوں میں رائج تھی۔ شاہی دربار اور عسکری فرودگاہوں کے ارد گرد بہت سے فارسی الفاظ رائج تھے اور یہ اس زبان میں داخل ہوتے گئے۔ ہم جوں جوں مغل درباری زندگی کے مرکزوں سے دور دور ہوتے ہوئے جنوب کی طرف بڑھتے ہیں۔ اردو کو خالص ہندی میں سمویا ہوا پاتے ہیں۔ یہ ناگزیر تھا کہ دربار کا لسانی اثر دیہات کی بہ نسبت شہروں پر اور پھر جنوبی شہروں کی بہ نسبت شمالی شہروں پر بہت زیادہ ہوا۔

اور یہ نکتہ ہمیں اردو اور ہندی کے موجودہ حقیقی فرق کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اردو شہروں کی زبان اور ہندی دیہات کی زبان ہے، ہندی شہروں میں بھی بولی جاتی ہے لیکن اردو قریب قریب صرف ایک شہری زبان ہے۔ پس اردو اور ہندی کو آپس میں قریب تر لانے کا مسئلہ درحقیقت گاؤں اور شہر کے باہمی اتصال کا اہم ترین مسئلہ بن جاتا ہے۔ اس کے سوا کوئی دوسرا ذریعہ اختیار کرنا نہ صرف فضول ہوگا بلکہ ناپائدار ثابت ہوگا۔ زبانیں اپنی ہیئت اسی وقت بدلتی ہیں جب ان کو بولنے والے لوگ بھی بدل جاتے ہیں۔

(۹)

اگرچہ گھروں میں بولی جانے والی اردو ہندی میں باہم چنداں فرق نہیں لیکن گذشتہ چند سال سے علمی و ادبی اردو ہندی کی درمیانی خلیج بہت وسیع ہو گئی ہے۔ ادبی تصنیفات میں یہ فرق بہت نمایاں ہے اور اس سے بعض لوگوں نے نتیجہ نکالا ہے کہ اس فرق کے پس پشت بدنیت لوگوں کے اغراض کام کر رہے ہیں۔ یہ خیال کم فہمی پر مبنی ہے اگرچہ اس میں شک نہیں بعض افراد جدائی کے رجحان کو زیادہ کرنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں لیکن زندہ زبانیں اس طرح توڑی مروڑی نہیں جا سکتیں اور چند افراد ان پر اس قسم کی قدرت حاصل نہیں کر سکتے۔ اس ظاہری فرق کی اصلیت معلوم کرنے کے لئے ہمیں زیادہ گہرائی میں دیکھنا پڑے گا۔

یہ تفاوت اگرچہ بجائے خود قابل افسوس ہے لیکن حقیقت میں صحت مندانہ نشوونما کی علامت ہے۔ اردو اور ہندی دونوں زبانیں سکون و جمود کے ایک لمبے وقفہ کے بعد بیدار ہوئی ہیں اور آگے بڑھنے میں مصروف ہیں۔ وہ نئے نئے خیالات کو جامۂ اظہار پہنانے اور پرانی روشوں کو چھوڑ کر ادبیات میں جدید طرز بیان اور ادائے مطالب اختیار کرنے کے لئے جدوجہد کر رہی ہیں

جہاں تک جدید تصورات کا تعلق ہے دونوں زبانوں کا ذاتی سرمایہ الفاظ کم ہے لیکن دونوں کی دسترس میں سنسکرت اور فارسی کے دو بیش بہا معدن ہیں۔ اس لئے جوں ہی ہم گھر اور بازار کی عام زبان سے آگے بڑھ کر زیادہ لطیف حلقوں میں داخل ہوتے ہیں۔ دونوں زبانوں کا باہمی فرق نمایاں تر ہو جاتا ہے۔ ادبی انجمنیں جنہیں

اپنی اپنی زبانوں کی پاکیزگی کا بہت خیال رہتا ہے۔ اس رجحان کو انتہا تک لے جاتی ہیں اور پھر ایک دوسرے پر جداگانہ میلانات کی حوصلہ افزائی کا الزام لگایا کرتی ہیں۔ اپنی آنکھ کا شہتیر نہیں دیکھتیں اور دوسرے کی آنکھ کا تنکا انہیں بہت آسانی سے نظر آجاتا ہے۔

مذکورہ بالا اسباب کا فوری نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہندی اور اردو کی درمیانی خلیج وسیع تر ہوتی جا رہی ہے اور بعض دفعہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کا جدا جدا زبانیں بن جانا مقدر ہو چکا ہے تاہم یہ خوف بے بنیاد ہے اور گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں۔ ہمیں اس نئی زندگی کا خیر مقدم کرنا چاہیے جو اردو اور ہندی دونوں کے پیکر میں سرایت کر رہی ہے۔ خواہ اس سے ان کا باہمی اختلاف عارضی طور پر زیادہ ہی کیوں نہ ہو رہا ہو۔ ہندی اور اردو دونوں اس وقت جدید علمی۔ سیاسی معاشرتی۔ تجارتی اور بعض اوقات مذہبی تصورات کے موزوں اظہار کی پوری اہلیت نہیں رکھتیں دونوں زبانیں اپنا سرمایہ بڑھانے کی کامیاب جد و جہد میں مصروف ہیں تاکہ وہ دورِ جدید کے سماج کی لسانی ضروریات پوری کر سکیں۔ پھر ایک دوسرے سے حسد کیوں کیا جائے۔ ہم اپنی زبان کو زیادہ سے زیادہ الفاظ کا سرمایہ دار دیکھنا چاہتے ہیں اور ایسا کبھی نہیں ہو سکتا اگر ہم ہندی یا اردو الفاظ کو اس وجہ سے مٹانے کی کوشش کرتے رہے کہ وہ ہمارے اپنے مخصوص پس منظر میں ٹھیک نہیں بیٹھتے ہمیں دونوں کی ضرورت ہے اور ہمیں دونوں کو قبول کرنا ہوگا ہمیں اس بات کا احساس ہونا چاہیے کہ ہندی کا فروغ اردو کی ترقی سے مراد ہے۔ اور اردو کی نشو و نما ہندی کے پھلنے پھولنے سے عبارت ہے۔ دونوں ایک دوسرے پر نہایت شدت سے اثر انداز ہوتی رہیں گی اور دونوں زبانوں کے الفاظ اور تصورات کے ذخیرے بڑھتے رہیں گے مگر لازم ہے کہ دونوں اپنے دروازے اور کھڑکیاں ان الفاظ اور تصورات کی آمد کے لئے پوری طرح کھلی رکھیں بلکہ میں تو چاہتا ہوں کہ ہندی اور اردو دونوں۔ غیر زبانوں کے الفاظ اور تصورات کو خوش آمدید کہیں اور انہیں اپنا لیں۔ انگریزی یا فرانسیسی یا کسی اور غیر زبان کے ایسے الفاظ کے لئے جو آسان اور مقبولِ عام ہوں۔ نئے سنسکرت اور فارسی الفاظ گھڑنا ایک احمقانہ بات ہے۔

میرے دل میں اس بات کے متعلق کوئی شک نہیں کہ اردو اور ہندی کا ایک دوسرے سے قریب تر آنا ناگزیر ہے اور اگرچہ ان دونوں کے ظاہری لباس مختلف ہوں لیکن حقیقت میں وہ ایک زبان ہو کر رہیں گی۔ اس اتحاد کو ترقی دینے والی قوتیں انفرادی کوششوں کے روکے سے نہیں رک سکتیں۔ قوم پرستی کے جذبات اور ایک متحدہ ہندوستانی قومیت کے قیام کی عالمگیر خواہش آخر میں فتح یاب ہو کر رہے گی۔ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ زمانہ کروٹ بدل چکا ہے۔ ہمارے سیاسی اور معاشرتی ماحول میں انقلاب برپا ہے آمد و رفت اور نشر و اشاعت کے ذرائع بہت تیز اور وسیع ہو چکے ہیں اور ان کی مدد سے باہمی تبادلہ خیالات اور میل جول میں آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ یہ سب اسباب مل کر زبان کے اتحاد پر یقیناً خوشگوار اثر ڈالیں گے۔ جب زمانے کا سیل رواں جوش و خروش سے ہمارے قریب سے گذر رہا ہو تو ہم تنگناؤں میں کیوں کر گھسے رہیں گے تعلیم جب عام ہو کر جمہور کو اپنے حلقے میں لائے گی تو اس میں یک جہتی اور ایک معیار کا قائم ہونا لازمی ہو جائے گا۔

(۱۰)

پس ہمیں اردو اور ہندی کے جداگانہ فروغ کو بھی شک و شبہ کی نظروں سے نہیں دیکھنا چاہیئے۔ اردو کے حامیوں کو اس نئی روح کا خیر مقدم کرنا چاہیئے جو ہندی میں سرایت کر رہی ہے اور ہندی کے عاشقوں کو بھی ان کوششوں کی داد دینی چاہیئے جو اردو کے بہی خواہ اس کی ترقی کے لئے سرانجام دے رہے ہیں۔ دونوں فریق آج ایک دوسرے سے علیحدہ رہ کر متوازی طریقوں پر کام کئے جائیں اگرچہ کل ان کا ملنا ضروری ہے اور گو ہمیں اسی موجودہ جداگانہ روش کو رضامندی سے برداشت کر لینا چاہیئے پھر بھی ہمیں دونوں زبانوں کے اتحاد کے لئے اپنی کوششیں جاری رکھنی چاہئیں۔ اس اتحاد کی بنیاد کس چیز پر رکھی جائے گی؟ یقیناً جمہور پر کیونکہ جمہور ہی کو اردو و ہندی کا مشترک عنصر قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہماری بہت سی موجودہ مشکلات کا سبب وہ حد درجہ مصنوعی ادبی زبان ہے جس کا جمہور سے کوئی تعلق نہیں کبھی آپ نے سوچا کہ جب مصنفین لکھتے ہیں تو وہ کن کے لئے لکھتے ہیں۔ ہر مصنف کے ذہن میں شعوری یا نیم شعوری طور پر ایک ایسا حلقہ سامعین ہوتا ہے جس پر وہ اپنے خیالات کا پرتو ڈالتا اور جسے اپنے نقطۂ نظر کا حامی بنانا چاہتا ہے۔ افسوس کہ ہماری عام جہالت کی وجہ سے یہ حلقہ ہمیشہ نہایت محدود رہا ہے لیکن پھر بھی یہ ہمارے مصنفین کے لئے کافی بڑا ہے اور روز بروز وسیع ہو رہا ہے۔

میں اس معاملے میں ایک ماہر کی حیثیت نہیں رکھتا لیکن میرا خیال ہے کہ ایک اوسط درجے کا ہندی یا اردو مصنف اس موجودہ حلقۂ سماعت سے بھی پوری طرح فایدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کرتا وہ ان مخصوص ادبی مجالس کا زیادہ خیال رکھتا ہے جن سے اس کا روزمرہ کا تعلق ہوتا ہے اور وہ گویا ان ہی کے لئے ان کی پسندیدہ زبان میں لکھتا ہے اس کی آواز اور اس کے الفاظ جمہور کے وسیع تر طبقہ تک نہیں پہنچتے اور اگر پہنچتے بھی ہیں تو سمجھے نہیں جاتے۔ پھر اگر اردو اور ہندی کتابیں بہت کم فروخت ہوتی ہیں تو حیران ہونے کی کونسی بات ہے۔ ہمارے اردو اور ہندی اخبارات بھی عوام کے وسیع حلقے میں نہیں پہنچتے کیونکہ وہ عام طور پر بلند طبقے کی زبان استعمال کرتے ہیں۔

بس ہمارے مصنفین کو اپنے ذہن میں ایک جمہوری حلقۂ مخاطب قایم کر کے ارادۃً عوام کے لئے لکھنے کی کوشش کرنی چاہئے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ زبان خود بخود سہل ہو جاے گی اور مصنوعی اور آرائشی بندشیں جو ہمیشہ کسی زبان کے زوال کا باعث ہوتی ہیں پرزور اور زندگی سے بھرپور الفاظ کے لئے جگہہ خالی کر دیں گی۔

ہم ابھی تک اس خیال سے چھٹکارا نہیں پا سکے کہ تہذیب اور ادبی قابلیتیں درباری حلقوں سے وابستہ اور ان ہی کی پیداوار ہوتی ہیں ہمارا یہ طرز تخیل ہمیں محدود دائروں میں قید رکھتا ہے اور ہمیں عوام کے دل و دماغ تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں دکھاتا موجودہ دور میں تہذیب و تمدن کی عمارت کو ایک وسیع تر جمہوری بنیاد پر تعمیر کرنا ہوگا۔ اور زبان کو بھی جو تہذیب و تمدن کا ایک پیکر ہے انہیں بنیادوں پر قائم ہونا پڑے گا۔

جمہور تک رسائی حاصل کرنے کا سوال محض سادہ الفاظ اور بندشوں کا مسئلہ نہیں ہے اسے ان الفاظ و فقرات کے اندرونی معانی اور تصورات سے بھی برابر کا تعلق ہے۔

ایک جمہور پسند زبان کے لئے ضروری ہے کہ اُسے عوام کے مسائل زندگی سے تعلق ہو اور وہ ان کے رنج و راحت اور امید و بیم کا ذریعہ اظہار ہو۔ اسے بحیثیت مجموعی عوام کی زندگی کا آئینہ دار ہونا چاہئے۔ نہ کہ خواص کے خیالات کی نمایندہ یہی ایک صورت ہے جس میں کوئی زبان ایک مستقل زندگی حاصل کرنے کی امید کر سکتی ہے۔

یہ نظریہ محض اردو یا ہندی نہیں بلکہ ہماری سب ہندوستانی زبانوں پر عاید ہوتا ہے مجھے علم ہے کہ ان سب میں ایسے خیالات کا اظہار ہو رہا ہے اور وہ روز بروز عوام کی طرف مائل ہو رہی ہیں۔ ہمیں اس عمل کو تیز تر کرنا چاہئے اور ہمارے مصنفین کو ارادۃً اس کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے۔

میری رائے میں ہماری زبانوں کو غیر ملکی زبانوں کے قدیم علوم اور جدید ادب سے تراجم کے ذریعے سے شناسائی پیدا کرنی چاہئے ایسا کرنے سے ہم دوسرے ممالک کی تمدنی ادبی اور سوشل تحریکات سے قریب تر ہو جائیں گے اور تازہ تصورات کی درآمد سے ہماری زبانوں کو تقویت پہنچے گی۔

میرا خیال ہے کہ سب ہندوستانی زبانوں میں بنگالی عوام سے تعلق پیدا کرنے کے لحاظ سے پیش پیش ہے۔ ادبی بنگال بنگال کی جمہوری زندگی سے کوئی علیحدہ یا دور افتادہ چیز نہیں ہے ایک فرد واحد رابندرا ناتھ ٹیگور کی وہبی قابلیت نے اس خلیج کو پاٹ دیا ہے جو گنے چنے متمدن خواص اور عوام کے درمیان حائل تھی اور اس کے پیارے گیت اور دلکش نظمیں بنگال کی چھوٹی سے چھوٹی جھونپڑیوں میں بھی سنی جاتی ہیں ان سے نہ صرف بنگالی ادب میں بیش بہا اضافہ ہوا ہے۔ بلکہ خود جمہور بنگال کی زندگیاں شاداب ہو رہی ہیں اور بنگالی زبان نازک ترین ادبی مطالب کو سادہ ترین الفاظ میں ادا کرنے کے قابل ہو گئی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ رابندرا ناتھ جیسے غیر معمولی دل و دماغ روز بروز پیدا نہیں ہوتے لیکن ہمیں ان کی مثال کی پیروی سے اپنے لئے صحیح راہ عمل تجویز کرنی چاہئے۔ اس ضمن میں مجھے گجراتی کا ذکر بھی کرنا ہے مجھے بتایا گیا ہے کہ گاندھی جی کی سادہ اور پرزور زبان نے گجراتی لٹریچر پر بہت نمایاں اثر کیا ہے۔

(۱۱)

اب ہمیں ہندوستانی پر اس کی دوسری حیثیت یعنی ہندوستان کی مشترکہ زبان کے طور پر غور کرنا چاہیئے اور اس امر کو مدنظر رکھنا چاہئے کہ اُسے بڑی بڑی صوبجاتی زبانوں سے نہ کوئی رقابت ہے اور نہ ان کے مخصوص علاقوں میں مداخلت کی ضرورت۔ اس وقت ہمیں رسم خط کا سوال ایک طرف رکھ دینا پڑے گا کیونکہ دونوں رسوم کا پھلنا پھولنا ضروری ہے اس میں شک نہیں کہ ہم دونوں رسوم کی تعلیم لازمی قرار نہیں دے سکتے کہ یہ امر عوام پر ایک ناقابل برداشت بار ثابت ہوگا حکومت

کو دونوں رسوم کی سرپرستی کرنی چاہئے اور ان میں سے کسی ایک کا انتخاب طلبا یا ان کے والدین پر چھوڑ دینا چاہئے پس ہمیں اب رسم الخط کو چھوڑ کر زبان کی اصلیت پر غور کرنا ہے

ہندوستانی ہندوستان کی ملک گیر زبان ہونے کے علاوہ چند ایسی خصوصیات بھی رکھتی ہے جو اسے ایک مشترکہ زبان ہونے کی اہلیت عطا کرتی ہیں اسے اور زبانوں کی بہ نسبت آسانی سے سیکھا جا سکتا ہے اور اس کے قواعد سہل ہیں تذکیر و تانیث کی کچھ الجھنیں ضرور رہیں لیکن سوال ہے کہ کیا ہم ہندوستانی کو اور بھی سادہ بنا سکتے ہیں۔

ہماری رہنمائی کے لئے ایک بہت کامیاب تجربہ پہلے سے موجود ہے یہ بنیادی انگریزی کی تشکیل ہے بہت سے عالموں نے کئی برس کی محنت سے انگریزی کی ایک سادہ صورت تجویز کی ہے جو اگرچہ خالص انگریزی ہے لیکن سیکھنے میں بالکل سہل ہے۔ چند نہایت سادہ قواعد کے سوا گرامر تقریباً غائب ہے اور علمی اصطلاحی اور تجارتی تراکیب کو چھوڑ کر بنیادی لغات کو صرف نو سو اسی الفاظ تک محدود کر دیا گیا ہے یہ تمام لغات اور گرامر مع الفاظ ایک صفحہ کاغذ میں سما سکتے ہیں اور ایک معمولی ذہانت رکھنے والا شخص اسے دو یا تین ہفتوں میں ازبر کر سکتا ہے ہاں اس نئی زبان کے استعمال میں مشق کی لازماً ضرورت ہوا ہے

اس تجربے کو ان کوششوں سے خلط ملط نہیں کرنا چاہئے جو قبل ازیں دنیا کے لئے ایک عام زبان مثلاً اسپرانتو و ولاپک وغیرہ تجویز کرنے کے لئے کی گئیں۔ ایسی تمام زبانیں سادہ ہونے کے باوجود بے حد مصنوعی تھیں اس لئے ان کا سیکھنا ایک زائد بار سے کم نہ تھا ان کے جسم میں زندگی کا روح پرور سانس نہیں تھا اور وہ کبھی انسانوں کی ایک بڑی تعداد کی زبان نہیں بن سکتی تھیں۔ اس کے خلاف بنیادی انگریزی ان کی تمام خوبیاں رکھنے کے باوجود مذکورہ بالا نقص سے بری ہے کیونکہ یہ ایک زندہ زبان ہے۔ بنیادی انگریزی سیکھنے سے دوسروں سے گفت و شنید کا نہ صرف ایک سادہ اور نہایت عمدہ ذریعہ حاصل ہو جاتا ہے بلکہ سیکھنے والا معیاری انگریزی کی دہلیز پر پہنچ جاتا ہے اور اگر چاہے تو آسانی سے آگے بڑھ سکتا ہے۔

بنیادی انگریزی کی نسبت میری پرجوش دلچسپی سے غالباً یہ سوال اٹھایا جائے گا کہ پھر بنیادی انگریزی ہی کو ہندوستان کی مشترکہ زبان کیوں نہ قرار دیا جائے؟ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس زبان کی طبیعت قطعی طور پر ہمارے اہل ملک کے لئے بالکل اجنبی ہے اور اسے ان پر عاید کرنے کے لئے ہمیں انہیں ان کے موجودہ ماحول سے جدا کر کے انگریزی فضا میں لانا پڑے گا۔ اس زبان کو رائج کرنے میں جو عملی مشکلات درپیش آئیں گی۔ وہ ہندوستانی کی ترویج کے مقابلے میں جو پہلے سے ملک پر چھا رہی ہے بے حد زیادہ ہوں گی۔

لیکن میرا خیال ہے کہ جہاں ہم انگریزی ایک غیر ملکی زبان کے طور پر سکھاتے ہیں (اور ظاہر ہے کہ انگریزی کی تعلیم ایک وسیع پیمانے پر جاری رکھنی پڑے گی) وہاں بنیادی انگریزی سکھائی جائے اور صرف وہ لوگ معیاری انگریزی سیکھیں جو اس زبان کا بطورِ خاص مطالعہ کرنا چاہتے ہوں۔

(۱۲)

کیا بنیادی انگریزی کی طرح ہم ایک بنیادی ہندوستانی تیار کر سکتے ہیں! میرے خیال میں اگر ہمارے عالم اس طرف توجہ دیں تو یہ بات آسانی سے ہو سکتی ہے۔ گرامر جس قدر سادہ ہو سکے کر دی جائے لیکن اسے موجودہ قواعد کی خلاف ورزی کی اجازت نہ دی جائے۔ اس ضمن میں سب سے ضروری بات یہ مدنظر رکھنی چاہئے کہ یہ بنیادی زبان اگرچہ تمام غیر اصطلاحی خیالات و تصورات کے اظہار کے لئے بجائے خود ایک مکمل چیز ہو لیکن زبان کے وسیع تر مطالعہ کے لئے صرف ایک دروازے کا کام دے۔ لغات کم و بیش ایک ہزار ایسے الفاظ پر مشتمل ہو سکتی ہے جو بے ترتیبی سے نہ چنے جائیں اور ان کے انتخاب میں یہ امر ملحوظ نہ رکھا جائے کہ وہ ہندوستانی زبانوں کے مشترک الفاظ ہیں۔ بلکہ یہ دیکھا جائے کہ ایسا ہر لفظ مکمل ہو اور کسی خارجی مدد کے بغیر عام بول چال میں اپنا مطلب بخوبی واضح کر سکے۔

ایسی بنیادی ہندوستانی ملک کی مشترکہ زبان قرار دی جائے حکومت کی تھوڑی سی امداد سے یہ نہایت سرعت سے تمام ملک میں پھیل جائے گی اور اس قومی اتحاد کے قیام میں مدد دے گی جو ہم سب کو اس قدر عزیز ہے۔ یہ نہ صرف اردو اور ہندی کو ایک دوسرے کے قریب تر لے آئے گی۔ بلکہ زبانوں کا ایک آل انڈیا اتحاد قایم کرنے میں معاون ثابت ہوگی۔ ایسی مضبوط اور مشترکہ بنیاد پر اگر زبان کی مختلف صورتیں بھی قایم ہوئیں تو وہ جدائی کی طرف نہیں لے جائیں گی۔ وہ لوگ جو

ہندوستانی کا وسیع تر مطالعہ کرنا چاہیں گے آسانی سے اپنا مقصد حاصل کر سکیں گے اور جو لوگ بنیادی ہندوستان پر قائم رہنا چاہیں گے وہ بھی قوم کی وسیع تر زندگی میں حصہ لے سکیں گے۔

میں اس سے پہلے کہہ چکا ہوں کہ ہمیں اردو اور ہندی کے جداگانہ فروغ پر اعتراض نہیں کرنا چاہئے۔ دونوں اطراف سے جو نئے الفاظ آئیں گے۔ وہ اگر زندہ الفاظ ہوں گے اور حالات کے دباؤ یا عوام میں مقبولیت کے باعث ہم تک پہنچیں گے تو وہ یقیناً ہمارے ترکے میں بیش بہا اضافہ کریں گے۔ لیکن ایسے مصنوعی الفاظ جن کی پشت پر ایسی کوئی طاقت یا تحریک نہیں ہوگی اس شق میں داخل نہیں ہوں گے ہمیں مصنوعی الفاظ زیادہ تر اپنی روزافزوں سیاسی معاشرتی علمی اور تجارتی ضروریات کی تکمیل کے لئے بنانے پڑے ہیں۔ ان الفاظ کی صنعت میں ہمیں تواتر اور جداگانہ ذہنیت اختیار کرنے سے پرہیز کرنا چاہئے۔ ہمیں جرأت سے کام لے کر ایسے غیر ملکی اصطلاحی الفاظ جو دنیا کی زبانوں میں مشترک ہو چکے ہیں۔ بلا تکلف ہندوستانی میں داخل کر لینے چاہئیں نہ صرف ہندوستانی میں بلکہ ہندوستان کی دیگر زبانوں میں بھی۔ اس طرح ہمارے اہل وطن کو ہندوستانی اور غیر ہندوستانی زبانوں میں ایک ہی قسم کے اصطلاحی الفاظ سے دوچار ہونا پڑے گا اور اس کا فائدہ ظاہر ہے۔ اس کے خلاف کرنے سے اُن طالب علموں کے لئے جنہیں مختلف زبانوں میں مختلف اصطلاحات سے سابقہ پڑتا ہے۔ بہت سی الجھنیں پڑ جائیں گی۔ ایک علیحدہ سائنٹیفک اور علمی مجموعۂ الفاظ مرتب کرنے سے ہماری علمی نشو و نما دوسرے علمی حلقوں سے علیحدہ ہو کر کمزور ہو جائے گی اور اساتذہ اور طلبا پر بے حد بار پڑ جائے گا۔ دنیا کی جمہوری زندگی اور پبلک معاملات آپس میں بے حد مربوط ہیں اور مل کر ایک واحد سالمہ بناتے ہیں۔ ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ ہمارے اہل وطن انہیں سمجھ سکیں اور ان میں حصہ لے سکیں اور غیر ملکی لوگ بھی ہمارے پبلک معاملات میں ایسی ہی دلچسپی لے سکیں۔

اس طرح بہت سے غیر ملکی الفاظ ہندوستانی زبان میں لئے جا سکتے اور لئے جانے چاہئیں۔ مگر ہمیں اپنی زبان میں بھی ایسے اصطلاحی الفاظ کی کافی تعداد دستیاب ہو جائے گی۔ مناسب ہو گا اگر ماہرین زبان عام استعمال کے لئے ایسے الفاظ کی ایک جامع فہرست مرتب کر دیں۔ ایسا کرنے سے نہ صرف ان معاملات میں جہاں اختلاف اور ابہام نہایت مذموم ہوتا ہے۔ یکسانیت اور صحت پیدا ہو جائے گی بلکہ بے معنی الفاظ اور بندشوں کا استعمال بند ہو جائے گا۔ ہمارے اخبار نویس دوستوں کی یہ عادت ہے کہ وہ غیر ملکی الفاظ اور تراکیب کا نہایت بے تکلفانہ ترجمہ کر ڈالتے ہیں جو ان کے اصل مطلب سے چنداں تعلق نہیں رکھتا اور پھر یہ ڈھیلے ڈھالے الفاظ نشر و اشاعت کی کرامات سے رائج الوقت سکہ بن کر خیالات کی بے شمار الجھنیں پیدا کر دیتے ہیں۔ مثلاً ٹریڈ یونین کا ترجمہ بعض دفعہ بیوپار سنگ کیا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ بالکل درست لفظی ترجمہ ہے لیکن اسے ٹریڈ یونین کے معنوں سے دور کی نسبت بھی نہیں اس سے بہت زیادہ دلچسپ ترجمہ امپیریل پریفرنس کا ہے جسے ایک من چلے اخبار نویس نے "شاہی پسند" کے دلکش الفاظ میں پیش کیا ہے۔

(۱۳)

اب یہ دیکھنا ہے کہ زبان کے متعلق حکومت کی پالیسی کیا ہونی چاہئے۔ حکومت کے لئے عدالتی، دفاتر اور تعلیم کے معاملے میں اس مسئلے کا فیصلہ کرنا لازمی ہے۔

ہر صوبے میں حکومت کے امور وہاں کی مقامی زبان میں سرانجام پانے چاہئیں لیکن ہر صوبے میں ہندوستانی کی آل انڈیا حیثیت کا سرکاری طور پر تسلیم کیا جانا ضروری ہے۔ ہندوستانی بولنے والے صوبوں میں دونوں رسوم کا سرکاری طور پر تسلیم کیا جانا لازمی ہے اور ہر شخص کو اس امر کا اختیار ہونا چاہئے کہ وہ کسی عدالت یا دفتر سے تخاطب میں ہندی رسم الخط برتے یا اردو اور ایسی حالت میں اُس پر دوسرے رسم الخط میں نقل مہیا کرنے کا بار نہیں ڈالنا چاہئے کسی ایک رقبہ میں جو رسم الخط رائج ہو وہاں کی عدالت یا دفتر کی بیشتر کارروائی اس میں انجام پائے گی اور اس بات پر اصرار بے جا ہو گا کہ ہر عبارت دونوں رسوم میں لکھی جائے۔ مگر سرکاری اعلانات کا دونوں رسوم میں شائع کیا جانا ضروری ہے۔ سرکاری تعلیم کے لئے کلیتہً قاعدہ یہ ہو کہ یہ طالب علم کی زبان میں دی جائے۔ پس ہر لسانی رقبہ کے لئے وہاں کی مقامی زبان ذریعہ تعلیم قرار پائے۔ لیکن میں ایک قدم آگے بڑھتا ہوں۔ جہاں کہیں ایک خاص لسانی گروہ سے متعلق افراد کی خاصی تعداد موجود ہو اور اُن کی زبان اپنے حلقے کی زبان سے مختلف ہو تو انہیں حق حاصل ہو گا کہ وہ اپنی زبان میں تعلیم حاصل کرنے کا مطالبہ کریں۔

ایک حد تک ایسے مطالبے کی تکمیل کا انحصار اس بات پر بھی ہوگا کہ ایک خاص مرکز میں ارد گرد کے طلبہ آسانی سے جمع ہو سکتے ہوں۔ یہ سہولت پرائمری تعلیم کے لئے ضروری ہوگی اور اگر طلبا کی تعداد کافی ہو تو ثانوی تعلیم کے لئے بھی جائز ٹھہرائی جائے۔

مثلاً کلکتہ میں ذریعۂ تعلیم بنگالی ہوگا۔ لیکن وہاں ایسے افراد کے بہت بڑے بڑے گروہ موجود ہیں جن کی مادری زبانیں ہندوستانی تامل، تلگو اور گجراتی ہیں۔ ان میں سے ہر گروہ حکومت سے مطالبہ کر سکتا ہے کہ ان کے بچوں کی پرائمری تعلیم ان کی مادری زبان میں دی جائے یہ عمل ثانوی تعلیم میں کہاں تک جاری رکھا جا سکتا ہے۔ اس کی بابت میں بہت کچھ نہیں جانتا۔ اس کا انحصار طلبا کی تعداد اور دیگر متعلقہ امور پر ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ ثانوی تعلیم کے ابتدائی درجوں میں اور اس کے بعد ان طلبا کو اپنے لسانی حلقے کی زبان ضرور سیکھنی پڑے گی۔

ہندوستانی بولنے والے صوبوں کے مدارس میں اردو اور دیوناگری دونوں رسوم خط سکھائے جائیں گے اور طلبہ یا اُن کے والدین کو ان میں سے ایک کے انتخاب کا حق حاصل ہوگا۔ پرائمری کے درجوں میں صرف ایک رسم الخط سکھایا جائے اور ثانوی مدارج میں دوسرا رسم الخط سیکھنے کی حوصلہ افزائی کی جائے اور ہندوستانی نہ بولنے والے صوبوں کے مدارس میں ثانوی درجوں میں بنیادی ہندوستانی سکھائی جانی چاہیئے اور رسم الخط کے انتخاب کا سوال اشخاص متعلقہ پر چھوڑ دینا چاہیئے۔

یونیورسٹی کی تعلیم بھی لسانی حلقوں کی زبان میں دی جائے اور ہندوستانی (کسی ایک رسم الخط کے ساتھ) اور ایک غیر ملکی زبان لازمی قرار دی جانی چاہیئے۔

لیکن یہ التزام صنعتی مدارس اور اعلیٰ صنعتی تعلیم پر عاید نہیں ہونا چاہیئے۔

ثانوی مدارس میں غیر ملکی اور ہماری قدیم قومی زبانوں کی تعلیم کا بھی انتظام ہونا چاہیئے لیکن سوائے خاص نصابات لینے اور یونیورسٹی میں داخل ہونے کی صورت کے ان کی تعلیم لازمی قرار نہیں دی جانی چاہیئے۔

صوبجاتی زبانوں میں میں نے پنجابی اور پشتو کا ذکر کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ پرائمری تعلیم انہی زبانوں میں دی جانی چاہیئے۔ لیکن چونکہ یہ کافی طور پر ترقی یافتہ نہیں ہیں غالباً اس لئے اعلیٰ تعلیم کے لئے موزوں ثابت نہیں ہوں گی۔ ان علاقوں میں غالباً اعلیٰ تعلیم کے لئے ہندوستانی ہی بہترین زبان ثابت ہوگی۔

(۱۴)

میں نے اپنی بہت سی باتیں صحیح فرض کر کے جو مختلف تجاویز پیش کی ہیں۔ ان کا تعلق پرائمری تعلیم سے لے کر یونیورسٹی کی تعلیم تک سے ہے ان پر نکتہ چینی کرنا اور ان مشکلات کا واضح کرنا جو ان کی تکمیل میں حائل ہو سکتی ہیں۔ شاید چنداں مشکل نہ ہوگا۔ کیونکہ میں نہ ماہر تعلیم ہوں اور نہ ماہر زبان مگر میرا ماہر نہ ہونا ہی شاید میرے لئے مفید ہے کیونکہ میں اس مسئلہ کو ایک عام شخص کے غیر جانبدارانہ نقطۂ نگاہ سے دیکھ سکتا ہوں۔ میں اس امر کی بھی وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ اس مضمون میں تعلیم کے اہم اور مشکل مسئلہ پر بحث نہیں کر رہا۔ میں صرف اس کے لسانی پہلو کا جائزہ لے رہا ہوں۔ جب ہم تعلیم کے مکمل موضوع پر غور کریں گے۔ تو ہمیں بہت سی باتیں مد نظر رکھنی پڑیں گی۔ مثلاً ہمیں اس سوسائٹی اور حکومت کی کیفیت کو ملحوظ رکھنا ہوگا جس میں یہ تعلیم جاری ہوگی۔ ہمیں اس بات کا فیصلہ کرنا ہوگا کہ ہمارے شہری اور اُن کے مشاغل کس قسم کے ہوں۔ ہمیں ان کی زندگی اور کاروبار کی رعایت سے اُن کی تعلیم کا معیار قائم کرنا ہوگا۔ ہمیں ان کی خانگی، سماجی اور پبلک زندگیوں میں ایک یک آہنگی اور مطابقت پیدا کرنی ہوگی۔ اگر ہمیں دنیا کی دوسری قوموں کے دوش بدوش چلنا ہے تو ہمیں صنعتی اور سائنٹیفک تربیت پر بہت زیادہ زور دینا ہوگا۔ ہمیں یہ سب کچھ اور اس سے بہت کچھ زیادہ کرنا پڑے گا اور ایسا کرنے میں ہمیں موجودہ بے کار فرسودہ اور سرگراں نظام تعلیم کو مٹا کر اس کی جگہ زیادہ مضبوط بنیادوں پر ایک نیا نظام تعلیم تعمیر کرنا ہوگا۔

لیکن اس وقت ہمیں اپنی توجہ صرف زبان کے سوال تک محدود رکھ کر کسی متفقہ نتیجے پر پہنچنا چاہیئے میں نے یہ مضمون اس غرض سے لکھا ہے کہ اس پر ایک وسیع تر زاویۂ خیال سے اہل بصیرت کو دعوتِ فکر دوں۔ اگر ہم اُن عام اصولوں پر متفق ہو جائیں جن پر میں نے بحث کی ہے تو عملی اعتبار سے ان کا نفاذ چنداں مشکل ثابت نہ ہوگا۔ موجودہ نام نہاد صوبجاتی خود مختاری کے باوجود ہم ان میں سے بہت سے اصولوں کو نافذ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ ہمارے مالی ذرائع

ناکافی ہیں اور کئی دیگر مشکلات ہمارے راستے میں حائل ہیں لیکن جس حد تک ممکن ہو ہمیں ان پر عمل پیرائی کی کوشش کرنی چاہئے۔

ممکن ہے کہ میری بعض تجاویز پر ایک عام اتفاق کی صورت نکل آئے اور بعض سے اتفاق نہ کیا جاسکے۔ لیکن ہمیں کم از کم یہ جان لینا چاہئے کہ ہم آپس میں کہاں تک متفق ہوسکتے ہیں۔ اس کے بعد زیر بحث مسائل محدود ہو جائیں گے اور ان پر جدا جدا غور کیا جا سکے گا۔

میں یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میری رائے میں لسانی رقبے اور صوبجات کی حدود آپس میں منطبق ہونی چاہئیں۔

(۱۵)

مذکورہ بالا غور و خوض کو آسان تر بنانے کے لئے میں اپنی بعض موٹی موٹی تجاویز درج ذیل کرتا ہوں۔

(۱) ہمارے پبلک کام اور سرکاری تعلیم کے لئے ہر لسانی رقبہ کی مخصوص زبان استعمال ہونی چاہئے اور اس رقبہ میں اس زبان کو باقی زبانوں پر فوقیت حاصل ہونی چاہئے۔ اس مطلب کے لئے ہندوستان میں مندرجہ ذیل زبانوں کو سرکاری طور پر تسلیم کیا جانا چاہئے۔

ہندوستانی (اردو اور ہندی دونوں) بنگالی گجراتی۔ مرہٹی۔ تامل۔ تلوگو۔ کناری۔ ملیالم۔ آڑیا۔ آسامی۔ سندھی اور کسی حد تک پشتو اور پنجابی۔

۲۔ ہندوستانی بولنے والے رقبوں میں اردو اور ہندی دونوں اپنے جدا جدا رسم الخط کے ساتھ سرکاری طور پر تسلیم کی جانی چاہئیں۔ پبلک اعلانات دونوں رسوم میں جاری ہونے لازمی ہیں ہر شخص کو اختیار ہو کہ عدالتوں اور دفاتر کے ساتھ معاملات کرنے میں دونوں میں سے ایک رسم الخط چن لے اور اسے یہ مجبوری نہیں ہونی چاہئے کہ وہ دوسرے رسم الخط میں اپنی تحریر کی نقل داخل کرے۔

۳۔ ہندوستانی رقبے میں ہندوستانی ذریعہ تعلیم ہوگی اور تعلیم دونوں رسوم الخط میں دی جائے گی اور دونوں کو تسلیم کیا جائے گا۔ طلبا یا اُن کے والدین دونوں میں سے کسی ایک کے انتخاب کا حق رکھیں گے۔ طلبا پر دونوں رسوم الخط سیکھنے لازم نہیں ہوں گے۔ اگرچہ ثانوی مدارس میں دوسرا رسم الخط سیکھنے کی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔

(۴) ہندوستانی کو (مع اپنے دونوں رسوم الخط کے) سرکاری طور پر آل انڈیا زبان تسلیم کیا جائے گا اور اس لحاظ سے ہر شخص مجاز ہوگا کہ وہ ہندوستان کے کسی دفتر یا عدالت کے ساتھ ہندوستانی میں معاملہ کرے اور تحریر میں دونوں میں سے کوئی ایک رسم الخط اختیار کرے اور اس پر لازم نہیں ہوگا کہ اپنی تحریر کی نقل دوسرے رسم الخط میں مہیا کرے۔

(۵) دیوناگری۔ بنگالی۔ گجراتی اور مرہٹی رسوم الخط کو متحد کرنے اور ایک ایسا مخلوط رسم الخط مقرر کرنے کی کوشش کرنی چاہئے جو چھاپے، ٹائپ رائٹر اور دیگر جدید ایجادوں سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکے۔

(۶) سندھی رسم الخط کو اردو میں جذب کر دینا چاہئے اور اردو رسم الخط کو ممکن حد تک سہل تر کر کے چھاپے اور ٹائپ رائٹر کے لئے موزوں بنانے کی کوشش کرنی چاہئے۔

(۷) جنوبی رسوم الخط کو دیوناگری کے قریب قریب لانے کی ممکنات کا پتہ چلانا چاہئے اور اگر یہ ممکنات بہم نہ پہنچ سکیں تو مختلف جنوبی زبانوں یعنی تامل تلوگو۔ کناری اور ملیالم کے لئے ایک مخلوط رسم الخط کی بنیاد ڈالنی چاہئے۔

(۸) لاطینی رسم الخط میں ہمیں خواہ کیسی ہی خوبیاں نظر آئیں کم از کم موجودہ دور میں اسے رائج کرنے کے امکانات پر غور نہیں کیا جاسکتا۔ پس ہمارے لئے صرف دو رسوم الخط رہ جائیں گے ہندی۔ بنگالی مرہٹی گجراتی کا مخلوط رسم الخط۔ اور اردو سندھی کا رسم الخط اور اگر ضرورت ہو تو جنوبی زبانوں کا ایک مخلوط رسم الخط اس صورت میں کہ وہ اول الذکر رسم الخط سے مطابقت نہ کرسکیں۔

(۹) ہندوستانی بولنے والے رقبوں میں ہندی اور اردو کا جداگانہ رجحان اگر ترقی کی طرف مائل ہو تو خطرے کا باعث نہیں اور ان دونوں کے نشوونما میں رکاوٹ نہیں ڈالنی چاہئے۔ یہ جداگانہ فروغ زیادہ دقیق تصورات کے زبان میں داخل ہونے کا قدرتی نتیجہ ہے۔ ہندی اور اردو کی علٰحدہ علٰحدہ ترقی بھی ہندوستانی کے لئے مفید ثابت ہوگی۔

آگے چل کر جب عالمگیر تحریکوں اور قومیت ہند کا دباؤ اس طرف آن پڑے گا تو ہر چیز اپنی نشست پر ٹھیک بیٹھ جائے گی اور پھر جمہور کی عام تعلیم سے ایک معیار اور یکسانیت قائم ہو جائے گی

(۱۰) ہمیں زبان کے (اس میں اردو ہندی کی تخصیص نہیں سب زبانیں مراد ہیں) مقبول عام طرز بیان پر زیادہ توجہ دینی چاہئے مصنفین کو عوام کی تعلیم کے لئے عوام کی سادہ زبان میں لکھنا چاہیے اور ان مضامین پر لکھنا چاہئے جن کی عوام کو ضرورت ہے۔ دو ... اور مصنوعی طرز تحریر کی حوصلہ شکنی کرنا اور سادہ اور پر زور طرز تحریر کو فروغ دینا چاہئے۔ اس روش سے جہاں اور بہت سے فایدے ہوں گے وہاں اردو اور ہندی میں یکسانیت پیدا ہوتی چلی جائے گی۔

(۱۱) بنیادی انگریزی کی طرز پر ہندوستانی میں سے ایک بنیادی ہندوستانی پیدا کرنی چاہئے۔ یہ ایک سادہ زبان ہوگی۔ جس کی گرامر نہ ہونے کے برابر اور لغات ایک ہزار الفاظ سے زاید نہیں ہوگی۔ اسے معمولی بول چال اور لکھت پڑھت کے لئے ایک مکمل زبان بنانا ہوگا۔ اس کا گوشت پوست خالص ہندوستانی ہوگا اور یہ زبان وسیع تر مطالعہ کے لئے پہلے زینے کا کام دے گی۔

(۱۲) بنیادی ہندوستانی کے علاوہ ہمیں متعدد اصطلاحی، علمی، سائنٹیفک، سیاسی اور تجارتی الفاظ مقرر کرنے ہوں گے جو اردو ہندی اور اگر ممکن ہو تو ہندوستان کی دیگر زبانوں میں بھی یکساں استعمال ہو سکیں گے۔ جہاں کہیں ممکن ہو ایسے الفاظ غیر ملکی زبانوں سے مستعار لے کر اپنی زبان میں پیوند کر لئے جائیں اور دیگر مناسب اور موزوں الفاظ اپنی زبانوں سے چن کر فہرستیں بنالی جائیں تاکہ تمام اصطلاحی اور سائنٹیفک معمولات میں ہم ایک نہایت صحیح اور یکساں ذخیرۂ الفاظ استعمال کر سکیں۔

(۱۳) حکومت کی تعلیمی پالیسی یہ ہونی چاہئے کہ تعلیم طالب علم کی زبان میں دی جائے۔ ہر لسانی رقبہ میں پرائمری سے لے کر یونیورسٹی تک تعلیم کے لئے اس رقبے کی زبان مستعمل ہو۔ اگر کسی زبان کے رقبے میں ایسے طلبا کی ایک کافی تعداد موجود ہو جن کی مادری زبان حلقے کی زبان سے مختلف ہو تو ان کا حق ہوگا کہ پرائمری تعلیم اپنی مادری زبان میں حاصل کریں بشرطیکہ وہ ایک مرکزی مقام پر جمع ہو سکیں۔ اگر ان کی تعداد کافی ہو تو یہ بھی ہو سکے کہ انہیں ثانوی تعلیم ان کی مادری زبان میں دی جائے۔ مگر ایسے تمام طلبا کے لئے اپنے حلقے کی قدرتی زبان بطور ایک لازمی مضمون کے لینی پڑے گی۔

(۱۴) ہندوستانی نہ بولنے والے صوبوں میں بنیادی ہندوستانی ثانوی مدارس میں سکھائی جائے اور رسم الخط کا سوال طلباً پر چھوڑ دیا جائے۔

(۱۵) یونیورسٹی کی تعلیم کے لئے ذریعہ تعلیم رقبے کی زبان ہوگی اور ہندوستانی اپنے کسی رسم الخط کے ساتھ اور ایک غیر ملکی زبان لازمی مضامین ہوں گے۔ یہ لازمی شرط اعلیٰ صنعتی نصابات کی صورت میں نافذ نہیں کی جائے گی۔ اگرچہ اس حلقے کے طالب علموں کے لئے بھی زبانوں کا سیکھنا مناسب ہوگا۔

(۱۶) ثانوی مدارس میں ہماری قدیم قومی زبانیں اور غیر ملکی زبانیں سکھانے کا انتظام کیا جائے گا لیکن خاص نصابات یا یونیورسٹی میں داخل ہونے کے لئے تیاری کی صورت کے علاوہ ان کی تعلیم لازمی نہیں ہوگی۔

(۱۷) ہندوستانی زبانوں میں غیر ملکی زبانوں کی قدیم کتابوں کے تراجم بڑے پیمانے پر کئے جانے چاہئیں تاکہ ہماری زبانیں ان ممالک کی تمدنی، ادبی اور سوشل تحریکوں سے لگاؤ پیدا کریں اور اس اتصال سے اپنے لئے طاقت و قوت حاصل کریں۔

(مترجمہ صلاح الدین احمد)

جواہر لال نہرو

عزمِ شاعر

میں تری راہ سے بے خوف گزر جاؤں گا موت! اک بار تو حیراں تجھے کر جاؤں گا

چند انفاس کا مجموعہ ہے میری ہستی مثلِ بو عالمِ امکاں میں بکھر جاؤں گا

دردِ ہستی سے ہوں بے چین مثالِ سیماب مبتلا سب کو اسی درد میں کر جاؤں گا

بحر و بر روئیں گے پتھر بھی پگھل جائیں گے جس طرف لے کے میں یہ دیدۂ تر جاؤں گا

بادۂ عشق سے ہر ساغرِ دل خالی ہے اس مئے کہنہ سے پھر اس کو میں بھر جاؤں گا

موت کے نام سے ہوگا نہ ہراساں کوئی روح بے خوف وہ انسانوں میں بھر جاؤں گا

تاجور آیا ہوں میں بہرِ مداوائے جہاں
جس طرح بھی ہو ادا قرض یہ کر جاؤں گا

تاجور سامری

شاخِ نبات

گردید حالِ من زغمِ ہجر زارتر
دل بے قرارتر شد و جاں سوگوارتر

سازم بہ ہر بلائے کہ از آسماں رسد
تا کلفتِ غمِ تو شود سازگارتر

دانستہ ام کہ در پسِ ہر خندہ گریہ ایست
زیں غم شدہ است دیدۂ من اشکبارتر

یاراں بہ صحنِ باغ نشینیم و مے خوریم
باشد کہ نوبہار شود نوبہارتر

چشمے کہ بادہ ہا خورد از حسنِ مست کار
از مست میگسار بود میگسارتر

بے پردہ جلوۂ تو گدازد نگاہ را
حسنِ تو در نقاب بود آشکارتر

زاں ناامیدئی کہ بتو در نمی رسد
دل شرمسار و چشم ازاں شرمسارتر

صوفی غلام مصطفٰے تبسم

فریبِ خیال

دعوت میں شریک ہونے والوں کی تعداد سو سے کسی صورت کم نہ تھی۔ کوٹھی کے وسیع احاطے میں نہایت قرینے سے چھوٹی چھوٹی میزیں اور کرسیاں بچھائی گئی تھیں۔ چائے کا اہتمام بڑے تکلف سے کیا گیا تھا اور کھانے پینے کی ہر چیز سے خوش سلیقگی کا اظہار ہو رہا تھا۔ مہمانوں میں ہر طبقے اور ہر مذاق کے لوگ موجود تھے۔ وکلا تھے، اخبارات و رسائل کے ایڈیٹر تھے، سرکاری حکام تھے۔ رؤسا تھے۔ چند مشہور شاعر اور مصور بھی تھے۔ موسم نہایت خوشگوار تھا سبزے کے فرش پر جگہ جگہ پھولوں کے گملے رکھے ہوئے تھے اور اوپر رنگ برنگ کاغذ کے پھولوں کی بیلیں لہرا رہی تھیں۔ میزبان اور ان کے دونوں صاحبزادے خود مہمانوں کی خاطر تواضع میں مصروف تھے۔ اس مجمع میں ایک شخص اپنی وضع قطع کے اعتبار سے زیادہ نمایاں نظر آ رہا تھا۔ دوہرے بدن کا نکلتا ہوا قد۔ جسم پر سیاہ سمور کا لمبا کوٹ، حالانکہ سمور پہننے کا رواج مدت ہوئی ختم ہو چکا تھا۔ پاؤں میں چمک دار چمڑے کا پمپ اور سفید زمین پر سیاہ لکیروں والے کپڑے کی پتلون۔ سر کے بال بہت لمبے جنہیں پشت کی طرف پھینکا ہوا تھا قلمیں بڑھی ہوئیں جو رخسار کے عین وسط تک پہنچ رہی تھیں جب چائے ختم ہو چکی تو وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کبھی اس میز پر کبھی اس میز پر جا کر لوگوں سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگا۔ بعض مہمان اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ میں نے اپنے ساتھی سے پوچھا "یہ کون صاحب ہیں؟" اس نے جواب دیا "نام تو میں نہیں جانتا لیکن یہ شاید یہاں ونیس تھیٹر میں پانیو بجاتے ہیں۔"

دعوت کے اختتام پر صاحبِ خانہ نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور تقریب بخیر و خوبی انجام پذیر ہوئی۔

اس واقعہ کو ایک ہفتہ گزرا ہو گا کہ اتوار کے دن صبح نو بجے میرا ملازم ایک ملاقاتی کارڈ میرے پاس لایا جس پر انگریزی حروف میں "ایم۔ ایچ۔ شیدا۔ بی اے" مرقوم تھا۔ میں اس نام کے کسی شخص سے واقف نہ تھا۔

میں نے ملازم سے پوچھا "تم جانتے ہو یہ کون صاحب ہیں؟"

اُس نے جواب دیا "جناب اس سے پہلے تو یہ کبھی نہیں آئے میں نے بھی آج ہی انہیں دیکھا ہے"

میں نے کہا "انہیں بڑے کمرے میں بٹھاؤ۔ میں ابھی آتا ہوں"

دس منٹ کے بعد جب میں بڑے کمرے میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ میرا ملاقاتی وہی شخص ہے جو دعوت میں سیاہ سمور کا کوٹ اور چمک دار چمڑے کا پمپ پہن کر شریک ہوا تھا۔ میں نے کہا "معاف کیجئے اس روز پارٹی میں آپ سے شرفِ نیاز حاصل نہ ہو سکا۔ میں مدت کے بعد لاہور آیا ہوں اس لئے نئے دوستوں سے ملاقات پیدا کرنے کے لئے بھی کچھ وقت چاہیئے۔"

اُس نے کہا "یہ صحیح ہے لیکن میری جرأت تو دیکھئے کہ آپ سے متعارف ہوئے بغیر میں آپ کے مکان پر آ دھمکا ہوں۔"

میں نے کہا "آپ کی اس تکلیف فرمائی کا بے حد شکریہ۔ آپ کا اپنا گھر ہے۔ شوق سے تشریف رکھئے۔" جب ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے تو میں نے کہا "کیا میں آپ کا پورا اسمِ گرامی دریافت کر سکتا ہوں؟"

اُس نے جواب دیا "میرا نام محمد حسین شیدا ہے۔ دو سال سے لاہور میں مقیم ہوں۔ اس سے پہلے الہ آباد تھا۔ بچپن کلکتے میں بسر ہوا ہے۔ کسی ایک شہر کو وطن کہنا میرے نزدیک جائز نہیں۔ ہم لوگ دنیا کے باشندے ہیں۔"

میں نے ہنس کر کہا "میں بھی وطن پرستی کو شرکِ مکانی سمجھتا ہوں لیکن اس کے باوجود ایک جگہ سے تعلقِ وطن قایم ہے۔"

اُس نے کہا "ہاں، میں نے آپ کی تحریروں میں دیکھا ہے کہ آپ بہت التزام سے اپنے نام کے ساتھ اپنی نسبتِ وطن ظاہر کرتے ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟"

میں نے جواب دیا "اس کی وجہ وطن پرستی نہیں بلکہ محض اپنے

نام کو ایک امتیازی رنگ دے دیا ہے۔"

اُس نے کہا "رسمیاتِ عہد کی پابندی صرف اُن لوگوں کا کام ہے جو اپنی انفرادی شخصیت کے شعور سے محروم ہیں۔ یہ شعور بہت سے اشخاص میں فطری طور پر موجود ہوتا ہے لیکن تقلید کے اس جذبے سے جو ہندوستان میں عام ہے دب کر ضائع ہو جاتا ہے۔ لکیر کا فقیر بنے رہنے سے انسان کی انفرادی قوتیں بروئے کار نہیں آ سکتیں۔"

میں نے کہا "صحیح بات یہ ہے کہ سماج کی عافیت تقلید ہی میں ہے۔ رسمیاتِ عہد کی پابندی سے انحراف کرنا پیغمبروں کو زیبا ہے یا باغیوں کا کام ہے۔ ایک عام آدمی کے لئے یہ انحراف اس وقت تک نقصان رساں نہیں جب تک اُس کے اعمال و خیالات قانون سے متصادم یا ہم جنسوں کی آسائش میں خلل انداز نہ ہوں۔ قانون اور اخلاق نے انسان کی آزادی پر چند حدود عاید کر دی ہیں جن کے اندر رہ کر ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ اپنے شوق کی تشفی کے لئے جو سامان چاہے پیدا کرے۔"

ہم نے فوراً محسوس کیا کہ ہماری گفتگو بہت ٹھوس ہو رہی ہے اور پھر دو آدمیوں کا پہلی ہی ملاقات میں اس قسم کی باتیں لے بیٹھنا یوں بھی کچھ بھلا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ میں نے کہا "شیدا صاحب، چھوڑیئے اس قصے کو۔ آپ شاعر ہیں اپنے شعر سنایئے۔"

اُس نے کہا "معاف کیجئے، آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں شاعر نہیں ہوں۔ شیدا میرا تخلص نہیں ہے۔ یہ فقط ایک خاتون کا عطیہ ہے جنہیں میرا نام پسند نہیں تھا۔ انہوں نے میرے نام کے ساتھ اس لفظ کا اضافہ صرف اس لئے کر دیا کہ وہ مجھے اس نام سے بلانا چاہتی تھیں۔"

میں نے کہا "پھر تو تخلص سے بھی زیادہ دلچسپ اور رومان انگیز چیز ہے۔ اپنی داستانِ معاشقہ کا کوئی باب ہی سنایئے۔"

شیدا نے قہقہہ لگا کر کہا "آپ نے یہ کیوں کر جانا کہ لفظ شیدا کا تعلق کسی داستانِ معاشقہ سے ہے؟"

میں نے کہا "میرے پاس دلیل تو کوئی نہیں۔ البتہ آپ کی باتوں سے یہ جھلک رہا ہے۔"

شیدا اور میں جلد ہی ایک دوسرے سے بے تکلف ہو گئے۔ وہ بہت خوش مزاج اور زندہ دل انسان معلوم ہوتا تھا۔ وہ دراصل پنجاب کا رہنے والا تھا لیکن اپنی عمر کا ابتدائی حصہ اُس نے اپنے چچا کے پاس کلکتے میں بسر کیا تھا۔ اسکول کی تعلیم اُس نے وہیں ختم کی تھی اور پھر وہ علی گڈھ چلا گیا تھا جہاں سے اُس نے بی اے کی سند حاصل کی تھی۔ کلکتے کے قیام کے دوران میں شیدا کو موسیقی سے خاص اُنس ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ کچھ تو کلکتہ کا ماحول تھا اور کچھ اُس کا اپنا فطری رجحان۔ علی گڈھ میں بھی طالب علمانہ مصروفیتوں کے ساتھ ساتھ وہ اپنے اس شوق سے غافل نہیں رہا تھا۔ تعطیلات میں وہ اکثر لکھنؤ چلا جاتا تھا۔ جہاں ماتا دین، بندرا بن اور ظہیر خاں جیسے ماہرِ فن اُستادوں سے تلمذ پیدا کر کے اُس نے کسبِ فیض کیا تھا۔ ساز بجانے میں بالخصوص اُسے کمال حاصل تھا۔ ستار، دلربا، وائلن، پیانو، ہارمونیم غرض کہ ہندوستانی اور ولایتی دونوں قسم کے سازوں میں اُسے خوب مہارت تھی۔ اُس کے چچا جو ابتدا سے اُس کی پرورش کر رہے تھے اس شوق کو پسند نہیں کرتے تھے۔ شروع شروع میں تو وہ اس خیال سے خاموش رہے کہ آج کل کے نوجوان گانے بجانے کے شوقین ہوا ہی کرتے ہیں لیکن جب اُنہوں نے دیکھا کہ یہ شوق جائز حدود کو عبور کر کے پیشہ ورانہ شغف کی صورت اختیار کر رہا ہے تو انہوں نے اُس کی مخالفت کی۔ شیدا کی خود سری نے اس مخالفت کو اور زیادہ بدمزگی کا رنگ دے دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ طرفین میں رنجش بڑھتی گئی اور شیدا جب علی گڈھ سے فارغ التحصیل ہو کر نکلا تو کلکتے جانے کی بجائے وہ سیدھا بمبئی چلا گیا جہاں ایک فلم کمپنی میں اس نے ملازمت اختیار کر لی۔ بمبئی کی فضا اُس کے حسبِ خاطر نہ تھی۔ اس لئے مختصر سے قیام کے بعد وہ الٰہ آباد لوٹ آیا۔ یہاں گلوب تھیٹر میں آرکسٹرا کا مہتمم مقرر ہو گیا۔ اُس کی طبیعت میں آزادروی اور جدت پسندی شروع سے تھی۔ اب کہ وہ معاش کی طرف سے ایک حد تک مطمئن ہو چکا تھا اُس نے زندگی کی شاہراہ پر صرف اپنے ذوق اور اپنی ذہانت کو رہنما بنا لینا کافی سمجھا۔ تقلید اور پیروی سے اُسے سخت نفرت تھی۔ اگر کھانے پینے اور پہننے میں انسان صرف اپنے ہی ذوق کی رعایت روا رکھے اور مروجہ رسوم کی پروا نہ کرے تو بھی سماج کے طور طریقوں سے اس کا تصادم ناگزیر ہو جاتا ہے، لیکن شیدا تو اپنے مذاق کی پذیرائی کے سامنے معاشرت کی پابندیوں اور تمدن کے اصولوں کی بھی پروا نہ کرتا تھا۔ ایسے باغی کے لئے بھلا قدامت پسند اور روایت پرست دنیا میں کہاں گنجائش ہو سکتی ہے۔ الٰہ آباد میں آہستہ آہستہ وہ طعن و تشنیع کا ہدف بننا شروع ہوا۔ بعض لوگ اُس کی ہنسی اڑاتے تھے بعض اُس سے نفرت کرتے تھے

اور بعض اُس کے دشمن بن گئے تھے۔ جب اُس نے محسوس کیا کہ ہیئت اجتماعی اُس کی انفرادیت کو قبول کرنے سے انکار کرتی ہے تو اُس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یوپی کے باشندے سخت دقیانوسی قسم کے لوگ ہیں جو ہر جدت کو بدعت سمجھ کر روشن خیالی کے بدترین دشمن ہیں۔ پنجاب کے متعلق وہ ہمیشہ حسن ظن کا شکار رہا تھا چنانچہ الٰہ آباد سے دل برداشتہ ہو کر وہ لاہور چلا آیا اور رونیس تھیئیٹر میں پیانو بجانے پر ملازم ہو گیا۔ تھوڑے عرصے میں اُس کی انوکھی روش نے یہاں بھی اُس کو لوگوں کی توجہات کا مرکز بنا دیا۔ طلبہ کے حلقے میں وہ یقیناً روز بروز مقبول ہو رہا تھا لیکن سنجیدہ اشخاص میں اس کو چنداں وقعت حاصل نہ تھی۔ چونکہ گانے میں اس کو مہارت تھی اور علی گڈھ کا گریجوایٹ ہونے کی وجہ سے وہ گویا علمی وقار کا مالک بھی سمجھا جاتا تھا اس لئے اکثر تقاریب میں اُس کو شرکت کے دعوت نامے موصول ہوتے رہتے تھے۔ ظاہری وضع قطع میں بھی اُس نے ایسا بہناوا اختیار کر رکھا تھا کہ بڑے بڑے مجمع میں اُس کی جانب انگلیاں اٹھنا شروع ہو جاتی تھیں کبھی وہ اچکن کے ساتھ جودھ پوری طرز کی پگڑی باندھ کر آجاتا تھا جس سے یہ معلوم ہوتا کہ وہ بہت بڑا کلاونت ہے کبھی سیاہ فراک کوٹ اور سرخ ترکی ٹوپی پہن کر خالص علی گڈھی لباس میں نمودار ہوتا تھا بعض اوقات کھلی آستینوں کا کرتہ اور تہمد اور پاؤں میں سلیپر پہن کر وہ اس طرح بے تکلفی سے آجاتا تھا کہ گویا یہی مہذب دنیا کا لباس ہے کبھی جی چاہتا تو گاندھی ٹوپی اور کھدر کی دھوتی پہن کر نکل آتا تھا۔ سوٹ پہننے میں تو اُسے ایسا ملکہ حاصل تھا کہ کم ہندوستانیوں کو ہو گا۔ میں نے جب اُسے پہلی مرتبہ دیکھا تو سمور کا بنا ہوا لباس زیب تن کئے ہوئے تھا۔

ہم بہت دیر تک بیٹھے الٰہ آباد اور کلکتے کی باتیں کرتے رہے۔ وہ مجھے وہاں کے دلچسپ حالات سنا رہا تھا اور کبھی کبھی کسی لطیفے پر ہم ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے۔ دفعتاً مجھے یہ ندامت آمیز خیال آیا کہ میں نے اُسے چائے تک کا نہیں پوچھا۔ میں نے کہا "شیدا صاحب، معاف کیجئے میں نے آپ کو نہ کھانے کا پوچھا ہے نہ چائے کا۔ اگر آپ کہیں تو ملازم چلئے لے آئے"

اُس نے فوراً جواب دیا "جی نہیں۔ کھانے سے زیادہ لذیذ اور چائے سے زیادہ مفرح تو یہ گفتگو ہے۔ بھوک ہو تو میں کبھی عذر نہیں کیا کرتا لیکن محض رسم کا لحاظ کر کے دوستوں کے کام و دہن کی تواضع کرنا مجھے ہرگز پسند نہیں۔ ہمارے ہاں یہ عجیب دستور ہے کہ جب کوئی آشنا یا دوست یا عزیز ملنے کے لئے مکان پر آئے تو ضرورت ہو یا نہ ہو سب سے پہلے اُسے کچھ کھلانا پلانا ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ اگر یہ فرض فوراً سرانجام نہ دیا جائے تو ملاقاتی بھی خفا اور صاحب خانہ بھی ناراض۔ میرا خیال ہے جب انسان ارتقائی دور کی اولیں منزل میں تھا تو اُسے سوا اپنا پیٹ بھرنے کے اور کوئی کام نہ تھا۔ جوں جوں انسانی عقل و خرد اور تخیل و احساس کی کارفرمائی بڑھتی گئی پیٹ کی ضروریات موخر اور قلب و دماغ کی ضروریات مقدم حیثیت اختیار کرتی گئیں۔ آج جبکہ علم و فن نے دنیا کی کایا پلٹ دی ہے۔ انسانی ضروریات کا وہی مذاق اور معیار برقرار رکھنا جو زمانہ ماقبل تاریخ میں تھا غلطی ہے"۔

میں نے کہا "تو کیا آج تعلیم یافتہ انسان ہوا پھانک کر گزارہ کرتے ہیں؟ کیا اُنہیں جسم و جان کا رشتہ بحال رکھنے کے لئے روٹی کی ضرورت نہیں؟"

اُس نے ہنس کر کہا "ہوا پھانک کر تو یوں گزارہ کرتے ہیں کہ آج کل ہر دماغی کام کرنے والا شخص سوء ہضم کا شاکی ہے پھر ایسی سوسائٹی میں جہاں سوء ہضم کی شکایت اس درجہ عام ہو یہ کہاں کی دانشمندی ہے کہ خاطر تواضع کا تنہا یہ طریقہ باقی رکھا جائے کہ موقع بے موقع معدہ و امعا پر بوجھ لاد دیا جائے۔ انسان مراد حواس خمسہ سے ہے۔ ہم نے صرف حاسہ ذائقہ کی تواضع ضروری سمجھ رکھی ہے اور باقی چاروں حواس نظرانداز کر دئے ہیں حالانکہ ایک تربیت یافتہ سماج میں ترتیب بالکل اس کے الٹ ہوتی ہے جب علم و ادب کی ترقی سے سوسائٹی میں تہذیب و شائستگی پیدا ہو جائے اور فنون لطیفہ کے رواج سے جمالیات کا شعور فروغ حاصل کرے تو پھر افراد کا فرض ہے کہ سامعہ، باصرہ اور شامہ نواز اشیاء سے ایک دوسرے کی خاطر مدارات کیا کریں"۔

میں نے کہا "بہت اچھا حضرت، اب آپ کے لئے ناچ رنگ کا انتظام کرتا ہوں"!

چند ہفتوں میں میرے اور شیدا کے مراسم کافی ترقی کر گئے۔ ہم ایک دوسرے کے ہاں بے تکلفی سے آنے جانے لگے۔ وہ عجیب خصوصیات کا آدمی تھا۔ اپنے افعال کے لحاظ سے بالکل بے ضرر لیکن خیالات کے اعتبار سے بہت پریشان کن اور دلچسپ۔ مذہب سے اُسے سخت عناد تھا۔ وہ کہتا تھا کہ "مذہب چند بے جان رسوم کا نام ہے جنہوں نے انسان کے ہوش و حواس پر اس طرح قبضہ جما رکھا ہے کہ غور و فکر کرنے کی تمام صلاحتیں

سلب ہو گئی ہیں۔ ہندوستان میں مذہب کے ہاتھوں جس جس طرح ہماری مٹی پلید ہو رہی ہے اُس کا سب سے دردناک پہلو ہماری غلامی ہے غور تو کیجئے کہ یہاں ہم کھڑے ہیں اور سامنے آزادی کی دیوی ہے جس کے جلو میں دولت و حکومت کی تمام نعمتیں اور جاہ و حشمت کی تمام جلوہ فرازیاں ہیں لیکن ہمارے اور اس دیوی کے درمیان مذہب ایک اژدہے کی طرح حائل ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم اس لاش کو کب تک اپنے کندھوں پر اٹھائے پھریں گے"!

اُس کی خواہش تھی کہ وہ روزمرہ زندگی کی فرسودہ اور پامال روش سے ہٹ کر چلے خواہ اُسے یہ امتیاز پیدا کرنے کے لئے لوگوں کے تمسخر و استہزا کا نشانہ ہی بننا پڑے۔ اس خواہش نے اُس کے ذوق و نظر میں بھی ندرت پیدا کر دی تھی۔ ایک روز میں اس کے ہاں گیا تو وہ کہنے لگا "آئیے، آج آپ کی آنکھوں کی ضیافت کروں"۔ یہ کہہ کر اُس نے ایک بڑا سا البم کھولا جس میں قدیم و جدید مصوری کے بہترین نمونے موجود تھے۔ چند حسین و جمیل عورتوں اور خوشنما قدرتی مناظر کے فوٹو تھے۔ وہ ورق الٹتا رہا اور ہر تصویر کی فنی خوبیاں بڑی شرح و بسط سے بیان کرتا رہا۔ گانا تو وہ تقریباً ہر ملاقات میں سناتا تھا۔ مختلف قسم کے سازوں کی آوازیں علیحدہ علیحدہ نکال کر سناتا اور پھر اُن میں سے بعض کو ہم آہنگ کر کے کبھی سخت کرخت اور کبھی نہایت لطیف آواز پیدا کرتا تھا۔ ایک دن وہ میرے مشام جاں کی مدارات کرتا رہا۔ لکھنؤ، قنوج اور جون پور کے بیش بہا عطر اُس کے پاس موجود تھے۔ طرح طرح کی ولایتی اور ایرانی خوشبوئیں بھی تھیں۔ ان سب کو شیشیوں میں بند کر کے اُس نے ایک صندوقچی میں مقفل کر رکھا تھا۔ اسی طرح ایک اور دلچسپ واقعہ مجھے یاد ہے۔ جاڑوں کے دن تھے اور سردی خوب زوروں پر تھی۔ ایک روز شام کے قریب میں اس کے مکان پر گیا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ پکار اٹھا "آپ بہت اچھے وقت آئے۔ بس آج رات یہیں رہیئے"!

میں نے تعجب سے پوچھا "خیریت تو ہے"؟

کہنے لگا "بالکل خیریت ہے میں نے بمبئی سے ایک نہایت اچھی چیز منگوائی ہے جسے آپ اس موسم میں یقیناً پسند کریں گے"۔

میں نے کہا "بمبئی میں اِن دنوں پرتگال کی بنی ہوئی شراب کثرت سے فروخت ہو رہی ہے۔ کہیں اس کی سو پچاس بوتلیں تو نہیں منگوا لیں"؟

ہنس کر کہنے لگا "لاحول ولا، آپ کو بھی کیا سوجھا ہے" اور دوسرے کمرے میں گھس گیا۔ وہاں سے لکڑی کا ایک بکس اٹھا لایا جس میں سے ایک ریشمیں لحاف نکال کر میرے اوپر ڈال دیا۔ یہ بمبئی کی ایک مشہور ولایتی فرم کا بنا ہوا نہایت خوب صورت اور نرم و نازک لحاف تھا جس کے اندر بہت نفیس اور قیمتی پر بھرے ہوئے تھے۔ میں نے لحاف کے بیش قیمت مکلّف و مطلا کپڑے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "اس لحاف کو اوڑھ کر سونا جسمانی عشرت کی معراج ہے"!

کہنے لگا "میں نے اب تک اسے استعمال نہیں کیا۔ جی یہی چاہتا تھا کہ کبھی آپ تشریف لائے تو اس سے آپ کی تواضع کروں گا"۔

شیدا نے اب تک شادی نہیں کی تھی اور نہ بظاہر اس کا ارادہ شادی کرنے کا تھا۔ شیدا کے مکان سے تھوڑی دور، اسی سڑک پر، ہومیوپیتھک کے ایک ڈاکٹر رہتے تھے۔ اُن کی بیوی شعر و سخن کی دلدادہ اور کسی قدر گانے بجانے کی بھی شوقین تھی۔ شیدا کو اُس سے محبت ہو گئی۔ ایک روز مجھ سے کہنے لگا "ڈاکٹر نے اس عورت کی زندگی کو بے حد تلخ بنا رکھا ہے"۔

میں نے پوچھا "کیوں کر"؟

کہنے لگا "ڈاکٹر خود تو بالکل ٹھوس اور جامد طبیعت کا انسان ہے اور وہ بہت رنگیں خیال، شگفتہ مزاج اور خوش طبع خاتون ہے۔ دونوں کے مذاق میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اسی پر بس نہیں بلکہ کمبخت دن رات اُسے طعنے دے دے کر جلاتا رہتا ہے۔ کبھی کہتا ہے کہ گانا بجانا رنڈیوں کا کام ہے۔ کبھی کہتا ہے کہ شرفا کی بہو بیٹیوں کو شعر و سخن سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہیئے۔ مجھے اس عورت سے ہمدردی ہو گئی ہے بلکہ یوں کیوں نہ کہوں کہ محبت ہو گئی ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ اُسے اپنے پاس لے آؤں"۔

میں نے چونک کر کہا "اس سے آپ کا کیا مطلب! کیا ڈاکٹر اسے طلاق دے رہا ہے"؟

"طلاق ولاق میں نہیں جانتا۔ کیا آپ کسی بدمذاق آدمی کے ساتھ ایک گھنٹہ بھی بسر کرنا پسند فرماتے ہیں! کیا یہ ظلم نہیں کہ صحبتِ ناجنس کے عذاب کو تمام عمر محض اس لئے برداشت کیا جائے کہ مذہب نے اس پر جواز کی مہر ثبت کر دی ہے! سماج یہ تو گوارا کر تا ہے کہ دو انسان جو فطری و معنوی طور پر ایک دوسرے سے اس قدر اجنبی ہیں کہ عام حالات کے اندر

وہ شاید آپس میں گفتگو کرنا بھی پسند نہ کریں صرف اس لئے ایک دوسرے کے ساتھ شکنجے میں جکڑے رہیں کہ سوءِ اتفاق سے ایک مُلّا کی زبان سے چند کلمات نکل چکے ہیں لیکن سماج کو یہ منظور نہیں کہ دو ہم خیال، ہم ذوق اور ہم مشرب افراد اطمینان و مسرت سے ایک دوسرے سے مل کر زندگی بسر کریں۔ نکاح آخر ہے کیا؟ جب دو دل مل جائیں تو پھر کسی بے معنی رسم کی ادائی کی ضرورت ہی کب باقی رہتی ہے؟ رسموں نے انسان کی روح کو کچل دیا ہے۔ نہ صرف روح کو ہی نہیں کچلا جسمانی مسرتوں کو بھی تباہ کر دیا ہے۔"

میں نے حیرت سے کہا "میں آپ کا صحیح مفہوم اخذ نہیں کر سکا۔ کیا آپ اس فعل کو قابلِ اعتراض نہیں سمجھتے کہ ایک بیاہتا عورت اپنے خاوند کو چھوڑ کر دوسرے مرد کے پاس چلی جائے؟"

وہ بہت جوش سے کہنے لگا "مجھے کوئی اعتراض نہیں میں اسے جائز سمجھتا ہوں۔ چند بے جان رسوم کی خاطر زندگی جیسی گراں مایہ چیز کو رائگاں کھو دینا حماقت ہے۔ انسان دنیا میں ایک ہی مرتبہ آتا ہے۔ بار بار زندگی کسے نصیب ہوتی ہے"۔

ایک روز اچانک مجھے کچہری سے ٹیلی فون آیا۔ شیدا بول رہا تھا۔ "جلدی آؤ۔ خدا را جلدی پہنچو" میں بھاگا بھاگا وہاں گیا تو عجیب منظر دیکھا۔ شیدا کے ہتھکڑی لگی ہوئی تھی اور وہ پولیس کی حراست میں عدالت کے کمرے سے باہر کھڑا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ ڈاکٹر کی بیوی کو اغوا کر لایا ہے اور ڈاکٹر نے اُس کے خلاف استغاثہ دائر کر کے اُسے گرفتار کرا دیا ہے۔ اب وہ مجھے بلا رہا تھا کہ آ کر ضمانت دوں۔ شیدا کی طلاقتِ لسانی ختم ہو چکی تھی۔ رنگ اُڑا ہوا تھا اور منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ میں نے ضمانت دی اور شیدا صاحب کو پولیس کے چنگل سے نجات ملی۔ بڑی مدوجہد اور مصیبت کے بعد مستغیث راضی نامہ پر آمادہ ہوا اور مقدمہ عدالت سے واپس لیا گیا۔

اب شیدا صاحب نہایت چپ چاپ زندگی بسر کرتے ہیں بہت کم بولتے ہیں۔ سماج کے خلاف بغاوت کے آثار اُن میں نظر نہیں آتے۔ سنا ہے کہ لاہور کو خدا حافظ کہنے کا ارادہ کر رہے ہیں۔

عاشق حسین بٹالوی

خوابوں کی شہزادی

تو میرے خوابوں کی دنیا کی تھی شہزادی کبھی
مسکراتی تھی میرے پاکیزہ رومانوں میں تو
رنگ و بو بن کر بسی تھی میرے افسانوں میں تو
تو مرے احساسِ شعری کی حسیں تعبیر تھی
زیست کے خوابِ پریشاں کی جواں تعبیر تھی
تجھ سے تھیں رعنائیاں میرے حزیں افکار میں
تجھ سے سوزِ عشق پنہاں تھا مرے اشعار میں
ارتعاشِ نغمہ بن کر سازِ کے پردوں سے تو
ذرے ذرے میں بپا کرتی تھی حشرِ رنگ و بو
اور کبھی زندہ تھا تجھ سے شیوۂ عشقِ جواں
میرے قدموں پر کبھی جھکتی تھی جوئے کہکشاں
تو نے بخشا تھا مرے دل کو محبت کا غرور
زندگی کو سوز، اشکوں کو چمک آنکھوں کو نور
اور تیرے ہوتے متاعِ دو جہاں کچھ بھی نہ تھا
یہ زمیں کچھ بھی نہ تھی یہ آسماں کچھ بھی نہ تھا
تو مرے خوابوں کی دنیا کی تھی شہزادی کبھی

تابش صدیقی

غزل

یار کی بزمِ ناز میں جو نہ کٹیں جوانیاں
وہ بھی کسی حساب میں آئیں گی زندگانیاں؟

تازہ جہاں میں ہے ابھی قصۂ قیس عامری
اور جم و کیقباد کی بھول گئیں کہانیاں

سرو و سمن بہار میں کس کے ہیں انتظار میں
کس کے خرامِ ناز کی باغ میں ہیں نشانیاں

بھول گئی جفائے دوست، یہ بھی تھی اک ادائے دوست
یاد رہی وفائے دوست، یار کی مہربانیاں

ناز و نیاز میں ہوا روزِ ازل معاملہ
عشق کی جانفروشیاں حسن کی دل ستانیاں

حُسن کی وہ ادائے ناز کچھ نہ سمجھ سکے کلیم
دعوتِ شوقِ دید تھیں طور کی لن ترانیاں

لختِ جگر کباب ہے، خونِ جگر شراب ہے
آج خیالِ یار کی دل میں ہیں میہمانیاں

کہہ دیا چشمِ شوق نے حُسن سے ماجرائے دل
کام زباں کا دے گئیں عشق کی بےزبانیاں

کس نے یہ بزمِ حسن میں چھیڑ دیا ربابِ عشق
وجد میں آئیں پیریاں رقص میں ہیں جوانیاں

ناظرؔ خوش نوا اگر بزمِ چمن میں آ گئے
بھول گئی ہیں بلبلیں اپنی وہ نغمہ خوانیاں

چوہدری خوشی محمد ناظرؔ

کوریا کی قدیم شاعری

ابتدائے عالم سے انسان انفرادی یا اجتماعی طور پر ہجرت کرتا آیا ہے۔ اپنی جنم بھومی اپنے وطن کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینا ایک نہایت سنجیدہ اقدام ہے، لیکن اس کی تہ میں ضروریاتِ انسانی اور تقاضائے وقت کے علاوہ تجسس کے ہلکے جذبے کو بھی دخل ہے۔ آریہ لوگ وسط ایشیا سے نکلے، کچھ مغرب میں پہنچ کر اپنے ماخذ کو بھول بیٹھے، اور باقی سلسلۂ ہمالیہ کی حدیں پار کر کے ہندوستان کے طلسم خانے کی گوناگوں سحر طرازیوں کے جلووں میں کھو گئے۔ مغرب اور ہندوستان دونوں جگہ آریاؤں نے مختلف اور ممتاز تہذیب و تمدن کی بنیاد ڈالی۔ لیکن تاریخ میں ایسی ایک اور مثال بھی ہے۔ کوریا کے رہنے والے آبادی کی کثرت سے برانگیختہ ہو کر روحِ انتقال کے متوالے بنے اور چین کے وسیع علاقے کو آباد کیا۔ وطن کو چھوڑ دیا لیکن خاکِ وطن کی زردی ہمیشہ چہروں پر چھائی رہی اور اس کے علاوہ اولیں اندرونی خصوصیات بھی برقرار رہیں۔ کوریا ہی کی قدیم تہذیب کو چینیوں نے اپنے نئے ملک میں پھیلایا۔ ہر ملک کی طرح چین کی شاعری بھی وہاں کے تہذیب و تمدن کا آئینہ ہے۔ چینی شاعری کی بہت سی مثالیں ہندوستانی کے دامن میں آچکی ہیں۔ لیکن اس موقعے پر ہمیں کوریا کی شاعری کا اظہار مقصود ہے۔

سنِ عیسوی کی ابتدائی صدیوں سے ہی کوریا (یا شگون صبح کی بستی) میں علم کے حصول کو ایک قابلِ فخر و اعزاز تصور کیا جاتا رہا ہے۔ وہ جنم کے لحاظ سے خواہ کسی ادنےٰ گھرانے سے ہی کیوں نہ متعلق ہو، سیاسی عہدوں کی تقسیم کے وقت ہمیشہ ایک عالم کو ترجیح دی جایا کرتی تھی۔ لیکن چند نمایاں مستثنیات کے علاوہ شعرا عموماً ناکامیاب سیاست داں ہی ثابت ہوئے اور کوریا کی بہترین نظموں میں سے اکثر شعرا نے اس زمانے میں لکھیں جب انہیں اپنے عہدوں پر ناکامی کے باعث جلاوطن یا نظربند کر دیا گیا تھا۔

۹۵۸ء سے "گواگو" (سرکاری امتحان) کوریا کی مہذب نگاہوں کا مرکز تھا اور اس امتحان کا ایک نمایاں اور لازمی جزو شاعری تھا۔ جس طرح آج کل ہندوستانی نوجوانوں کا منتہائے نظر سول سروس ہے، کوریا میں ہر نوجوان جسے ذہانت اور قابلیت کا ذرا بھی دعوےٰ ہوتا اپنی کامیابی کا معیار اسی سرکاری امتحان کو ٹھہراتا لیکن اس سرکاری امتحان سے عہدہ برائی کوئی آسان مرحلہ نہ تھا۔ اس میں بے حد جاں فشانی اور محنت اور مشقت درکار تھی۔ دو تین سال کے وقفے سے اوپر تلے چار امتحان پاس کرنا ہوتے تھے اور چوتھا امتحان شہنشاہ کے محل خاص میں ہوا کرتا تھا لیکن اس آخری آزمائش میں شامل ہونے والے بہت نہ ہوتے تھے۔ اکثر پہلی تین منزلوں کی بھینٹ ہو کر قعرِ گمنامی میں کھو جاتے "شہنشاہ کے سامنے قلم تھامنا" ہر شاعر کی انتہائی اُمنگ ہوا کرتی تھی جو طلباء اس چوتھی آزمائش کی کسوٹی پر بھی پورے اُترتے انہیں "ہان۔ لِن" یعنی شاہی اکاڈمی کا ممبر بنا دیا جاتا۔ یا کوریا کی عام شاعرانہ زبان میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہ لوگ "قلموں کے جنگل میں خراماں" ہوتے تھے۔

کوریا کی عام زندگی علم ادب سے لبریز تھی۔ ہر شخص ہر موقعے پر شعر کہہ لیا کرتا تھا۔ شعر گوئی فطرتِ ثانی کے درجے کو پہنچ چکی تھی۔ کوریا کے جس قدر قدیم ترین اشعار دستیاب ہوئے ہیں، اُن میں سے ایک نظم ۱۷ء قبل مسیح میں شاہ یورِی کی کہی ہوئی ہے۔ واقعہ یہ تھا۔ بادشاہ کی بڑی رانی چھوٹی رانی سے روٹھ کر محل چھوڑ گئی۔ بادشاہ رانی کو منانے چلا، لیکن وہ نہ مانی۔ ملول و غمگین، اپنے ناکام سفر سے لوٹتے ہوئے اس نے سرِ راہ ایک درخت کی شاخ پر دو پرندے دیکھے۔ روحِ شاعری

بیدار ہوگئی اور اُس سے متاثر ہوکر ذیل کا گیت لکھا:۔

گیت

سنہرے رستے پر زرد کرنوں میں
کھڑا ہوں میں تن تنہا!
یہ سب میرے ہیں، میرے! — کھیت چاول کے!
سنہرا، سنہرا!
یہ سب میرے ہیں، میرے ہیں!
مگر اک بات حاصل ہی نہیں مجھ کو،
تمنا دل میں ہے جس کی!
یہیں ایک پیڑ پر دو زرد طائر پیار کرتے ہیں،
مگر یہ کس لئے گاتے ہیں اتنی شادمانی سے؟"

کوریا کی شاعری پر چینی خیالات کا اثر نہایت آسانی سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔ جب چین پر تی۔آنگ خاندان کی حکومت تھی، اُس زمانے میں یہ اثر بہت نمایاں ہوگیا۔ یہاں تک کہ اس وقت کی چینی نظمیں کوریا میں اس قدر مقبول و معروف ہوئیں کہ کوریا ہی کی قومی ملک سمجھی جانے لگیں۔ نیز اس وقت کوریا کے شعرا نے بھی جو کچھ لکھا اُس میں چین ہی کا تتبع کیا۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود کوریا کے کلام میں اپنی ملکی روح کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور باقی رہا۔

کوریا کے ابتدائی علم ادب پر ملک کی جغرافیائی حالت کا بھی اثر ہوا کوریا ایک الگ تھلگ سا کوہستانی جزیرہ نما ہے۔ ایسے ملک میں ذرائع آمد و رفت قدرتاً بہت مشکل اور ناقابل اطمینان سے تھے اور اس لئے دوسرے ممالک سے راہ رسم پیدا ہونا ذرا دور کی بات تھی۔ لیکن سفر کی مشکلات کے باوجود ہمیں کئی سفری نظمیں ملتی ہیں، ان میں کوریا کی شاعری کا ایک نہایت خوشگوار پہلو نظر آتا ہے۔ اِن سے شعراء کے ذاتی مشاہدے اور زندہ دلی کا پتہ چلتا ہے۔ مشاہدہ اور زندہ دلی اس زمانے میں کوریا کے شعرا کی مخصوص افتادِ طبیعت تھی۔ اس قسم کی نظموں کی مثال کے طور پر ۱۵۵۴ء میں لکھی ہوئی "ی۔چُنگ۔کُو۔ی" کی ایک نظم پیش کی جاسکتی ہے:۔

چین کو سفر پر جاتے ہوئے

"یہ کاروانسرائے اک مثال ہے سکون کی،
کنارے جوئے آب پر!
کنارِ جوئے آب پر ہیں زرد زرد پیڑ نکال کر کھڑے ہوئے،
فصیلِ نیستاں سے!
یہاں پر نرم نرم نیلگوں غبارِ آسمان صبح کو
شکستہ کر رہے ہیں پارہ ہائے ابرِ دُرفشاں!
یہاں پر شام ایک ریشمی عَلَم بنی ہوئی،
چھا گئی —
کوہ کی چٹان پر!
سفر کے دن خطوط بن کے جلوہ گر ہوئے رُخِ فسردہ پر،
مگر میں جانتا نہیں،
کہ کوئی ساعت اس سے ہو سکون میں بڑھی ہوئی،
میرے خیال اس طرح ہیں جس طرح ہوں جھاڑیاں،
کنارِ جوئے آب پر یہاں وہاں!
یہ میرے نغمے موجہائے آبشارِ خواب ہیں!!"

چونکہ تمام شعرا کی اولین حیثیت علما کی ہوتی تھی، اس لئے ان کے کلام میں عشقیہ جذبات کا فقدان ہے۔ کوریا کے شاعروں کے لئے عورت اور مرد کی محبت کا موضوع جذباتی اور جمالیاتی، دونوں حیثیتوں سے ناقابل قبول تھا کیونکہ وہ جنسی تحریک کو بھی کھانے اور پینے کی طرح زندگی کا ایک لازمی پہلو سمجھتے تھے اور اس میں اُن کے لئے کوئی شاعرانہ دلچسپی اور دلکشی نہ تھی۔ لمبے لمبے مباحثوں کو بھی نظم کی صورت میں لکھنے کا رواج تھا لیکن وہ ہماری اختصار پسند طبیعتوں کے لئے بیزار کن ہو سکتے ہیں۔ اور اُن میں ہماری ذہنیتوں کے لئے کوئی بات قابل توجہ نہیں۔ سیاسی ہجویں بھی لکھی جایا کرتی تھیں لیکن ان کا بھی یہی حال ہے۔ فن کے لحاظ سے اچھی خاصی ہونے کے باوجود وہ علم ادب کے مطالعے کے لئے صرف فضلائے بعید کا کام ہی دے سکتی ہیں۔

کوریائی شعرا کے موضوع تین سرخیوں کی ذیل میں آسکتے ہیں — ۱۔ فکریہ نظمیں، ۲۔ دوستوں کے متعلق (اور اسی میں نوحے اور مرثیے بھی شامل ہیں) اور ۳۔ طنزیہ نظمیں۔

لیکن ان طنزیہ نظموں میں سے بہت ہی کم ایسی ہیں جن کا لطف ترجمے میں بھی برقرار رہ سکے۔ ایک نظم مثال کے طور پر دی جاتی ہے۔ جسے "ی۔اِن۔لو" نے لکھا تھا۔ یہ شاعر اپنے زمانے کے مشاہیر میں شمار ہوتا تھا لیکن اس کا شاعرانہ کلام بہت ہی کم ہے:۔

عہدِ نو پر خیالات

شمع جلتی ہے، یہ شعلہ ہے کہ لَو مرمریں،
شانہ جاتا ہے مرے بالوں میں ایسے . . . ایسے . . .
اب چلا ایک طرف، ـــــ اب یہ چلا ایک طرف۔
سر ہے اب صاف مرا!
مُردہ جو بال تھے وہ گر کے زمیں پر بکھرے!
تازہ اور حسین کیا، باندھ لیا پھر سے انہیں[1]۔
کاش! اس طرح سے ہم ملک میں شانہ کر دیں،
حرص کو اور حماقت کو روانہ کر دیں!
ہاں، اسی طرح سے پژمردہ خیالوں کو نکالیں دل سے!
اور نئی قوتیں پیدا کریں دشمن سے نبٹنے کے لئے!
شمع جل جل کے بجھی، لو وہ بجھی ـــــ لو وہ بجھی۔
مرمریں شعلہ لرزتا ہوا خاموش ہوا!
نیند میں ڈوب گئیں ساری امنگیں دل کی!

فکریہ نظموں میں کوریائی شاعر کا محبوب ترین موضوع چاند ہے صدیوں سے یہ اُس کے دل کو بھاتا آیا ہے۔ آئے دن نت نئی تشبیہیں اور استعارے اس کے لئے وضع کئے جاتے رہے ہیں کبھی اسے "مشعلِ بے دود" کہا جاتا ہے، کبھی اسے "ماہ امبر" پکارتے ہیں، اور کبھی "کشادہ خنک محل" کا لقب دیتے ہیں۔ صرف ایک چیز، چاند کے لئے ہی اتنے بے شمار ناموں کا تواتر ترجمے میں پیچیدگی پیدا کر دیتا ہے۔

کوریا کی چاندنی صاف ستھری اور شفاف ہوتی ہے اور اس میں ایک جادو کی سی خاصیت ایک سیدھے سادے گاؤں کو رات کے وقت ایک "مرمریں بستی" میں تبدیل کر دیتی ہے۔ ذیل کا گیت دوسری صدی عیسوی کے آغاز میں "چوئے چونگ" نے لکھا تھا۔ وہ ایک نیک اور متین آدمی تھا اور اُس نے یہ گیت سرود اور ڈھولک کے ساتھ گانے کے لئے تصنیف کیا تھا۔

رات کا وقت

"مشعلِ سیمیں کا نور
نور ـــــ بے دودِ فغاں!

ساتویں طبقے سے گہری نیند کے
مجھ کو لے آیا اشاروں میں یہاں!
ایک سایہ ہے صنوبر کا در و دیوار پر،
اور چلمن پر مری
سایہ آسا کوہ ہے!
میرے گھر میں زندگی بھی آج اک سایہ سا ہے!
مجھ کو کچھ احساسِ بیداری نہیں،
نیند کا احساس بھی معدوم ہے!
ایک موسیقی ہے اس گہری خموشی میں رواں!
کیا صنوبر میں ہے یہ بادِ پریشاں کی صدا،
اور یا یارہ ہے ایسے گیت کا،
جس کا حامل ہے کوئی سازِ نہاں؟

چھٹی اور آٹھویں صدی عیسوی میں کوریا کے تہذیب و تمدن ترقی کی انتہائی بلندی پر پہنچے، اور پھر رفتہ رفتہ ان کا زوال شروع ہوا، اسی زمانے میں مردوں کے باہمی عالمانہ اُنس و رفاقت نے علم ادب پر ایک گہرا اثر کیا۔ اکثر یوں ہوتا کہ دو امنگوں بھرے دل والے نوجوان اکٹھے سرکاری امتحان کی تیاری کرتے آخر اُن کی ہمدمی اس قدر گہری ہو جاتی کہ وہ شگفتہ لوکے باغیچے کی قسم کھاتے۔ یہ ابدی رفاقت کی قسم کا نام تھا اور اس کے بندھن تمام زندگی بلکہ موت کے بعد بھی قائم سمجھے جاتے تھے۔ اس قسم کی رفاقتوں سے کوریا کے گلستانِ ادب میں نادر ترین پھول کھلے۔ باہمی جرأت افزائی اور ہمدردانہ نظرِ انتقاد سے ادبی معیار بہت بلند ہو گیا۔ اگر کوئی دوست مر جاتا تو دوسرا اس کی یاد میں نوحہ یا مرثیہ لکھتا اور عموماً وہ مرثیہ ایک ادبی جوہر ثابت ہوتا۔ ہم ایسے مرثیوں کی مثال کے طور پر ۱۴۰۰ء میں "پی۔ سونگ۔ ان" کا لکھا ہوا نوحہ درج کرتے ہیں۔

دوست کا نوحہ

(۱)

دل ہے بھرپور غموں سے میرا!
جھینگروں کی یہ صدا بارش میں
شادماں شادماں خُرّم خُرّم،
قہقہے یاد دلاتی ہے ترے!

[1] کوریا کے مرد بھی پنجاب کے سکھوں کی طرح بلکہ جنوبی ہند کے باشندوں کی طرح سر کے منتشر بال کو جُوڑے کی صورت میں لپیٹ کر باندھ لیا کرتے تھے۔

(۲)

چشم لبریز غموں سے میری؛
لالہ گوں صبح کا رنگیں پردہ
کوہ شفاف پہ آویزاں ہے ؛
گویا ہے تیری قبائے زرّیں،
سُرخ اور سبز سے رنگوں والی !

(۳)

گھر ہے بھرپور غموں سے میرا !
گھر میں جتنی بھی صدائیں ہیں سنے مجھے
طنز کرتی ہیں اُس آواز پہ سب ،
خواب آسا ہے جو میرے دل میں !

اسی قسم کی عالمانہ اُنس و رفاقت کی مثالیں ان مطالعہ گاہوں میں بھی دیکھی جاسکتی تھیں جہاں علماء اور طلباء مقدس کتابوں پر بحث و تمحیص اور مطالعہ و تعلیم کی خاطر اکٹھے ہوا کرتے۔ کوریا کے مذہبی اور ادبی خیالات پر کئی صدیوں تک ان مطالعہ گاہوں کے اثرات پھیلتے رہے

کسی غیر زبان میں ہر نظم کا ترجمہ یوں کرنا کہ فرداً فرداً ہر ایک شاعر کے طرزِ بیان کا اندازہ ہو سکے، بہت ہی مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ لیکن اس کے باوجود چند مخصوص رجحانات ہیں جن کی بنا پر ہم ان میں امتیاز کر سکتے ہیں۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ وہ شعراء جو گوشہ نشینی کی علیحدگی اور سکون میں غور و تفکر کے ساتھ شاعری کرتے تھے، اُن کا کلام فنی لحاظ سے زیادہ نفیس اور زیادہ مکمل ہے۔ ان کے کلام میں درباری شاعر کے کلام کی نسبت زیادہ پُر وقار تخیل کی موجودگی معلوم کی جاسکتی ہے۔ بارھویں صدی میں لکھی ہوئی ذیل کی دو نظموں سے اندازِ بیان کا یہ اختلاف واضح ہو سکتا ہے۔ ان میں سے ایک "کواک۔ کوڈ" کی لکھی ہوئی ہے جو ایک کامیاب سیاست داں تھا۔ وہ اپنی عالمانہ قابلیت کی وجہ ہی سے سیاسی حلقے میں داخل ہوا اور اس نے شاعر ہونے کے باوجود اپنے کو کامیاب ثابت کیا۔ اس کا دوست "یی۔ چان۔ یون" ابھی اپنی پبلک زندگی میں کامیابی اور شہرت کے درجے پر ہی تھا کہ تارک الدنیا ہو گیا۔ تیس سال کے بعد "کواک۔ یو" اپنے دوست سے ملنے کے لئے گیا۔ کوریائی رواج کے مطابق دونوں عالموں نے اس واقعے کے متعلق ایک ایک نظم لکھی۔ پہلی نظم "کواک۔ کوڈ" کی ہے۔

دور و نزدیک

"پربت کی فضائیں،
اک عرصہ گذرنے پہ ہیں ہم دونوں ملے آج ،
ہم دونوں — جوانی میں جو اک جان تھے — اک جان !
شمع کے اجالے میں کئے کام — کتنے کام،
ہم دونوں نے مل کر،
طے کہ ہوئی صبح، گئی رات کی رانی !
"لیکن ہمیں اب دور کیا بیتے دنوں نے ،
ہاں، تم نے نگاہوں کو ہٹایا،
"گلزار" کے در سے !
"گلزار" کا ہر برگ بلاتا رہا بیکار ،
تم لوٹ کے کب آئے ؟ — نہ آئے !
بس، چرخ پہ اڑتی ہوئی کونجیں،
اور ابر کے پارے ،
نیلے سرِ پہ تمہارے ؛
تم چلتے گئے ، چلتے گئے ، چلتے گئے تم !
نیلے شام و سحر پیرہن جسم تمہارے ،
اور ساغرِ مہتاب تھا تمہاری رضا پر،
تم نوش کرو تاکہ مئے ماہ کے ساغر !
"اب دیکھتا ہوں تم کو، جھجکتا ہوں ،
میرے لب پہ ہے اک قفلِ خموشی !
اب کیسے ملیں روحیں ہماری ؟"

اس نظم میں ہم دیکھتے ہیں کہ کوریا کی شاعرانہ اصطلاحوں کا جابجا استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً "گلزار" کے معنی گلزار ہی نہیں، اس سے مراد زنانخانہ ہے۔ گویا ایک دوست دوسرے دوست کو تارک الدنیا ہونے کی وجہ سے طنزیہ مخاطب کر رہا ہے۔

اس قسم کی اصطلاحوں، استعاروں اور تشبیہوں کا مطالعہ شاعری میں ایک مخصوص اہمیت رکھتا تھا اور اس فن کو مکمل طور پہ جاننے کے لئے ضروری تھا۔ نہ صرف ایک استعارے، تشبیہہ یا محاورے ہی کو ذہن نشین رکھنا ضروری تھا بلکہ اُس کے متعلقہ خیالات بھی چونکہ شاعرانہ تصور کو تکمیل دینے میں لازمی حصہ دار ہوتے تھے اس لئے لفظ کے سامنے

آتے ہی ان سب کا تازہ ہو جانا بھی ایک فیصلہ شدہ امر تھا۔

صنعت ایہام اور دوسرے ذو معنی اشارات جاپانی شاعری میں بہت پائے جاتے ہیں لیکن کوریا کے شاعروں کے کلام میں شاذ ہی ان کی موجودگی دریافت کی جا سکتی ہے۔ مثلاً "کوا ک کو" کی مندرجہ بالا نظم میں ان کی بھرمار ہے۔ "چرخ پر اڑتی ہوئی کونجیں" اور "ابر کے پارے" نہ صرف سفر کے منظر کی تصویر کو بناتے ہیں بلکہ مخصوص محاورے ہیں ان سے روحانی اور علمی خیالات بھی مقصود ہوتے ہیں۔ یہ گویا استعارہ ہیں، یعنی ایسے خیالات ابدیت کی طرف رجوع کرتے ہوئے بلندی کی جانب لے جاتے ہیں۔

اس نظم کے جواب میں "پی جان یون" نے بھی "کنج عزلت میں دوست سے ملاقات" کی سرخی سے ایک نظم لکھی تھی۔ اگرچہ وہ بہت لمبی ہے اور تمام کی تمام پیش نہیں کی جا سکتی لیکن اس کے اقتباس اس طریقے پر ذیل میں درج کئے جاتے ہیں کہ مکمل بھی معلوم ہو اور دونوں شاعر دوستوں کے خیالات اور احساسات کا اختلاف بھی ظاہر ہو جائے

کنج عزلت میں دوست سے ملاقات

"رات ـــــ ہاں کل رات تھا ماہ خزاں،
اور پرواز وداعی تھی عیاں!
آج آمد ہے تری،
لوٹ کر آئی بہار!
"جب تلک فرقت مری ساتھی رہی،
میں تھا اور تیرے خیال!
رات کو کہتا تھا میں یوں چاند سے،
جھانک کر روزن سے دیکھ آئے تجھے!
تاکہ جب لوٹ آئے پھر اس کوہ پر،
دوست کی حاصل ہو مجھ کو کچھ خبر!
"آہ! لیکن چاند چپکا ہی رہا!
وہ نہ پہنچا، وہ نہ لوٹا، اور نہ اس نے کچھ کہا!
"جب کبھی دھیان آگیا مجھ کو ترا،
میں نے بس سوچا یہی،
جلد تو تنگ آ جائے گا تو اپنی مصروفیتوں سے اے ندیم!
"آ، اُتار اپنی کلاہ،
گیسوؤں کو اپنے آزادی دلا!
دور کر دے گی ہوا سر سے ترے گرد جہاں!
اور اس سنگین بستر پر ذرا آرام کر،
پُر سکوں دل اپنے پہلو میں لئے۔
"یہ زمیں کتنا صنوبر کے شجر خاموش ہیں،
ان کی ہلکی ہلکی سی سرگوشیاں کوئی نہیں!
لیکن ان کے دل میں سازش کا گمان کوئی نہیں!
پاسباں انجم تلاش شب میں سرگرداں نہیں!
ابر کے دامن میں خنجر کوئی بھی پنہاں نہیں!

اس نظم کے شروع میں ایک دو رسمی تشبیہیں استعمال کی گئی ہیں، مثلاً پرواز وداعی سے کونجوں کے اڑ کر رخصت ہو جانے کی طرف اشارہ ہے اور "بہار" سے مقصد مسرت کی تازگی ہے، دوست سے دوبارہ ملنے پر لیکن اس کے بعد شاعر کا انداز بیان اس سادگی کا حامل ہو جاتا ہے جو اس کے سادہ زندگی بسر کرنے کا نتیجہ تھی۔

آخر میں ہم ان دونوں دوست اور عالم شاعروں کا بیان مکمل کرنے کے طور پر تین صدی بعد (۱۵۰۱ء ۔ ۱۵۷۰ء) کے ایک شاعر لی ۔ وہانگ کی ایک نظم درج کرتے ہیں جو اس نے "پی ۔ جان ۔ ین" سے صد درجہ عقیدت ہونے کی وجہ سے لکھی تھی۔

"گورو کا خیال کرتے ہوئے"

"شام کا وقت ہے، آکاش پہ بھورے بادل،
جمع ہو ہو کے ملے، ان سے بنا اک جنگل!
جھولتا جھولتا دریا بھی چلا جاتا ہے،
سمت پچھم کی وہ چپ چاپ بہا جاتا ہے!
"قلب لرزاں کو لئے پہلو میں، ہوں میں بھی رواں،
اُسی رستے پہ، وہ اک روز خراماں تھا جہاں!
"مرا آقا، انہیں رستوں میں، یہیں رہتا تھا،
ہل چلاتا ہوا کھیتوں میں یہیں رہتا تھا!
ایسے گیانی کے خیالوں میں جو ڈوبے کوئی،
وقت دھندلا کے مٹے، یاد نہ پھر آئے کبھی!
ماہ سے جیسے ہر اک لمحہ فلک ہے روشن،
روح اس کی بھی یوں ہی نور کا نمی اک مخزن!
کلّۂ کوہ کی مانند تھی اس کی ہستی،

تھی بلندی کو، واں پھول کے ہر اک پتی!
ان پہاڑوں کی خموشی کا شکوہ ابدی،
عمر بھر کے لئے اس روح کا تھا اک ساتھی!
اس کے دل میں نہ تھی دنیا کی تمنا کوئی،
ہیچ تھی دہر کی ہر بات نظر میں اُس کی!"

یہ نظم عقیدت مند شاعر نے اپنے روحانی رہنما کے مسکن یعنی اُن پہاڑوں کی زیارت کے وقت لکھی تھی۔

ان دونوں عالم شاعروں کے تیس سال بعد کوریا کے قدیم ادبی حلقے میں ایک اور بڑا آدمی پیدا ہوا۔ اس کا نام "پی۔کیو۔بو" تھا اور یہ بیک وقت شاعر بھی تھا، عالم بھی اور سیاست دان بھی۔ مختلف تحریروں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص ہر پسندیدہ انسانی صفت کا مالک تھا۔ اس کی ابتدائی زندگی غربت سے جنگ اور کشمکش حیات میں گذری۔ علم کے حصول میں اُس نے اکثر اپنا پیٹ کاٹا۔ فاقے کئے اور علم کو ترجیح دی اور یوں اس جادۂ مستقیم سے ذرا منحرف نہ ہوا جسے اس نے اولوالعزمی سے اپنا مقصود بنا رکھا تھا۔ جوانی کے زمانے سے ہی اس نے اپنی قوتِ ارادی کو تربیت دے کر اپنے ذہن پر اس درجہ قابو پا لیا تھا کہ جسمانی آسائش اور تن آسانی کے خیال اس کی نظر میں بے بنیاد اور ہیچ تھے۔ وہ تحریر اور تقریر میں ایک بے لاگ اور صاف گو انسان تھا اور اس لئے اُس کے کئی دشمن پیدا ہو گئے تھے۔ اپنے زمانے کے لحاظ سے وہ ایک نہایت صاف دل انسان تھا اور اس کی یہی خوبی بسا اوقات ترقی کے راستے میں ایک روک ثابت ہوتی رہی۔ لیکن مخاصمت اور مخالفت کے باوجود وہ بے خوفی اور مستقل مزاجی سے اپنے راستے پر گامزن رہا۔ سرکاری امتحان پاس کرنے کے بعد اسے دربار میں ایک عہدہ مل گیا۔ لیکن جلد ہی اُسے ایک سال کے لئے جلاوطنی برداشت کرنا پڑی۔ بہر حال ایک سال کے بعد اُسے از سرِ نو سرکاری منصب کے عہدے پر بحال کر دیا گیا۔ لیکن دنیوی قدر و منزلت اور ترقی کا بیان اس کی روحانی اور ذہنی نشو و نما کی بہ نسبت دلچسپ نہیں ہے۔ اس کی فطرت ایک مستقل شعلۂ سوزاں تھی موسیقی اور شاعری ہی حقیقتاً اُس کی اصل زندگی تھی۔ انہیں سے اس نے اپنی ہستی کو برقرار رکھا۔ انہیں سے اُس نے ایک ایسی آسمانی قوت حاصل کر لی جس کی وجہ سے کوئی طاقت اس کے امن و سکون کو برہم نہ کر سکی۔ اس کی شاعری شخصی اور داخلی ہے اور اس میں موضوع کا ایک حیرت ناک تنوع پایا جاتا ہے۔ اس کی بہترین نظمیں عموماً لمبی ہوتی ہیں لیکن یہاں پر ہم تین مختصر نظموں کو پیش کرتے ہیں۔

صبح کی آمد

زاغ اپنے آشیاں میں محو گویائی لبِ دریا پہ ہے،
جانتا ہوں میں سحر ہونے کو ہے،
زرد ہوتا جاتا ہے سیمیں رُخِ ماہِ تمام!
ہیں سیہ لہریں خراماں
جیسے سائے بادلوں کے چاند پر!
اور نسیم صبحگاہی جاگ اٹھی
اس جگہ ——
جس جگہ کھاتے ہوئے خم چھو لیتے ہیں کچھ شجر!
اور اس گہری خموشی میں کہیں سے —— دور سے ——
ایک نغمہ آ رہا ہے بے نشاں رفتار سے بہتا ہوا،
رفتہ رفتہ ہوتا جاتا ہے وہ یوں آتے ہوئے،
نزد سے نزدیک تر!
رات کا ہر اک مچھیرا جا رہا ہے اپنے گھر کو لوٹ کر،
اُجلے، پھولوں سے ہیں اُن کے پیرہن،
جس طرح اجلی ہیں کرنیں چاند کی!
دونوں گویا ایک ہیں!
یہ کوئی روحیں ہیں یا انسان ہیں، مجھ کو نہیں اس کی خبر!
رفتہ رفتہ اُن کے نغمے مٹ گئے!

دوسری نظم کی سرخی "رخصت" ہے۔ اس کے ساتھ ہمیں ایک نوٹ بھی ملتا ہے "تیسرے چاند کے آخری دن شاعر تصور میں بہار کے دیوتا کی رخصت کا منظر دیکھتا ہے۔"

رخصت

گرے پتوں سے، پھولوں سے بنا گلزار میں بستر،
ہے سویا موسمِ گل کا بسنتی دیوتا اس پر!
فلک پر چاند اب دھندلا چلا ہے، آخرِ شب ہے،
مگر سویا ہوا ہے دیوتا، وہ ہوش میں کب ہے؟
یکایک نیند میں اس نے کیا محسوس یوں، گویا۔

کوئی گل نکہتِ شبنم کو اس کے پاس لے آیا !
ہوئی جب نیند سے دوری، وہ ہنستے ہنستے جاگ اٹھا،
اور اپنے بسترِ گلہائے تر کی قید سے نکلا !
بنا تھا بوئے گل کے نشّے سے مخمور، مستانہ،
تلاشِ عشق میں ہر سمت وہ پھرنے لگا تنہا !
وہ اپنی کیفیت کا اب کسے ہمدم بنائے گا ؟
وہ شفتالو سے اپنے عشق کا اظہار کر دے گا !
مگر عشوؤں نے اس کے دیوتا کو ہے تھکا ڈالا !
تو کیا خوبانیوں کا پیڑ اس کے دل کو بھائے گا ؟
نہیں اس میں بھی اک تندی ہے دل اس پر نہیں آتا!
مگر اک پھول کے پودے کا پیراہن تھرکتا ہے،
چمکتا ہے کہ گویا کوئی پروانہ لرزتا ہے !
اور اس کے برگ ہائے سرخ میں لرزش ہوئی پیدا!
بسنتی دیوتا کا نام اس لرزش میں جاگ اٹھا۔
یہی اب ہمدمِ کیفیتِ مخمور ہو جائے،
یہی گل، جس سے بڑھ کر آسماں بھی پھول کب لائے؟
فلک پر چاند اب مٹنے لگا ہے، آخرِ شب ہے۔
وہ شعلے صبح کے آئے، وداعِ ماہ و کوکب ہے!
صدا آتی ہے دھندلی سی کسی دوری سے قدموں کی !
سحر کی اب حکومت چھا گئی، گلزار خالی ہے۔
جلوسِ رنگ و گل کی گونج ہی محسوس ہوتی ہے !
گری جاتی ہے ہر پتّی، یہ اب حالت ہے پھولوں کی!
سحر کی اب حکومت چھا گئی، گلزار خالی ہے !
صدا کچھ آنسوؤں کی کان میں رہ رہ کے آتی ہے !

تیسری نظم واقعاتی ہے اور اس سے "پی۔کیو۔یو" کی خاص ذہنی افتاد کا اظہار بھی ہوتا ہے کیونکہ کوریا جیسے رسمی خیالات والے ملک میں لڑکیوں کی کوئی اہمیت نہ تھی اور ایک باپ کی نظروں میں ہمیشہ بیٹے کا درجہ ہی بڑا ہوتا تھا۔ ہم اس نظم کا ترجمہ نثر میں پیش کرتے ہیں۔

ننھی بچی کی موت پر

میری ننھی بچی، چمکتی ہوئی برف سے چہرے والی،
خاموش صحن کیسا سونا معلوم ہوتا ہے،
ایک دن یہیں اس کے رنگین پیراہن پھولوں میں نظر آیا کرتے تھے !
ابھی وہ دو ہی سال کی تھی کہ میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگی،
جب تین برس کی ہوئی تو بڑی پیاری بڑی شرمیلی، چپ چاپ تمیز والی۔
اس سال وہ چار برس کی ہو جاتی۔ وہ اپنے ننھے سے ہاتھ میں قلم لیتی
اور میں اسے لکھنا سکھاتا۔
لیکن وہ تو چلی گئی۔ صرف قلم ہی باقی رہ گیا۔
اس گھر کے آشیانے میں رہنے والی، میری ننّی سی چڑیا!
تو اتنی جلدی کیوں اڑ کر چلی گئی۔
جیسے بجلی چمکے ـــ تو آئی، اور یونہی چلی گئی، جیسے بجلی چمکے!
گذرتے ہوئے دنوں کو چپ چاپ دیکھتے رہنا میں نے سیکھا ہے۔
میں یہ گذرتے ہوئے دن کاٹ سکتا ہوں۔
لیکن ایک ماں کے آنسوؤں کو کون خشک کر سکتا ہے !
کھیتوں میں آندھی کے طوفانی آثار دکھائی دے رہے ہیں۔
آج رات ہلکے تھپیڑوں سے اناج کی کئی بالیں گر کر ضائع ہو جائیں گی۔
کسان جس قدر لٹتا ہے، اتنا اسے کلٹنے کو نہیں ملتا!

"پی۔کیو۔یو" کے علاوہ عام رجحانات سے مختلف ذہنیت رکھنے والا ایک اور شاعر بھی کوریا میں ہوا ہے۔ اس کا نام "پی رسونگ۔ ان" تھا اور اس کا زمانہ چودھویں صدی میں ہے۔ اس کی نظم "خزاں کا گیت" مختصر نظموں کی ایک اچھی مثال ہے۔ اس میں کم جگہ میں شدید اختلافات کو سمویا گیا ہے۔ اور یہ انداز چودھویں صدی سے لے کر کئی سالوں تک کوریا میں مقبول اور رائج رہا ہے۔

"خزاں کا گیت"

بگولوں کی طرح اڑتے ہیں پتے صحنِ گلشن میں، ـــ
گذشتہ سال تھی آواز محوِ رقص قدموں کی،
مگر امسال آتی ہے صدا آنسو کے نغموں کی !
سیاہ و سرخ سایہ پیڑ کا پانی کے دامن میں، ـــ
گذشتہ سال قلبِ شادماں مسرورِ شاعر کا،
مگر امسال خون سرخ ہے ہر فردِ لشکر کا !

سولھویں صدی کا ایک شاعر جو زیادہ تر "یول۔کوک" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، لوگوں کی نظروں میں ایک مہاسنت کا رتبہ رکھتا ہے۔ اس کے زمانے سے عالمانہ فرقے کی وہ قدر و منزلت نہ رہی جو پہلے تھی۔ بدلتا

ہو از مانہ تھا اور تنزل کا دور دورہ۔ اُس کی ایک نظم ہے:۔

وطن کے مصائب کے خیال میں

تین مہینے آج سے پہلے!

تین مہینے آج سے پہلے
میں نے کہا تھا اپنے دل سے
اب کے چاند یہ کٹ جائے گا
اے دل! پیری دکھ یہ تیرا! "

آئی بہاریں، چھائی بہاریں
سوکھے اور مرجھائے پتے،
ان سب پر ہریالی چھائی؛
پھول کھلے، کھل کر مسکائے؛
چاند نیا آکاش پہ آیا!
ساون کی برکھا نے اپنا گھیرا سارے جگ پر ڈالا!
پربت کی چوٹی سے بہتی ہر اک دھارا زور سے لرزی!
برکھا نے جب ایک ہی پل کو،
سانس لیا اور ٹھٹکی چپ ہو،
پھلواری میں داد بوسے،
انسوؤں جل نینوں سے برسا،
پھر سے جاری ہو گئی برکھا!

جیسا کہ پیشتر لکھا جا چکا ہے محبت کی نظمیں قدیم شعرا میں شاذ ہی ملتی ہیں لیکن اس کے باوجود چند ایسے نغماتِ عشق ہیں جن کی طرف توجہ کرنا چاہئے۔ ایسی تمام نظمیں یا گیت اکثر طوائفوں، داشتاؤں یا رقاصہ لڑکیوں کی تصنیف ہوتے ہیں اور اس لئے ان کے لکھنے کے نام کا کبھی پتہ نہیں چلتا۔ یہ گمنام ہی رہتے ہیں۔ اگرچہ ان کو کوریا کی بلند یا معیاری شاعری میں جگہ نہیں دی جاتی۔ پھر بھی ان میں اپنی ایک گونہ دلکشی موجود ہوتی ہے۔ مثال ذیل میں لیجئے:۔

دھوکا

کئی بار دیکھے ہیں میں نے،
ترے لوٹ کر آتے قدموں کے سپنے؛
مگر آنکھ کھلنے پہ دیکھا،
صدا تھی وہ بارش کی روزن کے پردے پہ،
اور پیڑ کی ٹہنیوں پہ!
یہ کیفیتیں اس قدر دیکھ بیٹھی ہوں، ڈر ہے،
کہ اب راہ تکتے ہیں، چپ سے،
کہیں آنہ جائے تو برسات کا اک دھندلکا ہی بن کر!

کوریائی ادب کا زوال رفتہ رفتہ ہوا تا بیسویں صدی کے آغاز میں اس انقلاب کے آثار خاصے نمایاں ہو گئے۔ جوں جوں غیر ملکی اجنبیوں نے ملک میں داخل ہونا شروع کیا، اور ہر قسم کے مغربی اثرات نے اپنے پاؤں جمانے شروع کئے، اشیا اور حقائق کی قدر و قیمت کا وہ پہلا احساس دھندلا ہو کر معدوم ہوتا گیا۔ قومی زندگی میں عالمانہ ارتقا کی وہ اہم ترین حیثیت باقی نہ رہی۔

رفتہ رفتہ پرانے اور نئے زمانے کے ان اختلافات کی درمیانی حدود کا فاصلہ بڑھتا گیا۔ کوریا کا پرانا باشندہ فضائے بعید میں دکھائی دینے لگا، کنفیوشس کے عقاید کو دل میں لئے ہوئے، عالم اور شاعر جس کی روح خیالی دنیاؤں کی سیاح تھی اور ماضی کی اس باوقار شکل کے مقابے میں آج کل کے کوریا کا نوجوان نظر آنے لگا۔ ان دونوں کے باہمی اختلافات کی کوئی حد ہی نہیں۔

کوریا کے ادب کا آج کیا درجہ ہے یا مستقبل میں اس کی کیا حالت ہو گی، اس بارے میں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن کوریا کے شاعروں کی روش اور متفاول افتادِ طبع اور رجحان ذہنی سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں، کہ کوریا کے ہر شاعر کا مطمح نظر بلندی اور ترقی کی طرف ہوتا ہے۔

میراجی

دعوتِ شوق !

بنائے عہدِ محبت کو استوار کریں ! بھلا کے شکوے گلے آؤ دل کے پیار کریں !
تمام عمر اسی انتظار میں گزری تمہیں کہو کہ ابھی کب تک انتظار کریں
وہ دل کہ ہیں غمِ فرقت سے تیرہ و تاریک نشاطِ وصل سے پھر ان کو زرنگار کریں
بہار لائی ہے رنگینیوں کے میخانے دلوں کو آؤ ذرا ہم بھی مے گسار کریں
بجا ہے پیرہنِ ضبط و احتیاط کو ہم جنونِ فصلِ بہاری میں تار تار کریں
پہن کے پھول کریں رقص صحنِ گلشن میں ربابِ شوق و محبت کو نغمہ بار کریں
فضائے روح میں بھر دیں گلوں کی رنگینی سرودِ دل کو ہم آہنگِ آبشار کریں
صلائے رقص، صلائے طرب، صلائے سرود کچھ احترام صلاہائے نو بہار کریں

بہار آئی ہے، اے کاش تم بھی آجاؤ !
کھلے ہیں پھول ذرا تم بھی مسکرا جاؤ !

اثر صہبائی

غزل

سناؤں تجھ کو میں کیوں کر غمِ نہاں اپنا
نہیں ہے رازِ دروں محرمِ زباں اپنا

دکھاؤں کیا تمہیں نظارہ اپنی پستی کا
کہیں زمیں سے بھی نیچے ہے آسماں اپنا

تری جفا ہی پہ کیا منحصر ہے لذتِ درد
فلک بھی خیر سے ہے ایک مہرباں اپنا

کرشمہ ہے یہ اک ادنےٰ سا حُسنِ فانی کا
ہوا ہے عشق زمانے میں جاوداں اپنا

سنا ہے منزلِ مقصود رہ گئی پیچھے
ابھی روانہ ہوا تھا نہ کارواں اپنا

الٰہی اس کی تلافی بھی کوئی ہے کہ نہیں
گیا ہے وقت جو جینے میں رائگاں اپنا

رہوں قفس میں تو کچھ روز مطمئن ہو کر
چلوں جلا کے گلستاں سے آشیاں اپنا

کچھ ایسا اپنے خیالوں میں محو ہوں شاہدؔ
الگ جہاں سے ہے اک اور ہی جہاں اپنا

مسعود شاہد

صدمہ

"کچھ بھی ہو، ان کا رویہ نہایت قابلِ اعتراض ہے، اگر میں آپ کی جگہہ ہوتی تو میں ایسے شخص کو کبھی پسند نہ کرتی"۔

"جنک! اپنے پتا کے لئے ایسے الفاظ نہ کہو، وہ تمہارے پتا ہیں اور ——— وہ نہایت اچھے آدمی ہیں، میں تمہیں سچ کہتی کہ ایسا انسان ڈھونڈے سے بھی نہیں مل سکتا، میں نے تمہیں وہ راز اس لئے نہیں بتایا تھا کہ تم اپنے پتا سے نفرت کرنے لگو بلکہ انہیں اچھی طرح سمجھ کر ان سے زیادہ محبت کرو، تو بہ! وہ دوسرے شرابیوں کی طرح آسمان کو سر پر نہیں اٹھا لیتے ——— اگر میں تمہیں نہ بتاتی تو کیا تمہیں معلوم ہو سکتا تھا کہ وہ شراب پیتے ہیں، ذرا کمزور ہو گئے ہیں اس لئے کبھی کبھی پی لیتے ہیں تاکہ طاقت بحال رہے اور معدے کی کمزوری کی وجہ سے کبھی کبھی پی کر مجھ سے جھگڑ بھی پڑتے ہیں"۔

"ماتا میں جانتی ہوں تم ان کی طرفداری کر رہی ہو، ان حالات کے ماتحت ان کی یہ حرکات حد درجہ معیوب ہیں"۔

سیٹھ ہردے شنکر کسی وقت ایک متمول آدمی تھا، لاہور میں موٹر کی تجارت کی ابتدا اسی نے کی تھی، خوب روپیہ کمایا، لوگ اس وقت سے اُسے سیٹھ کہنے لگے، ایک وقت ایسا آیا جو ہر ایک تاجر پہ آیا کرتا ہے، اس سے غلطی ہوئی اور بڑی بھاری غلطی ——— ! اس نے ایک ہی ماڈل کی بہت سی کاریں منگوا لیں، وہ ماڈل پسندیدہ نگاہوں سے نہ دیکھا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ موٹریں اس کی دکان میں ہی پڑی کی پڑی رہ گئیں، سیٹھ ہردے شنکر نے اپنا سارا روپیہ اس ماڈل پر صرف کر دیا تھا، یہ ایک صدمہ تھا جس سے سنبھالا بہت مشکل تھا، اس نے ساتھ ہی آٹو موبائیل ریپئر کا ایک کارخانہ بھی کھول لیا لیکن اس میں بھی خاطر خواہ کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی، سیٹھ جس ٹھاٹھ سے پہلے رہتا تھا اسے گنوانا بھی نہ چاہتا تھا لیکن وہ شان کب تک رہ سکتی تھی، کوٹھی تو خیر اپنی ہی تھی البتہ بچ کے تمام نوکر ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے، بیوی کے تمام زیور بک چکے تھے، قیمتی سامان بھی فروخت ہونے لگا، سیٹھ صاحب دن رات کام کرنے کے باوجود روپیہ نہ کما سکے اس لئے اُن کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ چکے تھے، مزاج میں ضد کا بہت دخل ہو چکا تھا، ہر روز بیوی سے لڑنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کر ہی لیا کرتے تھے اور اپنے خیال کے مطابق محض اس لئے کثرت سے شراب پینی شروع کر دی کہ وہ اپنا غم غلط کر سکیں، کچھ دن ہوئے ایک سیکنڈ ہینڈ موٹر بھی قسطوں پر خرید لیا تھا، وہ یہ نہیں جاننا چاہتے تھے کہ قسطوں کے لئے روپیہ کہاں سے آئے گا، لیکن ہر لمحہ انہیں یہ خیال چین نہ لینے دیتا تھا کہ ان کا دوست اور ہمسایہ شو دیال ہر سٹر تو ہر روز شام کو موٹر پر سوار ہو کر نکلے اور ان کے اپنے خیال میں ان کی کوٹھی کے عین سامنے زور زور سے ہارن بھی بجائے اور ان کے پاس موٹر نہ ہو، یہ کیسے ہو سکتا ہے!

موٹر خرید لینے سے انہیں ایک اچھی خاصی مصروفیت ہو گئی تھی، وہ ہر روز بگڑ جاتا تھا اور سیٹھ صاحب دن بھر منہ اٹھائے کر اس کی مرمت میں لگے رہتے تھے، چونکہ وہ خود ہی مستری بھی، کلینر بھی اور ڈرائیور بھی تھے اس لئے وہ اپنی بیوی اور اپنی بیٹی کو بھی موٹر پر بٹھانا اپنی حق تلفی خیال کرتے تھے۔

ان کی بیوی نہایت سمجھدار متحمل مزاج تھی۔ اس نے بہتیرا سمجھایا کہ کسی طرح سیٹھ صاحب موٹر خریدنے سے باز آ جائیں لیکن سیٹھ صاحب کی ضد کا مقابلہ کرنا کوئی آسان کام نہ تھا، بچاری لہو کے گھونٹ پی کر رہ گئی، اس کو علم ہو گیا تھا کہ جنک کماری اپنے باپ کی طرف سے کچھ کھچی کھچی رہتی ہے اس لئے اس نے تمام واقعات ٹھیک ٹھیک اس کے سامنے دہرا دئے تاکہ جنک کو معلوم ہو جائے کہ وہ کس قدر غریب ماں باپ کی بیٹی ہے —

جنک کماری اس دن بھری بیٹھی تھی،

"ماتا! آپ خواہ مخواہ ان کی طرفداری کر رہی ہیں، کیا میں ابھی نادان ہوں جو آپ اس طرح کی باتیں کرتی ہیں، میں خوب سمجھتی ہوں"۔

جنک سیدھی اپنے باپ کے کمرے میں گئی وہ دیر تک اس کی طرف دیکھتی رہی، گویا اس نے مدت کے بعد ایک مجرم کو پکڑ لیا تھا،

وہ خاموش تھی۔ آنکھیں نمناک تھیں۔ وہ اس کے سامنے کھڑی ہوتی محسوس کر رہی تھی کہ وہ ایک ایسا راز جان گئی ہے جو اسے نہ جاننا چاہئے تھے، وہ اس کی تمام کمزوریوں سے واقف ہو چکی تھی، وہ دل ہی دل میں اپنے باپ کو مخاطب کر کے کہہ رہی تھی،

"میں وہ بات جانتی ہوں جو تمہیں معلوم نہیں کہ میں جانتی ہوں"۔

سیٹھ ہر دے شنکر حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا، مقابلے کے جذبات جنگ کے حسین چہرے پر صاف عیاں تھے۔

"بیٹی! کیا بات ہے؟"

"ماتا کے پاس پہننے کو اچھے کپڑے بھی نہیں ہیں اور آپ موٹریں خریدتے پھرتے ہیں"! یہ کہہ کر جنگ چیخیں مار کر رونے لگی اور روتی ہوئی باہر بھاگ گئی، چند لمحوں تک میاں بیوی ایک دوسرے کا منہ تکتے رہے، سیٹھ نے غم انگیز مسکراہٹ سے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے جنگ کا دماغ خراب ہو گیا ہے"۔

جنگ دیر تک اپنے کمرے میں روتی رہی یہاں تک کہ اس کے دل کی بھڑاس نکل گئی، وہ اپنی ماں سے اتنی محبت کرتی تھی کہ کسی اور کے لئے اس کے دل میں جگہ باقی نہ رہی تھی، اس کی ماں کس قدر حلیم، شریف النفس، متحمل مزاج اور بے ضرر عورت تھی! اس کا باپ کس قدر چڑچڑا، ضدی، ہٹ دھرم اور فضول خرچ آدمی تھا —! یہ خیال اسے بار بار آتا اور ہر بار ماں کی محبت میں اضافہ ہوتا جاتا،

اس کی ماں اسے تسکین دے رہی تھی،

"جنگ! اتنا کرودھ بھی تو اچھا نہیں، تمہارے پتا کیا کہتے ہوں گے!"

"یہی کہتے ہوں گے کہ جنگ کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ کاش انہیں معلوم ہو جاتا کہ مجھے سمجھ آ گئی ہے"۔

"بیٹی! میں انہیں اس وقت سے سمجھتی ہوں جب تم پیدا بھی نہ ہوئی تھیں اور اس وقت سے یہ جانتے ہوئے کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں غلط اور نامناسب کر رہے ہیں ہمیشہ ایک دو دفعہ کہہ دینے کے بعد خاموش رہی ہوں اور خاموشی سے سب کچھ برداشت کرتی رہی ہوں، تو مجھ سے بہت پریم کرتی ہے، میری ہمدرد ہے، میرا دکھ دیکھ نہیں سکتی لیکن یہ کب تک، کب تک تو میرا دکھ بٹاتی رہے گی؟ کل تو بیاہی جائے گی تو میری وہی زندگی ہوگی اس لئے تمہارا کڑھنا بے سود ہے"۔ "ماتا! میں تمہیں کبھی نہ چھوڑوں گی، میں تمہیں اس حالت میں نہیں چھوڑ سکتی"!

ماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جنگ! یہ کیا کہہ رہی ہو! تمہاری تو بات بھی پکی ہونے والی ہے، شودیال بیرسٹر نے اپنے بیٹے منوہر کے لئے پیغام بھیجا تھا، تمہارے پتا نے مجھ سے بھی مشورہ کیا، لڑکا شریف اور لائق بھی ہے اگلے سال وکالت کا امتحان پاس کرے گا، تمہارا اور اس کا جوڑ بھی خوب ہے، بچپن سے ایک ساتھ کھیلے ہو اس لئے میں نے بھی ہامی بھر دی"۔

"ماتا! ایسا کبھی نہ ہوگا، میں اس سے —— میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتی"۔

"جنگ! بیٹی ایک ایسا میوہ ہے جو پک جانے کے بعد سڑنا شروع ہو جاتا ہے"

لالہ شودیال بیرسٹر کا لڑکا منوہر اگرچہ حسین تھا لیکن نہایت خود پسند اور خود بیں واقع ہوا تھا، چونکہ منوہر اور جنگ بچپن سے ہی اکٹھے رہے تھے اس لئے ان میں محبت کی فراوانی اور تیزی تو ہرگز پیدا نہ ہو سکتی تھی، منوہر یہ جانتے ہوئے کہ جنگ حسین ہے اور شہر کی حسین ترین لڑکیوں میں سے ہے یہ بات بھی نہ بھول سکتا تھا کہ وہ ایک قلاش سیٹھ کی بیٹی ہے، ایک بار نہیں بلکہ کئی بار اس نے جنگ کے نازک محسوسات کو صدمہ پہنچایا۔ وہ اپنی خودداری کو صدمے پہنچاتی رہی اور دن گذرتے گئے،

جنگ کے دل میں اپنی ماں کی محبت اور منوہر سے نفرت بڑھتی گئی،

ایک دن اس نے اپنی ماں سے کہہ ہی دیا۔

"ماتا! تم نے خواہ مخواہ اس دن منوہر کی یہ بات مان لی کہ وہ مجھے اپنی کار پر بٹھا کر ہر روز کالج چھوڑ آیا کرے گا، وہ تو اس قدر خود پسند ہے کہ میں آپ سے کیا بیان کروں، جب میں کار میں بیٹھ جاتی ہوں تو وہ چلاتے ہوئے ارد گرد اس طرح دیکھتا ہے گویا وہ لوگوں سے یہ کہہ رہا ہے کہ یہ لڑکی پہلے پیدل چل کر کالج جایا کرتی تھی اب میں اسے اپنی موٹر میں بٹھا کر لے جا رہا ہوں۔ ماتا! وہ میری طرف اس طرح دیکھتا ہے گویا وہ مجھ پر ترس کھا رہا ہے، جب کبھی وہ اپنے دوستوں سے میرا تعارف کراتا ہے تو صرف یہی کہتا ہے "میں انہیں کالج چھوڑنے جا رہا ہوں یہ میرے پتا کے ایک دوست کی بیٹی ہیں۔" گویا پتا جی کا نام لیتے ہوئے بھی اسے شرم آتی ہے، اس میں شک نہیں کہ وہ کبھی کبھی محبت کا اظہار بھی کرتا ہے لیکن میں سمجھتی ہوں کہ وہ

محض اپنی خود پسندی کو تسکین دینے کے لئے ایسا کرتا ہے، اس کی ہر بات میں تصنع ہے، وہ مصنوعی ماحول میں پل کر جوان ہوا ہے، زندگی کی صحیح کیفیتوں سے وہ بالکل آگاہ نہیں۔

اپنے موٹر، اپنے لباس، اپنی گفتگو غرض کہ ہر وہ چیز جو اس کی اپنی ہے اس سے وہ مجھے مرعوب کرنا چاہتا ہے اور یہ توقع کرتا ہے کہ میں اس کی ہر غلط بات کی تائید کروں، ماتا! اگر ہم غریب ہو گئے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اپنا ضمیر بھی بیچ ڈالیں، ابھی کل کی بات ہے، سکول سے آتے وقت وہ مجھ سے کہنے لگا "چلو نہر کا چکر ہی لگاتے چلیں" میں نے اعتراض تو نہ کیا۔ البتہ میں نے بُرا ضرور محسوس کیا، راستے میں اپنے خاندان کی جو بات تھی اس نے مجھ سے کہہ ڈالی البتہ تمام کمزوریوں کو چھپاتے ہوئے، وہ مجھے حقیر سی شے سمجھ کر اپنے آپ کو اتنا بڑھا چڑھا کر دکھاتا گویا میں وہاں موجود ہی نہ تھی کبھی نہایت تیزی سے موٹر چلاتا اور مجھے میٹر کی طرف دیکھنے کا اشارہ کرتا، یہ بہت چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں ماتا! لیکن مجھے باغی بنا دینے کے لئے کافی ہیں، کل مجھ سے یہ بھی کہہ رہا تھا،

"جنک! تم نے تو دنیا دیکھی ہی نہیں، کاش تم کلب میں گئی ہوتیں تو تمہیں معلوم ہوتا کہ آج کل کی لڑکیاں کس قدر مہذب تعلیم یافتہ اور چست و چالاک ہوتی ہیں"

میں نے کہا "مجھے بھی آج لے چلنا!"

وہ خاطر خواہ جواب نہ دے سکا اور بے رخی سے کہنے لگا کہ "اچھا میں آج آؤں گا تو وہاں فیصلہ کریں گے۔"

"بیٹی! تم زود رنج ہو گئی ہو۔ منوہر نہایت سمجھ دار لڑکا ہے، اگر اس قسم کی حرکات وہ کرتا بھی ہے تو محض بچپن کی وجہ سے۔ تم یہ نہیں جانتیں کہ وہ بچپنے سے تمہارے ساتھ کھیلا ہے اور تم سے بہت پریم کرتا ہے۔"

"پریم؟ وہ خود نما نوجوان پریم کو کیا جانے! میں تو اتنا جانتی ہوں۔"

باہر موٹر کی آواز آتی ہے،

میرے خیال میں منوہر آ گیا ہے۔"

منوہر سیٹی بجاتا ہوا کمرے میں داخل ہوتا ہے اور نہایت فخریہ انداز میں کہتا ہے،

"ماتا جی! آج مجھے جنک نے کلب جانے کو کہا تھا"

جنک نے بظاہر خلوص کے ساتھ کہا۔

"ہاں ہاں! میں تیار بیٹھی ہوں۔"

"لیکن جنک میں یہ نہیں چاہتا کہ وہ لوگ تمہاری ہنسی اڑائیں ٹینس تم نہیں کھیل سکتیں، برج تمہیں کھیلنی نہ آئے، وسکی سوڈا کو تم ہاتھ نہ لگاؤ، تو کلب میں جانے کا فایدہ! وہاں بت بن کر بیٹھ رہنا بالکل "ایٹی کٹ" کے خلاف ہے، اگر کوئی لڑکی تم سے گفتگو کرے گی تو تم "ماڈرن" موضوعات کو سمجھ ہی نہ سکو گی، یوں ہی نادم ہونے کا کیا فایدہ! مجھے کچھ عذر نہیں، یہ نہ سمجھنا کہ میں جان بوجھ کر تمہیں ساتھ نہیں لے جانا چاہتا، اس میں تمہارا ہی فایدہ ہے۔ اور ——"

جنک نے ماں کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا اور مسکرا کر کہا،

"مسٹر منوہر! میں بھی یہ نہیں چاہتی کہ لوگ میری ہنسی اڑائیں، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں میں صرف یہ جاننا چاہتی تھی کہ آپ کی کلبوں میں تہذیب کس حد تک ترقی کر چکی ہے اور ہم جیسی گنوار لڑکیاں وہاں جا کر کچھ سیکھ بھی سکتی ہیں یا نہیں، معلوم ہوتا ہے کہ وہاں جانے سے پیشتر لڑکی کو پورا مہذب اور "اپ ٹو ڈیٹ" بن جانا چاہیے۔"

میں نے تمہیں گنوار تو نہ کہا تھا، تم یونہی بات بات پر بگڑ جاتی ہو، یہ بھی "ایٹی کٹ" کے خلاف ہے۔"

جنک خاموش ہو گئی، ماں نے بیٹی کی طرف پر غور نگاہوں سے دیکھا، صرف ماں کی آنکھیں دیکھ سکتی تھیں کہ جنک کی آنکھوں کی عمیق ترین گہرائیوں میں آنسو چھلک رہے تھے،

منوہر سیٹی بجاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا، جنک کی بڑی بڑی آنکھوں سے آنسو ڈھلک پڑے۔

"ماتا! دیکھ لیا آپ نے؟ مجھے اس بات کا رنج نہیں کہ وہ مجھے اپنے ساتھ کلب میں کیوں نہیں لے گیا —— ایشور جانتا ہے کہ میں ہرگز وہاں جانا نہ چاہتی تھی —— لیکن جس بہانے سے اس نے مجھے ٹالا ہے اس میں میری کس قدر ذلت اور سبکی پنہاں ہے، پنہاں نہیں بلکہ آشکار، ماتا! کاش تم جانتیں کہ ان باتوں سے میری روح کو کس قدر صدمہ پہنچا ہے۔"

"بیٹی! میں سب کچھ جانتی ہوں لیکن ——"

"—— لیکن مجھے صبر کرنا ہی ہوگا۔ یہی کہنے لگی تھیں ماتا؟ آخر یہ کیوں! زہر کے گھونٹ کس لئے پینے ہوں گے! اپنی روح کو کیوں کچلنا ہوگا؟

اس لئے کہ ہم غریب ہیں!

یہ کوئی معقول وجہ نہیں ہے! روح کا دکھ سارے دکھوں سے بڑھ کر ہے۔ میری محبت صرف تمہارے لئے ہے بس اس میں کسی اور شخص کو شریک نہیں کرنا چاہتی اور یہ میرا آخری فیصلہ ہے"

بیٹی کا یہ فیصلہ اس نے ہردے شنکر تک پہنچا دیا اور اس نے بلا تکلف شیو دیال بیرسٹر کو جواب دے دیا۔ بیرسٹر امیر ہونے کے باوجود نہایت متحمل مزاج انسان تھا، اس نے چپکے سے ہردے شنکر کے جواب کو سنا اور پھر اس طرح بھلا دیا۔ گویا کوئی واقعہ ہوا ہی نہیں تھا، اس کے بعد اس نے یہ کوشش کی کہ ان کے دیرینہ تعلقات خوشگوار رہیں لیکن ان حالات کے بعد ایک خفیف سی کشیدگی کا پیدا ہو جانا قدرتی امر تھا، جنک نے منوہر کی کار میں کالج جانا بھی بند کر دیا جس سے منوہر کو کافی رنج ہوا اور اسی رنج کی بنا پر اس نے جنک سے ملنا جلنا بالکل بند کر دیا۔

منوہر خود بیں اور خود پسند تھا، اس لئے اسے بہت صدمہ ہوا، اس میں شک نہیں کہ وہ جنک سے محبت نہ کرتا تھا لیکن اکٹھے رہنے سے انتہا درجے کا انس ضرور پیدا ہو چکا تھا، کالج کے نوجوانوں کے جذبات میں پختگی نہیں ہوتی، کومل اور لچکدار ڈالیوں کی طرح خفیف سے خفیف ہوا کے ساتھ بھی بل کھا جاتے ہیں، وہ اکثر اوقات خود فریب کھا جاتے ہیں لیکن اس زعم میں رہتے ہیں کہ وہ دوسروں کو فریب دے رہے ہیں۔

منوہر نے جنک کی شخصیت کو کبھی اہمیت نہ دی تھی، وہ تیز طرار اور عشوہ طراز لڑکیوں کو بہت پسند کرتا اور اسی ماحول میں وقت گزارتا تھا، جنک کو ایک آسان شکار سمجھ کر وہ اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں دیا کرتا تھا، کلب میں بھی اس نے جنک کو ساتھ لے جانے سے محض اسی لئے ٹال دیا تھا تاکہ وہ اس کی کمزوریوں سے واقف نہ ہو جائے، وہ ہر روز جنک کو کالج لے جایا کرتا تھا اور اس نے یہ کبھی محسوس نہ کیا تھا کہ اگر وہ اُسے نہ لے جائے تو اس کی حالت کیا ہو گی، دراصل یہی سمجھے ہوئے تھا کہ اس کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہے، لیکن پہلے ہی دن اس نے محسوس کیا گویا ایک پوشیدہ سی دلکشی اس کے پہلو سے چھین لی گئی ہے، اس نے بارہا اپنے جی میں کہا۔

"کلب کی لڑکیوں کے مقابلے میں جنک کیا چیز ہے؟ میں خواہ مخواہ اسے یاد کر رہا ہوں، عجیب پاگل ہوں"

دو دن اسی کشمکش میں گزر گئے،

تیسرے دن وہ رنجیدہ ہو کر کہنے لگا۔

"جنک! تو مجھے کیوں بار بار یاد آ رہی ہے میں سچ کہتا ہوں مجھ تجھ سے محبت نہیں"

ایک دفعہ نہیں بلکہ کئی بار اس نے اپنے آپ کو فریب دیا لیکن انتہائی جدوجہد کے باوجود جنک اس کی رگ و پے میں سرایت کرتی گئی اس نے محسوس کر لیا تھا کہ جنک میں ایک بات ایسی تھی جو عشوہ طراز چھوکریوں میں نہ تھی۔

ایک دن وہ اپنی کار لے کر اس راستے پر کھڑا ہو گیا۔ جہاں سے جنک کالج کی طرف جایا کرتی تھی، آج وہ محسوس کر رہا تھا کہ جنک کو دیکھ کر اس کے سینے میں ایک خفیف سا ہیجان پیدا ہو گیا تھا، وہ حیران تھا کہ یہ تو وہی جنک ہے ——— وہی پہلی جنک ——— جس پر وہ ترس کھایا کرتا تھا، ایک غریب اور بےکس لڑکی سمجھ کر اس کے مکان پر جایا کرتا تھا، اور اس کے مقابلے میں اپنے آپ کو ایک بہت بڑا انسان تصور کرتا تھا ——— لیکن آج اسے دیکھ کر اس کا رنگ زرد کیوں ہو رہا تھا، گویا وہ خود کو ایک شہزادی کی موجودگی میں ہار رہا تھا، وہ سنبھلنا چاہتا تھا۔

"جنک! یہ نہ خیال کرنا کہ میں تمہارے لئے مرا جاتا ہوں لیکن تم نے میری کار میں جانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس لئے مجھے سخت صدمہ ہوا بلکہ میری توہین ہوئی تمہیں معافی تو مانگ لینی چاہئے تھی"

"میں معافی کی خواستگار ہوں"

"لیکن میرا مطلب یہ تھا کہ میں آپ ——— سے کچھ کہوں یہی مطلب تھا آپ کا؟"

"میں کوئی ایسی بات تو کہنا نہیں چاہتا جس سے تمہیں رنج ہو لیکن ایک نہایت ضروری پیغام تمہیں دینے آیا تھا"

"کس کا پیغام؟"

"پیغام تو میرا اپنا ہی ہے، تمہیں زیادہ فکرمند نہیں ہونا چاہئے، میں چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ کلب چلا کرو"

"منوہر! کلب جانے کا وقت اب گزر گیا ہے، میں کسی جگہ بھی تمہارے ساتھ جانے کو تیار نہیں ہوں، میں ایک ایسے شخص کا انتخاب کرنا چاہتی ہوں جس سے مجھے محبت ہو اور میں آیندہ صرف اسی کی معیت میں رہوں گی، میں خوب جانتی ہوں کہ تم مجھ سے محبت نہیں کر سکتے اور تمہیں یہ بھی معلوم ہو جانا چاہئے کہ میں بھی تم سے محبت نہیں کر سکتی

میرے سینے میں وہ دل نہیں ہے جو تم سے محبت کرسکے۔"

"لیکن میں تو یہ چاہتا ہوں کہ تم ہر وقت میرے ساتھ رہو۔"

"یہ اور بات ہے!"

"لیکن میں تو ــــــ"

"تمہارا خیال ٹھیک ہوگا لیکن میں تم سے محبت نہیں کرسکتی، ایک ٹہنی پر ایک رنگ کے دو پھول اکٹھے کھِل کر بھی الگ الگ ہی رہتے ہیں!"

اس کے بعد منوہر خاموش ہوگیا۔

وقت کو گذرنا تھا، وہ تو بیتا لیکن منوہر کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دنیا چلتی ہوئی تھم گئی ہے، اسے یقین نہیں آسکتا تھا کہ جنک بھی اس کی محبت کو ٹھکرا سکتی ہے، جسے وہ حقیر عورت تصور کرتا تھا۔

وہ یکایک پُرتمکنت اور باسطوت شہزادی بن کر نمودار ہوئی تھی، اس نے اپنی خود پسندی اور خودنمائی کو شکست دے کر جنک کے سامنے اپنی درخواست پیش کی تھی جو اس نے ایک پرمعنی انداز سے ٹھکرا دی، اس کی حسیات کا خون ہوگیا؛ انتہائی صدمے کے باوجود اس میں قوت برداشت پیدا ہوچکی تھی۔ اس نے غم و غصہ کے ہلاکت خیز زہر کو ایک شیریں گھونٹ سمجھ کر پی لیا اور بظاہر اس کے محسوسات سے یہی معلوم ہوتا تھا گویا کوئی واقعہ ہوا ہی نہیں لیکن حقیقت میں وہ زندگی کی اس منزل پر پہنچ چکا تھا جہاں سے بازیافت مشکل تھی، وہ خوب سمجھ چکا تھا کہ وہ جنک سے محبت کرنے لگا ہے لیکن اس کے باوجود اسے بھول جانا چاہتا تھا،

وہ کلب میں کثرت سے جانے لگا، لڑکیوں سے اس نے مراسم بہت بڑھا لئے، ہر شام وہ کسی نہ کسی لڑکی کو ساتھ لے کر سینما جاتا اور خود بھی شراب پیتا اور لڑکی کو بھی پینے پر مجبور کر دیتا، چاروں طرف اس کی عیاشی کے تذکرے ہونے لگے اور وہ کلب کا ہیرو تصور کیا جانے لگا اور سوسائٹی اس کے اعزاز میں دعوتیں دینے لگی،

جنک سب کچھ سن رہی تھی لیکن وہ خاموش تھی کیونکہ اسے خاموش ہی رہنا تھا۔

جنک کے چچازاد بھائی گورچرن کی امرتسر میں شادی تھی، کئی دنوں سے وہ والدین کے ہمراہ جانے کو تیار ہو رہی تھی لیکن اتفاق کی بات دیکھو کہ روانگی سے ایک دن پیشتر وہ بخار میں مبتلا ہوگئی، بخار کی حالت میں وہ سوچ رہی تھی کہ اسے بخار نہ ہونا چاہئے تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا پتا اپنی کار امرتسر لے جائے گا اور سمجھانے کے باوجود اس کی سمجھ میں یہ بات نہ آئے گی کہ اپنی کار میں پٹرول کا خرچ بہت زیادہ ہوتا ہے اور سب سے بڑا خطرہ جو جنک محسوس کر رہی تھی، وہ یہ تھا کہ سیٹھ صاحب ضرور شراب کے نشے میں چور ہوکر موٹر چلائیں گے اور راستے میں کوئی نہ کوئی حادثہ ضرور پیش آئے گا، اپنی پیاری ماں کی تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے تھی، اس نے بخار کی حالت میں بہت کوشش کی کہ یہ سفر ملتوی ہو جائے لیکن سیٹھ سردے شنکر راضی نہ ہوا، شام کے وقت یہ فیصلہ ہوگیا کہ جنک گھر پہ رہے گی اور اس کے والدین صبح سویرے اپنی کار میں امرتسر جائیں گے اور شام تک لوٹ بھی آئیں گے،

جنک رات بھر نہ سو سکی، وہ کروٹیں بدلتی رہی اور سوچتی رہی کہ یہ سفر نہایت خطرناک ہوگا، پتا جی ضرور اندھا دھند گاڑی چلائیں گے اور اس کے بعد معلوم نہیں کیا حشر ہو، رات کے پچھلے پہر اس کی آنکھ لگی تو کیا دیکھتی ہے کہ اس کی ماں موٹر کی ٹکر کی وجہ سے ہسپتال میں مردہ پڑی ہے اور اس کا باپ اگرمرا نہیں لیکن بُری طرح زخمی ہوا ہے، وہ چلا کر اُٹھی اور خدا کا شکر بجا لائی کہ یہ خواب تھا لیکن وہ انہیں آج امرتسر نہ جانے دے گی۔

"کم از کم پتا جی اپنے کار میں تو نہ جائیں گے۔" یہ خیال کرکے وہ دبے پاؤں گراج میں گئی اور ایک تیز دھار والے چاقو سے موٹر کے اگلے دونوں پہیئے پنکچر کر دئیے اور خود آرام سے آکر لیٹ گئی،

وہ مطمئن ہوکر سو گئی اور دیر تک سوتی رہی،

صبح نو بجے اٹھی تو نوکر سے معلوم ہوا کہ سیٹھ صاحب دیر تک موٹر سے سر کھپاتے رہے لیکن دیر ہوتی جا رہی تھی اس لئے مجبوراً لاری پر سوار ہوکر چلے گئے ہیں اور یہ کہہ گئے ہیں کہ شام تک یقینی طور پر وہ واپس آجائیں گے، جنک خوش تھی کہ وہ اپنے ارادے میں کامیاب ہوگئی،

شام کے قریب جنک کا بخار بھی ذرا ہلکا ہوگیا، اس لئے وہ بستر سے اٹھی، بکھری ہوئی چیزوں کو قرینے سے لگایا اور رسوئیے کو کھانے پکانے کی ہدایت کی،

سورج غروب ہوتے ہی وہ اپنے والدین کا انتظار کرنے لگی چاروں طرف اندھیرا چھا گیا لیکن وہ برآمدے میں آرام کرسی پر لیٹی ہوئی اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی، گرجا کے گھڑیال نے نو

بجائے وہ اس خیال سے، اٹھی اور اٹھ کر بستر پہ جا لیٹی کہ چلنے روک لیا ہوگا اور خصوصاً ایسے موقعوں پر تو مجبوراً بھی رک جانا پڑتا ہے۔

اس نے سونے کی کوشش کی لیکن نیند نہ آئی۔ اس نے کروٹ بدلی لیکن پھر بھی آنکھوں سے نیند غائب تھی، وہ سوچنے لگی، ایک وہم سا اس کے دل میں اٹھا لیکن جلد ہی اس نے اپنے آپ کو تسکین دی "میں بھی نری پگلی ہوں، کیسے کیسے وسوسے دل میں آرہے ہیں۔"

یہ کہہ کر اس نے پھر سونے کی جدوجہد کی لیکن اس کا اضطراب بڑھتا جارہا تھا۔ اسی کشمکش میں رات کا پچھلا پہر ہوگیا۔

تکان سے چور حسین آنکھیں کچھ دیر کے لئے جھکیں اور وہی گزشتہ بھیانک خواب دیکھنے کے لئے بند ہوگئیں —— بالکل وہی خواب!

جنک گھبرا کر اٹھی، خواب کا اثر اتنا تھا کہ وہ دیوانہ وار ادھر ادھر بھاگ رہی تھی، اس نے کمال تیزی سے ساڑھی درست کی رات کے پچھلے پہر کے اندھیرے میں منوہر کی کوٹھی کی طرف بھاگی ہوئی گئی، جب اس نے پھاٹک سے اندر کی طرف چھلانگ لگائی تو تین چار کتے اس کی طرف لپکے، وہ ہر ایک کتے کا نام لے کر پکار رہی تھی لیکن اس کے باوجود کتے اسے نہ پہچان سکے، کتوں کی کرخت آوازوں میں سے ایک نازک اور نرم آواز کوٹھی کی فضا میں گونج رہی تھی،

"منوہر! منوہر!"

منوہر میٹھی نیند سو رہا تھا، وہ خواب دیکھ رہا تھا کہ وہ بھیانک تاریکیوں میں راستہ گم کر بیٹھا ہے، سامنے سے باد و باراں کا ایک ہولناک طوفان اٹھا آرہا ہے وہ تکان سے چور ہو چکا ہے لیکن اسے راستہ نہیں ملتا، یکایک سامنے پہاڑی پر ایک روشنی نمودار ہوتی ہے، وہ روشنی جنک کے ہاتھ میں ہے، جنک زور زور سے آوازیں دے رہی ہے،

"منوہر! منوہر!"

منوہر کی آنکھیں کھلیں تو باہر "منوہر! منوہر!" کی صدا ابھی تک بلند ہو رہی تھی وہ بھاگا ہوا باہر گیا دور سے ہی کتوں کو آواز دی اور بھاگتا ہوا جنک کے پاس آیا۔

"جنک؟ اس وقت؟"

"ہاں! منوہر! میں اس وقت مدد کے لئے تمہارے پاس آئی ہوں ماتا اور پتاجی دونوں آج صبح سے امرت سر گئے ہیں، آج شام تک انہیں ضرور آجانا تھا لیکن وہ ابھی تک نہیں آئے۔ مجھے وہم آرہا ہے، کیا اس وقت تم میرے ساتھ امرت سر نہ چلوگے؟" "جنک! تمہارا وہم فضول ہے، صبح ہوتے وہ آہی جائیں گے کسی خاص وجہ سے وہاں رک گئے ہوں گے۔" "اس کا مطلب ہے کہ تم میرے ساتھ نہیں جاؤ گے!" "جنک! میں تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں، تم یہیں ٹھہرو میں پتلون پہن لوں، ٹھہرو! میں پہلے گراج میں سے کار نکال لوں۔"

یہ کہہ کر وہ بھاگا ہوا گیا اور گراج میں سے کار باہر نکال لایا۔

جنک نہایت پھرتی سے اس میں بیٹھ گئی، اسے وہ دن بھول گیا تھا وہ گھڑیاں اس کے دماغ سے بالکل محو ہو چکی تھیں جب منوہر نے درخواست کی تھی کہ وہ ہر صبح اس کی کار پہ کالج جایا کرے اور اس نے صاف انکار کر دیا تھا

کار فراٹے بھرتی ہوئی سڑک پہ جا رہی تھی، منوہر نے اپنے دائیں پہلو سے وسکی کی بوتل نکالی اور ایک ہی کش میں تین چار گھونٹ پی گیا، جنک کو شراب سے سخت نفرت تھی، منوہر بھی اس بات کو جانتا تھا لیکن جنک کی دنیا ہی بدلی ہوئی تھی، اس نے غور سے منوہر کی طرف دیکھا۔ پھر سامنے دیکھنے لگی اور دل ہی دل میں یہ کہہ رہی تھی۔

"منوہر! آج جس قدر شراب تم پی سکتے ہو پیو، کیونکہ تم اس کے نشے میں نہایت تیز رفتار سے کار چلاؤ گے اور میں وہاں اڑ کر پہنچنا چاہتی ہوں"

امرت سر سے پانچ چھ میل ادھر انہیں سڑک پر ایک اوندھی پڑی ہوئی لاری دکھائی دی، منوہر پتہ چلانے کے لئے اترا، جنک کے دل کی دھڑکن دور تک سنائی دے رہی تھی،

"جنک! ہمیں سیدھا امرت سر کے ہسپتال میں چلنا چاہئے لیکن پتاجی اس میں کہاں آئے ہوں گے!"

"حادثہ کب ہوا؟"

"کل شام، لاری درخت سے ٹکرا گئی، بہت سے آدمی زخمی ہوئے ہیں۔"

"منوہر! میرا دل دھڑک رہا ہے، جلدی ہسپتال چلو، آہ! میرا خواب ——"

"جنک! گھبراؤ نہیں، تم تو بہت وہمی ہو گئی ہو۔"

"منوہر! میں نے کبھی وہم نہیں کیا۔"

وہ دونوں ہسپتال پہنچے، جنک پاگلوں کی طرح ایک چارپائی سے دوسری چارپائی پر لپک رہی تھی۔

ایک "نرس" نے جنک کو گرنے سے تھام لیا جنک کی ماں آخری سانس لے رہی تھی، جنک دیوانہ وار اس سے لپٹ گئی لیکن اب تو اس کی ماں اسے پہچان بھی نہ سکتی تھی،

سیٹھ ہر دے شنکر کے زخم معمولی تھے۔ بیٹی کو روتا دیکھ کر اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

جنک کی حسین آنکھوں میں سے دو ندیاں بہہ رہی تھیں، منوہر اسے تھامے باہر لا رہا تھا،

"منوہر! میرے سینے میں صرف ایک دل تھا جو اس ہستی کی محبت سے بھرپور تھا جو آج دنیا میں نہیں، اس کے چلے جانے سے میرے لئے ساری دنیا تاریک ہو چکی ہے، میری روح میری رگ و پے سے نکل چکی ہے، محبت سے بھرا ہوا جام مسرت آج الٹ کر خالی ہو گیا ہے، اس کے بعد میں صرف ——— میں اپنی شکست تسلیم کرتی ہوں، میں جانتی ہوں کہ تم مجھ سے محبت نہیں کر سکو گے لیکن دنیا میں میں کسی اور مرد کو جاننا نہیں چاہتی"!

یہ کہہ کر اس نے اپنا سر منوہر کے کاندھوں پر جھکا دیا،

موٹر سڑک پر آہستہ آہستہ جا رہا تھا، اچانک اس میں سے ایک چیز باہر گر کر چکنا چور ہو گئی۔

یہ شراب کی بوتل تھی ——— !

خلیل

اشعار

ان کا دامن مری آنکھیں یہ خدا کی قدرت
اب تو قسمت کا ستارہ ہے مرا ہر آنسو

میں یہ سمجھوں گا ہوئی قدر مرے رونے کی
اپنے دامن سے ذرا پونچھ دو ہنسکر آنسو

شرف

آتش پارے

بھری تھی ساقی نے کیا شیشۂ شراب میں آگ
لگا دی جس نے مرے خاطرِ خراب میں آگ

وہ شعلہ رو نظر آیا ہمیں عتاب میں آگ
اب اس کے آگے نہیں ہے کسی حساب میں آگ

پڑا جو اُن کے رُخِ آتشیں کا آب میں عکس
تو بولی دیکھ کے دنیا لگی ہے آب میں آگ

ملا جو عارضِ گلگوں پہ اُس نے غازۂ سُرخ
پکار اٹھا یہ زمانہ لگی گلاب میں آگ

نہیں نقاب میں وہ روئے آتشیں انور
بساطِ چہرہ رخ پہ ہے دامنِ سحاب میں آگ

سیّد ولایت حسین
ایم اے ایل اے

غزل

نگاہِ لُطف مجھ پر کب نہیں ہے؟ جو پہلے تھی مگر وہ اب نہیں ہے

مری قسمت اُن آنکھوں پر ہے موقوف رہینِ گردشِ کوکب نہیں ہے

مری تقدیر ہی کو تو بدل دے انہیں احساسِ غمِ یارب نہیں ہے

محبت داستانِ جذبِ دل ہے حدیثِ چشم و گوش و لب نہیں ہے

محبت ایک مجبوری ہے ورنہ مجھے تم سے کوئی مطلب نہیں ہے

اُمیدِ صبح سے بہلا نہ دل کو! سحر جس کی ہو، یہ وہ شب نہیں ہے

زباں پر آئے کیا حرفِ تمنّا
کوئی محرم ہی اس کا جب نہیں ہے

حفیظ ہوشیارپوری

غزل

ذرہ ذرہ معدنِ تنویر ہے میرے لئے
ہر تجلی حسن عالمگیر ہے میرے لئے

کاش مجھ کو پھونک دے اُس کی نگاہِ برق پاش
خاک ہو جانا مرا اکسیر ہے میرے لئے

گر نہیں اس میں محبت کی کرشمہ سازیاں
یہ طلسمِ دہر بے تاثیر ہے میرے لئے

آج حاصل ہوں گی ساری زندگی کی لذتیں
آج میرا ہر نفس شمشیر ہے میرے لئے

دل بنائے ہر الم ہستی سراسر قیدِ غم
زندگی اک آہنی زنجیر ہے میرے لئے

سُن رہا ہوں ہر بُنِ مو سے صدائے دردِ دل
زیست کیا ہے عشق کی تفسیر ہے میرے لئے

یہ مری شانِ تحمل مر رہا ہوں ضبط پر
آہ کرنا باعثِ تحقیر ہے میرے لئے

میں فریبِ دامِ ہستی سے نکل جاؤں تو کیا
یہ نظامِ دو جہاں تقدیر ہے میرے لئے

مجھ کو حرماںؔ عشق میں مٹنا مبارک ہو گیا
سُن رہا ہوں اِک جہاں دلگیر ہے میرے لئے

حرماںؔ خیرآبادی

برائے فروخت

طلوعِ آفتاب سے پہلے، خاموش سمندر کے کنارے کنارے، شبنم آلود کھیتوں میں پیادہ پا چلنا کس درجہ سُرور خیز ہوتا ہے۔ یہ وقت نورِ سحر کی ہر لہر اور نسیمِ صبح کی ہر موجِ عنبریں نے سرانند مشامِ جاں میں سرایت کر جاتی ہے۔

نہ جانے ہمارے حافظے میں اُسے لطف اندوز لمحے کیوں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پیوست ہو جاتے ہیں، جو ہم کبھی وادی میں اور کبھی دریا کے کنارے، قدرتی مناظر کا مشاہدہ کرتے ہوئے گزار دیتے ہیں۔

ایسے لمحوں میں سے ایک لمحہ میرے ذہن میں اچھی طرح محفوظ ہے جب ایک روز میں آہستہ آہستہ سمندر کے کنارے کنارے سیر کر رہا تھا۔ یہ مقام کوم پرل کے قریب واقع ہے اور برٹنی کا دلکش ترین حصہ ہے۔ بہار کا آغاز تھا، اور صبح کا سہانا وقت ایسا وقت جبکہ ہر شخص اپنے آپ کو بیس سال کا نوجوان محسوس کرنے لگتا ہے اور مردہ امیدیں اور جوانی کے بھولے بسرے خواب از سرِ نو شگفتہ ہو جاتے ہیں۔

میں کھیتوں اور سمندر کے درمیان سے گزرتی ہوئی ایک تنگ سڑک پر چل رہا تھا۔ غلّے کے پودے ساکت و جامد کھڑے تھے۔ سمندر میں لہریں آہستہ آہستہ اٹھ رہی تھیں۔ ہوا پکے ہوئے کھیتوں کی سوندھی سوندھی خوشبو سے بسی تھی۔ میں برٹنی کے ساحل کے ساتھ ساتھ سیدھا جا رہا تھا۔ اس وقت میرے ذہن میں کوئی خیال جاگزیں نہ تھا۔ میرا دل انتہائی اطمینان کی حالت میں تھا اور میرے قدم اس طرح ہلکے پھلکے معلوم ہوتے تھے، جیسے کسی نے ابھی ابھی سفر شروع کیا ہو!

اس وقت جسمانی اور روحانی طور پر، مجھ پر ایسی مسرت مسلط تھی جو جانوروں کو اچھلنے کودنے، اور پرندوں کو آسمان کی نیلی چھت کے نیچے چہچہانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ میں دور فاصلے پر دلکش آوازیں سُن رہا تھا۔ اتوار کا دن تھا اور یہ آوازیں شاید کسی ضیافت کی جگہ سے بلند ہو رہی تھیں میں نے ایک طرف کو مڑ کر ذرا غور سے دیکھا کہ پانچ شکاری کشتیاں نمودار ہوئیں جن پر مرد، عورتیں اور بچے بیٹھے تھے۔

ہوا خاموشی سے بادامی رنگ کے بادبانوں میں داخل ہو رہی تھی۔ اور کشتیاں آہستہ آہستہ ساحل کے ساتھ ساتھ جا رہی تھیں کشتی نشین سب کے سب گا رہے تھے۔ مرد مستول کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑے تھے۔ ان کے سروں پر بڑی بڑی انگریزی ٹوپیاں تھیں اور وہ نہایت استقلال اور خوبی سے گیت گا رہے تھے۔ عورتوں اور بچوں کی ہم آہنگ آوازوں نے ایک قیامت برپا کر رکھی تھی۔

یہ پانچوں کشتیاں آگے پیچھے چلی جا رہی تھیں اور ان میں سے ایک سی قسم کی آوازیں بلند ہو کر آسمان تک پہنچ رہی تھیں۔

میرے قریب ہی سے گذر کر یہ کشتیاں دور چلی گئیں اور ان کی آوازیں آہستہ آہستہ فضا میں گم ہوتی گئیں۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے جوانی کے امید افزا خواب دیکھ رہا ہوں۔ آہ جوانی، جو زندگی بھر میں خوابوں کا ایک خوشگوار ترین زمانہ ہے، کتنی سرعت سے گذر جاتی ہے۔ آہ سنہری خوابوں سے بسی ہوئی زندگی کتنی خوشگوار معلوم ہوتی ہے۔

مجھے اس وقت محسوس ہو رہا تھا جیسے میں خوابوں کی بستی میں ایسے شیریں خواب دیکھ رہا ہوں جن سے آدمی کبھی سیر نہ ہو—— دولت، عزت راحت کے الم ربا خواب!

میں لمبے لمبے قدم اٹھاتا جا رہا تھا میرے ہاتھ مجتوا کے نرم نرم ریشوں کو چھو رہے تھے اور میری انگلیوں کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی حسینہ کے شگفتہ بالوں سے مس کر رہی ہوں۔

تھوڑی دیر میں میں ایک ایسے سبزہ زار میں پہنچ گیا جو راس کی شکل میں دور تک سمندر میں چلا گیا تھا۔ وہاں ساحل کے قریب ایک سفید رنگ مکان میری نظر پڑا جو ساحل سے تین سیڑھیوں کی بلندی پر بنا ہوا تھا۔

نہ جانے اس مکان کو دیکھ کر میرے دل میں مسرت کا ایک بحرِ بے پایاں کیوں موجیں لینے لگا۔ مجھے معلوم نہیں، مگر بعض اوقات سیر کرتے کرتے

ہم ایسی سرزمین میں پہنچ جاتے ہیں، جس سے ہماری آنکھیں دیر سے آشنا معلوم ہوتی ہیں اور جسے دیکھتے ہی ہمارے دلوں میں محبت کا ایک بے پناہ جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس زمین کی ہر چیز ——— افق، درخت، اور زمین کا رنگ، ہمارے اندر مسرت کے ایک عمیق جذبے کو بیدار کر دیتا ہے۔

یہ دلکش مکان ذرا اونچی جگہ پر بنایا گیا تھا۔ اونچے اونچے ثمردار درخت ایسے فراخ چبوتروں پر اُگے تھے، جو بڑی بڑی کشادہ سیڑھیوں کی شکل میں بتدریج پانی تک پہنچ گئے تھے۔ ہر چبوترے کے ایک کنارے پر بڑے بڑے شگفتہ پھول اُگ رہے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے بہت سے سنہری تاج پودوں کے سروں پر پہنا دیئے ہوں۔

اس رہائشی مکان کو دیکھ کر میں حیرانی کے عالم میں وہیں کا وہیں کھڑا رہ گیا۔ میری انتہائی تمنا تھی کہ میں اسی جگہ اپنی زندگی تمام کر ڈالوں۔

میں دروازے کے قریب پہنچا۔ میرا دل فرطِ تمنا سے اس وقت بے تاب ہو رہا تھا۔ دروازے کے ایک ستون پر "برائے فروخت" لکھا تھا۔

یہ الفاظ دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہونے لگا، گویا یہ مکان مجھے پیش کیا جا رہا ہے۔

"برائے فروخت!" تو یہ مکان اب کسی خاص شخص کا نہیں۔ ہر اس شخص کے قبضے میں آسکتا ہے جو اسے خرید لے۔ خواہ زید ہو۔ خواہ بکر۔ خواہ میں۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ میں ایسا شاندار مکان نہیں خرید سکتا۔ پھر بھی، نہ جانے، کیوں میرا دل کسی پراسرار مسرت سے اچھل رہا تھا۔

میں مکان کے باغیچے میں داخل ہوا۔ آہا کتنا فرحت افزا باغ تھا . . . اس کے بلند سے بلند تر چبوترے، اس کے خوشنما درخت، اس کے سنہری پودوں کے جُھنڈ اور ہر چبوترے کے سرے پر انجیر کے دو درخت، یہ سب چیزیں اس کی خوبصورتی کو دوبالا کر رہی تھیں۔

وہاں کھڑے ہو کر میں نے گردوپیش کے مناظر پر نگاہ دوڑائی۔ اس چھوٹی سی خلیج کے ریتلے ساحل کا پانی میرے پاؤں کو چھو رہا تھا۔ کھلے سمندر اور ساحل کے درمیان تین عظیم الہیئت چٹانیں پڑی تھیں جو طوفان کے دنوں میں شاید بند کا کام دیتی ہوں گی۔

میں نے کچھ اس انداز سے دروازہ کھٹکھٹایا جیسے میں اپنے مکان پہ دستک دے رہا ہوں۔ چھوٹے سے قد کی ایک بوڑھی خادمہ، جس نے سیاہ گون اور سفید ٹوپی پہن رکھی تھی، اور جو ایک پرانی "کنواری" معلوم ہوتی تھی، دروازے پر نمودار ہوئی۔ اسے دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں اس سے آشنا ہوں۔ میں نے اس سے کہا۔

"کیا تم برٹنی کی رہنے والی ہو؟"

اُس نے جواب دیا۔ "نہیں میں لورین سے یہاں آئی ہوں۔"

پھر اس نے مجھ سے پوچھا۔ "تم اس مکان کو دیکھنے آئے ہو گے؟"

میں نے کہا۔ "ہاں، ہاں، یقیناً۔" اور میں اندر داخل ہو گیا۔

تمام فرنیچر، حتیٰ کہ دیواروں سے بھی میں آشنا معلوم ہوتا تھا اور ہال میں اپنی چھڑی کو نہ پاکر حیران ہو رہا تھا۔

میں نے ڈرائنگ روم کا راستہ لیا۔ یہ ایک دلکش کرہ تھا۔ اس کی تین بڑی بڑی کھڑکیوں سے سمندر کا وسیع منظر دکھائی دیتا تھا۔ کائی سے بنا ہوا فرش اس پر بچھا تھا۔ انگیٹھی پر چین کے خوشنما ظروف اور کسی عورت کی ایک بڑی سی تصویر رکھی تھی۔ میں جھٹ تصویر کے قریب پہنچا۔ مجھے یقین تھا کہ میں اس سے کبھی آشنا تھا۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ گو میرا خیال تھا کہ اس سے دوچار ہونے کا مجھے کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا گویا میں اسی ایک عورت کے لئے اتنے عرصے سے ہمہ تن انتظار تھا اور یہی دل ربا چہرہ میرے خوابوں کو شیریں بنا رہا تھا۔ یقیناً یہی وہ حسینہ تھی جس کی تمنا میں بنی نوع انسان کا ایک ایک فرد مضطرب و بے چین نظر آتا ہے۔ یہی وہ عورت تھی جس کی تلاش میں ہر شخص گلی کوچوں اور شہروں کی خاک چھانتا پھرتا ہے۔ آہ اسی محبوبہ کے لئے میں ہوٹلوں، گاڑی کے ڈبوں اور دور دراز مقامات کو اپنا مسکن بناتا رہا۔ یہ وہی حسینہ تھی۔ یقیناً یہ وہی حسینہ تھی۔

میں نے اسے ان آنکھوں سے، جو میری طرف دیکھ رہی تھیں، ان بالوں سے جو انگریزی فیشن میں مزین تھے اور سب سے زیادہ اس کے چہرے، اور اس کے دلربا تبسم سے، جو دیر سے میرے تخیّل میں جاگزیں تھا، پہچان لیا۔ میں نے معاً پوچھا۔

"یہ عورت کون ہے؟"

بوڑھی خادمہ بولی۔ "یہ مادام ہے۔"

میں نے کہا۔ "تمہاری مالکہ؟"

اس نے متانت آمیز لہجے میں جواب دیا۔ "نہیں، نہیں۔"

میں بیٹھ گیا اور استقلال سے پوچھا۔ "اس کے متعلق کچھ بتاؤ تو۔"

وہ حیرانی کے عالم میں ساکت و صامت کھڑی تھی۔ میں نے اصرار سے پوچھا

"تو پھر کیا یہ اس مکان کی مالکہ ہے۔؟"

"نہیں جناب!"

"تو پھر یہ مکان کس شخص کا ہے؟"

"میرے آقا موسیو تونیلی کا"

میں نے تصویر کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"اور یہ حسینہ کون ہے؟"

"یہ مادام ہے"

"تمہارے آقا کی بیوی؟"

"نہیں نہیں جناب"

"اس کی محبوبہ؟"

خادمہ یہ سن کر خاموش ہو گئی۔ میرا دل موسیو تونیلی کی رقابت سے جل رہا تھا۔ کیونکہ وہ مجھ سے پہلے ایسی عورت سے آشنا ہو چکا تھا۔ میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔ "اب یہ دونوں کہاں ہیں؟"

خادمہ زیر لب بولی "موسیو تو پیرس میں ہے۔ مگر مادام کے متعلق مجھے کچھ علم نہیں"

میں حیران سا ہو کر رہ گیا اور پوچھنے لگا "تو اب یہ دونوں اکٹھے نہیں رہتے"۔

خادمہ بولی "نہیں"

میں نے ہمہ تن گوش ہو کر نہایت متانت سے پوچھا "مجھے تمام ماجرا سناؤ، شاید میں تمہارے آقا کی کوئی خدمت بجا لاسکوں میں اس عورت کو جانتا ہوں"

خادمہ نے میری طرف دیکھا اور میرے اخلاص آمیز انداز گفتگو پر اعتبار کرتے ہوئے بولی:۔

"دیکھئے۔ اس عورت نے میرے آقا کے ساتھ بہت برا سلوک کیا ہے۔ وہ پہلی مرتبہ اس سے اٹلی میں شناسا ہوا اور اسے یہاں اپنے ساتھ لے آیا۔ یہ بڑی دلکش آواز سے گاتی تھی۔ وہ اس پر اس درجہ فریفتہ تھا کہ اس کے عشق نے اسے دیوانہ ہی بنا دیا تھا۔ یہ دونوں پچھلے سال اس علاقے میں سیر کرنے آئے تھے کہ یہ مکان ان کی نظر پڑا۔ مادام نے اسی وقت اسے خریدنے کی خواہش ظاہر کی۔ میرے آقا نے اسے خوش کرنے کی خاطر مکان خرید لیا۔ انہوں نے گذشتہ پچھلی گرمیاں اور سردیاں یہیں بسر کیں۔ پھر ایک صبح ناشتے کے وقت آقا نے مجھے بلا بھیجا اور پوچھنے لگا کیا مادام آ گئی ہے؟

میں نے جواب دیا "نہیں آقا" اور ہم سارا دن اس کا انتظار کرتے رہے آقا دیوانہ ہو رہا تھا۔ ہم نے ہر جگہ اس کی تلاش کی۔ مگر وہ ہمیں کہیں نہ ملی۔ نہ معلوم وہ کیوں چلی گئی اور کہاں چلی گئی"۔

خادمہ سے یہ قصہ سن کر میرے دل میں مسرت کی ایک برقی لہر دوڑ گئی۔ میں چاہتا تھا کہ اس خوشی میں خادمہ کو اپنے بازوؤں میں لے لوں اور ڈرائنگ روم میں رقص کرنے لگوں۔

آہ میری حسینہ نے، میرے رقیب کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا تھا وہ اس کی محبت سے سیر ہو گئی تھی۔ وہ اس سے متنفر ہو گئی تھی اور میں اس بات سے اپنی خوشی کا اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔

بوڑھی خادمہ بولی "موسیو فرط غم سے مرا ہی چلا تھا۔ اب وہ پیرس واپس چلا گیا ہے اور مجھے اور میرے شوہر کو مکان بیچنے کے لئے یہاں چھوڑ گیا ہے وہ اسے بیس ہزار فرانک پر فروخت کرنا چاہتا ہے"

میری توجہ اب خادمہ کی باتوں پر نہ تھی۔ میں حسینہ کے شیریں تصور میں محو تھا۔ یکایک مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں اس سے ضرور کہیں ملاقات کر سکتا ہوں۔ میرا خیال تھا کہ اب بہار کا موسم ہے اور وہ ضرور اس مکان ـــ اس دلکش مکان کو، جسے وہ اتنی شدت سے چاہتی تھی، دوبارہ دیکھنے آئے گی۔

میں نے دس فرانک خادمہ کے ہاتھ میں دیئے اور حسینہ کی تصویر کو انگیٹھی پر سے اٹھا کر وہاں سے بھاگ نکلا اور پہلی سڑک پر ہو لیا۔ راستے میں میں تصویر کی طرف دیکھتا جاتا تھا۔ یہ بات کتنی امید افزا تھی کہ وہ موسیو تونیلی کے دام الفت سے اپنے آپ کو چھڑا کر چلی گئی ہے۔ میرا خیال تھا کہ آج یا کل، اس ہفتے یا آیندہ ہفتے اس سے ضرور میری ملاقات ہو جائے گی۔ نہ معلوم اب وہ دنیا کے کس خطے میں ہو گی۔ میں اس کی صورت سے آشنا ہو چکا تھا اور اب صرف اس سے دو چار ہونے کی فکر میں تھا۔

میں نے تمام راستہ پودوں کے نرم و نازک ریشوں سے اپنی انگلیوں کو مس کرتے اور سمندری ہوا سے اپنے پھیپھڑوں کو بھرتے ہوئے طے کیا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ سورج کی خوشگوار شعاعیں میرے چہرے پر بوسے دے رہی ہیں۔ میں فرط مسرت سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میں جلد ہی اس سے ہمکنار ہو جاؤں گا اور پھر اسی خوشنما مکان میں اس کے ساتھ عیش و نشاط کی زندگی گذاروں گا۔

(موپاساں)

طاہر قریشی بی اے

نیرنگِ حیات

زندگی کا ہر گھڑی نقشہ بدلتا ہی رہا
اور انہی نیرنگیوں سے جی بہلتا ہی رہا

کارخانہ صانعِ عالم کا رکتا ہے کہیں؟
کارکن مرتے رہے اور کام چلتا ہی رہا

دل ہی شاید دینِ الفت میں رہے ثابت قدم
عقل کا مذہب تو ہر ساعت بدلتا ہی رہا

روندنا چاہا خرد نے جب کبھی جذبات کو
پاؤں ہر ہر گام پر اُس کا پھسلتا ہی رہا

نفس جس کی تربیت میں زندگی کا راز تھا
زاہدِ ناداں اُسی کا سر کچلتا ہی رہا

ذوقِ عصیاں بڑھ کے خود بنتا گیا جاں کا عذاب
ہم یہی سمجھے خدا کا حکم ٹلتا ہی رہا

میں نے ثابت کر دیا اپنے گناہوں کا صواب
اُن میں نیکی کا کوئی پہلو نکلتا ہی رہا

ہوش آنے پر بھی غفلت کی تلافی کچھ نہ کی
وقت کے کھو بیٹھنے پر ہاتھ ملتا ہی رہا

اے اسدؔ پایا خوشی کو اور نہ غم کو دیرپا
زندگی کا ہر گھڑی نقشہ بدلتا ہی رہا

اسدؔ ملتانی

اشتراکی شاعری

ہندوستان میں اشتراکیت کی ابتدا تقریباً ۱۹۲۰ء میں ہوئی۔ اس کے مقاصد اور اصول وہی قرار دیئے گئے جو لینن نے تیسری بین الاقوامی کے لئے مقرر کئے تھے یعنی وجود الٰہی کا کلی انکار، زمینداروں اور سرمایہ داروں کا قلع قمع، اور مزدوروں کی حکومت کا قیام۔ اشتراکیت پسندوں کا انتہائی مقصد یہ ہے کہ روایاتی زندگی کو بالکل بدل دیا جائے اور اس کی جگہ ایسی زندگی پیدا کی جائے جو آج تک زمین کے پردے پر نظر نہیں آئی۔ ان کا خیال ہے کہ اب تک زندگی کے جس قدر قوانین وضع کئے گئے ہیں وہ محض سرمایہ داروں کے لئے مفید تھے، غریبوں یا مزدوروں کو ان سے کسی ترقی یا آسائش کی امید نہیں۔ چنانچہ اشتراکیوں کے نقطۂ نظر سے فنون لطیفہ کا فروغ بھی اب تک اس جذبے کے ماتحت ہوا ہے۔ ان فنون میں انسانی آبادی کے بڑے حصے یعنی مزدوروں اور کسانوں کے جذبات کی ترجمانی نہیں کی گئی اس لئے انہوں نے ہر اس چیز کو ٹھکرا دیا جس میں ذرا بھی قدامت کا شائبہ تھا۔ شاعری میں بھی انہوں نے یہی روش اختیار کی۔ قدیم شاعری کو ٹھکرا کر جدید شاعری کی بنا ڈالی جس میں صرف مزدوروں کے جذبات کی ترجمانی کی جاتی ہے۔

اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ شاعری وہی چیز ہے جو شعرا دماغی کاوش سے شعر کہتے ہیں ان کے کلام میں کبھی وہ زور نہیں آسکتا جو ایک حقیقی شاعر کے یہاں ہوتا ہے لیکن اشتراکیت پسند اس نظریے کو صحیح نہیں سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے، کہ وہبی شاعر اور الہام محض ڈھکوسلے ہیں غیب سے مضامین کی آمد کا خیال بے سروپا ہے، ہر شخص شاعر بن سکتا ہے اور اگر اس کو تربیت دی جائے تو اس کے کلام میں وہی ندرت پیدا ہوسکتی ہے جو ایک فطین کے یہاں ہوتی ہے، دنیا کی شاعری میں اب تک یہی مانا جاتا ہے کہ شاعر میں ایک خاص باطنی دانش ہوتی ہے جس کے ذریعے سے وہ کائنات کے ان سربستہ رازوں کو دیکھ سکتا ہے جو عوام کی نظروں سے پوشیدہ رہتے ہیں لیکن اشتراکیت اس کی قائل نہیں اس کے ماہرین علم الاعضا نے بہت سے کتوں اور دیگر جانوروں پر تجربے کئے اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ہر ذی روح کی قوت حاسہ میں اگر تحریک پیدا ہو تو اظہار جذبات ہوگا یعنی تحریک ہمیشہ خارجی ہوتی ہے، ان ماہرین نے مختلف اوقات میں بہت سے کتوں کے منہ میں ایسڈ ڈالا اور اس خارجی تحریک سے جو اثر روح پر پیدا ہوا اس سے قواعد بنا ڈالے اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچے کہ ہر روحانی فعل کسی نہ کسی حاسہ کا ممنون ہوتا ہے۔ اسی طرح فطانت، خداداد وصف الہام وغیرہ کو بھی اس روشنی میں دیکھا گیا۔

اب ذرا اشتراکیوں کے اس نظریے پر نظر ڈالیں۔ اشتراکیوں کے علاوہ ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ شاعر پیدا ہوتا ہے اس کی فطرت کی تشکیل میں چند ایسے عناصر شامل ہوتے ہیں جن سے متشاعر محروم ہوتا ہے مثلاً میر اور مصحفی کا کلام دیکھئے مصحفی کی استادی کو سب نے تسلیم کیا ہے کیونکہ ان کے یہاں الفاظ جن کا تعلق مشق اور علمیت سے ہے بہت موزوں ہیں کہیں الفاظ کی نشست قابل اعتراض نہیں لیکن خیالات جنہیں شاعری کی جان کہنا چاہئے اس اثر سے محروم ہیں جو ایک الہامی شعر میں ہوتا ہے امیر کی شاعری وہبی ہے، ان کے اشعار میں سوز و گداز، تڑپ، اور بلندی بدرجۂ اتم موجود ہے، یہاں الہام کی قدر آشکار ہوگئی اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اشتراکیوں کا ردِ الہام کس قدر مضحکہ خیز ہے۔

اشتراکی ماہرین دماغ کے نزدیک یہ عضوی شہادتیں شاعری کے مسئلے کو مکمل طور پر حل کر دیتی ہیں، ان کے خیال میں دماغی پیداوار غیر ارادی یا غیر معلوم نہیں ہوسکتی بلکہ یہ پیداوار ایک عضوی مشین کا ساعمل ہے جس کی درستی مرضی کے مطابق ہوسکتی ہے اشتراکی شعرا کا نظریہ یہ ہے کہ

شاعری ایک طرح کی رنگ آمیزی ہے جسے تھوڑی سی تربیت کے بعد ہر شخص سیکھ سکتا ہے۔ اسی لئے ان کے یہاں شاعری فطرت میں نہیں بلکہ الفاظ، تشبیہات اور استعارات میں مضمر ہے۔

مسٹر شاورج نے ایک رسالہ (Futurism Without Disguise) میں شاعری کو محض الفاظ کا مجموعہ قرار دیا، مالکووسکی اور اس کے شاگردوں کی بھی یہی رائے ہے کہ شاعری صرف الفاظ کو سلیقے سے ملا دینا ہے۔

زبان کا تاریخی ارتقا الفاظ کی معنوی حیثیت کو ان کی صوری حیثیت پر فوقیت دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زمانے میں مسلم الثبوت اساتذہ نئے الفاظ اور جدید تراکیب ڈھالتے ہیں، ان کا منشا یہ ہوتا ہے کہ جہاں تک ہو سکے صوری حیثیت کو معنوی حیثیت پر فوقیت دی جائے، اس لئے ماہرین علم اللسان کا فیصلہ ہے کہ نئے الفاظ کی پیدائش ہمیشہ جاری رہنی چاہیئے تاکہ زبان کے ظاہری و باطنی محاسن میں اضافہ ہو، اشتراکی شاعر یہ مانتا ہے کہ زبان کے تاریخی ارتقا میں الفاظ کی معنوی حیثیت کو فوقیت ہوتی ہے لیکن چونکہ وہ اپنی دنیا بالکل مختلف بنانا چاہتا ہے۔ اس نے اس قدیم نظریے سے بھی اختلاف کیا اور اس کی متضاد صورت یعنی صوری حیثیت کو ترجیح دی،

اشتراکی شعرا کا یہ نظریہ قطعی غلط نہیں لیکن (Shershenevich) نے اس کو مضحکہ خیز بنا دیا، اس کے خیال میں الفاظ کو معنی سے کوئی تعلق نہیں اور ساتھ ہی صرف و نحو کے قواعد کو دنیائے ادب سے یک قلم خارج کر دینا چاہیئے۔

شعرگوئی کے ان نظریوں کے علاوہ روس میں بات چیت کے الفاظ کو تعلیم یافتہ عوام کے الفاظ کی کیمیا سمجھا جاتا ہے، الفاظ کی کیمیا کے اس علم کو ترقی دینے کے لئے باقاعدہ ایسے کیمیا خانے بنائے گئے جہاں الفاظ کے قابل کیمیاگر، نئے الفاظ نئے بحور اور نئے اصول بناتے ہیں،

اسی طرح براسوف انسٹی ٹیوٹ (Brusov Institute) میں شعر کے تمام اجزا کی تحلیل و تشریح کر کے ان میں اضافہ یا کمی کی جاتی ہے، یہاں کے ماہرین کہتے ہیں کہ عنقریب شعرگوئی ہر شخص کو اس طرح سکھا دی جائے گی جس طرح پڑھنا یا باجا بجانا سکھایا جاتا ہے۔ اسکولوں میں دیگر مضامین کے ساتھ شعرگوئی بھی ایک مضمون ہوگا جو طالب علم چاہے اختیاری مضمون کی طرح اسے لے سکے گا اس طرح یہ غلط فہمی کہ شعرگوئی محض چند لوگوں کا حصہ ہوتی ہے جاتی رہے گی لیکن قدرت سے جنگ کرنے کا نتیجہ بھی ان لوگوں کو جلد معلوم ہو گیا، پانچ سو چودہ طلبا میں سے جنہوں نے شاعری اختیاری مضمون کی حیثیت سے لی تھی صرف ۳۶ شاعر طیلسانین (graduates) کامیاب ہو سکے۔ ان چھتیس کے متعلق بھی یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ ممکن ہے ان میں شعرگوئی کے جراثیم ہوں یا قطعی ناکامیابی کے دھبہ کو دور کرنے کے لئے چھتیس طلبا کو ڈگریاں دے دی گئی ہوں۔

اشتراکیوں کا عقیدہ ہے کہ الہام، باطنی دانش، اصول وغیرہ محض سرمایہ داروں کی ایجادیں ہیں، ان کو حقیقت سے کوئی تعلق نہیں یہ نظریہ کہ شعر اور ادب زندگی کو حسین بناتے ہیں قطعی غلط ہے بلکہ زمانہ وسطیٰ کے اوہام ہیں جبکہ سرمایہ داری کا ظلم انتہائی صورت اختیار کر گیا تھا۔ اشتراکیوں نے فن کا مقصد صرف یہ قرار دیا ہے کہ اشتراکی اصولوں کے مطابق زندگی کی تشکیل و تعمیر کی جائے۔ نئی قسم کی نظموں۔ ناولوں۔ ڈراموں کو جذبات، احساسات اور کردارنگاری سے کوئی تعلق نہیں بلکہ ان میں سے ہر چیز کو اشتراکیت کے نشر و اشاعت کا آلہ بنایا گیا ان کا نظریہ فن کے متعلق یہ ہے کہ فن زندگی کو پیش نہیں کرتا بلکہ نئی زندگی پیدا کرتا ہے، یہ سرمایہ داروں کے ہاتھ کا آئینہ نہیں بلکہ عوام کے ہاتھ کا ہتھوڑا ہے۔"

اشتراکیت نے نظم میں سب سے مقدم چیز انقلابی روح سمجھی۔ ہر نظم ایسی ہو جو سرمایہ داروں کے خلاف عوام میں بغاوت، نفرت اور غصہ پیدا کرے۔ اس قسم کی نظموں میں (Demian Bedny) کی نظمیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان کا جذب و جوش تعجب خیز ہے، الفاظ آگ کے شرارے ہیں جو پڑھنے والے میں بھی سرعت سے اشتعال پیدا کر دیتے ہیں، اس کی ایک نظم کا ترجمہ یہاں پیش کیا جاتا ہے سے

اٹھو، اٹھو، اے لوگو، دنیا کے مصائب کا بدلہ لینے والو۔
جاگو اٹھو، مار ڈالو، مار ڈالو،
ان سب کو مار ڈالو، بدکاروں کو،
ان سب کو جنہوں نے ہماری روٹیاں چرائی ہیں،
اے مزدورو، اب گود ابنا ڈالو۔
اپنے گھونسلوں سے اس کا جس کو خدا کہتے ہیں۔
تم دنیا کی قسمت کے مالک ہو۔

اے مزدورو! تم آزاد ہو، آزاد،
اے حکمرانو! اب تمہارا خاتمہ ہونے والا ہے
اٹھو، اے لوگو! فتح!
آگے بڑھو، فتح، بڑھو، بڑھو،
آگے بڑھو . . . اور گولی پر گولی۔

بیڈنائی (Bednyi) کی دوسری نظم جس کا عنوان "ڈی ہائی و۔ٹے ہے" روس میں بہت مقبول ہوئی۔ اس میں مزدوروں اور سرمایہ داروں کی جنگ کا منظر بہت ہی سخت الفاظ میں دکھایا گیا ہے حتیٰ کہ گالیاں تک آگئی ہیں، اس کے بعد مزدوروں کی فتح کے ترانے گائے ہیں۔ ملاحظہ ہو:-

کون ہے؟ کہو دیا ۔۔۔ اس دفعہ تم نے ڈنک مارا،
آؤ، جہنم کے منہ میں اپنے نخروں کے ساتھ اے آقاؤ،
تم برباد، ہم اب خوشامدی نہیں، اے آقاؤ،
ہمیشہ اپنی دم افسوس سے ہلاتے رہو، ہم تمہارے جبڑوں پر ضربیں لگائیں گے۔
اے آقاؤ،
برباد ہو جاؤ، برباد،
تم وہ ہو جن کی ہڈیاں چربی میں سڑ رہی ہیں،
نیچے گر جاؤ، خون پینے والے کتو! مکار اپنی زبان بند کرو۔
تم انسانی غلاظت ہو!
گڑھوں میں گر کر مر جاؤ،
برباد ہو جاؤ، برباد،
راہ کھلی ہوئی ہے،
اپنے تمام عملہ کے ساتھ فنا ہو جاؤ۔
ایک، دو
ایک، دو
بڑھو، بڑھو!
سرمایہ داروں کی حکومت ایک غلاظت کا ڈھیر ہے
مزدوروں نے حکومت لے لی ہے۔
مداخلت مت کرو۔

بیڈنائی (Bednyi) کی نظموں سے روس کے انقلاب کو بڑی مدد ملی اور (Party Executive) اور (Red General Staff) نے ان کی بڑی قدر کی، ان نظموں نے عوام میں ایک آگ بھڑکا دی، ہر طرف انقلاب زندہ باد کے نعرے بلند ہونے لگے، جو فوجیں جنگ سے تھک گئی تھیں وہ از سرِ نو تازہ ہو گئیں اور جنگ میں بدستورِ سابق حصہ لینے لگیں اور سرمایہ داروں کے سروں کو سرِ بازار توڑنا شروع کیا خصوصاً ایسے وقت میں جبکہ ان کا جوش ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ اس صلہ میں حکومت نے بیڈنائی کو ۱۹۲۳ء میں سب سے بڑا اعزاز (Order of the Red Flag) عطا کیا اور درباری شاعر بھی بنا دیا، روس کی جید ہستیوں نے نہایت شاندار الفاظ میں اس کی عظمت کا اعتراف کیا ہے، ٹراٹسکی لکھتا ہے "وہ ایسا شاعر نہیں جو انقلاب تک پہنچا ہو یا اس کو قبول کر لیا ہو بلکہ وہ شاعری کے اسلحہ سے آراستہ ہو کر اس کی خدمت کر رہا ہے، انقلاب اس کی شاعری کا موضوع نہیں بلکہ انقلاب ایک زبردست حاکم ہے جس نے اس کو اس رتبے پر پہنچایا ہے . . . مجموعی طور پر اس کی شاعری ایسی ہے جو اس سے قبل کبھی نہیں ہوئی"۔

بیڈنائی میں کوئی نمایاں قابلیت نہیں، اس کے دماغی کارنامے ایسے نہیں کہ اس کو دنیا کی باعظمت ہستیوں میں جگہ دی جائے۔ وہ شخص ایک کسان کا لڑکا ہے۔ اس کی نظمیں صرف پروپیگنڈے کے لئے ہیں، ان میں نہ کوئی مسرت کا عنصر ہے اور نہ حیاتِ انسانی کی تشریح ہے۔ لیکن اس کی مسلسل کامیابی کا راز زبان کی روانی اور الفاظ کی سادگی میں ہے، اس کے اسلوب میں قدامت کا رنگ بھی ہے، لیکن اس کے جوش اور اثر کی وجہ سے حکومت نے اس رنگ کو نظر انداز کر دیا ورنہ حکومت ہر اس چیز کی دشمن ہے جس میں قدامت جھلکتی ہو، کچھ عرصہ بعد بیڈنائی کو بھی اسی قدامت کی وجہ سے انقلاب کا دشمن سمجھا جانے لگا۔ اس کے خلاف ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا جو مایکوفسکی (Mayakovsky) کو حقیقی انقلابی شاعر سمجھتا تھا۔ مؤخر الذکر میں چند خوبیاں ایسی تھیں جن سے اس کی مقبولیت اور زیادہ ہو گئی۔ وہ ہر طرح مزدور معلوم ہوتا تھا۔ اس کی کرخت آواز، اس کے قوی جسم، اس کے غیر مہذب اطوار اور اس کی اوباش مزاجی نے اسے مزدوروں کا صحیح نمائندہ شاعر بنا دیا، اس کی ایک نظم "لیفٹ مارچ" (Left March) کا کچھ حصہ ملاحظہ ہو:-

آگے بڑھو، بڑھو، بڑھو،
باتیں کافی ہو چکیں ۔ دھکے بھی کافی ہو چکے،
فضول بکواس کا خاتمہ کر دو،
تمہارے پاس الفاظ ہیں، کامریڈ موزر،
اے آدم اور حوا کے زمانے کے قوانین
ہم تمہیں توڑتے ہیں، دنیا ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی ہے،

مائیکوسکی کی وہ نظم جس کا عنوان "ایک سو پچاس ملین" (150 Millions) ہے انقلابی جذبات کی سچی تصویر ہے ملاحظہ ہو ؎

رومانیت کی دنیا کے ساتھ فنا ہو جاؤ،
ہمارے بزرگوں کی قنوطیت کے ساتھ
جمع کرنے کے خبط کے ساتھ فنا ہو جاؤ،
بہادر بنو، رگوں کو سخت کر لو،
جوش سے بھری ہوئی،
تمہاری روح،
بھاپ، ٹھونسی ہوئی ہوا، بجلی کی طرح
ان زکوٰۃ دینے والوں کے
گنجے سروں پر کلہاڑی کا ناچ ہونے دو،
مار ڈالو، مار ڈالو،
شاباش، ان کی کھوپڑیوں کو راکھ دان بنا لو،
بڑھو،
اپنے گھونسے ان کی پسلیوں میں برچھیوں کی طرح بھونک دو،
زکوٰۃ دینے والے شرفا کے جبڑوں میں،
اپنے گھونسے ٹھونس دو اور ان کو توڑ دو،
ان کی ناکوں میں پونچھنے کے کپڑے ٹھونس دو،
اپنے دانت تیز کرو،
وقت کو کاٹو،
نئے چہرے، نئے خواب،
نئے گیت، نئے تصور،
ہم ایک نئی دنیا کی بنیاد ڈال رہے ہیں۔

مائیکوسکی کو بیڈنیانی پر ایک اور فضیلت تھی، وہ صرف سر توڑنے اور گھونسہ مارنے ہی کی نظمیں نہیں لکھتا تھا بلکہ اُسے اصلاحات کو بھی اپنا موضوع بنایا لیکن بالآخر وہ نظمیں بیچنے والا شاعر ہو گیا۔ اس کے باقاعدہ انقلابی نظموں کو فروخت کرنے کے لئے اشتہار شائع کئے، اس کے خیال میں فن کی وہ صورت جو غیر اشتراکی ممالک میں ہے محض فریب ہے اس کا منشا فن سے صرف روزمرہ زندگی کی خدمت ہے۔ اسی خیال سے وہ صابن کے فواید میں نظمیں لکھتا ہے۔ شراب کے فواید کو موضوع بناتا ہے۔ غرض اس قسم کے واقعات جن کا تعلق روزمرہ زندگی سے ہے ان کا اظہار فن ہے۔

ان انقلابی مزدور شعرا کے علاوہ تخیلی شعرا نے بھی اس میدان میں قسمت آزمائی کی لیکن بیڈنیانی اور مائیکوسکی کے سامنے ان کی ایک نہ چلی مجبور ہو کر انہوں نے بھی ایک موضوع اختیار کیا۔ یہ مذہب تھا، چنانچہ انہوں نے مذہب کے خلاف نظموں میں پروپیگنڈا شروع کیا، اور چونکہ عوام اور حکومت دونوں پرزور طریقہ سے مذہب کے مخالف ہیں اس لئے ان کی بھی پرستش ہوئی۔ انہوں نے اپنی نظموں کو فروخت کرنے کے لئے باقاعدہ اشتہار جاری کئے اور دل کھول کر مذہب کی توہین کی، کوئی ایسا الزام نہ تھا جو مذہب کے سر نہ تھوپا گیا ہو، دنیا کے مصائب و آلام کا ذمہ دار مذہب کو ٹھہرایا اور جاہل اور غیر تعلیم یافتہ عوام کو نہایت غلط اور سطحی دلائل سے وجود باری تعالیٰ کا منکر کر دیا، اسی گروہ کا سب سے بلند شاعر میرنہاف (Menienhoff) ہے۔

حکومت کو شعرا کی ان جماعتوں سے یہ خطرہ ہوا کہ کہیں ان کی نظموں میں انقلاب کے خلاف عناصر نہ جگہ پا جائیں، اس لئے تمام جماعتوں کو باقاعدہ سرکاری نگرانی میں لیا گیا اور قابل اعتماد افسر مقرر کئے تاکہ وہ یہ دیکھیں کہ ہر شاعر اپنی نظم میں کون کون سے اسمائے صفت (Adjectives) استعمال کرتا ہے؟ وزن کس قسم کا ہے! بحور کا انداز کیا ہے؟ انقلاب میں معاون ہیں یا نہیں؟

بیڈنیانی، مائیکوسکی اور میرنہاف تینوں انقلابی شاعری کے درخشندہ ستارے ہیں۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد انقلابیوں کو خیال آیا کہ فنون لطیفہ ہماری سوسائٹی کی اقتصادی حالت کے موافق ہونے چاہئیں چونکہ روس میں سوسائٹی کا نظام اجتماعیت (Collectivity) پر قائم ہے اس لئے فنون کی بھی یہی شکل ہونی چاہئے۔ اس لئے ہر شاعر کو لازم ہے کہ وہ نظم میں اپنے جذبات کا اظہار نہ کرے بلکہ عوام الناس

کے جذبات کو موضوع بنائے گویا نظم شخصی (Personal) نہیں بلکہ غیر شخصی (Impersonal) ہو، اس نظریے کی تائید سب سے اول بوگدانوف (Bogdanov) نے کی اور کہا کہ حقیقی معنوں میں مزدوروں کے فنون کی بنیاد بھی اجتماعیت ہی پر ہونی چاہئے، اس کی اس تحریک پر بہت سی انجمنیں قائم ہو گئیں جہاں "الفاظ کے معمار" (Word workers) نے متحد ہو کر نئی قسم کی نظمیں لکھنی شروع کیں، ان کی تصانیف جو روس کی مطالعہ گاہوں میں ملتی ہیں ان پر کسی ایک مصنف کا نام نہیں ہوتا بلکہ یوں لکھا جاتا ہے "مصنفہ ۳۰ کا گروہ" "مصنفہ ۲۰ کا گروہ" "مصنفہ ۲۵ کا گروہ" فنون لطیفہ کے یہ کارخانے سال یا چھ مہینے میں اپنا گوشوارہ بھی شائع کرتے ہیں جس میں یہ دکھایا جاتا ہے کہ ان کے کارخانے میں مقررہ نوع کا کتنا ادبی ذخیرہ تیار ہوا۔

اس جدید تحریک نے شخصی شاعری کو مٹا دیا اور نہ تنہا کوئی شخص خود کو شاعر کہہ سکتا ہے بلکہ ہر شاعر کا فرض ہے کہ وہ کسی نہ کسی جماعت سے منسلک ہو، اس اجتماعیت کا یہاں تک زور رہا کہ مایکووسکی نے اپنی بعد کی تصانیف میں اپنا نام لکھنا چھوڑ دیا اور اس کی تصنیف "ایک سو پچاس ملین" کو ہر اشتراکی اپنی تصنیف کہنے لگا محض اس لئے کہ اجتماعیت کی رو سے کوئی شخص تنہا کسی چیز کا مالک نہیں ہو سکتا۔

اشتراکی شاعری کی یہ اجتماعیت غیر شخصی تصنیفات پر بھی قانع نہ رہ سکی بلکہ اب یہ قاعدہ ہو گیا کہ کسی مجمع کے سامنے ایک کی بجائے کئی آدمی مل کر نظم پڑھتے تھے، اس طریقے سے بھی وہی اجتماعیت کی روح پیدا کرنا تھا۔

جب سے اجتماعیت کا دور شروع ہوا ہر ممکن طریقے سے شخصی جذبات کے اظہار کو روک دیا گیا۔ گاستاف نے اپنی نظموں کے متعلق خود اعتراف کیا کہ ان میں کسی فرد واحد کے جذبات نہیں بلکہ تمام جماعت کو مد نظر رکھا گیا ہے اس تحریک کے باعث بہت سی تمثیلوں کا نام صرف (MASS) رکھا گیا۔ سٹیاپنائی (Stepanova) نے ایک ناول میں "اکتوبر کی بغاوت" کو موضوع بنایا جس میں ہیرو فرد واحد کی بجائے تمام جماعت کو بنایا، اسی طرح مالشکن (Malio Rashkin) نے ایک افسانہ لکھا جس میں پوری فوج کو ہیرو تصور کیا، لیکن اشتراکی اس اجتماعیت پر بھی قانع نہ ہو سکے کیونکہ اس میں بھی کچھ شخصیت کا شائبہ باقی تھا مثلاً ہیرو تو پوری جماعت کو بنا دیا لیکن مصنف ایک ہی کہلایا، ان کا مقصد یہ تھا کہ مصنف بھی پوری جماعت ہی کہلائے، گو اس نظریے کی بعض افراد نے مخالفت کی لیکن ان کی مثال نقار خانہ میں طوطی کی سی تھی۔

ان تمام جدتوں کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اشتراکیوں کی زندگی فنون لطیفہ کے صحیح معنی سے بہت دور ہو گئی اور شاعری محض سیاست کا جامہ بن گئی۔ اشتراکی حکام نے شاعری کو جاسوسوں کا شکار بنا دیا جو ہر قدم پر موجود تھے تاکہ تمام شعرا کے کلام کا جائزہ لیا جائے۔ جہاں انقلاب کی ذرا مخالفت ہوتی وہیں تختہ دار کا سامنا بھی ہو جاتا لیکن یہ تشدد بالآخر ناقابل برداشت ہو گیا اور کئی ایسے گروہ پیدا ہو گئے جن کا نظریہ شعر کے متعلق مختلف تھا، ادب لطیف (Belles lettres) کے متعلق جب سرکاری رپورٹ شائع ہوئی تو وارودسکی نے اشتراکی شاعری پر بہت طعن و تشنیع کی اور کہا کہ یہ لوگ زندگی کے مسائل اور حسن کاری کو شاعری کا عنصر نہیں سمجھتے جو انتہائی غلطی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارے اعلیٰ تخیل کے شعرا بیکار ہو جائیں گے اور ہم ان کی شاعرانہ قوت سے محروم رہیں گے۔" لیکن وارودسکی کی اس تنقید کا اثر لوگوں پر بہت کم ہوا اور تمام سیاسی رہنما ادب میں بدستور مداخلت کرتے رہے۔ ٹراٹسکی بھی ایک حد تک اشتراکی شاعری کا مخالف ہی نظر آتا ہے لیکن (Lenin) نے یہ رائے دی کہ اس قسم کی نئی شاعری پیدا کرنے کی بجائے عوام کی تعلیم پر توجہ کی جائے اور جو روپیہ شاعری کے پروپیگنڈے میں صرف ہوتا ہے وہ تعلیم پر خرچ ہونا چاہئے لیکن اشتراکی ابھی اسی طرز کے فریفتہ ہیں۔

زین العابدین

شعر

کیوں دیکھتے ہی نقش بہ دیوار بن گئے

تم آئینے میں کس کے خریدار بن گئے

شرف

غزل

نگاہوں میں، دل سمائے چلا جا!
یونہی میری ہستی پہ چھائے چلا جا!
زمانے پہ پھر بے خودی چھا رہی ہے
خودی کا ترانہ سنائے چلا جا!
ہے ذوقِ نظر معرضِ گفتگو میں
ذرا رُخ سے آنچل ہٹائے چلا جا!
ابھی زندگی کے ہیں کچھ سانس باقی
چراغِ سحر جھلملائے چلا جا!
تری ضو سے ہے ہستیٔ وجد روشن
مرے داغِ دل جگمگائے چلا جا!

سکندر علی وجد

غزل

عشق کے گیت گا رہا ہوں میں
غم کی دنیا بسا رہا ہوں میں
اپنی ہستی مٹا رہا ہوں میں
اُن کو اپنا بنا رہا ہوں میں
بس رہا ہے مری نگاہ میں خلد
حُسن کو دیکھتا رہا ہوں میں
سعیٔ ناکام کے چراغوں کو
آندھیوں میں جلا رہا ہوں میں
اک نظر دیکھ بھولنے والے!
مدّتوں آشنا رہا ہوں میں
سازِ ہستی کے تار ٹوٹ نہ جائیں
نغمۂ دل سنا رہا ہوں میں
جلوے آنکھوں میں رقص کرتے ہیں
کس کی محفل سے آ رہا ہوں میں

مسعود حفیظ

دنیائے ادب

ادبی قیود اور ذہنی انقلاب

حیاتِ انسانی اس لہرے اور وسیع سمندر کی طرح ہے جو لامحدود قوتوں سے مل کر بنتا ہے۔ سمندر دیکھتے وقت ہمارے ذہن میں ایک وسیع چادرِ آب، ایک نامعلوم گہرائی، موجوں کا ایک ناقابلِ فہم گردش گیت، لہروں کے طوفان میں ایک ہیبت ناک اضطراب اور ہیجان، ایک طرح کے حسن اور ایک قسم کی عظمت کا احساس ہوتا ہے اور یہ اثر ہمارے تجربات اور معلومات، ہماری قوتِ حس اور جذب کی کمی و بیشی کے ساتھ ساتھ بڑھتا گھٹتا رہتا ہے۔ بالکل اسی طرح انسانی زندگی اگرچہ دیکھنے میں ایک ہے لیکن بہت سے چھوٹے بڑے احساسات و تجربات، معلومات اور قدیم روایات کا مخزن ہے۔ ہم حیات کو ان چیزوں سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتے اور جب یہ چیزیں الگ کر لی جائیں گی تو حیات پوری طرح ہمارے سامنے نہ آئے گی بلکہ اس کا صرف ایک رُخ پیشِ نظر ہوگا۔

زندگی کا وسیع مفہوم ان تمام چیزوں پر حاوی ہے اور ادب انہیں کی ترجمانی کا نام ہے۔ انسان کی عظمت اور بزرگی کا اندازہ لگانے کے بعد ہمیں ادب کی مشکلوں کا بھی کچھ اندازہ ہو جاتا ہے کیونکہ ہمالیہ کی تصویر ایک کاغذ پر بنا لینا آسان ہے۔ مگر کسی خوشی یا رنج کے اثر سے چہرے پر جو ہلکی سی تبدیلی پیدا ہوتی ہے اسے الفاظ کے سانچے میں ڈھال کر ہر شخص کو اسی طرح متاثر کر لینا آسان نہیں کیونکہ صرف لکھنے والے یا مصور کے زورِ قلم اور طرزِ بیان ہی پر اس نقاشی یا مصوری کی کامیابی منحصر نہیں بلکہ سننے اور پڑھنے والے کے احساسات اور تجربات کو بھی بہت کچھ دخل ہے۔

ہم نے نہ جانے کتنی مرتبہ یہ سنا ہے کہ ادب اور آرٹ کو ہمارے جذبات سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ کسی ایسی غیر محسوس زنجیر سے وابستہ ہونا چاہیے کہ ایک میں حرکت پیدا ہونے سے دوسرے میں بھی ہو۔ کوئی ایسی کشش ہونی چاہیے کہ ایک دوسرے کی تبدیلیوں سے لطف اندوز ہو

یہ سننے کو تو ہم نے بہت سنا لیکن اس کی نزاکت پر غور بہت کم کرنے کا موقع ملا ہے۔ ایک ہی شعر یہاں تمام بیٹھنے والوں پر مختلف طرح کے اثر پیدا کرے گا۔ اس کی وجہ نہایت سیدھی سادی مگر اہم ہے۔ ہمارے نیم شعوری اور بعض اوقات غیر شعوری احساسات جنہیں ہم کسی وجہ سے اوجاگر کر کے ابھار نہ سکے تھے۔ ممکن ہے کسی شاعر کے یہاں تند و تیز طریقے پر پیدا ہوں۔ فن کار کی آنکھ اور ذہن عوام سے پہلے انسانی جذبات کا تجزیہ کر لیتے ہیں اور جب کوئی شعر اس طرح آ جاتا ہے جس کے لئے ہماری روح میں بھی کبھی بے چینی پیدا ہوتی تھی تو ہم اس اتحادِ جذبات پر چونک پڑتے ہیں اور وہ نیم شعوری احساس دماغ کی گہرائیوں سے نکل کر ایک مستقل احساس بن جاتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کوئی تصویر، کوئی کتاب کوئی شعر ہمیں اس وقت تک پسند نہیں آ سکتا، ہم پر پوری طرح اثر نہیں کر سکتا جب تک کہ ہمارے جذبات اس کی پذیرائی کے لئے پہلے سے تیار نہ ہوں اور یہ پذیرائی کے لیے تیار ہونا اس قبولیت اور عدمِ قبولیت کے جذبے کا پیدا ہونا ماحول کے اثرات کا نتیجہ ہوتا ہے۔ دنیا ہر وقت کسی نامعلوم منزلِ مقصود کی طرف جاتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ دریا کا ایک تیز بہاؤ ہے جس پر بند نہیں باندھا جا سکتا۔ ہوا کا ایک طوفان ہے جو اونچی سے اونچی دیوار کو بھی عبور کر سکتا ہے اور زندگی کے اس لامتناہی بہاؤ میں ہم بھی مع اپنے ادب اور علم، مذہب اور معاشرت کے بہتے چلے جا رہے ہیں۔ دریا جب ریگزار دل سے گذرتا ہے تو بالو اپنے ساتھ لے لیتا ہے، جب پہاڑوں کو عبور کرتا ہے پتھروں کے ٹکڑے بہاؤ میں آ جاتے ہیں، جنگلوں سے پار ہوتا ہے تو درختوں کی شاخیں اور پتیاں شامل ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح زندگی انقلاب کے تمام اثرات کو ساتھ لیتی ہوئی علم ادب پر اپنا اثر چھوڑتی ہوئی چلی جا رہی ہے۔

اب ہمیں دیکھنا یہ چاہئے کہ بعض اوقات اس طرح کی بندشیاں کیونکر ہمارے ادب کے اندر جڑ پکڑ کر مضبوط ہو جاتی ہیں اور دوسرے انقلابات کے لئے پھر جگہ خالی نہیں کرنا چاہتیں یا دوسرے الفاظ میں یہ کہ ادبی قیود کی پابندی کس طرح شروع ہو جاتی ہے۔ اول تو یہ کہ ہم بغیر خود اپنے دماغ کو کام میں لائے ہوئے اپنے ماحول سے بے خبر ہو کر تمام پرانی باتوں کو مان لیں اور انہیں کو قائم رکھنے کی کوشش کریں۔ دوسرے یہ کہ ماحول کے پورے اثرات جذب کر کے صرف قدیم کو جدید کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کریں۔ انسانی طبائع کے اختلافات کو دیکھتے ہوئے اس کے بہت سے درجے ہو سکتے ہیں۔ اگر کسی قوم کے ذہنی ارتقا کے رک جانے کی وجہ سے خیالات کے پھیلانے کا ذریعہ بہت مانوس اور یکساں رہا ہے تو اس کا مقصد یہ ہے کہ قیود کی بندشیں مضبوط ہوتی چلی جائیں گی اور پھر ان کو متزلزل کرنے کے لئے کسی بڑے ہیجان خیز انقلاب کی ضرورت ہو گی۔ میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ تولید و تخلیق جذبات کے لئے ذہنی ارتقا اور ایک طرح کی تیاری ضروری ہے جو نئے جذبات کا استقبال کر کے اسے اچھی جگہ دے۔

ایک حسین شام جب بادل کے بے پروا ٹکڑے ڈوبتے ہوئے سورج کو اپنے حلقہ میں لے کر ساکت تھے، جب سورج کی آخری کرنیں دریا کے کنارے چھوٹے چھوٹے ذرات پر عکس افگن ہو کر تڑپ رہی تھیں۔ جب پانی کی لہروں پر ایک طلائی چادر بچھی ہوئی معلوم ہوتی تھی، جب طائر اپنے آخری گیت گا کر اپنے آشیانوں میں جھولا جھول کر چھپ رہے تھے۔ اس وقت آپ کے دل میں نہ جانے کتنے خیالات پیدا ہوئے ہوں گے۔ کس قدر جلد جلد آپ کا ذہن گزشتہ زندگی کے واقعات طے کر گیا ہو گا اور پھر اگر آپ شاعر بھی ہیں تو آپ کے دل نے یہ بھی چاہا ہو گا کہ اس شام کے تاثرات کو دوسروں تک پہنچا دیا جائے اور اگر خدا کا فضل شریک ہے اور آپ کے ساتھ وہ بھی ہے جسے آپ محبوب رکھتے ہیں تو سورج کی کرنیں اس کے چہرے پر سنہرے تاروں کا نقاب معلوم ہوتی ہوں گی۔ اگر ہوا میں خنکی ہے تو ایک گرم بوسے نے آپ کے سرد جسم میں برقی رو دوڑا دی ہو گی اور پھر یہ شام آپ کی زندگی کی ایک یادگار شام ہو کر رہ گئی ہو گی۔ ایک ذرا سی بات ہے لیکن اس کا اثر دنیا کی ہر حسین چیز سے وابستہ نظر آ رہا ہے اس سے ساری کائنات میں ایک زندگی کی لہر دکھائی دے رہی ہے — آپ اسے اور لوگوں تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ آپ کا دل جذبات اور تاثرات کا گنجینہ بن گیا ہے۔ آپ کے احساسات اس بے پناہ سیل رنگ و بو میں غرق ہوتے جا رہے ہیں۔ آپ کسی نہ کسی طرح اسے کہہ دینا چاہتے ہیں لیکن آپ کو دو باتوں کا خیال پھر بھی رکھنا ہے۔ اظہار خیال کا آلہ کیا ہونا چاہئے اور یہ کہ جس کے سامنے، جس دنیا کے روبرو یہ مرقع پیش کیا جائے گا اس میں قبول کرنے کی کہاں تک صلاحیت ہے۔

آپ ایک دیہات میں شیشوں کی دکان کھول کر کوئی فروغ نہیں پا سکتے اور نہ ایک کور چشم کو بہزاد کی غیر فانی مصوری سے متاثر بنا سکتے ہیں۔ یہ دو مشکلیں ہر فن کار یا آرٹسٹ کو پیش آتی ہیں لیکن ایک ادیب کو سب سے زیادہ — صرف الفاظ کام آ سکتے ہیں۔ الفاظ جن میں صرف الفاظ ہونے کی حیثیت سے رنگ و بو نہیں، جن میں گرمی اور اثر نہیں، جن میں جوش اور تڑپ نہیں، ہاں ان سب کا نازک امتزاج، ان کا حسین میل جول سب کچھ پیدا کر سکتا ہے لیکن یہ توفیق ہر ادیب کو نصیب نہیں۔ اس یادگار شام کا اثر ایک دنیا پر ڈالنا ہے لیکن اسی دنیا کے سامنے جس میں خود آپ کی ذہنی نشو و نما ہوئی ہے جو آپ کو ہر جانب سے گھیرے ہوئے ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ کوئی ایسی عجیب و غریب بات نہیں کہہ سکتے جسے آپ کی ایجاد یا اختراع کہا جا سکے دوسرے یہ کہ آپ کو خود اپنے مخاطب کی قوت اور معلومات کا احساس ہونا چاہئے۔ اب آپ یہ کر سکتے ہیں کہ شام کی سرخی کو خون سے تشبیہ دیں، سورج سے دور شفق کو کسی پھول کا رنگ بتائیں ہلکے نارنجی بادلوں کو کسی دیوی کا اڑتا ہوا آنچل کہہ دیں — اس طرح تشبیہات کے علاوہ اور کوئی تدبیر ایسی نہیں کہ آپ اچھا اثر پیدا کر سکیں۔ سننے والوں پر اثر پیدا کرنے کی کوشش میں تشبیہہ و استعارہ کی پیدائش کا ثبوت ملتا ہے اور طرز بیان میں ندرت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ یہ احساس ہم میں نامعلوم طور پر آ گیا ہو لیکن عام سے عام آدمی بھی جب کوئی چیز بیان کرتا ہے تو اپنی استعداد کے مطابق تشبیہات کا استعمال کرتا ہے اور ایسی تشبیہیں استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اس کے مخاطب کے لئے اجنبی اور نامانوس نہ ہوں۔ ادیب کو بھی اس کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ وہ کوئی ایسی اچھوتی تشبیہہ نہیں لا سکتا جو ساری دنیا کے لئے نئی ہو۔ ایسا انداز بیان اختیار نہیں کر سکتا جو عجیب و غریب ہو۔ اگر آج انسان کے دل کو یورپ کی کسی ایسی مشین سے تشبیہہ دی جائے جو ہندوستان میں کسی نے نہ دیکھی ہو تو بے اثر ہونے کے علاوہ وہ تشبیہہ بے کار اور ناقص ہو گی۔ اس طرح اس شام کے متعلق اثر پیدا

کرنے میں آپ کو ان تجربوں سے کام لینا پڑے گا۔ اس میں آپ کے تجربات، مشاہدات اور معلومات سب شریک ہیں اور یہ صفتیں آپ سے الگ نہیں کی جا سکتیں۔ یہ آپ کی ہستی کا جزو بن گئی ہیں۔ اسی کو مدنظر رکھ کر میتھو آرنلڈ نے شاعری کو تین چیزوں کا مجموعہ بتایا ہے۔

میں اور جذبات زندگی
I + Emotion + Life اس طرح

ادب مختلف چیزوں کا مجموعہ ہوتا ہے جس طرح شام شفق خون کی سرخی پھول کے رنگ سے بنی تھی اسی طرح ادب بھی مجموعہ ہے زندگی کے چند احساسات کا۔ ادب مختلف چیزوں میں کلی مرکزی مناسبت تلاش کر کے منحد کرنے کا نام ہے۔ یوں ہماری شاعری اور نثر نگاری کے بہت سے شعبہ جات کا دار و مدار ہماری قوت مشاہدہ اور معلومات پر ہے۔

تشبیہ اور استعارات کا ذکر اس لئے اتنا زیادہ کیا گیا کہ شاعری اور مضمون نگاری میں ان کا بہت کام پڑتا ہے اور انہیں کے مانوس یا غیر مانوس ہونے یا پرانے ہونے سے ادب کی لذت میں بڑا فرق ہو جاتا ہے۔ دوست کے چہرے کو چاند سے کب تک تشبیہ دی جائے کیونکہ بہت زیادہ انس نفرت بھی پیدا کرتا ہے۔ کسی ملک کے ادب میں تخیلات اور واردات کا بار بار دہرایا جانا ایک تھکی ہوئی ذہنیت کی پیداوار ہونے کا پتہ دیتا ہے۔ انسانی فطرت کی یہ طرفگی بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ وہ بہت مانوس اور بہت نامانوس دونوں سے گھبراتی ہے وہ شخص جس نے ساری عمر دھوتی اور کرتے میں بسر کی ہے سوٹ پہن کر اپنے بے چین چہرے کو چھپا نہیں سکتا صرف اس لئے کہ وہ اس سے مانوس نہیں۔ اسی طرح روزانہ ایک ہی طرح کی زندگی بسر کرنے میں کوئی ندرت اور حسن باقی نہیں رہ جاتا اس سے یہ بات اچھی طرح ظاہر ہو جاتی ہے کہ ایک باہوش اور باخبر طریقے کی جدت طرازی ہمیں متاثر بنا سکتی ہے۔ جدت کا مطلب کسی طرح کی ایجاد و اختراع نہیں بلکہ کسی چیز کو ایسے نئے رنگ میں پیش کرنا جسے ہماری روح خود چاہتی تھی مگر کسی نامعلوم وجہ سے نہ کر سکی۔

پرانی اور نئی چیزیں تناسب یا اس کی قدر و قیمت میں اضافہ ہمارے مشاہدے پر منحصر ہے ایک چہرہ جسے آپ روز دیکھتے تھے اور خاموش گذر جاتے تھے کسی دن اچانک آپ کو اپنی جگہ پر پا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ جو چیز آپ کے لئے پرانی ہے وہ دوسرے کے لئے نئی ہو سکتی ہے۔ تاج محل کو بنے ہوئے کم و بیش تین سو سال ہو گئے ہیں۔ لیکن وہ ہر نئی نسل کے لئے ایک نئی چیز ہے اس طرح عنوانات تو کبھی پرانے نہیں ہو سکتے۔ ان کا بیان فرسودہ ہو جاتا ہے اور پھر ان عنوانات سے بھی تکلیف ہونے لگتی ہے کوئی صبح کسی دوسری صبح سے بالکل مشابہ نہیں ہوتی اور نہ کوئی تاروں بھری رات کسی دوسری رات کی طرح ہوتی ہے۔ لیکن ہم اپنے مشاہدات کو کام میں نہیں لاتے اور بہت زیادہ مانوس اور یکساں سمجھ کر ان کی تمام خوبیوں کو نظرانداز کر دیتے ہیں تشبیہ و استعارات، طرز بیان، خیالات کا رسمی طور پر بار بار دہرایا جانا در حقیقت وہ غلامانہ ذہنیت ہے جس سے بغاوت ضروری ہے۔

اس طرح ہم نے مختصراً یہ دیکھ لیا کہ ادب میں قیود کی پابندی کا کیا مقصد ہے۔ اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ اس میں تبدیلیاں اور ترقی کے پیدا کرنے کے لئے ہمیں کیا کیا صورتیں اختیار کرنی چاہئیں اور جس طرح حیات مختلف منزلوں سے گذرتی رہتی ہے اسی طرح ادب کیونکر ان منازل میں ساتھ دے کر حیات کا ترجمان بن سکتا ہے ادب اپنی ترقی کے لئے دو راہیں اختیار کر سکتا ہے ایک تو یہ کہ رسوم و قیود کی پابندی کرتا جائے۔ انہیں باتوں کو بار بار دہرایا جائے جو پہلے سے چلی آ رہی ہیں لیکن آنکھیں کھلی ہوئی ہوں اور قوت مشاہدہ اپنی پوری طاقت سے موضوعات پر نئے رنگ و روغن چڑھا رہی ہو دوسری صورت یہ ہے کہ پرانی باتوں سے الگ ہو کر انقلاب کی نئی روح پھونک دی جائے۔ پہلی راہ مصلحین کی ہے اور دوسری بے لاگ اور باہمت راہبروں کی جنہیں راستہ نہیں معلوم لیکن اس یقین کے ساتھ جا رہے ہیں کہ منزل کہیں بھی ہو انہیں ضرور مل جائے گی۔ روزمرہ کی زندگی میں انقلاب کے متعلق بھی دو نظریے ہیں ایک تو اصلاح، ترقی اور ارتقا کے ذریعے اور دوسرے اچانک تبدیلی کی مدد سے۔ ممکن ہے دوسرا طریقہ کسی سیاسی انجمن کی ترقی میں مدد دے سکے اور بالکل نئے اصول زندگی کا کر کے تمدن بھی باقی رکھا جائے لیکن ادب میں اس کی گنجائش نہیں ذہنیت میں اچانک تبدیلی مشکل ہے، فطرتیں اس قدر آسانی سے نہیں بدل سکتیں کہ جب کسی دن لوگ صبح کو سو کر اٹھیں تو ہر شخص انقلاب پسند یا رجعت پسند ہو۔ مادی دنیا میں الہ دین کا چراغ ایک رات کے اندر انقلاب پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن ذہنی دنیا میں تدریجی ترقی کے سوا اور کچھ ممکن نہیں۔ موضوعات جو ہمیں مل چکے ہیں وہ اپنی جگہ پر ہیں ہم ...

بیداری کا ثبوت اس طرح دے سکتے ہیں کہ نئے موضوعات کو اپنے یہاں جگہ دیں جو سرمایہ ہمارے دامن میں ہے اسے پھینک کر دوسرا لینے کے لئے بڑھنا کچھ زیادہ عقلمندی نہیں بلکہ یہ بہتر ہوگا کہ ہم اپنے دامن سے چھانٹ کر بالکل بے کار چیزوں کو پھینک دیں اور وہ نئی چیزیں لیں جو ہماری قوتوں کو بڑھانے میں مدد دیں۔ دنیا تبدیل ہو رہی ہے اور ہمیں اس سے فایدہ اٹھانا چاہئے ورنہ ہم سے زیادہ کمزور اور کوئی نہ ہوگا۔ سیاسی، معاشرتی، علمی، ادبی، مذہبی معیار زندگی بدل رہا ہے۔ ہمیں بھی اپنی پونجی میں اضافہ کرنا چاہئے۔ وہ سڑے ہوئے پھل لوکری سے ضرور نکال دینے چاہئیں جو اچھے پھلوں کو بھی اپنی گندگی سے سڑا دیں گے۔

جب ادب یا ذہن کے ساتھ انقلاب کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو اس کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ ہماری محدود نظروں میں وسعت پیدا ہو اور ہمارے علم میں اضافہ ہو، ہمارے مشاہدات موجودہ دور کی ترقی سے فایدہ اٹھائیں ورنہ ہر شعبۂ حیات تو ترقی کر جائے گا اور ادب سب سے پیچھے رہ جائے گا بس قدر مضحکہ خیز ہوگا۔ وہ وقت جب ہم یہ دیکھیں کہ ایک سپاہی توپ کے مقابلے کے لئے اپنی کمان میں تیر جوڑ کر سر کرنا چاہتا ہے وہ ادب جو زندگی کے سرچشمے سے سیراب نہ ہوگا، جو مسائل حیات سے کنارہ کشی اختیار کر کے توہمات کی آڑ میں پناہ لے گا اس کا مٹ جانا ضروری ہے۔ ہم اپنے پرانے زنگ آلود اسلحوں پر صیقل کر سکتے ہیں اور بازار سے نئے خرید سکتے ہیں تو ایسا کیوں نہ کریں

مسائل حیات میں کچھ ایسی ہی شاہراہیں معلوم ہوتی ہیں جن سے ہم اب تک بے خبر تھے۔ جیسے ابتدائی دور کا انسان آفتاب کے طلوع و غروب، بہار و خزاں کی آمد و رفت کے اسباب سے بے خبر تھا۔ ہم آج بھی ہزارہا باتوں سے ناواقف ہیں لیکن جن سے واقف ہو گئے ان سے فایدہ کیوں نہ اٹھائیں۔ سائنس کی ترقی، فلسفہ اور علم النفس کے مسائل، تحلیل نفسی کے ہنگامہ خیز تجربات، اخلاقیات کے نئے معیار سب نے ہماری زندگی میں عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ ان نئے اسلحوں سے ہم کو بھی کام لینا چاہئے، ان چیزوں کا اثر ہماری روزانہ زندگی پر ہے اور ہمیں ان کی روشنی میں اپنے ادب کو عہد حاضر کے اضطراب کا ترجمان بنانا چاہئے۔ اس سے یہ غلط نتیجہ نہ نکالا جائے کہ ہم کسی غیر ملک کی پیروی کر کے اپنے ادب کو صرف ایک طرح کی نقالی بنا لیں لیکن ہمیں یہ حق ہے کہ ہم ان مسائل کو دوسرے ملکوں کے ادب کی مدد سے سمجھیں۔ پہلا ذہنی انقلاب خود لکھنے والوں میں ہونا چاہئے، ان کا تنگ زاویۂ نظر، ان کا تعصب، ان میں معلومات کی کمی انہیں کبھی ترقی یافتہ مصنفین کی صف میں نہیں پہنچا سکتی۔ ہمیں ضرورت ہے کہ ہم اپنی زندگی کو تپا کر سونے کی طرح چمکا دیں، ہم تھوڑا سا کٹنے چھٹنے کے لئے تیار ہو جائیں لیکن ہیرے کی جگمگاہٹ پیدا کر دیں۔ اظہار خیال کے لئے اب بھی الفاظ ہیں جیسے پہلے تھے لیکن مناسبتوں میں فرق آ گیا ہے۔ ہماری ذہنی وسعتیں بڑھ رہی ہیں، ہمیں نئی دنیا سے نئی تشبیہیں اور نئے استعارات تلاش کرنے چاہئیں اور وہ جنہیں سنانا تھا، جن تک پیغامبری کرنی تھی وہ بھی تجربات اور معلومات کے لحاظ سے گذشتہ صدی کے لوگوں سے آگے ہیں۔ ان کا دل جد و جہد میں مدد دینے والی کتابیں چاہتا ہے اور ہمارا فرض ہے کہ ہم انہیں محروم نہ رکھیں۔ ہمارے نغموں میں بھی اب دانت بڑھ جانی چاہئے۔ ہمیں کتاب کا ورق الٹ کر دوسرا سبق شروع کر دینا چاہئے جس میں پچھلے سبق سے بھی مدد ملے گی۔ ہم ابھی تک تنقید میں اپنی نظر پاک نہ کر سکے، ہم ادبیات میں تعصب اور اوہام بے جا کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ ہم شخصیت پرستی سے مرعوب ہو کر اپنی ذہنی ایمانداری اور آزادیٔ ضمیر کی قربانی پر تیار ہو جاتے ہیں لیکن اگر ہم کو ترقی کرنا ہے تو کچھ پسندیدہ مگر مذموم رسموں سے کنارہ کش ہونا پڑے گا۔ پھر ہم کھلی ہوئی فضا میں سانس لے سکیں گے اور وہی فضا ترقی کی جانب لے جا سکتی ہے۔

ہماری غلامانہ ذہنیت ہمیں آزادی کے خواب دیکھنے سے روکتی رہی، ہماری آسائش پرستی ہمیں غریبوں کے دکھ درد کی جانب مائل نہ کر سکی، ہماری تھوڑی بہت علمیت عوام کے گلوں سے جہالت کا طوق نہ اتار سکی لیکن اب انسانی ہمدردی کا تقاضا ہے کہ ہم کسی محدود طبقے کے نہیں بلکہ ساری دنیا کے پیغامبر بن جائیں۔ ہمدردی کا جذبہ زندہ رہنے والی چیز ہے۔ موجودہ دور کی تحریکات سے ہمیں فایدہ حاصل ہو سکتا ہے لیکن اگر ہم چاہیں ورنہ سوتے ہوئے انسان کو دن اور رات میں کہاں فرق معلوم ہو سکتا ہے میں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا

سماج اپنے عہد طفلی میں کوہ کن کے پہاڑ کاٹنے کو سن کر سردھن سکتا تھا لیکن آج جب یہ کام بہت آسان ہو گیا ہے ہم پر وہ سحری طرح اثر ڈالے جانے کی ضرورت ہے، پریوں کا ذکر میر حسن، امانت اور نسیم کی زبان سے لطف دے سکتا ہے مگر اب فرضی پریوں کی جگہ جنس نازک کی ان اصلی پریوں نے لے لی ہے جن سے روزانہ ہمارا سابقہ پڑتا رہتا ہے اور ہم ان فرضی پریوں سے زیادہ گوشت پوست کی بنی ہوئی پریوں سے کیف حاصل کر سکتے ہیں۔ زمانے کی روح بدل رہی ہے اور اگر ادب زندہ رہنا چاہتا ہے تو اُسے اپنے عہد کا ترجمان بننا پڑے گا ورنہ اس کی قسمت میں ٹھوکروں کے سوا کچھ بھی نہیں۔"

میں نے ختم کیا ـــ میرے عزیز دوستو! اگر تمہیں بنی نوع انسان سے محبت ہے تو اُٹھو، اور اوہام کی زنجیروں سے قدم باہر نکال لو مذہبی تعصب اور بے جا جنبہ داری سے بلند ہو کر اس ادب کی بنیاد ڈال دو جس کی کوشش تمہارے ادب کو ہندوستان کی قومی زبان بنانے کی ذمہ دار ٹھہر جائے اور وہ زبان جسے سارے ہندوستان کی روایات نے پودے کی شکل میں لگایا تھا۔ ایسا تناور درخت بن جائے جس کے سائے میں غریب اور دکھیا پناہ لیں۔"

"تمیساں" — احتشام رضوی دہلی

ہندوستانی زبان کا مستقبل

شاہجہاں نے دہلی کو از سرِ نو تعمیر کیا اور اپنی عظمت کی یادگار میں قلعہ اور جامع مسجد جیسی بے نظیر عمارتیں چھوڑیں دیوانِ عام اور دیوانِ خاص اس گئی گذری حالت میں آج بھی اس مغل بادشاہ کے صاحب حوصلہ ہونے کی داد دے رہے ہیں۔ اگر کوئی صاحب نظر اپنے ذہن میں دورِ ماضی کی سطوت اور شوکت کا تصور لا کر دیوانِ خاص پر کندہ کئے ہوئے شعر ؎

اگر فردوس بر روئے زمین است ✦ ہمین است و ہمین است و ہمین است

کو آج بھی پڑھے تو وہ اس جذبے سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے گا۔

لیکن شاہجہاں دہلی کو شاہجہاں آباد نہ کہلا سکا۔ عوام الناس نے عمارات کی عظمتوں کو قبول کر لیا۔ اس بادشاہ کا دبدبہ مان لیا۔ رعایا اپنے بادشاہ سے محبت رکھتی تھی اور اس کا درشن کرنے کے لئے ایک جمِ غفیر بلا لحاظ مذہب و قومیت محل کے جھروکہ کی طرف نگاہ انتظار لگائے رکھتا تھا۔ مگر بادشاہ کے اس حکم کو کہ دہلی کو آئندہ شاہجہاں آباد کہا جائے رعایا نے قبول نہ کیا اور آخر کار دہلی دہلی ہی رہی۔ یہ کیوں کر ہوا کہ ایک ہر دلعزیز بادشاہ کے حکم اور خواہش کی فرمانبردار رعایا نے قدر نہ کی مورخین اس کی کوئی تاویل ہی کیوں نہ کریں میرے نزدیک اس کی صرف ایک وجہ ہے اور وہ یہ ہے کہ زبان کو سیاست سے کوئی سروکار نہیں۔ زبان ہر قوم کی ضروریات کے تحت مرتب ہوتی ہے اور اس پر اگر سیاسی دور اثر انداز ہوتے ہیں تو عارضی طور پر۔ اس کی حیثیت کہیں بلند ہے سیاسی عقاید سے اور کہیں بالاتر مذہب اور فرقہ داری سے۔ سلطنت مغلیہ کو زوال ہو گیا۔ بہادر شاہ ظفر کے دور میں سلطنت مغلیہ آخری سانس لے رہی تھی مگر مغلوں نے کئی صدیوں تک اقلیم ہند میں جو حکمرانی کی تھی ان کے بیدار مغز فرمانرواؤں نے یہاں کے باشندوں میں جو میل جول اور محبت قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ اکبر اعظم کے دربار میں سنسکرت اور فارسی کے ماہرین کی جو یکساں قدر و منزلت تھی ان سب نے ایک نئی چیز چھوڑی اور وہ زبان اردو تھی۔ مسلم اہلِ قلم اس کو استعمال کرتے ہوئے ڈرتے تھے اس لئے کہ اس میں سنسکرت کے غیر مانوس الفاظ بھی ملے ہوئے تھے۔ ہندو صاحبانِ قلم کو اس میں فارسی اور عربی کے اجنبی الفاظ اور تراکیب کی شمولیت نہ بھاتی تھی اور وہ اس سے اس لئے گریزاں تھے لیکن جب اجڑی ہوئی دہلی اور لٹے ہوئے لکھنؤ سے میر، آتش، ناسخ، غالب، ذوق، انیس، دبیر وغیرہ کی ترنم ریزیاں اٹھیں تو دونوں قوموں نے کان کھڑے کئے۔ بانسری کی آواز تھی جو باریک سُروں سے شروع ہو کر دلکش سے دلکش تریں ہوتی گئی اور شیخ اور برہمن دونوں کو اس موسیقی کی لہر میں ایسا محو ہونا پڑا کہ تمام عارضی اور باہمی جھگڑوں کو بھول کر دونوں اس کی طرف متوجہ ہو گئے

سامعین نے غور کیا تو نہ اس میں عرب کی نزاکتی نہ شیراز کا حسن صرف کوہ ہمالیہ کی وادیوں میں کوئل کی کوک بلکہ گنگا اور جمنا کے شیریں ملار کے ساتھ شیرازی بربطا ایسے خوشنا طریقہ پر مل کر بج رہا تھا کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا ناممکن تھا۔ یہ تھی ابتدا اس زبان کی جو نہ کسی بادشاہ نے رائج کرنے کی کوشش کی نہ کسی حکومت نے اس کے لئے کوئی اسکیم بنائی۔ صرف عام آدمیوں نے جو ایک دوسرے کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی حالت میں ایک دوسرے کے خیالات جذبات اور حسیات کی قدر کرنے اور ایک دوسرے کی معاشرت کی وقعت کرنے کے لئے مجبور تھے یہ زبان ایجاد کی اس کی سرپرستی اگر کی تو رائے عامہ نے اس کو ترقی اگر دی تو عوام نے جو لوگ فارسی رسم الخط جانتے تھے انہوں نے اس کو اس میں لکھا جو سنسکرت رسم الخط سے واقف تھے انہوں نے اس کو اس طریقہ پر تحریر کیا۔ گفتگو دونوں کی ایک تھی جو فارسی سے بھی واقف تھے اس میں بیس فی صدی الفاظ فارسی کے ملا کر بولتے تھے۔ جو سنسکرت بھی جانتے تھے وہ دس بیس شبد بھاشا کے ملا کر گفتگو کرتے جہاں ہماری بدنصیبیاں اور افتراقات کا باعث ہیں وہاں دونوں کے لئے جدا رسم الخط ہونا بھی باعث افتراق ہو گیا اور وہ اشتراک عمل جو ہم کو اس زبان سے حاصل ہوا تھا۔ اس طرح کمزور ہوتا گیا کہ ایک نے اپنی زبان کو "اردو" کہا تو دوسرے نے ہندی۔

آج بدنصیبی سے یہ افتراق زیادہ وسیع ہوتا جا رہا ہے اور بے اعتمادی کی بیماری فرضی اختلافات لا کر کھڑے کر رہی ہے۔ یہ وقت نہیں ہے کہ اردو رسم الخط یا ہندی رسم الخط کی موافقت یا مخالفت کی جائے۔ تاوقتیکہ ہمارے قلوب صاف نہ ہو جائیں دونوں رسم الخط جاری رہیں گے۔ جب یہ عارضی کیفیت عوام کے دماغ سے دور ہو جائے گی تو اس وقت خود عوام بھی اپنے لئے بہترین فیصلہ کر لیں گے اور پوری توقع ہے کہ سیاسی شور وشغب سے بالاتر فیصلہ دیں گے اس وقت اردو خط شکست کی زود نویسی اور اردو تحریر کی زود فہمی کے متعلق کچھ لکھنا ایسا ہی بیکار ہے جیسا کہ ہندی کے قدیم رسم الخط کی ستائش کرنا۔

لیکن جو اپنی مادرِ وطن کے مستقبل کی طرف سے مایوس نہیں اور جن کو یقین ہے کہ یہ کیفیت عارضی جنون کی سی ہے ان کو یقین ہے کہ ملک کی مختلف اقوام جس وقت سکون کے ساتھ غور کرنے کے قابل ہوں گی تو نہ اردو کا نام باقی رہے گا اور نہ ہندی کا بلکہ "ہندوستانی" زبان ہندوستان میں رائج ہو گی۔

ایک اور نئی بات جو ابھی پیدا ہو گئی ہے اور وہ یہ کہ ہر صاحب سیاست جب اردو یا ہندی کے افتراق کو رفع کرنے کے لئے نصیحت کرنے کھڑا ہوتا ہے۔ تو وہ یہ تلقین ضرور کرتا ہے کہ ہر صاحب قلم کا فرض ہے کہ آسان الفاظ لکھے اور ایسی زبان لکھے جو عام فہم ہو۔ یہ نصیحت کچھ ایسے طور پر بلا دماغ پر زور ڈالے عام ہو گئی ہے کہ اس پر بھی مختصر طور پر کچھ روشنی ڈالنی ضروری ہے۔

اگر سیاسی رہنماؤں کو علم ادب کی رہنمائی میں بھی وہی اہمیت حاصل ہوتی تو بلاشک یہ بات اور زیادہ خطرناک تھی تاہم یہ بتا دینا ضروری ہے کہ کسی اہل قلم کو کسی خاص طرزِ نگارش کے لئے پابند کرنا گویا زبان کو مردہ کر دینے کے مرادف ہے۔ دنیا میں جب تک علم ادب کا وجود ہے نئے نئے طرز کے شاعر انوکھے اسٹائل کے مالک نثار پیدا ہوتے رہیں گے اور کوئی زبان اپنے ادبی تنوع اور کلام کے گوناگوں طرز پر ہی فخر کر سکتی ہے۔ ورنہ اگر سب مضامین اور جملہ اشعار جو اس زبان کے اہل فکر کے قلموں سے نکلیں یکساں قسم کے آسان اور زود فہم ہوں تو ظاہر ہے کہ وہ زبان اپنے صاحبان قلم کو کس درجہ پابند کر دے گی اور اس پابندی کے نتائج یہ ہوں گے کہ کوئی خاص اہلِ فکر اپنا پیغام اسی وقت قوم تک پہنچا سکے گا جبکہ وہ سادہ زبان ہی استعمال کر سکتا ہو۔ گویا قوم کے ایسے افراد کی دماغی جولانیاں مسدود ہو جائیں گی۔

ہاں اگر کوئی ایسا مضمون لکھنا مقصود ہو جس کا مخاطب دیہاتی طبقہ ہو تو لازم ہے کہ ویسی ہی زبان لکھی جائے لیکن اگر کوئی شاعر یا ناثر اپنا پیغام کسی مخصوص تعلیم یافتہ جماعت تک ہی پہنچانا چاہتا ہو جس کو وہ اس پیغام کا اہل سمجھتا ہو تو اس کی تکذیب صرف اس بنا پر کر دینا کہ وہ دقیق الفاظ لکھتا ہے ہرگز موزوں نہیں۔

"دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر"

کیا پابند ہونا لازمی ہو گا انگریزی زبان شیکسپیئر پر ناز کرتی ہے اردو غالب کو فراموش نہیں کر سکتی اور دونوں کی وقعت ان باتوں کے باوجود ہے کہ دونوں مشکل پسند تھے ان ممالک میں جہاں تعلیم عام ہے وہاں بھی ہر شخص ایک سی علمی قابلیت کا اہل نہیں۔ خود انگلستان میں لندن کی انگریزی اور ہے مضافات کی اور۔ متعدد رسائل نکلتے ہیں جو ادبی حیثیت سے صرف مزدور پیشہ کم تعلیم یافتہ طبقہ کے مذاق

کا لحاظ رکھتے ہیں۔ دوسرے ہیں جو علمی اور ادبی انجمنوں کی سرپرستیوں میں شائع ہوتے ہیں جو ملک کی کثیر آبادی کے لئے نہ باعث دلچسپی ہیں نہ قابل توجہ مگر علمی حلقوں میں ان کو انتہا سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

براڈکاسٹنگ کا محکمہ بھی اس کا لحاظ رکھتا ہے کہ جس طبقہ کی دلچسپی کے لئے براڈکاسٹ ہو رہا ہے اسی قسم کی زبان کا استعمال کیا جائے۔

پس ہندوستانی زبان کو صرف آسان اور روزمرہ فہم طرز تحریر یا دوسری کا پابند کر دینا گو ہمارے آیندہ آنے والے ادیبوں اور شاعروں کے لئے انتہائی ہمت شکن ہے اور جو نئے مسئلے پیدا ہوں گے ان پر ایک ایسی پابندی عاید کر دینا ہے جس سے اُن کا کام اور زیادہ مشکل ہو جائے گا۔

"ہندوستانی ماہنامہ"

ناقد مرادآبادی

شاعر جیل کے دروازے پر

(چین کے شاعر تسو منگ نامی کی ایک نظم کا ترجمہ)

میری محبوبہ —!

آج کاغذ کے ایک پرزے پر غدار وطن کے چھوٹے سے قلم نے حرکت کی — اور میری قسمت کا فیصلہ ہو گیا — بیس سال کے بعد —!!

نہیں، میری محبوبہ! — تیری آنکھوں سے تو آنسو جاری ہو گئے — تو روتی کیوں ہے! — مگر تجھے۔ زمانے تو میری مصیبت پر نہیں — بلکہ اپنے دل کی کمزوری پر رو — اپنے درد نے پر رو

بیس سال — کہنے کے لئے بہت ہیں — لیکن درحقیقت ہوتے کیا ہیں! — تیرے تصور میں آنکھ جھپکاتے گذر جائیں گے مجھے زندان ستم میں داخل ہونے کا ذرا بھی صدمہ نہیں — ہاں اگر خیال ہے تو صرف اس قدر۔

تو سردی میں باہر کھڑی ٹھٹھر رہی ہے۔

تیرا چہرہ سردی سے سفید ہو رہا ہے۔

اور جذبہ یاس نے چہرے کی اس سفیدی میں مزید اضافہ کر دیا۔

میں ڈرتا ہوں —

میری محبوبہ! میں ڈرتا ہوں — سردی کی شدت سے کہیں تیری رگوں میں خون منجمد نہ ہو جائے — مجھے تو اس وقت سردی بالکل محسوس نہیں ہوتی — دل میں حب وطن کی جو آگ بھڑک رہی ہے — اس کی وجہ سے میرا خون رگوں میں اچھل رہا ہے۔

میری محبوبہ — ! تو ہوا کے سرد جھونکوں سے کانپ رہی ہے — لیکن — ہوا کے یہ سرد جھونکے — میری صبر و استقامت کی آگ کو اور بھڑکا رہے ہیں — میری روح کو اور گرما رہے ہیں — اچھا ہے جو اس وقت میرے اور تیرے درمیان — قید خانہ کی آہنی سلاخیں حائل ہیں — ورنہ —

کوچ اس وقت ضرورت ہے میرے خون کی — اور میں دلی مسرت کے ساتھ اپنی رگوں کا آخری قطرہ خون بھی وطن عزیز کے قدموں پر قربان کردوں گا۔ سلام ہو میرے وطن

اگر میں کہیں تجھے اپنی آغوش شوق میں لے لیتا — تو تیرا نازک جسم — بھسم ہو جاتا —

بیس سال —!

میں جانتا ہوں سات ہزار دن ہوتے ہیں۔

لیکن میری محبوبہ! تو یاد کر — دنیا بیس سال میں ہرگز ختم نہیں ہو جائے گی — مجھے نیند آئے گی۔ تجھے یاد کرتے ہوئے میں بیدار ہوں گا تجھے یاد کرتے ہوئے — تیری ایک یاد میرے دل میں چوبیس گھنٹے رہے گی۔ میں تجھے زیادہ نہیں — صرف سات ہزار مرتبہ یاد کروں گا اور بیس سال نہایت آسانی سے گذر جائیں گے۔

میری محبوبہ — جرأت سے جرأت پیدا ہوتی ہے۔ کیا تجھے معلوم ہے — جرأت کو فنا نہیں — موت کسی بہادر انسان کی زندگی لے سکتی ہے لیکن اس کی جرأت نہیں لے سکتی۔

جرأت —

مرنے والے کے گوشت و پوست میں — رگ و پے میں جذب ہو جاتی ہے میں کسی اخلاقی جرم کا مرتکب نہیں۔

اپنے ضمیر کی آواز سن کر — آزادی وطن پر قربان ہو رہا ہوں۔

میری محبوبہ —!

دیکھ وہ دیکھ۔ جیل خانہ کی دیوار کے باہر۔ وہ بلندی پر مادر چین کا پرچم لہرا رہا ہے۔ سلام ہو میرا اس مقدس پرچم کو — میں نے اس کے سائے میں جرأت حاصل کی ہے اور یہی نظارہ اس وقت بھی میری جرأت میں اضافہ کر رہا ہے۔

میری محبوبہ — !

تو رو رہی ہے۔ جا چلی جا — مجھے تیرے آنسوؤں کی ضرورت نہیں — اور چین کو تیرے آنسوؤں کی ضرورت نہیں — چین — میرے پیارے وطن چین! — میرے مظلوم وطن چین کو — سلام ہو آزادی وطن کے مقدس پرچم کو۔

کامیاب دہلی

نقد و نظر

فکر و نشاط

جوش ملیح آبادی کی ۸۰ چھوٹی بڑی نظموں کا مجموعہ مکتبہ جامعہ دہلی نے فکر و نشاط کے نام سے حال ہی میں شائع کیا ہے۔ کتابت و طباعت نہایت شگفتہ کاغذ بہت اچھا۔ حجم ۱۵۱ صفحے قیمت (عہ/)

اردو زبان میں اقبال پہلا شاعر ہے جس نے خودی کے اسرار و رموز، موت و حیات کے فلسفیانہ نکات ملک کے سیاسی و اقتصادی مسائل اور مذہب و معاشرت کے دقیق پہلوؤں کا اظہار نظم میں کیا ہے۔ از بسکہ اقبال پیغمبر سخن ہے۔ اس نے ان بے کیف باتوں کو جس دلفریب اور محکم انداز میں پیش کیا ہے اس سے اس کے کلام میں نہ فن کے اسقام پیدا ہوئے ہیں اور نہ شاعرانہ لطافت ہی زائل ہوئی ہے۔

اقبال کی اس روش سے متاثر ہو کر بہت سے شعرا نے جن کا حقیقی رنگ سخن اقبال سے مختلف ہے اس راہ پر گامزن ہونا ضروری خیال کر لیا ہے جوش یقیناً بہت بلند پایہ شاعر ہیں اور اگر وہ اپنے آپ کو صرف اس نوع کی شاعری کے لئے وقف کریں جو ان کی فطرت کا اصلی جوہر ہے تو اس رنگ میں ہندوستان بھر میں ان کا کوئی حریف نہیں۔ جوش کے مرصع الفاظ کا ترنم، اس کے انداز بیان کی حلاوت اور اس کے کلام کی فسوں کاری اس وقت اپنے عروج پر ہوتی ہے جب وہ "مئے کہنہ و معشوق جوان" کی تعریف میں قصیدے لکھتا ہے۔ یا پھر جب وہ حسن و عشق کے معرکے اور رندی و سرخوشی کی داستانیں بیان کرتا ہے۔ اس رنگ سے ہٹ کر جوش نے جو کچھ لکھا ہے وہ نظم تو ضرور ہے لیکن شعر نہیں۔ جوش صحیح معنی میں شاعر ہے۔ اس کا مصلحت وقت کی خاطر ہر چند کہ وہ مصلحت کیسی ہی اہم کیوں نہ ہو محض ناظم بن کر رہ جانا ادب اردو پر ظلم ہے۔ "فکر و نشاط" میں بیشتر نظمیں ایسی ہیں جن میں ردیف و قافیہ کی قید سے محض واقعہ نگاری کی گئی ہے اور وہ طلسم جو جوش کے کلام کی امتیازی چیز ہے موجود نہیں ہے۔

شمع فروزاں سعیٔ لاحاصل۔ داغ جگر بیچتا ہوں۔ فریب ہستی۔ ہم لوگ۔ مشاہدات۔ تحفہ ہستی۔ بے تاب ایسی نظمیں ہیں جن میں جوش کا فکر سخن و طرز نگارش نمایاں ہے' اور یہی وجہ ہے کہ یہ نظمیں دلاویزی کے لحاظ سے زیادہ مؤثر ہیں۔

طلسمات

سید عابد علی عابد کے پندرہ مختصر افسانوں کا مجموعہ ہاشمی بک ڈپو لاہور نے طلسمات کے نام سے شائع کیا ہے۔ کتاب مجلد ہے۔ لکھائی چھپائی بہت اچھی۔ کاغذ نفیس۔ حجم ۲۳۱ صفحات۔

عابد صاحب اردو افسانہ نویسی کی دنیا میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ ان کے مختصر افسانے اس مجموعہ کی صورت اختیار کرنے سے پہلے ملک کے مشہور رسائل میں شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔

فقرات کی شگفتگی اور تراکیب کی جدت سے انداز بیان کو رنگین بنانے میں عابد صاحب کو کمال حاصل ہے قصہ نویسی کے فن کا انہوں نے غائر نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ اس لئے ان کے افسانے بالعموم فنی اسقام سے پاک ہوتے ہیں۔ عابد دور حاضر کی تعلیم یافتہ سوسائٹی کا فرد ہے۔ اس لئے اس کے افسانوں کے کردار بھی اس زندہ اور متحرک سوسائٹی کے عیب و صواب کے آئینہ دار ہیں۔ طلسمات کے بیشتر افسانے جس ماحول کا نقشہ پیش کرتے ہیں وہ اجنبی یا غیر مانوس نہیں۔ پڑھنے والا شخص افراد قصہ کے رنج و مسرت میں اپنے جذبات کا عکس محسوس کرتا ہے۔ عابد کا قلم بے باک بھی ہے۔ وہ گناہ و ثواب کی داستان بیان کرتے وقت ایک حقیقی صناع کی طرح چشم پوشی کو روا نہیں رکھتا لیکن اس بے محابا نگاری کے لئے جس صناعانہ قابلیت کی ضرورت ہے وہ عابد کے ہاں مفقود نہیں۔

داغ ناتمام۔ بہار۔ لاہور کی ایک رات منگنی اور قسمت اور خطوط رنگیں نہایت دلچسپ افسانے ہیں۔ عشرت باقی۔ محبت کی ایک شام۔ جوانی کی پہلی محبت میں عابد کی افسانوی خصوصیات موجود نہیں ہیں اس لئے اگر انہیں اس مجموعہ میں شامل نہ کیا جاتا تو کچھ حرج نہ تھا۔

طنزیاتِ مانپوری

مانپوری کے تیرہ مزاحیہ افسانوں کا مجموعہ دفتر رسالہ "نیم گیو (صوبہ بہار) نے مندرجہ بالا عنوان سے شائع کیا ہے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ اچھا کتاب مجلد ہے۔ حجم ۱۷۲ صفحات قیمت عہ

اردو کے بعض انشاپرداز اپنے نام کی بجائے صرف اپنی نسبت وطن لکھنا کافی سمجھتے ہیں۔ مثلاً عبدالرزاق ملیح آبادی اپنے آپ کو صرف ملیح آبادی لکھتے ہیں۔ اسی جدت کے تتبع میں زیر نظر مجموعہ میں مصنف نے اپنے نام کی جگہ صرف مانپوری لکھا ہے۔ اب خدا جانے یہ مانپوری کون صاحب ہیں اور ان کا نام کیا ہے۔ اس رواج کا مطلب تو یہ ہوا کہ اب مانپور اور ملیح آباد کا کوئی اور باشندہ اپنے آپ کو مانپوری اور ملیح آبادی نہیں لکھ سکتا۔ اگر یہ رواج عام ہو جائے اور جوش ملیح آبادی بھی اپنے آپ کو صرف ملیح آبادی لکھنے لگیں تو یہ کیونکر معلوم ہو سکے گا کہ فلاں تحریر جس کے نیچے صرف ملیح آبادی درج ہے عبدالرزاق کے قلم سے ہے یا جوش کے قلم سے۔ یہ طریقہ ہرگز اس قابل نہیں کہ جاری رکھا جائے۔ اگر مانپور کے کوئی اور ادیب اپنی کتاب شائع کریں اور اپنے نام کی جگہ صرف مانپوری لکھ دیں تو دنیا کے لئے یہ تمیز کرنا ناممکن ہوگا کہ وہ مانپوری کون ہے اور یہ مانپوری کون۔

اس مجموعہ کے شروع میں سید وصی احمد بلگرامی کا ایک طویل دیباچہ ہے جو بالکل بے سود ہے۔ بہتر تھا کہ یہ دیباچہ شامل نہ کیا جاتا۔ مانپوری کا یہ افسانہ ہندوستانی معاشرت کے کسی کمزور پہلو سے تعلق رکھتا ہے۔ اور دلچسپ ہونے کے علاوہ سبق آموز بھی ہے۔ "میر کلو کی گواہی" میں انہوں نے یہ واضح کیا ہے کہ انگریزی عدالتوں میں قانونِ شہادت کی سخت گیری کے باوجود فرضی گواہ کس چالاکی سے جھوٹی شہادتیں دے آتے ہیں۔ اور قانون کی زد میں بھی نہیں آنے پاتے "میونسپل الیکشن" میں بہت قابلیت اور خوش اسلوبی سے آج کل کے انتخاب کی بے اعتدالیوں اور میونسپل کمشنر کی زندگی کے واقعات کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔ "ہاں میں ہاں" میں بتایا گیا ہے۔ کہ آج کل کے خوشامدی اور تملق پیشہ لوگ کس طرح حکام کے پاس جا جا کر ان کی ہاں میں ہاں ملانے کے عادی ہیں اور اس عادت کا نتیجہ سوا اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ انجام کار یہ بے اصول لوگ ذلیل و خوار ہو کر نکلتے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے ہندوستانی معاشرت کے مختلف پہلوؤں کا اچھی طرح مطالعہ کیا ہے۔ انہیں اپنے قلم پر بھی قدرت حاصل ہے۔ اور جس بے تکلفی سے وہ حالات اور واقعات کا تجزیہ کرتے ہیں وہ یقیناً قابل ستائش ہے۔ زبان میں بعض ایسے محاورات استعمال کئے گئے ہیں جو صرف بہار میں رائج ہیں۔ بعض غلط الفاظ کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔ تفریری۔ بیگاری۔ تنزلی۔ انکساری وغیرہ۔ انگریزی الفاظ جن کے مترادفات موجود ہیں بلا ضرورت استعمال کئے گئے ہیں۔

شیرازہ

اس نام کا ایک ہفتہ وار اخبار گزشتہ چھ، سات ماہ سے لاہور سے شائع ہو رہا ہے۔ ادارہ تحریر میں سند باد جہازی اور محمود افضل بی۔ اے شریک ہیں۔ اخبار کا کاغذ اچھا اور لکھائی چھپائی دیدہ زیب ہے۔ حجم ۱۶ صفحات چندہ سالانہ تین روپے۔ ملنے کا پتہ:۔ دفتر شیرازہ۔ دل محمد روڈ۔ لاہور۔

روزنامہ "احسان" (لاہور) کے مطائبات میں سند باد جہازی جو تیر و نشتر استعمال کرتا ہے ان کی قدر صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہیں قدرت نے ذوقِ ادب کے ساتھ ظرافت کی پاکیزہ چاشنی بھی عطا کی ہے۔ سند باد جہازی ایک فرضی نام ہے جس کے پس پردہ ایک شعلہ طراز ادیب اور کہنہ مشق اخبار نویس کی شخصیت کار فرما ہے۔ ہماری مراد مولانا چراغ حسن حسرت سے ہے جن کی دلآویز تحریروں نے ہندوستان میں ہر جگہ ان کے مداح پیدا کر دیئے ہیں۔

"شیرازہ" کی روح رواں بھی حسرت کا قلم ہے۔ اس لئے بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ "شیرازہ" کے صفحات نظم و نثر کے معیاری مضامین سے مزین ہوتے ہیں۔ یوں تو آج مزاحیہ رنگ میں لکھنے والوں کی کمی نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ظرافت نویسی سنجیدہ نگاری سے کہیں مشکل ہے۔ "شیرازہ" کی خصوصیات میں یہ چیز لائقِ توجہ ہے کہ اس میں سیاسی، ادبی اور معاشرتی مسائل پر ایسے ہلکے پھلکے ظرافت کی نوک جھونک سے لبریز اور ہنسی دل لگی کے زیور سے آراستہ مضامین شائع ہوتے ہیں کہ زبان و ادائے بیان پر سر دھننے کے علاوہ اہلِ دانش کے لئے غور و فکر کا بھی کافی سامان ہوتا ہے۔ امتیاز علی تاج، عبد المجید سالک، حفیظ ہوشیارپوری ایسے مشہور ادیب اکثر "شیرازہ" میں لکھتے ہیں۔ ہر نمبر میں اردو کے کسی اچھے شاعر یا ادیب کی تصویر بھی شائع کی جاتی ہے۔ وہ لوگ جو صحیح اردو پڑھنا یا سیکھنا چاہتے ہیں "شیرازہ" ضرور مطالعہ کریں۔

"ع"

جوہر وسمہ مہندی کی مقبولیت

دنیا کی متفقہ رائے کا خلاصہ

سفید بالوں کو سیاہ کرنیوالا نایاب تحفہ

اس ایجاد کی صداقت کو دنیا مان گئی ہے

اخبار سیاست لاہور — جوہر وسمہ مہندی [illegible]

شیخ عبدالحکیم صاحب گجراتی دفتر تبلیغ اخبار [illegible]

جناب بابو جوالا پرشاد صاحب محلہ بسنت پورہ گورکھپور یو۔پی

جوہر وسمہ مہندی استعمال کیا ... طبیعت بہت خوش ہوئی [illegible]

عالیجناب حضرت مولنا سید رسول شاہ صاحب جیلانی سجادہ نشین [illegible]

پنجاب کے مشہور قومی کارکن سید حبیب صاحب فیروزپوری [illegible]

آغا خالق داد خان ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس — جوہر وسمہ [illegible]

فاضل اجل بلند اقبال صاحبزادہ ... حافظ محمد حسین شاہ صاحب نقشبندی [illegible]

مسیح الملک عالیجناب حکیم حاجی محمد اجمل خاں صاحب رئیس اعظم دہلی

جوہر وسمہ مہندی [illegible]

صاحب بہادر ... راولپنڈی [illegible]

حضرت مولنا مولا بخش صاحب خطیب [illegible]

راولپنڈی سابق سپرنٹنڈنٹ [illegible]

مولانا محمد عرفان صاحب سیکرٹری خلافت کمیٹی بمبئی [illegible]

عالیجناب سردار عبدالحی خانصاحب افغان کرنیل ... صوبہ بہار — جوہر وسمہ مہندی کے استعمال سے دماغ اور آنکھوں میں ٹھنڈک ہوتی ہے۔

چوہدری غلام حیدر خانصاحب منیجر روزنامہ زمیندار لاہور [illegible]

جناب حاجی انوار الحق صاحب ... کلکتہ [illegible]

میاں عبدالعزیز صاحب ڈویژنل آفیسر ... لائل پور [illegible]

جناب ٹھاکر لاجپت سنگھ صاحب انسپکٹر پولیس کوتوالی دہلی — جوہر وسمہ مہندی بہت اچھی چیز ثابت ہوئی [illegible]

جناب سردار کرم سنگھ صاحب رئیس اعظم عالمپور — جوہر وسمہ مہندی استعمال کیا ... مفید ثابت ہوا۔

جناب محمد حیات نمبردار بالاکوٹ ضلع ہزارہ [illegible]

مشہور قومی کارکن حضرت امیر چند صاحب ... ایڈیٹر

جناب ... صاحب ... دار [illegible]

پیام گذارشات [illegible]

معززین کی [illegible]

عالیجناب ... بیرسٹر [illegible]

جناب لالہ ... صاحب [illegible]

امرتسری شاہی حکیم راولپنڈی [illegible]

عالیجناب راؤ محمد ... خان [illegible]

جناب راجہ سوار خانصاحب [illegible]

حضرت رضوی ... دہلوی [illegible]

مولانا ... احمد صاحب [illegible]

سردار گوروت سنگھ صاحب [illegible]

خلیفہ شجاع الدین صاحب [illegible]

بشارت کا اعلان [illegible]

روزنامہ سیاست لاہور [illegible]

روزنامہ احسان لاہور [illegible]

روزنامہ حق پرست لاہور [illegible]

اخبار شیعہ لاہور [illegible]

اخبار مسلمان لاہور [illegible]

رسالہ ... لاہور [illegible]

یادگار
منصور احمد مرحوم



India's Premier Magazine

The ADABI DUNYA
LAHORE

ادبی دنیا

ادارہ

عاشق حسین بٹالوی
بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی

حفیظ ہوشیارپوری
ایم۔ اے

قیمت چھ آنے

ڈاک کے ڈاکو! اہرماہ ہمیں خریداروں کی طرف سے شکایتیں موصول ہوتی ہیں کہ انہیں پرچہ نہیں ملتا وسیوں خریدار ایسے بھی ہیں جو شکایت نہیں کرتے لیکن یہ فرض کر لیتے ہیں کہ پرچہ دفتر سے نہیں بھیجا جاتا حالانکہ پرچہ چھاپنا اور پھر خریدار کو نہ بھیجنا بالکل بن اور تجارتی خودکشی سے کم نہیں ادبی دنیا ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ تک شائع ہو جاتا ہے اگر ۲۰ تک آپ کو پرچہ نہ ملے تو سمجھ لیجئے کہ کسی ڈاک کے ڈاکو کی نذر ہوا۔ بس ایک شکایتی کارڈ اپنے حلقہ کے سپرنٹنڈنٹ پوسٹ آفس کو لکھئے اور ایک کارڈ ہمیں لکھئے تاکہ آپ کو پرچہ دوبارہ بھیجا جائے اور محکمۂ ڈاک کے دروازے پر ایک اور دستک دی جائے (مینجر)

فہرستِ مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہ اکتوبر ۱۹۳۷ء

جلد ۱۵ تصاویر :- ۱-ایجنٹا کی مصوری ۲-شہسوار شہزادیاں **نمبر ۱۲**

نمبر شمار	مضمون	صاحبِ مضمون	صفحہ
	بزمِ ادب		
۱	سالنامہ ادبی دنیا	صلاح الدین احمد	۸۱۲
	آئینۂ عالم		
۲	ہندوستان کا قومی ترانہ	صلاح الدین احمد	۸۱۹
	افسانے		
۳	بریش	جناب ایم۔ ایم لقا بابا	۸۳۶
۴	انجام	جناب راجہ مہدی علی خاں	۸۴۵
۵	نیرنگِ انتقام	جناب تقی علی قاسمی ناگ پور	۸۶۴
	علمی و ادبی مضامین		
۶	ایک فرانسیسی نژاد اردو شاعر	جناب پیارے لال شاکر میرٹھی (ایڈیٹر "ادیب")	۸۲۴
۷	ہندوستانیوں کی زبانیں	"ایک پنجابی"	۸۵۴
	حصۂ نظم		
۸	منصور کی یاد میں	حضرت مسعود شاہد	۸۲۳

نمبر شمار	مضمون	صاحبِ مضمون	صفحہ
۹	غزل	جناب عبد اللطیف تپش بھیروی	۸۳۵
۱۰	روحی فداک	حضرت امجد حیدرآبادی	۸۴۲
۱۱	مجاہد	حضرتِ ساغر جیلی	۸۴۴
۱۲	نغمہ خودی	جناب سادھو رام تاجور سامری	۸۵۲
۱۳	سحرِ حیات	جناب "میراجی"	۸۵۳
۱۴	بھاشا کے پھول	جناب "راہو"	۸۵۳
۱۵	غزل	جناب محمد احسن نامل	۸۶۲
۱۶	تلخاب	جناب "شہیر"	۸۶۳
۱۷	تعبیرِ جنوں	جناب خواجہ حمید عرفانی ایم اے	۸۶۷
۱۸	غزل	جناب نذیر احمد ظفر	۸۶۸
۱۹	غزل	حضرتِ مسعود حفیظ	۸۶۹
	دنیائے ادب		
۲۰	اردو کی شستگی و نفاست میں آگرے کا حصہ	جناب لطیف الدین احمد بی اے	۸۷۰
۲۱	انقلاب	محترمہ آمنہ نسیم	۸۷۸
۲۲	نقد و نظر	حفیظ ہوشیارپوری	۸۷۹

سالانہ چندہ مع محصول ڈاک و وی پی پانچ روپے (۵) ممالک غیر سے دس شلنگ

گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام مسٹر صلاح الدین احمد پرنٹر پبلشر چھپ کر دفتر ادبی دنیا کمرشل بلڈنگس مال روڈ لاہور سے شائع ہوا

بزمِ ادب

سالنامۂ "ادبی دنیا"

ادبی دنیا کا سالنامہ ۱۹۳۸ء حسبِ معمول دسمبر کے نصفِ اول میں شائع ہو جائے گا۔ منصور احمد مرحوم کی ابدی جدائی جس شدت سے ہمیں اس موقع پر محسوس ہو رہی ہے اُسے کچھ ہما را ہی دل جانتا ہے۔ لیکن خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ "ادبی دنیا" ابھی تک اس راستے پر نہایت سلامت روی سے چل رہا ہے جس پر مرحوم اُسے ڈال گئے تھے اور اگر خدا کا فضل شاملِ حال رہا تو آیندہ بھی وہ اسی طرح گامزن رہے گا۔

مجھے اور میرے رفیقوں حضرات عاشق بٹالوی و حفیظ ہوشیارپوری کو ادبی دنیا کے تمام قلمی معاونین سے بالعموم اور منصور مرحوم کے مخلص احباب سے بالخصوص یہ توقع ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ نہایت جائز توقع ہے کہ وہ ادبی دنیا کے آیندہ سالنامہ کو ویسا ہی شاندار بنانے میں ہمارا ہاتھ بٹائیں گے جیسا کہ وہ مرحوم کی زندگی میں رہا ہے۔

سالنامے کے لئے مضامین موصول ہو رہے ہیں لیکن ان کی رفتار تسلی بخش نہیں۔ پس ان سطور کے ذریعے سے ہم ادبی دنیا کے تمام معاونین کو ان کے اس خوشگوار فرض کی طرف متوجہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے اپنے رشحاتِ قلم زیادہ سے زیادہ نومبر کے وسط تک بھیج دیں۔ مضامین جس قدر جلد آئیں گے ان کی کتابت۔ ترتیب۔ تزئین اور طباعت اُس قدر اچھی ہو سکے گی۔

ادبی دنیا کے سالنامے نے اردو میں بہترین لٹریچر فراہم کرنے کے اعتبار سے جو امتیازی روایات قائم کر دی ہیں۔ ان کا سہرا درحقیقت ہمارے بلند پایہ مضمون نگاروں کے سر ہے اور ہم اسے اپنی انتہائی خوش نصیبی سمجھتے ہیں کہ اردو کے بہترین انشاپردازوں اور شاعروں کی ایک معقول تعداد ہمیشہ ادبی دنیا کی قلمی اعانت کو اپنا مخصوص علمی فرض سمجھتی رہی ہے۔

ہمیں نہیں بلکہ خود زبان اردو کو علم و ادب کے ان مخلص اور بے غرض خادموں پر فخر و ناز ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ مستقبل میں جب دورِ حاضر کی تاریخ ادب لکھی جائے گی تو ان کے کارنامے اس کے زرین صفحات پر روشن حروف میں نظر آئیں گے۔

انعامی مضامین

گذشتہ سال اعلان کیا گیا تھا کہ سالنامہ ۱۹۳۷ء کے بہترین مضامین نظم و نثر پر ادارہ "ادبی دنیا" کی جانب سے ازراہِ قدردانی چند انعامات دئے جائیں گے۔ ہمیں افسوس ہے کہ منصور احمد مرحوم کی طویل بیماری اور پھر انتقال کے باعث عرصۂ دراز تک انعامات کے متعلق کوئی فیصلہ نہ کیا جا سکا۔ مرحوم کے بعد گزشتہ گرما میں جدید ایڈیٹروں نے کام سنبھالتے ہی ہمالیہ کی بلندیوں کا رخ کیا۔ ایک صاحب شملہ اور دوسرے ڈلہوزی چلے گئے۔ اس لئے نہ وہ یکجا ہوئے اور نہ اس ضروری مسئلے کا تصفیہ ہوا۔ اب آغازِ خزاں میں دونوں صاحبان لاہور آ گئے ہیں اور خدا کا شکر ہے کہ ہم اولیں فرصت میں اس بارِ گراں سے سبکدوش ہو رہے ہیں۔ ذیل میں گزشتہ انعامی مضامین کے موضوعات اور دیگر تفاصیل درج کی جا رہی ہیں:-

(۱) بہترین طبعزاد افسانہ یا ڈراما

دو انعامات
(۱) "بہارانی کا تحفہ" (افسانہ) سردار راجندر سنگھ بیدی
(۲) "کمار" (ڈراما) جناب اندرلال داس قمر

(۲) بہترین علمی مضمون

عہدِ حاضر کی علمی۔ معاشرتی۔ تمدنی اور سائنٹفک ترقیوں

اور تحریکوں کے متعلق اول درجے کا انعام "تہذیب کدھر جارہی ہے" ڈاکٹر ایس ایم اختر ایم اے پی ایچ ڈی۔

(۳) بہترین ادبی مضمون

موضوع ہندوستانی ادبیات سے متعلق لسانی تاریخی اور تنقیدی مضامین۔ اس ضمن میں حضرت علامہ برج موہن دتاتریہ کیفی کا مضمون "پنجاب کا اولیں اردو ماہنامہ" بہترین تسلیم کیا گیا ہے اور اس کے بعد مندرجہ ذیل دو مضامین کا رتبہ برابر قرار دیا گیا ہے:-

(۱) "شہزادیوں کی شاعری" از جناب تسکین عابدی

(۲) "مسلمان اور ہندی زبان" از پنڈت رام سروپ شاستری

ازبسکہ حضرت علامہ کی ذات بابرکات کی خدمت میں انعام پیش کرنا گستاخی سمجھا جاسکتا ہے اس لئے یہ انعام موخر الذکر حضرات میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔

(۴) مزاحیہ مضمون

اس ذیل میں صرف ایک قابل اشاعت مضمون موصول ہوا تھا اور اسی کو انعام دیا جارہا ہے یعنی "شیخ صاحب" از جناب خلیل بی اے۔

بہترین نظم

اس صنف ادب کا انتخاب جس قدر مشکل ہے۔ وہ اہل ذوق سے مخفی نہیں۔ بڑی کاوش کے بعد دس ایسی نظمیں انتخاب کی گئیں جو سب کی سب قابل انعام تھیں لیکن ازبسکہ انعام فقط مقرر تھا اس لئے اس مشکل کو قرعہ اندازی سے حل کیا گیا البتہ ایک کی بجائے دو انعامات دئیے جارہے ہیں تاکہ کاوش انتخاب کو کچھ تو داد ملے۔ یہ دو انعامات جناب عبدالحمید عدم کو ان کی نظم "خدا اور انسان" اور حضرت عرشی امرت سری کو ان کی نظم "یاد فراموشی" پر دئیے جارہے ہیں۔

انعامات کی مجموعی رقم پچاس روپے ہے۔ اس حقیر رقم سے ان گراں قدر مضامین کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنا بہت بڑی غلطی ہوگی۔ کیونکہ انعامات تو محض قدردانی کے اظہار کا ذریعہ ہیں اور بس۔ ہم چاہتے ہیں کہ ادبی دنیا اپنے معاونین کی خدمت میں اس سے بہت زیادہ رقم کے انعامات پیش کرسکے۔ لیکن یہ امر ہمارے اہل ملک کی قدر علم و ادب پر منحصر ہے۔ اس بارے میں ہمارا ادب جس مجرمانہ غفلت کا شکار ہو رہا ہے۔ اس کی کہانی بڑی دردناک اور مایوس کن ہے۔ اور اپنے بیان کے لئے ایک طویل فرصت کی محتاج۔ یہ قصہ ہم کسی اور وقت پہ اٹھا رکھتے ہیں اور آج کی صحبت کو تلخی حقایق کے ذائقے سے بدمزہ نہیں کرنا چاہتے

آئندہ سالنامہ کے انعامات

ہمیں یہ اعلان کرنے میں بڑی خوشی محسوس ہوتی ہے کہ ادبی دنیا کے سرگرم معاون اور منصور احمد مرحوم کے رفیق مخلص جناب ملک عطاء اللہ صاحب کلیم ایم اے۔ ڈپٹی کنٹرولر ملٹری اکاونٹس راولپنڈی نے سالنامہ آئندہ کے بہترین علمی یا ادبی مضمون کے لئے ایک طلائی تمغہ پیش کیا ہے جو منصور احمد مرحوم کے نام سے منسوب ہوگا۔ کامیاب انعامی مضمون کا تصفیہ جنوری ۳۹ء میں ہو جائے گا۔ اور فروری ۳۹ء کے پرچہ میں اس کا اعلان کرکے صاحب مضمون کی خدمت میں تمغہ پیش کر دیا جائے گا۔

اس طلائی تمغے کے علاوہ ادارۂ ادبی دنیا کی جانب سے مندرجہ ذیل تفصیل کے مطابق مضامین نظم و نثر پر انعامات دئیے جائیں گے۔ اور انعام حاصل کرنے والے مضامین کا اعلان فروری کے پرچے میں کر دیا جائے گا اور اس کے فوراً بعد انعامات روانہ کر دئیے جائیں گے۔

(۱) بہترین طبعزاد افسانہ۔ ضخامت ادبی دنیا کے آٹھ صفحات سے زاید اور ۴ سے کم نہ ہو انعام دس روپے

(۲)۔ بہترین طبعزاد ڈرامہ۔ ضخامت مطابق بالا انعام دس روپے

(۳)۔ بہترین مزاحیہ مضمون۔ ضخامت ۶ صفحات سے زاید اور ۳ سے کم نہ ہو۔ انعام سات روپے۔

(۴) بہترین نظم۔ انعام پانچ روپے
(۵) بہترین غزل انعام پانچ روپے
(۶) بہترین رنگین تصویر۔ انعام دس روپے
(۷) بہترین فوٹو۔ انعام پانچ روپے۔
(۸) کتابت و طباعت کی غلطیاں چن کر بھیجنے کے لئے چار روپے۔

اس انعام کی غرض اصلاح نفس ہے۔ ادارہ کو اپنے بے شمار فرائض میں جس مشکل ترین فرض سے سابقہ پڑتا ہے۔ وہ کتابت و طباعت کی غلطیوں کی تصحیح ہے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ مسودے دو دو بار صاف کئے گئے ہیں۔ کاپیاں دو دو دو بار پڑھی گئی ہیں۔ پروف دو دو بار دیکھے گئے ہیں۔ لیکن پھر بھی کاتب مصحح اور سنگ ساز کی متحدہ کوششیں سب ایڈیٹر کی مجاہدانہ سرگرمیوں پر غالب آجاتی ہیں اور جب پرچہ چھپ کر سامنے آتا ہے تو بیچارہ ایڈیٹر سر ندامت جھکانے کے سوا کوئی چارہ نہیں دیکھتا

یہ انعام ان صاحب کو دیا جائے گا جو کتابت کی زیادہ سے زیادہ غلطیاں چن کر بھیجیں گے اور اگر اس ضمن میں کوئی تحریر نہ آئی تو یہ سمجھ کر کہ سالنامہ اغلاط سے پاک ہے یہ انعام کاتب صاحب کو دے دیا جائے گا

منصور گولڈ میڈل

مندرجہ بالا سطور میں کلیم صاحب کی طرف سے جس سنہری تمغے کی پیش کش کا ذکر کیا گیا ہے اس کی نسبت ذیل میں چند لفظ ایسے مضمون نگاروں کی رہبری کے لئے درج کی جاتی ہیں۔

موضوع

مضمون کا موضوع مباحث ذیل میں سے انتخاب کیا جا سکتا ہے:۔

۱۔ اردو کے مندرجہ ذیل شعراء میں سے کسی ایک کی شاعری کا سیر حاصل تجزیہ: میر۔ آتش۔ مومن۔ درد۔ غالب۔ انیس۔ اکبر۔ حالی۔ اقبال۔ حسرت موہانی۔ جوش۔

۲۔ اردو کے موجودہ صاحب طرز انشا پرداز

۳۔ اردو کے ہندو، عیسائی یا یورپین شعراء (انتخاب کلام اور حالات)

۴۔ دہلی، لکھنؤ، حیدرآباد، بہار اور پنجاب میں سے کسی ایک مرکز کی خدمات اردو۔

۵۔ اردو کی درسی کتب میں اصلاح و ترقی کی ضرورت و اس کے اصول۔

۶۔ زبان اور کلچر یا زبان اور سیاست۔

۷۔ اردو کی ڈرامائی تاریخ کا خاکہ۔

۸۔ اردو کی ادبی و سیاسی صحافت پر ایک اجمالی نگاہ۔

۹۔ اردو کی ترقی میں ترجمہ کا حصہ۔

۱۰۔ شمالی ہندوستان کی آئندہ زبان و اس کی علمی و ادبی ممکنات۔

ضخامت

مضمون کی ضخامت ادبی دنیا کے چھ صفحات سے کم اور پندرہ صفحات سے زائد نہ ہو۔

مضمون کا انتخاب

تمام ایسے مضامین جنہیں ادارہ ادبی دنیا سالنامہ کے لئے موزوں سمجھے گا سالنامہ میں طبع کئے جائیں گے اور طبع ہونے والے مضامین میں سے بہترین مضمون کا انتخاب تین اراکین کی ایک کمیٹی کرے گی۔ جو مندرجہ ذیل اصحاب پر مشتمل ہوگی:۔

ایڈیٹر ادبی دنیا۔ علامہ برج موہن صاحب کیفی۔ ملک عطاء اللہ صاحب کلیم یا ان کا نمائندہ خاص۔

اس کمیٹی کا انتخاب قطعی تصور ہوگا اور اس کا فیصلہ ادبی دنیا کے فروری نمبر میں شائع کر دیا جائے گا۔

صلاح الدین احمد

آئینۂ عالم

ہندوستان کا قومی ترانہ

کچھ عرصے سے ہندوستان کے قومی ترانے کا مسئلہ اہل ملک کی توجہ اور دلچسپی کا مرکز بن رہا ہے اور اس کی قریب ترین وجہ ہندوستان کے سات صوبوں میں کانگرسی وزارت کا قیام ہے۔ عام اجتماعات، طلبا کی مجالس اور سیاسی تقریبات کے علاوہ بعض صوبوں کی مجالس قانون ساز میں جلسہ کی کارروائی شروع کرنے سے پہلے کوئی نہ کوئی ترانہ گایا جاتا ہے اور اس بارے میں سب سے زیادہ توجہ بنگالی زبان کے مشہور گیت بندے ماترم کو دی گئی ہے۔

ملک میں قومی ترانہ کی ضرورت کا احساس ایک نہایت مبارک شعور ہے اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ اہل ہند کے دلوں میں قومیت اور وطنیت کا جذبہ روزافزوں ترقی کر رہا ہے۔ اس امر کا اظہار تحصیل حاصل ہے کہ کسی قوم کے جذبات وطن پرستی کے نشو ونما کے لئے ایک ایسا قومی ترانہ بے حد مفید ہوتا ہے جو سرور انگیز ہونے کے ساتھ ساتھ زندگی بخش بھی ہو جس کے ترنم میں آہنگ رزم کی آمیزش ہو اور جو شام ماضی کی رنگینیوں کے ساتھ صبح مستقبل کی درخشانیاں بھی پیش کرے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ جو ترانے اس وقت ہماری قومی مجلسوں میں یا اس قسم کی دیگر تقریبات پر گائے جاتے ہیں۔ وہ مذکورہ معیار سے کس حد تک مطابقت رکھتے ہیں۔ ان ترانوں میں پہلا نمبر "بندے ماترم" کا ہے۔ یہ گیت مشہور بنگالی مصنف بنکم چند چیٹرجی کے ایک ناول آنند مٹھ سے ماخوذ ہے جس میں بھارت پر مسلم حملہ آوروں کی یورش کا افسانہ بیان کیا گیا ہے اور یہ ترانہ گویا اس یورش کے خلاف ایک احتجاج منظوم ہے۔

"بندے ماترم" کے اس پس منظر سے متاثر ہو کر بعض مقامات پر اس کی مخالفت کی گئی اور ایک یونیورسٹی کے اجتماع اور ایک صوبائی اسمبلی کے اجلاس میں اسے مسلم احساسات کے لئے باعث جراحت بیان کیا گیا اور مسلم حاضرین نے اس میں اپنی آوازیں شامل کرنے سے انکار کر دیا۔

ہمیں یہاں اس گیت کے مذکورہ پس منظر سے کوئی بحث نہیں اور نہ ہمیں اس امر سے اتفاق ہے کہ "بندے ماترم" گانے سے لازمی طور پر آنکھوں کے سامنے مسلم ترکتاز اور ہندو مدافعت کا وہ منظر سامنے آ جاتا ہے جو اس گیت کی تصنیف کا محرک ہوا تھا۔ ہندوستان پر اسلامی قبضہ اب ایک بھولی ہوئی کہانی ہے۔ اور ہندو کی جدوجہد آزادی کا رُخ فرنگی استعمار کی چھاؤنی کی طرف ہے۔ مسلم بادشاہت کا قلعہ مدت سے مسمار ہو چکا ہے۔

پس "بندے ماترم" کے نیم تاریخی نیم افسانوی ماحول کو اس کی قبولیت کے راستے میں سدّ راہ نہیں بنایا جا سکتا ہمیں جس چیز پر اعتراض ہے۔ وہ اُس کی صوبائی زبان اور اس کا تنگ اور محدود تخیّل ہے۔ بنگالی زبان بنگال سے باہر نہ بولی جاتی ہے نہ سمجھی جاتی ہے۔ پس اس کا کیا فائدہ ہے اگر ہم آنکھیں بند کر کے ایک نرم اور خواب آور ترنم میں بنگالی زبان کے چند بول ادا کریں اور سمجھ لیں کہ اس گیت سے ہماری روحوں کو بالیدگی حاصل ہو گئی۔ حالانکہ واقعہ اس کے خلاف ہو۔ اس لحاظ سے اقبال کا قومی ترانہ "ہندوستاں ہمارا" "بندے ماترم" پر بہت بڑی حد تک فضیلت رکھتا ہے۔ اس کی زبان عام فہم ہندوستانی ہے جسے ایک طرف پشاور سے لے کر کلکتہ بلکہ سلہٹ تک اور دوسری جانب سری نگر سے بنگلور تک سمجھا جاتا ہے۔ جس بنیادی ہندوستانی کو جواہرلال نہرو ہندوستان کی مشترکہ زبان بنانا چاہتے ہیں۔ وہ اسی

ترانے کی زبان سے بہت مختلف نہیں ہے اور اس کا ماحول احساس وطن پرستی کی وہ صبح ہے جو بیسویں صدی کے آغاز میں مطلع ہندوستان پر نمودار ہوئی اور اس کی روشنی سے ہندو، مسلم، عیسائی، موسائی، گبر و ترسا سب کے سب مخمور ہو گئے۔

تخیل اور زور بیان کے اعتبار سے بھی اقبال کا ترانہ بندے ماترم سے کسی طرح کم نہیں بلکہ اس کی لطیف بندشوں میں ایک مثل ایک روشن ماضی، ایک معیاری وطن پرستانہ ذہنیت اور وطن کے تقدس و عظمت کی ایک دلربا جھلک دیکھئے اور مسحور ہو جاتے ہیں (اگرچہ کہا جا سکتا ہے کہ ضرورت مسحور ہونے کی نہیں بلکہ بیدار ہونے کی ہے) اگر راقم الحروف کی یاد غلطی نہیں کرتی احمد آباد کی کانگرس منعقدہ ۱۹۲۱ء اور اس کے بعد دو تین سال تک کانگرس کی کارروائی کا آغاز بھی اقبال کے ترانہ سے ہی ہوتا رہا۔ اس کے بعد نہ معلوم کیا ہوا کہ اسے یکسر گلدستۂ طاق نسیان کر دیا گیا اور آج اس کا روح پرور نغمہ بہت کم سننے میں آتا ہے۔

جہاں تک کہ ملک کی مقبول عام زبان کا تعلق ہے کسی ذی فہم کو اقبال کے ترانہ کی فضیلت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ تخیل کے لحاظ سے بھی قدیم تر "بندے ماترم" پر "ہندوستاں ہمارا" ایک ترقی پذیر ترمیم ہے۔ اس کا ماحول بھی کسی قسم کی تنگ خیالی و توہمات سے ملوث نہیں۔ ہاں ایک ضروری بات میں دونوں گیت ہماری موجودہ اور مستقبل کی ضروریات کو پورا کرتے نظر نہیں آتے اور وہ ان دونوں میں ایک جارحانہ ذہنیت کا فقدان ہے۔ ہم ایک ایسے دور میں سے گزر رہے ہیں جو سیاسی نقطۂ نظر سے ہمارے لئے موت کے بعد ایک نئی زندگی کا زمانہ ہے۔ جن دنوں ترانہ لکھا گیا تھا اس زمانے میں وہ ہوا جو آج آندھی بن کر عرصہ سیاست میں چل رہی ہے اور بڑے بڑے تناور درخت اکھاڑ پھینکے ہیں، نسیم بہار کا حکم رکھتی تھی۔ وطنیت کا آفتاب طلوع ہو چکا تھا لیکن ابھی اس کی تمازت نے نبرد آزماؤں کے صبر و ہمت کی آزمائش نہیں کی تھی۔ آزادی اخوت اور مساوات کے سحر آگیں لفظوں سے کان آشنا ہو گئے تھے لیکن قید و بند اور دار و رسن کے مکتب میں ان کے معانی کا دل نشیں ہونا باقی تھا۔ پس وہ ترانہ جو صبح زندگی کی جلوہ پاشیوں میں لکھا گیا یا وہ گیت جو پو پھٹنے سے پہلے پچھلی رات کے ہنگامۂ دار و گیر میں گایا گیا۔ اب کہ حیات تازہ کا آفتاب افق سے بہت بلند ہو چکا ہے اور خیال کی جگہ عمل، نظریہ کی جگہ تجربہ اور بحث و تمحیص کی جگہ جد و جہد نے حاصل کر لی ہے۔ ہماری نئی زندگی کے ساز سے ہم آہنگ نہیں ہوتا۔ آج ہمیں ایسے قومی نغمہ کی ضرورت ہے جو ہماری رگوں میں خون گرم کی روانی کو تیز سے تیز تر کر دے جو ہماری منتشر حرکات کو ایک رقص عمل عطا کرے اور جو اپنی جاں پرور موسیقی سے ہماری کسل و ماندگی کو انبساط و تازگی سے بدل دے۔

ناظرین کی سہولت کے لئے ہم یہاں تین نظمیں درج کر رہے ہیں۔ "ہندوستاں ہمارا" اور "میرا وطن" از ڈاکٹر اقبال اور بندے ماترم کا منظوم اردو ترجمہ جو ہمارے محترم دوست حضرت سیماب اکبرآبادی نے کیا ہے۔ ان تینوں کے مطالعے سے ناظرین ان کے حسن و خوبی کا بخوبی اندازہ کریں گے اور امید ہے کہ ہماری اس رائے سے متفق ہوں گے کہ بنگالی بندے ماترم کا قبول کرنا تو ملک کے لئے بحیثیت مجموعی قطعاً ناقابل عمل ہے۔ اس بارے میں انڈین نیشنل کانگرس کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو کی بھی یہی رائے ہے۔

"ہندوستاں ہمارا" موجودہ حالت میں سب سے موزوں اور قابل قبول ترانہ ہے اور ضرورت ہے کہ جب تک ایک معیاری ترانہ ملک کے سامنے نہیں آ جاتا، قومی مجلسوں اور اس قسم کے دیگر اجتماعات و تقریبات کا آغاز اسی ترانہ سے کیا جائے۔ "میرا وطن" بھی ایک نہایت دلکش و دل پسند نظم ہے اور طلبا کے جلسوں اور بچوں کے اجتماعات میں گانے کے لئے بہت موزوں ہے۔

اس ضمن میں ہمیں ایک اور گذارش بھی کرنی ہے۔ ملک کی اس اشد ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا ہمارے ممتاز شعرا اس جانب متوجہ نہیں ہوں گے۔ ہمارا روئے سخن سب سے پہلے حضرت علامہ اقبال کی طرف اور ان کے بعد حضرات جوش، ساغر اور حفیظ کی جانب ہے۔ کیا وہ ملک کے لئے ایک زندۂ جاوید ترانہ لکھ کر لوح ہستی پر ایک نقش دوام ثبت نہیں فرمائیں گے؟

صلاح الدین احمد

میرا وطن

چشتی نے جس زمیں میں پیغامِ حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

یونانیوں کو جس نے حیران کر دیا تھا
سارے جہاں کو جس نے علم و ہنر دیا تھا
مٹی کو جس کی حق نے زر کا اثر دیا تھا
ترکوں کا جس نے دامن ہیروں سے بھر دیا تھا
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

ٹوٹے تھے جو ستارے فارس کے آسماں سے
پھر تاب دے کے جس نے چمکائے کہکشاں سے
وحدت کی لے سنی تھی دنیا نے جس مکاں سے
میرِ عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

بندے کلیم جس کے پربت جہاں کے سینا
نوحِ نبی کا آ کر ٹھہرا جہاں سفینہ
رفعت ہے جس زمیں کی بامِ فلک کا زینہ
جنت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

اقبال

ہندوستاں ہمارا

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا

پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا

گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں
گلشن ہے جن کے دم سے رشکِ جناں ہمارا

اے آبِ رودِ گنگا وہ دن ہیں یاد تجھ کو
اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

اقبال

بندے ماترم

لے سلام اے مادرِ ہندوستاں!

خوشنما دریا ترے بہتے ہوئے اور تیرے پھل ہیں میٹھے رس بھرے

یہ تری ٹھنڈی ہوائیں، یہ سماں،

لے سلام اے مادرِ ہندوستاں!

صاف یہ راتیں تری بھیگی ہوئی یہ سفید اور خوبصورت چاندنی

لہلہاتے کھیت پھل پھلواریاں،

لے سلام اے مادرِ ہندوستاں!

ہے تری آواز نوٹے نل کی آس اور تیری مسکراہٹ میں مٹھاس

اور پیڑوں میں ترے ہریالیاں

لے سلام اے مادرِ ہندوستاں!

اپنے دکھیاروں کو سکھ دیتی ہے تو بھوکے ننگوں کی خبر لیتی ہے تو

تو ہے فرزندوں کی اپنے پاسباں

لے سلام اے مادرِ ہندوستاں!

ہم حفاظت تیری کرنے آئیں گے ہم کروروں فتح تیری گائیں گے

کون کہتا ہے تجھے کمزور ماں

لے سلام اے مادرِ ہندوستاں!

زور بل دھرتی کا کہلاتی ہے تو دشمنوں کی چھاونی ڈھاتی ہے تو

دوستوں کو اپنے دیتی ہے اماں

لے سلام اے مادرِ ہندوستاں!

سیماب اکبرآبادی



شهسوار شهزادها



اجنتا کی مصوری

منصور کی یاد میں

اے مرگ ہائے، ایسا ستم، ہائے، ہائے ہائے
منصور اور کنجِ عدم، ہائے ہائے ہائے

دنیا سے شاہزادۂ "ملکِ قلم" اٹھا
تھی جس کے دم سے بزم میں رونق وہ جم اٹھا

بحرِ فنا میں ڈوب گیا ماہتابِ حسن
آخر گہن میں آ ہی گیا آفتابِ حسن

سر اپنا پیٹنے کے لئے عشق رہ گیا
دل چشمِ اشکبار سے خوں ہو کے بہہ گیا

ماتم میں اس کے سینۂ گل چاک چاک ہے
نکہت کی جا نسیم کے دامن میں خاک ہے

اُگتا ہے لالہ داغ جگر میں لئے ہوئے
اک شمع اس کی قبر پہ روشن کئے ہوئے

خالی ادب کے باغ کا آغوش ہو گیا
مرغ اک ترانہ ریز تھا، خاموش ہو گیا

اُف! خاتمِ زباں کا نگیں تھا جو اٹھ گیا
اُف! انجمن کا صدر نشیں تھا جو اٹھ گیا

ہے آدھی رات سارا جہاں ہے سکوت میں
پروانۂ غریب تپاں ہے سکوت میں

کیا جھلملا رہے ہیں ستارے سپہر کے
جل جل کے بجھ رہے ہیں شرارے سپہر کے

شبنم بھگو رہی ہے شگوفوں کو باغ میں
اشکوں کی مے ٹپک پڑی دل کے ایاغ میں

شاہدؔ گھڑی یہ خوب ہے رونے کے واسطے
بے چین اس کی یاد میں ہونے کے واسطے

مسعود شاہدؔ

ایک فرانسیسی نژاد اُردو شاعر

انیسویں صدی کے آغاز میں اردو شاعری شباب پر تھی۔ گھر گھر شعر و سخن کا چرچا تھا۔ جا بجا مشاعرے ہوتے تھے۔ صدہا یورپین موجود تھے جو ہندوستان کو اپنا وطن بنا چکے تھے، اور چونکہ ہندوستانیوں سے ان کے مخلصانہ تعلقات تھے، اس لیے اکثر ادبی مجلسوں و صحبتوں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں شعر و سخن کا مذاق پیدا ہو گیا اور وہ خود بھی شعر کہنے لگے۔

مغربی النسل اردو شعرا کی کوششوں سے ادب اردو میں جو اضافہ ہوا ہے وہ مخصوص حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ ان لوگوں نے اجنبیوں کی طرح فکرِ سخن نہیں کی۔ "ہندوستانیت" ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی۔ وہ ہندوستانی طرزِ معاشرت کو اختیار کر چکے تھے۔ یہاں کے مشاغلِ تفریح کو بھی انہوں نے اپنا بنا لیا تھا۔ ان میں متعدد حضرات خاں صاحب، نواب مرزا، چھوٹے مرزا، منا صاحب وغیرہ کے عرف سے مشہور رہے۔ اس لحاظ سے انہوں نے جو کچھ لکھا وہ ہندوستانی طرزِ خیال کے مطابق تھا۔ زبان پر انہیں اچھا عبور تھا بعض مواقع پر انہوں نے شاعری کے نکات میں نہایت باریک بینی سے کام لیا ہے۔ اور وہ موشگافیاں کی ہیں کہ داد دئیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ ان کے کلام میں وہ مصنوعی ترکیبیں اور بندشیں بھی پائی جاتی ہیں جو اُس عہد کی شاعری کا طرۂ امتیاز تھیں۔ یہ درست ہے کہ ان کا کلام سقام سے خالی نہیں، تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ اپنے لازمی حدود کے دائرے میں رہ کر انہوں نے قابلِ تعریف کام کیا ہے۔

یورپین شعرائے اردو میں شور (میرٹھی) کا نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے۔ ان کا نام جارج پرنس مِش تھا فرانسیسی النسل تھے۔ فارسی اردو میں اچھی مہارت تھی۔ ان کے چھ اردو دیوان چھپ چکے ہیں، لیکن نایاب ہیں۔ ایک طویل مثنوی بھی چھپ چکی ہے جس میں انہوں نے اپنے ذاتی حالات قلم بند کئے ہیں۔ ان کے والد، جان مِش مستقل طور پر علی گڈھ میں رہتے تھے اور رؤسائے شہر میں ان کا شمار تھا۔ ان کے دادا مرہٹہ فوج رگوا لیار میں کپتان تھے۔ شور کی ولادت علی گڈھ میں ہوئی۔ تاریخ پیدائش یکم دسمبر ۱۸۲۳ء ہے۔

ہندوستانی شرفا سے شور کو بہت ربط ضبط تھا۔ ان کا طرزِ معاشرت ہندوستانی تھا۔ شاعری کی خداداد قابلیت تھی۔ کلام میں شستگی اور دلکشی پائی جاتی ہے۔ مرزا رحیم بیگ رئیس میرٹھ سے تلمذ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شور نے سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں مشق سخن جاری کر دی تھی منشی کریم الدین اپنے "تذکرۃ الشعرا" میں لکھتے ہیں کہ

> "جب میں اپنے مکان پر مشاعرہ کرتا تو وہ اکثر اپنی غزلیں خطوط میں رکھ کر مشاعرہ میں پڑھنے کے لئے بھیجتا تھا۔ اس کے خطوط اس کی دماغی اور علمی قابلیت پر دال ہیں۔ اس کا فارسی کلام بھی خوبیوں سے خالی نہیں دین عیسوی کا پیرو تھا۔ مندرجہ ذیل غزل اُس نے مجھے ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۴ء) میں بھیجی تھی:"

دیر و حرم میں تو نہ دے تدریج زاہدا | سر جس طرف جھکا یا وہی سجدہ گاہ تھی
عاجز تھا ہی جان سے ایسا تو الم عشق | دیکھے سے جس کے حالِ مسیحا تباہ تھی
بل بے یہ بے خودی کہ خودی سے بھلا | درنہ یہ زیست مرگ کی اپنی گواہ تھی

شور کے زمانۂ نوعمری کے حالات معلوم نہ ہو سکے۔ جس مثنوی میں انہوں نے اپنے ذاتی حالات نظم کئے ہیں بڑی تلاش و جستجو کے بعد اس کا ایک نسخہ دستیاب بھی ہوا تو ناقص۔ اس کے شروع اور آخر کے چند اوراق گم ہیں۔ بعض درمیانی اوراق بھی سالم نہیں ہیں۔ تاہم جو کچھ مل گیا وہی غنیمت ہے۔

شور کو تیرنے کی بہت مشق تھی۔ بارش کے ایام میں جب اپنی جاگیر واقع باغپت ضلع میرٹھ پر جانے کا اتفاق ہوتا تھا تو اکثر ہنیڈن ندی

کوتیر کے عبور کرتے تھے۔ رتھ کی سواری کا بہت شوق تھا۔ ان کی پوشش ہندوستانی تھی۔ سر پر دو پلی ٹوپی، عمامہ یا مرہٹی پگڑی، اچکن کے اوپر شالوں پر شیمی و دوشالہ جلوہ گر۔ اکثر کل لباس سفید رنگ کا ہوتا تھا۔ ہر طبقے کے آدمیوں سے ملا کرتے تھے۔ کم درجہ لوگوں کی دل جوئی پر فدا تھے۔

۱۸۹۴ء میں جب شور کا انتقال ہوا تو ضبط میرٹھی نے مندرجہ ذیل الفاظ میں اس واقعے کا اظہار کیا تھا۔

مسٹر جارج پیش صاحب شور، زمیندار ہرچند پور، افسوس کا مقام ہے کہ دو تین دن بیمار رہ کر رہ گرائے عالم جاودانی ہوئے تمام شرفائے شہر میرٹھ عموماً و شعرائے نامدار اور ربان دان عالی وقار کو خصوصاً اس برگزیدہ صفات کا وہ قلق ہوا کہ تحریر کے انداز سے باہر ہے۔ خندہ روئی، خوش مزاجی، خوش خلقی میں یہ نادرہ روزگار عدیم المثال تھا۔ شعر گوئی، شعر فہمی، فصاحت بیانی، طلاقت لسانی میں اپنا آپ ہی نظیر تھا۔ ہندوستانی وضع دل پسند تھی۔ رتھ کی سواری مرغوب تھی۔ اراکین اور رعایائے شہر سے برادرانہ برتاؤ تھا۔ ہنود و اہلِ اسلام سے ملنا قدیم شعار تھا۔

ضبط نے متعدد قطعاتِ تاریخ بھی لکھے تھے۔ مثلاً

شاعرِ خوش خیال شور اے ضبط — گشتہ در لحد بے نشاں اے وائے
از دلِ خلق ایں ندا آمد — شور برخاست از جہاں اے وائے

. . . . .

مرگ سے جارج پیش کے ہر سمت — جوش آہ و فغاں سے شور ہوا
ضبط سر پیٹ کر سخن بولا — وائے رخصت جہاں سے شور ہوا

. . . . .

مر گیا جارج پیش شور اے ضبط — زندگی پر ہے کس کا زور چلا
دونوں ہاتھوں سے چھوڑ کر دنیا — چار سو شور اٹھا کہ شور چلا

. . . . .

شور کو اپنے عہد کے ممتاز شعرا سے کلام کی داد بھی ملتی رہی ہے۔ چنانچہ جب انہوں نے اپنا دیوان ثانی مرتب کیا تو حکیم فصیح الدین رنج نے ذیل کی رباعی ان کے کلام کی تعریف میں کہی جو دیوان کے سرورق پر موجود ہے۔

اے رنج جہاں ہے عیب بینی کے لئے — حالانکہ سخن ہے دلنشینی کے لئے
پردہ ہے گلشنِ فصاحت جس کی — سبحان آنکھ ہے خوشہ چینی کے لئے

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جس مثنوی میں شور نے اپنے ذاتی حالات نظم کئے ہیں، پہلے اس پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے۔ اس سے شور کے حالات کے ساتھ اس عہد کی سوسائٹی پر بھی تھوڑی بہت روشنی پڑے گی۔

شور اگلاس میں تھانیدار تھے۔ وہاں ایک مسلمان تحصیلدار کی تعیناتی ہوئی جن سے کسی بات پر بگاڑ ہو گیا۔ وہ شور سے کھنچنے لگے۔ تحصیلدار صاحب اپنے حلقہ احباب میں "خرانٹ" مشہور تھے۔ چونکہ مُسن اور تجربہ کار تھے اس لئے افسرانِ بالا کے بھی منہ چڑھے تھے جو افسر شور کا مربی تھا رخصت پر چلا گیا۔ ان کی جگہ ایک اور صاحب تشریف لائے تحصیلدار صاحب نے شور کے خلاف ان کے کان بھرے تو وہ مکدر ہو گئے۔ شور سے آنکھیں پھیر لیں۔ شور نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً استعفیٰ پیش کر دیا جس کے منظور ہونے میں دیر نہ لگی۔ چندے علی گڈھ میں قیام کیا، بعد ازاں تلاشِ معاش میں آگرہ پہنچے۔ آگرہ پہنچ کر بھوپال جانے کا قصد کیا تاکہ

. . . . کہیں وہاں کی بیگم سے کچھ برمحل
کہ جس سے نکل آئے شکلِ معاش — مقدم ہے انساں کو اس کی تلاش

مگر مسٹر کانسٹین نے انہیں اس ارادے سے باز رکھا۔ کلکٹر صاحب کانسٹین سے خوش تھے۔ شور کو پولیس میں کام مل گیا۔ کھیڑہ گڈھ کے تھانہ پر تعیناتی ہوئی۔ دو برس تک نہایت خوش اسلوبی سے اپنے فرائض انجام دئے۔ افسرانِ بالا بھی ان کے کام سے بہت خوش تھے وعدہ کیا کہ تحصیلداری عطا فرمائیں گے مگر ہنوز اُس وعدے کے وفا ہونے کی نوبت نہ آئی تھی کہ ایک نئی افتاد پیش آ گئی۔

شور کے نانا، فراسوکونس نے اپنے تمام اعزہ وا قارب سے بیگانگی اختیار کر رکھی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ انہوں نے ایک باگڑی عورت کو گھر میں ڈال لیا تھا اور وہ ان کے مزاج پر اس قدر حاوی تھی کہ بڑے میاں اس کے ہاتھ میں کٹھ پتلی ہو کر رہ گئے تھے وہ انہیں تمام اعزہ سے برانگیختہ کرتی رہی اور اس طرح تقریباً ساٹھ برس تک اس کا طوطی بولتا رہا۔ اب جو فراسو کو اپنے "خاتمہ" کی صورت نظر آنے لگی تو اعزہ کی یاد ایک بار پھر تازہ ہو گئی۔ انہوں نے شور کو متعدد پیام روانہ کئے اور بار بار لکھا کہ میرا آخری وقت قریب ہے، نوکری ترک کر کے فوراً آ جاؤ——

شور نے ساری کیفیت اپنے مربی حاکم سے بیان کی انہوں نے مشورہ دیا کہ "نانا کی باتوں میں آ کر میری تعالی کو نہیں ٹھکرانا چاہئے۔ جب تمہارے نانا کے اختیار میں کچھ ہے ہی نہیں تو تمہیں کیا مل سکے گا، اور ویسے بھی تمہارا حق تمہیں پہلے ہی مل چکا ہے"۔

ایک ماہ کی رخصت لے کر شور اپنے نانا کی خدمت میں حاضر ہوئے انہیں دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے۔ فرمایا کہ میرا چل چلاؤ کا وقت ہے اب مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ، ریاست کو دیکھو بھالو۔

مگر پہلے شادی بھی کر لو ضرور   کہ اس سے نہیں ہو گا از بس گزر

اپنے نانا کے مشورے سے شور علی گڈھ پہنچے اور اپنے والدین سے ساری کیفیت بیان کی۔

علی گڈھ پہنچتے ہی شور کی صحت کے لالے پڑ گئے۔ چھ ماہ تک جاڑے کے بخار میں مبتلا رہے۔ اطبا نے جواب دے دیا۔ اقربا بھی ان کی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے۔ اسی اثنا میں شور کے ایک دوست صادق، چوبے گھنشیام داس مزاج پرسی کو تشریف لائے۔ چوبے جی نے اپنے ہاتھوں ایک دوا تیار کر کے دی۔

بروز سوم اس سے ٹوٹا بخار   بخار ہی گئی ہو کے ناچار خوار
غرض ایک ہی ہفتہ میں تمام شکایتیں رفع ہو گئیں، اور
ہوا غسلِ صحت بہ لطف و خوشی   سبھوں نے مبارک سلامت کہی

ریاست گوالیار میں ایک صاحب سلوا کو ور نامی سر صوبہ تھے۔ ان کا شمار رؤسائے عظام میں تھا۔ وہ بہت نامور اور ذی اختیار تھے۔ انہیں کی پوتی سے شور کی شادی قرار پائی۔ انتظامات مکمل ہو گئے تو نہایت دھوم دھام سے شادی ہوئی، شادی کے رسوم آگرہ میں ادا ہوئے۔ دو روز تک شادی کی محفل

برقص و سرود و شراب و طعام

گرم رہی۔ آٹھویں روز رخصت ہو کر علی گڈھ پہنچے۔ یہاں بھی ایک ہفتہ تک قیام کیا۔ بعد ازاں دولہا دلہن ہرچندپور روانہ ہوئے۔

ہرچندپور پہنچے تو نانا کو وہ دن ہوا روزِ عید، خوب شادیانے بجے اور دھوم دھام ہوئی۔ میرٹھ کی مشہور طوائفوں اور دلی کے نقالوں نے اپنے اپنے کمال کا دل کھول کر مظاہرہ کیا۔

ہوا رقص اور روشنی جابجا   اکھاڑے کا اندر کے آیا مزا
رہا جلسہ یہ آٹھ دن صبح و شام   کسی کو نہ تھا اس سوا اور کام

غزالوں کے چشمے وہ جاری رہے   کہ ہر دم نشے سب پہ طاری رہے
بہت زاہدوں کا بھی ٹوٹا وضو   لنڈھانے لگے وہ سبو پر سبو
رہا لطف جلسہ کا لیل و نہار   کہ ہے آج تک کیف کل یادگار
ہوئی شادی ایسی ہوا شاد دل   طرب سے ہوا خانہ آباد دل
پس جلسہ انعام سب کو دیا   علی قدر سب کے راضی کیا

جلسہ کے بعد تمام اعزہ و اقارب علی گڈھ واپس چلے گئے، اور

. . . . . .   رہے دولہا دلہن فقط در محل
لگے رہنے مصروف با کاروبار   ریاست کے کام آئے پھر دیکھ کا

شادی کو صرف دو ماہ گزرے تھے کہ فتنۂ غدر برپا ہو گیا۔ جان کے لالے پڑ گئے۔ تمام خاندان ہرچندپور سے میرٹھ کو روانہ ہوا، لیکن شور کے نانا بدستور وہیں رہے۔ راستے میں ہنڈن ندی پڑتی تھی۔ ڈونگی یا کشتی کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ باغیوں نے پار اترنے کا کوئی سہارا باقی نہ رہنے دیا تھا۔ مجبوراً چار مشکوں پر ایک کھٹولا باندھا گیا اور اس کے ذریعے سے یہ قافلہ پار اترا۔ میرٹھ میں قدرے امن تھا، کیونکہ باغی دہلی کی طرف روانہ ہو چکے تھے اس کے باوجود طبیعت کو سکون نہ تھا۔ آئے دن نئی نئی خبریں سننے میں آتی تھیں۔ ایک دن خبر ملی کہ ہرچندپور میں بھی باغی پہنچ گئے ہیں، اور لوٹ مار کا بازار گرم ہے۔ فراسو کو باغیوں نے بہت ستایا، اور خزانہ طلب کیا۔ جیسے تیسے جان تو بچ گئی مگر گھر میں جھاڑو سی پھر گئی۔ فراسو کو بہت دنوں میں شفا ہوئی۔

ادھر علی گڈھ کا حال اور بھی ابتر تھا۔ تلنگوں نے لوٹ مچا رکھی تھی۔ شور کے والد نے یہ کیفیت دیکھی تو اعزہ کو ساتھ لے کر کوٹھے پر جا چھپے۔ تلنگوں نے بہت تلاش کیا مگر ان پر نظر نہ پڑی۔ تاہم گھر کی صفائی ہو گئی۔ تھوڑے دنوں بعد پھر افواہ اڑی کہ باغی آ رہے ہیں۔ شور کے والد رات کو گھر سے فرار ہو گئے اور جا کر اپنے دھوبی کے گھر میں پناہ لی۔ دوسرے دن پڈرون صاحب کے یہاں پہنچے۔ لیکن سکون کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ بالآخر شیخ خوش وقت علی، رئیس و زمیندار سہنول نے چاروں کو اپنے گھر میں پناہ دی اور پانچ ماہ تک اپنے یہاں مقیم رکھا۔ جب غدر فرو ہو گیا اور علی گڈھ میں کاکس نامی ایک انگریز جج کا تعین ہوا تو شیخ صاحب چاروں کو ساتھ لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

کہا شیخ صاحب نے لیجئے انہیں   جو ممکن ہوا مدد دیجئے انہیں

جج نے شیخ صاحب کا شکریہ ادا کیا اور سرکار سے ان کی سفارش

کرنے کا وعدہ بھی کیا لیکن شیخ صاحب نے اس کو نامنظور کیا۔ انہوں نے کہا کہ میں نے اپنا انسانی فرض ادا کیا ہے، مجھے اس کا صلہ درکار نہیں! دو ہفتہ کے بعد شور مچا کہ باغی پھر آرہے ہیں۔ کاکس نے آگرے کا رخ کیا اور قلعے میں جا چھپا۔ شور کے والد بھی آگرہ پہنچے، اور رفع دہلی تک وہیں قیام کیا۔

شور نے پھر اپنا کام سنبھالا تھوڑے دنوں بعد خبر ملی کہ فراسو کوکس کا انتقال ہو گیا ہے، اس سے کچھ قبل شور کے بھائی کا انتقال ہو چکا تھا، تازہ صدمہ سے وہ زخم پھر ہرا ہو گیا، رخصت لے کر سر چند پور پہنچے، لیکن اس باگڑی عورت کی طبیعت میں فتور نظر آیا۔ دہلی میں باغیوں نے جب اودھم مچا رکھا تھا تو بہت سے انگریز اپنی جان بچا کر ادھر ادھر فرار ہو گئے تھے، منجملہ ان کے بیس انگریز جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے موضع کھیکڑا میں پہنچے اور رات کو فقیروں کے مہمان رہے۔ صبح ہوئی تو فقیروں نے فراسو کو اس واقعے کی اطلاع دی۔ انہوں نے سواری بھیج کر انہیں اپنے یہاں بلا لیا بعض ان میں زخمی تھے۔ دو تین روز اپنے یہاں رکھا اور حتی الامکان ان کی مدد کی۔ اسی اثنا میں سرکاری فوج کی ایک رجمنٹ وہاں سے گزری تو فراسو نے اس کے ساتھ انہیں بھی روانہ کر دیا۔ فراسو کو اس "خدمت" کے صلے میں گورنر کے دربار سے ایک گراں بہا رقم بطور انعام عطا ہوئی تھی۔ شور کو امید تھی کہ نانا صاحب یہ رقم انہیں کے نام وصیت کر گئے ہوں گے۔ سر چند پور پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ سب کچھ اپنی مدخولہ کے نام پر وصیت کر گئے ہیں۔ اس زمانے میں شور محکمہ پرمٹ میں بسانہ کی چوکی پر مامور تھے، وہ اپنے کام پر واپس گئے، مگر یکایک نصیبوں نے دھکا دیا، کہ پرمٹ سے بھی پھر جدا ہو گیا۔

بات یہ ہوئی کہ جو سپرنٹنڈنٹ تبدیل ہو کر وہاں آیا تھا جب اس نے دیکھا کہ شور کا طوطی بول رہا ہے تو اس نے کمشنر میرٹھ کو متعدد جھوٹی شکائتیں کیں، نتیجہ یہ ہوا کہ شور کی تنزلی کے احکام صادر ہو گئے۔ ہزار کوشش کی کہ کسی طرح یہ بلا ٹل جائے مگر ایک پیش نہ گئی۔ تنگ آ کر شور نے استعفیٰ دے دیا اور سر چند پور چلے گئے۔

فراسو مرحوم کی مدخولہ بظاہر تو شور کی خاطر و مدارات کرتی تھی لیکن در پردہ یہ کوشش تھی کہ ان کے قدم نہ جمنے پائیں، اس کے ساتھ ہی اس نے ایک اور چال چلی۔ جے پور سے رام سنگھ نامی ایک لڑکے کو بلا لیا اور اس کو اپنا بھتیجا ظاہر کیا، اب وہ یہ چاہتی تھی کہ کسی طرح تمام جائیداد رام سنگھ عرف "نان جی" کے نام منتقل ہو جائے۔ مگر شور کی موجودگی نے دونوں کو الجھن میں ڈال رکھا تھا۔ ان حالات سے شور بھی باخبر تھے۔ انہوں نے ان دو کارندوں کو اپنے ساتھ ملایا جن پر تمام کاروبار کا دار و مدار تھا۔ ان میں ایک شیخ علیم الدین تھے اور دوسرے لالہ دیبی پرشاد۔ شیخ صاحب مختار عام تھے۔ شیخ صاحب کے تعلقات شور سے کچھ زیادہ خوشگوار نہ تھے، بلکہ وہ ہمیشہ ان کے خلاف ہی رہا۔ اس نے کسی ذریعے سے کہلایا کہ "حق خدمت" کا وعدہ کرو تو میں جائداد کو رام سنگھ کے نام منتقل نہ ہونے دوں گا۔ اس نے یہ بھی دھمکی دی کہ اگر شور التفات سے کام نہ لیں گے تو ان کے ہاتھ کچھ نہ لگے گا۔ جیسے تیسے شیخ صاحب سے سمجھوتہ ہو گیا۔

شیخ علیم الدین نے سب سے پہلے فراسو مرحوم کی مدخولہ کو سبز باغ دکھائے، اس سے کہا کہ جب تک نواسہ (شور) یہاں مقیم ہے، اس وقت تک خاموش رہئے۔ اس کے جانے کے بعد تمام معاملات حسب دل خواہ طے ہو جائیں گے۔ دوسری طرف شور کے حق میں کارروائی کرتا رہا۔ لالہ دیبی پرشاد نہایت حق بیں اور خیر خواہ تھے۔ طمع سے انہیں سروکار نہ تھا تاہم وہ بھی شور کے حق میں تھے۔ شیخ صاحب نے پٹواری کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ ادھر رام برہمن جو اس باگڑی عورت کا گرو تھا، اس کے دل میں بھی "رام اتر آیا" اور اس نے بھی شور کے حقوق کی حمایت کی۔ الغرض اب تمام عملہ شور کی طرف تھا۔

ایک روز شیخ نے جا کر اس باگڑی عورت سے کہا کہ "میرے خیال میں آپ کے بھتیجے کا یہاں رہنا مناسب نہیں۔ نواسہ چلا جائے تو اسے پھر بلا لیجے گا۔ کیونکہ اگر نواسے کی موجودگی میں کسی قسم کی کارروائی کی جائے گی تو اندیشہ ہے کہ معاملہ عدالت تک پہنچے گا اور مفت کی زیرباری ہوگی نواسہ فکر معاش میں کہیں نہ کہیں ضرور جائے گا، اس وقت سب کچھ ہو جائے گا۔" اس عورت نے اس مشورے پر صاد کیا اور رام سنگھ کو واپس جے پور بھیج دیا۔ مگر وہ خالی ہاتھ نہیں گیا جو کچھ لے جا سکتا تھا لے گیا۔

تھوڑے ہی دنوں میں اس باگڑی عورت پر بھی شیخ علیم الدین کی درپردہ کارروائیوں کا راز فاش ہو گیا، مگر وہ خون کے ایسے گھونٹ پی کر خاموش ہو گئی۔ اب اس کو بھی یقین ہو گیا کہ شیخ کو اپنی طرف ملائے بغیر کچھ نہ ہو سکے گا۔ چنانچہ اس نے بھی وہی روش اختیار کی ایک دن وہ کسی قدر

خوش تھی۔ شیخ نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور اس سے کہا کہ جو کچھ آپ چاہتی ہیں ارشاد فرمائیے۔ میں خفیہ طور پر تمام معاملات کو سلجھا دوں گا اور اس ذرگی بچہ (شور) کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔ اتنا سنتے ہی اس کی باچھیں کھل گئیں۔ اُس نے کہا جو کچھ میں چاہتی ہوں، آپ پر روشن ہے۔ ایسا کیجیے کہ کسی طرح یہ بیل منڈھے چڑھ جائے!

شیخ علیم الدین نے حسب قرار داد سب کچھ شور کے نام لکھ دیا مگر اپنے "حق خدمت" سے غافل نہ رہا یعنی ایک موضع کا دو ثلث اپنے نام اور ایک ثلث لالہ دیبی پرشاد کے نام لکھا۔ دستاویز کا کاتب خوب چند نامی ایک کائستھ تھا اس کو بھی "حصہ" پیش کیا گیا مگر اُس نے لینے سے انکار کر دیا۔ الغرض دو برس میں تمام معاملات سلجھ گئے اور شور اپنے ہواخواہوں کے مشورے کے مطابق وہیں جم گئے۔

اس واقعہ کو زیادہ دن نہ گزرنے پائے تھے کہ وہ بانگڑی عورت چارپائی سے لگ گئی۔ اُس کو کم و بیش ۲۰ سال سے خلل ناف کی شکایت تھی۔ بہت کچھ علاج معالجہ ہوا مگر سب بے سود۔ آخری آٹھ دن اس کے بہت سختی سے گزرے۔ نویں روز پیام اجل آ گیا۔ آخری رسوم اُس کے عقیدے کے مطابق ادا ہوئے۔ اس کے بعد عدالت سے وصیت تصدیق ہو گئی اور شور جائداد پر باقاعدہ قابض ہو گئے۔

شور کے برادر مرحوم کی بیوہ کو ان حالات کی اطلاع ہوئی تو اس نے اپنے نابالغ بچوں کی طرف سے عذرداری داخل کی کہ داخل خارج میں اُن کا نام بھی درج کیا جائے ہرچند پور کے قریب ڈوکہ نامی ایک گاؤں تھا۔ وہاں کی ایک زن فاحشہ شور کی بھاوج کی بھیلی تھی۔ اس نے روبکاری کے لئے دو ہزار کی رقم ولیہ کو دی۔ اپنے بھائی کی وفات پر شور نے اپنے برادرزادوں کو مانگا تھا اور ان کی پرورش و تعلیم کے تمام مصارف برداشت کرنے کا وعدہ کیا تھا مگر بھاوج رضامند نہ ہوئی۔ ایک سال تک مقدمہ چلتا رہا۔ آخر میں باہمی سمجھوتہ ہو گیا۔ دو گاؤں اور ایک مکان برادرزادوں کو دیا گیا لیکن دونوں گاؤں شور کے ٹھیکہ میں رہے۔ قرار پایا کہ برادرزادوں کے سن بلوغ کو پہنچنے تک انہیں ڈیڑھ ہزار سالانہ دیا جائے گا۔ لیکن اس رقم کو بچوں کی والدہ خرد برد کرتی رہی اور اُن کی تعلیم وغیرہ کی مطلق فکر نہ کی۔ سو دونوں لڑکے آوارہ ہو گئے اور کلکتہ کی آزادیوں نے انہیں کہیں کا نہ رکھا۔ بڑا لڑکا اس قدر خودسر نکلا کہ اپنی ماں کی بھی پرواہ نہ کی اور متعلقین کی اجازت و مرضی کے بغیر ایک کم رتبہ یورپین عورت سے شادی کر لی۔ خاندان والوں نے اُس سے ملنا جلنا ترک کر دیا۔ طرہ یہ کہ یہی صاحبزادے شور کے خلاف مخالف ہو گئے۔ شور سے تعلقات تو پہلے ہی ناخوشگوار تھے کیونکہ شور کی معاشرت، لباس، سوسائٹی وغیرہ ہندوستانی تھی اور صاحبزادے پورے "انگریز" بن چکے تھے۔ باہمی میل جول کی گویا کوئی صورت ہی باقی نہ تھی۔ اِدھر اپنی ماں کی باتوں میں آ کر اُس نے شور کے خلاف پھر ایک دعویٰ دائر کر دیا۔ جیسے تیسے یہ معاملات بھی صاف ہوئے۔ لیکن شور کو اپنے برادرزادوں کی تباہی و بربادی کا ہمیشہ قلق رہا۔

شور کے والدین اس وقت تک حیات تھے۔ علی گڑھ میں قیام تھا۔ والد کو نزلہ کی دیرینہ شکایت تھی، حتیٰ کہ اسی سے ان کی آنکھیں بھی جاتی رہیں۔ آنکھیں بنوائیں نور رہی سہی جوت بھی جواب دے گئی۔ آنکھوں کے درد نے بے قرار کر دیا۔ رفتہ رفتہ یہی بے قراری ان کی موت کا موجب ہوئی۔ اس صدمے سے شور کی والدہ بھی نڈھال ہو گئیں۔ اسی دوران میں علی گڑھ میں وبائے ہیضہ پھیلی۔ ان کی والدہ بھی اس کا شکار ہو گئیں۔ مرحومین کی آخری خواہش کے مطابق شور نے انہیں خانہ باغ میں دفن کیا اور قبریں پختہ بنوائیں۔

والدین کی وفات پر شور نے ایک نظم کہی تھی۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

یادگار جہان تھے یہ لوگ ۔۔۔ مغتنم فی زمان تھے یہ لوگ
فیض ان سے ہر اک بشر کو تھا ۔۔۔ مرجع صد جہان تھے یہ لوگ
تھے بزرگ ان کے خاص اہل فرانس ۔۔۔ صاحب خاندان تھے یہ لوگ
اک زمانہ انیس تھا ان کا ۔۔۔ فخر ہندوستان تھے یہ لوگ

نظم کے علاوہ شور نے قطعات تاریخ بھی لکھے تھے جو ان کی قبروں کے تعویذوں پر کندہ کئے گئے۔

تاریخ وفات عالیجاہ مسٹر جان پیش، رئیس کول ضلع علی گڑھ۔

شد ز ہستی عمدۂ اہل فرانس ۔۔۔ آنکہ بودا علی وادنیٰ را جلیس
شور چوں تاریخ رحلت بجُستا ۔۔۔ داد ہاتف مادہ از بس نفیس
یعنی از اعظم برآوردہ الف
گفت گر جان پیش اعظم رئیس ۱۸۴۲ء

تاریخ رحلت جنابہ معظمہ مسز میڈلین پیش صاحبہ رئیسہ علی گڑھ۔

. . . .

تاریخ کا تردد تھا جب کہ شور مجھ کو
ہاتف یہ بول اٹھا باغ بہشت میں ہیں ۱۸۴۲ء

والدین کی وفات کا غم ابھی تازہ ہی تھا کہ ناگاہ شوؔر کی اہلیہ مرض نسواں میں مبتلا ہو گئیں۔

اطبائے حاذق بھی حیران تھے ❊ دوا کرتے کرتے پریشان تھے
مہینوں حکیموں کی دارو رہی ❊ شفا اس سے مطلق نہ حاصل ہوئی

مجبوراً انگریزی علاج کی طرف رجوع ہوئے۔ میرٹھ میں مچل صاحب نامی ایک جاگیردار تھے۔ ان سے شوؔر کے دوستانہ مراسم تھے۔ ڈاکٹر امانت علی کہ

تھا مشتاق اور چیدۂ روزگار

مچل صاحب کی ملازمت میں تھے۔ مچل صاحب کو شوؔر کی پریشانی کا حال معلوم ہوا تو ڈاکٹر امانت علی سے کہا کہ جا کر شور صاحب کے یہاں رہو اور بنہایت توجہ سے بیم صاحبہ کا علاج کرو۔ تین ماہ تک ڈاکٹر امانت علی نے علاج کیا اور مرض میں افاقہ ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب کو "باعزاز و جاہ" رخصت کیا۔ مگر تھوڑے ہی دنوں بعد کرم کنکری نکل آئی۔ پھر وہی تردد و پریشانی اس بار مریضہ کو دہلی لے گئے۔ ایک ماہ تک مشہور حکما کا علاج ہوا، مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ بالآخر مریضہ کو گوالیار بھیج دیا گیا۔ حکیم امیر علی وہاں ایک مشہور طبیب تھے۔ دو برس تک ان کا علاج رہا اور مرض میں اس قدر افاقہ ہو گیا کہ آیندہ دو برس تک کسی قسم کی شکایت نہ ہوئی لیکن دو سال کے بعد مرض پھر عود کر آیا اور مریضہ کو دوبارہ گوالیار بھیج دیا گیا۔

شور صاحب میرٹھ میں تھے۔ تنہائی سوہان روح تھی۔ غم غلط کرنے کے خیال سے انہوں نے بمشورۂ احباب میرٹھ کی مشہور طوائف مغل جان کو پچاس روپے ماہانہ پر ملازم رکھا۔ ہر وقت رقص و سرود کا شغل رہنے لگا۔ مغل جان کی زبان شستہ اور لہجہ درست تھا زیادہ تر وہ شوؔر صاحب کی غزلیں گایا کرتی تھی۔ چند سال یہی کیفیت رہی، نتیجہ یہ ہوا کہ مغل جان قرب و جوار میں مشہور ہو گئی۔ ہر طرف سے اس کو بلاوے آنے لگے۔ وہ بھی اب اغماض سے کام لینے لگی۔ شوؔر نے اس کو برخاست کر دیا۔ اُدھر گوالیار سے خبر آئی کہ

مرض ہے ترقی پہ شام و سحر

شوؔر فوراً گوالیار پہنچے۔ حکیم امیر علی نے کہا بھئی، میں تو علاج کرتے کرتے تھک گیا۔ میری رائے میں تم انہیں آگرہ لے جاؤ۔ آب و ہوا کی تبدیلی بھی مفید ہوگی"۔ مریضہ کو ساتھ لے کر شوؔر آگرہ آئے۔ مرض جنون کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ ڈاکٹر نے مریضہ کا معائنہ کیا اور کہا کہ چار دواؤں کے اثر سے مریضہ پر جنون کی کیفیت طاری ہو گئی ہے۔ سب سے پہلے اُن دواؤں کے اثر کو زائل کرنے کی ضرورت ہے۔ بہرکیف ایک سال انہوں نے بھی علاج کیا مگر جنون کو مطلق افاقہ نہ ہوا۔ ادھر ڈاکٹر نے جواب دیا، ادھر اسی شب مریضہ کا طائر روح پرواز کر گیا (۱۸۷۹ء)

در و بام سے تھی صدا رونے کی ❊ ہمیں پڑ گئی اپنی جان کھونے کی

شوؔر واپس میرٹھ پہنچے مگر بے حد پژمردہ و مضمحل۔ احباب نے اظہار ہمدردی کیا۔ مغل جان بھی پُرسہ کی رسم ادا کرنے کو آئی۔ پھر وہی پرانا رنگ جمانے کی تدبیر ہوئی۔ مگر اب وہ بات نہ تھی، ویسے بھی مغل جان "اب عام طوائف" نہ تھی۔ اب اس کی طرف سے بڑی بڑی فرمائشیں ہونے لگیں جنہیں شوؔر نے عمداً ٹال مٹال دیا۔ جب "لفظی تکرار" تک نوبت پہنچ گئی تو شوؔر نے اُس کو رخصت کر دیا۔ احباب کو اس واقعے سے بڑی حیرت ہوئی اُن کا خیال تھا کہ مغل جان سے کھٹک ہوئے بغیر پیچھا نہ چھوٹے گا۔

مغل جان کی علیحدگی کے بعد شوؔر نے ایک اور طوائف کو ملازم رکھا اس کا نام رمضانو تھا اس سے ایک سال کے اندر ہی اندر طبیعت مکدر ہو گئی۔ اس کو بھی رخصت کیا اور خانہ آبادی کی ازسر نو فکر دامنگیر ہوئی۔ اس سلسلہ میں شوؔر آگرہ و لکھنؤ تک گئے مگر اپنے "میل" کا کوئی گھر نظر نہ آیا ایک روز بیٹھے بیٹھے خیال ہوا کہ گوالیار میں سوائی سکندر کے خاندان سے قرابت بھی ہے۔ کیوں نہ انہیں کے ہاں رشتہ کا ڈول ڈالا جائے۔ مگر رہ رہ کر اپنی کبر سنی کا بھی خیال ہوتا ہے کہ اگر وہاں سے انکار ہوا۔ تو دل کو ملال ہوگا۔ آخر جی کڑا کر کے خط لکھنے کو آمادہ ہوئے سکندر صاحب کا چند سال قبل انتقال ہو چکا تھا۔ ان کی اہلیہ محترمہ حیات تھیں

. . . . ❊ شریف زماں فیض بخش انام
انہیں خط میں لکھا کرم کیجئے ❊ غلامی میں اپنی مجھے لیجئے

گوالیار سے جواب باصواب آیا تو جان میں جان آئی۔ مگر اغیار نے یہاں بھی روڑا اٹکایا۔ جا کر پادری کے کان بھرے کہ دونوں کا بہت قریبی رشتہ ہے۔ لہٰذا شادی نہیں ہو سکتی پادری بھی اُن کی باتوں میں آ گیا معاملہ بشپ صاحب تک پہنچا۔ انہوں نے خوب تحقیقات کی اور جب ثابت ہو گیا کہ قریبی رشتہ نہیں ہے تو شادی کی اجازت دے دی۔

غرض دھوم سے پھر تو شادی ہوئی ❊ نصیب عدو نامرادی ہوئی

شوؔر نے اس تقریب پر خود بھی ایک سہرا کہا تھا۔ ایک شعر ہے ؂

ساقیا دور چلے آج کہ دل خوش ہو مرا ❊ گاؤں گا پی کے برانڈی کا میں ساغر سہرا

دو روز تک گوالیار میں خوب جشن رہا۔ سکھیا طوائف کے گانوں کی دھوم مچ گئی۔ شور نے سکھیا کی تعریف کی ہے۔

وہ گانے کا ڈھنگ اور بتانے کا ڈھنگ   کہ ہو جائے پانی اگر دل ہو سنگ
گلے میں وہ کھٹکا خدا کی پناہ   کہ کھٹکا کرے دل میں شام و پگاہ
اٹھاتی جگر سے تھی جب کوئی تان   چلاتی تھی تیر و سنان تان تان
سنی تان جس کی جو دن اور رین   گئے بھول تان اپنی بھی تان سین
وہ تھے رقص میں اس کے آنچل بل پٹے   کہ زہرہ کے سکعل میں بھی بل پڑ گئے
سروں کی کروں اس کی کیا میں صفات   کہ بے سُر کے مُردوں سے بڑتی نبات
رسیدہ نہ ہوتی سن و سال میں   تو پھنستے جہاں اس کے ہی جال میں
کمال اس کا مجال سے کم نہ تھا   غرض اس کا مجو نحال سے کم نہ تھا

اسی شادی کے تذکرے میں شور بیان کرتے ہیں کہ "ڈومنگو انطون" نامی بھی ایک صاحب شریک جلسہ تھے۔ رشتے میں وہ شور کے بھانجے ہوتے تھے لکھتے ہیں:۔

مہاراج کے وہ نمک خوار ہیں   رسالہ کے افسر ہیں سردار ہیں
ہمارے وطن دار ذی احترام   وطن سردھنہ ان کا عالی مقام
شریک طرب ہمدم انبساط   رہے بزم میں وہ بہ لطف و نشاط
صراحی کا نغمہ سنا خوب سا   پیالہ کا دورہ رہا خوب سا
برادر وہ ایسے ہیں باغ و بہار   ہزاروں میں اک گل ہیں وہ رنگدار

. . . .

کہ سکھیا سے وہ بھی رہے پھر کبھی   نہ پاس آیا دکھ ان کے ہرگز کبھی

چند دیگر احباب کا نام بنام تذکرہ کرکے آخر میں لکھتے ہیں۔

غرض خوب خاطر ہماری ہوئی   تواضع تکلف سے ساری ہوئی
سحر کو جو رخصت ہوئی پھر برات   تو داخل ہوئی آگرہ رات رات

آگرہ میں بھی وہی محفل آرائی ہوئی، اور چار روز کے قیام کے بعد علی گڈھ پہنچے۔ وہاں کے احباب سے ملاقاتیں کرکے میرٹھ پہنچے۔ اس سفر میں کم و بیش ایک ماہ صرف ہوا۔

شادی کے کم و بیش ڈیڑھ سال کے بعد شور کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی تاریخ کہی ہے۔

مژدہ تولید دخت کا سن کر   بج گیا شور شادیانہ کا
یہ تو فرزند کے برابر ہے   متفق قول ہے زمانہ کا
فکرِ تاریخ گر تجھے ہے شور   لکھ دے اس کو چراغ خانہ کا ۱۸۹۱ء

شور نے چھٹی بھی کہی تھی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

خدا نے شور کو بخشی جو نور کی پتلی   تو اس پہ مہر کو لائی پنے نثار چھٹی
دکھایا وقت ضعیفی میں یہ خدا نے دن   زمانہ کہتا ہے ایسی ہو میں بار چھٹی
خوشی رہے گی جو چالیس دن تلک اس کی   تو ہوگی اس پہ بیسو طرح نثار چھٹی
صدا جو بجتی ہے ہنسلی کڑوں کی کانوں میں   ضرور وقت کی لپنے ہے مالدار چھٹی

دو ماہ تک اس ولادت کی خوشیاں منائی جاتی رہیں۔ تمام ملازمین کو نقد پارچہ تقسیم ہوا۔ نو مولود کی نانی کی طرف سے چھوچھک بڑے تکلف اور دھوم دھام سے آئی۔

شور کی ایک بیوہ بہن علی گڈھ میں رہتی تھیں۔ ان کے کوئی اولاد نہ تھی بھائی کی اولاد کو گود لینے کی انہیں بڑی تمنا تھی۔ چنانچہ شور نے اپنی اکلوتی بیٹی ان کے حوالے کر دی۔ بڑے ناز و نعم سے اس کی پرورش ہونے لگی۔ نو ماہ کی ہوئی تو اچانک بیمار ہو گئی۔ کچھ دانتوں کا بھی خرخشہ تھا۔ ڈاکٹر نے جگر پر ورم تشخیص کیا۔ بہت دوڑ دھوپ ہوئی مگر بے کار۔ شور نے نوحہ لکھا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

عمر بھر میں کھلا تھا نخل مراد   تو نے بادِ خزاں اجاڑ دیا
باغباں نے بنا بنا کے چمن   کھیل کی طرح پھر بگاڑ دیا
تھے دلاور جہاں میں ہم بھی بڑے   صدمۂ غم نے پر پچھاڑ دیا
کوہِ غم سے یہ دل بھی بیٹھ گیا   کیا فلک نے مجھے پہاڑ دیا
ٹکڑے دامن کے کہہ گئے ہم نے   کہ گریباں کو ہم نے پھاڑ دیا
صدمۂ شوری کا وہ ہوا ہے شور
پاؤں دنیا سے بھی اکھاڑ دیا

دو سال کے بعد ایک اور لڑکی پیدا ہوئی تو پہلی سالگرہ کے موقعہ پر خوشیاں منائی گئیں، اور علی گڈھ میں نہایت دھوم دھام سے جشن منایا گیا۔

جلالی ضلع علی گڈھ میں سید علی نامی ایک شخص رہتا تھا۔ اگرچہ اس سے شور کے بہت اچھے مراسم تھے مگر اس کے ہاتھوں انہیں بہت نقصان پہنچا۔ اس نے ۴۰ سالہ مراسم کا مطلق لحاظ نہ کیا۔ طمع سے مغلوب ہو کر ان کے درپے آزار ہو گیا، اور ایسے ایسے داؤں پیچ سے کام لیا کہ شور صاحب کو آٹھ دس ہزار کی رقم سے ہاتھ دھونا پڑا۔ شور نے اپنی مثنوی میں ڈھائی سو سے زیادہ اشعار سید علی کی شان میں کہے ہیں، اور اس کے تمام کرتوت اور ہتھکنڈے بیان کئے ہیں۔ شور کو روپیہ کے

جانے کا تو اتنا غم نہ تھا لیکن اس معاملے نے اتنا طول پکڑا تھا کہ خواب و خور حرام ہو گیا تھا۔

ہم بتا چکے ہیں کہ شور سے چھ اردو دیوان یادگار ہیں۔ لیکن وہ اتنے نایاب ہیں کہ ان کی زیارت بھی ممکن نہیں۔ ذیل میں جو انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔ وہ دوسرے، پانچویں اور چھٹے دیوان کا ہے، اور اس کے لئے ہم اپنے محب دلی مسٹر سلیم عابد کے مرہون منت ہیں۔

"بیکسی کا آسرا" ملاحظہ ہو ؎

عدم سے ہستی میں جب ہم آئے، نہ کوئی ہمدرد ساتھ لائے
جو اپنے یاں بنتے ہوئے پرائے، اب آسرا ہے تو بیکسی کا

کسی شاعر نے کہا ہے ع بگڑی بن جاتی ہے جب فضل خدا ہوتا ہے
شور نے یہی خیال اور انہیں الفاظ میں یوں ادا کیا ہے ؎

شور رکھ یاد کہ جب فضل خدا ہوتا ہے   دم میں ہو جاتے ہیں سب بگڑے ہوئے کام درست

زر بر سر فولاد نہی نرم شود کو نظم کیا ہے ؎

انسان تو چیز کیا دل فولاد نرم ہو   دنیا میں سب سے شور زیادہ ہے زر کی چوٹ

موج کی فرضی بے قراری کا فرضی سبب ؎

نہیں ہے موج کو اک دم بھی جو قرار کہیں   بھٹکتی پھرتی ہے دنیا میں کیا حباب کی روح

کنج قفس میں جیسے سلے اڑتا ہے ایسا رنگ   ہر دم بدلتی رہتی ہے مجھ ناتواں کی شکل

چھکا دے سے آج ہمیں جیسے بن پڑے ساقی   گلاب ہی کے دو دم، اگر شراب نہ ہو

روتی ہے اجل بھی دیکھ مجھ کو   فرقت میں یہ حال ہو گیا ہے

کیونکر بسر اوقات کریں اپنی جہاں میں   جینے کی ہے امید نہ مرنے کی خبر ہے

محرومی دیدار کا سبب کیا خوب بتایا ہے یہ خیال کالیداس کے تخیل کا چربہ ہے

اشک باری کے سبب محروم ہوں دیدار سے
بند آنکھیں ہو گئی ہیں آنسوؤں کے تار سے

یوم کلاں ۱۸۷۴ء ؎

روشن ہوئے اعجاز سے جب مردم دیدہ   اس نام پہ آنکھوں سے ہوا صاف اجالا

تہنیت یوم کلاں ۱۸۷۵ء ؎

خدا نے خیریت سے پھر ہمیں یہ دن دکھایا ہے
بڑی امید سے بارے بڑا دن آج آیا ہے

تہنیت عید پاسکوٹ ۱۸۷۶ء ؎

ہے روز عید روزوں کا آج اختتام ہے   عیسائی کیوں نہ خوش ہوں خوشی کا مقام ہے
اے شور آج کھول کے دل تم پیو شراب   سب کہتے ہیں کہ عید کا روزہ حرام ہے

از قطعہ تاریخ مرگ الاپچی، سگ ماده رفیق مسس آنا فسلی ؎

کیا دیکھتے ہو لوگو اس قبر پر تم آ کر   ہاتھوں کا اک کھلونا مٹی میں مل گیا ہے
حسرت سے ہاتھ مل کر آنا سے شور بولے   بیٹھے بٹھائے تم پر یہ کیا غضب ہوا ہے

از رقعہ ہولی بنام احباب بزم ۲۵ فروری ۱۸۷۷ء ؎

شفق نہیں ہے یہ رخ چرخ پر نمایاں یہ   اڑا ہے بن کے گلابی غبار ہولی کا

تہنیت تولید فرزند بخانہ مسٹر اڈمنڈ بڑفیلڈ لفٹنٹ توپخانہ، گوالیار ؎

ہوا اڈمنڈ صاحب کے جو فرزند   بر آئی شور میرے دل کی امید
لب بام فلک سے آئی آواز   چراغ خانہ ہے تاریخ تولید

حمد ؎

جس کو ملا ہے عشق حقیقی کا مرتبہ   قائل نہ ہو گا وہ کبھی کیف مجاز کا
لب پہ ہے گو خیال سے عصیاں کے خامشی   ہے درد دل میں پر اسی نکتہ نواز کا
ارض و سما کی فکر میں اک عمر صرف کی   عقدہ کھلا نہ اس کے نشیب و فراز کا

"نعت مسیح علیہ السلام" ؎

اعجاز کیوں اثر نہ ہو اپنے کلام کا   مداح ہوں مسیح علیہ السلام کا
ہے چرخ پر وہ جب سے کہ مسند نشین ہوا   عرش بریں پہ ناز ہے اس کے مقام کا
میری زباں نہ کیوں ہو کلید در نجات   ہے نام اس کا ورد مری صبح و شام کا
کیوں عرش پر دماغ نہ ہو ناز کا مرے   آقائے پاک چرخ نشیں ہے غلام کا
وہم و خیال کو ہو رسائی کہاں نصیب   زینہ ہے عرش سا اس کے مقام کا
قم کہہ کے مردے دم میں ہزاروں جلا دیئے   کیا معجزہ تھا اس لب معجز نظام کا

اے شور چشم تر کو بنا چشمہ حیات
کر ورد جان و دل سے مسیحا کے نام کا

تو جو اس دفعہ سے منسوب ہوا خوب ہوا   یعنی فرزند خدا خوب ہوا خوب ہوا
حشر میں فخر نہ کیونکر ہو تری امت کو   جان دینا تجھے مرغوب ہوا خوب ہوا
جان دینے میں بھی شکر نہ نکلا منہ سے   صبر میں ثانی ایوب ہوا خوب ہوا

دوسری غزل میں بھی "ایوب" کا قافیہ باندھا ہے ؎

صبر نے نام کیا سلسے جہاں میں میرا
پیرو حضرتِ ایوب ہوا خوب ہوا

"قطرۂ شبنم" کی خجالت پر "گل" کی ہنسی ملاحظہ ہو ؎

دیکھ کر گل بھی چمن میں ہنس پڑا اُس کو وہیں
میرے اشکوں سے خجل جب قطرۂ شبنم ہوا

اس قافیہ ردیف کی ایک غزل اور بھی ہے۔ اس میں بھی "قطرۂ شبنم" باندھا ہے۔ ؎

یا دِ فصلِ گل میں رونے کا عجب عالم ہوا
اشک جو آنکھوں سے نکلا قطرۂ شبنم ہوا

انسان کی شانِ عظمت ؎

کس غضب کا ہے بنا شانِ خدا آدم
کہ فرشتہ کو تمنا ہے میں انساں ہوتا!

"دستِ جنوں" سے لاگ کی لیتے ہیں ؎

روز کیوں رہتا ہے درپے یہ مرے دستِ جنوں
چاک کیا کرتا جو باقی نہ گریباں ہوتا

بے قراری اور انتظار کی انتہا ملاحظہ ہو ؎

تمام عمر نہ آیا قرار دم بھر کو
خدا ہی جانے دل بے قرار میں کیا تھا

کھلی ہیں بعد فنا بھی مزار میں آنکھیں
کسے خبر تھی مرے انتظار میں کیا تھا

مطلع قابلِ داد ہے ؎

جلوہ یہ طور کا مجھے کس نے دکھا دیا
بے خود جو دم میں صورتِ موسیٰ بنا دیا

بالعموم انسان کے دل کی یہ حالت ہوتی ہے کہ دشمن کو بھی مصیبت میں دیکھ کر بھر آتا ہے۔ ؎

کون ہے جس کو مرے حال پہ افسوس نہ ہو
دوست کیا، غیر بھی آئے گا تو رو جائے گا

ذیل کے شعر میں ہاتھ، پہنچے، سر، پاؤں کا تلازم ہے ؎

ہاتھ بھی پہنچے نہ جن کے پاؤں تک
ٹھوکریں کھاتے ہیں وہ سرپاؤں میں

چشمِ گریاں کا زور ملاحظہ ہو ؎

گھٹا دی ایک پل میں آبرو سب ابرِ نیساں کی
خدا آباد رکھے گھر ہماری چشمِ گریاں کا

کس غضب کا نالۂ سوزاں ہے ؎

الٰہی نالۂ سوزاں کہاں سے کر کہاں پہونچا
کہ اس آتش کے پرکالے نے تو کون مکاں پھونکا

سچ ہے ؎

خدا مہرباں ہو تو سب مہرباں ہوں
خدا چاہتا ہے تو سب چاہتے ہیں

بھلے آدمی کی تعریف ؎

ہے بھلا جو بھلا سنے سب کا
اور کسی کا کبھی بُرا نہ سُنے

از تہنیت سالگرہ سوم برخوردار جوزف خلف مسٹر اڈورڈ جونس انسپکٹر پولیس میرٹھ

آتی ہے سال دار جو یہ ساعتِ سعید
عقدہ کھلا ہے یہ کہ عنایت خدا کی ہے

قطعۂ تاریخ فارسی تولید برخوردار سجانہ شور ؎

للہ الحمد در کہن سالی
طرب افزاست شور باغ مراد

شجرِ آرزو ثمر آورد
خانۂ انبساط شد آباد

چمن آرائے گلشنِ کونین
شاہدِ رشکِ حور مہرخ داد

مرزا غالب کی ایک غزل ہے ؎

در خورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا
پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

شور کا مطلع ملاحظہ ہو ؎

عشق میں قابلِ حسرت کوئی مجھ سا نہ ہوا
فردِ کامل ہوں کہ مجھ سا کوئی پیدا نہ ہوا

اسی غزل کے یہ اشعار بھی دیکھئے ؎

وہ مصیبت مری خادم جو کسی جا پہ نہیں
پاؤں دابے ہے وہ فتنہ کہ جو برپا نہ ہوا

وہ اذیت مری ہمدم کہ ہو شاگردِ اجل
غم وہ غمخوار کہ جس غم کا مداوا نہ ہوا

حسرت اس دل پہ کہ جس دل کی نہ حسرت نکلی
گریہ اُس لب پہ جو مشتاقِ ہنسی کا نہ ہوا

چھٹ گئے درد سے سوزش سے قلق سے ہم بھی
فایدہ جان کے نقصان سے کیا کیا نہ ہوا

مرزا نوشہ کی اور بھی چند غزلوں پر شور نے غزلیں کہی ہیں۔ ایک غزل کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

یہ نہ ہوتی غم کی دھڑکی، یہ نہ ہوتی بے قراری
وہ جو ہونا تھا سو ہوتا، ستم ایک بار ہوتا

لب و چشم و سینہ ہر دم ہوئے وقفِ حسرت و غم
نہ یہ اضطراب ہوتا جو نہ انتظار ہوتا

جو خوشی انہیں جان تھی کبھی بھول کر نہ آئی
بُرے وقت میں کوئی بھی نہیں غمگسار ہوتا

ایک مقطع میں اپنے ترکِ وطن کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

اس دل کا ہر ایک نکالا وطن سے بھی
آخر کو شور بے سروساماں نکل گیا

اس غزل کا مطلع اور دو شعر اور ملاحظہ ہوں ؂

کانٹوں کی نگہیں سے جو داماں نکل گیا   دامن کے ساتھ ساتھ گریباں نکل گیا
اللہ ری بیخودی کہ بدن کا نہیں ہے ہوش   دامن نکل گیا کہ گریباں نکل گیا
پھر کا فسوں یہ کیوں ہے مزہ کہ نہیں ہے لوگ   پھر کیوں کھٹک ہے دل میں جو پیکاں نکل گیا

ایک غزل ہے ؂

وحشت نہ کیوں ہو دست بھی دشمن سے جا ملے
ہم خاک ہو کے دشت کے دامن سے جا ملے

اس غزل میں ایک شعر یہ ہے ؂

پتلون کوٹ کا یہ چلن گھر بہ گھر ہوا
سب اہل ہند صاحب لندن سے جا ملے

اشعار ذیل قابل داد ہیں۔ پوری غزل مرصع ہے ؂

جا ملا اس کے روئے انور سے   آئینہ روٹھ کر سکندر سے
چشم مخمور سے ہیں ہم مسرور   دور رہتے ہیں دور ساغر سے
واہ وا دوسرا نہیں تم سا   بولا عکس آئینہ کے اندر سے
نالہ سے اپنے ہے مجھے شکوہ   جو گرجے بھلا وہ کب برسے

ذیل کے دو شعروں میں کیا اچھی باتیں کہی ہیں ؂

نہ وہ سونے میں نہ چاندی میں نہ اکسیر میں ہے
جو مزا خاک میں اور خاک کی تاثیر میں ہے
رفتہ رفتہ جو بڑھے چاہ تو ہے اس کو قیام
نہیں تعجیل میں وہ لطف جو تاخیر میں ہے

ایک غزل میں شورؔ نے خاص طور پر مذہبی جذبات کا اظہار کیا ہے ؂

گناہوں سے جہاں پر کچھ مصیبت ہونے والی ہے
نظر ہے چرخ کی بدلی کچھ آفت ہونے والی ہے
ضعیفی ہے مصیبت ہے غضب کی ناتوانی ہے
بدن سے روح کچھ روزوں میں رخصت ہونے والی ہے
نہ یاروں میں رہی یاری نہ شاہوں میں وفاداری
خدا جانے کہ کیا دنیا کی حالت ہونے والی ہے
بھروسا تو خدا پر رکھ، ہراساں ہو نہ اے غافل
کہ تجھ پہ اس کا فضل اور اس کی رحمت ہونے والی ہے
مسیحا کی شفاعت سے ہمیں امید ہے کامل
وسیلہ سے اسی کے ہم کو جنت ہونے والی ہے

اس قسم کی ایک اور بھی غزل ہے۔ اس کے بھی چند اشعار ملاحظہ ہوں ؂

ترا دیدار خداوند بڑا مشکل ہے   ترے جلوہ کی کسے تاب اور مشکل ہے
ایک آتا ہے یہاں دوسرا جاتا ہے وہاں   سب کو اک دن ہے فنا لطف بقا مشکل ہے
عاشق حق میں جو تکلیف ہے راحت ان کو   ان کی آسان ہر اک روز جزا مشکل ہے
کس نے دیکھا ہے اسی منزل مقصود کو دور   سچ تو یہ ہے بخدا راہ خدا مشکل ہے
یوں تو ہر شخص ہے دنیا میں خدا کا بندہ   ساتھ ایمان کے پر خوف خدا مشکل ہے
اور باتیں تو زمانہ میں ہیں آسان ساری   غور سے دیکھا تو اک طرز وفا مشکل ہے
تم جو مانگو گے خدا سے وہی پاؤ گے ضرور
صدق دل سے گر اے شورؔ دعا مشکل ہے

شورؔ نے رضوان مرادآبادی کی غزل پر مصرعے لگائے ہیں ؂

نے برق کی شوخی ہے نہ چشمک ہے شرر کی   نے نور نگہہ کا ہے نہ تیزی ہے نظر کی
نے حسن شب مہ نہ سپیدی ہے سحر کی   خورشید کا جلوہ نہ تجلی ہے قمر کی
پھیلی ہوئی ہے روشنی روئے مسیحا

بوز مرے اک دم بھی نکلتے نہ دہن سے   اور رنگ یہ کھلتے کبھی اس کے سخن سے
رکھتی نہ غرض رنگ سے ملاب چمن سے   بلبل کو محبت کبھی ہوتی نہ چمن سے
پھولوں میں نہ بس جاتی اگر بوئے مسیحا

ہاں جلوۂ انوار وفا اس کو ملے گا   فیض اثر کیف دعا اس کو ملے گا
لطف ثمر صدق و صفا اس کو ملے گا   تبسیر ہے دیدار خدا اس کو ملے گا
جو خواب میں دیکھے رخ نیکوئے مسیحا

ہر شان سے اک نور کا جلوہ نظر آیا   ہر رنگ سے اک حسن مجلا نظر آیا
حیران ہوں کس سے کہوں میں کیا نظر آیا   اللہ کی قدرت کا تماشا نظر آیا
دیکھا جو کبھی آئینہ روئے مسیحا

چھٹے دیوان کے یہ شعر بھی ملاحظہ کے قابل ہیں ؂

دل گذرگاہ جہاں میں نہیں شاداں میرا   دم ہے مہمان، بدن خانہ مہماں میرا
جس میں سوزش نہ ہو وہ طرز سنانے کی نکال   خود گرِ شعلۂ غم ہے دل سوزاں میرا

خاک پہ چمن چمن میں ہے نشیمن میرا   باغباں میرا نہ گل میرا نہ گلشن میرا
انقلاب ایسا زمانہ میں ہوا ہے اب شورؔ   کل جو تھا دوست ہوا آج وہ دشمن میرا

یہ محبت ہی سے شکوں ہے ہیلنک مرے گھر کی مورت   نہ وہ دیدار کی [illegible] ہو نہ در کی [illegible]

نظر آتا ہے ادھر سارے جہاں کا نقشہ پر دکھائی نہیں دیتی ہے اُدھر کی صورت

ملوانی سخن سے نظر آتی نہیں داں ہاں شرق یہ کہ بات کوئی مختصر نہ ہو
دل کی گشش غضب ہے نالہ ہے پر اثر ممکن نہیں کہ دو میں کسی کا اثر نہ ہو

اپنی عادت ہیں تو تا مرگ وفا سے داخل پر یہ ڈر ہے کہ جفا کی تمہیں خو ہو جائے

کیا کام ہے صیاد اسیروں کا قفس میں یہ ظلم ہے ان کی تو سزا اور ہی کچھ ہے

غیر مناسب نہ ہوگا کہ آخر میں حضرت شوّر کا فارسی کلام بھی نمونتہً پیش کر دیا جائے۔ لہٰذا ایک غزل اور چند رباعیات ملاحظہ ہوں ؎

رُخت مہر درخشانے است گویا لبت لعل بدخشانے است گویا
گل داغت از سر جا یک بسر ا گریبانم حیا بانے است گویا
زبس آشفتگی جمع است در وے فغاں زلفِ پریشانے است گویا
زبس مضمون ابروے تو بستم مرا ہر بیت دیوانے است گویا
زجوشِ گریہ مژگانِ ترِ من رگِ ابرِ بہارانے است گویا
علد بے روے اودر دیدہ من نگہ خارِ مغیلانے است گویا
ز زلفش بر ندارم شوّر دل را
مرا ایں کفرِ ایمانے ست گویا

ہر چند بدل صد ہوسِ خام گزشت در چشم زدن شوّر مے و جام گزشت
زیں عمر دو روزہ کہ دادند افسوس کامے نہ گرفتیم و بنا کام گزشت

پیوست خدائے را اطاعت می کن جان و دلِ خویش صرفِ طاعت می کن
تا صاحبِ آبرو شوی چوں خورشید بانانِ جویں شوّر قناعت می کن

شاداز عدم آمدیم و محزوں رفتیم بادیدۂ زار و دل پرخوں رفتیم
واضح نشدہ، شوّرا دریں دارِ فنا از بہر چہ آمدیم و پس چوں رفتیم

در راہِ رضا خیالِ رہبر کفر است افزوں طلبیدن از مقدر کفر است
سنگِ ستم است دخواہ شمشیرِ جفا سر باز زدن ز حکم داور کفر است

ما از روشِ خلق جدا می گریم گرید نہ کسے چناں کہ ما می گریم
یک بہر پدر گرید و یک بہر پسر بر غفلتِ ایں و آں بسا می گریم

دیدیم بسے بدیدہ آخر بیں ہیچ است ہمہ چہ آسمان و چہ زمیں
اے شوّر چہ پرسی ز ثباتِ عالم دنیا لغنے و اہلِ دنیا کم ازیں

حیرت زدہ از پنبہ بگوشاں مائیم در دہر ہم از خانہ بدوشاں مائیم
از شوّر چہ پرسیم و چہ گوئیم اے وائے دانیم کہ در شہرِ خموشاں مائیم

(جملہ حقوق محفوظ)

پیارے لال شاکر میرٹھی

رباعی

نیند سے سر کبھی تو صنعتی نہ اٹھا
دنیا ری وسر نفس کا پھر افسانہ اٹھا
مرتے اٹھ سانس میں شاوے ساتے جھگڑے
لب تشنہ ہے تشنہ لب نہ پیمانہ اٹھا

سید محمد عسکری طبا طبائی بی اے

غزل

ساقی کا منتہائے نظر پاکے پی گیا مستی میں جھوم جھام کے لہرا کے پی گیا
وہ چشمِ پرعتاب وہ صہبا کی تلخیاں پر اقتضائے شوق سے بل کھاکے پی گیا
میں جانتا ہوں فرق گناہ و ثواب کا لیکن غمِ حیات کو بہلا کے پی گیا
وہ تیری چشمِ ناز کی مستانہ لغزشیں میں جنت و طہور کو ٹھکرا کے پی گیا
اللہ رے سرورِ محبت کی وسعتیں دونوں جہاں نگاہ میں سما کے پی گیا
میں اور تنگ ظرفیٔ پیرِ مغاں کا ڈر ساقی کے التفات کی شہ پاکے پی گیا

کچھ عذرِ کم نگاہیٔ ساقی نہ تھا شمیمؔ
میں ان کی بزمِ ناز میں پھر آ کے پی گیا

شمیم بھیروی

ہریش

ہریش نے اپنی زندگی میں دو ہمدرد پائے۔ ایک تو سرین بابو ــــ اُس کے والد کے ایک ایسے دوست جنہوں نے اتنے امیر ہونے پر بھی اپنے غریب دوست کو کبھی دل سے فراموش نہ ہونے دیا۔ اور دوسرے ان کی لڑکی سرلا ــــ جو ایک بہترین ہمجولی کی طرح ہریش کے ہر دُکھ سُکھ میں شریک ہوتی رہی۔

والدہ کی یاد تو ہریش کے دل میں چند ایک دھندلے سے واقعات سے زیادہ نہ تھی مگر اپنے والد اُسے خوب یاد تھے۔ ان کی زندگی میں بھی سرین بابو اور سرلا کو ہی وہ صرف اپنا خیال کرتا تھا۔ باقی دنیا سے اُسے کوئی سروکار نہ تھا۔ اس کی دنیا بس اتنی ہی تھی۔ نہایت مختصر مگر بے حد پاک۔ جس میں صرف دو جذبات کا راج تھا۔ محبت اور ایثار۔ نفرت دشمنی، حسد، بیر کسی کا وہاں دخل نہ تھا۔ اس مختصر سی دنیا میں ہی وہ بے حد خوش تھا۔ رنج و غم کے وجود کا اُسے علم ہی نہ تھا۔ اس کی دنیا میں پہلا المناک واقعہ والد کی موت تھی۔ زندگی کے آخری لمحات میں انہوں نے سرین بابو سے کہا تھا۔ "میرے بعد بھی ہریش کو ایسا ہی سمجھنا جیسا میری زندگی میں سمجھتے رہے"۔ اور اس کے جواب میں سرین بابو نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں اُن کے سرد ہاتھ لے کر کہا تھا ــــ "میری نظر میں ہریش ایسا ہی ہے جیسی سرلا"۔

اُس کے والد نے ایک دفعہ ممنون نگاہوں سے اُن کی طرف دیکھا۔ محبت سے ان کا ہاتھ ذرا دبایا اور آنکھیں بند لیں۔ ان کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

اُس دن کے بعد سے ہریش سرین بابو اور سرلا کے نزدیک تر ہو گیا۔ اس کی زندگی کی ہر دلچسپی، اس کے دل کی ہر خواہش انہی دونوں کی زندگی سے وابستہ ہو گئی۔ اس کے لئے اگر وہ خوش تھے تو ساری دنیا خوش تھی۔ اگر وہ تکلیف میں تھے تو ساری دنیا غمزدہ تھی اور وہ دونوں بھی اُس کا خیال رکھتے تھے۔ اُسے ایک لمحہ کے لئے بھی محسوس نہ ہوتا تھا کہ اس کی پیدائش اور پرورش اس گھر میں نہیں ہوئی ہے یا اس کی بہ نسبت سرلا کو سرین بابو پر زیادہ حق ہے یا سرین بابو کو اُس سے کم محبت ہے۔ تینوں کی زندگی ایک دوسرے سے اس قدر وابستہ تھی کہ ایک کا غم تینوں کا غم تھا اور ایک کی خوشی تینوں کی خوشی۔

ان کے گھر کے نزدیک ہی سست رفتار گنگا اپنے صاف اور سرد پانی کو خاموشی سے بہائے لئے جاتی تھی۔ چاندنی راتوں میں گنگا کے کنارے کا نظارہ نہایت ہی دلفریب ہوتا۔ ہریش اور سرلا اکثر وہاں بیٹھ کر گھنٹوں بہتے ہوئے پانی سے کھیلا کرتے۔

ایسی ہی ایک رات تھی۔ گنگا کا پانی دھیمے دھیمے بہا جا رہا تھا چاند کی چاندنی اُس میں حل ہو کر اُسے شفاف تر بنا رہی تھی۔ کنارے کے درختوں کی جھکی ہوئی شاخیں بہتے ہوئے پانی کو چوم رہی تھیں۔ ہوا کے سرد جھونکے جسم میں جھرجھری سی پیدا کر رہے تھے۔ نرم نرم ریت پر بیٹھا ہریش دھیمی آواز میں گنگنا رہا تھا۔ "نہ آیا من کا میت۔ عمریا بیت گئی ساری"

کسی نے پکارا "ہریش بھائی!"

گردن پھیر کر ہریش نے دیکھا۔ "تم ہو؟" اُس کے منہ سے نکل گیا۔

"ہاں" سرلا نے کسی قدر افسردگی سے کہا۔ "تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"اس دلفریب نظارے سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔ آؤ تم بھی اس میں شریک ہو جاؤ"۔ سرلا خاموش کھڑی رہی۔

"کیوں!" ہریش نے کہا۔ "کیا اس چاندنی رات میں گنگا کے پانی کی دھیمی آواز۔ ہوا کے سرد جھونکے۔ درختوں کی جھکی ہوئی شاخیں۔ تمہارے دل میں مسرت کی ایک امنگ۔ ایک لہر پیدا نہیں کرتیں"۔

"نہیں" سرلا نے چاند کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "مجھے اس نظارے سے تکلیف ہوتی ہے چاند کی چاندنی گنگا کے پانی کی دھیمی آواز۔ ہوا کے سرد جھونکے درختوں کی جھکی ہوئی شاخیں۔ تمام ہی مجھے

ایک مایوسی نظر آتی ہے۔ ایک ناامیدی کا احساس ہوتا ہے جو میرے دل کو مسلے ڈالتا ہے۔

ہریش نے سرلا کی طرف دیکھا۔ وہ اب بھی چاند کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کا اُس وقت کا اظہار ہریش کی نظر سے پہلے کبھی نہ گذرا تھا۔ اتنا غمگین اور مایوس اُس نے سرلا کو کبھی نہ پایا تھا۔ اس کی اس غیر معمولی مایوسی اور افسردگی کا مطلب وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ جس نے اس کے ساکت دل میں بھی ایک حرکت پیدا کر دی تھی۔ "سرلا" اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "تم کو آج ہو کیا گیا ہے۔ یہ آج تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟"

سرلا چونک پڑی جیسے بے ہوشی کی حالت سے ہوش میں آگئی ہو۔ خوابوں کی دنیا سے گناہوں کی دنیا میں لوٹ آئی ہو۔ خیالات کے سمندر سے باہر کھینچ لی گئی ہو۔ اپنی غیر معمولی مایوسی اور افسردگی کو ہٹانے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے آہستہ سے کہا۔ "بابوجی تم کو تلاش کر رہے ہیں، تم کتنی دیر سے یہاں ہو؟"

"کچھ نہیں کہہ سکتا اس دلکش نظارے سے لطف اندوز ہونے میں میں اتنا محو تھا کہ . . . ."

نہ جانے ہریش اور کیا کیا کہہ جاتا مگر ایک نظر سرلا پر ڈالتے ہی وہ سمجھ گیا کہ وہ کچھ اور ہی دیکھ رہی ہے۔ گویا ہریش کی بات اُس نے سنی ہی نہ تھی۔ اپنے شاعرانہ جذبات کا اظہار کرنے کا ارادہ ترک کر کے وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

اس واقعہ کو کئی روز گذر گئے۔ ہریش ایک روز کالج سے کسی قدر جلد واپس آگیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اُس کی نظر سرلا پر پڑی جو الماری کے سامنے کھڑی کوئی کتاب تلاش کر رہی تھی۔ ہریش کو دیکھ کر سرلا بولی "تم آج جلدی آگئے کیا؟"

"ہاں . . . اور تم؟" ہاتھ کی کتابیں میز پر رکھتا ہوا ہریش بولا۔

"میں تو آج کالج گئی ہی نہیں۔"

"کیوں؟"

"ایسے ہی"

"کیا طبیعت کچھ خراب ہے؟"

"نہیں نہیں۔ طبیعت تو ٹھیک ہے!"

"پھر!"

"یوں ہی دل نہیں چاہتا تھا جانے کو۔"

ہریش نے دیکھا سرلا آج پھر غمگین ہے۔ بات بدلنے کے خیال سے اُس نے کہا۔ "کوئی کتاب تلاش کر رہی تھیں کیا؟ مل گئی! یا میں تلاش کر دوں؟"

"نہیں مل گئی" سرلا نے ایک کتاب دکھاتے ہوئے کہا۔

"ذرا دیکھوں" کہہ کر ہریش نے ہاتھ بڑھایا اور سرلا کے ہاتھ سے کتاب لے کر ورق اُلٹنے لگا۔ کتاب تھی۔ ہال کین کی (Hallcaine) دی بانڈ مین (The Bond Man) کتاب واپس کرتے ہوئے ہریش بولا "خوب کیا زبردست "ٹریجیڈی" آپ نے انتخاب کی ہے۔ کیا تم کو ٹریجیڈی بہت پسند ہے سرلا؟"

"ہاں"

"کیوں"

"اپنی اپنی پسند ہی تو ہے۔"

"مگر تم اتنی افسردہ کیوں رہنے لگی ہو سرلا۔ تم کو یاد ہے۔ اُس روز چاندنی رات کو تم نے گنگا کے کنارے کہا تھا۔ "چاند کی چاندنی گنگا کے پانی کی دھیمی آواز۔ ہوا کے سرد جھونکے۔ درختوں کی جھکی ہوئی شاخیں، تمام میں مجھے ایک مایوسی نظر آتی ہے۔ ایک ناامیدی کا احساس ہوتا ہے جو میرے دل کو مسلے ڈالتا ہے" کیوں کہا تھا نا!"

سرلا نے اٹھ کر جانا چاہا۔ مگر ہریش نے اُسے روک کر کہا۔ "نہیں پہلے میری بات کا جواب دو۔ تم کو یہ ہو کیا گیا ہے۔ تم ایسی باتیں کیوں کہتی ہو؟"

تھوڑی دیر خاموش رہ کر سرلا نے آہستہ آہستہ کہا۔ "کیونکہ اس زندگی کا انجام مایوسی ہی ہے۔ ناامیدی ہی ہے۔ یہ زندگی بھی ایک "ٹریجیڈی" ہے اور زبردست "ٹریجیڈی" ہے اگرچہ انسان اس کو جانتے ہوئے بھی بھلا دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اُس سادہ دل پڑھنے والے کی طرح جو کسی افسانے کو ٹریجیڈی کی طرف جاتا دیکھ کر بھی آخری دم تک اُس کے "کامیڈی" ہونے کی امید ترک نہیں کرتا"

کچھ دیر تک بالکل سناٹا رہا۔ سرلا کی باتوں نے گویا ہریش کو آسمان سے زمین پر پھینک دیا تھا۔ اس کی باتوں کا کوئی مطلب اس کی سمجھ میں نہ آسکا۔ کچھ سنبھل کر اس نے کہا۔ "آخر ان باتوں کا مطلب کیا ہے؟ تمہیں ان خیالات سے واسطہ؟ یہ تو شاعروں اور

ادیبوں کی خیالی پرواز ہے۔ عام انسانوں کو اس میں کیا دخل ! تم ایسی باتیں کیوں کرتی ہو سرلا۔ پہلے تو تم ایسی نہ تھیں۔ اس رات سے ہی تم کو کچھ ہو گیا ہے۔ آخر تم اتنی غمگین کیوں رہنے لگی ہو۔ کچھ بتاؤ بھی تو؟"

اس طویل تقریر کا اثر سرلا پر کچھ بھی نہ ہوا اس کے بہت اصرار کرنے پر بھی سرلا نے اپنی افسردگی کی کوئی وجہ نہ بتائی۔ آخر تنگ آ کر ہریش نے سب حال سرین بابو سے کہہ دینے کا ارادہ کیا۔ اس امید سے کہ شاید وہ اس معمّے کا کوئی حل بتا سکیں۔

دوسرے روز اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے جب ہریش سرین بابو کے پاس گیا تو وہ بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے ہریش کو آتا دیکھ کر اخبار میز پر رکھتے ہوئے وہ بولے "تم آ گئے بیٹا۔ میں خود ہی تم کو بلانے والا تھا۔ ایک نہایت ضروری کام کے لئے ہریش! تم ہمیشہ میری مشکل آسان کرتے رہے ہو۔ دیکھنا ہے اس دفعہ بھی تم کامیاب ہوتے ہو یا نہیں؟"

آنکھوں سے عینک اتار کر۔ رومال سے صاف کرتے ہوئے سرین بابو بولے "سرلا نے بی اے تو پاس کر ہی لیا ہے۔ اب میں اس کی شادی کر دینا چاہتا ہوں"۔

عینک پھر آنکھوں پر چڑھاتے ہوئے وہ کہنے لگے۔" اور اس کے لئے ایک لڑکا بھی میں نے تلاش کر لیا ہے۔ لڑکا کلکتہ کے پریزیڈنسی کالج میں پروفیسر ہے شکل صورت اچھی ہے۔ خاندان شریف ہے مگر . . . "

ہریش کو خاموش دیکھ کر وہ پھر کہنے لگے "مگر سرلا رضامند نہیں ہے اور کیوں نہیں۔ یہ بھی کچھ معلوم نہیں۔ وجہ بتانے کے لئے مجبور کرنے پر رونے لگی اور بولی "میں شادی کروں گی ہی نہیں"۔ اب تم ہی سوچو۔ بیٹا! یہ بھی کبھی ہو سکتا ہے۔ شادی تو ایک نہ ایک روز کرنی ہی ہو گی۔ پھر ادھر ادھر بھٹکنے سے کیا حاصل! میں اُس کا باپ ہوں جو کچھ کروں گا اس کی بہتری کے لئے ہی کروں گا۔ پھر ایسا اچھا موقع..."

"یہ سب درست ہے" ہریش نے کہا "مگر جب سرلا ہی رضامند نہیں تو . . . "

"اُدھر او وہ کوئی وجہ بھی تو نہیں بتاتی۔ وہ ابھی نادان ہے۔ اچھے اور برے میں تمیز نہیں کر سکتی۔ لیکن تم تو بیٹا سمجھ دار ہو۔ تم ہی اُس کو سمجھاؤ۔ تمہارا کہنا وہ ضرور مانے گی تم کو وہ اپنا سچا ہمدرد سمجھتی ہے"۔

ہریش خاموش کھڑا رہا۔ کیا کرنا ہو گا۔ اس کا فیصلہ نہ کر سکا۔ ایک طرف والد کے ہم رتبہ سرین بابو کا لحاظ تھا۔ ادب تھا۔ فرض تھا اور دوسری طرف . . . کیا تھا۔ ہریش کو خود معلوم نہ ہو سکا۔ شاید خود غرضی تھی۔ شاید انسانیت تھی۔ شاید . . . ایک اور طاقت تھی جس کو سمجھنے سے وہ قاصر تھا لیکن جو اُسے اپنی طرف نامعلوم طور پر کھینچ رہی تھی۔ ہریش کو خاموش دیکھ کر سرین بابو اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے "کیا سوچتے ہو بیٹا! جیسے بھی ہو سرلا کو تمہیں سمجھانا ہی پڑے گا۔ اس کی بہتری چاہنا ہی تمہارا فرض ہے۔ تمہارا کہنا وہ کبھی نہیں ٹالے گی"۔ ہریش لاجواب سا ہو کر اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔

شام کو بیٹھا سوچ رہا تھا سرین بابو کہتے ہیں "سرلا تم کو اپنا سچا ہمدرد سمجھتی ہے . . . اس کی بہتری چاہنا ہی تمہارا فرض ہے" . . . مگر کیا اسی میں سرلا کی بہتری ہے . . . ہاں کم از کم سرین بابو تو یہی یقین کرتے ہیں . . . اور ان کی خواہش پر چلنا میرا "فرض" ہے . . . "فرض"! لیکن سرلا کے لئے میرا کوئی "فرض" نہیں ہے! اُس کی اپنی مرضی کے خلاف اُس کو ایک بات پر اپنے ذاتی اثر سے راضی کر لینا۔ کیا بے انصافی نہ ہو گی . . . مگر سرین بابو کا خیال ہے کہ سرلا کی اس میں بہتری ہے . . . اور سرین بابو سرلا کے والد ہیں . . . "

ہریش کچھ فیصلہ نہ کر سکتا تھا۔ یہ اُس کی زندگی کی پہلی مشکل تھی۔ جس میں وہ کسی سے صلاح نہ لے سکتا تھا۔ نہ سرین بابو سے۔ نہ سرلا سے اور اُس کے اپنے اندر دماغ اور دل کی جو کشمکش ہو رہی تھی اُس نے دونوں میں سے کسی کو کسی قابل نہ رکھا تھا۔ اتنے میں دروازہ کھلا۔ سرلا اندر آ کر بولی۔ "کیا سوچ رہے ہو۔ ہریش بھائی؟"

"سرلا" ہریش نے سرلا کی بات کو ان سنی کرتے ہوئے کہا "مجھے تم سے ایک بات پوچھنی ہے"۔

"کیا؟"

کچھ سوچ کر ہریش بولا۔ "اچھا کچھ نہیں۔ پھر کبھی پوچھوں گا"

"اچھا چائے پینے تو چلو"

"چلو"

سرین بابو۔ جب چائے پی کر میز سے اُٹھ گئے تو ہریش سرلا

کی طرف مخاطب ہوا "اچھا، تم سے اب وہ بات پوچھوں؟"

"پوچھو"

"اچھا اس وقت نہیں"

سرلا ہنس پڑی — "تم کرتے کیا ہو۔ آپ ہی سوال۔ آپ ہی جواب پوچھنا ہے تو پوچھتے کیوں نہیں؟"

"اچھا . . . سنو . . . لیکن . . . پھر . . . اچھا یہ بتاؤ . . " اتنا کہہ کر ہریش پھر خاموش ہو گیا — پھر ذرا اپنے کو قابو میں کر کے وہ بولا "باوجی نے تم سے کبھی شادی کے متعلق کچھ کہا تھا؟"

سرلا نے سر جھکا لیا اُس کا چہرہ پہلے سُرخ اور پھر فوراً ہی زرد ہو گیا۔

"مذاق نہیں سرلا۔ ٹھیک ٹھیک جواب دو۔ مجھے باوجی سے سب کچھ معلوم تو ہو ہی گیا ہے۔"

"معلوم ہو گیا ہے تو پوچھتے کیوں ہو؟"

"تمہارے اعتراض کی وجہ جاننے کو۔"

"تم چائے کی دوسری پیالی لو گے نا؟"

"ہاں۔ ہاں۔ مگر پہلے میری بات کا جواب دو۔"

سرلا کو خاموش دیکھ کر ہریش آہستہ آہستہ کہنے لگا "تم شاید نہیں سمجھ رہی ہو سرلا۔ کہ تمہاری اس ضد سے باوجی کو کتنی تکلیف ہو گی۔ اُن کا بڑھاپا ہے اور اس عمر میں زندگی کے آخری ایام میں ان کو تمہارا ہی بھروسہ ہے۔ تمہاری ہی فکر ہے اور تمہیں سے تمام امیدیں ہیں۔ اگر مرنے سے پہلے وہ تم کو سکھی دیکھ سکیں تو وہ کتنی شانتی سے مر سکیں گے برخلاف اس کے اگر آخری وقت ان کو یہی رنج رہا کہ ساری عمر تمہاری ہر بات ماننے پر بھی وہ تم کو اپنی ایک خواہش ماننے پر راضی نہ کر سکے تو ان کو کیسا محسوس ہو گا اور پھر مرتے مرتے بھی یہی خیال رہے گا۔ کہ نہ معلوم اُن کے بعد تمہاری زندگی کیسے گذرے گی۔ تمہاری رہنمائی کے لئے بہترین ہاتھ ایک ایسا انسان جو تم جیسی اچھی لڑکی کی قدر کرنا جانتا ہو۔ ملے گا یا نہیں۔"

سرلا کو خاموش دیکھ کر ہریش نے کہا — آخر تم کو اعتراض کیا ہے؟ کم از کم مجھے تو بتا دو۔ میں تمہاری پوری مدد کرنے کا وعدہ کرتا ہوں سرلا۔ کیا تم کو میرا بھی اعتبار نہیں ہے؟"

سرلا نے سر جھکائے ہوئے ہی جواب دیا — "اعتبار مجھے سب کا ہے۔ مگر میں کیا کروں۔ میں خود فیصلہ نہیں کر سکتی کہ میں کیا کروں"۔

ہریش نے تسلی دیتے ہوئے کہا "تم مجھے وجہ بتاؤ سرلا۔ میں تم کو فیصلہ کرنے میں مدد دوں گا۔" سرلا کسی سوچ میں پڑ گئی کئی دفعہ اُس نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا۔ مگر پھر خاموش ہو گئی۔ گویا جو کچھ وہ کہنا چاہتی تھی کہہ نہیں سکتی تھی۔ آخر ایک طویل خاموشی کے بعد وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور بولی "نہیں میں کچھ نہیں بتا سکتی۔ کسی کو نہیں بتا سکتی مجھے جانے دو"

سرلا جانے لگی۔ ہریش نے ہاتھ پکڑ کر اُسے بٹھاتے ہوئے کہا "آخر ایسی کونسی بات ہے سرلا جو تم کسی کو بھی نہیں بتا سکتیں۔ تم ہی سوچو نہ بتانے سے کام کیسے چلے گا؟" ہریش نے سرلا کو بہت طرح سمجھایا۔ مگر کوئی بات جان نہ سکا آخر اُس نے کہا "اچھا۔ ابھی نہ سہی۔ تم کل تک اس بات پر غور کر لو۔ کل اسی وقت مجھے بتا دینا۔ اچھا؟"

دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ سرلا اس طرح کمرے سے چلی گئی کہ ہریش کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہ ملا۔

دوسرے روز چائے پینے کے بعد سرلا نے اٹھ کر جانا چاہا کہ ہریش نے اُسے روک کر کہا۔ "میری بات کا جواب؟ کیوں بھول گئیں کل کا وعدہ؟"

سرلا چند لمحوں تک خاموش کھڑی۔ پاؤں کے انگوٹھے سے فرش پر لکیریں کھینچتی رہی پھر ایک سانس میں۔ "مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے" کہہ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔

ہریش نے ایسا محسوس کیا گویا کسی نے اس کے منہ پر زور سے ایک طمانچہ مارا ہو۔ تھوڑی دیر تک وہ بے حس بیٹھا کھوئی ہوئی آنکھوں سے اُس دروازے کی طرف دیکھتا رہا جس میں سے سرلا گئی تھی اور تب اٹھ کر اُس نے پکارا "سرلا"۔ مگر کسی نے اُس کی آواز کا جواب نہ دیا

اس بات کو بہت دن گذر گئے۔ ویسے ہی جیسے پہلے گذرتے تھے۔ اسی طرح سورج نکلتا تھا۔ غروب ہوتا تھا۔ سویرا ہوتا تھا۔ رات ہوتی تھی مگر ہریش کے لئے وہ دن پہلے سے دن نہ تھے۔ اُس کی زندگی ہی بالکل بدل گئی تھی۔ اب بھی اکثر چاندنی رات میں گنگا کے کنارے جا کر بیٹھا کرتا مگر پہلے کا سا لطف۔ سکون۔ مسرت۔ اُسے کبھی نصیب نہ ہوتا۔ چاند کی چاندنی میں گنگا کے پانی کی آوازیں۔ ہوا کے سرد

جھونکوں میں درختوں کی جھکی ہوئی شاخوں میں اُسے ایک مایوسی نظر آتی تھی۔ ایک نا امیدی کا احساس ہوتا تھا جو اس کے دل کو مسلے ڈالتا تھا۔ ایک رات ایسے ہی وقت جب سرلا نے اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا تھا تو وہ کتنا حیران ہوا تھا۔ اُس نے سمجھا تھا سرلا پاگل ہو گئی ہے مگر آج اُسے خود بھی ویسا ہی احساس ہو رہا تھا اس کے نزدیک زندگی سوز و غم سے معمور ایک رنجیدہ سی تھی جس میں جگہ جگہ پر مصنف نے جس کو "نست" کہا جاتا ہے۔ عارضی خوشی رکھ کر پڑھنے والے کو اس کے ناامیدی ہونے کی امید دلانے کی رائیگاں کوشش کی تھی۔ تاکہ انسان زندگی سے بیزار نہ ہو جائے اور تب تک زندگی کی جد وجہد سے آزاد نہ ہو سکے۔ جب تک کہ "موت" اُس کی زندگی کا آخری ورق نہ الٹ دے۔

مرلی بابو کے شب و روز البتہ روشن ہو گئے تھے۔ جب سے انہوں نے ہریش کی زبانی سُنا تھا کہ سرلا شادی کے لئے رضامند ہے تب سے ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ سرلا اور ہریش کی دل کی حالت کا کوئی علم اُن کو نہ تھا۔ یہ سب کے لئے باعث مسرت ہوگا۔ اسی یقین میں وہ بڑی امنگ سے شادی کی تیاری کر رہے تھے۔

سرلا کی حالت کا علم ہریش کو بھی نہ تھا۔ جس سرلا کے ساتھ ایک بہترین ہمجولی کی طرح وہ لڑکپن سے کھیلا تھا۔ اُسی سرلا کی کسی بھی حرکت کا مطلب وہ اب سمجھ نہ سکتا تھا۔ وہ ہی سرلا جو کبھی کتنی خوش۔ شوخ اور بھولی تھی۔ اب اتنی خاموش سنجیدہ اور محتاط ہو گئی تھی کہ ہریش کو یقین نہ آتا تھا کہ یہ وہی سرلا ہے جس کو وہ کبھی اپنے اتنا قریب محسوس کرتا تھا اور جو اب اُس سے اس قدر دور معلوم ہوتی تھی کہ اُس کی کوئی حرکت کوئی بات۔ ہریش کی سمجھ میں نہیں آتی تھی ہریش کو ایسا معلوم ہوتا گویا اس نے سرلا کو اپنے ہاتھوں سے دھکیل کر اپنے سے دور کر دیا ہو۔ اور اس فاصلے کا احساس ہریش کو اُسی دن سے ہونے لگا تھا جب سرلا نے اپنا "جواب" دیا تھا۔ اس کے بعد ہریش نے کئی دفعہ کوشش کی کہ وہ اس بارے میں سرلا سے ذکر چھیڑ کر اس "فاصلے" کو دور کرنے کی کوشش کرے مگر سرلا کا سنجیدہ چہرہ اور روکھا سلوک دیکھ کر اس کی ہمت جواب دے دیتی آخر ایک دن اُس نے چائے کی میز پر سرلا سے ذکر کر ہی دیا۔

میرا خیال ہے۔ سرلا کہ جس روز سے تم نے میرے "سوال" کا "جواب" دیا ہے۔ اُس روز سے تم کچھ بدل سی گئی ہو میں محسوس کرتا ہوں گویا تم مجھ سے روز بروز دور ہوتی جا رہی ہو۔

"اب بھول جاؤ۔ ہریش بھائی گذری باتوں کو۔ میرے آگے اب اُن کا ذکر مت کیا کرو"۔

یہ کہہ کر سرلا کچھ اس طرح دوسرے موضوع پر باتیں کرنے لگی کہ ہریش اس بارے میں ایک لفظ بھی اور نہ کہہ سکا۔ مگر اس کے دل کا طوفان اور بھی زور پکڑ گیا۔ لمحہ بہ لمحہ اس کی زندگی ایک ایسے تاریک راستے پر جا رہی تھی جہاں رہبری کے لئے روشنی کی ایک کرن تک نہ تھی۔

سرلا کی شادی سے کئی ماہ پہلے ہریش کو لکھنؤ جانا پڑا۔ وہیں میڈیکل کالج میں پڑھنے کا ارادہ تھا۔ سب سے رخصت ہو کر ہریش سرلا کے کمرے میں گیا۔ دھیرے سے دروازہ کھول کر اس نے اندر جھانکا۔ سرلا کھڑکی کی چوکھٹ کا سہارا لئے شام کے دھندلکے میں کھوئی کھوئی نظروں سے اس طرح باہر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ گویا دور بہت دور کسی چیز کو دیکھنے کی کوشش کر رہی ہو۔

دروازہ کھلنے کی آہٹ پا کر اس نے ہریش کی طرف دیکھا اور تب آگے آکر خاموشی سے ہریش کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ گویا وہ اسی کا انتظار کر رہی تھی اور اب جو کچھ ہریش کہنے آیا تھا اُسے بھی سننے کو تیار تھی کیا کہہ کر بات شروع کرے یہ سوچ نہ سکنے کے باعث ہریش خاموش ہی کھڑا رہا اسے خاموش دیکھ کر آخر سرلا نے ہی اُس کی مشکل آسان کرتے ہوئے کہا "تم جا رہے ہو ہریش بھائی؟"

بھرے ہوئے گلے سے ہریش نے جواب دیا "ہاں"

بہت دیر تک دونوں خاموشی سے سر جھکائے گذرے ہوئے دنوں کا مقابلہ آنے والے دنوں سے کرتے رہے۔

آخر اپنا منہ پھیر کر کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے سرلا نے آہستہ سے کہا "جاؤ"۔

ہریش چلنے لگا۔ مگر سرلا نے روک کر پھر پوچھا "اب کب آؤ گے؟"

اب وہ ہریش کے بالکل قریب کھڑی تھی۔ زمین کی طرف دیکھتے ہوئے ہریش نے جواب دیا۔ "شاید تمہاری شادی پر"۔ اُسی وقت پانی کے دو موٹے موٹے قطرے اُس کے پاؤں کے پاس زمین پر گر پڑے۔ نظر اٹھا کر اُس نے دیکھا۔ سرلا رو رہی تھی۔

کسی قدر گھبرا کر ہریش نے کہا "تم رو رہی ہو سرلا؟"

"ہریش بھائی . . ." سرلا کچھ آگے نہ کہہ سکی۔ دروازے کی چوکھٹ سے سر لگا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ہریش نے اُس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھکر تسلی دیتے ہوئے کہا "سرلا! سرلا!!" مگر اُس کے آنسو کسی طرح نہ رُک سکے۔ جیسے عرصے کا بندھا ہوا بند ایک دفعہ ہی ٹوٹ گیا ہو۔ طبیعت کچھ ہلکی ہونے پر سرلا نے آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "تم کو دیر ہو جائے گی، ہریش بھائی"۔

ہریش امنڈتے ہوئے آنسوؤں کو روکتا ہوا باہر آکر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گاڑی اسٹیشن کی طرف چل پڑی۔ ہریش نے گاڑی سے سر نکال کر دیکھا۔ سرلا کھڑکی کی چوکھٹ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے۔ جاتی ہوئی گاڑی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

جس امید سے ہریش لکھنؤ آیا تھا۔ وہ پوری ہوتی نظر نہ آتی تھی۔ بہت کوشش کرنے پر بھی وہ اپنا دل پڑھائی میں نہ لگا سکا۔ اُس کے دل میں جو طوفان بپا تھا۔ وہ بجائے خاموش ہونے کے کبھی کبھی تو اتنا زور پکڑ جاتا کہ ہریش کو محسوس ہوتا کہ وہ پاگل ہو جائے گا۔ مگر آہستہ آہستہ اُسے اُس سکون اور خاموشی کا احساس ہونے لگا جس کی امید میں وہ یہاں آیا تھا۔ کئی ماہ کے عرصے میں وہ جو کچھ حاصل کر سکا تھا وہ سب کا سب ایک دن اُس سے پھر چھن گیا۔ سرین بابو نے لکھا تھا کہ "سرلا کی شادی اب نزدیک ہی ہے۔ تم جس قدر جلد ہو سکے آجاؤ"۔ جس طوفان کو وہ اتنی مشکلوں سے خاموش کرا سکا تھا۔ اس خبر سے وہ پھر ویسے ہی زور سے امڈ آیا۔ جہاں سے بھاگ کر اس نے یہ خاموشی حاصل کی تھی اُسے اب پھر وہیں جانا ہوگا۔ سرلا سے رخصت ہونے کا منظر ــــ ایک المناک خواب کی طرح اس کی بند آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔

"تم جا رہے ہو . . . ہریش بھائی . . . جاؤ . . . "

سرلا کے الفاظ ہریش کو اب تک یاد تھے اور وہ "آنسو" جن کو بہتا ہوا وہ دیکھ رہا تھا مگر روک نہ سکتا تھا۔ کیا یہی سب کچھ اُسے پھر دیکھنا ہوگا؟ اس خیال سے ہی ہریش کا دل کانپ گیا۔ اُس نے سوچا۔ اسے شادی کون کہتا ہے! یہ تو سرلا کی تمناؤں کا مرثیہ ہوگا۔ تب اسے سرین بابو پر غصہ آیا۔ پھر اُسے اپنا خیال آیا اُس نے سوچا۔ مگر میں بھی تو بے قصور نہیں ہوں۔ کیا میں نے سرلا کو مجبور نہیں کیا تھا! کیا سرلا نے میرے اصرار پر ہی اپنی رضامندی نہیں دی؟ اُس نے سوچا سرلا کی تمناؤں کا خون تو کیا ہی ہے۔ کیا مرثیہ سننے کو بھی موجود رہنا ہوگا؟ مگر نہ جانا بھی ممکن نہیں ہے۔ سرین بابو کیا کہیں گے؟

ضمیر کی اس کھینچا تانی میں کئی روز گذر گئے۔ ایک دن ہریش نے سنا کہ ڈاکٹر ماتھر کچھ طلباء کی پارٹی سی بنا کر ہندوستان کے چند بڑے بڑے ہسپتالوں کو دیکھنے جائیں گے۔ اُس کے دوستوں نے اس کا نام بھی لکھوا دیا۔ ہریش کو معلوم ہوا۔ باہر جانا انہیں دنوں میں ہے۔ جن دنوں میں شادی ہے اُس کو سہارا مل گیا۔ اُس نے سرین بابو کو خط لکھا۔ ڈاکٹر ماتھر اور اُن کے جانے کے بارے میں سب حال بتا کر اُس نے لکھا "ڈاکٹر ماتھر نے جن لڑکوں کو انتخاب کیا ہے۔ ان کو جانا لازمی ہے۔ ان میں میرا نام بھی ہے۔ شادی تک ہم لوگ ضرور واپس آجائیں گے۔ مگر بہت پہلے میں نہ آسکوں گا"۔ پھر اِدھر اُدھر کا حال لکھ کر اس نے اپنی دیر کے لئے معافی مانگی اور خط روانہ کر دیا۔

اگلے ہفتے ہریش اپنی پارٹی کے ساتھ لکھنؤ سے چل پڑا۔ مدراس آکر معلوم ہوا کہ ابھی پندرہ روز سے پہلے وہ واپس لکھنؤ نہیں جا سکتا۔ اور شادی میں ایک ہی ہفتہ رہ گیا تھا۔ مجبوراً اُسے سرین بابو کو خط لکھنا پڑا جس میں اُس نے سب حال اور اپنی مجبوری کا ذکر کر کے دوبارہ معافی مانگی۔ لکھنؤ آکر ہریش کو سرین بابو کا خط ملا جس میں لکھا تھا "شادی بنسی خوشی ہوگئی۔ تمہاری غیر موجودگی سب نے بہت محسوس کی"۔ ہریش اس "سب" کے لفظ کو چند لمحوں تک دیکھتا رہا اور پھر خط جیب میں ڈال اُٹھ کھڑا ہوا۔ لڑکپن کے گذرے ہوئے واقعات ــــ شیریں خوابوں کی طرح اُس کے دل کو گدگدانے لگے۔

گرمی کی چھٹیوں میں ہریش لکھنؤ سے آیا تو سرین بابو گھر پر نہ تھے۔ ہریش کے لئے ایک رقعہ چھوڑ گئے تھے ــــ "سرلا بہت بیمار ہے۔ میں کلکتہ جا رہا ہوں"۔ کسی المناک انجام کے خوف سے ہریش کا دل دہل اٹھا ایک خوفناک تنہائی کے احساس سے وہ پاگل سا ہوگیا۔ مکان کی دیواریں اُس کو ایسی مایوس اور افسردہ معلوم ہوتیں گویا وہ ایک قید خانے میں بند ہے۔ سرلا کے کمرے میں قدم رکھتے ہی اُسے محسوس ہوتا گویا کوئی کہہ رہا ہے ــــ "تم جا رہے ہو۔ ہریش بھاؤ . . . جاؤ . . . !" گنگا کے کنارے بیٹھا وہ گھنٹوں سوچا کرتا کہ اس کی زندگی ایک مختصر سے عرصے میں ہی کتنی تبدیل ہوگئی تھی۔ کہاں وہ روشن سڑک اور کہاں یہ تاریک پگ ڈنڈی جہاں روشنی اور امید کے خیال پر بھی ہنسی آتی تھی۔

سرین بابو کلکتہ سے آئے تو پہچانے نہ جاتے تھے۔ ڈرتے ڈرتے ہریش نے سرلا کی طبیعت کے بارے میں پوچھا۔ ایک لمبی سانس لے کر

وہ بولے ۔۔ مجھے اب معلوم ہوتا ہے ۔بیٹا۔ کہ سرلا کی مرضی کے خلاف اس کی شادی کرکے میں نے اپنی زندگی میں سب سے بڑی غلطی کی ہے جس کا انجام ۔ ۔ ۔ کچھ رک کر وہ بولے ۔ ۔ ۔ ویسے اب وہ اچھی ہے۔لیکن اس کی زندگی کا لمحہ بھر کے لئے بھی اعتبار نہیں تم بھی جا کر اُسے دیکھ آؤ"

کچھ رُکتے ہوئے ہریش نے کہا۔۔"لیکن میرے جانے سے ہی اب ۔ ۔ ۔ کیا ہوگا؟"

"ہوگا کیا؟ سرین بابو نے جواب دیا"ہونے کو اب باقی ہی کیا رہ گیا ہے۔ مگر تب بھی سرلا تم سے ملنا چاہتی ہے اس لئے کہتا تھا کہ تم بھی ہو آؤ"

دوسرے روز ہی ہریش کلکتہ روانہ ہوگیا۔اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے کئی سال میں وہ کلکتہ پہنچا ہو۔ اُس کا سفر ختم ہی نہ ہونے میں آتا تھا۔ اپنا نام بتاتے ہی وہ بڑی خاطر کے ساتھ سرلا کے کمرے میں لے جایا گیا۔ دروازے پر رُک کر ایک نظر اُس نے کمرے میں ڈالی۔ایک طرف پلنگ پر سرلا لیٹی تھی۔آنکھیں بند کئے سرہانے ایک کرسی پر ایک صاحب بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے اور وہاں کوئی نہ تھا۔ کمرے میں بالکل خاموشی تھی ہریش کے پاؤں کی آہٹ پا کر اخبار سامنے سے ہٹا وہ صاحب اٹھ کر بولے "آیئے" کچھ جھجکتا ہوا ہریش پلنگ کے قریب آکر کھڑا ہوگیا"میں کان پور سے آیا ہوں" اُس نے آہستہ سے کہا"اب ان کی طبیعت کیسی ہے"؟

"پہلے سے تو اچھی ہے" کہہ کر وہ صاحب سرلا کی طرف دیکھنے لگے بولنے کی آواز سے سرلا نے آنکھیں کھول دیں۔چند لمحوں تک وہ غور سے ہریش کی طرف دیکھتی رہی اور تب بولی"تم آگئے ہریش بھائی، اچھا ہی کیا۔تم سے ملنے کو میرا بڑا جی چاہتا تھا"

پلنگ کے پاس بیٹھتا ہوا ہریش بولا"تم اچھی ہو جاؤ گی ۔سرلا، گھبراؤ نہیں"

"لیکن گھبراتی تو میں نہیں ہوں ۔ ۔ ۔ مگر تب بھی تم آگئے اس سے مجھے بڑی خوشی ہوئی۔میں سمجھتی تھی ۔ ۔ ۔ تم مجھ سے ۔ ۔ ۔ ناراض ہو گئے ہو ۔ ۔ ۔ مگر تم ہو تو نہیں ؟ ۔ ۔ ۔ ہیں۔ہریش بھائی!"

"نہیں۔نہیں۔ناراض میں تم سے کیوں ہوں گا" ہریش نے بھرّے گلے سے کہا"میں تم سے ناراض ہو سکتا ہوں؟" ہاں۔ہاں۔یہی تو میں بھی سوچتی تھی" ۔ ۔ ۔ پھر اُن صاحب کی طرف دیکھ کر ۔ ۔ ۔ سرلا بولی۔

"یہی میرے ہریش بھائی ہیں ۔ ۔ ۔ جن کا ذکر میں تم سے کرتی تھی" پھر ہریش کی طرف دیکھ کر وہ بولی"یہ میرے پتی ہیں۔ہریش بھائی!"

پھر بہت دیر تک سرلا سب حال ہریش سے پوچھتی رہی۔دو تین روز خوب تسلّی دے کر آخر ہریش واپس آگیا۔سرلا اب پہلے سے اچھی تھی۔ دو تین روز وہ خوب خوش رہی۔ چلتے ہوئے وہ بولی۔۔ اب جارہے ہو۔ہریش بھائی۔اچھا جاؤ۔مگر دیکھو مجھے بھول نہ جانا۔خط ضرور لکھتے رہنا۔اچھا!"

سرلا کے خاوند۔ہری بابو۔۔ اسٹیشن تک ہریش کو چھوڑنے آئے راستے بھر اِدھر اُدھر کی باتیں کرکے وہ ہریش کی افسردگی مٹانے کی کوشش کرتے رہے۔ریل جب چلنے لگی تو ہاتھ ملاتے ہوئے وہ بولے" اچھا ہریش بابو دیکھئے ہمیں بھول نہ جایئے گا"

جواب میں"نہیں نہیں آپ کو بھی کہیں میں بھول سکتا ہوں" کہہ کر ہریش نے کھڑکی سے سر اندر کر اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔ریل تیزی سے سرلا سے دور ہی دور بھاگنے لگی۔

کان پور آئے ابھی پندرہ روز بھی نہیں ہوئے تھے کہ ہریش کا دل بالکل اُکتا گیا۔اُسے کانپور سے نفرت سی ہوگئی۔ اس کے لئے اب وہاں کوئی دلچسپی نہ تھی ۔ وہی کان پور۔وہی مکان تھا۔وہی گنگا تھی اور وہی چاندنی رات۔ ویسے ہی ہوا کے سرد جھونکے جسم میں پھریری سی پیدا کرتے تھے۔ویسے ہی درختوں کی شاخیں بہتے ہوئے پانی کو چومتی تھیں۔مگر ہریش کو اب کسی سے دلچسپی نہ تھی۔چھٹیاں ختم ہونے سے پہلے ہی وہ لکھنو چلا گیا۔

ایک روز چھٹی کے دن وہ بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا کہ نوکر نے ایک خط لاکر دیا۔ہریش نے کھول کر پڑھا۔۔"ہریش بھائی! اب میں اچھی ہوں بالکل اچھی۔آج کل ہم دارجیلنگ میں ہیں۔کتنی اچھی جگہ ہے۔یہ دارجیلنگ کیا بتاؤں۔ہریش بھائی۔تم بہت یاد آتے ہو۔تم بھی ہوتے تو دیکھتے۔ تمہارے بنا کچھ اچھا نہیں لگتا ۔ ۔ ۔"خط ہاتھوں میں دبائے آنکھیں بند کئے ہریش سب کچھ بھول گیا۔وہ شاید اس وقت دوسری ہی دنیا میں تھا جو اس دنیا سے کتنی مختلف تھی۔کتنی اچھی تھی!!!

ایم ایم لقبایا

روحی فداک

ہوں خواب میں یا بیدار ہوں میں
محوِ جمالِ دلدار ہوں میں

دونوں جہاں سے دل بے خبر ہے
وہ دلنشیں اب پیشِ نظر ہے

دلدار بھی ہے خونخوار بھی ہے
نازک کمر میں تلوار بھی ہے

صورت پہ رعب اور دل میں ترحم
چتون میں غصہ لب پر تبسم

ہر آن، ہر شان اس کی عجب ہے
باطن کرم ہے ظاہر غضب ہے

نامِ خدا ہے کیا حسنِ دلخواہ
اللہ، اللہ، سبحان اللہ

دیکھا جو جلوہ اس مہ لقا کا
دل نے صدا دی "روحی فداک"

ہر اک ادا پر قربان ہوں میں
ہر اک نظر میں حیران ہوں میں

سینے کو دیکھوں گردن کو دیکھوں
عارض کو دیکھوں چتون کو دیکھوں

ابرو کو دیکھوں مژگاں کو دیکھوں
خمدار زلفِ پیچاں کو دیکھوں

چشمِ سیہ کو دل میں جگہ دوں
ترچھی نظر کو آنکھوں میں رکھ لوں

ہو جاؤں صدقے سیبِ ذقن پر
یا جان دے دوں شیریں دہن پر

رفتار محشر، قامت قیامت
سر سے قدم تک حسن و نزاکت

میں ایک، سب سے کیونکر نباہوں
کس کس کو چاہوں کس کو نہ چاہوں

اے توبہ توبہ میں اور تری چاہ!
استغفر اللہ، استغفر اللہ

تیری محبت اور میرے دل میں!
یہ پاک جوہر اور آب و گل میں

تو میرا دلدار! اللہ اکبر
میں اور ترا پیار! اللہ اکبر

میں صرف تجھ سے ڈرتا رہوں گا
میں صرف تیری عزت کروں گا

گر اک اشارہ ہو، جان دے دوں
ہے جان کیا شے ایمان دے دوں

ہے آس میری ترے کرم پر
گرتا ہوں ڈر کر تیرے قدم پر

تمثیل

عالم کا منظر پیشِ نظر ہے
ہر ایک ذرہ شمس و قمر ہے

اشجار دیکھوں، انہار دیکھوں!
کہسار دیکھوں گلزار دیکھوں!

ارض و سما کو مسجود سمجھوں؟
شمس و قمر کو معبود سمجھوں!

ہے ایک جلوہ سارے جہاں میں
اور اک مکیں ہے سارے مکاں میں

اک پردے میں ہیں مسجود و ساجد!
واحد میں کل ہے اور کل میں واحد!

امجد حیدرآبادی

مجاہد

وہ جا رہا ہے ایک تنومند نوجواں سینے میں ژرنگال کا طوفاں لئے ہوئے
ظاہر جبیں شوق سے رعب و جلالِ مہر آنکھوں میں برقِ طور کا ساماں لئے ہوئے
نبضِ حیات میں تپشِ خونِ حرّیت بازو میں عزم و شانِ کہستاں لئے ہوئے
بکھرے ہوئے ہیں دوش پر اس کے سیاہ بال صورت میں رنگِ ابرِ بہاراں لئے ہوئے
ہونٹوں پہ ہیں تھرک رہے نغماتِ آتشیں ہر سانس ہے دمِ شررافشاں لئے ہوئے
ساری ہے عضو عضو میں اس کے وطن کا درد رگ رگ میں جذبہ ہائے فراواں لئے ہوئے
ہوتا نہیں ہے جس پہ خزاں کا کوئی اثر سینے میں وہ بہارِ گلستاں لئے ہوئے
نے خوفِ برق و رعد نہ تشویشِ ابر و باد دل میں ہے اپنے عزم کا طوفاں لئے ہوئے

کس شوق سے رواں ہے وہ جادہ نوردِ شوق
دل میں شہید ہونے کا ارماں لئے ہوئے

ساغر جلیلی

انجام

[redacted] گینو آ کی سرحد کو پار کر کے پیسا میں جا آباد ہوا۔ اس وقت اس کی عمر کوئی بائیس سال تھی۔ غریب آدمی تھا اس لئے کرائے کے ایک معمولی مکان میں رہنے لگا۔ بڑا کفایت شعار تھا۔ تھوڑے ہی عرصے میں اپنی قابلیت سے اس نے اپنی زبوں حالی دور کر لی اور چھوٹی چھوٹی رقمیں لوگوں کو سود پر قرض دینے لگا۔ اپنی ذات پر وہ بہت کم روپیہ خرچ کرتا تھا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ چند ہی سال میں وہ امیر کبیر بن گیا۔ جوں جوں اس کی دولت بڑھتی گئی اس کی ہوس زرگری میں اضافہ ہوتا گیا۔ وہ دنیا میں تن تنہا تھا۔ اسے تنہائی کی زندگی ہی مرغوب تھی اور یہ بھی وہ انتہائی رازداری میں بسر کرتا۔ اس کے سیم وزر کے پوشیدہ خزانوں میں دن دوگنی رات چوگنی ترقی ہوتی گئی یہاں تک کہ اس کے خزانوں کے منہ بند ہو گئے۔ روپیہ اسے اس قدر عزیز تھا کہ وہ کسی دوست کی جان بچانے کے لئے بھی اس میں سے ایک پائی تک خرچ کرنے کو تیار نہ تھا۔ اگر تمام دنیا ابدی مصیبت میں مبتلا ہو جاتی اور اس سے کہا جاتا کہ تم چند روپوں کی قربانی کر دو تو دنیا تباہی سے بچ سکتی ہے تو یقیناً وہ صاف انکار کر دیتا۔ اس کی زرپرستی کا شہرہ دور دور جا پہنچا تھا۔ لوگ اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھا کرتے۔ بے چارے کو اسی کنجوسی کا خمیازہ بھی بہت بری طرح سے اٹھانا پڑا۔

ایک دن وہ اپنے ایک کنجوس دوست کے ہاں سے کھانا کھا کر واپس آرہا تھا کہ شب کی تاریکی میں کسی نامعلوم آدمی نے اس پر قاتلانہ حملہ کر دیا۔ اس کے سینے میں چاقو کے گہرے زخم آ گئے اور وہ مدد کے لئے چلانے لگا۔ نامعلوم حملہ آور اپنا کام کر کے چلتا بنا۔

عین اسی وقت طوفان باد و باراں اور ژالہ باری نے قیامت برپا کر دی اور بادلوں سے مہیب گرج کی آواز سنائی دینے لگی۔ اب بے چارے گریالڈی کو ایک نئی مصیبت سے دوچار ہونا پڑا اور وہ کسی اچھی جگہ پناہ لینے کے لئے بھاگنے لگا۔ زیادہ خون بہنے سے اس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں اور طاقت جواب دے رہی تھی۔ اسے ایک مکان میں کچھ روشنی سی نظر آئی۔ دوڑ کر اسی میں گھس گیا۔ یہ فیفیو نام ایک سنار کا مکان تھا۔ وہ اس وقت آگ روشن کر کے کیمیائی تجربات میں مصروف تھا۔ عرصے سے وہ ٹین اور سیسے کو پگھلا کر انہیں سونے یا چاندی میں تبدیل کرنے کا عمل سیکھ رہا تھا لیکن تاہنوز اسے اس میں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ اس کا تمام سرمایہ انہیں تجربات پر صرف ہو چکا تھا۔ آج اس نے بھٹی میں اس قدر آگ جلائی تھی کہ اس کے لئے مکان کا دروازہ بند رکھنا دشوار ہو گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ گریالڈی کو اس کے مکان میں اس آسانی سے پناہ مل گئی۔

سنار نے نظر اٹھا کر دیکھا تو سامنے کنجوس گریالڈی کھڑا تھا۔ وہ اس سے کہنے لگا "کہو دوست اسی تیرہ و تار شب میں تم یہاں کیسے آئے ہو! رات تو بہت زیادہ گذر چکی ہے"۔

کنجوس گریالڈی نے جواب دیا "آہ میرے بھائی میں بیمار ہوں مجھ پر کسی نے قاتلانہ حملہ کر کے مجھے بری طرح سے زخمی کر دیا ہے۔ میں نہیں جانتا مجھ پر کیوں حملہ کیا گیا ہے اور کس نے کیا ہے"! ابھی کنجوس گریالڈی نے اپنا فقرہ پورا کیا ہی تھا کہ طاقت اسے جواب دے گئی وہ دھم سے زمین پر گرا اور اس کی روح پرواز کر گئی۔

فیفیو نے جب دیکھا کہ اس کے قدموں میں ایک لاش پڑی ہے تو فرط وحشت سے اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اس نے سوچا کہ ضرورت سے کم کھانا کھانے کی وجہ سے کنجوس کی طاقت زائل ہو چکی ہوگی اس پر کوئی قاتلانہ حملہ نہیں ہوا۔ لیکن جب اس کے قریب آکر اس نے غور سے دیکھا تو واقعی گریالڈی کا سینہ چھلنی ہو چکا تھا۔ نبض دیکھی تو وہ بھی غائب تھی۔ فیفیو دوڑ کر دروازے سے باہر نکل آیا تاکہ شور مچا کر

ہمسایوں وغیرہ کو بیدار کرے لیکن باہر طوفان نے ایک خوفناک تباہ کاری مچا رکھی تھی۔ بے چارہ بے بسی سے اپنے گھر میں واپس آگیا۔ اس کی بیوی بچا اپنے ننھے لڑکوں کو ساتھ لے کر میکے چلی گئی تھی کیونکہ اطلاع آئی تھی کہ اس کا باپ بستر مرگ پر پڑا آخری ہچکیاں لے رہا ہے۔ پہلے اس نے سوچا کہ طوفان ذرا خاموش ہوتا ہے تو کسی ڈاکٹر کو بلاتا ہوں لیکن جلد ہی اس کا ارادہ بدل گیا۔ اس نے مرنے والے کی واسکٹ کی جیبیں ٹٹولیں۔ ان میں صرف چار آنے تھے ایک دوسری جیب اسے ذرا پھولی ہوئی معلوم ہوئی۔ اس میں سے چیتھڑوں کی ایک ننھی سی گٹھری برآمد ہوئی۔ گٹھری کے اندر چابیوں کا ایک بڑا سا گچھا موجود تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ سونے چاندی کے خزانوں، بڑے بڑے آہنی صندوقوں اور تجوریوں کی چابیاں ہیں۔

فیضیو دل میں سوچنے لگا کہ "میں کیوں نہ یہ چابیاں لے کر جلدی سے اس کے گھر پہنچوں اور جو کچھ وہاں ہے اپنے گھر اٹھا لاؤں۔ ایک بھی متنفس میرے رستے میں حائل نہیں ہوگا۔ اس تیرہ و تار رات میں جبکہ بادل جنگل کے شیروں کی طرح گرج رہے ہیں کس کی جرات ہے کہ باہر آئے۔ نصف سے زیادہ رات گذر چکی ہے تمام لوگ یا تو سو چکے ہیں یا مکانوں میں اس طوفان سے چھپے بیٹھے ہیں۔ میں بھی اپنے مکان میں تنہا ہوں۔ بے چارے گریالڈی کا قاتل بھی سر پہ پاؤں رکھ کر کہیں بھاگ گیا ہوگا سو اگر میں تھوڑی سی ہوشیاری کا ثبوت دوں تو کون جان سکتا ہے کہ گریالڈی پر کسی نے قاتلانہ حملہ کیا اور وہ دوڑ کر فیضیو کے گھر جا داخل ہوا اور وہیں مر گیا اور جو کچھ میں کرنے والا ہوں وہ خلاف اخلاق بھی تو نہیں۔ اگر میں لوگوں کو اصل بات بتاتا پھروں تو بہت ممکن ہے وہ مجھ پہ اعتبار نہ کریں اور میں ہی گریالڈی کا قاتل تصور کیا جاؤں۔ میرے پاس ثبوت ہی کیا ہے کہ وہ خود زخم کھا کر میرے گھر آیا۔ اگر میں قانون کے اجارہ داروں کے چنگل میں پھنس گیا تو یقیناً وہ میری جان لئے بغیر نہیں چھوڑیں گے۔ تو اب سوال یہ ہے کہ ان تمام خطرات سے بچنے کی بہترین ترکیب کیا ہے مثل مشہور ہے قسمت بہادر آدمی کا ساتھ دیتی ہے سو میں بھی بہادر بنوں گا اور اپنے آپ کو تباہی کے اس غار میں گرنے سے بچا لوں گا!"

یہ کہ کر فیضیو نے چابیاں اپنی جیب میں ڈال لیں سمور کا کوٹ پہنا سر پر کچھ اس انداز سے ٹوپی رکھی کہ وہ پہچانا نہ جائے ایک لال ٹین ہاتھ میں لی اور بجی کڑا کر کے کنجوس گریالڈی کے گھر کی طرف چل دیا۔ برف سے لپٹی ہوئی سرد ہوا اس کے منہ پر طمانچے مار رہی تھی اور بادل کی مہیب گرج اس کے دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہتی تھی۔ کنجوس کے گھر کے سامنے پہنچ کر اس نے دو بڑی چابیوں سے اس کا دروازہ کھولا اور اندر جا داخل ہوا۔ سب سے پہلے وہ اس کمرے میں گیا جو مکان کے عقبی حصے میں تھا اور جسے دو بہت بڑے قفل لگے تھے۔ جلد ہی اس نے دونوں قفل کھول لئے اور اندر جا داخل ہوا۔ سامنے کی دیوار کے ساتھ لوہے کا ایک بہت بڑا صندوق پڑا تھا۔ یہ کئی چابیوں کی مدد سے بمشکل کھل سکا۔ فیضیو نے اس کا ڈھکنا اٹھایا۔ سونے کی بیش بہا انگوٹھیوں زنجیروں موتیوں اور ہیرے جواہرات کے انباروں نے اس کی آنکھیں خیرہ کر دیں اس کے بعد اس نے ایک دوسرا صندوق کھولا۔ یہ ایسی تھیلیوں سے معمور تھا جن میں سونے اور چاندی کی ڈلیاں اٹا اٹ بھری تھیں یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہ ابھی پھٹ جائیں گی۔ فیضیو کا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا۔ اس نے دل میں سوچا کہ انگوٹھیاں اور جواہرات کے ہار شاید پہچانے جائیں خالص سونے کی ڈلیاں بہتر رہیں گی۔ چنانچہ اس نے کنجوس کے بستر سے چادر اٹھائی اور اس میں سونے کی دس بارہ تھیلیاں باندھ کر گھر کی طرف چل دیا۔ گھر اس نے اسی طرح مقفل کر دیا اور چابیاں جیب میں رکھ لیں۔ راستے میں اسے ایک بھی آدمی سے دو چار نہ ہونا پڑا۔ بجلی کی ہیبت ناک روشنی بار بار فضائے تیرہ کی نقاب الٹ دیتی تھی اور رعد کڑک کڑک کر اس کے وحشت زدہ دل کو زیادہ مضطرب کر رہی تھی پھر بھی وہ ہمت نہ ہارا اور سر پہ بے پناہ بوجھ اٹھا کر آخر گھر آ ہی پہنچا۔

فیضیو نے سب سے پہلے اپنا لباس تبدیل کیا پھر اپنے طاقتور آہنی بازوؤں میں کنجوس کی لاش اٹھا کر مکان کے سب سے پچھلے کمرے میں لے گیا۔ وہاں اس نے اپنی تمام تر قوت خرچ کر کے کوئی چھ فٹ گہرا گڑھا کھودا کنجوس کی واسکٹ کی جیب میں چابیوں کا گچھا رکھ دیا اور گڑھے میں لاش دفن کر دی۔ پھر کھدی ہوئی جگہ کی مٹی ہموار کر کے اس پر اینٹیں اور چونے کی بوریاں اس طریقے سے رکھ دیں کہ خود اس کی بیوی کو بھی معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ اس جگہ کوئی گڑھا کھودا گیا ہے۔ جب وہ اس کام سے فراغت پا چکا تو اس نے اطمینان سے ایک جگہ بیٹھ کر سونے کی ڈلیاں گننی شروع کیں۔ سونے کی چمکتی ہوئی ڈلیوں کا نظارہ بہت صبر آزما تھا وہ انہیں گنتے گنتے خوشی سے اچھل پڑا۔ ہر تھیلی میں تقریباً

بیس ہیں ہزار روپے کا سونا تھا اور کل بارہ تھیلیاں تھیں۔ اب تمام تھیلیاں وہ ایک تاریک کمرے میں لے گیا اور انہیں ایک صندوق میں رکھ کر کمرے کو باہر سے مقفل کر دیا۔ سب سے آخر میں اس نے وہ چادر جلا ڈالی جس میں وہ سونے کی تھیلیاں باندھ کر لایا تھا۔ یہ تمام کام ختم کر کے وہ اپنے بستر پر لیٹ گیا۔

اب طوفان خاموش ہو چکا تھا۔ صبح ہونے والی تھی۔ فیضیو کا بند بند شب بیداری اور تکان کی وجہ سے دکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اسے نیند آنے لگی اور وہ غافل ہو کر سو گیا۔

جب وہ بیدار ہوا تو سورج نکل آیا تھا۔ اٹھتے ہی اس نے شہر میں گھومنا شروع کیا تاکہ معلوم ہو کہ گریالڈی کے یکایک غائب ہو جانے کے متعلق شہر میں کوئی خبر مشہور ہوئی ہے یا نہیں لیکن نہ تو اس دن نہ دوسرے دن شہر میں گریالڈی کے غائب ہونے کا کوئی چرچا ہوا جب متواتر تین دن تک لوگوں کو گریالڈی اپنے کام پر جاتا ہوا دکھائی نہ دیا تو وہ چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ وہ حیران تھے کہ تین دن سے اس کے مکان کا قفل کیوں نہیں کھلا اور وہ یکایک اس پراسرار طریقے سے کیوں غائب ہو گیا ہے۔ چند دن بعد اس کے دوستوں کی تشویش بڑھنے لگی اور ہوتے ہوتے یہ خبر حکام تک جا پہنچی۔ مختلف لوگوں کی شہادتیں لی گئیں لیکن گریالڈی کی پراسرار گمشدگی کے مسئلے پر کوئی روشنی نہ پڑ سکی آخر عدالت نے فیصلہ کیا کہ کنجوس کے مکان کا قفل توڑ کر اس کا تمام خزانہ بحق سرکار محفوظ کر لیا جائے۔ جب سرکاری آدمیوں نے اس کے مکان کی تلاشی لی تو ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ ہر شے اپنی اپنی اصل جگہ موجود ہے چوری یا ڈاکے کی کوئی واردات رونما نہیں ہوئی تاہم حکومت کی طرف سے دور نزدیک کے شہروں میں اشتہارات تقسیم کر دئے گئے کہ جو شخص گریالڈی کو زندہ یا مردہ پیش کرے گا اسے انعام دیا جائے گا۔ لیکن تمام تحقیق و تفتیش بے کار ثابت ہوئی تین ماہ بعد حکومت کو گینوآ کے خلاف جنگ لڑنی پڑی چنانچہ اس مقصد کے لئے گریالڈی کی تمام جائیداد بحق سرکار ضبط کر لی گئی۔

ان دنوں فیضیو نہایت اطمینان و سکون کی زندگی بسر کر رہا تھا وہ بہت خوش تھا کہ معاملہ بہ آسانی رفع دفع ہو گیا اور اس پر کوئی آنچ نہیں آئی۔ اب اس کی بیوی بھی گھر واپس آ گئی تھی۔ اس نے بیوی کو اس کے متعلق ایک لفظ تک نہ کہا اور نہ کہنے کی ضرورت ہی سمجھی۔ اگر وہ اپنے اس ارادے پر قائم رہتا تو شاید اس کی اور اس کے کنبے کی زندگی اس بری طرح سے تباہ و برباد نہ ہوتی۔ کنجوس کی گمشدگی کا قصہ لوگ تقریباً بھلا چکے تھے ادھر فیضیو نے مشہور کر دیا تھا کہ میں ایک کیمیائی عمل سے ٹین کی چاندی بنانے میں کامیاب ہو گیا ہوں اور چاندی کی ایک کثیر مقدار فروخت کرنے فرانس جانے والا ہوں۔ اور وہاں جا کر اپنے تجربات سے مزید فایدہ اٹھاؤں گا۔ فیضیو کے دوست اس تجویز کے مخالف تھے۔ وہ کہتے تھے کہ تم یہیں رہ کر اپنا کاروبار شروع کرو لیکن اپنی برائی بھلائی کو فیضیو خوب سمجھتا تھا اگرچہ اس کے گھر میں دولت کے انبار لگے تھے تاہم محض دکھاوے کے لئے اس نے اپنی کچھ زمین فروخت کر دی اور لوگوں سے کہا کہ میرے پاس کرایہ بھی نہیں تھا اس لیے زمین فروخت کر دی ہے چنانچہ نصف روپیہ اس نے بیوی کو گھر کے خرچ کے لئے دے دیا اور نصف خود کرائے کے لئے رکھ لیا۔ اس کی بیوی اسے اس نئے عزم سے بہتیرا روکتی رہی لیکن فیضیو نے سنی ان سنی ایک کر دی۔

جب وہ فرانس جانے کے بالکل تیار بیٹھا تھا اس کی بیوی اس کے پاس آئی اور اس کے گلے میں باہیں ڈال کر اور اپنا خوبصورت سر اس کے سینے سے لگا کر زار و قطار رونے لگی۔ "دیکھو ہمیں یوں تنہا چھوڑ کر نہ جاؤ مجھے اس امیری سے غربت اچھی۔ کیا ہماری روزانہ ضروریات پوری نہیں ہو جاتیں۔ نہیں میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔ جا کر تو دکھاؤ!"

فیضیو نے بڑی محبت سے اسے تسلی دی اور کہا کہ میں آتے ہی تمہارے گھر کو سونے سے بھر دوں گا اور تمہاری پچھلی تمام تکلیفات کا ازالہ ہو جائے گا" لیکن بیوی ایک نہ مانی اور کہنے لگی" اگر تمہارے پاس چاندی ہے تو وہ فرانس میں زیادہ مہنگے داموں تو نہیں بکے گی۔ اسے یہیں بیچ دو اور اتنی دور نہ جاؤ۔ تم شاید ہمیں ہمیشہ کے لئے تباہ کرنا چاہتے ہو جو روپیہ تم نے مجھے دیا ہے خرچ ہو جائے گا تو میں کیا کروں گی۔ میں کتنی بدقسمت ہوں۔ کیا میں ان چھوٹے چھوٹے بیکس بچوں کو ساتھ لے کر بھیک مانگتی پھروں گی؟ آہ کیا تم مجھے چھوڑنے جا رہے ہو غم تنہائی اور آنسوؤں کا تحفہ دے کر"

فیضیو کو اپنی بیوی سے بہت محبت تھی۔ وہ اسے اس قدر مضطرب ہوتے نہ دیکھ سکا۔ اس نے اس کے خوبصورت ہونٹوں کو چوم لیا اور

اُسے اس کے نازک بازو سے پکڑ کر ایک بند کمرے میں لے گیا جہاں اس نے اپنی دولت کے انبار چھپا رکھے تھے۔ اس کے بعد اس نے اسے تمام واقعہ من و عن سنا دیا۔ سونے کی چمکتی ہوئی ڈلیوں کو دیکھ کر اس کی بیوی دیوانی سی ہو گئی اور شوہر سے لپٹ کر کہنے لگی "دیکھو مجھے معاف کر دو۔ میں تمہیں اتنا دق کرتی رہی۔ مجھے کیا معلوم تھا تم کوئی اتنا اچھا کام کرنے والے ہو"

فیفیو نے اپنی بیوی سے یہ قول لینے کے بعد کہ وہ اس کا کوئی راز افشا نہ کرے گی اسے اپنے مستقبل کے ارادوں سے آگاہ کیا اور بتایا کہ میں جلد ہی واپس آ جاؤں گا اور جلد ہی دولت کے انبار ہماری زندگی کو رشک جنت بنانے والے ہیں۔ اب اس کی بیوی نے بخوشی اسے جانے کی اجازت دے دی۔ فیفیو نے بھی جاتی دفعہ اس کا منہ چومتے ہوئے کہا "دیکھو مجھے بھول نہ جانا میں جلد ہی واپس آ جاؤں گا"

دوسرے دن خزانے کا بہت سا حصہ گھر چھوڑ کر سونے کی کچھ تھیلیاں لے کر وہ جہاز میں سوار ہو گیا۔ بندرگاہ پر اس کے تمام دوست اسے الوداع کہنے آئے تھے اور اس کے جانے پر افسوس کر رہے تھے۔ بیوی بھی جھوٹ موٹ اُن کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھی اور بظاہر شوہر کو خوب کوس رہی تھی کہ وہ کیوں ایسی بوالعجبی کر رہا ہے۔ تمام شہر فیفیو کی تجویز کا مضحکہ اڑا رہا تھا اور بعض تو یہ کہتے تھے کہ فیفیو زیادہ محنت کی وجہ سے پاگل ہو گیا ہے۔ بعض کہتے تھے کہ بے چارے کے باپ دادا بھی نسخۂ اکسیر بناتے بناتے تباہ حال اور دیوانے ہو گئے تھے۔

اب اس بے چارے کا بھی انجام آ پہنچا ہے۔ فیفیو نے ان نکتہ چینیوں کی کوئی پروا نہ کی اور اپنے سمندری سفر پر روانہ ہو گیا۔ جب جہاز مارسیلز پہنچا تو فیفیو نے علم کیمیا سے متعلق اپنا وہ تمام سامان جن کی مدد سے وہ نت نئے تجربات کیا کرتا تھا سمندر میں پھینک دیا۔

بندرگاہ پر اترتے ہی اس نے چند مزدوروں سے اپنا سامان اٹھوایا اور شہر لیاونز میں جا پہنچا۔ وہاں اس نے سونا فروخت کر کے اس سے حاصل شدہ تمام رقم ایک بنک میں جمع کرا دی اور یہاں کے بنک والوں نے اس کا حساب پیپلز بنک کے نام منتقل کر دیا۔ یہ تمام کام ختم کر کے اس نے بیوی کو خط لکھ دیا کہ میں نے اپنی تمام چاندی فروخت کر لی ہے اور عنقریب پیسا واپس آنے والا ہوں۔

یہ خط فیفیو کی بیوی نے اپنے باپ اور فیفیو کے دوستوں اور رشتہ داروں کو دکھایا۔ بعض تو یہ خط پڑھ کر بہت ہی حیرت زدہ ہوئے اور بعضوں نے کہا کہ فیفیو تباہ ہو چکا ہے اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے اور وہ بہکی بہکی باتیں کرنے لگا ہے عنقریب سب لوگوں کو اس کا علم ہو جائے گا۔

چند دن بعد فیفیو واپس آ گیا اور ایک دفعہ پھر اسے اپنے بچوں کا خوشی سے تمتمایا ہوا چہرہ دیکھنے کی مسرت حاصل ہوئی۔ اس کے دوست بھی اس کے خیر مقدم کے لئے آئے ہوئے تھے وہ ان میں سے ہر ایک کے گلے ملا اور انہیں بتایا کہ مجھے توقع سے زیادہ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

جلد ہی فیفیو نے بنک سے بہت سا روپیہ نکلوا لیا اور شہر کا امیر ترین آدمی بن گیا۔ اس نے نہایت شان و شوکت کی زندگی بسر کرنی شروع کی اور اپنی مسرت اور اپنے عیش میں دوستوں کو بھی شریک کرتا رہا۔ اس نے ایک شاندار مکان بھی بنایا اور اُسے سجانے کے لئے اچھی اچھی خوبصورت اور قیمتی چیزیں خریدیں اس کی شان و شوکت یہاں تک بڑھی کہ وہ اپنے شہر میں ایک شہزادے کی سی زندگی بسر کرنے لگا۔ اس نے کئی گھوڑے اور دوسرے پالتو جانور خریدے۔ اس کے بیٹے بیش قیمت لباس پہننے لگے غرضکہ دونوں میاں بیوی نے نہایت ہی مسرت کی زندگی بسر کرنی شروع کر دی۔ پیپا جس کے لئے یہ زندگی بالکل نئی اور اجنبی تھی کسی قدر مغرور ہو گئی اپنا ساز و سامان اور پرشوکت مکان دکھانے کے لئے وہ اکثر اپنی سہیلیوں کو بلا لیا کرتی۔ ان میں ادھیڑ عمر کی ایک عورت اور اس کی خوبصورت لڑکی بھی شامل تھی پیپا نے دونوں کو کچھ دن اپنے ہاں ٹھیرنے کی دعوت دی۔ فیفیو کو بھی اس نے زبردستی رضامند کر لیا اور کہا کہ "یہ کئی طرح کی مدد دیا کریں گی۔ مجھے ان کی موجودگی کی سخت ضرورت ہے"۔ غرضکہ یہ سب لوگ نہایت مسرت کی زندگی بسر کرنے لگے۔

لیکن قسمت جو ہمیشہ عیش و مسرت میں خلل ڈالنے کے لئے تاک لگائے بیٹھی رہتی ہے ان پر نامہربان ہو گئی اور مسرت افزا بہار کا زمانہ غم افزا خزاں کا دور بن گیا بدقسمتی یہ ہوئی کہ حسین میڈلینا (مہمان عورت کی بیٹی) کی شوخ اور دل نشین اداؤں نے فیفیو کا دل چھین لیا۔ اس ساحرہ نے فیفیو کو اس قدر مسحور کیا کہ وہ دن رات اس کے لئے بیتاب

نہ سہنے لگا یہاں تک کہ وہ اسے معصومیت کی راہ سے پرے لے جانے میں کامیاب ہو گیا اور آخر کار دونوں میں میاں بیوی کے تعلقات قائم ہو گئے بے چاری فیفنیو کی بیوی کو ان واقعات کا کچھ علم نہ تھا لیکن جب عاشق اور محبوبہ نے پہلے سے کہیں زیادہ بے تکلفی کے ساتھ اور کسی قدر بے احتیاطی سے محبت کرنی شروع کی تو بیتا تمام معاملے سے باخبر ہو گئی۔ وہ ایک بپھری ہوئی شیرنی کی طرح غصے میں آ گئی اور اس نے انتہائی غیظ و غضب کے ساتھ اپنے خاوند اور میڈلینا کے آیندہ تعلقات کے متعلق ایسی شرائط پیش کیں جو کچھ ایسی معمولی نہیں تھیں۔ وہ اپنی حسین مہمان سے بھی نہایت درشتی سے پیش آئی اور ایک دن جب فیفنیو کہیں باہر گیا ہوا تھا اس نے نہایت بے عزتی سے اس حسینہ کو اس کی والدہ کے ہمراہ اپنے مکان سے باہر نکال دیا۔ فیفنیو واپس آیا تو گھر کی بگڑی ہوئی حالت دیکھ کر آتش زیر پا ہو گیا۔ اس نے اپنی حسینہ کو گھر میں بلا لیا اور پہلے کی طرح اس کی پرستش کرنے لگا اسے گوارا نہیں تھا کہ ایک لمحے کے لئے بھی وہ اپنی محبوبہ کے چہرے سے نگاہ محبت ہٹائے اور دوسری طرف روز بروز میاں بیوی کے تعلقات بھی سخت کشیدہ ہوتے گئے۔ بیوی کے سر پر رشک کا بھوت سوار ہو گیا تھا وہ بے چاری جل بھن کر کباب ہو رہی تھی۔ وہ گھر جو کبھی امن و مسرت کا گہوارہ تھا آج میدان جنگ و جدال بنا تھا۔ فیفنیو نے بہتیری کوشش کی کہ کسی طرح اس کی بیوی کا مزاج درست ہو جائے اس کی منت خوشامد بھی کی لیکن وہ تو شاید دیوانی ہو گئی تھی۔ کسی طرح اس کا بگڑا ہوا مزاج درست نہ ہوتا تھا۔ اس نے گھر میں ایک کہرام مچا رکھا تھا اسے ایک پل کے لئے بھی گوارا نہ تھا کہ فیفنیو اس سے بھی محبت کرے اور اس کی رقیب سے بھی۔

آئے دن کی خانہ جنگیوں سے تنگ آ کر فیفنیو نے اپنی محبوبہ کے لئے کچھ فاصلے پر ایک چھوٹا سا خوبصورت مکان لے لیا اُسے وہیں لے گیا اور دونوں نے پھر سے اس چھوٹے سے مکان کو اپنی امنگوں اور آرزوؤں سے آباد کر لیا فیفنیو نے اپنی بیوی کے گھر آنا بھی تقریباً ترک کر دیا وہ بے چاری وہیں تنہائی میں اپنی قسمت پر آنسو بہایا کرتی۔ یکایک اس کے احساسات جو شوہر کی مسلسل بے اعتنائی سے کچھ مردہ سے ہو گئے تھے۔ پھر سے زندہ ہو گئے۔ اب اس کے دل میں یاس کی جگہ غیظ و غضب اور حسد نے لے لی اور اس نے اپنے شوہر سے انتقام لینے کی ٹھان لی۔ جب بیتا نے دیکھا کہ فیفنیو کو مجھ سے ملے تین ماہ ہو چکے ہیں اور وہ میڈلینا کی ہستی میں اپنے آپ کو اس قدر مستغرق کر چکا ہے کہ اسے خبر ہی نہیں کہ دنیا کدھر جا رہی ہے تو اس نے اس خوفناک صورت حالات کا تدارک کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کی زندگی ایک مسلسل دکھ کی زندگی بن گئی تھی۔ فرط غم سے وہ دیوانی ہو گئی۔ اس ناقابل برداشت صورت حالات کے سدباب کے لئے اس نے ایک خوفناک عزم کیا یعنی یہ کہ حکومت پر فیفنیو کے تمام راز افشا کر دیے جائیں اور لوگوں کو بتا دیا جائے کہ اس نے یہ دولت کس طرح حاصل کی ہے تاکہ حکومت اسے مناسب سزا دے۔ فیفنیو اور اس کی محبوبہ نے اسے جو ایذائیں پہنچائی تھیں ان کا انتقام لینے کی واحد صورت اسے یہی نظر آئی۔ اس نے انہیں کسی قسم کی تنبیہہ کرنے کی ضرورت نہ سمجھی اور کسی سے مشورہ کئے بغیر کسی مجسٹریٹ سے مشورہ کرنے کے لئے چل دی۔ مجسٹریٹ اس کے بیانات سن کر چونک اٹھا اور اس نے یہ تمام باتیں سرکاری طور پر قلمبند کر لیں۔ اس کے بعد بیتا اپنے بیانات کو سچا ثابت کرنے کے لئے حکام کو اپنے پہلے مکان کے اس کمرے میں لے آئی۔ جہاں گریالڈی کی نعش دفن تھی جب قانون کے ارباب بست و کشاد نے وہ جگہ کھدوائی تو وہاں سے سچ مچ گریالڈی کی نعش برآمد ہو گئی۔ مجسٹریٹ نے فیفنیو کی بیوی کو زیر حراست رکھا اور ایک افسر کو سپاہیوں کی ایک جماعت کے ہمراہ فیفنیو کے گھر بھیجا کہ اسے گرفتار کر لائیں۔ جب سپاہی فیفنیو کے مکان میں پہنچے وہ اپنی محبوبہ سے ہم آغوش ہو رہا تھا۔ افسر اعلیٰ نے اسے فوراً گرفتار کر لیا۔ جب اسے عدالت میں پیش کیا گیا تو اس نے کسی قسم کا کوئی بیان دینے سے صاف انکار کر دیا لیکن اس کی بیوی جسے شوہر کے خلاف آ کر بیان دینے کا حکم دیا گیا تھا۔ چلا کر کہنے لگی" اب اصلی انصاف ہو گا۔"

فیفنیو اُس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا" میں نے تم سے حد سے زیادہ مہربانی کا سلوک کیا جس کا خمیازہ آج مجھے بھگتنا پڑا۔"
اس کے بعد فیفنیو نے ایک مجسٹریٹ کو ایک طرف لے جاتے ہوئے ساری بات اس کے گوش گزار کر دی اور اصل واقعات سے من و عن آگاہ کر دیا قانونی کونسل کے تمام ارکان نے اس کی بیان کردہ کہانی پر یقین کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ پورا پورا ثبوت موجود ہے کہ اس نے بے چارے گریالڈی کو لوٹ کر اسے قتل کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے فیفنیو کو دھمکی دی کہ اگر تم اقرار جرم نہ کر لو گے تو تمہیں فوراً قتل کر دیا جائے گا متعدد

پیشیوں کے بعد انہوں نے اس سے حسب دلخواہ بیانات لے لئے اور بالآخر یہ فیصلہ کیا کہ اسے کوئی سخت عبرتناک سزا دے کر ہلاک کر ڈالا جائے اور اس کی جائداد بحق سرکار ضبط کر لی جائے۔

کجوس گربالڈی کی لاش زمین سے برآمد کر لی گئی اور اسے کسی مقدس زمین میں دفن کرا دیا گیا۔ خوبصورت میڈلینا اور اس کی ماں کو ان کے پہلے گھر میں واپس بھیج دیا گیا اور فیفیو کا شاندار مکان جس میں وہ اور اس کی محبوبہ رہتے تھے مسمار کر دیا گیا۔ اس کے بچوں کو اس مکان سے باہر نکال دیا گیا اور کہہ دیا گیا کہ تم جہاں چاہتے ہو رہو حکومت کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔ پتیا جو عدالت میں اپنے شوہر کے خلاف بیان دیتی رہی تھی ابھی تک حکام کی حراست میں تھی۔ اب چونکہ مقدمے کا فیصلہ ہو چکا تھا اس لئے اسے رہا کر دیا گیا۔

پتیا جب واپس آئی تو صرف اس کے بچے پہلے مکان میں موجود تھے ہر سمت ایک بھیانک نقشہ نظر آتا تھا۔ نوکر غائب ہو چکے تھے مکان سونا پڑا اور اس کی شیریں چہل پہل افسانہ بن کر رہ گئی تھی۔ یہ دیکھ کر اس کا دل ٹوٹ گیا شدت غم سے وہ زار زار رونے لگی وہ دیوانوں کی طرح بہکی بہکی باتیں کرنے لگی اور اس نے اپنے چیختے ہوئے بال نوچ لئے۔ بہت دیر میں اسے احساس ہوا کہ وہ کس قدر خوفناک اور بھیانک غلطی کی مرتکب ہوئی ہے۔

شہر بھر میں میاں اور بیوی کی اس خوفناک جنگ کے چرچے ہو رہے تھے جس میں بیوی کامیاب ہو گئی تھی۔ فیفیو کی غلطیوں کا ذکر کسی کی زبان پر نہ تھا۔ ہر کوئی اس کی بیوی ہی کو غدار اور بے مہر کہتا تھا۔ ہر کسی کو حیرت تھی کہ کیا دنیا میں کوئی ایسی سنگ دل بیوی بھی ہو سکتی ہے جو شوہر کو قتل ہونے کے لئے نہایت سرد مہری سے حکومت کے حوالے کر دے۔ خود پتیا کے رشتہ داروں اور واقفوں نے اس کے گھر آ کر اسے سو سو طرح سے کوسا اور برا بھلا کہا۔ اس کی سنگدلی کا ماتم کیا اور بد قسمت فیفیو کے افسوسناک حشر پر آٹھ آٹھ آنسو روتے ہوئے واپس چلے گئے۔ پتیا شدت غم سے زار و قطار روتی رہی۔ اس کے لئے یہ صدمہ ناقابل برداشت تھا۔

دوسرے دن بد قسمت فیفیو کو ایک گاڑی پر سوار کر کے شہر بھر میں پھرایا گیا تاکہ لوگ اسے اس حالت میں دیکھ کر اچھی طرح سے نصیحت پکڑ سکیں۔ اس ذلت و رسوائی کے بعد وہ لوگ اسے مقتل کی طرف لے گئے پہلے اسے ایک تیز رفتار بھاری بھرکم گاڑی کے نیچے روندھا گیا پھر مقتل میں اسے تمام لوگوں کے سامنے قتل کر دیا گیا۔ مجسٹریٹوں نے حکم دیا کہ اس کی لاش دن بھر وہیں پڑی رہے لوگ جوق در جوق آئیں اور اس کا عبرتناک انجام دیکھ کر نصیحت پکڑیں۔

جب ان لرزہ خیز مناظر کی تفصیل پتیا نے سنی جسے اس کا شوہر قتل گاہ میں آخری دم تک گالیاں دیتا رہا تھا تو وہ فرط دہشت و غم سے جھلا گئی اللہ اس نے اپنی غلطی پر اپنے ہی سے انتقام لینے کا فیصلہ کر لیا کھانا کھانے کے وقت جب اس کے گھر میں بہت کم لوگ رہ گئے اس نے اپنے دونوں بچوں کو ساتھ لیا اور روتی ہوئی قتل گاہ کی طرف چل دی جو لوگ اسے راستے میں ملے انہوں نے اس پر طرح طرح کی پھبتیاں کسیں تاہم آسے آگے نکلنے کا راستہ دے دیا۔ جب وہ اس چبوترے کے قریب پہنچی جہاں اس کے شوہر کی لاش نہایت ہی بری حالت میں پڑی تھی۔ وہاں بہت کم لوگ موجود تھے اکثر کھانا کھانے کے لئے وہاں سے چلے گئے تھے۔

وہ زار و قطار روتی ہوئی بین کرتی اپنے بچوں کو ساتھ لے کر چبوترے کی سیڑھیوں پر چڑھ گئی اردگرد کے ہجوم میں سے کسی نے مزاحمت نہ کی البتہ نہایت جوش و خروش اور درشتی سے اس کی سنگ دلی پر ماتم کیا اور طرح طرح کے آوازے کسے اور پکار پکار کر کہنے لگے "شوہر قتل ہو گیا ہے تو اب کس زور شور سے رو رہی ہے۔ اب اپنے کئے کی سزا بھگتے سے پہلے تو اسے قتل کیا اور اب ماتم کر رہی ہے"۔

یہ سن کر بد قسمت پتیا نے اپنے بال نوچ لئے اپنے خوبصورت چہرے اور سینے کو اپنے ہاتھوں سے بری طرح پیٹنا شروع کیا اور بالآخر اپنے جلتے ہوئے مرتعش ہونٹ فیفیو کے مرجھائے ہوئے ہونٹوں پر رکھ دئے۔ پھر اس نے اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو باپ کے سامنے گھٹنے ٹیک بٹھا دیا اور ان سے کہا "اپنے باپ کا چہرہ چوم لو"۔ تماشائی یہ رقت انگیز نظارہ دیکھ کر یکایک اپنے غصے کو بھول گئے اور ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پریشان حال دیوانی ماں نے اپنی جیب سے ایک چمکتا ہوا چاقو نکالا اور انتہائی وحشت اور تندی سے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اسے یکے بعد دیگرے اپنے معصوم بچوں کے سینوں میں گھونپ دیا اور اس سے پہلے کہ لوگ اس سے یہ خوفناک ہتھیار چھین لیں چمکتا ہوا چاقو اس نے اپنے ہاتھ میں سے گرا کر اٹھایا اور اس زور سے اسے اپنے سینے میں گھونپ لیا کہ وہ دستے سمیت اس کے سینے میں چلا گیا۔ ایک ہی لمحے

میں وہ اپنے شوہر اور بیٹوں کی لاشوں پر گر گئی۔ لوگ چیختے ہوئے ان کے قریب پہنچے ماں اور اس کے دونوں بیٹے آخری سسکیاں لے رہے تھے اور ان کے جسم سے نکلتے ہوئے خون کے فواروں نے ان کا لباس بالکل سرخ کر دیا تھا۔

تمام شہر میں یہ افسوسناک خبر بجلی کی سی سرعت کے ساتھ پھیل گئی۔ ماتم کرتے ہوئے لوگ گروہ در گروہ یہ خوفناک منظر دیکھنے کے لئے آنے لگے۔ جہاں میاں بیوی اور بچوں کی لاشیں ایک ڈھیر کی صورت میں پڑی تھیں۔ انیفنز ٹرائے روم کے لرزہ خیز خونیں واقعات کی تفصیل بھی ہم سن چکے ہیں۔ کون بے درد ایسا ہے جس کی روح ان واقعات کی تفصیل سن کر لرز نہیں جاتی لیکن ایک ہی دن میں اہل ہسپانیہ نے جو خونیں منظر دیکھا وہ کہیں زیادہ دردناک تھا اگرچہ ایتھنز ٹرائے اور روم کے خوفناک واقعات میں ہزاروں لوگ موت کی نیند سو گئے تھے خون کی ندیاں بہ گئی تھیں لیکن یہاں صرف چار آدمیوں کے حسرتناک انجام سے لوگوں کا کلیجہ منہ کو آ رہا تھا۔ ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے اور ان میں کئی ایسے تھے جو ان واقعات پر خون کے آنسو رو رہے تھے۔

جلد ہی یہ خبر اٹلی جا پہنچی اور دوسرے شہروں میں بھی یہ خبر ایسی سرعت سے پھیلی کہ دہشت زدہ لوگ متاثر ہو کر جوق در جوق ہسپانیہ آنے لگے تاکہ اس خونیں منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں ان میں سے کون ایسا تھا جو مسکراتے ہوئے چہروں والے معصوم بچوں کا نوحہ خواں نہ ہو اس طرح معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے ماں باپ کے تیار کردہ مرگھٹ میں گہری نیند سو رہے ہیں۔ کون بے درد ایسا تھا جس کی آنکھوں میں اس وقت آنسو نہیں چمک رہے تھے۔ آہ یہ نظارہ تو پتھر کو بھی موم بنا دینے کے لئے کافی تھا۔ قانون نے بھی اب اپنی لرزتی ہوئی تلوار ہاتھوں سے گرا دی تھی۔ ان کی لاشیں دفن کرنے کے لئے جلوس کی صورت میں لے جائی جا رہی تھیں۔ ہر چہرہ مغموم نظر آتا تھا اور ہر آنکھ آنسوؤں سے تر تھا۔

اطالوی سے

مہدی علی خاں

دامن گلچیں

دو آتشہ

عرفی اگر بہ گریہ میسر شدے وصال صد سال میتواں بہ تمنا گریستن

(عرفی)

ہم وقت وداع ان سے منہ میں ہو کے خصت رونا تھا بہت لیکن رو تے بھی تو کیا ہوتا

(حالی)

ترجمہ

شادم کہ عاشقاں را سوز دوام دادی درماں نہ آفریدی آزار جستجو را

(اقبال)

خوش ہیں کہ عاشقوں کو سوز دوام بخشا درماں کیا نہ پیدا آزارِ جستجو کا

(حفیظ ہوشیارپوری)

شائستہ پاسخ

کباب سیخ ہیں ہم کروٹیں سو بدلتے ہیں جو جل اٹھتا ہے یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہیں

(؟)

کباب سیخ ہیں لیکن پڑے ہیں ایک پہلو پر مزا کیا گر بچالیں جان کو ہم کروٹیں لے کر

(؟)

نغمۂ خودی

لوحِ فنا پہ نقش ہوں پھر بھی بقا نشاں ہوں میں — کب یہ کسی پہ کھل سکا کون ہوں میں کہاں ہوں میں

مجھ سے نہ چھپ سکا ہی کچھ مجھ سے نہ چھپ سکے گا کچھ — حسن کا ہوں ادا شناس عشق کا رازداں ہوں میں

گایا ہے جس کو عشق نے جس کو سنا ہے حسن نے — وجہِ قیامِ دہر وہ نغمۂ جاوداں ہوں میں

مری تلاش ہے فضول دشت بدشت بے خبر — اپنے ہی دل سے پوچھ تو میرا پتہ کہاں ہوں میں

ملتے ہیں جستجو سے ہی اہلِ تلاش کو گہر — ورنہ نہیں پکارتا آپ گہر "یہاں ہوں میں"

دیکھنے کو ہوں پابہ گل ساحلِ عافیت سے دور — اہلِ نظر کے واسطے قلزمِ بے کراں ہوں میں

قدر مری عوام میں گر نہیں تاجورؔ نہ ہو
جانتے ہیں خواص تو شاعرِ خوش بیاں ہوں میں

تاجورؔ سامری

سحرِ حیات

کشاں کشاں
بلندیوں پہ لے گئی امنگ میری روح کو،
خیال دل میں آگیا!
میں چل پڑا،
نکل کے گھر سے کوہ و دشت و ریگ زار کی طرف!

افق کے پاس دیکھ کر وہ دھندلی دھندلی بستیاں،
جنون نے ہیچ کر دیا
مری نگاہِ شوق میں
نظامِ کائنات کو!
مری رگوں میں بھر دیا
جوان و گرم جوش خون!
فضا میں عزمِ آہنیں کے نغمہ ہائے آتشیں
بکھیر کر میں چل پڑا
نکل کے گھر سے کوہ و دشت و ریگ زار کی طرف!
مگر بھلا چکا تھا دل سے ضبط و عقل و ہوش کو
جنونِ جستجو نے اب
بدل کے میرے نغمہ ہائے آتشیں کو رکھ دیا
ملول، سردِ آہ میں!

حیاتِ مختصر کا دور ہو چکا،
امنگ کے طلسم سے بدل کے اور ہو چکا
وہ نغمہ میرے خواب کا!

"میراجی"

بھاشا کے پھول

[ذیل میں چند ہندی طرز کے دوہے درج کئے جاتے ہیں۔ مصنف شاعر کی حیثیت سے منظرِ عام پر آنا پسند نہیں کرتا۔ اس کے اکثر مضامین اصلی نام کے ساتھ ان صفحات میں شائع ہوتے رہے ہیں اور ہم یہ ناظرین پر چھوڑتے ہیں کہ وہ اس بات کا اندازہ لگائیں کہ ادبی دنیا کے گلے میں بھاشا کے پھولوں کا یہ خوبصورت گجرا ہار کس نے ڈالا ہے! ح۔ ہ]

(۱)

نینوں سے میں نیر بہاؤں تارے بن بن جائیں!
جی سے بھولوں جتنا اُن کو پیارے بن بن جائیں!

(۲)

چندر ما نے راگ الاپا روئے جس سے پھول!
پریت کے سارے سندر سپنے گئی جوانی بھول!

(۳)

جاری کومل میں نہ سنوں گی تیرے من کا گیت!
میرے من سے روٹھ گیا ہے میرے من کا میت!

(۴)

پیتم پیارے پاس نہیں، تو آگنی مت برسا!
من کے سے لپٹ جا چندرما مت دور سے یوں ترسا!

(۵)

جارے بھونرے باغ میں، چاند کی کرنیں لوٹ!
من کا اب وہ روپ کہاں، زخم گئے جب پھوٹ!

"راہو"

ہندوستانیوں کی زبانیں

نسل اور زبان کا چولی دامن کا ساتھ ہے جن لوگوں کی نسل ایک ہوگی۔ اُن کی زبان بھی ایک ہوگی اور زبان کی یکسانیت عموماً تہذیب و تمدن کی یکسانیت پر منتج ہوتی ہے۔ جس طرح ہندوستان میں بہ لحاظ نسل ایک ہی قوم آباد نہیں بلکہ بہت سی قومیں آباد ہیں اسی طرح زبان کے لحاظ سے بھی ہندوستان کے باشندے مختلف گروہوں میں منقسم ہیں اور یہی امر واقعہ بالواسطہ طور پر اُن کے اختلاف نسل کی بھی دلیل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر کوہِ یورال ایشیا اور یورپ کے مابین حائل ہو کر اُن کو دو مختلف براعظموں میں تقسیم کر سکتا ہے تو کوہ ہمالیہ بھی جو اس قدر بلند طویل اور عریض ہے۔ ہندوستان کو ایشیا سے الگ کر کے اسے بذاتہ ایک علیحدہ براعظم کی حیثیت بخش سکتا ہے اگر اس نظریے کو درست تسلیم کر لیا جائے تو ہندوستان کو براعظم اور اس کے مختلف صوبوں یا حصوں کو اس کے ملک تسلیم کرنا پڑے گا۔ نیز یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان ملکوں میں مختلف قومیں آباد ہیں جو نسل زبان اور تہذیب کے لحاظ سے ایک دوسری سے مختلف ہیں۔

زبان کے اختلافات کے پیشِ نظر ہندوستان کو اگر مینارِ بابل سے تشبیہہ دی جائے تو غلط نہیں۔ یہاں نسل کے لحاظ سے جتنے اختلافات موجود ہیں اتنے ہی بلکہ اُن سے بھی زیادہ اختلافات زبان کے لحاظ سے پائے جاتے ہیں زبان کے لحاظ سے ہندوستان کی آبادی کی تقسیم سے متعلقہ اعداد و شمار حسب ذیل ہیں :-

تبیس کروڑ تیس لاکھ آبادی یعنی ۷۳ر۴ فی صدی آبادی آریوں کی زبانیں استعمال کرتی ہے۔ چھ کروڑ تیس لاکھ آبادی یعنی ۲۰ فی صدی آبادی دراوڑی زبان بولتی ہے۔ ایک کروڑ تیس لاکھ آبادی یعنی ۴ فی صدی باشندے تبتی یا چینی زبانیں بولتے ہیں۔ باقی ایشیائی زبانیں تقریباً نصف کروڑ آبادی میں مروج ہیں زبان کے لحاظ سے آبادی کے ان گروہوں کی مزید تقسیم بھی ممکن ہے۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک گروہ میں کئی اور ایسی زبانیں رائج ہیں جو آپس میں بہت ملتی جلتی ہیں اور اصل زبانوں کی شاخیں ہیں۔ سب سے عجیب بات یہ ہے کہ بنگال کے سوا ہر ایک صوبے میں کئی زبانیں رائج ہیں۔ بنگال کی ۹۰ فی صدی آبادی بنگالی بولتی ہے۔ آسام میں ۵۰ فی صدی باشندے بنگالی بولتے ہیں ۲۰ فی صدی آسامی اور ان دو زبانوں کے علاوہ باقی باشندوں میں سو کے قریب اور زبانیں مستعمل ہیں۔ بہار اور اڑیسہ میں ۶۰ فی صدی باشندوں کی زبانیں ہندی اور بہاری ہیں۔ ۲۰ فی صدی کی زبان اڑیا ہے اور باقی ۱۵ فی صدی کی زبانیں منڈری اور سنتھالی ہیں۔ صوبہ بمبئی میں سب سے زیادہ مروج زبان مرہٹی ہے اور اس کے بولنے والوں کی تعداد صرف ۴۶ فی صدی ہے۔ ۳۲ فی صدی باشندے گجراتی بولتے ہیں۔ باقی ۲۲ فی صدی آبادی دیگر زبانیں مثلاً انگریزی اُردو پارسی وغیرہ استعمال کرتی ہے۔ برما کی ۷۰ آبادی کی زبان برمی ہے اور باقی آبادی میں کئی مختلف زبانیں رائج ہیں صوبجات متوسط اور برار میں ۵۵ فی صدی باشندوں کی زبان ہندی یا پراکرت ہے۔ ۳۱ فی صدی کی مرہٹی اور باقی باشندے ان کے علاوہ اور زبانیں استعمال کرتے ہیں۔ صوبہ مدراس کا بھی یہی حال ہے۔ ۴۱ فی صدی کی زبان تامل ہے ۳۱ فی صدی کی تلگو اور باقی باشندے ملیالم، اڑیا کناری اور ہندی ایسی زبانیں بولتے ہیں۔ صوبہ پنجاب اور صوبجات متحدہ میں ۴۵ فی صدی تو مغربی ہندی (اردو اور پنجابی) بولتے ہیں اور ۳۲ فی صدی مشرقی ہندی (ہندی اور اردو وغیرہ) ۲۰ فی صدی بہاری اور ۳ فی صدی مرکزی پہاڑی۔

ہندوستان کی زبانوں میں سے کئی زبانیں ایسی ہیں جو لکھنے میں نہیں آتیں صرف بولی جاتی ہیں۔ ایسی زبانیں اکثر بہت جلد مٹ جاتی ہیں جو زبانیں لکھی بھی جائیں اور ادبی حیثیت سے بھی انہوں نے کچھ ترقی کی ہو ان کا غیر مستعمل ہونا تو درکنار وہ اکثر ایسی زبانوں کی جگہ لے لیا کرتی ہیں جن کا کوئی رسم الخط نہیں ہوتا۔ مغربی نیپال میں کسی وقت کچھ ہندو پناہ گزیں ہوئے۔ وہاں کی مروجہ زبان "خاص" تھی لیکن آہستہ آہستہ ان پناہ گزیں ہندوؤں

کی زبان ایسی ہردلعزیز ہوئی کہ یہ وہاں کے باشندوں کی اصل زبان کی بجائے استعمال ہونے لگی اور اب یہ زبان نیپال میں مروجہ پہاڑی زبان کی جگہہ بھی لے رہی ہے۔ شمالی بنگال کے باشندے کوچی اپنی زبان کو کافی حد تک بھول چکے ہیں اور اب ملی جلی بنگالی بولتے ہیں۔ اسی طرح قوم چکمانے اراکانی زبان کو چھوڑ کر بنگالی کو اپنی زبان بنالیا ہے لیکن وہ بنگالی لکھتے وقت برمی حروف تہجی استعمال کرتے ہیں۔ گریرسن صاحب کی پنجابی اور موجودہ زمانے کی پنجابی میں زمین وآسمان کا فرق ہے زبانیں چونکہ بدلتی رہتی ہیں اس لئے ہندوستان کی مشترکہ زبان کے متعلق کوئی آخری فیصلہ کرنا آئندہ نصف یا ربع صدی میں عوام کے رجحانات پر منحصر ہوگا۔

مرقومہ صدر اعداد وشمار سلسلہ ۱۹۳۱ء کی رپورٹ، مردم شماری میں درج ہیں اور ان کے مطابق ہندوستان کے باشندے بلحاظ زبان بھی متفق ومتحد نہیں ہوسکتے۔ چونکہ جذبۂ ملیت کی تخلیق کے لئے ضروری ہے کہ ملک میں ایک مشترکہ زبان جاری ہو اس لئے اس وقت ایک مشترکہ زبان کا مسئلہ ملک بھر کے زیر غور ہے۔ تین زبانوں یعنی اردو، ہندی اور انگریزی کے متعلق یہ دعوے کیا جاتا ہے کہ وہ ہندوستان بھر کی مشترکہ زبانیں ہونے کی اہلیت رکھتی ہیں۔ اردو کے حامی یہ دعوے کرتے ہیں کہ اردو ایک ایسی زبان ہے جسے ہندوستان میں ہر جگہہ سمجھا جاتا ہے برخلاف اس کے حامیان ہندی کا یہ دعوے ہے کہ اردو نہیں بلکہ ہندی ہندوستان کی مشترکہ زبان ہے اور ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو انگریزی کے متعلق یہی دعوے پیش کرتا ہے۔ اب ہم ان مختلف دعاوی پر غور کرکے کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کریں گے۔

جہاں تک سلیس اردو یا سلیس ہندی کا تعلق ہے ہندوستان کے اور خاص کر شمالی ہندوستان کے اکثر باشندے انہیں سمجھ سکتے ہیں اور ان زبانوں میں کچھ زیادہ فرق بھی نہیں۔ فرق صرف اس وقت نظر آتا ہے جب اردو کے حامی اس میں عربی اور فارسی الفاظ کی بھرمار کرکے اسے مغلق اور مشکل بنا دیتے ہیں اور ہندی کے حامی اس میں سنسکرت کے الفاظ استعمال کرکے اسے غیر مانوس اور ناقابل فہم کر دیتے ہیں۔ جہاں تک لفظوں فقروں کی ساخت اور گرامر کا تعلق ہے یہ دونوں زبانیں اس قدر ملتی جلتی ہیں کہ ان کو ایک ہی زبان کہہ دینا غلط نہ ہوگا۔ صرف ان کے حروف تہجی اور رسم الخط میں فرق ہے گویا کہ ہندی اور اردو کا جھگڑا بہت بڑی حد تک رسم الخط کا جھگڑا ہے اور اگر اس بات کا فیصلہ ہو جائے تو یہ جھگڑا مٹ جاتا ہے اور اردو یا ہندی تمام ملک کی یا کم از کم شمالی ہندوستان کی مشترکہ اور ملکی زبان تسلیم کی جاسکتی ہے لیکن اس وقت لوگوں میں ایک اور رجحان بھی پایا جاتا ہے اور وہ یہ کہ ہر صوبے کے باشندے اپنے صوبے کی زبان کو ترجیح دینا چاہتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر صوبہ کی یہ خواہش ہے کہ جو زبان اس میں مروج ہے اس کو ترقی دی جائے اور جہاں تک صوبجاتی معاملات کا تعلق ہے وہی زبان عام تعلیمی اور سیاسی اغراض کے لئے استعمال ہو۔ اگر شمالی اور خاص کر شمال مغربی ہندوستان کا جس میں شمال مغربی سرحدی صوبہ پنجاب صوبجات متحدہ وغیرہ شامل ہیں۔ یہ دعوے تسلیم کر لیا جائے کہ شمالی ہندوستان کی زبان اردو یا ہندی ہے تو بنگال کب اس کو گوارا کرے گا کہ وہ بنگالی کو جو وہاں اس قدر زیادہ ہردلعزیز اور رائج ہے چھوڑ کر اس کی بجائے اردو یا ہندی کو رواج دے۔ اس کے علاوہ سلیس اردو یا ہندی کی ترقی ابھی تک اتنی نہیں ہوئی کہ ان میں سے کسی ایک کے ذریعے مختلف علوم کی تعلیم دی جاسکے۔ تعلیمی اغراض کے لئے ہندی یا اردو کی ترقی اسی طرح ہوسکتی ہے کہ یا تو اس میں عربی اور فارسی کے الفاظ ٹھونسے جائیں یا سنسکرت کے متروک الفاظ کو ڈھونڈھ نکالا جائے۔ اور پھر ان کی بے معنی طور پر اس میں بھرمار کر دی جائے۔ اگر مسلمانوں کی قابل تعظیم زبانوں عربی اور فارسی اور ہندوؤں کی چہیتی زبان سنسکرت کے الفاظ کو تصفیہ کی خاطر اس بنا پر جگہہ نہ دی جائے کہ وہ فرقہ داری کی محرک ہیں تو پھر اردو یا ہندی کی ترقی کے لئے انگریزی زبان کا سہارا ڈھونڈھنا پڑتا ہے اور جدید علوم چونکہ زبان انگریزی کے ذریعے سے ہم تک پہنچے ہیں اس لئے انگریزی سے ہی اردو یا ہندی میں تراجم کئے جائیں گے۔ لہذا انگریزی الفاظ کے مترادف عربی یا سنسکرت کے الفاظ ڈھونڈنے پر وقت اور محنت صرف کرنے کی بجائے کیوں نہ انگریزی الفاظ کو ہی استعمال کیا جائے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اردو یا ہندی کو ترقی دینے کے لئے کافی وقت درکار ہے۔ تمام صوبوں میں بالخصوص بنگال۔ مدراس، بمبئی، سندھ صوبجات متوسط وغیرہ میں اس مشترکہ زبان کی ترویج کی اس قدر ضرورت ہوگی کہ یہ وہاں کے لوگوں کی مادری زبان بن جائے۔ معلوم نہیں کہ اس پر کتنا عرصہ لگے اور عین ممکن ہے کہ اس بارہ میں کوشش شروع کرنے کے کچھ عرصہ بعد یہ پتہ چلے کہ یہ مقصد ناممکن الحصول ہے یا اس سے اور کئی جھگڑے اٹھنے کا اندیشہ ہے مثلاً اگر بنگال میں اردو کو رواج دینے کی کوشش شروع کی جائے تو اغلب ہے کہ

اس بارے میں کامیابی نہ ہو کیونکہ بنگال کی ۹۰ فی صدی بنگالی بولنے والی آبادی اپنی زبان کو چھوڑنے پر مجبور نہیں کی جا سکتی۔ پھر اگر اسے ایسا کرنے کے لئے مجبور بھی کیا جائے تو بنگالی کے مقابلے میں چونکہ وہاں اردو ابھی ابھی جاری ہوئی ہوگی اس لئے اسے چنداں فروغ حاصل نہیں ہوگا۔ عین ممکن ہے کہ اس سے پیشتر کہ بنگال میں اردو کو مروج کرنے کی ٹھانی جائے بنگالی اس قدر زیادہ ترقی کر جائے کہ یہ خیال ہی مضحکہ خیز نظر آنے لگے۔ یہی حال مدراس میں مروجہ زبانوں کا ہے۔ وہ کافی ترقی کر چکی ہیں اور ان کو چھوڑنا یا ترک کرنا مدراسیوں کے لئے ناممکن ہو گیا ہے۔ لہٰذا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہندوستان کی کونسی مشترکہ زبان ہوگی۔

لیکن جہاں تک زبان کا تعلق ہے مختلف صوبوں کو آزادی دینا بھی درست نہیں۔ کیونکہ ایسی آزادی بالآخر ہندوستان کے اتحاد و اتفاق کے منافی ہوگی اور جذبۂ ملیت پیدا کرنے کی بجائے صوبائی تنگ دلی پیدا کر دے گی جس سے ملک کی سیاسی متحدہ حیثیت قائم نہیں رہ سکے گی۔ زبان کے اختلافات اکثر سیاسی تفرقوں پر منتج ہوا کرتے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ ان تفرقات کی بنا پر ہر صوبہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ تیار کرنے کی ٹھان لے اور مضر مرکزیت تحریکات شروع ہو جائیں۔ لہٰذا زبان کا مسئلہ ایک نہایت اہم مسئلہ ہے اور اس کے متعلق بغیر سوچے سمجھے جلد بازی سے کام لینا قرینِ دانش نہیں کسی مروجہ ہندوستانی زبان کو بتدریج ترقی دے کر اس میں تمام ہندوستان کی مشترکہ زبان ہونے کی خصوصیات پیدا کرنے کا کام خود مرکزی حکومت کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہئے۔ صوبوں کو اس بارے میں کلی اختیار دینا نقصان کا باعث ہوگا۔

بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ ملک بھر کے سکولوں میں اردو اور ہندی کو لازمی قرار دیا جائے اور تمام بچوں کو یہ دونوں زبانیں اور ان کے رسم الخط بھی سکھائے جائیں۔ نیز ہندو علم الاصنام اور اسلامی روایات قدیمہ کی بھی تعلیم دی جائے۔ کیونکہ اس طریقے سے کچھ عرصہ کے بعد اردو ہندی ملک کی مشترکہ زبان بن جائے گی یعنی ان کی تعلیم تدریس کے جاری رہنے کے کچھ عرصہ بعد ایک ایسا وقت آئے گا کہ عام لوگوں کے پاس اردو اور ہندی الفاظ کا ذخیرہ اتنا کافی ہوگا کہ وہ بلا تامل ہر موضوع پر اظہارِ خیال کر سکیں گے اور چونکہ ان کو ہندی رسم الخط سے بھی واقفیت ہوگی اس لئے ان کے پڑھنے پڑھانے میں دقت نہیں ہوگی۔ یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ طبعی میلان ایسے ہو جائیں کہ ان دونوں میں سے ایک رسم الخط بالکل ترک کر دیا

جائے۔ یہ تجویز معقول معلوم ہوتی ہے لیکن صرف شمالی ہندوستان میں اس کی کامیابی کے امکان ہیں۔ باقی ہندوستان میں اس سے دقتیں پیدا ہو جائیں گی۔ اس کے علاوہ ہم اس قسم کی کسی تجویز پر یک دم عمل نہیں کر سکتے یہ مشترکہ زبان بنانے کا ایک تعمیری پروگرام ہے جس کی کامیابی اور تکمیل کے لئے ہمیں کافی عرصہ انتظار کرنا پڑے گا اور پھر اس کے بعد بھی یہ ہندوستان بھر کی نہیں بلکہ صرف شمالی ہندوستان کی مشترکہ زبان کہلا سکے گی۔

اس اعتراض نیز اس محنت اور وقت کے پیشِ نظر جو انگریزی کی ترویج پر صرف کیا جا چکا ہے بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ انگریزی کو ملک بھر کی مشترکہ زبان قرار دیا جائے۔ میکالے کے زمانے سے لے کر انگریزی ملک کی مشترکہ زبان چلی آتی ہے۔ تمام اعلیٰ تعلیم خواہ وہ ادبی ہو یا اصطلاحی انگریزی میں دی جاتی ہے اور پنجابیوں، بنگالیوں اور مدراسیوں کے مابین جن کی مقامی زبانیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں اور جو ایک دوسرے کی زبان کو سمجھنے سے بالکل قاصر ہیں، انگریزی زبان ہی اظہارِ خیال یا تبادلۂ خیالات کا ذریعہ بنتی ہے۔ بہ الفاظِ دیگر اردو یا ہندی کے مقابلے میں مختلف صوبوں کے لوگ سیاسی و اجتماعی اغراض کے لئے انگریزی ہی کا زیادہ تر استعمال کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے انگریزی کو باقی زبانوں پر ترجیح دینی پڑتی ہے لیکن یہ بات جذبۂ ملی کے خلاف ہے اور جذبۂ ملی کی بنا پر جو دلیل پیش کی جائے اس کی اہمیت میں نہ تو شک و شبہ کی گنجائش ہے اور نہ ہی اسے فلسفیانہ معقولیت اور مناسبت کی کسوٹی پر پرکھنا درست ہے کیونکہ ملیت ایک جذبہ ہے۔ ایسی حالت میں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ کوئی ایسی مشترکہ زبان تلاش کی جائے یا بنائی جائے جسے ہندوستان سے براہِ راست علاقہ ہو اور چونکہ انگریزی کے بغیر فی الحال گذارہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اس وقت تک جب تک کہ مشترکہ زبان کے متعلق کوئی آخری فیصلہ نہیں ہوتا انگریزی قائم مقام حیثیت میں مشترکہ زبان کی خدمات سرانجام دیتی رہے۔ ملیت کے مفاد سیاسی اور اقتصادی ہوتے ہیں اس لئے اس کے جذباتی پہلو کا احترام اسی طور پر ہو سکتا ہے کہ اس بارہ میں ضبط سے کام لیا جائے اور قیامِ ملت کے اصل مقصد کو مدِ نظر رکھتے ہوئے حصول کے کسی خاص ذریعہ یا آلۂ کار کے بارے میں اصرار نہ کیا جائے بلکہ وہ بات کی جائے جس میں آسانی اور سہولت ہو۔

اس کے علاوہ ایک اور بات جو قابلِ غور ہے یہ ہے کہ جدید ہندوستان کی عام سیاسی فضا اور کسی حد تک مجلسی فضا بھی مغربی خیالات سے بہت زیادہ متاثر

ایک خاص مرحلہ تک پہنچ چکی ہے۔ نمایندگی جمہوریت ملیت حقوق انسانی ایسے خیالاتِ جدیدہ نیز علوم جدیدہ کی اشاعت انگریزی زبان کی وساطت سے عمل میں آئی ہے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ جدید ہندوستان مغربی اصولوں کے مطابق شاہراہِ ترقی پر گام زن ہے اور آئندہ بھی وہ انہیں اصولوں پر عمل پیرا ہونا چاہتا ہے تو انگریزی زبان کو چھوڑنے سے اس کے مغربی ممالک سے تعلقات منقطع ہو جائیں گے اور اس انقطاع سے عین ممکن ہے کہ سیاسی نشوونما اور اجتماعی ترقی کی لہر جو اس وقت پیدا ہو چکی ہے ہمیشہ کے لئے رُک جائے اور امرا کے اثر و اقتدار سے پھر ملوکیت کا دور دورہ شروع ہو جائے اور اس کے زہر آلود اثرات رونما ہو کر بنا بنایا کام بگاڑ دیں۔ نیز انگریزی زبان چونکہ دنیا بھر کی اور زبانوں کے مقابلے میں زیادہ بولی اور سمجھی جاتی ہے اس لئے دیگر ممالک سے تعلقات قایم رکھنے کے لئے اس کی ہمیشہ ضرورت رہے گی۔ لہٰذا انگریزی کو بالکل ترک کر دینے میں نقصان ہے انگریزی زبان کے ذریعہ باقی ممالک سے تعلقات قایم رہ سکتے ہیں۔ ہندوستان کا باقی دنیا کے ساتھ پہلو بہ پہلو آگے بڑھنا، ترقی کرنا اور اس ہم دوش کھڑا ہونا انہی تعلقات کے قایم رہنے پر منحصر ہے۔ یہ زمانہ بین الملی تعلقات کا زمانہ ہے ایک ملک کے اندرونی اور بیرونی حالات پر دنیا کے باقی ممالک کا اثر پڑتا ہے اور اسی لئے دورِ جدید میں پروپیگنڈا کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے لہٰذا اس نقطہ نظر سے بھی زبان ایسی ہونی چاہئے جو دنیا بھر میں سمجھی جاتی ہو اور جس کے ذریعہ اگر ضرورت پڑے تو تمام دنیا کو اپنے حالات سے آگاہ کرنا ممکن ہو۔ اگر ہندوستان کو باقی دنیا سے علحدٗ کر دیا جائے اور اُس کا دیگر ممالک سے کوئی تعلق نہ رہے تو عوام میں ترقی کرنے کی جو خواہش اس وقت موجود ہے بہت جلد مفقود ہو جائے گی اور ان کی وہی پست حالی پھر عود کر آئے گی جو اب سے ایک صدی پہلے ملک پر مسلط تھی۔ ہندوستان کی ترقی کے سلسلہ کو جاری رکھنے کے لئے اس کا باقی دنیا سے تعلق قایم رکھنا بے حد ضروری ہے اور اسی لئے ہمیں انگریزی زبان کا محتاج ہونا پڑتا ہے۔

"بادہ ہے نیم رس ابھی شوق ہے نارسا ابھی
رہنے دو خم کے سر پہ تم خشتِ کلیسیا ابھی"

اقبال

اس بارے میں ۱۹۱۵ء میں امپیریل کونسل کے مباحثات میں سے چند ایک اقتباسات خالی از دلچسپی نہ ہوں گے۔

(۱)

"اگر تمام ہندوستان کی کوئی مشترکہ زبان ہوتی تو کسی ہندوستانی کی طرف سے نہ صرف میٹریکولیشن بلکہ اعلےٰ سے اعلےٰ تعلیم بھی اس زبان میں دئے جانے کی کبھی مخالفت نہ کی جاتی۔ تمام محبانِ وطن کی یہ مخلصانہ کوشش ہے کہ انگریزی کی وسیع پیمانے پر تعلیم دی جائے۔ کیونکہ یہی ایک زبان ہے جسے فرزندانِ وطن مشترکہ طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ انگریزوں اور ہندوستانیوں کے مابین اظہار خیال کا واحد ذریعہ ہے بلکہ خود ہندوستانیوں میں بھی اسی زبان کے ذریعے تبادلۂ خیالات کیا جاتا ہے۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے پلیٹ فارموں پر بھی یہی استعمال کی جاتی ہے۔ ملک کے مختلف حصوں کے باشندوں کا جب کبھی کوئی جلسہ ہوتا ہے تو وہ بھی آپس میں اسی زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔ لہٰذا انگریزی کو پس پشت ڈالنے کے لئے جو بھی کارروائی کی جائے گی وہ بلاشبہ رجعت پسندانہ ہوگی۔"

مسٹر غزنوی

(۲)

"مغربی تہذیب کے اثرات سے ہندوستان کا معیارِ زندگی بہت بلند ہو گیا ہے اور یہ تمام نتائج اس لئے مرتب ہوئے ہیں کہ ہمیں تعلیم میکالے اور برک کی زبان میں دی گئی ہے۔"

مسٹر سرندرناتھ بینرجی

(۳)

"ہمارے ملک کو انگریزی کی تعلیم سے جو فایدہ ہوا ہے جب ہم اس کا نہ دل سے اعتراف کرتے ہیں تو ہمیں کم از کم ہم میں سے اُن کو جو اس قرارداد کے اتنے مخالف نہیں جتنے کہ وہ اس کے حامی ہیں۔ اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ اس غرض سے کہ ہمارے نوجوان انگریزی زبان اور ادب میں اعلیٰ استعداد حاصل کر سکیں جس حکمتِ عملی پر عمل کیا جا رہا ہے وہ باشندوں کی تعلیم و تربیت کے لئے دیسی زبانوں کے قدرتی یا مناسب استعمال سے متعلقہ حکمتِ عملی کی حوصلہ افزائی کے منافی نہیں ہے۔"

پنڈت مدن موہن مالویہ

(۴)

ہم لارڈ میکالے کے مشکور ہیں کہ انہوں نے استقلال اور جرأت

سے یہ کوشش کی اور اس بات پر اصرار کیا کہ ملک میں تعلیم انگریزی اور صرف انگریزی ہی میں دی جانی چاہئے۔ اگر انگریزی زبان کے ذریعہ ہم اعلیٰ قابلیت حاصل نہ کرتے تو ہماری کیا حالت ہوتی؟ یہ اصلاح یافتہ کونسل جس پر اس وقت ہم اس قدر نازاں ہیں کہاں ہوتی؟ کیا میرے دوست چاہتے ہیں کہ سائنس، ریاضی، انجینئرنگ، طب، قانون اور دیگر مغربی علوم کے پڑھنے کے لئے جن کی تعلیم صرف انگریزی زبان کے ذریعہ عمل میں آسکتی ہے، ہندوستان میں مروجہ بیسیوں زبانوں کو استعمال کیا جائے؟ کیا میرے دوست مینار بابل ایسی امری پیدا کرنے کے متمنی ہیں؟"

رائے بہادر راجہ سیتا ناتھ

لیکن ملت کی تشکیل کے لئے زبان کے ایک ہونے پر اصرار کرنے کی ضرورت کیا ہے؟ برطانیہ کے مختلف حصوں کی مقامی زبانیں ایک دوسری سے جدا ہیں۔ سوئٹزرلینڈ میں بھی یہی حال ہے اور یورپ کے دیگر ممالک میں بھی زبان کے اختلاف موجود ہیں اور ان کے باوجود ان ملکوں کی اپنی اپنی ملتیں قائم ہیں اور بدستور قائم رہیں گی۔ جب کسی ملک میں اپنی ملت کے قائم کرنے کا خیال پیدا ہو جاتا ہے تو ایسی دقتوں سے عہدہ برآ ہونا اس کے لئے مشکل نہیں ہوتا۔ امریکہ میں نسل اور زبان کے لحاظ سے اتنے شدید اختلافات موجود تھے کہ شاید ہی کسی دوسرے ملک میں ایسے اختلافات پیدا ہوئے ہوں گے لیکن امریکہ نے احساس ملی کے زیر اثر اپنی نسل کو بھی ایک بنا لیا اور زبان کی یکسانیت بھی پیدا کر لی۔ اگر کوئی خاص رکاوٹ پیدا نہ کی جائے تو کیا ہندوستان جہاں لوگوں میں اپنے ہم نسل ہونے کا یقین پہلے ہی سے موجود ہے اور جو ایک دوسرے کی بات کسی نہ کسی طرح سمجھ لینے کی قدرت رکھتے ہیں۔ اس بارے میں امریکی اور دیگر یورپی ممالک کے مقابلے میں کم اہلیت کا ثبوت دے سکتا ہے؟ جو بات سب سے زیادہ اہم ہے وہ یہ ہے کہ آزاد ملکوں اور آزاد ملتوں کی مثال ہمیشہ اہل ملک کے پیش نظر رہنی چاہئے۔ خواہ اس کا انتظام انگریزی کے وسیلہ سے کیا جائے خواہ ہندی یا اردو کے ذریعے سے تاکہ ان میں جذبات رشک پیدا ہوتے رہیں اور متحد و متفق ہو کر شاہراہ ترقی پر گامزن ہونے کی خواہش ٹھنڈی نہ ہونے پائے اس احساس ملی کو جو اس وقت پیدا ہو چکا ہے برقرار رکھنے کی ضرورت ہے یہ ترقی و تربیت کی راہیں خود نکال لے گا۔ اس کے متعلق فکر کی ضرورت نہیں۔ جذبہ ملیت جن کو ایک دفعہ متحد کر دے وہ اپنی فلاح کی راہیں خود ڈھونڈھ لیتے ہیں۔ اسی سلسلے میں ایک اور نکتہ جس کی تشریح لازمی ہے یہ ہے کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کی مثال اگرچہ ہمارے لئے شمع ہدایت ہے اور اس امر سے ہماری حوصلہ افزائی بھی ہوتی ہے کہ وہاں کے باشندوں نے باوجود ایسے شدید باہمی اختلافات کے اپنی ملت قائم کر لی تھی لیکن ہم اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ موجودہ امریکی ملت کے آباؤ اجداد یورپی ممالک سے ترک وطن کر کے آئے تھے۔ اس لئے نہ صرف وہ جمہوریت پسند واقع ہوئے تھے بلکہ ملی خیالات سے بھی کافی حد تک متعارف تھے۔ لہذا ان کے لئے باہم مل کر اپنے تمام اختلافات کو مٹا دینا کچھ زیادہ مشکل نہ تھا۔ ہندوستان تو در کنار کوئی مشرقی ملک بھی جمہوریت پسند واقع نہیں ہوا کیونکہ یہاں ملوکیت کا غلبہ رہا ہے۔ ہماری ذہنیت امارت پسند اور حاکم پرست واقع ہوئی ہے۔ جمہوریت کی روح ابھی اتنی نہیں پھیلی کہ ہم دعوے سے کہہ سکیں کہ ملوکیت کے زہر آلود اثرات اب زائل ہو چکے ہیں اور ہم حقیقی معنوں میں آزادی کے طلبگار ہیں اور وہ سب قربانیاں بھی کرنے کے لئے تیار ہیں جو اس ایک حق کو حاصل کرنے کی خاطر اکثر کرنی پڑتی ہیں۔ لہذا جمہوریت کی روح کو اور زیادہ پھیلانے کے لئے ہمیں کچھ عرصہ تک اور انگریزی زبان کی ضرورت ہے۔

صوبجاتی مجالس قانون ساز میں سے سرکاری ممبران کے اخراج کے بعد صوبوں میں انگریزی کی اہمیت میں کسی حد تک کمی آ جائے گی۔ کیونکہ اگر ان مجالس میں اس وقت انگریزی ضرورت سے زیادہ رائج ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ سرکاری افسران جو اکثر انگریز ہوتے تھے صوبائی زبانوں کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے تھے۔ اس لئے دیسی ارکان کو ان کی سہولت کے پیش نظر انگریزی میں اظہار خیال کرنا پڑتا تھا۔ نیز دیسی قابل ارکان کو بڑے بڑے عہدوں مثلاً وزارتوں کے حصول کے لئے اپنی قابلیت کا سکہ ہندوستانی ممبروں پر نہیں بلکہ انگریز ممبران پر بٹھلانے کی ضرورت ہوتی تھی۔

. . . . .

"قانون ساز مجلسوں میں سے سرکاری ممبران کے نکل جانے کے بعد یہ بات نہیں رہے گی۔ اب وزرا اپنے محکموں کے انتظامات کے لئے ایوان کے سامنے ذمہ دار ہیں نہ کہ گورنر کے سامنے۔ اس کا نتیجہ یہی ہوگا کہ وزرا کو انگریزی چھوڑ کر کسی ایسی صوبائی زبان کو استعمال کرنا پڑے گا جسے ممبران کی اکثریت سمجھتی اور پسند کرتی ہو۔ لیکن کچھ عرصہ تک تقریروں کی تیاری کے لئے نیز مختلف موضوعات کے بارے میں مختلف اعداد و شمار حاصل کرنے کے لئے بھی انہیں انگریزی کتب کا مطالعہ کرنا پڑے گا جس

سے انگریزی زبان یک دم غیر مستعمل نہیں ہوگی بلکہ آہستہ آہستہ کسی دیسی زبان کو اپنی جگہ دیتی جائے گی حتٰی کہ وہ دیسی زبان مکمل نشو و نما کے بعد تعمل عام ہو جائے اور لوگوں کو انگریزی زبان کی ضرورت نہ رہے۔ لیکن یہ عمل صرف صوبوں تک محدود ہوگا مرکزی مجلس مقننہ میں انگریزی کے بغیر گذارہ نہیں ہو سکے گا اور اگر موجودہ حالات کی بنا پر استنباط کیا جائے تو ہم ہمیشہ انگریزی کے محتاج رہیں گے مختلف صوبوں کے لوگوں کو آپس میں تبادلۂ خیالات کرنے کے لئے اور ہندوستان کو باقی ممالک دنیا کے ساتھ تعلقات قائم رکھنے کے لئے انگریزی زبان کی بدستور حوصلہ افزائی کرنی پڑے گی۔

اس ضمن میں ایک تقریر کا ذکر کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا جو مجھے ۲۸ فروری ۱۹۳۵ء کو لاہور میں سننے کا اتفاق ہوا۔ مقرر کسی مقامی کالج کے پروفیسر تھے۔ موضوع یہ تھا "صوبہ پنجاب میں اردو کا مستقبل اور اس سے وابستہ چند دیگر مسائل"۔ فاضل پروفیسر کی تقریر نہ صرف پُر مغز اور پُر معنی تھی بلکہ فکر یہ کے لئے باعث انگیخت تھی۔ دوران تقریر میں آپ نے یہ مشورہ پیش کیا کہ اگر ہندوستانی زبان کے ناگری اور فارسی رسم الخطوں کو متروک قرار دے کر ان کی بجائے انگریزی حروف تہجی یعنی رومن رسم الخط کو استعمال کیا جائے تو اس سے کم از کم شمالی ہندوستان کے چند صوبوں میں زبان کے بارے میں یگانگت اور یکسانیت پیدا ہو سکتی ہے نہ صرف یہ بلکہ رسم الخط کی بنا پر زبان کے بارے میں فرقہ وارانہ اختلاف کی ایک خلیج کو بھی جو ایک مدت سے ہندوں اور مسلمانوں کے درمیان حائل ہے پاٹا جا سکتا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی لیکن اس کے پس پردہ متحدہ ملت ہندیہ کی قابل احترام خواہش ضرور موجود تھی۔ ہر سمجھ دار شخص کی یہ خواہش ہے کہ اختلافات کی خلیجیں جو اس وقت ہندوستان کی ہمسایہ اقوام کو ایک دوسروں سے جدا کئے ہوئے ہیں پاٹی جائیں۔ رومن رسم الخط کو رائج کرنے کا مشورہ جہاں تک نظریہ اور قیاس کا تعلق ہے نظر فریب اور دلکش ہے لیکن جہاں تک عملی زندگی عملی سیاسیات اور واقعات کا تعلق ہے اس مشورہ کو جامہ عمل پہنانا آسان کام نہیں کئی دفعہ رومن رسم الخط کو اپنانے کی کوششیں ناکام ہو چکی ہیں۔ افواج میں بھی کوشش کی گئی کہ رومن حروف کو مروج کیا جائے لیکن یہ کوشش بھی بے سود ثابت ہوئی۔ اس کے علاوہ انگریزی اخبارات نے رومن رسم الخط کو ہر دلعزیز بنانے کی کوشش کی اور اپنے کچھ کالم رومن رسم الخط میں لکھی ہوئی اردو کے لئے وقف کئے لیکن کامیابی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا سول اینڈ ملٹری گزٹ پریس لاہور سے ۱۸۹۷ء میں ایک ماہوار رسالہ "رومن اردو جرنل" نکلا کرتا تھا اور اس کے سرورق پر لکھا ہوتا "مشرقی زبانوں کی تحریر رومن حروف میں مروج کرنے کے لئے" لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ اسی طرح کئی اردو کی کتب کو رومن رسم الخط میں چھاپا گیا لیکن عوام نے توجہ تک نہ کی اور یہ تحریک خود بخود بند ہو گئی۔ سیاسیات میں اور خاص کر جمہوریت پسند ممالک کی سیاسیات میں ہمیشہ وہی بات اختیار کرنی پڑتی ہے جس کے راستے میں کم از کم رکاوٹیں اور دقتیں حائل ہوں۔ جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے سب سے بڑی رکاوٹ جو اس مشورے کے قبول کرنے کے راستے میں حائل ہے وہ ذہنیت ہے جو فارسی عربی یعنی اسلامی تہذیب کے زیر اثر معرض وجود میں آ کر ایک مستحکم و مکمل صورت اختیار کر چکی ہے۔ اگر یہ کہا جائے جیسا کہ قابل احترام پروفیسر کی تقریر کے دوران میں کہا گیا تھا کہ اس مسئلے پر مقامی زبان کے ادب سے وابستہ جذبات سے بالاتر ہو کر غور کرنا چاہیے تو یہ ایک ایسی توقع کرنے کے مترادف ہے جو نہ صرف انسانی فطرت کے خلاف بلکہ اس کے عین متضاد ہے۔ تمام سیاسی خیال اپنی قیاسی حیثیت میں محض جذبات ہوتے ہیں اور سیاسی تعقل و تفکر کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ کسی سہل اور آسان طریقے سے ان سے وابستہ تقاضات کی تسکین و تشفی کرے۔ ملیت کسی ملک کے باشندوں کے اس مشترکہ جذبے کا نام ہے جو انہیں زمانۂ ماسبق کے تاریخی واقعات حال کے مفاد اور مستقبل کی خواہشات کی زنجیروں سے آپس میں جکڑ دیتا ہے۔ اسی طرح جمہوریت بھی ایک فطری جذبہ ہے جس کی بنا پر ہر انسان یہ چاہتا ہے کہ اسے دوسرے انسانوں کے مساوی حیثیت دی جائے۔ اسی طرح اشتراکیت بھی جمہوریت سے متعلقہ اس قدرتی جذبے کی ایک شدید اور انتہائی صورت ہے۔ صوبائی داخلی آزادی کا مطلب ہی یہ ہے کہ جہاں تک صوبجات کے اندرونی معاملات کا تعلق ہے ان کو پوری پوری آزادی دی جائے کیونکہ ان کی منازل مختلف ہیں اور ان کے ان تک پہنچنے کے راستے بھی مختلف ہیں اگر صوبجات میں نسل مذہب تہذیب و تمدن اور زبان کے اختلافات موجود نہ ہوتے تو اس وقت ہندوستان کی طرف سے فیڈرل نظام حکومت کا مطالبہ نہ کیا جاتا اور نہ ہی پارلیمنٹ فیڈریشن کو قرین مصلحت سمجھتی۔ اگر یہ اختلافات اور تضاد جو مختلف صوبوں کے باشندوں کے درمیان موجود ہے آسانی سے دور ہو سکتا تو سیاسیین وحدانی نظام حکومت کے قائم کرنے پر اپنا زور صرف کرتے۔ جہاں تک ملیت کا تعلق ہے ریاست ہائے متحدہ

امریکہ کی سی ملت قائم کرنا ہمارا نصب العین ہے۔ فیڈریشن قائم کرنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ صوبجات صرف خارجی معاملات اور غیر ملکی خطرات سے تحفظ کے لیے اُس پر مرکز رہیں اور دیگر داخلی امور کے بارے میں اپنے اپنے مقامی حالات کے مطابق عمل پیرا ہوکر شاہراہِ ترقی پر گامزن ہوں ہندوستان میں ایسی ملت قایم کرنا جیسی کہ انگلستان جرمنی یا کسی اور یورپی ملک میں ہے خیال است و محال است و جنوں۔ کیونکہ مختلف امور کے متعلق باہمی یک جہتی یگانگت اور یکسانیت جو ان ممالک کے باشندوں کو حاصل ہے ہمیں نصیب نہیں۔ ایسی یک جہتی کے قیام کی کوشش بسا اوقات ملک کی اقتصادی، سیاسی، مجلسی اور دیگر ایسی سرگرمیوں کے راستے میں حائل ہو جایا کرتی ہے۔ اگر ہم ان قیاسی اور خوابی ناممکنات کے حصول کی کوشش میں لگ گئے تو اس سے سوائے تضیع اوقات کے اور کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔ اگر ان امداد و شمار کی طرف توجہ کی جائے جو اس باب کے آغاز میں رقم کئے گئے ہیں تو یہ بات ظاہر ہے کہ ہندوستان میں زبان کے اختلافات اس قدر گہرے اور شدید ہیں کہ ایک دو یا زیادہ سے زیادہ تین صوبوں کے درمیان زبان کے بارے میں یکسانیت پیدا کر دینا کوئی بڑی اور مفید مطلب کامیابی نہیں ہوگا۔ مزید براں اگر یہ بھی تسلیم کرلیا جائے کہ رومن رسم الخط کو مروج کرنے کا جہاں تک تعلق ہے اعراب اور مشتقات کی۔ نیز اس وقت تک جس قدر اردو ادب فارسی رسم الخط میں چھپ چکا ہے اس کو رومن رسم الخط میں بدلنے کی مشکلات محنت اور سرمایہ کے آگے کچھ بڑی مشکلات نہیں ہیں تو بھی رسم الخط کے متعلقہ اس بدعت کو پنجاب یا دیگر ایسے مسلم صوبجات کی ذہنیت میں ٹھونسنا جو صدیوں سے سامی الاصل ہو چکی ہے ایک کار دشوار ہے۔ اس کے علاوہ اگر فارسی رسم الخط کو غیر مستعمل کرکے اس کی بجائے رومن رسم الخط کو فروغ دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے جس قدر روپیہ اور محنت گذشتہ ۸۰ برس کے دوران میں لوگوں کے عام طبقوں کو اور خاص کر دیہاتی طبقوں کو خواندہ بنانے پر صرف کی ہے وہ سب اکارت گئی۔ عنقریب آنے والے تمام انقلابات کے پیش نظر یہ امر قرین دانش نہیں کہ ہم اس رسم الخط کو چھوڑ کر جسے ایک بڑی حد تک صوبے کے باشندے اس وقت پڑھنے کے قابل ہو چکے ہیں کسی اور رسم الخط کو رواج دینا شروع کردیں۔ لہٰذا اس کے سوا کوئی اور چارہ نہیں کہ زبان کے بارے میں صوبے کے موجودہ حالات کو برقرار رکھا جائے۔ تجربات کرنے کے لیے یہ وقت موزوں نہیں ہے۔ ہماری موجودہ فضا ایسی ہے کہ ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ ہر صوبے کی اپنی اپنی علیحدہ صوبائی زبان ہوگی اور ان کے باہمی تعلقات کو برقرار رکھنے کے لئے انگریزی کا مرہونِ منت رہنا پڑے گا۔

مفرر مذکور کے اس مشورے کے ساتھ میں کلی طور پر متفق ہوں کہ انگریزی کو سکولوں میں غیر لازمی مضمون قرار دے دیا جائے اور ان طلبا کو جو اعلیٰ یونیورسٹی تعلیم حاصل کرنے کے متمنی ہوں اور جو اپنی اعلیٰ ذاتی استعداد کا ثبوت دے کر اپنے حق کو ثابت کریں یا انگریزی کے پڑھنے کے لئے خاص زائد فیس ادا کرنے کے لئے تیار رہوں اس بارے میں زیادہ سے زیادہ سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کافی تعداد میں ایسے اشخاص پیدا ہوتے رہیں گے جو مرکزی حکومت کے سامنے نیز دنیا کے سامنے مختلف صوبوں کی نمایندگی کرسکیں گے۔

اس کے بعد ایک بڑا اعتراض جو فارسی رسم الخط کے خلاف پیش کیا جاتا ہے یہ ہے کہ اس میں ٹائپ کی لکھائی اور سانچہ کی چھپائی بہت مشکل ہے حال ہی میں حیدرآباد میں سانچہ کی چھپائی کا ایک طریقہ ایجاد ہوا ہے اس کے خلاف یہ اعتراض پیش کئے جاتے ہیں کہ اس میں اکثر حروف کے بہت سے حصے کرکے ان کے سانچے تیار کئے گئے ہیں اور ایک ایک حرف کے ان کئی کئی حصوں کو ترتیب دینے کا کام سخت محنت طلب ہوتا ہے نہ صرف یہ بلکہ پروف کی کاپیاں درست کرنا اور بھی زیادہ باعث زحمت ہوتا ہے۔ ان تمام دقتوں کا علاج یہ ہے کہ چھاپے کی ضرورتوں کے مطابق فارسی رسم الخط کے حروف کی شکلوں کو بدل دیا جائے۔ دستی لکھائی تو بدستور بہ طریق موجودہ مروج رہے لیکن چھاپے میں تبدیل شدہ حروف کا استعمال کیا جائے اور ان کو آپس میں ملانے کی بھی ضرورت نہیں اسی طرح جس طرح رومن حروف علیحدہ علیحدہ چھپتے ہیں ان کو بھی لفظ میں علیحدہ علیحدہ ترتیب دی جائے اور دو لفظوں کے درمیان کچھ فاصلہ چھوڑ دیا جائے اس طرح جس طرح انگریزی لکھی جاتی ہے۔ اس مشورے کے مطابق فارسی رسم الخط کے حروف تہجی کی نئی شکل یہ بھی ہوسکتی ہے۔

ا ب ح د ر س ص ط ع ف ک ل م ن و ہ ی ے

مثال کے طور پر عبارت کی شکل اس قسم کی ہوگی۔

ہ ن د ی ہ ی ں ہ م و ط ن ہ ے ہ ن د و س ت ا ں ہ م ا ر ا

ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اس شکل میں یا اس سے ملتی جلتی کسی اور شکل میں فارسی حروفِ تہجی

کا ٹائپ رائٹر بھی تیار ہو سکتا ہے اور اس کا کی بورڈ انگریزی ٹائپ رائٹر کے کی بورڈ کے مقابلے میں بہت سادہ ہوگا اور مشق بھی آسانی سے ہو سکے گی۔ مرقومہ صدر حروف اعراب اور گنتی کے ہندسوں کے اعداد کے علاوہ جن اور علامات کی ضرورت ہوگی وہ حسب ذیل ہیں۔

، ۔ ، ! ، ر ، ( ) ، ر ، ، ، ۔ ، ، پ ، ۔ ، ، ، ، ،

انگریزی کے ٹائپ رائٹر کے کی بورڈ پر حروف اور علامات کی کل تعداد ۷۵ ہوتی ہے لیکن اردو کے اس ٹائپ رائٹر کے کی بورڈ پر اگر یہ تیار کیا جائے تو صرف ۴۲ حروف مع علامات کافی ہوں گے۔ اس کے علاوہ انگریزی حروف میں صغیر اور کبیر کا بھی امتیاز ہے۔ اس امتیاز سے بھی جہاں تک اردو ٹائپ رائٹر کا تعلق ہے فایدہ اٹھایا جا سکتا ہے

تقلید بُرا شیوہ نہیں لیکن سمجھ سوچ کر مقلد بننا بہتر ہوتا ہے۔ اگر ترکی نے ترکی رسم الخط چھوڑ کر رومن رسم الخط کو اختیار کیا ہے تو ممکن ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ ترکی رسم الخط میں کوئی ایسے نقائص موجود ہوں کہ جن سے عہدہ برآ ہونا ناممکن یا کم از کم بے حد مشکل ہو۔ ترکی میں ایک ہی قوم آباد ہے اور اس کے افراد میں نسل مذہب تہذیب وغیرہ کے بارے میں مکمل یکسانیت موجود ہے۔ وہ کسی بات کو متفقہ طور پر رائج کر سکتے ہیں کیونکہ ان کو کسی ایسے فریق کی طرف سے مخالفت کا اندیشہ نہیں ہو سکتا جو ان سے ہر بات میں مختلف ہو۔ ترکوں نے اگر رومن رسم الخط کو اختیار کر لیا ہے تو سہولت کے پیش نظر ایسا کیا ہے نہ کہ ملت کے مختلف عناصر کے باہمی اختلافات کو مٹانے کے لئے۔ اگر ترکی میں اس قسم کے کسی تضاد کو مٹانے کے لئے ایسا کیا گیا ہوتا تو اس کی پیروی کرنا پُر مصلحت ہوتا۔ موجودہ صورت میں تقلید نقصان دہ ہے۔

"ایک پنجابی"

مباحث بالا کی تفصیل کے لئے "ہندوستان اور ریاست" مصنفہ "ایک پنجابی" ملاحظہ فرمائیں ملنے کا پتہ :-

دفتر ادبی دنیا لاہور

عشق

عشق شعلوں کا اک خزانہ ہے ، زندگی کا چراغ خانہ ہے
متحرک ہے اس سے نبضِ جہاں! ، رگِ ہستی میں مثلِ خوں ہے رواں!
یہ کہیں "آہ" اور کہیں ہے "واہ"! ، اس کی نیرنگیاں خدا کی پناہ!
دیدۂ کوہکن میں ہے آنسو! ، قصرِ خسرو میں رنگ و رامش و بُو

عشق ہر رنگ میں ہے جلوہ ریز
غمِ فرہاد، عشرتِ پرویز!

رشید احمد درویش میرٹھی

شکر پارے

کو عیسیٰ و کو خضر کہ تعبیر بپرسم! ، در خواب نہادست کسے لب بلبِ من
(؟)

ز عشق زادم و عشقم بکشت زار و دریغ! ، خبر نداد برستم کسے کہ شہرا بم
(؟)

در حیرتم کہ بانگِ جرس را چہ آرزوست؟ ، آرامِ جاں بہ محمل و بر لب شکایتے!
(؟)

غزل

مٹے ہوؤں کے نشاں تک مٹائے جاتے ہیں
چراغِ گورِ غریباں بجھائے جاتے ہیں

وہ حسن بن کے نظر میں سمائے جاتے ہیں
اس آئینے کو بھی روشن بنائے جاتے ہیں

چمن میں آکے وہ یوں گل کھلائے جاتے ہیں
نظر ہے غنچوں پہ اور مسکرائے جاتے ہیں

الٰہی خیر سے گذرے بہار اب کے برس
ابھی سے ہاتھ گریباں تک آئے جاتے ہیں

یہ لطف ہے کہ ہمیں دل بھی دیں نشانے کو
ہمیں پہ تیرِ نظر آزمائے جاتے ہیں

بڑھائی جاتی ہے میدانِ حشر کی وسعت
کسی کی زلف کے وحشی بلائے جاتے ہیں

پھر اس کی بزم میں، تقدیر کھینچ لائی ہے
برنگِ شمع جہاں دل جلائے جاتے ہیں

کہا یہ شمع نے ہو بزمِ غم، کہ بزمِ طرب
کوئی جگہ ہو ہم آنسو بہائے جاتے ہیں

ادھر جو بڑھتی ہے مائل کے دل کی بے تابی
ادھر وہ رسمِ محبت گھٹائے جاتے ہیں

محمد اسمٰعیل مائل

تلخابہ

قسم ہے تجھے،
اپنے اُن آنسوؤں کی،
تبسم سے،
دلکش تبسم سے جن کے،
بہلتی ہیں،
میری جوانی کی شامیں!

محبت کی تلخی ہے یا زہرِ قاتل؛
محبت کی تلخی نے
معصوم دل کو
سلایا ہے،
آغوشِ رنج والم میں،
میری بے بسی ہو گئی ہے فزوں تر!!

گذشتہ مسرت کے،
درہائے رنگیں
میری التجاؤں سے پھر باز کر دے!
میرے عشقِ رسوا کو اک راز کر دے!

"شہپر"

نیرنگِ انتقام

چند احباب نشست گاہ میں بیٹھے ایک حیرت انگیز خون کے مقدمے پر گفتگو کر رہے تھے۔ مسٹر مولو جو کبھی سرکاری وکیل رہ چکے تھے۔ بولے مجھے ایک اور اسی قسم کا مقدمہ یاد ہے میں اُن دنوں ریٹی میں سرکاری وکیل تھا۔ والد چونکہ پیرس میں ایک مشہور جج تھے اس وجہ سے میں نے ترقی کے زینے بسرعت طے کئے اور اُن ہی کی سفارش سے مجھے موردن کا مقدمہ ملا تھا۔

ایک شخص نے قطع کلام کرکے کہا ـــــ میں نے سنا ہے وہ بڑا ہی حیرت خیز مقدمہ تھا"!

جی ہاں ـــــ" میں نے جواب دیا موردن کمسن بچوں کا اتالیق تھا کیونکہ وہ ہر ایک زبان کا ماہر و منتہی تھا نیز وہ چھوٹے بچوں کو بڑی محبت اور توجہ سے تعلیم دیتا تھا اس لئے خواص و عوام دونوں کی نظر میں اُس کی بہت قدر و منزلت تھی۔

اس نے مکتب کی بنا کیوں ڈالی؟ یہ تو کوئی وثوق سے نہیں کہہ سکتا البتہ یہ مشہور بات تھی کہ اُس کے تین لڑکے یکے بعد دیگرے اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے جس کا اس کو انتہائی صدمہ تھا چنانچہ اس نے اپنا غم غلط کرنے کے لئے ایک مکتب کی بنیاد ڈالی اور اپنا تمام وقت درس و تدریس میں صرف کرنے لگا اس کا ذوق تدریس اس قدر بڑھ گیا تھا کہ وہ طلبا کو تعلیم کا شوق دلانے کے لئے ہر ممکن کوشش کرتا حتیٰ کہ اپنی جیب سے اُن کے لئے کھلونے اور مٹھائیاں خریدتا اس کے اس برتاؤ اور توجہ سے مدرسے میں طلبا کی ایک معقول تعداد جمع ہو گئی تھی۔ موردن کے طرزِ تعلیم پر ہر شخص اس کا مداح تھا۔ چونکہ وہ طلبا سے اپنے بچوں کی طرح محبت کرتا تھا اس لئے والدین اپنے بچوں کو اس کے سپرد کر کے بے فکر ہو جاتے تھے۔

لیکن مکتب کے پانچ طلبا کا یکایک مر جانا دلوں میں کھٹکنے لگا کوئی کہتا کہ پانی خراب ہوگیا ہے کوئی کہتا گرمی کی وجہ سے بیماری پھیل گئی ہے جتنے منہ اتنی باتیں تھیں لیکن سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ تھی کہ بخار کسی کو نہیں آیا صرف وہ کمزور ہو جاتے اور پیٹ کے درد کی تکلیف سے دم توڑ دیتے۔

ان میں سے ایک بچے کا پوسٹ مارٹم ہوا لیکن جب اس کی موت کی وجہ سمجھ میں نہ آسکی تو اُس کی آنتیں پیرس معائنہ کے لئے بھیج دی گئیں مگر وہاں سے بھی کوئی تسلی بخش جواب نہ آیا۔

اس کے ایک سال بعد تک نہ کوئی طالب علم بیمار ہوا اور نہ کوئی مرا پھر یکایک دو تندرست و توانا طالب علم جن سے موردن بہت محبت کرتا تھا چند روز بیمار رہ کر چلتے ہوئے ان کا پوسٹ مارٹم ہوا تو اُن کی آنتوں میں سے کانچ کے ذرے اور سوئیوں کے ٹکڑے ملے۔

عام طور پر گمان تھا کہ اُن کے کھانے میں غلطی سے کوئی ایسی چیز مل گئی ہے جس میں کانچ کے ذرے تھے حالانکہ بورڈنگ ہاؤس میں کھانے کا معقول انتظام تھا بالخصوص کھانے کے معاملے میں وہ بہت سخت تھا کبھی طلبا کو خراب کھانا کھانے نہیں دیتا تھا۔

معاملہ زیادہ طول نہ کھینچتا اگر اُن ہی دنوں میں بورڈنگ ہاؤس کی ملازمہ بیمار نہ ہو جاتی وہ بھی اسی عارضے میں مبتلا ہوئی جو طلبا کو لاحق ہوا تھا۔ ڈاکٹر کی مزید تشخیص پر ملازمہ نے کہا موردن نے طلبا کے لئے جو مٹھائی رکھی تھی وہ میں نے چوری سے کھالی۔

عدالت کے حکم سے بورڈنگ ہاؤس کی تلاشی لی گئی تو ایک الماری سے بچوں کے لئے رکھی ہوئی مٹھائی برآمد ہوئی مٹھائی کا ڈاکٹری امتحان ہوا تو پتہ چلا کہ اس میں کانچ کے سفوف کی آمیزش ہے۔

موردن گرفتار کر لیا گیا لیکن اُسے اپنی گرفتاری پر کچھ رنج یا افسوس نہ تھا ثبوت اس قدر صاف تھا کہ مزید شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی لیکن ملزم

کی نیک مزاجی اور پارسائی کی وجہ کسی طرح یہ بات قیاس میں نہ آتی تھی کہ اُس نے طلباء سے ایسی دشمنی کیوں کی۔ وہ ان سے بے انتہا محبت کرتا تھا اور اپنی آمدنی کا نصف حصہ اُن پر خرچ کر دیتا تھا۔ پھر اگر اس نے قصداً ایسی حرکت کی تو وہ یقینی پاگل ہوگا لیکن ایک ذہین اور عقل مند استاد جس کا برتاؤ طلباء سے باپ جیسا رہا ہو اُسے کیوں کر پاگل کہا جا سکتا ہے۔

وہ جس دکان سے مٹھائی خریدا کرتا تھا اس دکان کی بھی تلاشی لی گئی لیکن دکان سے کوئی ضرر رساں شے دستیاب نہ ہوئی معاملہ صاف ہو گیا۔

سننے والوں میں سے ایک نے دریافت کیا "موررن نے اپنے بچاؤ کے لئے کیا کیا؟"

اُس نے اپنا بیان دیا کہ "یہ حرکت اس کے کسی دشمن کی معلوم ہوتی ہے یا ممکن ہے کسی کو اُن طلباء سے دشمنی ہو اور اس نے کسی موذی کو روپے کا لالچ دے کر ابھارا ہو کہ ان کے کھانے میں کوئی ایسی مہلک چیز ملا دے جس سے وہ جانبر نہ ہو سکیں چنانچہ اُس ظالم نے مٹھائی میں ایسی آمیزش کر دی اور اتفاق سے وہ مٹھائی ان طلباء کے کھانے میں آ گئی۔

اُس کا بیان حقیقت پر مبنی معلوم ہوتا تھا اور بیان دیتے وقت اُس نے ایسی شکل بنائی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بالکل بے گناہ ہے بہت ممکن تھا ہم اُس کے بیان پر اُسے رہا کر دیتے لیکن ناگہاں اُس کے خلاف ایسا سنگین ثبوت ملا جس نے اُسے صحیح معنوں میں مجرم قرار دے دیا اور وہ ثبوت یہ تھا کہ اُس کے کمرے میں ایک ہلاس کی ڈبیا ملی جس میں کانچ کا چورا بھرا تھا اور وہ ڈبیا ایسی جگہ سے ملی جہاں وہ اپنا روپیہ رکھتا تھا تاہم اس نے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے کہا یہ بھی اس کے دشمن کی کارستانی ہے کیونکہ وہ خفیہ طریقے سے اسکول میں آ جاتا تھا۔

ایک دن ایک بساطی نے آ کر گواہی دی کہ موررن نے اُس کی دکان سے باریک سوئیاں خریدی تھیں اور امتحاناً ایک سوئی کو توڑ کر دیکھا تھا کہ وہ اس کے کام کی ہے یا نہیں بساطی نے ایک درجن گواہ پیش کئے جنہوں نے موررن کو پہچانا اور پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ موررن طلباء کو اپنی نگرانی میں مٹھائی کھلاتا تھا۔

اس کو پھانسی کا حکم ہوا اُس نے اپیل کی مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا تاہم اُس نے درخواست دی کہ اس کی پھانسی کا حکم چند روز کے لئے ملتوی کر دیا جائے میں جانتا تھا کہ اس کی درخواست کبھی منظور نہ ہوگی کیونکہ اس کا جرم بہت سنگین تھا۔

ایک دن میں آفس میں بیٹھا تھا کہ جیل کے پادری مجھ سے ملنے آئے انہوں نے اپنی تمام زندگی قیدیوں میں گذاری تھی۔ وہ بہت تجربہ کار آدمی معلوم ہوتے تھے لیکن ان کی صورت کسی اندرونی انتشار کا پتہ دے رہی تھی۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی بات چیت کے بعد جب وہ جانے لگے تو مجھ سے کہہ گئے "آپ بے گناہ موررن کو پھانسی دے رہے ہیں"

اُن کے اِن الفاظ نے مجھ پر بہت اثر کیا چنانچہ میں اُسی وقت صدرِ جمہوریہ کی خدمت میں مقدمے کی تفصیلات بیان کرنے روانہ ہو گیا۔

جب میں حضور کے سامنے بیٹھا تفصیل بیان کر رہا تھا تو کمرے کا دروازہ کھلا اور بیگم صاحبہ کمرے میں داخل ہوئیں انہیں میری موجودگی کا علم نہ تھا وہ مجھے دیکھ کر واپس ہونے لگیں تو حضور نے انہیں بیٹھ جانے کو کہا جب وہ بیٹھ گئیں تو حضور نے انہیں موررن کا مقدمہ سمجھایا وہ سن کر کہنے لگیں "اس شخص کو معاف کر دیا جائے وہ بے گناہ معلوم ہوتا ہے"۔

حضور پس و پیش کرنے لگے کیونکہ وہ اس واقعے سے سخت برافروختہ تھے تاہم وہ انصاف کرنا چاہتے تھے ملکہ نے کہا "ایک بے گناہ کو قتل کر کے گناہ گار کو چھوڑ دینا قرین انصاف نہیں"۔

حضور نے ان کی بات مان لی اور موررن کی پھانسی کا حکم منسوخ کر دیا۔

. . . . .

اس کے کئی سال بعد گرمی کے موسم میں اپنے چچا زاد بھائی کے ہاں بیٹھا تھا کہ ایک پادری آیا اور اس نے مجھ سے کہا "ایک شخص مر رہا ہے اور وہ آپ سے ملنا چاہتا ہے"۔

میں اس کے ساتھ ایک شکستہ مکان میں گیا ایک تنگ و تاریک کمرے میں ایک آدمی بستر پر پڑا تھا اس کا جسم بالکل لاغر ہو چکا تھا اور شکل سخت خوفناک ہو رہی تھی مجھے دیکھتے ہی اس نے پوچھا "آپ مجھے پہچانتے ہیں"۔؟

میں نے اپنے حافظے پر زور دے کر کہا ــــ "نہیں"۔

اُس نے کہا "میرا نام موررن ہے ــــ میں وہی اسکول ماسٹر ہوں"۔

میں اُسے پہچان کر کانپ گیا میں نے دریافت کیا "تم یہاں

کیسے آئے!

اُس نے کہا "یہ قصہ بہت طویل ہے اور اب میرا آخری وقت آپہنچا ہے۔ میں نے آپ کو اس لئے تکلیف دی کہ میں آپ کا شکریہ ادا کرلوں کیونکہ آپ ہی نے مجھے پھانسی سے بچایا تھا۔

ایک لمبی سی سانس لے کر اُس نے سلسلہ کلام جاری رکھا میں آپ سے جو کچھ عرض کرنے والا ہوں آپ اُسے بالکل سچ تصور کیجئے اسی صورت میں اطمینان کی موت مرسکتا ہوں۔ اس میں کلام نہیں کہ میں ان معصوم بچوں کا قاتل تھا لیکن میں نے ایسا کیوں کیا؟ محض قدرت سے انتقام لینے کے لئے دنیا جانتی تھی کہ میں ایک نیک اور متقی شخص ہوں اور میں بھی اس کی قدرت پر اعتقاد رکھتا تھا اور اُس کے رحم و انصاف کا قائل تھا لیکن میرا اعتقاد غلط ثابت ہوا مجھے معلوم ہوگیا کہ خدا دھوکا باز ہے۔ اس نے میرے پیارے بچوں کو مجھ سے چھین لیا۔

میں اُن بچوں سے دیوانہ وار محبت کرتا تھا۔ اس میں مطلق مبالغہ نہیں کہ میں اُن سے اتنی محبت کرتا تھا کہ آج تک دنیا میں کسی باپ نے اپنے بچوں سے نہ کی ہوگی میں دنیا میں صرف اُن ہی کے لئے زندہ تھا لیکن افسوس وہ سب رخصت ہوگئے۔

میں نے ایسا کیوں کیا؟ ان معصوم بچوں نے میرا کیا بگاڑا تھا کہ میں نے اُن کے خون میں اپنے ہاتھ رنگے؟

مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ زندگی کچھ نہیں —— اس کی کوئی قیمت نہیں زندگی صرف ضائع ہونے کے لئے ہے انسان قدرت کے خلاف جنگ کر رہا ہے۔ چنانچہ میں نے بھی اس کے خلاف جنگ کی لیکن شکست ہونے پر میں نے اُس سے انتقام لینے کی ٹھانی میں خدا سے نفرت کرنے لگا۔

میں نے عہدِ مصمم کر لیا تھا کہ جس طرح اس نے میرے بچوں کو مجھ سے چھین لیا تھا اس طرح میں بھی اُس کے بنائے ہوئے ہنستے کھیلتے کھلونوں کو توڑ ڈالوں گا چنانچہ طلبا کو ایک ایک کرکے ختم کرنے لگا اگر میں گرفتار نہ ہوتا تو اور بچوں کو بھی موت کی نیند سلا دیتا لیکن مجھے پھانسی کا حکم ہوا لیکن میں مرنا نہیں چاہتا تھا میں مرجاتا تو خدا مجھ پر ہنستا میرا مذاق اڑاتا اس لئے پادری سے قسم کھا کر میں نے جھوٹ کہا اور اس جھوٹ نے مجھے بچا لیا لیکن اب میں اس کی گرفت سے نہیں بچ سکتا مجھے اب اس کی پروا بھی نہیں۔

یہ کہہ کر وہ چپ ہوگیا اس کا جسم پتے کی طرح کانپنے لگا۔ انگلیاں سکڑنے لگیں۔

میں نے دریافت کیا "کچھ اور کہنا چاہتے ہو؟"

"نہیں —— صاحب" اُس نے جواب دیا۔

میں نے پادری کی طرف دیکھا اس کا کالا لباس دیوار پر موت کا سیاہ عکس ڈال رہا تھا۔

مورون نے کہا "آپ یہاں ٹھہرئے"۔

مورون نے مجھ سے کہا "—— پادری خدا کا نام بار بار لے کر مجھے چڑاتا ہے چڑائے مجھے کوئی فکر نہیں"۔

میں کمرے سے نکل کر سڑک پر آگیا۔

(فرانسیسی)

تقی علی ہاشمی

رباعی

بانکا مرے جان کا سبب اُس بن ہو جا
آزاد مے و سراحی و گلابی ہو جا
ہو ولولۂ عمل سے آشنا تنہا
بے منت جام و مے شرابی ہو جا

سید محمد عسکری بی اے

تعبیرِ جنوں

تُو، ترے ہونٹوں کی شیرینی، ترا رنگیں شباب،
وہ ترے جلووں کی رعنائی کی بے پروائیاں
وہ ترے شیریں تبسم کی نمودِ بے حجاب
وہ ترے حسنِ جنوں زا کی جنوں آرائیاں
خوابِ رنگیں تھا یہ، رنگیں تر مگر تعبیر تھی

آہ! تو نے کچھ مرے جذبات کی پروا نہ کی
میرے دل کے نازک آئینے کی قدر اصلا نہ کی
آہ! یہ دنیا تھی عشقِ باہمی کا اک فسوں
وہ تری پرکیف رنگینی، مرا جوشِ جنوں!

تھا مرے چاروں طرف گویا ترا اپنا خیال!
اور مری تخلیق تیرا پیکرِ حسن و جمال!
میں تری تصویر تھا اور تو مری تصویر تھی

خواجہ حمید عرفانی ایم اے

غزل

جنوں نے کر دیا ہے مجھ کو بیگانہ گلستاں سے
بہار اٹھکیلیاں کرتی ہے کیوں چاکِ گریباں سے

تو کیا تم پرسشِ دل کے لئے اب بھی نہ آؤ گے
کہ آنسو خون کے بہنے لگے ہیں چشمِ گریاں سے

جو آزادی میں میرے آشیاں پر رقص کرتی تھیں
کبھی وہ بجلیاں ٹکرائیں آ کر بابِ زنداں سے!

سلامت رہ سکے گی زندگی اس کا بھروسہ کیا؟
کہ اب دستِ جنوں آگے ہے کچھ چاکِ گریباں سے

ہماری جستجو ہے عالمِ حیرت میں دنیا کو
کہ اُس کی جستجو میں بڑھ چلے ہیں حدِّ امکاں سے

نہ جانے کس قدر ہیں تشنہ لب اس خاک میں پنہاں
صدائے العطش آتی ہے ذراتِ بیاباں سے

بتا اے ناخدا کیونکر ہو وہ آسودۂ ساحل
ابھرنا ہی جسے آتا نہ ہو موجوں کے طوفاں سے

یہ نالے یہ فغاں بیکار ہیں ان کی محبت میں
ظفرؔ آسودگی پاؤ گے ضبطِ دردِ پنہاں سے

نذیر احمد ظفرؔ

غزل

تیرگیٔ فراق ہے صبح سے بے نیاز کیوں؟ عشق ہے جانگداز کیوں؟ حسن ہے محوِ ناز کیوں؟
اب نہ وہ بزمِ ناز ہے اور نہ جلوہ سازیاں کر دیا میرے عشق نے حسن کو بے نیاز کیوں؟
نالۂ دل ہے بے اثر، دل نہیں سنگ ہی سہی! کون یہ کہہ سکے مگر سنگ ہے بے گداز کیوں؟
میرا جہان اور ہے تیرے خیال سے پرے پوچھ رہی ہے تو صبا میرے جنوں کا راز کیوں
سینہ جوئبار میں کیوں ہے یہ جوشِ اضطراب؟ دامنِ ابر جل نہ جائے برق ہے شعلہ ساز کیوں

محو تھی ایک کائنات، جھوم رہے تھے بحر و بر
خونِ جگر کی داستاں ہو نہ سکی دراز کیوں؟

مسعود حفیظ

دنیائے ادب

اُردو کی شُستگی و نفاست میں آگرے کا حصہ

مغربی تمدن کی ترقی کے ساتھ علوم و فنون نے جو ارتقائی مدارج طے کئے ہیں وہ آج ہمارے سامنے ہیں بعض روایت کو ناکافی و غیر مفید دیکھ کر تاریخ نویسی کا دستور قدیم مسترد ہوا اور اس کی بنا درایت پر مستحکم کی گئی۔ ہمارے مورخوں نے بھی قدیم طرز واقعہ نگاری کی شکایتیں کیں اور جدید اسلوب اختیار کیا۔ مگر جب ہم زبان اردو کے جدید مورخین کی تالیفات پڑھتے ہیں تو سخت حیرت میں پڑ جاتے ہیں۔ قدیم تذکرہ نویسوں سے اگر کچھ فروگزاشتیں ہوئیں تو ان کی طرف سے متعدد معقول عذر لائے جا سکتے، لیکن عہدِ حاضر کا واقفِ فن لسانی مورخ اپنی تنگ نظری و فقدان درایت کی کیا توجیہہ پیش کر سکتا ہے!

اس مقالے میں ہم اس فروگزاشت کی تصریح اور ازالے کی کوشش کریں گے کہ اردو کے ارتقا، شستگی و صفائی میں آگرے کی ارباب علم و ہنر نے ہر دور میں نہایت معقول حصہ لیا ہے، اور اس ذیل میں آگرے کی خدمات نہایت وزنی ہیں؛ لیکن ایک صفیر بلگرامی کے ماسوائے ہمارے مورخوں نے ارتقائے اردو کی تاریخ قلمبند کرتے وقت آگرے کی ان خدمات کو نظر انداز کیا ہے؛ اور اگر کہیں یہ ذکر ناگزیر طور پر آ گیا ہے تو اس طرح بیان کیا ہے کہ آگرے کا نام نہ آنے پائے۔ متقدمین میں سے ہم مثال کے طور پر میرامن دہلوی کے دیباچہ، باغ و بہار سے ایک اقتباس پیش کرتے ہیں۔

> "جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم قدردانی و فیض رسانی اس خاندان لاثانی کی سن کر حضور میں آکر جمع ہوئے لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدا جدا تھی، اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین، سودا سلف، سوال جواب کرنے کے لئے ایک زبان اردو مقرر ہوئی۔"

ہر چند میرامن نے یہ عبارت مورخ کی حیثیت سے نہیں لکھی۔ لیکن ایک تاریخی بیان ضرور ہے۔ مگر ہمیں ان سے تعرض نہیں کہ انہوں نے اکبر کے پایہ تخت کا نام لینا کیوں روا نہ رکھا۔ وہ فی الحقیقت کوئی تاریخ مرتب نہیں کر رہے تھے اور کہا جا سکتا ہے کہ وہ جدید فن تاریخ نویسی سے واقف بھی نہ تھے لیکن اگر عہد حاضر کا کوئی مورخ اس فروگزاشت کا اعادہ کرے تو باز پرس لازمی ہو جاتی ہے۔ اس کی ایک مثال ہم شعر الہند سے دیتے ہیں:۔

> "۔۔ تیمور کے بعد شمالی ہند میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے قدرتی اختلاط کے علاوہ اکبر کے زمانے میں مختلف قوموں کے اختلاط کا ایک مصنوعی سبب اور پیدا ہو گیا یعنی اکبر نے قلعے میں ایک زنانہ بازار قایم کیا ۔ ۔ ۔"

ہمیں تسلیم ہے کہ صاحب شعر الہند کی نیت بخیر تھی، لیکن اس عبارت کے پڑھنے سے یہ سوال از خود پیدا ہوتا ہے کہ اکبر کا یہ قلعہ جہاں وہ بازار قایم ہوتا تھا کس مقام پر واقع تھا؟ اور جب یہ ظاہر ہے کہ وہ مقام آگرے کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا تو ہمارے مورخ کو آگرے کا نام لینے کیا قباحت محسوس ہوتی تھی!

ہمارے اس بیان سے یہ خیال نہ ہونا چاہئے کہ ہمارا مدعا آگرے کا تفوق قائم کرنا یا اس کی مرکزیت تسلیم کرانا ہے۔ ہمارا مقصود صرف ایک تاریخی فروگزاشت کا ازالہ کرنا ہے

اردو کی تاریخوں کے مطالعے سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ شمالی ہند میں زبان کا وہ دور تو متعین ہے جب مختلف زبانوں کے الفاظ مخلوط ہو رہے تھے اور نصف ہندی و نصف فارسی اشعار کی مثالیں بھی بہم ہو گئی ہیں۔ لیکن اس کے بعد ڈھلی ڈھلائی اور صاف شستہ زبان میں اساتذۂ متقدمین کے دیوان ہمارے سامنے آ جاتے ہیں۔ امیر خسرو کی مثالوں کے بعد مخلوط زبان کے دس پانچ شعر ملتے ہیں اور پھر دفعتًا دکنی شعرا کا کلام پیش ہو جاتا ہے۔ شمالی ہند میں زبان کے بننے اور اس کے سدھرنے کی کڑی غائب نظر آتی ہے جس کو ہمارے مورخین زبان نے دکنی شعرا کے کلام سے مرتب کر کے دکھا دیا ہے لیکن ہم اس کڑی کو شمالی ہند میں ڈھونڈھنا چاہتے ہیں؛ اور معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ مخلوط زبان، زبان کی حیثیت پا کر صاف و شستہ کہاں ہوئی؟ اور وہ کونسا مرکز تھا جہاں یہ عمل ہوتا رہا کہ جس نے دورِ اول کے اساتذہ مہیا کر دیئے؟

اگر بعض فلاسفہ کی اس رائے کو پیش نظر رکھا جائے کہ واقعات کے اخذ و انتقاط میں ایک مورخ اپنے رجحان طبع و پسند کو ترک نہیں کر سکتا اور اس لئے تاریخ ایک فردِ واحد کی رائے اور مذاق طبیعت کا آئینہ ہونے سے زیادہ نہیں، تو ہماری سمجھ میں آ جاتا ہے کہ آگرے کو نظر انداز کر دینے کا سبب سوا اس کے دوسرا نہیں ہو سکتا کہ دہلی و لکھنو کی مرکزیت کا خیال ہمارے مورخین زبان و ادب کے دماغوں میں عصبیت کی حد تک راسخ ہو گیا ہے اور ان کو اس ذیل میں کسی تیسرے مقام کا نام لینا بھی گوارا نہیں۔

تاریخی مباحث سے گفتگو کرتے وقت "پسند و رجحان" کے کلیئے سے ہم اپنے آپ کو بھی محفوظ نہیں سمجھتے، لیکن بایں ہمہ یہ حق ہم کو ضرور حاصل رہتا ہے کہ ہم ایک مورخ کے کسی واقعے کو قلمبند کرنے یا قلم انداز کر دینے پر جرح و تعدیل کر سکیں۔

یہ بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے کہ اردو کی ابتدا کہاں سے ہوتی اور اس کی جنم بھومی بننے کا فخر دکن کو حاصل ہے یا پنجاب کو۔ لیکن اس کے آغاز کے متعلق چند اشارات ناگزیر ہیں۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ مسلمانوں کے تداخل ہند کے ساتھ جس مخلوط زبان کی بنا پڑی اس نے عملی صورت اختیار کرنا کب سے شروع کیا؟ اگر غور کی نظر ڈالی جائے گی تو اردو کے عملی جامہ پہننے کی ابتدا اس وقت سے نظر آئے گی جب سکندر سوری نے آگرے کو پایۂ تخت بنایا اور ہندوؤں نے فارسی زبان سیکھنا شروع کیا۔ منتخب التواریخ سے اس عہد کے بیان میں ہمیں پنڈت ڈونگر مل کا نام ایک فارسی کے شاعر کی حیثیت سے ملتا بھی ہے جو غالبًا فارسی کا یہ پہلا ہندو شاعر تھا۔

بہر حال اس امر کے ثبوت میں کافی و وافی شہادت ملتی ہے کہ اس مخلوط زبان نے عہدِ اکبری میں ایک شکل اختیار کرنا شروع کر دیا تھا، جس میں اکبر کا مینا بازار معقول حد تک ممد و معاون ثابت ہوا۔ یہ حقیقت ہمارے پیش نظر ہے کہ قریب قریب اس عہد میں یہی کام دکن میں بھی جاری تھا؛ اور کہا جا سکتا ہے کہ اردو کی تشکیل میں مغلیہ و قطب شاہی درباروں کو برابر کا درجہ حاصل ہے۔ لیکن دقتِ نظر کے ساتھ دیکھنے پر یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ اردو جس زبان کا نام ہے۔ وہ برج بھاشا کی ترقی یافتہ صورت ہے اور اس کی تشکیل آگرے ہی میں ہو سکتی تھی۔ کیونکہ آگرہ خود برج میں داخل ہے۔ دکن میں جو زبان بن رہی تھی اس کی بنا برج بھاشا نہیں بلکہ دکنی بولی ہو سکتی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ مولف آبِ حیات کو اس معاملے میں مغالطہ ہوا اور مورخین مابعد آنکھ بند کر کے نکالا کرتے رہے۔ نُہ سپہر میں امیر خسرو کے بیان سے یہ بات مصدق ہے کہ دکنی ایک جداگانہ بولی تھی۔ یہ ایک دوسری بحث ہو گی کہ آیا دکنی اور بھاشا میں کوئی تعلق تھا یا نہیں اور دکنی شاعری اردو شاعری میں کب اور کیسے مدغم ہوئی؟

تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں سے یہ بات مخفی نہ ہونا چاہیئے کہ شاہجہاں نے دہلی آباد کر کے جب اپنا پایۂ تخت آگرے سے وہاں منتقل کر لیا تو اس کے بعد بھی بہت عرصے تک آگرہ نہ صرف علمی و ادبی مرکز بنا رہا بلکہ سیاسی چالوں اور ریشہ دوانیوں کا تماشا بھی آگرے ہی کے اسٹیج پر کھیلا جاتا رہا اور اس امر کی شہادت بھی تلاش کرنا نہ پڑے گی کہ دکن میں اورنگ زیب کی وفات تک دہلی برائے نام پایۂ تخت تھا ورنہ تمام سیاسی واقعات و امور آگرے ہی میں رونما ہوتے اور طے پاتے رہے اور ارباب فضل و کمال کی جو محفل عہد اکبری سے قائم تھی۔ وہ اس وقت تک آگرے ہی میں جمی رہی۔ اس لئے ناگزیر طور پر یہ مستنبط ہو جاتا ہے کہ شمالی ہند میں تشکیل اردو کا عمل اسی مجلس کے ہاتھوں سرانجام پاتا رہا۔ یہ ہمارے محقق مورخوں کا کام تھا کہ ان تاریخی واقعات پر نظر کرتے شواہد کی جستجو کرتے اور اس کڑی کو شمالی ہند ہی کے اندر مرتب کرتے۔

اگر آگرے کے ساتھ یہ بے اعتنائی نہ برتی گئی ہوتی تو ہمارا خیال ہے کہ ارتقائے زبان کی یہ گم شدہ کڑی منطقی نتائج کی صورت میں از خود مل گئی ہوتی۔ بہر حال ایک لسانی محقق کے لئے یہ میدان آج بھی کھلا ہوا ہے۔ اردو زبان کے ارتقا کا مختصر خاکہ ذیل کے اقتباس میں پیش کیا جاتا ہے۔ صفیر بلگرامی جلوۂ خضر میں لکھتے ہیں:۔

"امیر خسرو نے اس طفل نو خیز کو نظر توجہ سے دیکھا مگر اکبر نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور چاہا کہ اس کو سرفرازی کا خلعت بخشا جائے اور خلعت کی تیاری میں مصروف ہوا۔ راجاؤں کی بیٹیاں گھر میں لا، ہزاروں سہیلیوں سے اپنا محل بھر دیا۔ علما سے ہندی کتابوں کا ترجمہ کرایا۔ ہندو کو دربار میں دخل دیا اور ان سے بات چیت کا موقع ہر طرح رکھا۔ بیربل کی شوخیاں مشہور عام ہیں۔ مکانات اور ظروف و اشیاء کے نام ہندی یا ہندی فارسی آمیز رکھے، اور محل میں مینا بازار ہوا۔ یہ سب خلعت اردو کے سامان ہیں۔ مگر اس کو بھی زندگی نے مہلت نہ دی کہ ابھی خلعت نا تیار تھا کہ اکبر تمام ہوا۔ حقیقت میں جیسی توجہ دل اکبر نے ہندیوں کی طرف کی تھی اگر وہ اور زندہ رہتا تو اردو کی صورت اسی وقت میں سب کو نظر آتی۔ اور دربار میں یہی زبان شائع ہو جاتی۔ مگر یہ بھی واضح رہے کہ اکبر نے اپنا پایۂ تخت آگرہ میں مقرر کیا تھا اور ہمیشہ وہیں رہتا تھا۔ دہلی کو اس عہد اکبری سے چنداں حصہ نہ ملا۔"

جلوۂ خضر کے صفحہ نمبر ۵۵ پر درج ہے:۔

"جہانگیر کے وقت میں بھی یہی بازار قایم رہا۔ شاہ جہاں کے دور میں اور ترقی ہوئی کہ یکایک اکبر آباد سے شاہ جہاں کا دل اچاٹ ہوا اور دہلی جا بسایا۔ آگرے میں شاہجہاں کے وقت میں اردو کی صورت قایم ہونا اچھی طرح ثابت ہوتا ہے۔ بادشاہ کے دربار و دفتروں کی زبان فارسی تھی مگر اردو اس کے عہد میں زبانوں پر آ چلی تھی ... میں نے شاہ جہاں کی ایک تحریر اردو میں بادشاہ کے نام لکھی ہے جو اس وقت یاد نہیں"

اب ہم مختلف زبان کے چند ایسے اشعار پیش کرنا چاہتے ہیں جو اردو کی تشکیل کو صدق کرنے کے ساتھ اس کا بھی ثبوت ہیں کہ آگرے میں مغلیہ دربار قایم ہونے تک زبان میں روانی آ چلی تھی اور اس منزل پہنچ گئی تھی جس کے بعد دور اول کے شعرا کا کلام رونما ہونا مستبعد نہیں رہتا، اور یہ کہ شمالی ہند میں اردو کا استحکام بلا واسطہ ہوا اور اس میں دکنی شعرا کا کوئی حصہ نہ تھا۔

صاحب جلوۂ خضر نے تزک جہانگیری کے حوالے سے اکبر کی ایک رباعی نقل کی ہے جو اس نے جہانگیر کی درخواست معذرت پر لکھی تھی۔

پوچھی جو گھڑی مجھ سے براہ عادت
تو وصل کو ساعت کی نہیں کچھ حاجت
ہو جاتی ہے ملنے سے مبارک ساعت
ساعت کا بہانہ نہیں، خوش ہر ساعت

خندۂ گل کے مولف نے ملا ابوالحسن دو پیازہ کا ذیل کا شعر نقل کیا ہے۔

وہ گورا گورا لڑکا بامن کا شوخ گھونا
ایسا لگے ہے مجھ کو جوں کھانڈ کا کھلونا

مغل اور اردو میں جلوۂ خضر کے حوالے سے نور جہاں کے دو شعر منقول ہیں۔

دیں جگہ زخم وفا کو دل صد چاک میں ہم
دیکھیں گر کچھ بھی وفا اس بت بے باک میں ہم
نقش پا کی طرح اسے راحت جان عاشق
تیرے قدموں سے جدا ہو کے ملے خاک میں ہم

خمخانۂ جاوید میں پنڈت چندر[illegible] اکبرآبادی کے دارا شکوہ کے میر منشی تھے کچھ شعر نقل کئے گئے ہیں۔ ایک شعر درج کیا جاتا ہے:۔

خدا نے کس شہر اندر ہمیں کو لائے ڈالا ہے
نہ دلبر ہے نہ ساقی ہے، نہ شیشہ ہے نہ پیالا ہے

مغل اور اردو میں جلوۂ خضر کے حوالے سے زیب النسا سے منسوب تین شعر درج ہیں۔ ایک شعر پیش کیا جاتا ہے۔

جدا ہو مجھ سے مرا یار یہ خدا نہ کرے
خدا کسی کے تئیں دوست سے جدا نہ کرے

اسی سلسلے میں کہ دکن کی شاعری کے دہلی میں متعارف ہونے سے قبل شمالی ہند میں شعر کس درجے پر تھا، اور بھی چند مثالیں پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

میر حسن نے اپنے تذکرے میں ایک شاعر متخلص بہ خاکی کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ دہلی میں درویشانہ زندگی گزارتا تھا۔ صاحب گل رعنا کا قول ہے کہ اس وقت تک دلی میں اردو شاعری کا سراغ نہیں ملتا" لیکن بقول صاحب گل رعنا سید محمد بن جلال الدین قادری متخلص بہ خاکی کا ایک ردیف وار مکمل دیوان مولانا حبیب الرحمان شروانی کے کتب خانے میں ملتا ہے اور دیوان کے علاوہ خاکی کی ایک مثنوی موسوم بہ فیض عام مورخہ سنہ ۱۱۴۲ھ بھی ہے۔ صاحب گل رعنا کا خیال ہے کہ میر حسن نے جس خاکی کا ذکر کیا ہے وہ یہی خاکی ہے، جس کے تین شعر ہم گل رعنا سے یہاں نقل کرتے ہیں:۔

جائز نہیں تھیں ہجر کے شب کی شکایتیں
مجھ کوں خصوص آج تو للہ و مال تھا

اپنے معشوق سنگ ہو رہنا، ایک دل ایک رنگ ہو رہنا
خوش یہی حال ہے فقیری کا نفس و دل بیچ جنگ ہو رہنا

مرزا عبدالقادر بیدل کے دو شعر اکثر تذکروں میں آئے ہیں ایک شعر یہ ہے:۔

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم ہیں۔
اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم ہیں

قزلباش خاں امید کے دو شعر ملاحظہ ہوں:۔

در و دیوار سے اب حجت ہے یار بن گھر میں عجب صحبت ہے
تیری آنکھوں کو دیکھ ڈرتا ہوں الحفیظ الحفیظ کہتا ہوں

مذکورہ بالا اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ شمالی ہند میں عہد عالمگیری ہی میں اردو زبان شعرائے دکن کی محمد شاہی عہد کی زبان سے کہیں زیادہ صاف و شستہ تھی ولی کی اس زبان سے بھی جب تک کہ اس نے دہلی کا اثر قبول نہ کیا تھا۔ یہاں یہ فراموش نہ ہونا چاہئے کہ اگر شاعری اس وقت دکن ہی میں تھی تو دہلی میں وہ کونسی خصوصیت تھی جس کی طرف شاہ گلشن نے ولی کو توجہ دلائی؛ اور جس کے اختیار نہ کرنے سے بھی زبان اس قدر نکھر کس طرح گئی!

اب ہمیں اس بات کو دیکھنا ہے کہ زبان میں یہ سلاست و روانی پیدا ہو جانے کا مرکز کہاں تھا؟ جس قدر تلاش و جستجو کی جائے گی جتنی شہادت فراہم ہو سکے گی، اس سے یہی نتیجہ نکلے گا کہ وہ مرکز آگرے کے سوا دوسرا نہیں تھا۔ ورنہ پھر سوال یہ پیدا ہوگا کہ آبرو، مضمون، آرزو اور مظہر نے زبان کہاں حاصل کی اور ان کے مذاق شعری نے کہاں تربیت پائی کہ دہلی پہنچ کر صدر بزم شعر و ادب بن سکے۔

محمد شاہ کے عہد سلطنت میں ظاہر ہے کہ آگرے کا اجتماع قایم نہ رہ سکتا تھا کچھ لوگ شاہ جہاں کے ساتھ گئے کچھ اورنگ آباد کے دربار میں جا پہنچے، رہے سہے اب دہلی پہنچنے لگے۔ کیوں کہ آگرہ درباری سرپرستی سے محروم، اور وہاں کے ارباب فن قدر دانی سے مایوس ہو گئے تھے۔ جن لوگوں کو کس مپرسی ناپسند اور وطن کی گوشہ گیری نامطبوع تھی۔ وہ رفتہ رفتہ دہلی کو آباد کرنے لگے۔

شاہ مبارک آبرو عالمگیری عہد کے لوگوں میں سے تھے۔ شعر و ادب کے پرستاروں میں یہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے نقل وطن کیا۔ اسی زمانے میں میاں شرف الدین مضمون، مولوی عبدالرب، نواب اسدیار خاں وغیرہ باری باری سے دہلی جا پہنچے۔ اس وقت دہلی میں زبان و شعر کی حیثیت جعفر زٹل کے کلام سے متعین ہو سکتی ہے۔ لیکن جب آبرو و مضمون نے وہاں پہنچ کر شعر و سخن کی بساط بچھائی تو دہلی میں زبان اردو نے تشخص حاصل کیا، اور بلا ریب دہلی کی بزم زبان و ادب کے بانی یہی تھے اور شعرا اردو کا دور اول انہیں سے عبارت ہے۔ یہ بتانے کے لئے کہ اس دور میں ان بزرگوں کو کیا مرتبہ حاصل تھا، اردو کے مستند تذکرہ نویسوں کے چند اقتباس پیش ہیں۔ آبرو کے ذکر میں میر تقی نکات الشعرا میں فرماتے ہیں:۔

"شاعرے نادرہ گوے ریختہ، مے گویند کہ طبع شوخے داشت! غرض مستغنی وقت خود بود"

میر حسن لکھتے ہیں:۔

"از ابتدائے جوانی مشق سخن می کرد۔ شاعرے خوش گوئے در وقت خود بود"

آب حیات میں ہے:۔

"یہ اپنے زمانے میں مسلم الثبوت شاعر زبان ریختہ کے اور صاحب ایجاد نظم اردو کے شمار ہوتے تھے"

گل رعنا کی عبارت ہے:۔

"اور حق تو یہ ہے کہ دہلی میں اردو شاعری کا باقاعدہ آغاز انہیں سے ہوا"

میاں شرف الدین مضمون کے متعلق نکات الشعرا کا بیان ہے:۔

"حریف ظریف، ہشاش بشاش، ہنگامہ گرم کن مجلسہا ہرچند کم گو
بود لیکن بسیار خوش فکر، تلاش لفظ تازہ زیادہ۔"

میر حسن فرماتے ہیں:۔

"از اکبرآباد آمدہ بشاہجہان آباد و در زینت المساجد استقامت
در زید ہرچند کم گو لیکن خوش گو۔"

جب ان باکمالوں نے دہلی میں شعروادب کی محفل ترتیب دی تو وہاں کے جوہر قابل کو بھی ابھرنے کا موقع ملا۔ دورِ اوّل میں جن دہلوی شعرا کے نام چمکے ان میں ناجی، یک رنگ و احسن نمایاں ہیں ان حضرات کے تعلق اردو کے متعلق مستند تذکرہ نویسوں کی رائیں پیش کی جاتی ہیں۔

ناجی کے ذکر میں میر حسن کا خیال یہ ہے:۔

"مردے ظریف بود اکثر لطائف و ظرائف آں مرد ہاں را بخندہ می آرد
خود نمی خندید۔ تبسمے کرد۔ تلاش صنعت ایہام بسیار داشت۔"

نکات الشعرا میں ہے:۔

"مزاجش بہ ہزل مائل بود"

شعرالہند کا بیان ہے:۔

"ان کی حیثیت جعفر زٹلی سے زیادہ نہ تھی۔"

تذکرۂ قدرت کے الفاظ ہیں:۔

"ہرچند پرگو فاما بسیار بہ ایہام گو است"

گل رعنا کی عبارت ہے۔

"کہن سال و کہنہ مشق تھے، مگر باوجود اس کے حضرت مظہر رحمۃ اللہ علیہ کو کلام دکھانے آتے تھے مشورہ سخن کرتے تھے مصحفی نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ ایک قول کے مطابق وہ خان آرزو اور ایک قول کی بنا پر شاہ مبارک آبرو کے شاگرد دیکھے جاتے ہیں۔"

آبرو و مضمون کے زمانے ہی میں آگرے سے نقل وطن کرنے والوں میں خان آرزو و مرزا مظہر جان جاناں کے نام بھی ہیں۔ اردو کے استحکام و شستگی میں، دورِ متقدمین میں جو درجہ سراج الدین علی خاں آرزو کو حاصل ہے وہ ذیل کے اقتباسات سے ظاہر ہے،

"سراج الدین علی خاں آرزو بعد امیر خسرو دہلوی چنیں صاحب
کمال پرگو و خوش گو، بمسامع عالمیان نہ رسیدہ۔ ہفت دیوان
دارد کہ ہر یکے پہلو بہ نظیری و فغانی می زند۔ فکر صائب او تزلزل در
دکان مضامین مبتذل انداختہ شاعر فارسی۔ عالم فاضل شہرۂ آفاق
در سخن فہمی طاق، استادان ریختہ شاگرد اویند۔"
(تذکرۂ میر حسن)

"ہمہ استادان معتبر فن ریختہ ہم شاگردان آں بزرگوار اند۔"
(نکات الشعرا)

"خان آرزو کو زبان اردو پر وہی دعویٰ پہنچتا ہے جو کہ ارسطو کو فلسفہ منطق پر ہے۔ جب تک کہ کل منطقی ارسطو کے عیال کہلائیں گے تب تک اہل اردو خان آرزو کے عیال کہلاتے رہیں گے۔ ۔ ۔ ۔ خان آرزو وہی شخص ہیں جن کے دامن تربیت سے ایسے شائستہ فرزند پرورش پا کر اٹھے جو زبان اردو کے اصلاح دینے والے کہلائے اور جس شاعری کی بنیاد جگت اور ذومعنی لفظوں پر تھی اسے کھینچ کر فارسی ادائے مطلب پر لے آئے یعنی مرزا جان جاناں، مرزا رفیع، میر تقی خواجہ میر درد۔" (آب حیات)

مرزا مظہر جان جاناں کے متعلق میر حسن کی رائے یہ ہے:۔

"مرزا مظہر از فصحائے زمان و بلغائے دوران شاعر لیست مقدس و
بزرگ، خوش تقریر بمرتبہ ایست کہ در تحریر نمی گنجد یقین و
حزیں شاگردان اویند۔"

مولف آب حیات کی عبارت ہے:۔

"۔ ۔ ۔ زبان کی اصلاح و انداز سخن اور تحریر کی ایجاد میں انہیں
ایسا ہی حق ہے جیسا کہ سودا و میر کو۔"

تذکرۂ قدرت کے الفاظ ہیں:۔

"می گویند کہ اول کسے کہ طرز ایہام گوئے را ترک نمودہ ریختہ را در
زبان اردوئے معلیٰ شاہ جہان آباد کہ الحال پسند خاطر عوام و خواص
گردیدہ مروج ساختہ، مرزا مظہر جان جاناں متخلص بہ مظہر
مرد لیست فرشتہ صفت ۔ ۔ ۔"

گل رعنا کی رائے ہے:۔

"مرزا جان جاناں مظہر نے اس خارزار کو ایسا چھانٹا کہ شاعری ساحری بن گئی پھر اپنی زور طبع و خداداد قابلیت سے اچھوتے مضمون اور فارسی ترکیبوں اور اردو کے دلکش محاوروں کو اس طرح پر ترتیب دیا اور وہ خوبی پیدا کی کہ ایہام اور تجنیس وغیرہ صنائع لفظی جو ہندی دوہروں کی بنیاد تھے اسے سب بھول گئے۔ حزیں، بیان حسرت، فقیہہ، دردمند نے ان کے سامنے زانوئے

تلمذ تہ کیا اور میر و مرزا وغیرہ نے ان کا تتبع کر کے اردو شاعری کو معراج کمال پر پہنچا دیا۔ ہمارے اردو شاعری کے مورخ کی سخت بے انصافی ہے کہ اس نے مرزا صاحب کے اس احسن کا اعتراف نہیں کیا بلکہ ان کی کمال شاعری کو دبانے کی ہر جگہ بے سود کوشش کی ہے۔

ان باکمالوں کے بعد میر تقی کا نام آتا ہے۔ اس خدائے سخن کے متعلق کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے۔ میر نے اردو شعر میں وہ شے شامل کر دی جس کے بغیر شعر، شعر نہیں ہو سکتا تھا۔

اس موقع پر مرزا رفیع سودا کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جن کو آبحیات میں شاہ حاتم کا شاگرد بتایا گیا ہے۔ لیکن آبحیات کے اس بیان کی تائید کسی دوسرے ذریعے سے نہیں ہوتی۔ البتہ اس بات کو متعدد مورخوں نے لکھا ہے کہ مرزا سودا نے خان آرزو سے استفادہ کیا۔ ہر چند اس وقت تک سودا فارسی میں مشق سخن کرتے تھے، لیکن اردو میں شعر کہنے کا مشورہ ان کو خان آرزو ہی سے ملا تھا۔

سودا نے اپنے کلام میں شاہ حاتم کی شاگردی یا تقلید کی طرف کہیں اشارہ نہیں کیا ہے، البتہ آبرو و مضمون کے طرز کے معترف نظر آتے ہیں:-

اسلوب شعر کہنے کا تیرے نہیں ہے یہ
مضمون و آبرو کا ہے سودا یہ سلسلہ

میر کے ذکر کے بعد ہی مرزا غالب کا نام لینا پڑتا ہے کہ پیغمبر سخن تھے۔ غالب کے ذکر میں ہم صرف ایک اشارہ کریں گے!! اور وہ یہ ہے کہ ان کے رنگ شاعری کی آج پرستش ہوتی ہے اور امتداد وقت کے ساتھ اس پرستش میں خشوع و خضوع بڑھتا جائے گا۔ غالب کی شاعری کے بغیر اردو شاعری جس مرتبے کی ہوتی اس کا اندازہ بآسانی ہو سکتا ہے۔ اردو نثر میں مرزا غالب نے جو انقلابی بنیاد رکھی۔ وہی اس تعمیر کی تکمیل بھی تھی کہ آج تک اس سے زیادہ سلیس زبان کا تصور نہیں بندھ سکا ہے۔ اس ذکر میں یہ بتا دینا بے محل نہ ہوگا کہ غالب کے رقعات کی تاریخ سنہ ۱۸۵۰ء ہے۔ لیکن غالب کے رقعات مرتب ہونے سے چار سال پہلے خان بہادر ذوالفقار خواجہ غلام غوث اکبرآبادی کے خطوط جو ویسی ہی سادہ و سلیس زبان میں ہیں مرتب ہو چکے تھے۔ لیکن ان کی اشاعت سنہ ۱۸۹۵ء سے قبل نہ ہو سکی اور خواجہ غلام غوث ہی وہ بزرگ ہیں جنہوں نے اصل میں عود ہندی کو جمع و مرتب کیا ہے۔

مولوی عبدالرب صاحب اکبرآبادی

عہد محمد شاہی میں آگرے سے دہلی پہنچے اور ۱۱۳۶ھ میں شاہی رصدگاہ میں بیٹھ کر علم مساحت پر ایک کتاب اردو میں لکھی۔ مگر اس سے بھی قبل وہ ایک رسالہ ریاضی پر لکھ چکے تھے اور اس طرح اردو نثر کے اولین مصنف ہونے کا استحقاق مولوی عبدالرب کو پہنچتا ہے۔

شیخ قلندر بخش جرات بھی ان ہنرمندان آگرہ میں سے ایک ہیں جنھوں نے ترک وطن کر کے شعر و سخن میں اپنا درجہ قایم کیا ہے۔ جرأت کے متعلق مولانا آزاد نے آبحیات میں لکھا ہے کہ وہ صاحب طرز ایجاد تھے اور آج تک ان کا طرز بیان انہی سے مخصوص ہے۔

ہم نے بخیال طوالت متقدمین و متوسطین شعرائے اکبرآباد کے تلامذہ کے ذکر کو قلم انداز کر دیا ہے، لیکن ایک جستجو کرنے والے کو تذکروں کے مطالعے سے بہ آسانی پتہ چل سکتا ہے کہ ان باکمالوں کے دریائے فیض سخن نے کتنی ندیاں اور نہریں جاری کر دیں اور ان ندیوں اور نہروں نے کتنے بڑے رقبے کو سیراب کیا۔ یہاں ہم میر تقی کے ہم عصر اساتذہ و ادبائے اکبرآباد کے چند نام لیں گے جو آگرے سے باہر نہیں گئے۔

میر امجد علی اصغر ... صاحب دیوان تھے۔ صاحب گلشن بیخار نے تذکرہ کیا ہے۔

میاں نظیر اکبرآبادی

قاضی واجد علی خاں واجد ... نغمۂ عندلیب میں ذکر ہے

میاں محمدی بیدار ... صاحب دیوان تھے۔ اکثر تذکروں میں ذکر آیا ہے۔

مرزا اکبر قلی ... تذکرہ میر حسن۔

شرف الدین علی پیام ... "

جنون ... "

میر محمد سجاد سجاد ... " میر تقی ان کی شاعری کے بڑے " مداح تھے۔

محمد محسن محسن ... "

محمد عارف عارف ... "

مجرم ... گلشن بے خار

سید حسن خاں محو ... نغمۂ عندلیب۔

بقاء اللہ بقا ... تذکرۂ سرخوش۔

یاں نظیر اکبرآبادی کی خصوصیات شاعری پر اس عہد میں کچھ توجہ
ے تمران کے متعلق ہنوز بہت کچھ کام ہونا ہے۔ اس مضمون میں
ر دینا کافی ہوگا کہ آج سے کم وبیش سو سال قبل میاں نظیر نے اس
ام کی بناڈالی جو اس زمانے میں باوجود اس قدر مقبول ہونے کے
ورت اختیار نہیں کرسکی ہے۔ فطرت نگاری کو ابھی اتنا حقیقی اور
نے میں دیر لگے گی جس مقام پر اس کو نظیر پہنچا گئے ہیں۔ ہماری آنکھیں
نے کو دیکھ رہی ہیں جب اردو زبان کے بولنے والے تنہا
رکو اردو کا فطری و حقیقی شاعر مانیں گے۔ نظیر کے متعلق ایک مزید
نا بدبے محل نہ ہو اور وہ ان کی فرہنگ سے متعلق ہے۔ نظیر کے
رسے خیال میں الفاظ کی اتنی کثرت اور بہتات ہے جو کسی دوسرے
یہاں نہ ملے گی۔ نظیر کا مطالعہ کرنے والے کے لئے ان کی فرہنگ
بد موضوع تحقیق ہوسکتا ہے۔ اس ذیل ہم ایک نکتہ اور پیش کریں
ی لکھنوی زبان کی خصوصیات میں زری بمعنی ذرا ٹھیٹ لکھنو کا
لیا جاتا ہے، مگر یہ لفظ نظیر کے یہاں بار بار استعمال ہوا ہے۔
عہدِ غالب میں ان کے ہم عصر اساتذۂ اکبرآباد میں سے بعض کے
ں :-

خلیفہ اسیر خلف میاں نظیر
اکبرآبادی ... صاحبِ دیوان تھے۔
رزا اعظم علی بیگ اعظم ... صاحبِ دیوان ہونے کے علاوہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔
ہام اللہ افہام وساحر ... خمخانۂ جاوید میں تذکرہ ہے۔
شیخ نیاز علی پریشان ... مصنف مثنوی سرمایۂ عشق وواسوخت وتذکرہ شعر وسخن۔
سید مددعلی نیش ... مصنف خزینۃ القواعد وجغرافیۂ منظوم۔
مولوی نبی بخش حقیر ... صاحبِ دیوان تھے اور سخن فہمی کے لئے غالب کے ممدوح ہیں۔
ہاراجہ بلوان سنگھ ... صاحبِ دیوان تھے۔
رزا خانی رنج ... واسوخت ومثنویاں یادگار ہیں۔
غلام محمد رسا ... صاحبِ دیوان۔
سید بلاقی زر ... دو دیوان دو واسوخت اور مثنوی موسیٰ وفرعون یادگار ہے۔

قطب الدین خاں باطن ... صاحبِ دیوان ہونے کے علاوہ تذکرہ گلستان بےخزاں، نسخہ تقویم مراۃ خیال، مثنوی غم دل ربا اور خمسہ مثنوی میرحسن کے مصنف ہیں۔
احمد خاں شیفتہ ... مثنوی یادگار ہے نغمۂ عندلیب میں ذکر ہے۔
منشی جواہرلال جواہر ... مثنوی جواہرالبیان یادگار ہے اور زبدۃ التاریخ کے نام سیرالمتاخرین کا خلاصہ بھی لکھا ہے۔
میر سعادت علی سعید ... صاحبِ دیوان تھے۔
مولوی اصغر علی اصغر ... مصنف مثنوی شورش عشق، مثنوی بہار خرد، وقائع منصور الزمان، نیرنگ فرنگ، مفتاح الفرائض، لغات صغیر علی وغیرہ۔

اس مقالے میں اتنی گنجائش نہیں کہ ہم اساتذہ اکبرآباد یا صرف میر و غالب کے ہم عصر شعرا وادبا کے کلام نظم ونثر کا دوسرے مرکزوں کے اساتذہ سے مقابلہ کرسکیں۔ اس کے لئے ایک پورے دفتر کی ضرورت ہے۔ یہاں ہم دو چار بزرگوں کے متعلق چند اشارات کافی سمجھتے ہیں۔
ان میں ایک ہستی میر اعظم علی اعظم کی ہے۔ یہ میر امن کے ہم عصر ہیں اور جس زمانے میں باغ وبہار چھپی اس سے آٹھ سال قبل اعظم اسی قسم کا ایک افسانہ موسوم بہ فسانۂ سرور افزا لکھ چکے تھے۔ لیکن افسوس کہ یہ کتاب زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہوسکی۔ لیکن اعظم کا کارنامہ ایک دوسری کتاب ہے جس میں انہوں نے اس وقت تک کی فارسی واردو کتابوں پر تبصرہ کیا تھا۔ مگر حیف کہ وہ کتاب بھی مسودے کی ہی صورت میں رہی۔

دوسرا نام قطب الدین خاں باطن کا ہے جو صاحبِ دیوان ہونے کے علاوہ تذکرہ گلستان بےخزاں (یا نغمۂ عندلیب) کے مؤلف ہیں۔ یہ تذکرہ نواب شیفتہ کے تذکرے کے جواب میں لکھا گیا تھا کیونکہ شیفتہ نے میاں نظیر کا ذکر اہانت آمیز الفاظ میں کیا تھا۔ اس تذکرے کی قدر وقیمت مطالعے کے بعد معلوم ہوسکتی ہے۔ باطن نے اس کے علاوہ بھی کئی تصنیفیں چھوڑی ہیں۔

پھر مولوی اصغر علی اصغر کا نام آتا ہے جو کم و بیش ستر کتابوں کے مصنف ہیں، جن میں نصف کے قریب غیر مطبوعہ رہیں۔ وقائع منصور الزمان سات جلدوں میں بجواب بوستان خیال لکھی تھی، لیکن اس کی صرف پہلی جلد شائع ہو سکی۔ غالباً یہ کتاب پہلی نہیں تو چند پہلی کتابوں میں سے ہے جو سادہ غیر مقفیٰ زبان میں تصنیف ہوئیں ورنہ اس وقت تک اردو نثر مقفیٰ و مسجع عبارت ہی میں لکھی جاتی تھی۔

یہاں تک کے بیان سے یہ بات واضح ہو جانی چاہئے کہ آغاز اردو سے لے کر اس وقت تک جب کہ شعر اردو مضمون و تخیل کے اعتبار سے شعر بنا، آگرے کے ہنرمند و اہل کمال نہ صرف پیش پیش رہے بلکہ ہر عہد میں اردو کا پرچم انہیں کے ہاتھوں میں لہراتا رہا ہے لیکن مورخوں نے آگرے کی ان خدمات کو ایسی ہٹ دھرمی کے ساتھ پامال کیا کہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی سا بزرگ بھی بے تاب ہو گیا۔ مقدمہ نکات الشعرا میں مولانا شروانی لکھتے ہیں:۔

"دہلی و لکھنؤ کی ہنگامہ آرائیوں میں آگرہ گرہ در گلو ہے۔ مگر اس کی بے زبانی صاف کہہ رہی ہے کہ میرے دور تک جو بلاکشان محبت بزم سخن میں آئے ان میں سے اکثر کے دماغ اُسی کے بادہ کہن سے پر کیف تھے، شاہ مبارک آبرو، شرف الدین مضمون، سراج الدین علی خاں آرزو، مرزا مظہر قدس سرہٗ، میر تقی کی ذات پر اول اکبرآباد کو ناز ہے اس کے بعد دہلی و لکھنؤ کو۔ جب مرزا غالب بھی بزم آرا ہو جائیں پھر آنکھ ملانا آسان نہیں رہتا۔"

اب ہم ایک اقتباس مولانا ناشر مرحوم کے مضمون سے دیتے ہیں جو نقاد مئی ۱۹۱۹ء میں شائع ہوا تھا۔

"واقعہ یہ ہے کہ اردو زبان آگرہ و دہلی میں پیدا ہوئی۔ اردوئے معلیٰ میں نشو و نما پا کے اس نے اپنی موجودہ صورت پیدا کر لی۔ شجاع الدولہ، آصف الدولہ، اور سعادت علی خاں کے زمانوں میں دربار دہلی کی کمزوری و بے استطاعتی اور لکھنؤ کے نوابی دربار کی دولت مندی و قدر دانی کی وجہ سے تمام صاحبان کمال لکھنؤ پہنچ گئے۔ مرزا رجب علی بیگ سرور اکبرآباد میں پیدا ہوئے، وہیں نشو و نما پایا، ناشر بے ہمتا بننے کے بعد لکھنؤ میں آئے۔"

صفیر بلگرامی کی رائے بھی سن لیجئے۔ جلوۂ خضر میں لکھتے ہیں:۔

"نثر میں لکھنؤ نے بہت کم محنت کی سرور کے بعد کوئی ایسی تحریر نظر میں نہیں آتی جس کی مثال دی جائے۔ ہاں قبل غدر ایک رسالہ حدیقۂ شہدا مولوی امیر علی شہید کے واقعہ کا بطور نمونہ فسانہ عجائب لکھا گیا اور ایک نورتن مہجور نے لکھا۔"

فسانۂ عجائب کا قبول عام اس سے ظاہر ہے کہ بہت مدت تک تالیف و تصنیف میں وہی طرز انشا اختیار کی جاتی رہی اور جس طرح ابرو، مضمون، آرزو و مظہر وغیرہ نے دہلی پہنچ کر زبان کو زبان اور شعر کو شعر کے درجے پر پہنچا دیا اسی طرح سرور نے آگرے سے لکھنؤ پہنچ کر فسانۂ عجائب لکھی اور اس کے ذریعے سے لکھنوی زبان کی اساس قائم کر دی۔

جاٹوں کی ترکتازنے آگرے کی جو خانہ ویرانی کی وہ تاریخوں سے ظاہر ہے، اور اس کے بعد علمی و ادبی مشاغل کا پتا آگرے میں ڈھونڈھنا فضول ہے۔ متاخرین کے زمانے میں آگرے کی مجلس و ہنر قطعاً برہم ہو گئی تھی، لیکن صدر نظامت کے باعث ایک اجڑی اجڑی محفل ضرور تھی۔ جب ہائی کورٹ بھی آگرے سے الہ آباد کو منتقل ہو گیا تو عدم سرپرستی و ناقدر دانی نے آگرے کی مخلوق کو ہر قسم کے علمی و ادبی مشغلے سے بے پروا کر دیا، لیکن اس ہمت شکن و حوصلہ فرسا زمانے میں بھی آگرے میں شعر و سخن اور علم و فن کی پرستش موقوف نہ ہوئی۔ اس عہد کے بعض بزرگوں کے نام یہ ہیں جن کو زمانے نے ابھرنے کا موقع نہ دیا۔

مولوی احمد علی خاں صوفی صاحب مینا بازار
مولوی جمیل الدین نیّر ... صاحب آرسی مصحف
مرزا نثار علی بیگ ... مصنف قواعد فارسی و اردو و سفرنامہ حجاز و یورپ
مرزا خادم حسین رئیس ... صاحب دیوان
ماسٹر توصف حسین واصف ... صاحب دیوان
مولوی احسن اللہ خاں ثاقب ... صاحب قند پارسی
کالے خاں سفلی وغیرہ

رئیس، واصف اور نثار اپنے وقت کے اساتذہ میں سے تھے۔ قلت وقت ہمیں ان کے کلام پر سرسری نظر ڈالنے سے بھی باز رکھتی ہے لیکن ان کا مرتبہ شاعری اس سے ثابت ہے کہ مولوی نجم الغنی رامپوری جو متعدد کتابوں کے مصنف اور مشہور بزرگ ہیں اپنی تصنیف بحر الفصاحت میں ان بزرگوں کو داغ سے بہتر شاعر مانتے ہیں۔ ان کی یہ تصنیف فن عروض

پر ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ رعایت لفظی جو کسی زمانے میں اردو شعرا اور اس طرح لکھنؤ اسکول کا طرہ امتیاز تھی، اور جو امانت و ناسخ کے عہد میں بد مذاقی کی حد کو جا پہنچی، دراصل شعرائے اکبرآبادی ہی کی ایجاد و اختراع تھی۔ اس کی تائید میں صاحبِ تصنیف نے اکبرآبادی اساتذہ کے کلام کی مثالیں بھی پیش کی ہیں جن کی اس زمانے کے دہلوی و لکھنوی شعرا تقلید کرتے تھے۔

فن صحافت کے ذریعے سے زبان کی جو خدمت ہو سکتی ہے۔ اس میں بھی اہل آگرہ بہت نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ ہم صرف میر اکبر علی حیدر آبادی ایڈیٹر ادیب اور خواجہ یوسف علی اکبرآبادی کے نام پیش کریں گے ادیب، اردو کے اولین رسالوں میں سے ہے جس کے مضمون نگاروں میں مولوی چراغ علی اور مولوی ذکاء اللہ کے نام نظر آتے ہیں۔ اسی زمانے کے بزرگوں میں مولوی عبدالرزاق صاحب البرامکہ و نظام الملک طوسی مرزا عرفان علی بیگ مصنف الخاتون، مولوی سعید احمد مصنف مرقع اکبرآباد امرائے ہنود و بوستان اخبار کے نام ہیں۔

عہدِ حاضر میں جو آگرے کا تاریک ترین دور ہے شاہ نظام الدین دلگیر مرحوم ایڈیٹر نقاد کی خدماتِ ادب مخفی نہیں۔ مولانا سیماب اکبرآبادی کی قدرت و کمال شاعری سے کون واقف نہیں! حضرت عاشق حسین بزم اکبرآبادی اس وقت محاورات زبان کے ماہر اور مرثیہ گوئی میں اعلیٰ مرتبے کے مالک ہیں۔ مرزا نجم آفندی کے قصیدے اس زمانے میں ان کو برترین منصب کا سزاوار بناتے ہیں۔ مفتی انتظام اللہ پچاس سے زیادہ کتابوں کے مولف و مصنف وسیع المطالعہ بزرگ ہیں۔ محمد محمود اکبرآبادی کی ادبیت مسلم ہے اور خادم علی خاں احقر اکبرآبادی، شوخ اکبرآبادی رعنا اکبرآبادی و حضرت محمد علی شاہ میکش کہنہ مشق و مخصوص شعرا میں سے ہیں۔

ضرورت اختصار نے اس مضمون کو نہایت تشنہ رکھا ہے لیکن اگر زمانے نے فرصت دی تو مکمل صورت دے کر اسے ایک کتاب کی شکل میں پیش کریں گے، مگر جن حضرات کو تحقیق و جستجو کا ذوق ہے، ان اشارات کی مدد سے مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے تک بآسانی پہنچ سکیں گے کہ آگرے کے ارباب فن نے اردو زبان کی نہایت قابل قدر خدمت کی ہے اور اس کا اعتراف نہ کیا جانا سخت ناانصافی ہے!

"ہندوستانی"
سہ ماہی

لطیف الدین احمد اکبرآبادی

انقلاب

شاداب و پر بہار مسرتوں کا زمانہ ختم ہو چکا۔ وہ محبت جو گلاب کے تازہ کھلے ہوئے پھول سے زیادہ خوشبو دار اور شگفتہ تھی، اب خزاں کے بے درد ہاتھوں تباہ ہو چکی ہے ——

ہمارے راگ مٹ چکے ہیں۔ زمانے کی بے اعتنائی نے ان کا نشان بھی باقی نہیں رکھا ——

میں نے خواب دیکھا تھا کہ محبت خود رو پھولوں کی طرح انگڑائیاں لیتی ہوئی بیدار ہو رہی ہے اور دلفریب نغمے خوبصورت ساز پر بج رہے ہیں ——

جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ایک شکستہ ساز سامنے رکھا ہے اور ٹوٹا ہوا مضراب ہاتھ میں ہے ——

میرا دل ایک افسانہ تھا۔ جب میں ہوش میں آیا تو وہ حقیقت کی تلخیوں سے معمور زندگی کا پُرسوز نوحہ بن چکا تھا ——

خواب سے پہلے سکون تھا —— خواب کے بعد تلاطم ——

دونوں میں غم کی کسک تھی، لیکن مختلف —— میں تخیل کی اس روانی میں بڑھتا گیا۔ بہتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ شکستہ ساحل آ پہنچا۔ جہاں خالی گھونگے ریت کے ذروں پر پڑے چمک رہے تھے۔

آمنہ تمیم

نقد و نظر

"قید یاغستان" (طبع ثانی)

(مصنفہ محمد اکرم صاحب پنشنل کمشنر، آنریری مجسٹریٹ لاہور چھاؤنی)

(درسی کتب سے کم سائز کے چار سو صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، آرٹ پیپر پر متعدد تصاویر، نفیس سنہری جلد، قیمت ایک روپیہ بارہ آنے (۱۲/۱) مصنف سول لائنز)

"قید یاغستان" سب سے پہلے ۱۹۲۱ء میں چھپی۔ حال ہی میں مصنف نے نظرِ ثانی کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا ہے جو اس وقت ہمارے پیشِ نظر ہے یہ اُن صعوبتوں اور مصیبتوں کی دردناک داستان ہے جن سے اوائلِ شباب ہی میں مصنف کو دوچار ہونا پڑا۔ اپریل ۱۹۱۹ء میں محمد اکرم صاحب کو جب کہ آپ اوورسیر کی حیثیت میں وادی ٹوچی میں متعین تھے۔ سرحدی قزاقوں نے گرفتار کر لیا اور آپ دو ماہ تک قید و بند کی مشقتیں جھیلتے رہے۔

مصنف کوئی پیشہ ور ادیب نہیں یہ کتاب اس کی پہلی اور آخری تصنیف ہے لیکن اس کے قلم نے اس آپ بیتی کو ایک ایسا حقیقی افسانے کا رنگ دے دیا ہے جو بہت سے مشاق ادیبوں کو بھی میسر نہیں آتا۔ فطرت انسانی کا کوئی پہلو نہیں جو نظر انداز کیا گیا ہو۔ بعض مقامات پر شدت جذبات کی وجہ سے مصنف ایسا انداز بیان اختیار کرتا ہے کہ پڑھنے والے کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور یہ بات مصنف کی قدرت اظہار کی دلیل ہے۔ واقعات کی تصویر کشی، نفسیاتی کیفیات کا تجزیہ، مناظرِ قدرت کا والہانہ ذکر کتاب کی وہ خصوصیات ہیں جو ہمارے سامنے مصنف کو اوورسیر کی بجائے مصور، ماہر نفسیات اور شاعر کی حیثیت میں پیش کرتی ہیں۔ یہ باتیں تلخی کے اس احساس کو جو ہولناک مصائب کے تاثر انگیز ذکر سے ہمارے دل پر طاری ہو جاتا ہے کسی قدر کم کر دیتی ہیں۔

کتاب اس لحاظ سے بھی قابل مطالعہ ہے کہ اس میں سرحدِ آزاد کے غیور قبائل کی سیرت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے ہمارے دلوں میں ان قبائل کا ایسا تصور بٹھایا گیا ہے کہ ہم انہیں مجموعی حیثیت سے ڈاکو، رہزنوں، قتل و غارت کے دلدادہ اور مذہبی رواداری سے ناآشنا سمجھتے ہیں۔ یہ بات کسی حد تک درست ہے لیکن ان وحشیانہ مظالم کے ساتھ ساتھ اُن کی مہمان نوازی، اقیدیوں سے حسن سلوک، صداقت، صاف گوئی اور غیرت کے حالات معلوم کرنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اس سلسلے میں مصنف نے بڑی بھاری خدمت سرانجام دی ہے۔

ان مصائب میں محمد اکرم صاحب کے شریک ایک اور صاحب لالہ سندر لال ٹھیکیدار بھی تھے۔ جہاں لالہ سندر لال سے پٹھانوں کا سلوک مذہبی رواداری کا ثبوت پیش کرتا ہے، وہاں یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ ایک ہندو اور ایک مسلمان نے اس خوفناک مشترکہ مصیبت کو کس ہمدردی اور باہمی اتحاد کے ساتھ طے کیا۔ جیسا کہ کتاب کے بعض واقعات سے معلوم ہوتا ہے دونوں میں سے اگر ایک چاہتا تو موقع پا کر کسی رات کو بھاگ نکلتا۔ لیکن اس بات کے باوجود کہ بھاگ نکلنے کے بیشتر مواقع میسر ہوئے انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اس لئے قومی جذبہ رکھنے والے حضرات بھی کتاب کو پسند کریں گے

یہ کتاب مردوں اور عورتوں خصوصاً لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے یکساں مفید ہے۔ کیونکہ نابالغ بچوں کے لئے عموماً دلچسپ کتابیں جن میں شہوانی مضامین کو دخل نہ ہو بہت کم ملتی ہیں۔

ناتجربہ کار نوجوانوں کے لئے یہ کتاب بے حد سبق آموز ہے مصنف کے ذاتی تجربات اس بارے میں اُن کی رہنمائی کر سکتے ہیں کہ فلاں قسم کی تکلیف یا مصیبت کے وقت انسان کو کیا کرنا چاہئے۔

ممکن ہے بعض نکتہ چیں اور دوررس نگاہوں کو اس دلچسپ آپ بیتی میں کچھ ادبی یا لسانی خامیاں نظر آئیں۔ ان کا جواز مصنف نے اپنے الفاظ میں یوں پیش کیا ہے جسے قبول کرنے میں کسی کو تامل نہیں ہونا چاہئے:۔

"یہ ایک ادبی افسانہ نہیں ہے۔ اگر میں کسی کامل ادیب سے اصلاح لیتا تو شاید یہ کمی بھی پوری ہو جاتی لیکن ایک اندرونی آواز نے مجھے اس طریق کار سے یہ کہہ کر باز رکھا کہ ادبی اصلاح سے قصے کے قدرتی خدوخال میں فرق آ جانے کا اندیشہ ہے"۔

حفیظ ہوشیارپوری

مستند اور مجرّب ادویات

ہندوستانی دواخانہ دہلی سے طلب کیجئے جسے ملک و قوم کے شیدائی طبّی دنیا کے شہنشاہ حضرت مسیح الملک حکیم محمد اجمل خان صاحب مرحوم نے ۱۹۰۳ء میں قائم کیا تھا۔ اور جو آپ کے خلف الرشید عالیجناب مسیح الملک حکیم جمیل خانصاحب کی سرپرستی میں بدستور جاری ہے۔

ہندوستانی دواخانہ نے اپنے پینتیس سالہ دورِ زندگی میں ملک میں بہترین مجرب دوائیں پیش کرکے جو عزت و وقار حاصل کیا ہے۔ اس کے لحاظ سے یہ دیسی دواؤں کا لاجواب کارخانہ ہے۔ علاوہ ازیں اس دواخانے کا ایک خاص امتیاز یہ بھی ہے کہ اس سے کسی کا ذاتی مفاد وابستہ نہیں ہے بلکہ یہ ملک و قوم کی ملکیت ہے۔ اس کا منافع تقریباً دو لاکھ روپیہ سالانہ ہے۔ زنانہ و مردانہ طبیہ کالج اور اس کے متعلقہ شفاخانوں پر خرچ ہوتا ہے۔

ہندوستانی دواخانہ کی ہزارہا مستند و مجرب دواؤں میں سے مندرجہ ذیل چار دوائیں بطور نمونہ پیش کی جاتی ہیں ان کو طلب کرکے فائدہ حاصل کیجئے

جمیلان

جریان و رقت و سرعت کی لاجواب دوا ہے مادۂ تولید کی اصلاح کرتی ہے اور قدرتی امساک پیدا کرتی ہے۔

ترکیب استعمال

دو قرص صبح کو نہار منہ دودھ کے ساتھ کھائیں۔ تیل ترشی اور گرم چیزوں سے پرہیز رکھیں۔

قیمت:۔ فی شیشی ۳۲ قرص چار روپے آٹھ آنے

قرص مفاصل

گنٹھیا (جوڑوں کا درد) عرق النساء (ٹانگ کا درد) کے لئے نہایت مفید ہے۔ یہ بیماریاں خواہ کیسی ہی پرانی ہوں اس دوا کے کئی روز کے استعمال سے بالکل دور ہو جاتی ہیں

ترکیب استعمال

ایک قرص رات کو سوتے وقت نیم گرم پانی سے کھائیں تیل ترشی۔ اور ٹھنڈی چیزوں سے پرہیز۔ قیمت۔ فی شیشی ۲۱ قرص ایک روپیہ دو آنے

قرص جدید

ریاح کو ہضم کرتے ہیں۔ بھوک لگاتے ہیں۔ ریاح کو خارج کرتے اور نفخ و قراقر کو زائل کرتے ہیں۔

ترکیب استعمال

ایک قرص دونو وقت بعد از غذا کھائیں۔ قابض۔ بادی اور نفاخ چیزوں سے پرہیز رکھیں۔

قیمت

سو قرص ایک روپیہ دو آنے

قرص بواسیر

بادی بواسیر کے لئے نہایت مفید دوا ہے۔ اس کے چند روزہ استعمال سے یہ مرض بالکل دور ہو جاتا ہے۔

ترکیب استعمال

دو۔ دو قرص صبح و شام تازہ پانی سے کھائیں۔ قابض۔ بادی اور نفاخ چیزوں سے پرہیز رکھیں۔

قیمت

چونسٹھ قرص دو روپے (عگ)

ہندوستانی دواخانہ پوسٹ بکس نمبر ۲۲ دہلی ٹیلیفون نمبر ۵۵۲۶ تار کا پتہ مستعملہ ... دہلی

ریویوز

دیال باغ آگرہ

دیال باغ کے نام سے کون واقف نہیں؟ جسے سنتے ہی وہ تمام چیزیں سامنے آجاتی ہیں جو ملکی ترقی سے وابستہ ہیں۔ ضروریاتِ زندگی میں سے شاید ہی کوئی چیز ایسی ہو جو ہندوستانی سرمائے محنت اور قابلیت سے وہاں نہ بنائی جاتی ہو۔ ہندوستانیوں کے دورِ انحطاط میں یہ مشعل کام دے رہی ہے۔ نوجوانوں کو یہ بتا کر صحیح ٹریننگ کے بعد وہ خود اعتمادی کے علاوہ اپنی استبدادِ ایجاد کو بھی بڑھا سکتے ہیں ان میں زندگی کی ایک لہر پیدا کر دی ہے۔ دیال باغ کے تمام شعبوں میں ڈائری سب سے بہتر ہے۔ بہترین یورپین اصولوں پر چلائے جانے کی وجہ سے ہندوستان بھر میں بہترین ہے۔ اور دنیا بھر کی ڈائریوں میں ایک خاص امتیاز رکھتی ہے۔ اس کا مکھن جو کہ جراثیم سے صاف ملائی سے بنایا جاتا ہے۔ مارکیٹ بھر میں بہترین ہے۔ مقامی طور پر یہ مکھن مان اینڈ کمپنی نکلسن روڈ لاہور کے یہاں سے دستیاب ہو سکتا ہے۔ جو ڈبوں میں بند اور کھلے مکھن کیلئے ہندوستان کے اس حصے کے لئے ان کے ایجنٹ ہیں۔ ہم اپنے ناظرین سے اس مکھن کو کم از کم ایک دفعہ ضرور آزمانے کی سفارش کرتے ہیں۔

ڈائری کے متعلق وائسرائے۔ گورنروں۔ ایگزیکٹو کونسلروں مہاراجوں راجوں۔ کانگریس لیڈروں اور تمام اقوام کے یورپین مسلم۔ ہندو اور سکھ معززین نے بہترین آرا کا اظہار کیا ہے۔ عمدگی اور صفائی کے باوجود بھی اس مکھن کی قیمت دو اونس کے پیکٹوں میں اڑھائی آنے فی پیکٹ ہے۔

اختر لاہور (ایڈیٹر علی احمد صاحب برق) یہ ہونہار رسالہ تین ماہ سے لاہور کی ادبی فضاؤں میں روشنی پیدا کر رہا ہے۔ اس کی موجودہ اٹھان کو دیکھ کر امید پیدا ہوتی ہے کہ آئندہ بہت ترقی کرے گا۔ اس تھوڑے عرصہ میں برق صاحب نے اچھے اچھے مضمون نگاروں کو اختر میں لکھنے پر مائل کر لیا ہے ہم برق صاحب کو مشورہ دیں گے کہ وہ اپنے ناظرین کے ذوق تصویر نوازی کو بھی تشنہ نہ رکھیں اور ہر ماہ کم از کم ایک تصویر ضرور دیا کریں۔ خواہ قیمت میں کچھ اضافہ ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

اس وقت اپنے سائز کے رسالوں میں اختر سب سے سستا ہے یعنی صرف چار آنے فی پرچہ اور سالانہ چندہ دو روپے پندرہ آنے مع محصول ڈاک ہم اپنے ناظرین سے اختر کی اعانت کی پرزور سفارش کرتے ہیں۔

ملنے کا پتہ:۔ دفتر اختر مسلم آباد۔ چاہ میراں روڈ۔ لاہور

قلعہ معلّٰی کی جھلکیاں } یہ چھوٹی سی مگر نہایت دلچسپ کتاب عرشی تیموری صاحب نے لکھی ہے جس میں زمانہ مغلیہ کے دور آخر کی شاہی معاشرت کے دلکش مناظر دکھائے ہیں بعض واقعات نہایت تحیر خیز ہیں اور تاریخ کے ایک فلسفی طالب علم کے لئے اس میں بہت سی عبرتیں پنہاں ہیں طرز بیان بہت شگفتہ اور زبان صاف سلیس ہے۔ جناب یوسف بخاری کا ایک دلآویز تعارف بھی شامل کتاب ہے۔ ان خوبیوں کے باوجود صرف ۵ ر میں مکتبہ جہاں نما اردو بازار دہلی سے مل سکتی ہے۔

India's Premier Magazi

The ADABI DUNY

LAHOR

یادگار

منصور احمد مرحوم

ادبی دنیا

ادارہ

عاشق حسین بٹالوی — حفیظ ہوشیارپوری

بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی — ایم۔ اے

نور مشرق

ادبی دنیا کے ناظرین کو یہ سن کر مسرت ہوگی کہ ملک کے ممتاز نغزگو شاعر اور ادبی دنیا کے کرمفرمائے قدیم جناب مہرلال سونی ضیا کا مجموعہ کلام عنقریب زیور طبع سے آراستہ ہوکر اہل ذوق کے لئے تسکین روح کا سامان بہم پہنچائے گا اس اشاعت میں نور مشرق کا اشتہار علٰحدہ چھپا ہے اسے ملاحظہ فرمائیے اور اپنی فرمائشات ادبی دنیا کے پتہ پر بھجوا دیجئے ضیا صاحب کی شاعری پر ایک مبسوط مضمون اشاعت آئندہ میں درج ہو رہا ہے

ص - ا

اس کو پڑھ کر دوسروں کو مطلع کرنا خدمت خلق ہے

اکسیر جنون (پاگل پن) اگر آپ کے دل میں کوئی دانف یا دا نف شخص خدانخواستہ مرض جنون میں مبتلا ہو کر حد درجہ کو بھی پہنچ گیا ہو کہ بیٹھے پتھر مارتا ہو۔ ہوش و حواس درست نہ ہوں بعید نہ آتی ہو تو اس مثل مشہور کے مطابق کہ معالج کا راستہ بتانا ملا ئی کرنے کے مترادف ہے؟ مریض کو بجائے پاگل خانہ بھیجنے کے اس کے گھر والوں کو اس دوا کا پتہ بتادیں جس کی پہلی ہی خوراک حلق سے اترتے ہی اثر دماغ پر حکم شاہی مطلق کجلی کا اثر دکھاتی ہے اور رفتہ رفتہ تھوڑے ہی عرصہ میں ہوش و حواس عقل و فہم اپنی اصلی حالت پر عود کر آتے ہیں۔ قیمت اکسیر دکر ہم عدد آک ملنے معجون اسرار تفیض کشا ۵ خوراک عہ روغن مرطب ۵ تولہ عہ میزان کل ۔ علاوہ محصول

اکسیر اختناق الرحم (ہسٹیریا) اکثر رحم کی خرابی ت ایام ماہواری بند ہو گی تو یہ مرض شروع ہو جاتا ہے۔ مریضہ کو پیچ شکم میں درد سے گولہ سا اٹھتا ہوا محسوس ہوتا ہے جس کے اوپر کی جانب چڑھنے پر ہاتھ پیروں میں تشنج ہو جاتا ہے۔ سانس کھینچ کھینچ کر رک رک کر آتا ہے۔ اور بعض پر بے ہوشی سی طاری ہو جاتی ہے رفتہ رفتہ یہ مرض اس حد سے گذر کر مریضہ پر دیوانگی طاری کر دیتا ہے۔ جو موسم گرما کے پانچ چھ ماہ تک رہتی ہے۔ مگر موسم سرما شروع ہو جانے پر اتا تہ شروع ہو جاتا ہے یہاں تک کہ معتدل موسم سرما تک مریضہ کے ہوش و حواس درست ہو جاتے ہیں اور اپنی اصلی حالت پر آجاتی ہے۔ مگر موسم کے اختلاف سے حالت مریضہ کی صحت و سقم کی رہتی ہے بس یہ دوا اس مرض کے لئے اکسیر ثابت ہو چکی ہے جس کا فائدہ پہلے ہی روز بحکم حکیم مطلق ظاہر ہوتا ہے قیمت۔ ۸ خوراک معجون سوبی۔ ۸ خوراک ہے۔ روغن حب ۵ تولہ میزان کل علاوہ محصولڈاک وغیرہ

اکسیر صرع (مرگی) چیخ مار کر ا بیہوش ہو جاتا ہے یا ہاتھ پر نظر پڑنے سے اس مرض کا دورہ پڑ جاتا ہے۔ ہاتھ پاؤں تشنج اور منہ سے جھاگ نکلنا۔ مریض کا بیہوش ہو جانا اور نفس پر اثر پڑنا اس مرض کی خصوصیات سے ہے۔ یہ دوا اس مرض کیلئے اکسیر ثابت ہو چکی ہے قیمت ۸ خوراک معجون منقی ۸ خوراک میزان کل علاوہ محصول ڈاک وغیرہ۔

اکسیر مسان (سوکھیا) اس مرض میں بچے کو مختلف قسم کے دست آتے رہتے ہیں اور بچہ زیادہ رونا رہتا ہے۔ کمزوری کے علاوہ سلسلہ پسلیوں میں پڑ جاتی ہیں۔ اس دوا کا استعمال مفصل ذیل اکسیر الاثر ثابت ہوا ہے۔ دوسرے تیسرے ہفتے ہی دوا کے استعمال سے تندرستی کی جھلک اور آثار نمایاں ہو جاتے ہیں قیمت ۸ خوراک علاوہ محصولڈاک وغیرہ۔

نوٹ: سیاہ رنگ کے دست کے بعد سرخ یا سیاہ یا نیلے رنگ کے نشانات ظاہر ہونے سے پہلے دوا کا استعمال بہتر ہے۔

پتہ: مینیجر دواخانہ یونانی اسرار الطب دہلی۔ واقع شہر حصار احاطہ عبدالغفور خان صاحب شیخ اعظم حصار



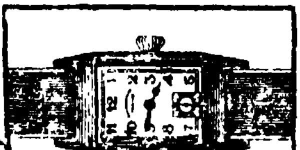
WEST END

'SECUNDUS'

ویسٹ اینڈ سیکنڈس

نہایت خوبصورت اور پائیداری میں گارنٹی شدہ ہے





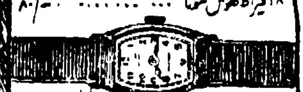
سیکنڈس کی نئی کالی برسٹلیل

ہمیشہ چمکدار رہنے والے فولاد کی ساخت ۔/۲۸

رولڈ گولڈ ۔/۳۶

۹ قیراط ٹھوس سونا ۔/۵۵

۱۸ قیراط ٹھوس سونا ۔/۸۰



سیکنڈس کی چھوٹی ٹونیو

سدا چمکدار فولاد ۔/۲۷

رولڈ گولڈ ۔/۳۰

۹ قیراط ٹھوس سونا ۔/۴۰

ہر دو نمونے قابل اعتماد اور گارنٹی شدہ وقت دینے والے ہیں۔ بڑی فہرست مفت طلب فرمائیے۔

WEST END WATCH Co

BOMBAY CALCUTTA

بال عمر بھر نہیں اُگتے ڈسٹرائر کی ایک بوتل خریدیئے جس کے تین منٹ استعمال سے بدصورت اور زیادہ بال ہمیشہ کے لئے دور ہو جائینگے۔ یہ بالوں کی جڑوں کو بالکل نکال پھینکتا ہے۔ اور جلد بچے کی طرح صاف اور نرم و ملائم ہو جاتی ہے۔ ڈسٹرائر جلدی اثر کرنے والا اور بےضرر ہے۔ اور نازک سی نازک جلد کو بھی نقصان نہیں پہنچاتا۔ دام واپس کرنے کی گارنٹی سٹیج اور سینما کی ٹرسیں استعمال کرتی ہیں۔ قیمت فی بوتل صرف تین روپیہ محصول علاوہ ملنے کا پتہ:

مینیجر گلزار ٹریڈنگ ایجنسی پوسٹ بکس نمبر ۱۲۰ لاہور

ڈاک کے ڈاکو | ہر ماہ ہمیں خریداروں کی طرف سے شکایتیں موصول ہوتی ہیں کہ انہیں پرچہ نہیں ملتا اور ہمیں خریدار ایسے بھی ہیں جو شکایت نہیں کرتے لیکن یہ فرض کر لیتے ہیں کہ پرچہ دفتر سے نہیں بھیجا حالانکہ پرچہ چھاپنا اور پھر خریدار کو نہ بھیجنا پاگل پن اور تجارتی خودکشی سے کم نہیں۔ "ادبی دنیا" ہر ماہ کی ۱۲ تاریخ تک شائع ہو جاتا ہے اگر ۱۲ تک آپ کو پرچہ نہ ملے تو سمجھ لیجئے کہ کسی ڈاک کے ڈاکو کی نذر ہو گیا۔ بس ایک شکایتی کارڈ اپنے حلقہ کے سپرنٹنڈنٹ پوسٹ آفس کو لکھئے اور ایک کارڈ ہمیں لکھئے تاکہ آپ کو پرچہ دوبارہ بھیجا جائے اور محکمہ ڈاک کے دروازے پر ایک اور دستک دی جائے۔ (مینیجر)

فہرست مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہ نومبر ۱۹۳۷ء

جلد ۱۶ — نمبر ۲

تصاویر: ۱۔ بڑی اماں ۲۔ بڑی اماں کا بچپن

نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	صفحہ
	بزم ادب		
۱	سالنامے کی ایک جھلک	صلاح الدین احمد	۸۸۰
	آئینۂ عالم		
۲	جاپان یورپین نقاب کے پیچھے	مظفر احمد	۸۸۲
۳	راشٹیا ملک کی امارت	مظفر احمد	۸۸۵
	افسانے		
۴	ایک شام	جناب راجہ مہدی علی خاں	۹۰۷
۵	سنیاسی	محترمہ معظمہ جمیل الرحمٰن	۹۱۹
۶	پہلی پوجا	جناب پنڈت جگن ناتھ شرما	۹۳۲
	علمی و ادبی مضامین		
۷	رسم الخط کا مسئلہ	جناب سید عبدالقدوس ہاشمی	۸۸۷
۸	ایک فرانسیسی نژاد شاعر کا منظوم سفرنامہ	جناب ماسٹر پیارے لال صاحب شاکر میرٹھی بی اے ایڈیٹر ادیب	۸۹۷
۹	ڈاکٹر تارا چند ہندی کی چندی	جناب سید ابوالقاسم	۹۱۱
۱۰	وزارت	پروفیسر محمد جمیل الرحمٰن صاحب ایم اے	۹۲۳
۱۱	نکات غالب	جناب شیر علی خاں سرخوش	۹۲۸
	حصۂ نظم		
۱۲	منصور کی یاد میں	جناب محمد ثناء اللہ	۸۸۶
۱۳	پیاری زبان	حفیظ ہوشیارپوری	۸۹۶
۱۴	تجلیات	سردار تخت سنگھ صاحب	۹۰۴
۱۵	سجدۂ نیاز	سید عبدالحمید صاحب عدم	۹۰۵
۱۶	جستجو	جناب سعید احمد اعجاز	۹۰۶
۱۷	غزل	جناب بہزاد لکھنوی	۹۰۹
۱۸	شاعر کا خواب	جناب تابش صدیقی	۹۱۰
۱۹	غزل	جناب علی منظور حیدرآبادی	۹۱۸
۲۰	حقائق و معارف	جناب حکیم آزاد انصاری	۹۲۲
۲۱	کلیات	جناب قیوم نظر بی اے	۹۲۷
۲۲	حسیات	جناب اصغر حسین خاں نظیر لودھیانوی بی اے	۹۳۰
۲۳	کیوپڈ اور میری شاہد	جناب مسعود شاہد بی اے	۹۳۱
	دنیائے ادب		
۲۴	عورت	حضرت شاد عارفی	۹۳۵
۲۵	اردو کے یورپی پرستار	جناب سید قاسم رضا	۹۳۷
۲۶	نقد و نظر	"ع"	۹۴۱

سالانہ چندہ مع محصول ڈاک اور وی پی پانچ روپے (۵) ممالک غیر سے دس شلنگ

گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام صلاح الدین احمد پرنٹر و پبلشر چھپ کر دفتر ادبی دنیا کمرشل بلڈنگ مال روڈ لاہور سے شائع ہوا۔

بزمِ ادب

سالنامہ کی ایک جھلک

نہایت مسرت کا مقام ہے کہ ادبی دنیا کا آئندہ سالنامہ جو آج سے ایک ماہ کے بعد آپ کے ہاتھوں میں ہوگا۔ بڑی خوش اسلوبی سے مرتب ہو رہا ہے ادبی دنیا کے قدیم کرمفرماؤں کے علاوہ بہت سے جدید مضمون نگاروں کے بہترین افکار اس میں شامل ہو رہے ہیں اور اگر اسے خود ستائی نہ سمجھا جائے تو ہمیں یہ کہنے میں ذرہ بھر تامل نہیں کہ سنہ ۳۶ء کا سالنامہ ادبی دنیا کے گزشتہ سالناموں کا سچا جانشین ثابت ہوگا۔

اس دفعہ جو علمی و ادبی مضامین اب تک موصول ہوئے ہیں۔ وہ غیر معمولی طور پر بلند پایہ اور ہمارے محترم مضمون نگاروں کی دقتِ نظر اور وسعت علم کے شاہد ہیں

پروفیسر حمید احمد خاں ادیب ادر العصر مرحوم کے ممتاز ایڈیٹر ماسٹر پیارے لال صاحب شاکر میرٹھی۔ شاہد احمد صاحب مدیر ساقی۔ جناب میراجی حضرتِ خلیل۔ پروفیسر نور الحسن برلاس مقیم جاپان۔ سید شہنشاہ حسین صاحب رضوی۔ مشہور محقق شبیر علی خاں صاحب سرخوش اور علی حسن خاں صاحب کے گرانقدر مضامین زیرِ طبع ہیں اور ملک عطا اللہ صاحب کلیم آنریبل سر عبد القادر۔ پروفیسر قاضی محمد اسلم۔ پروفیسر مرزا محمد سعید صاحب دہلوی۔ مولانا چراغ حسن صاحب حسرت۔ پروفیسر فیض احمد۔ پروفیسر غلام مصطفےٰ تبسم اور سید بادشاہ حسن حیدرآبادی کے عالی پایہ مضامین امروز فردا میں زیرِ طبع آجائیں گے۔

افسانوں اور ڈراموں میں مندرجہ ذیل حضرات کے نتائج فکر زیرِ طبع ہیں۔

کرشن چندر۔ طاہر قریشی۔ پروفیسر حمید الدین حسن عزیز جاوید۔ عاشق بٹالوی۔ ضیا فتح آبادی۔ سیفی نوگانوی۔ راجندر سنگھ بیدی۔ اندر لال داس قمر۔ پروفیسر قاضی فضل حق۔ مرزا مقبول بیگ بدخشانی۔ غلام عباس مولوی۔ آسی رام نگری۔ وقار انبالوی۔ پیرزادہ احمد ندیم قاسمی اور ظفر احمد

ان کے علاوہ حضراتِ سالک بٹالوی۔ سید امتیاز علی تاج۔ محترمہ حجاب امتیاز۔ حکیم احمد شجاع۔ مولوی حامد علی خاں اور بہزاد لکھنوی کے دلآویز افسانے اور ڈرامے دو ایک روز میں موصول ہونے والے ہیں۔

شعرائے نامدار میں سے مندرجہ ذیل حضرات اپنا دلآویز و کیف آور کلام ارسال فرما چکے ہیں:۔

جوش ملیح آبادی۔ فراق گورکھپوری۔ امجد حیدرآبادی۔ اسد ملتانی۔ عبد الحمید عدم۔ بہزاد لکھنوی۔ کیفی چریاکوٹی۔ احسان بن دانش ضیا فتح آبادی۔ جلیل قدوائی۔ تاجور سامری۔ مسعود شاہد۔ مسعود حفیظ۔ میراجی۔ سعید احمد اعجاز۔ عرشی امرتسری۔ اندرجیت شرما۔ نجم ندوی۔ آسی رام نگری۔ حمید عرفانی۔ لطیف انور۔ احمد ندیم قاسمی۔ سراج الدین ظفر اختر انصاری اصغر حسین خاں نظیر۔ ماہر القادری۔ سید علی منظور۔ تابش صدیقی۔ بزمی انصاری۔ ساغر جلیلی۔ فطرت کاشمیری۔ پروفیسر تبسم قیوم نظر۔ مہدی علی خاں۔ مراتب علی خاں ثاقب۔ عاصی امرتسری غلام رسول نازکی۔ نذیر احمد ظفر۔ عباس بیگ محشر۔ تخت سنگھ اور پروفیسر فیض احمد۔

حضرات مذکورہ کے علاوہ سالنامہ کی محفل ادب میں جن ارباب فکر کی شمولیت کی پوری توقع ہے۔ ان میں سے چند کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں

علامہ برج موہن دتاتریہ کیفی۔ ابوالاثر حفیظ جالندھری۔ ساغر نظامی۔ اختر شیرانی۔ اثر صہبائی علامہ تاجور نجیب آبادی۔ پنڈت ہری چند اختر۔ پروفیسر ایس ایم اختر۔ پنڈت رام سروپ شاستری۔ سید تسکین عابدی۔ سید تمکین کاظمی۔ سید محمد جعفری۔ مولانا ابوالعلا چشتی۔ محترمہ ح۔ ب ایڈیٹر نسوانی دنیا اور مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی۔

تصاویر کے لحاظ سے بھی اس دفعہ کا سالنامہ نہایت جاذب نظر ہوگا۔ لاہور کے ممتاز آرٹسٹ سید سرفراز ایک نہایت دل کش ٹائٹل تیار کر رہے ہیں۔

مشرقی آرٹ اور مغربی مصوری کے سات رنگین شاہ کار ناظرین کے لئے جنتِ نگاہ کا سامان بہم پہنچائیں گے اور قریباً ساٹھ یک رنگ تصاویر ان کے علاوہ ہوں گی۔

ادبی دنیا کے ان مخلص کرم فرماؤں سے جن کے رشحاتِ قلم ہمیشہ اس کے صفحات کی زینت رہے ہیں اور جنہوں نے ابھی تک سالنامے کے لئے اپنے گراں پایہ مضامین یا نظمیں ارسال نہیں فرمائیں مجھے صرف اس قدر عرض کرنا ہے کہ ہماری محفل ادب کی زینت آپ ہی لوگوں سے ہے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ کی نشستیں خالی رہیں اور آنکھیں آپ کو ڈھونڈتی رہیں اگرچہ اب کافی دیر ہو چکی ہے لیکن اگر آپ اب بھی تشریف لائیں تو ہمارے دیدہ و دل فرش راہ ہیں۔ آپ کے لئے ہر وقت جگہ نکالی جا سکتی ہے۔

منصور گولڈ میڈل

اکتوبر کی اشاعت میں انعامی مضامین کے ایک سلسلہ کا اعلان کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ کی اہم ترین کڑی منصور گولڈ میڈل ہے۔ ہم اپنے اہل قلم احباب کی توجہ ایک بار پھر ان عنوانات کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں جو منصور گولڈ میڈل سے متعلق مضامین کے لئے مخصوص ہیں۔ ہم اہلِ قلم حضرات کے علاوہ یونیورسٹی کے طلباء کو خصوصیت سے اس انعام کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں اور ان کی سہولت کے لئے یہ عنوانات دوبارہ درج کر رہے ہیں۔

۱۔ اردو کے مندرجہ ذیل شعراء میں سے کسی ایک کی شاعری کا سیر حاصل تجزیہ: میر۔ آتش۔ مومن۔ درد۔ غالب۔ اکبر۔ حالی۔ اقبال۔ حسرت موہانی۔ جوش۔

۲۔ اردو کے موجودہ صاحبِ طرز انشا پرداز۔

۳۔ اردو کے ہندو، عیسائی یا یورپین شعراء (انتخابِ کلام اور حالات)

۴۔ دہلی۔ لکھنو۔ حیدرآباد۔ بہار اور پنجاب میں سے کسی ایک مرکز کی خدماتِ اردو۔

۵۔ اردو کی درسی کتب میں اصلاح و ترقی کی ضرورت اور اس کے اصول۔

۶۔ زبان اور کلچر یا زبان اور سیاست

۷۔ اردو کی ڈرامائی تاریخ کا خاکہ۔

۸۔ اردو کی ادبی و سیاسی صحافت پر ایک اجمالی نگاہ۔

۹۔ اردو کی ترقی میں ترجمے کا حصّہ

۱۰۔ شمالی ہندوستان کی آئندہ زبان اور اس کی علمی و ادبی ممکنات

صلاح الدّین احمد

آئینۂ عالم

جاپان یورپین نقاب کے نیچے

مارکویس اوسیکا نے برآمدہ کا دروازہ کھول کر تواضعاً جھک گیا۔ اور بولا "تشریف فرمائیے۔ . . . اس جگہ آپ یوں محسوس کریں گے جیسے یورپ میں بیٹھے ہو۔"

مارکویس خود دہلیز میں کھڑا رہا۔ اور اس کمرے کے متعلق میرے تاثرات کو میرے چہرے سے بھانپنے کی کوشش کرتا رہا۔ جو اس نے مشرقی جاپان میں مغربی طرز پر آراستہ کر رکھا تھا۔ ٹوکیو میں مارکویس کا محل تین کمروں پر مشتمل ہے۔ جن میں سے چار کمرے یورپین طرز کے ہیں:

"عزیز دوست یقین کیجئے کہ مجھے ان کمروں میں بالکل اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ لیکن بدقسمتی سے میں اپنے اہلِ خانہ کو ان کے استعمال کی طرف راغب نہیں کر سکا۔ میرے گھرانے کے تمام افراد نرم نرم گدیلوں اور چٹائیوں کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ . . . لیکن آپ نے بتایا نہیں۔ کہ ان کمروں کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے"۔

حق تو یہ ہے کہ یورپ کی اس نقل نے مجھ پر کچھ اثر نہ ڈالا تھا۔ اور اسی لئے میں نے اپنے تاثرات کو اپنے معزز مہمان پر ظاہر نہ کیا۔ مارکویس یورپین گھروں کی آراستگی کے اصول اوّلیں سے بے خبر تھا۔ ایک سرخ چوبی پیانو ایک امریکن ڈیسک کے ساتھ کندھا جوڑے کھڑا تھا۔ کمرے کے وسط میں انیسویں صدی کی طرز کا ایک میز پڑا تھا جس کی طرز باقی سامان کے ساتھ کوئی مناسبت نہ رکھتی تھی۔ اور ان سب پر مستزاد ونقلی طرز کی برتن رکھنے والی خانہ دار میز تھی۔ جو دیوار کے ساتھ پڑی تھی۔

"میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس ماحول میں ایسا محسوس کرتا ہوں جیسے ہمیشہ سے ان کا عادی ہوں۔ لیکن افسوس ہے کہ میرا گھرانہ اس معاملہ میں میرا ہمنوا نہیں ہے"۔ مارکویس نے دوبارہ یقین دلاتے ہوئے کہا۔

لیکن جب چائے پینے کا موقع آیا تو ان یورپین کمروں کے بجائے ہم جاپانی ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ جہاں چائے کے ساتھ تیز مسالے والی مٹھائی کھائی گئی۔

میزبان نے بااصرار چائے اپنے ہاتھ سے تیار کی کیونکہ جاپانی تہذیب کے مطابق یہ اعزاز کسی اور کو نہیں پہنچتا۔

باوجود اپنے مغربی لباس کے مارکویس اپنی کہنیاں ایک چھوٹی سی چوکی پر ٹکا کر آرام سے زمین پر بیٹھ گیا۔ اس وقت میں نے محسوس کیا کہ خواہ کوئی جاپانی اپنی نصف زندگی لندن اور پیرس میں گذار آئے، اور خواہ ظاہرا طور پر کتنا ہی مغربیت کے رنگ میں رنگا ہوا نظر آئے۔ لیکن زندگی کا حقیقی لطف اور اطمینان اُسے اسی وقت نصیب ہوتا ہے۔ جب وہ ان کمروں میں خالص مشرقی انداز سے بیٹھتا ہے۔ وہ کمرے جو صدہا سال پرانے طرز بود و ماند کے مطابق آراستہ کئے گئے ہوں:

تھوڑی دیر کے بعد تین اور مہمان آ گئے۔ جن میں دو مرد تھے اور ایک عورت مرد کمرے کے ایک کونے میں بیٹھے رہے۔ لیکن مہمان عورت اور میزبان کی بیوی کمرے کے سامنے والے کونے میں جا بیٹھیں سب کے سامنے آبنوس کی ایک ایک چوکی پڑی تھی۔ اور سوائے میزبانہ کے جس نے جاپانی طرز کا سیاہ کمونو پہنا ہوا تھا۔ باقی تمام افراد یورپین لباس میں ملبوس تھے۔

ان دنوں میں نیا نیا جاپان آیا تھا۔ اس طرز سے بیٹھے ہوئے ابھی دس منٹ بھی نہ گذرے ہوں گے کہ میری ٹانگیں سونے لگیں۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے ہزارہا سوئیاں میری ٹانگوں میں چبھوئی جا رہی ہیں۔ اس وقت میں کتنا حیران ہوتا۔ اگر کوئی شخص مجھے بتاتا کہ آج سے دو ماہ بعد جب میں جاپان سے رخصت ہو رہا ہوں گا۔ تو جہاز کے

افسر کی پیش کردہ کرسی کی بجائے جاپانی گدیلوں کی خواہش مجھے بیتاب کردے گی۔

چائے کے بعد مارکوئیس مجھے رخصت کرنے کے لئے باہر تک آیا۔ اور جب میں اپنی موٹر میں بیٹھ گیا۔ تو ایک چھوٹا سا پیکٹ میرے ہاتھ میں دے کر رخصت ہو گیا۔ اس کے پیٹھ موڑتے ہی میں نے پیکٹ کھول ڈالا۔ اس میں تیز مسالے والی مٹھائی تھی۔ وہی جو چائے کے ساتھ پیش کی گئی تھی۔

میرے ترجمان نے کہا "شاید مارکوئیس کو معلوم ہو گیا ہو گا۔ کہ آپ نے مٹھائی کو پسند کیا ہے۔ چنانچہ وہ بھولے نہیں"۔

مارکوئیس نے کہا تھا "اگر تم اصلی جاپان دیکھنا چاہتے ہو۔ تو ٹوکیو میں نہ ٹھہرو۔"

میں اس تجویز پر عمل کرنے کے لئے پہلے ہی سے تیار تھا۔ کیونکہ چند ہی گھنٹے پہلے میں نے وزارت حربیہ سے چند فلمیں لینے کی درخواست کی تھی اور وہاں سے مجھے ناگاساکے حوالی میں سوکنیا کی چھوٹی سی بندرگاہ میں تصویر لینے کی اجازت مل گئی تھی۔

سوکنیا میں صرف ایک ہی ہوٹل ہے۔ اور اگلی شب میں وہاں پہنچ چکا تھا۔ میرا کمرا چارپائی، میز اور کرسیوں سے یکسر خالی تھا۔ خوش قسمتی سے میں ان کے بغیر گذارہ کرنے کا عادی ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد میں کھانے کے کمرے میں آگیا۔ جو عمارت کی پہلی منزل میں تھا۔ تقریباً ۳۰ مہمان پہلے سے وہاں موجود تھے۔ ہر ایک کے سامنے ایک چوکی پر مچھلی کا قورمہ رکھا تھا۔ جس سے تیز خوشبو نکل کر کمرے میں پھیل رہی تھی۔

ہوٹل کے مالک کی پرخلوص توجہ کے جواب میں دوستانہ طریق پر مسکراتے ہوئے میں ایک چوکی کے پاس بیٹھ گیا۔ تیز مسالہ والے قورمے کی ایک پلیٹ میرے سامنے بھی رکھ دی گئی؟

جاپانی مینجر نے کہا "آپ کو یہاں گوشت بھی مل سکتا ہے۔ حالانکہ حقیقی جاپانی کبھی گوشت نہیں کھاتا۔ صدہا سال سے ہم گوشت کو بطور خوراک استعمال کرنا جانتے ہی نہ تھے۔ لیکن جنگِ عظیم کے زمانے سے یورپین عادات و رسوم کی ترویج نے ہمارے ملکیوں میں بھی گوشت کھانے کی عادت ڈالدی ہے"۔

کھانا پیش کرنے پر نو عمر ملازم مامور تھے۔ جو بالکل بچے معلوم ہوتے تھے۔ یہاں رواج یہ ہے کہ جب پلیٹ کا کھانا بالکل ختم کر دیا جائے۔ تو بغیر اس کے کہ مہمان کی رائے لی جائے۔ پلیٹ اسی کھانے سے دوبارہ بھر دی جاتی ہے۔ اگر اس کی مرضی دوسری قسم کا کھانا منگانے کی ہو تو اُسے پہلی پلیٹ میں ذرا سا کھانا چھوڑ دینا چاہیے۔

"آپ شراب کیوں نہیں پیتے؟" مالک نے دریافت کیا "میں چاہتا ہوں کہ آپ ہماری ساکی کے متعلق اپنی رائے کا اظہار فرمائیں"۔

ساکی وہ شراب ہے جو چاولوں سے تیار کی جاتی ہے۔ میں نے اپنے میزبان کے پاس خاطر کے لئے ایک گھونٹ نگلا تو سہی لیکن اس طرح جیسے کوئی مریض بدمزہ دوا پیتا ہے۔

دوران طعام میں میں نے ایک عجیب معاملہ دیکھا۔ تمام مہمان برابر کے ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ لیکن یکایک ان میں سے ایک اٹھا اور ہوٹل کے مالک سے کہنے لگا۔

"دوست میرے پیالے میں شراب پیو گے"؟

"آپ حد سے زیادہ میری عزت افزائی فرما رہے ہیں"۔ یہ کہتے ہوئے ہوٹل کے مالک نے شراب کا پیالہ خالی کر کے اپنے مہمان کو واپس کر دیا۔

حاضرین کے لئے یہ ایک اشارہ تھا۔ چنانچہ یکدم تمام مہمانوں نے شراب کے نشے میں اپنے اپنے پیالے ایک دوسرے سے تبدیل کرنے شروع کر دیئے۔ ہوٹل کے مالک کے پاس ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ لیکن اب وہ پیالے کو بمشکل تمام لبوں تک لے جا کر پاس رکھی ہوئی گرم پانی کی بالٹی میں ڈالتا جاتا تھا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ تہذیب و رسوم کی سخت ترین قیود کے باوجود اس ملک میں بھی بعض اوقات تمام پابندیوں کو بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے۔

میرے نزدیک ترین مہمان نے ایک ملازمہ سے کہا "مہربانی کر کے مجھے تھوڑے سے چاول دیجیے"۔

"کیا آپ سیر ہو لئے"؟ ملازمہ نے حیرت سے پوچھا؟ یہاں اس بات کی توضیح کر دینی ضروری ہے کہ جاپان میں چاولوں کی فرمائش کھانے سے سیر ہو چکنے کے اعلان کے مترادف ہے۔

جاپانی کھانا کیسا ہوتا ہے؟

باریک دانوں والی مٹر کی پھلیاں (جن میں نمک بہت تیز ہوتا ہے)

اسے کھانے کے لئے چھوٹی چھوٹی لکڑیاں استعمال کرتے ہیں۔ جن کے ذریعے جاپانی دانے نکال لیتا ہے۔ اور پھلی کو پلیٹ میں چھوڑ دیتا ہے۔

جو یورپین ان لکڑیوں کا استعمال نہیں جانتے۔ انہیں ہاتھوں سے کھانا پڑتا ہے۔

اسے ختم کرنے کے بعد ساکی کا دور چلتا ہے۔ اور اگر کوئی چاہے تو ساکی کی بجائے بیر پی سکتا ہے۔

آپ کے سامنے ساکی کا پیالہ رکھنے کے بعد خادمہ مسکراتی ہوئی منتظرانہ انداز میں رکی رہے گی۔ اس موقع پر ہر مہذب اور تعلیم یافتہ جاپانی یہ کہنے سے نہ چوکے گا:-

"مجھے مسرت ہوگی اگر آپ میرے پیالے سے ساکی پئیں گی"

وہ ساکی کا پیالہ پی جائے گی اور پھر گرم پانی سے پیالہ دھوکر اور دوبارہ پُر کرکے آپ کے سامنے رکھ دے گی۔

میں جلد ہی جاپانی ماحول سے مانوس ہوگیا۔ اور جلد ہی مجھے معلوم ہوگیا۔ کہ میں ایک دوسری دنیا میں ہوں جس کے باشندوں کا زاویہ نگاہ زندگی کے متعلق ہماری دنیا سے بالکل مختلف ہے۔

مثلاً دل کے لفظ کا مفہوم جاپان میں وہ نہیں ہے۔ جو ہم لوگ لیتے ہیں۔ اُن کے نزدیک یہ چیز احساسات اور تاثرات کا سرچشمہ نہیں ہے۔

"میرا دل تمہاری محبت سے مملو ہے۔" اس فقرے کا ترجمہ کرتے ہیں جاپانی مترجم کو کتنی مشکل پیش آئے گی! اس کا اندازہ ناممکن ہے۔ "یا تم نے میرے دل کے ٹکڑے کردیئے"۔ ہمارے ملکوں کی طرح جاپان میں بھی عاشق اپنے محبوب کے کوچے میں گھومتے ہوئے دن سے رات کر دیتا ہے۔ لیکن یہ بات اس کی سمجھ میں کسی طرح نہیں آتی۔ کہ گوشت کے اس مرکزی لوتھڑے کو جو جسم میں دوران خون کرتا رہتا ہے محبت سے کیا تعلق ہے۔ چنانچہ ان فقروں کے بجائے جاپانی کہے گا "تم نے میرے پاؤں تھکا دیئے"

اکثر یورپین سیاح اس بات کو واضح کر چکے ہیں کہ جاپان میں بوسہ لینے یا دینے کے عمل یا مفہوم کو کوئی نہیں جانتا۔ یہ بات بالکل صحیح ہے۔ حالانکہ یہ تسلیم شدہ امر ہے لیکن ہر یورپین کو جو جاپان میں آئے اس کی تصدیق حیران کر دیتی ہے

ایک روز میں ایک رجمنٹ کو دیکھ رہا تھا۔ جو ابھی ابھی مانچوریا کے میدان جنگ سے واپس آئی تھی۔ شہر کے اکثر گلی کوچوں میں چکر لگانے کے بعد سپاہی اپنی بارکوں میں واپس پہنچ چکے تھے۔ جہاں ان کے عزیز و اقربا اُن سے ملنے کے لئے بے تاب کھڑے تھے۔ افسر نے اجازت دی کہ سپاہی صف بندی توڑ کر تھوڑی دیر کے لئے اپنے عزیزوں سے مل سکتے ہیں۔ میرے پاس ہی ایک سپاہی کے عزیز کھڑے تھے۔ ماں بہن اور دو چھوٹے بھائی سپاہی ماں کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ اور ذرا سا جھک کر بولا:-

"اماں میں آگیا ہوں"

اور بس اس کے بعد دونوں ساکت و صامت کھڑے تھے۔ جاپانی بڑھیا دیر تک اپنے بیٹے کی طرف دیکھتی رہی۔ اسے بیٹے کو چھاتی سے لگانے کا خیال تک نہ آیا۔ اسکی آنکھیں اس جوشِ محبت کا پتہ دے رہی تھیں۔ جو اس کے سینے میں امنڈ رہا تھا۔ اس کے بعد سپاہی وہاں سے ہٹ کر بہن کے سامنے آکھڑا ہوا اور بولا "میں آگیا ہوں"، خوشی سے چمکتی ہوئی آنکھوں کے دو جوڑے اس کے چہرے پر گڑے ہوئے تھے۔ اور اپنی تشنگی مٹا رہے تھے۔ میں کبھی نہ بھولوں گا اس خاموش ملاقات کو جس میں ایک سحر تھا۔ جو قلب و جگر کو پگھلا رہا تھا۔

میری میزبانہ کے دو بچے تھے۔ وہ نہایت پیارے بچے تھے جاپانی کھلونوں کی طرح۔ ایک روز بارش کی وجہ سے میں فلم لینے کے لئے باہر نہ جا سکا۔ اور چند گھنٹوں کے لئے گھر پر ہی ٹھہرا رہا۔ یکایک ان میں سے ایک بچہ دوڑتا ہوا میرے کمرے کے سامنے سے گذرا۔ میں نے اسے گود میں اٹھا لیا۔ اور فرطِ محبت سے اس کا منہ چوم لیا۔ ماں اپنے کمرے کے دروازے میں کھڑی دیدے پھاڑ پھاڑ کر میری طرف گھور رہی تھی اس کی سمجھ ہی میں نہ آتا تھا۔ کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ میں نے اسے بتایا کہ بوسہ لینا یورپینوں کے نزدیک محبت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ بوسے کی توضیح و تفسیر میں فقروں کے دفتر لکھے جا سکتے ہیں۔ اور یہ کہ بوسے کے عنایت کرنے یا انکار کرنے پر دنیا میں حقیقی اور عملی ڈراموں کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔ میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ بوسے کی کئی قسمیں ہیں۔ اپنی تقریر کو مختصر کرتے ہوئے میں نے کہا کہ سب سے زیادہ متبرک اور قابلِ تعظیم ماں کا بوسہ اپنے بچے کے لئے ہے۔ یہ بات تو میری سمجھ میں آسکتی ہے کہ عاشق اور محبوب بوسے کے بغیر بھی گذارہ کر لیں لیکن میرا دماغ اس بات کے سمجھنے سے یکسر عاجز ہے کہ جاپانی مائیں اپنے بچوں کو چومنے کی کیسے ضرورت محسوس نہیں کرتیں۔

میری میزبانہ خاموشی سے میری باتیں سنتی رہی اور پھر ایک لفظ کہے بغیر

بچے کو گود میں اٹھا کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس کے چند ہی منٹ بعد برآمدے کو عبور کرتے ہوئے میں نے اس کے نیم وا دروازے سے اندر کی طرف نگاہ کی نیک دل عورت اپنے بچے پر جھکے ہوئے اس کا بوسہ لے رہی تھی۔ . . . اور پھر ایک منٹ کے لئے خاموشی سے اس کا منہ تکتی رہی۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ بچے پر اس کا کیا اثر ہوتا ہے۔
کچھ عجیب ہی پر اسرار اور ناقابل فہم قسم کا ملک . . . .

راشچائیلڈ

کی امارت کے راز

آپ میں سے ہزاروں اصحاب نے دنیائے سینما کی غیر فانی اور مشہور فلم "ہاؤس آف راش چائیلڈ" ملاحظہ فرما کر لطف اٹھایا ہو گا۔ اس سبق آموز فلم میں جارج آرلس جیسے نامور ایکٹر نے بیرن راش چائیلڈ کا کردار خوب ادا کیا ہے۔

تعلیم یافتہ طبقے میں سے کون ایسا شخص ہے جس نے راش چائیلڈ کے مشہور زمانہ کاروبار کی نسبت کچھ سنا یا پڑھا نہ ہو، جسے یہ معلوم نہ ہو کہ فرانس کے عظیم الشان شہنشاہ نپولین اول کے وقت میں تاریخ یورپ میں اس گھرانے کو کتنی اہمیت حاصل ہو گئی۔ کسے معلوم نہیں کہ اس نے برطانیہ کی قسمت کو پلٹ دیا اور برطانیہ اور یورپ کی تاریخ بدل کر رکھ دی۔ ڈیوک آف ولنگٹن کے ہاتھوں شہنشاہ کی شکست کی اصلی توجیہہ صرف وہ بے شمار دولت ہے اور اس کیسۂ زر کی قوت مخفی حاجات طاقت ہے جس کی ڈوریاں اِس گھرانے نے برطانیہ کے ہاتھ میں پکڑا دی تھیں۔

اس گھرانے کی ترقی کا اصلی راز جس نے اس کو کامیابی کے اولیں زینے سے اٹھا کر آفتاب نصف النہار کی طرح چمکایا ان غیر فانی اصولوں میں مضمر ہے جن پر یہ ہمیشہ کاربند رہا اور جنہیں قطعات کی صورت میں لکھوا کر اہل خاندان نے اپنے بنک کی دیواروں پر لٹکا رکھا تھا۔

یہ زریں اصول اس قابل ہیں کہ ہندوستانی تاجر انہیں آب زر سے لکھوا کر اپنے دفاتر میں رکھیں اور ان پر حرف بہ حرف عمل کر کے اپنے ملک اور باشندگان ملک کے لئے بھلائی کا موجب ہوں:۔

یہ غیر فانی اصول مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ اپنے کاروبار کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیلات میں خود دلچسپی لو۔
۲۔ ہر بات کے لئے مستعد اور تیار رہو۔
۳۔ معاملات پر اچھی طرح غور کر لو اور پھر قطعی فیصلے پر پہنچ جاؤ۔
۴۔ نیکی کرنے کی جرأت پیدا کرو اور عمل بد سے ڈرو۔
۵۔ آزمائشوں میں صابر رہو۔
۶۔ زندگی کی جنگ بہادری اور مردانگی سے لڑو۔
۷۔ نااہلوں کی صحبت سے بچو۔
۸۔ دیانتداری کو اپنا سب سے بڑا فرض سمجھو۔
۹۔ دوسروں کے کاروبار یا نیک نامی کو نقصان نہ پہنچاؤ۔
۱۰۔ صرف نکوکار لوگوں سے رشتہ جوڑو۔
۱۱۔ اپنے دل کو برے خیالات سے پاک رکھو۔
۱۲۔ کسی مصلحت کی خاطر بھی جھوٹ نہ بولو۔
۱۳۔ اپنی دوستی کے لئے بہت کم لوگ منتخب کرو۔
۱۴۔ جو کچھ تم نہیں ہو اس کے ہونے کا ادعا کبھی نہ کرو۔
۱۵۔ لوگوں سے اچھا برتاؤ کرو۔
۱۶۔ اپنے قرض بروقت اور مستعدی سے ادا کرو۔
۱۷۔ اپنے دوست کی صداقت پر شبہ نہ کرو۔
۱۸۔ اپنے والدین کی پند و نصائح پر عمل کرو۔
۱۹۔ اپنے اصول کی پابندی کے لئے دولت کو قربان کر دو۔
۲۰۔ شراب کو چھونا یا چکھنا حرام ہے۔
۲۱۔ اپنے فرصت کے اوقات کو ترقی کی راہیں سوچنے پر صرف کرو۔
۲۲۔ بدی سے ہمیشہ بچتے رہو۔
۲۳۔ نفسانی خواہشات کو ہمیشہ قابو میں رکھو۔
۲۴۔ ہر شخص کی سلامتی چاہو۔
۲۵۔ اپنی ہمت کو کبھی پست نہ ہونے دو۔
۲۶۔ نیکی کے راستے پر مستقل مزاجی سے گامزن رہو تو کامیابی کی منزل پر پہنچنا یقینی ہے۔

مظفر احمد

منصور کی یاد میں

کس طرح اس کا یقیں آئے کہ منصور گیا
اپنے پہلو میں لئے خاطرِ مجبور گیا

مشکلیں اتنی پڑیں اُس پہ کہ آسان ہوئیں
خوگرِ رنج والم دہر سے مجبور گیا

کام اس کا ہے یہیں، نام بھی اس کا ہے یہیں
گرچہ نظروں سے ہمیشہ کے لئے دور گیا

اب نہیں ساقیٔ میخانۂ ادبی باقی
لطفِ میخوار گیا جذبۂ مخمور گیا

پختگی، طرزِ ادا، شُستگی، کہنہ مشقی،
اب زمانے سے صحافت کا وہ دستور گیا

محمد ثناءاللہ



هری امان



نی اماں کا بچہ

رسم الخط کا مسئلہ

آج کل اردو ہندی رسم الخط کا مسئلہ اخبارات و رسائل میں بار بار زیر بحث آرہا ہے میں دیکھتا ہوں کہ اس پر اپنی رائے کا اظہار فرمانے والے یا تو ان میں سے ایک ہی رسم الخط سے واقف ہوتے ہیں یا بے توجہ کے ساتھ غور فرمانے کی زحمت گوارا نہیں فرماتے اکثر اخبارات و رسائل میں یہ بھی دیکھا ہے کہ اس مسئلہ پر اپنی رائے کا اظہار فرمانے والے بعض وہ قابل احترام حضرات ہیں جو اگرچہ اپنی دوسری خصوصیات اور صلاحیتوں کے اعتبار سے ہمارے واجب الاحترام رہنما ہیں۔ مگر علم الاصوات وعلم الحروف سے بالکل ناواقف ہونے کی وجہ سے وہ کچھ زیادہ وقیع رائے دینے کے اہل نہیں ہیں۔ اس سے انکار نہیں کہ سیاسیات پر اچھی نظر کے مالک ہیں یا اقتصادی معلومات کے بڑے گراں بہا خزانے اپنے دماغوں میں محفوظ رکھتے ہیں۔ مگر یہ بھی عجیب بات ہوگی کہ کسی مریض کی دوا اور غذا کے متعلق کسی ماہر فن انجنیئر یا کسی عمارت کی تعمیر کے متعلق کسی تجربہ کار طبیب سے مشورہ کیا جائے۔

تیسری قسم اس مسئلہ پر رائے دینے والوں کی وہ ہے جو خود سوچنے یا سمجھنے کی مطلق صلاحیت نہیں رکھتی بلکہ کسی دوسرے شخص کے خیالات صرف اس لئے دہراتی رہتی ہے۔ کہ ان کا رعب کسی وجہ سے اس پر طاری ہے۔ یہ حضرات اپنی طرف سے اس مسئلہ پر دوسروں کی رائے اس طرح پیش فرماتے ہیں جیسے یہ آپ کی ساری عمر کے فکر و توجہ کا نتیجہ ہو۔ حالانکہ وہ مسئلہ سے اسی قدر ناواقف ہوتے ہیں جیسے ایک عامی النسان۔

مولانا عبدالحق صاحب بی۔ اے سیکرٹری انجمن ترقی اردو اور پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی نے ابھی حال میں جو گفتگو بابو راجندر پرشاد سے پٹنہ میں کی ہے۔ اس کے نتائج اخبارات میں شائع ہوئے ہیں ان پر رائے زنی فرماتے ہوئے ہمارے ایک مدیر نے ناگری رسم الخط کی مدح اور اردو رسم الخط کی مذمت اپنے اس خاص انداز میں فرمائی ہے جو صرف ان لوگوں کا حصہ ہے جو تخریبی دماغ رکھتے ہیں اور جانتے کم بکتے زیادہ ہیں۔

رسم الخط ہر ملک میں اس ملک کی مروجہ زبان کی ضرورت کے لحاظ سے ہوا کرتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ چینی اور جاپانی رسم الخط میں بعض الفاظ و نقوش کچھ خاص آوازوں کے ادا کرنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ جن کے مقابل دوسری زبانوں میں کوئی نقش آپ کو نہیں ملے گا۔ بظاہر وہ غیر ضروری معلوم ہوں تو ہوا کریں حقیقتاً ان زبانوں کو ان کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی انگریزی زبان کو D ۔ B وغیرہ کی۔ انگریزی میں ملاحظہ فرمائیے حرف X بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ K اور S کی مرکب آواز دیتا ہے اور K و S سے اس حرف کا کام لیا جا سکتا تھا اور یہ حرف انگریزی رسم الخط میں بے ضرورت اور زائد ہے لیکن ذرا غور سے توجہ فرمائیں تو معلوم ہوگا ایسا نہیں ہے کیونکہ S اور K کی مرکب آواز سے کسی حد تک مختلف ہوتی ہے۔ اسی طرح وہ نقوش یا حروف کسی رسم الخط میں نہیں پائے جاتے جن کی اس ملک کو ضرورت نہ ہو۔ مثلاً عربی میں ڈ۔ ڈ۔ ٹ۔ پ۔ چ۔ گ۔ وغیرہ کی تلاش عبث ہے۔ عربی زبان کو ان حروف کی ضرورت نہیں۔ ایسے ز۔ ذ۔ ظ وغیرہ حروف سنسکرت میں نہیں مل سکتے۔

یہ ہے وہ فطری وجہ جس سے تمام دُنیا کے رسم الخط بنے اور جاری ہوئے ہیں۔ ۔ تمدن کی روز افزوں ضروریات نے لوگوں کو اس کی طرف متوجہ کیا اور آہستہ آہستہ وقتاً فوقتاً اس میں اصلاح و ترمیم بھی ہوتی رہی اور برابر دُنیا کے مختلف رسوم الخط میں یہ سلسلہ جاری ہے اور شاید ہمیشہ جاری رہے گا۔

میں برسوں سے اردو اور ناگری رسم الخط پر غور کر رہا ہوں میں نے بہت سے مضامین بھی ہندی میں لکھے ہیں۔ ناگری خط سے مجھے کوئی عناد نہیں۔ لیکن پھر بھی میں یقین کرتا ہوں کہ ناگری خط ایک ناکمل اور تکلیف دہ رسم الخط ہے۔ میری رائے میں زبان اور خط کے مسئلہ پر جس نقطۂ نظر سے مسٹر گاندھی اور راجہ سی گوپال اچاریہ غور کرتے ہیں وہ صحیح نہیں ہے۔ زبان ہندوؤں یا مسلمانوں کی نہیں ہوا کرتی بلکہ کسی ملک یا دیس کی ہوتی ہے آپ نے کبھی نہیں سنا ہوگا۔ کہ عراق کے مسلمان عربی اور عیسائی عبرانی یا کلدانی زبان بولتے ہیں اور نہ آپ کے تصور میں یہ بات آسکتی ہے کہ بنارس کے مسلمان عربی اور ہندو سنسکرت بولتے ہوں گے۔ کیونکہ ایسا ہونا عقل کے خلاف اور فطرت انسانی کی

اقتضا کے بالکل منافی ہے۔ ہر ملک کی زبان وہ ہوتی ہے جس میں اس ملک کے رہنے والے چاہے وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں بات چیت کیا کرتے ہیں۔ اور وہی زبان ان کے لکھنے پڑھنے اور تمام ضروریات میں استعمال کی جاتی ہے پھر یہ کیسا صاف جھوٹ اور کتنی غیر حقیقی بات ہے کہ اردو کو مسلمانوں کی اور بھاشا کو ہندوؤں کی زبان قرار دیا جائے۔ کیا آج کہیں ہندوستان کے کسی حصے میں تلسی داس کی بانی والی یا بانان خانان کے دوہوں والی زبان بولی جاتی ہے۔ ہندی کے رسالوں میں جو زبان استعمال کی جاتی ہے وہ ہندوستان کے کسی حصہ بلکہ کسی ایک گھر تک میں بولی نہیں جاتی صدیاں گذریں کہ وہ زبان ہندوستان سے رخصت ہوگئی۔ بالکل اسی طرح جیسے سرکاری دفاتر سے فارسی ختم ہوگئی۔ اب جو زبان ہندوستان میں رائج ہے اس کے لئے کسی تشریح یا توضیح کی ضرورت نہیں سب جانتے ہیں کہ وہ وہی زبان ہے جو ہندوستان کے تمام شہروں میں اور شمالی ہندوستان کے شہروں اور دیہات میں عام طور سے بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ کلکتہ۔ بمبئی۔ یوپی۔ بہار۔ پنجاب۔ ناگپور۔ جہاں جی چاہے بول کر پوچھ کر دیکھ لیجئے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ایک زبان رائج ہے۔ لب ولہجہ کا معمولی فرق تو پایا جائے گا مگر زبان میں کوئی بنیادی فرق نہ ہوگا۔

ان علاقوں میں جہاں اُردو یا ہندوستانی زبان بولی جاتی ہے آپ جانتے ہیں کہ ہندو مسلمان۔ عیسائی۔ پارسی۔ بدھ اور لا مذہب سب ہی بستے ہیں لیکن سب کی الگ الگ زبانیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی زبان ہے جس سے اپنے دکھ دوسرے کو سناتے اور دوسرے کی آپ خود سنتے ہیں اگر ایسا نہ ہو تو شاید آقا اور نوکر باپ بیٹے اور دو پڑوسیوں میں کبھی تبادلہ خیالات ممکن نہ ہو سکے۔

ظاہر ہے ان حالات میں کوئی زبان یا رسم الخط کسی مذہب کے ساتھ مخصوص نہیں ہو سکتا بلکہ ہر زبان اور ہر رسم الخط کسی دیس یا ملک سے مخصوص ہوتا ہے ہمارے کسی لیڈر کا یہ کہنا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے اور قرآن مجید کے رسم الخط میں لکھی جاتی ہے اگر تعصب اور تنگ ظرفی نہیں تو جہل اور ناسمجھی کی بات ضرور ہے۔

یہ بھی غلط ہے کہ کوئی زبان کسی دوسری زبان سے رسم الخط لے کر کام چلائے۔ ایسا نہیں ہو سکتا دوسری زبان کے رسم الخط میں بہت سی اصلاحات اور اضافے کر کے اپنانا پڑے گا۔ تیسری صدی ہجری میں جب فارسی نے عربی کا رسم الخط اپنی زبان کے لئے لیا تو اس میں کئی حروف کے اضافے کئے گئے۔ فارسی کے لئے پہلے سے جو رسم الخط رائج تھا وہ پیدا ہونے والی زبان کا ساتھ نہ دے سکا اس لئے مجبوراً اس کو چھوڑ کر دوسری زبان کے رسم الخط میں اپنی ضرورت کے مطابق اضافے کر کے اپنا بنانا پڑا۔ اسی طرح ترکی نے اپنا رسم الخط بدلا تو لاطینی رسم الخط میں ۱۰ ۱ حروف۔ نقطوں اور نشانوں سے بنانے پڑے۔

آج جو رسم الخط دُنیا کے مختلف ممالک میں رائج ہیں وہ سب کے سب اپنی اصل کے اعتبار سے کسی نہ کسی مردہ زبان کے رسم الخط کی اصلاح یافتہ شکلیں ہیں دنیا میں جس قدر زبانیں پیدا ہوئیں اتنے رسم الخط نئے نئے پیدا نہ ہوئے بلکہ ایک رسم الخط دس زبانوں کے لئے تھوڑے بہت تغیر کے ساتھ کارآمد بنایا گیا۔ لیکن یہ تھوڑا بہت تغیر اس قدر اہم ہوتا ہے کہ اس کی وجہ سے وہ اصلاح شدہ رسم الخط اسی زبان کا مخصوص رسم الخط ہو جاتا ہے۔ اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ دو زبانیں بعینہ ایک رسم الخط میں نہیں لکھی جاتی ہیں۔ بلکہ ہر زبان کسی قدیم رسم الخط کو اصلاح و ترمیم کر کے اپنی ضرورت کے موافق بنا لیتی ہے۔

ہندوستان میں بھی یہی ہوا۔ سنسکرت آپ جانتے ہیں کہ ہندوستان کی بولی کبھی نہ تھی مقدس اشلوکوں کی خاص علمی زبان تھی۔ عوام سے اس کا کبھی تعلق نہیں تھا۔ شمالی ہندوستان میں عوام اس وقت ایک ملی جلی سی زبان بولا کرتے تھے جس کے پاس کوئی رسم الخط نہ تھا۔ مقدس نوشتوں کے لئے جو سنسکرت میں تھے ایک رسم الخط رائج تھا اس کی اصلاح شدہ شکل موجودہ دیوناگری۔ اور سادہ شکل بہار میں کیتھی رسم الخط ہے۔ جب پالی نے رواج پایا۔ پالی رسم الخط بھی ساتھ آیا جیسے سنسکرت کا رسم الخط قدیم سامری رسم الخط سے ماخوذ تھا۔ اسی طرح پالی کا رسم الخط ہندوستان کے بعض قدیم رسوم الخط کے اقتران سے پیدا کیا گیا۔ جب پالی رخصت ہوئی برج بھاشا نے اپنا بستر بچھایا۔ پالی رسم الخط سے کام نہ چل سکا۔ رسم الخط بھی ساتھ ساتھ رخصت ہو گیا قدیم رسم الخط کی شکلیں درست کی گئیں۔ اصلاح و ترمیم ہوئی دیوناگری کے نام سے ایک رسم الخط بنا یہ بولی جب تک بولی جاتی رہی رسم الخط اس کے لئے کام آتا رہا شیخ محمد جائسی اور عبدالجلیل بلگرامی کے دور تک چلے آئیے آپ دیکھیں گے کہ فارسی رسم الخط کے متعارف اور دفتری رسم الخط ہونے کے باوجود بھاشا کا سرمایہ ادب سب کا سب ناگری میں لکھا جاتا رہا۔

اردو یا کھڑی بولی جب دکن سے نکل کر شمالی ہندوستان میں پھیلی تو اس کے لکھنے کے لئے رسم الخط کا مسئلہ سامنے آیا۔ اور ٹھیک وہی سوال پیدا ہوا جو برج بھاشا کے ابتدائی دور میں پیدا ہوا تھا۔ پالی رسم الخط جیسے برج کے لئے کارآمد ثابت نہ ہو سکا۔ اُردو کے لئے بھی بھاشا کے رسم الخط سے کام چلتا نظر نہ آیا۔ گرد و پیش نظر کی گئی تو سب سے زیادہ آسان اور متعارف رسم الخط فارسی کا نظر

آیا۔ ٹ۔ ڈ۔ ڑ وغیرہ بڑھا کر اپنا بنا یا اور کام لیا اور جیسے بھاشا کے شاعروں تلسی داس اور سورداس نے اپنے دواوین کو فارسی رسم الخط میں لکھنے کی کوشش نہ کی اسی طرح لعل چند رنگین اورنگ آبادی اور دیا شنکر نسیم لکھنوی نے اپنے کلام کا مجموعہ ناگری میں نہ لکھا اگر خدانخواستہ ایسا کرتے تو ان کے پڑھنے کیلئے کچھ دنوں کے بعد شاید کسی ماہر فن خطوط کی ضرورت ہوتی۔ اور جس زبان کے وہ شاعر تھے اس زبان کے لکھے پڑھے آدمی کے بس کی بات نہ رہتی۔

اُردو رسم الخط اگرچہ فارسی رسم الخط سے لے کر بنایا گیا ہے لیکن اسے بعینہٖ فارسی کا رسم الخط نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ اگر نسبت اصل کی طرف ہی منظور ہے تو ہندی رسم الخط کو سنسکرت بلکہ وہ قدیم سامری رسم الخط کہا کیجئے کیونکہ تاریخ کا وسیع علم رکھنے والے جانتے ہیں کہ ناگری میں اپنا اس سے زیادہ نہیں جتنا اردو رسم الخط میں اپنا اردو کا حصہ ہے۔

جب اردو کے لئے فارسی رسم الخط میں تغیر و تبدل کیا جا رہا تھا تو اس وقت کے لوگوں نے بھی ان ہی خیالات کے ماتحت جو تجدد پسند مصلحین کے سامنے ہیں اس کام کو شروع کیا تھا۔ اور فارسی رسم میں ضروری تغیرات کے بعد اس کی صلاحیت پیدا کر دی کہ ہماری زبان کے تمام مروجہ الفاظ اور ان دوسری زبانوں کے الفاظ کو جن سے ہمیں اپنے فرہنگ کی تکمیل کے لئے الفاظ لینے پڑتے ہیں نہایت آسانی کے ساتھ ادا کر سکیں۔ ہمیں اس وقت دیکھنا یہ ہے کہ پچھلی صدیوں کے ہندوستانیوں کی یہ تجویز کس قدر کامیاب رہی اگر واقعاً وہ کامیاب رہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنی نادانی اور کج فہمی سے یہ صدیوں کا سرمایہ اور ہندوؤں اور مسلمانوں اور کسی تک انگریزوں کا بھی یہ قرنوں کا نتیجۂ عمل برباد کر دیں اگر ہم نے اپنی نادانی سے کوئی انقلاب خط میں کر دیا تو اب تک کا سارا کارنامہ آئندہ نسلوں کے لئے سرمایہ ادب نہیں بلکہ آثار قدیمہ کا مخزن نشانات ہو جائے گا۔ اور کتابیں کتب خانوں سے نکل کر عجائب خانوں میں جگہ پائیں گی۔ آئندہ صفحات سے آپ انشاء اللہ بہ آسانی سمجھ سکیں گے کہ یہ لوگ اس تجویز میں ناکام نہیں رہے اور جو زبان ہندوستان کے طول و عرض میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اس کے لئے موجودہ اردو رسم الخط سے زیادہ آسان مفید اور کارآمد کوئی دوسرا اردو رسم الخط نہیں ہو سکتا۔

ہاں اگر مردہ زبان سنسکرت یا مردہ بھاشا کو ہندوستان میں زندہ کر کے تاریخ کا سب سے پہلا تجربہ کرنا ہے اور آہستہ آہستہ ہندوستان کی روزمرہ کی زبان سنسکرت زبان کو بنانا چاہتے ہیں جو کبھی کسی زمانے میں روزمرہ کی زبان نہ تھی تو یہ ایک الگ مسئلہ ہے جس پر کسی اور فرصت میں عرض کیا جا سکے گا۔ لیکن اگر اسی زبان کو زندہ رکھنا ہے جسے ہم آپ سب بولتے ہیں اور جسے گاندھی جی "ہندی ہندوستانی" کے مہمل مرکب سے یاد فرماتے ہیں تو آپ یقین فرمائیں کہ اس کے لئے ناگری یا لاطینی رسم الخط کامیاب نہیں ہو سکتا۔ क پر نقطہ لگا کر क़ اور ज پر نقطہ لگا کر ज़ تو بنا لیا جا سکتا ہے مگر غ کی آواز اور ن۔ ہ۔ ل۔ و کی مرکب آوازوں کے لئے کیا سبیل نکالی جائے گی۔

فرض کیجئے کہ ان آوازوں کے لئے کچھ نقوش وضع کر لئے گئے بھی تو کسی رسم الخط میں جو آسانیاں مدنظر رکھی جاتی ہیں وہ صرف نقوش اور آواز کی مطابقت ہی تو نہیں ہوتی بلکہ رسم الخط میں اور کئی چیزیں غور طلب ہوتی ہیں اور ایک رسم الخط پر کئی حیثیتوں سے غور کیا جاتا ہے۔

تعلیم کی آسانیوں کے اعتبار سے۔

طباعت کی سہولت کے اعتبار سے۔

جگہ، محنت اور وقت کے اعتبار سے۔

ضرورت ہے کہ ہم اُردو اور ناگری دونوں رسم الخط پر ان تمام حیثیات سے غور کریں پھر دیکھیں کہ کونسا رسم الخط ہماری زبان اور ہمارے ملک کے لئے مفید، آسان اور کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ ورنہ ضد اور بال ہٹ میں پڑ کر ہم اپنے ملک کو نقصان پہنچانے کے سوا کیا پائیں گے۔ آج ہندی کے رسالوں کی جو روش ہے وہ اگر ایک اور نسل تک جاری رہی تو یقین فرمائیں کہ انگریزی زبان اور خط کو ہندوستان میں ضروری بنانے میں ان کا سب سے بڑا حصہ ہوگا۔ اور دو صوبوں میں نہیں بلکہ ایک ہی شہر کے دو آدمیوں میں خط و کتابت کے لئے انگریزی کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہے گا۔ کیونکہ وہ زبان جو ان رسالوں کے ذریعہ پیدا کی جا رہی ہے وہ ہندوستان کی عمومی زبان انشاء اللہ کبھی نہ ہو سکے گی۔ اور اردو سے دشمنی جو ہیلن کے حصیلوں نے پیدا کی ہے وہ رسم الخط کو عوام سے چھڑانے میں اگر کامیاب ہو گئی تو بتائیے کہ ایک ہی شہر کے دو آدمی انگریزی کے سوا کس خط و زبان میں مراسلت کریں گے۔

دنیا میں اگر زندہ رہنا ہے اور زندوں کی طرح اپنی زبان و قلم سے کچھ کام لینا ہے تو ٹھنڈے دل سے بغیر ضد اور غصہ کے جذبات کی آمیزش کے سوچئے اور غور فرمائیے ہٹ اور تنگ ظرفی سے تعصب اور کینہ سے بلند و بالا رہ کر سوچئے کہ اس قسم کی تحریکیں اور کوششیں بال ہٹ اور نقصان دہ ضد سے زیادہ کوئی حیثیت رکھتی ہیں؟

اُردو اور ناگری دونوں خطوں پر مختلف حیثیتوں سے غور فرمائیے۔ تفصیل بڑی فرصت اور وسعت چاہتی ہے اس لئے صرف بعض حیثیتوں

سے اور وہ بھی بہت غیر تفصیلی طور پر اس صحبت میں کچھ عرض کرتا ہوں ملاحظہ فرمائیے۔ ان میں بہت ہی تھوڑے سے نمونے پیش کئے گئے ہیں اس سے زیادہ کے لئے نہ تو مجھے فرصت تھی اور نہ گنجائش۔

آواز و حروف: سب سے پہلے تو ان آوازوں کی مطابقت کیجئے۔ روایتی رسم الخط کا تو کوئی سوال نہیں کہ وہ ہماری زبان کے لئے بالکل ناکافی ہے۔ ناگری رسم الخط کو لیجئے یہ رسم الخط باوجود ترمیم و اضافہ کے ہماری زبان کی تمام آوازوں کو ادا نہیں کر سکتا۔ بلاشبہ تلسی داس جی کی زبان اور عبدالرحیم خان خاناں کی سنسکرتی آوازیں کسی حد تک وہ ادا کر سکتا ہے مگر سوچئے تو آج ہندوستان کی وہی زبان ہے جو اس وقت تھی آج اس باغ میں کنٹکی اور کرم ا کے پھولوں کے ساتھ ساتھ گلاب اور یاسمین بلکہ کہیں کہیں ولایتی کروٹن بھی موجود ہے انہیں نکال کر الگ پھینک دینے کا خیال نادانی ہے۔ دنیا کی تمام زبانوں میں ضرورت اور حالات کے مطابق دوسری زبانوں کے الفاظ ملتے رہتے ہیں کوئی زبان انہیں یک دم نکال نہیں سکتی ترکی میں جس کے بارے میں عربی اور فارسی کے الفاظ نکال دینے کی بڑی کوشش کی گئی ہزاروں اس کے اپنے ہو کر رہ گئے کوئی ترکی اخبار پڑھ کر دیکھ لیجئے سینکڑوں الفاظ دوسری زبانوں کے ملیں گے عربی جس پر دوسری زبانوں کا اثر نسبتاً کم پڑا ہے فارسی اور دوسری زبانوں کے بیسیوں الفاظ اپنے ذخیرہ لغات میں رکھتی ہے۔

غرض کہ اردو سے بھی وہ اجنبی الفاظ جو اب جنبی نہیں رہے بلکہ اس کے اپنے ہو چکے ہیں نکالے نہیں جا سکتے تو ضرورت ہے ایسے رسم الخط کی جو ان تمام آوازوں کو جو اندرونی اور بیرونی الفاظ کے اس مجموعہ کے لئے ملک میں رائج ہیں آسانی سے ادا کر سکے اس ضرورت کے لئے ناگری رسم الخط کافی نہیں ہے۔

ناگری میں ۳۷ حروف صحیح و نجن ۱۲ حروف علت سُور اور ۱۲ ماترائیں یعنی اعراب ہوتے ہیں یہ کل ۶۱ نقوش ہوئے۔ ان پر ۵ ان حروف کا اضافہ کیجئے جو خ۔ ز۔ غ۔ ف۔ ق کی آوازوں کے لئے نقطے لگا کر بنائے گئے ہیں کل (۶۶) حروف تہجی ہوئے۔ اس اتنے بڑے مجموعہ میں ل۔ ہ اور ن۔ ہ کی مرکب آواز کے لئے کونسی ترکیب ہے مثلاً لفظ ننھا اور لفظ کولھو میں ل کے ساتھ ہ کی اور ن کے ساتھ ہ کی مرکب آواز پیدا ہوتی ہے ناگری میں باوجود اس قدر کثیر حروف تہجی کے اس کے لئے کوئی سامان نہیں ہے۔ آج کل جس طرح لکھتے ہیں وہ چترویدی دوارکا پرشاد شرما کی ڈکشنری ہندی شبدارتھ پاریجات سے نقل کرتا ہوں کولھو कोल्हू اور ننھا नन्हा لیکن ان سے جو آواز پیدا ہونا چاہئے وہ کول ہُو اور نن ھا ہے مرکب آواز نہیں ہو سکتی کیونکہ اس لغت میں हिन्दी ہندی اور تلپ तल्प بمعنی بستر کے لئے وہی ٹکڑے استعمال کئے گئے ہیں۔ اصل میں ناگری حروف کے ٹکڑے صرف ان حروف کے ساکن ہونے کو بتاتے ہیں مرکب آوازوں کے لئے الگ الگ حروف ہوتے ہیں جیسے کھ ख گھ घ وغیرہ مگر لام اور نون کے اس طرح ہ سے مرکب آواز کے لئے کوئی حرف موجود نہیں ہے۔

اسی طرح دکھاؤ بلاؤ یعنی اردو میں جو آواز ہمزہ اور واو سے ادا کی جاتی ہے اس کے لئے ناگری میں کوئی نقش موجود نہیں ہے۔ ہمزہ اور واو سے جو آواز پیدا ہوتی ہے۔ وہ یقیناً الف اور واو کے مرکب سے مختلف ہے لیکن ناگری رسم الخط میں کوئی سبیل اس کے ادا کرنے کو موجود نہیں یا دکھاؤ یا دکھاو لکھنا پڑیگا

س ص۔ ث کی آوازیں اردو میں اگرچہ مختلف نہیں ہیں مگر ان میں معانی کے اعتبار سے بڑا فرق ہے اگر اس فرق کو ختم کرکے ناگری حرف स سے کام لیا گیا تو ہم اثیر اور اسیر کے باہمی فرق معانی سے محروم ہو جائیں گے۔ اردو رسم الخط میں ض۔ ث۔ ص وغیرہ کے موجود ہونے کی وجہ سے ہمارے لئے ابتداء سے ابتک بڑی آسانیاں رہی ہیں اور ہمارے فرہنگ میں بہت سے الفاظ دوسری زبانوں سے اس آسانی کے ساتھ منتقل ہو گئے کہ آج ہزار ہا وہ جو فارسی اور عربی سے بالکل ناواقف ہو وہ بھی ان الفاظ کی وجہ سے اپنے خیالات خوبصورت سلیس اور سلجھی ہوئی عبارت میں ادا کرنے پر قادر ہے۔ بظاہر اگرچہ یہ ہم آواز حروف غیر ضروری معلوم ہوتے ہیں مگر معانی کی وسعت اور الفاظ کی فراوانی کا جو صلہ ہمیں ان کی وجہ سے ملتا ہے وہ رسم الخط میں ان حروف کے بوجھ کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے۔

یہ اردو زبان میں الوکھا عیب نہیں ہے بلکہ دنیا کی اکثر و بیشتر زبانوں میں یہ چیز پائی جاتی ہے ہمارے ایک فاضل انشاپرداز نے ابھی کچھ دن ہوئے لکھا تھا کہ وہ اب تک بعض الفاظ کی املا صحیح نہیں لکھ سکتے اور ص کی جگہ س لکھتے ہیں۔ شاید ان کو یاد نہیں رہا کہ دنیا کی تقریباً تمام زبانوں میں الفاظ کے لئے مخصوص املا ہوا کرتی ہے۔ انگریزی میں تو یہ بہت زیادہ ہے کہیں TURE CHAR کی آواز دیتا ہے اور کہیں CH - KH کی۔ ناگری میں بھی یہ بات اردو سے کچھ زیادہ پائی جاتی ہے श - ष - स - न وغیرہ حروف ایک دوسرے کی جگہ نہیں استعمال کئے جا سکتے اور جیسے صندوق کی بجائے صندق اردو میں غلط سمجھا جاتا ہے۔ ناگری میں بھی कृष्ण کی بجائے करिशन غلط سمجھا جائے گا۔ اور انگریزی میں بھی STATION کی بجائے STESHAN

غلط سمجھا جائے گا۔ یہ کسی زبان کا عیب نہیں ہے بلکہ اس کی خوبی ہے۔ ان آوازوں کے علاوہ اور بھی بہت سی آوازیں ہیں جو ادا نہیں ہوسکتی ہیں مگر ان کی فہرست طویل اور شاید پڑھنے والوں کے لئے بار ہوجائے گی۔ اس لئے میں نے انہیں چھوڑ دیا ہے غور کرنے سے ہر اس شخص کو معلوم ہوسکتی ہیں جو دونوں رسم الخط سے واقف ہے۔

تعلیم:۔ ہمارے سامنے دوسرا مسئلہ تعلیم کا مسئلہ ہے۔ ناگری رسم الخط پر اس حیثیت سے بھی غور کرنے کی ضرورت ہے میں نے اپنے بعض احباب سے جو ناگری رسم الخط سے ناواقف ہیں بارہا یہ سنا ہے کہ ناگری دو دن میں سیکھی جا سکتی ہے۔ لیکن ان کا یہ ذِمانا بطور واقعہ نہیں بلکہ محض لطیفہ کی طرح ہوتا ہے۔ ان میں سے بعض نے دس بیس دن تک محنت کی لیکن لکھنے پڑھنے پر قادر نہ ہوسکے۔ اس وقت انہیں معلوم ہوا کہ وہ جو سمجھ رہے تھے وہ ناواقفیت اور غلط فہمی تھی ابھی کچھ دلوں کی بات ہے کہ میرے ایک دوست کے ساتھ یہی قصہ ہوا اور ان کو تقریباً تین ماہ تک محنت کرنے کے بعد یہ اقرار کرنا پڑا کہ ناگری خط کے سیکھنے کے بارے میں وہ غلط فہمی میں مبتلا تھے۔

اصل بات یہ ہے کہ اردو رسم الخط جب ہم نے سیکھا تھا ہم بچے تھے اور ظاہر ہے کہ اس وقت فطرتی اور سمجھنے کی صلاحیت بہ نسبت عمر کے بہت کم تھی اب جوان ہونے کے بعد دو چار حروف ناگری کے جب ہم جلدی سے سیکھتے ہیں اور ہم لکھنے کے قابل ہوجاتے ہیں تو اس مدت کا مقابلہ بچپن کی مدت تعلیم سے کرتے ہیں اور فیصلہ صادر فرماتے ہیں کہ اردو رسم الخط سیکھنے میں زیادہ دقت اور محنت صرف ہوتی ہے۔ حالانکہ اس وقت جب کہ ہم نے اردو سیکھا تھا نہ تو آج اتنی ہمیں سمجھ تھی اور نہ اتنا دھیان سیکھنے پر دیتے تھے۔

ابھی کچھ دنوں کی بات ہے کہ ایک صاحب نے اردو کے لئے لاطینی رسم الخط تجویز کرتے ہوئے بڑا سخت اعتراض اردو رسم الخط پر کیا تھا کہ وہ اب تک کبھی کبھی س کی جگہ ص لکھ دیا کرتے ہیں۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ یہ اعتراض اردو رسم الخط پر عائد ہوتا ہے یا ان کے علم و فضل پر۔ ان حضرت کو یاد نہ رہا کہ ابتدا تعلیم میں انہوں نے انگریزی الفاظ کی املا کتنی بار غلط لکھی تھی اور آج تک کتنی بار ڈکشنری کی مدد لئے بغیر ان کو صحیح املا لکھنا نصیب ہوتا ہے۔ افسوس کہ شاید وہ بیچارے ناگری سے حرف شناس نہیں ورنہ انہیں معلوم ہوتا کہ ناگری میں اردو سے بھی زیادہ پابندی کے ساتھ श - ष - ण - स کا فرق قائم رکھنا پڑتا ہے۔ اور جب تک صحیح املا معلوم نہ ہو کوئی شخص ایک سطر صحیح عبارت نہیں لکھ سکتا۔ اور لکھنا تو الگ رہا اگر صحیح املا معلوم نہ ہو تو ایک سطر پڑھ بھی نہیں سکتا۔ اگر خدانخواستہ اس میں مبالغہ معلوم ہو تو ناگری حروف تہجی، ۳۴ حروف علت ۱۲ ماترا ۱۲ اور پانچ خ غ وغیرہ والے منقوط حروف کل ۶۴ نقوش جو ناگری کے پورے حروف ہجا ہیں کسی سے ایک بڑے تختہ کاغذ پر لکھوا لیجئے پھر ان کی مدد سے کسی ہندی رسالہ کی صرف سرخیاں ہی پڑھنے کی کوشش فرمائیے۔ معلوم ہوجائے گا کہ حروف ترکیب کے وقت اتنی طرح طرح کی شکلیں بدلتے ہیں کہ سینکڑوں جگہ ان کی اصلی شکلوں کا کوئی نشان باقی نہیں رہتا۔ اردو میں قاعدہ ہے کہ کوئی حرف جب کسی دوسرے حرف سے ملتا ہے تو ملنے والے حرف کا ابتدائی حصہ آخری کشش کو نکال کر قائم رکھا جاتا ہے جو پڑھنے والے کو اپنی اصلی شکل یاد دلاتا ہے۔ مثلاً جم میں ج کا اور اس کا ابتدائی اور میم کا ل موجود ہے۔ لیکن ناگری میں یہ ضروری نہیں ہے ज رجب مرزا मिर्जा میں لکھا جائے اپنی اصلی شکل اس طرح بدل دے گا کہ لفظ کے آخری حصہ پر اوپر کو ایک قوس نما نشان بن جائے گا۔ ملاحظہ فرمائیے کہ حرف ज سے ॅ اس نشان کو کیا نسبت ہے اور جب کوئی شخص صحیح املا نہ جانے کیسے پڑھ سکتا ہے۔

اردو میں انجمن حمایت اسلام لاہور کا قاعدہ۔ خواجہ حسن نظامی دہلوی کا قاعدہ اور ہندی میں ہندی پہلی پستک رام نرائن لال الہ آباد۔ ہندی پرائمر اور ہندی اردو بالا مصنفہ فاضل پنڈت ہری ہر شاستری پروفیسر انچارج جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن اس وقت میرے سامنے ہے۔ تعلیمی نقطۂ نظر سے غور کرنے پر جو نتائج ناگری اور اردو رسم الخط کے متعلق نکلتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں میں کوئی ماہر فن تعلیم نہیں ہوں اور نہ مجھے بچوں کی تعلیم کا کوئی علمی تجربہ ہے مگر ظاہری نظر سے جو معلوم ہوسکا ہے وہ پیش ہے۔ آپ خود غور فرما کر فیصلہ کرسکتے ہیں کہ دونوں رسم الخط میں سے کونسا رسم الخط آسانی سے سیکھا سکھایا جا سکتا ہے۔

اردو رسم الخط کے سکھانے کا یہ طریقہ عام طور سے مقبول ہے کہ سب سے پہلے اردو کے ۴۳ حروف تہجی کی شکلیں ذہن نشین کرائی جاتی ہیں۔ یہ شکلیں بہت ہی آسان اور سادی ہندی خطوط سے بنی ہوئی ہیں کسی تختی یا کاغذ کے چار رخ ہوسکتے ہیں۔ (۱) | (۲) — (۳) / (۴) \ اور نقطے کی تین شکلیں ◦ ◦ ◡ ہوتی ہیں۔ اردو کے سارے حروف تہجی ان ہی چار قسم کی لکیروں اور نقطوں سے مرکب ہیں۔ اس لئے بڑی آسانی سے ذہن نشین ہوجاتے ہیں۔ میں نے بعض ننھے بچوں کو بھی جو ذرا ذہین تھے دو ایک گھنٹوں میں یاد کرتے دیکھا ہے اسکے بعد ان تو حروف کو چھوڑ کر جو

کبھی کسی دوسرے حرف سے نہیں ملتے بلکہ دوسرے حروف ان سے ملتے ہیں بقیہ ۲۵ حروف کو ۴ گروپ میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اور ہر گروپ میں سے دو ایک حرف کو تمام حروف سے ملا کر کھروں کی شکلیں ذہن نشین کرا دی جاتی ہیں ان ۳۴ حروف میں سے ۲۴ حروف تو وہ ہیں جن کی شکلیں الگ نہیں ہوتی ہیں بلکہ صرف نقطوں کے فرق سے بنتی ہیں۔ اس یکسانگی کی وجہ سے شکلوں کے یاد رکھنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے اس کے بعد دو حرفی سہ حرفی چہار حرفی الفاظ اور جملے پڑھا کر مشق کرا دی جاتی ہے اور چھوٹی تقطیع کے ۲۰ صفحات کا ایک قاعدہ ختم کر لینے کے بعد جو ایک جوان آدمی کے لئے دو تین اور بچے کے لئے دس بیس دن کی محنت چاہتا ہے۔ ایک طالب علم اردو کی تمام صاف لکھی ہوئی عبارتیں پڑھنے لگتا ہے اب اس کے آگے مشق اور روانی کا درجہ ہے جو عادت اور کام پر منحصر ہے۔

دوسری طرف ناگری رسم الخط کو لیجئے۔ سب سے پہلے ۱۶ حروف علت سکھائے جاتے ہیں جن کی شکلیں نہایت غیر مناسب اور الجھی ہوئی ہیں بچہ تو بچہ کسی جوان آدمی کو بھی جلدی یاد نہیں ہو سکتی ہیں شاید آپ اسے مبالغہ سمجھیں اس لئے یہ حرف لکھے جاتے ہیں۔

अ आ इ ई उ ऊ ऋ ॠ ऌ ॡ
ए ऐ ओ औ अं अः

یہ ہیں ناگری حروف میں سولہ یعنی حروف علت ان شکلوں کو یاد رکھنا ایک بچے کے لئے ا ب ج د کی نسبت کس قدر مشکل ہے۔ اس کے لئے خود ان شکلوں سے قوی کوئی دلیل نہیں ہو سکتی۔

اس کے بعد حروف صحیح یاد کرائے جاتے ہیں جو ۳۴ اور ۵ منقوطہ جدید حروف کل ۳۹ ہیں یہ حروف ایک دوسرے سے اسقدر مختلف شکل و صورت کے ہیں کہ یادداشت کے لئے ان کی گروپ وار تقسیم ممکن نہیں ان کی شکلیں بھی حروف علت کی شکلوں کی طرح الجھی ہوئی ہیں نمونہ کے لئے دو تین حروف لکھے جاتے ہیں۔

چھ क्ष کش त्र گیان ज्ञ

اس کے بعد ۱۶ ماترائیں یعنی اعراب بتائے جاتے ہیں پھر ان کے حروف کے ساتھ استعمال کرنے کے طریقے بتائے جاتے ہیں لیکن چونکہ یہ اعراب تمام حروف صحیح کے ساتھ ایک ہی طرح نہیں لگائے جاتے بلکہ بعض کے ساتھ لگانے کے خاص طریقے ہیں اس لئے ان کو ہر ہر حرف کے ساتھ لگا کر مشق کرایا جاتا ہے۔ مثلاً धूप دھوپ میں پیش کا نشان حرف ध کے نیچے لگایا گیا ہے۔ مگر रूप روپ میں یہی نشان حرف र کے وسط میں ایک چھوٹی لکیر کے ذریعہ جوڑ گیا ہے۔ اس کے بعد حروف کے ٹکڑے اور ان کے ایک دوسرے سے ملنے کا مرحلہ آتا ہے ایسے حروف کو ہندی میں سنجگت اکھچر کہتے ہیں یہ مرحلہ طالب علم کے لئے بہت ہی مشکل اور نہایت ہی پریشان کن ہے اور سنجگت اکھچر کا وجود ناگری رسم الخط کے عیوب میں سب سے بڑا عیب ہے اکثر اساتذہ نے صرف اس کے لئے سو سو صفحات کی الگ مستقل ریڈریں لکھی ہیں اور کم از کم میں نے تو آج تک بیسیوں ریڈریں ہندی کی دیکھیں مگر کسی میں یہ نہ پایا کہ پہلی ریڈر میں اسے بتا دیا گیا ہو۔ سب سے اچھی شکل ان ٹکڑوں کے مشق کرانے کی فاضل پروفیسر ہری ہر شاستری عثمانیہ یونیورسٹی نے اختیار کی ہے مگر ظاہر ہے کہ رسم الخط کی بنیادی خرابی کو رفع کر دینا پروفیسر موصوف کے بس کی بات نہ تھی اس لئے پروفیسر صاحب کو بھی اس کے لئے اپنی کتاب کا پورا دوسرا حصہ وقف کر دینا پڑا۔ اس میں فاضل مصنف نے تقریباً پونے دو سو شکلیں مختلف حروف کے ان ٹکڑوں کی بتائی ہیں جو ان کے کسی دوسرے حرف سے ملنے یا کسی دوسرے حرف کے ان سے ملنے سے پیدا ہوتی ہیں میں بھی فاضل پروفیسر کے اس بیان کی تصدیق کرتا ہوں کہ ہندی کی پوری لیاقت صرف اسی وقت ہو سکتی ہے جب انسان حروف صحیح کے ملاپ سے اچھی طرح واقف ہو جائے۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ جب تک یہ تمام شکلیں اچھی طرح یاد ہوں نہ ایک سطر عبارت لکھ سکتا ہے اور نہ پڑھ سکتا ہے۔

نظر ثانی کرنے میں غالباً فاضل پروفیسر کو بھی اقرار کرنا پڑے گا کہ بعض شکلیں سنجگت حروف کی اتنی لمبی فہرست میں بھی درج ہونے سے رہ گئی ہیں مثلاً ابتدا بہ سکون اور ساکنین کی جو شکلیں سنجگت حروف میں ہوتی ہیں وہ اس میں درج نہیں ہو سکی ہیں مثلاً धृष्ट دہرشٹ धपट وغیرہ

اس کے بعد نون کی آواز اور غنہ کی آواز مشق کرائی جاتی ہے کیونکہ ناگری میں یہ دونوں آوازیں کس جگہ کس طرح سے ادا کی جاتی ہیں اور اس کے بہت مخصوص قسم کے قاعدے مقرر ہیں اگرچہ وہ قاعدے بھی کلیات نہیں ہیں ان آوازوں کے لئے جو مخصوص طریقہ کسی لفظ کے لئے مقرر ہے دوسرے لفظ میں اسے غلط سمجھا جائے گا مثلاً चांद چاند पतङ्ग پتنگ हिन्दी ہندی डण्डा ڈنڈا व्यञ्जन ویجن وغیرہ وغیرہ ان سب مرحلوں کے بعد بھی اردو کے ص۔ س۔ ض۔ ظ کی طرح ष श स न ड وغیرہ کے استعمال کا فرق باقی ہی رہ جاتا ہے جو الفاظ کے صحیح معنی کی یاد اور صحیح املا کی مشق پر منحصر ہے۔

میں نہیں سمجھتا کہ مجھے کوئی رائے پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ ہر شخص بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ اردو اور دیوناگری رسم الخط میں سے کونسا رسم الخط ہماری تعلیمی ضرورت کیلئے مفید اور سہل ہے۔ میں جس زمانہ میں پاٹ شالہ میں پڑھتا تھا میں نے دیکھا ہے کہ ابتدائی عمر کا بڑا حصہ صرف کرنے کے باوجود طلبا آسانی سے لکھنے پڑھنے پر قادر نہ تھے اور خود گرو جی بھی غالباً اپنی یہ کمزوری چھپانے کے لئے ہر عبارت کو لحن سے گا گا کر پڑھا کرتے تھے۔

طباعت:۔ دوسرا اہم سوال طباعت کی آسانیوں کا ہے جدید دنیا میں مطابع کی اہمیت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے اور آج ہر ملک اپنے مطابع کو قوی سے قوی تر بنانے پر تلا ہوا ہے۔ ہندوستان میں جب پہلے پہل مطابع کا رواج ہوا تو ہماری ساری کوششیں متداول درسی کتابوں تک محدود تھیں۔ مانوس اور متعارف خط نستعلیق خط تھا اس خط میں لیتھو کی طباعت نے رواج پکڑا۔ حتیٰ کہ عربی کتابیں بھی خط نسخ کی بجائے نستعلیق میں چھپنے لگیں اور ہم نے اس پر اتنا زور دیا کہ پچھلی صدی کے نصف آخر میں جبکہ مصر کا مشہور مطبع امیری بولاق ٹائپ میں عربی کتابیں چھاپ رہا تھا ہم نسخ اور نستعلیق دونوں خطوں میں لیتھو سے کتابیں چھاپا کرتے رہے۔ اور اردو تو اردو عربی کے لئے بھی ہندوستان میں ابتک لیتھو گرافی رائج ہے اور ٹائپ کا کام بہت تھوڑا ہوا کرتا ہے۔

لیتھو گرافی کو بعض وجوہ کی بنا پر ترجیح دی جا سکتی ہے لیکن بحیثیت مجموعی یہ ٹائپ کی بہ نسبت دقت طلب ہے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ اردو کو ٹائپ کی طباعت اختیار کر لینا چاہیئے۔ لیتھو گرافی کو فائن آرٹ پرنٹنگس تک محدود رکھا جائے تو حرج نہیں مگر عام مطبوعات کے لئے رائج رکھنا نقصان دہ ثابت ہوگا۔

نسخ و نستعلیق کا قصہ ایک ہی رسم الخط کے مختلف نمونوں کا قصہ ہے۔ ہمیں اس جگہ دیکھنا صرف یہ ہے کہ دیوناگری اور اردو رسم الخط میں سے کس کی طباعت زیادہ آسان ہے۔ اس مسئلہ پر غور کرتے ہوئے ہمارے سامنے کئی سوال آتے ہیں جن میں سب سے زیادہ ٹائپ رائٹر مشین کی کامیابی اور ٹائپ کے مطبعی حروف کی کامیابی کا مسئلہ ہے ناگری حروف میں چونکہ ماترائیں یعنی اعراب حروف کے اوپر نیچے اور بغل میں تینوں جگہ لگائے جاتے ہیں اور ٹائپ رائٹر مشین میں اوپر نیچے نشان لگانے کی کوئی ترکیب نہیں ہو سکتی اس لئے ٹائپ رائٹر مشین ناگری رسم الخط کے لئے کامیاب نہیں ہو سکی۔ اس کیلئے بڑی کوششیں کی گئیں مگر جو مشین بن کر تیار ہوئی وہ ایسی ہے کہ خط ٹائپ کرنے کے بعد ماترائیں قلم سے لگانا پڑتی ہیں۔ میرے پاس متعدد دوستوں کے خطوط کبھی کبھی ہندی ٹائپ رائٹر سے ٹائپ کئے ہوئے آتے ہیں ان سب کا یہی حال ہے کئی سال ہوئے کہ ایک مرتبہ میں نے ٹائپ رائٹر خریدنے کا ارادہ کیا اس سے پہلے ہندی ٹائپ رائٹر کے دیکھنے بلکہ کچھ ٹائپ کرنے کا اتفاق مجھے بارہا ہو چکا تھا میں نے سوچا کہ ایسے ٹائپ رائٹر سے زیادہ آسان قلم سے ہی لکھ لینا ہے۔ پھر بھی میں نے متعدد اداروں سے خط و کتابت کی کہ شاید کوئی صورت اصلاح کی نکل آئی ہو مگر مجھے جو جوابات ملے وہ حد درجہ مایوس کن تھے معلوم ہوا کہ اس میں کامیابی کی کوئی امید نہیں کیونکہ اس کی راہ میں ماتراؤں سے بھی بڑی رکاوٹ سنجگت حروف کی ہے چونکہ یہ ٹکڑے حروف سے اوپر نیچے بیچ میں اور بغل میں طرح طرح سے ملتے ہیں اس لئے ضرورت ہے کہ اتنے تمام ٹکڑے ٹائپ رائٹر میں لگائے جائیں اور ظاہر ہے کہ اس قدر کثیر التعداد ٹکڑوں کی گنجائش ٹائپ رائٹر مشین میں نہیں ہو سکتی اس لئے کار آمد اور صحیح ٹائپ رائٹر مشین ناگری رسم الخط کی نہیں بن سکتی۔ اس وقت جو ناکام مشین موجود ہے وہ صرف بڑے بڑے اداروں میں صرف ایک مشین بطور دلچسپی موجود ہے نہ تو اس سے کام لیا جاتا ہے اور نہ کام دے سکتی ہے۔

اردو کی ٹائپ رائٹر مشین ہر جگہ صحیح کام دے رہی ہے اس کے متعلق کسی بیان کی ضرورت نہیں ہر شخص جانتا ہے کہ بڑے بڑے دفتری اور نجی کام بے تکلف لئے جاتے ہیں۔

ٹائپ کے مطبعی حروف کی کامیابی کا دارومدار ان کے ٹکڑوں کی کمی تعداد کمپوز کی آسانی اور کاغذ کی کفایت پر ہے۔ اردو حروف ناگری سے بہت ہی کم جگہ لیتے ہیں ان کی باہمی نسبت تقریباً ۶۳ اور ۱۵۰ کی پڑتی ہے یعنی ایک عبارت جو اردو حروف میں ۶۳ سطروں میں آ سکتی ہے وہ ناگری حروف میں ۱۵۰ سطروں میں آتی ہے۔ کمپوز کی آسانی کے لئے ٹکڑوں کا کم سے کم ہونا ضروری ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ تمام ٹکڑے یکساں ایک طرح کے ہوں ایک دوسرے کے نیچے اوپر لگائے جانے والے نہ ہوں ورنہ کمپوزیٹر کی دقتیں بڑھ جانے کے علاوہ غلطیوں کا احتمال بھی بڑھ جاتا ہے اور پروف ریڈر کی محنت بھی بڑھ جاتی ہے وقت زیادہ صرف ہوتا ہے

اور کام کی رفتار سست ہو کر مطبوعات کی لاگت میں اضافہ ہو جاتا ہے

اردو میں شمول ہمزہ و لا کل ۳۴ حروف تہجی ہوتے ہیں جن میں سے ا۔ د۔ ڈ۔ ذ۔ ر۔ ڑ۔ ز۔ و ـــ لا ۔ ۹ حروف کبھی کسی حرف سے نہیں مل سکتے اس لئے ان کی صرف دو شکلیں ہوتی ہیں۔ (۱) جب وہ مفرد استعمال ہوں (۲) جب ان میں کوئی دوسرا حرف ملے۔ بقیہ ۲۵ حروف کی چار چار شکلیں ہوتی ہیں۔

(۱) جب وہ کسی حرف سے ملیں۔

(۲) جب وہ کسی لفظ کے بیچ میں واقع ہوں۔

(۳) جب وہ کسی لفظ کے آخر میں واقع ہوں۔

(۴) جب وہ مفرد استعمال کئے جائیں۔

یہ سب کل ۱۰۸ ٹکڑے ہوئے کچھ ٹکڑے حسن و خوبصورتی قائم رکھنے کے لئے بنائے جاتے ہیں کچھ مرکب ٹکڑے سہولت کے لئے تیار کر لیتے ہیں۔ غرض ۱۸۰ ٹکڑوں میں پورا ٹائپ ہو جاتا ہے اس وقت تک جدید نیں صورت جو یا ہو سکی ہے وہ ۱۸۰ ٹکڑوں میں ہے اور بہت ہی خوبصورت اور ضرورت کے لحاظ سے مکمل ہے۔ اس میں جوڑوں کی مختلف شکلیں جو جابری اور حسن خط کے لئے ضروری ہیں سب موجود ہیں۔

اب ذرا ناگری ٹائپ کو دیکھئے اس کے مندرجہ ذیل ٹکڑے ہوتے ہیں۔

۳۷ حروف صحیح

۱۵ حروف علت

۱۷ ماترائیں

$\frac{۲۳۰}{۲۹۹}$ سنگت کے ٹکڑے یعنی حروف کی وہ شکلیں جو مختلف جوڑوں میں استعمال کی جاتی ہیں۔

یہ ۲۹۹ ٹکڑے تو حروف کے ضروری ٹکڑے ہوئے۔ مگر چونکہ کمپوزیٹر کی آسانی کے لئے زیادہ استعمال ہونے والے مرکب ٹکڑے بھی ضروری ہیں اس لئے اکھنڈ یعنی مرکب شکلیں جنہیں انگریزی میں لیگیچر کہا جاتا ہے ناگری ٹائپ کے لئے بہت سی رکھی جاتی ہیں اس طرح پورا سٹ تقریباً ۶۰۰ ٹکڑوں پر مشتمل ہوتا ہے۔

پھر ایک دقت ناگری رسم الخط میں یہ بھی ہے کہ اگر ماترائیں حروف کے نیچے یا اوپر لگائی جاتی ہیں اور کمپوزنگ میں یہ صورت ممکن نہیں ہوتی اس لئے بیشتر حروف مع حرکات کے ڈھال لئے جاتے ہیں اگرچہ نرسنگا بھائی ٹائپ فونڈری بمبئی اور گجراتی ٹائپ فاونڈری بمبئی کے رائج ٹائپوں میں اس کا حل نکالا گیا ہے۔ اور تقریباً ہر ٹائپ فونڈری نے اپنے ٹائپوں میں اسے اختیار بھی کر لیا ہے۔ مگر اس سے کمپوزیٹر کی محنت بہت بڑھ جاتی ہے۔ اور وقت کا خون ہوتا ہے۔ وہ حل یہ ہے کہ ایک ٹائپ کو ۳ غیر متساوی ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے مثلاً اگر پریم प्रेम لکھنا ہو تو اس کے حرف प्र میں کئی ٹکڑے جوڑے جائیں گے اور اگر ۱۲ پوائنٹ کے حروف کمپوز کئے جا رہے ہوں تو ۹ پوائنٹ کا ٹکڑا ۱۲ پوائنٹ کا سادہ نیچا ٹکڑا لا کر مرکب حرف اور اس کے اوپر ۹ پوائنٹ کا ٹکڑا حرکت کا اور اس کے بغل میں ۱۲ پوائنٹ کا سادہ نیچا ٹکڑا لگایا جائے گا اس سے کمپوزیٹر کا کام تقریباً پانچ گنا بڑھ جاتا ہے اور رفتار کارگذاری کم و بیش $\frac{۴}{۵}$ کم ہو جاتی ہے۔ ان دقتوں کی وجہ سے عموماً حروف مع حرکات استعمال کئے جاتے ہیں۔ جن کی تعداد سینکڑوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ اگر یہ حروف مرکب صورت میں استعمال نہ کئے جائیں تو جن الفاظ میں تین تین ٹکڑے جوڑے جاتے ہیں عموماً غلط کمپوزنگ ہو جاتی ہے مجھے خود بارہا اس کا تجربہ ہوا ہے اور صرف دو دو صفحوں کے مضامین اصلاح کرتے کرتے پریشان ہو گیا ہوں۔

ان کثیر التعداد ٹکڑوں اور کمپوزنگ کی ان دقتوں کی وجہ سے کمپوزنگ پر لاگت بھی زیادہ آتی ہے اور کارگذاری بھی کم ہوتی ہے۔

سہولت:۔ تیسرا سوال ہماری روزمرہ کی دفتری اور نجی ضروریات کا ہے۔ ناگری رسم الخط پر اس حیثیت سے بھی غور کیا جانا چاہیئے اور دیکھنا چاہیئے کہ اگر ہم ناگری رسم الخط اختیار کریں تو ہماری دقتیں کچھ زیادہ تو نہیں ہو جاتی ہیں۔

جو حرف آسانی سے صحیح لکھا جا سکتا ہو اور تیزی سے صحیح پڑھا جا سکتا ہو وہ کامیاب خط سمجھا جائے گا۔ اردو رسم الخط ایک قسم کی مختصر نویسی ہے ناگری سے بہت جلد لکھا جا سکتا ہے۔ اور ناگری سے دوگنی تیزی کے ساتھ پڑھا جا سکتا ہے۔ لکھنے کا قاعدہ نہایت مکمل طور سے مرتب ہے۔ ہر طرح کی خط و کتابت اور تحریر عبارت میں کم وقت اور کم محنت سے کام لیا جا سکتا ہے۔ بخلاف اس کے ناگری رسم الخط میں خود سنسکرت اور بھاشا کے الفاظ لکھنے کا قاعدہ تک پوری طرح مرتب نہیں ہے اس وقت میرے سامنے ایک بہت فاضل سنسکرت داں کی مطبوعہ کتاب موجود ہے اس میں ایک لفظ پنڈت کو تین طرح سے لکھا گیا ہے (۱) पन्डीत (۲) पंडित (۳) पण्डित

اسی طرح اس کتاب میں لفظ دکن کو کہیں दक्खिन کہیں दक्कन اور کہیں दक्षिण لکھا گیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے کہ املا کا یہ فرق صرف ایک مصنف کی ایک ہی کتاب سے لیا گیا ہے۔ اس رسم الخط کے متعلق کون کہہ سکتا ہے کہ جو کچھ اس نے لکھا ہے وہ صحیح ہے اور جو وہ پڑھتا ہے وہ غلط نہیں ہے۔

آپ یقین فرمائیں کہ فاضل مصنف کے فضل و کمال کا انکار آفتاب کے نور اور شب کی سیاہی کا انکار ہوگا۔ چوٹی کے سنسکرت دانوں میں یہ مصنف بھی ہے۔ سنسکرت میں ایم۔ اے پاس کیا ہے اور جو لکھا ہے بالکل صحیح لکھا ہے مگر اس کو کیا کیجئے کہ اس رسم الخط میں لکھنے اور پڑھنے کا قاعدہ صحیح طور سے مرتب نہیں ہے۔

دوسری دقت جس کی وجہ سے لکھی لو لکھی ناگری میں چھپی ہوئی تحریر بھی تیزی سے صحیح طور پر پڑھی نہیں جا سکتی یہ ہے کہ حروف کے ٹکڑے جہاں پر لکھے جاتے ہیں وہاں پر پڑھے نہیں جا سکتے۔ مثلاً سپردھا स्पर्धा کہ اس میں ترتیب حروف س۔ پ۔ و۔ د۔ ا۔ ر۔ ہے اور ترتیب صوتی س۔ پ۔ ر۔ د۔ ہ۔ ا ہوتی ہے۔ اسی طرح اعراب جب مرکب حروف پر لگائے جاتے ہیں تو لگائے کسی کے ساتھ جاتے ہیں اور پڑھے کسی اور کے ساتھ مثلاً क्लेश کلیش کہ اس میں زیر کا نشان جو بظاہر क پر لگا ہوا ہے ल پر پڑھا جائے جس کا ایک ٹکڑا क کے نیچے جوڑ دیا گیا ہے۔

کسی عبارت کے پڑھنے میں آنکھیں اپنا کام زبان سے کچھ پہلے انجام دیتی ہیں اور جب پڑھنے والا کسی عبارت کے پہلے لفظ کو پڑھتا ہے تو اس اثنا میں کہ وہ لفظ اس کی زبان سے ادا ہو آنکھ دو تین لفظ آگے کے دیکھ کر دماغ کو پہنچا دیتی ہے۔ اور دماغ انہیں زبان سے جاری کراتا ہے نقوش اور اصوات کے اختلاف ترتیب کی وجہ سے یہ بات ناگری رسم الخط میں نہیں ہو سکتی اس لئے ناگری میں لکھی ہوئی عبارت تیزی سے نہیں پڑھی جاتی ہے۔

کسی عبارت کو جلد سے لکھ لینے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے الفاظ کے لئے کم سے کم نقوش بنائے جائیں۔ ورنہ جتنی زیادہ خدمت قلم کو انجام دینی پڑے گی اتنی ہی کم رفتار کتابت کی ہوگی۔ اب ذرا ٹھہرے دکن ناگری میں لکھیئے ठहरे दीदार مقابلہ فرمائیے کہ قلم کو اردو کی بہ نسبت کتنا زیادہ کام کرنا پڑا اور کاغذ کا کتنا زیادہ حصہ صرف ہوا کتنی بڑی نادانی ہوگی کہ ہم اپنی روزمرہ کی ضروریات میں یہ نظام استعمال کریں۔

یہ ہے ناگری رسم الخط کی دقتوں کا مختصر بیان۔ زیادہ تفصیل کی نہ تو ضرورت ہے اور نہ وقت۔ خدانخواستہ اس بیان سے میرا مقصد عرف عیوب گنوانا نہیں ورنہ فہرست اس سے بہت زیادہ طویل ہوتی۔ بلکہ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ بعض اردو داں احباب جو یہ سمجھتے ہیں کہ ناگری رسم الخط آسان ہے یہ صحیح نہیں ہے ان پر واضح ہو جانا چاہیئے کہ ناگری رسم الخط ہرگز اس قابل نہیں کہ اسے ہندوستان کی عام زبان کا رسم الخط قرار دیا جا سکے۔ مجھے معلوم ہے کہ اردو رسم الخط میں باوجود بیش بہا خوبیوں کے کچھ عیوب بھی ہیں۔ جن کی اصلاح کی طرف ہمیں توجہ کرنی چاہیئے۔ مگر اس کا یہ حل کسی طرح نہیں ہے کہ اس سے زیادہ مشکل اور ناکام رسم الخط اختیار کر کے اپنی دقتوں میں اضافہ کریں۔

پنڈت جواہر لال نہرو کی رائے ہے کہ ہندی اور اردو دونوں کو پھولنے پھلنے کا موقع دیا جائے اور جو شخص ان میں سے کسی ایک رسم الخط کی حمایت کرتا ہے وہ فرقہ پرست ہے مجھے اس بیان کے دوسرے جزء سے اتفاق نہیں کیونکہ اگر یہ کلیہ صحیح تسلیم کر لیا جائے تو مہاتما گاندھی جی مہاراج کی ہندی ساہتیہ سمیلن کے متعلق مساعی جمیلہ کو کیا کہا جائے۔

میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ زبان اور اس کے رسم الخط پر محض رسم الخط کے حسن و قبح کی بنا پر لکھا ہے۔ میرے نزدیک اس وقت قوموں کی روایات اور ان کے رجحانات کا کوئی سوال نہیں ہے۔ اگرچہ میں ان سوالوں کو جواہر لال جی کی طرح نامحمود اور غیر ضروری نہیں سمجھتا کہ واقعات اور حقائق کی دنیا تصورات اور لکچروں کی دنیا سے بہت مختلف واقع ہوئی ہے۔ چند افراد کو روایات و رجحانات سے الگ کر کے دوسری جگہ کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ مگر پوری قوم کو اس کی روایات اور رجحانات سے نہیں ہٹایا جا سکتا لیکن پھر بھی کم از کم اس وقت میرے پیش نظر صرف آسانی اور خوبی کا سوال ہے۔ حمایت اور مخالفت دونوں میری حد نظر سے اس وقت باہر ہیں۔ میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ ہندوستان کے تمام ہندو اور اب اس رسم الخط کو سنسکرت کا مخصوص رسم الخط قرار دیں۔ اور مذہبی تعلیم کا لازمی جزو سمجھیں جیسا کہ ہمیشہ سے ہندوستان میں رہا ہے۔ میں اس رسم الخط کو ہندوؤں کے لئے اتنا ہی ضروری سمجھتا ہوں جتنا ان کے لئے سنسکرت اور مسلمانوں کے لئے عربی زبان کو کہ مذہب مشرق کے لئے چھوڑ دینے کی چیز نہیں باقی ہی ہندوستان کی مروجہ بولی تو اس کے لئے اردو رسم الخط سب سے اچھا رسم الخط ہے!

عبدالقدوس ہاشمی

پیاری زبان

چپ سے کیوں بدگمان ہو پیارے   بے زبانی زبان ہے پیارے
آبسی جانِ زار آنکھوں میں   اب کہیں اور دھیان ہے پیارے
میرا نام و نشاں نہیں کوئی   بے نشانی نشان ہے پیارے
دشمن اپنی سی کر ہی گذرے تھے   تو بڑا مہربان ہے پیارے
تو کوئی مجھ سے اِتنا دُور نہیں   زندگی درمیان ہے پیارے
نت نئی زندگی ہماری ہے   نت نیا امتحان ہے پیارے

کتنی پیاری زبان ہے اُردو
"یہ ہماری زبان ہے پیارے"

حفیظ ہوشیارپوری

ایک فرانسیسی نژاد اردو شاعر کا منظوم سفرنامہ

اکتوبر کے ادبی دنیا میں شور ہرطٹی کی اس مثنوی کا ذکر ہو چکا ہے جس میں انہوں نے اپنے ذاتی حالات نظم کئے ہیں۔ اس مثنوی کا سب سے زیادہ دلچسپ حصہ وہ ہے جس میں انہوں نے بعض مشہور مقامات کی سیاحت کا حال قلمبند کیا ہے۔ یہ سفر انہوں نے کب کیا؟ اس کے متعلق صحت کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا، لیکن یہ ظاہر ہے کہ فتنۂ غدر کے فرو ہونے کے بعد وہ گھر سے نکلے تھے۔ قیاس چاہتا ہے کہ اپنی اہلیۂ اول کے زمانۂ علالت میں نیز ان کی اور اپنے والدین کی وفات کے بعد شور نے یہ سیاحت کی ہوگی۔ اُن کی اس سیاحت کو حقیقی معنوں میں "تفریحی" کہا جا سکتا ہے۔ ورنہ علی گڈھ، آگرہ، گوالیار وغیرہ مقامات ایسے تھے جہاں وہ ہمیشہ آتے جاتے رہتے تھے۔ جے پور اور گوالیار کی سیاحت کے متعلق وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ان مقامات میں وہ بلائے ہوئے گئے تھے جیسا کہ مثنوی کے مندرجات سے واضح ہوتا ہے۔

شور کے اس سیاحت نامے سے اُس عہد کے حالات پر کافی روشنی پڑنے کے علاوہ بعض مقتدر ہستیوں سے بھی واقفیت ہو جاتی ہے، نیز بعض یورپین شعرائے اردو کے کوائف و مشاغل بھی آئینہ ہو جاتے ہیں۔

سب سے پہلے شور علی گڈھ گئے اور وہاں کی تباہی و بربادی دیکھ کر بے حد متاثر ہوئے۔ ان کی زبان سے بے ساختہ نکل جاتا ہے ؎

علی گڈھ رئیسوں سے خالی ہوا

مصائب غدر کی داستاں گویا اسی ایک مصرعے میں بند ہے۔

لکھتے ہیں:۔

کبھی مثل جہاں کے جاتے ہیں ہم　　　　تو حسرت لئے وہاں سے آتے ہیں ہم

تڑپاں کبھی دل کو بھلاتے ہیں　　　　جو دو چار شاعر وہاں پاتے ہیں

شعرائے علی گڈھ میں چھوٹے خاں متین، عبدالرحمٰن مائل۔ اور نواری لال شعلہ کو شور اپنے "یاروں" میں شمار کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ عبدالمجید، نبی داد خاں، اور فدا حسین فدا سے بھی خاص مراسم تھے۔ موخرالذکر کے اسی زمانے میں دو دیوان اور تصوف میں ایک مثنوی شائع ہو چکی تھی۔

آگرہ کی سیر کے حالات میں وہاں کی مشہور عمارات کا تذکرہ ہے پھر چند مخصوص روساء سے متعارف کیا ہے جو دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ سب سے پہلے خاندان لائن کا ذکر ہے جس کے بعض افراد بڑے بڑے جلیل عہدوں پر نامور رہ چکے ہیں۔ از آں جملہ ایک پال لائن تھے جو "قطب" کہلاتے تھے اور کچہری لگی رہتی تھی اُن کے گھر۔ ان کا ایک بھائی ہنری لائن تھا۔ انہیں پرندوں کا بہت شوق تھا۔ لال، تیتر، بٹیرا، مرغ ہر سال لڑایا کرتے تھے۔ بہت سی اقسام کے کبوتر بھی پال رکھے تھے ان کا ایک بھتیجا تھا جس کا نام جان لائن تھا۔ اس کو مرغ بازی کا شوق تھا۔ اس کو فارسی اور انگریزی زبان پر اچھا عبور تھا۔ فرانسس ایس نامی ایک مشہور تاجر کا بھی ذکر کیا ہے۔ ان کے متعلق فرماتے ہیں۔

. . . .　　　　بڑے خوش مزاج اور طرفہ بشر

کہ ہر شخص سے ان کی تھی چھیڑ چھاڑ　　　　تمسخر طبیعت میں تھا بے شمار

فرانسس ایلس اگرچہ بے علم شخص تھا لیکن بڑی خوبیوں کا آدمی تھا۔ زمانۂ غدر میں شور انہیں کے ہاں مقیم تھے۔ ان کی شیریں زبانی ان کے ایسی آڑے آئی کہ خود بھی بچ گئے اور بہتوں کو بچا لیا، اور اس کے صلے میں خود بھی نہال ہوئے اور اولاد بھی مالا مال ہو گئی۔

مارٹین نامی دو بھائی بھی اس زمانے کے روساء میں شمار ہوتے

تھے۔ یہ لوگ "پرانے فیشن" کے آدمی تھے اور بہت ہردلعزیز تھے۔ پرانے آگرہ میں "ڈیمیلو" نامی خاندان بھی مشہور تھا۔ اب اس خاندان میں جان اور ایڈورڈ دو بھائی رہ گئے تھے۔ ایڈورڈ کو ستار بجانے میں استادانہ مہارت تھی اور ہر شخص اس کے کمالِ فن کا معترف تھا۔ جان کو پتنگ بازی کی لت تھی مگر اسی میں وہ نام پیدا کیا تھا کہ یاد شاید۔ جان بیل نامی ایک اور شخص کی تعریف کی ہے کہ "شرابی کبابی رہے عمر بھر"

غیر مسیحی روسا میں مرزا الف بیگ، نظام علی خاں، حکیم نصیر الدین اور تیتھرا پرشاد وکیل کی دائمی جدائی پر غم کے آنسو بہائے ہیں۔

اس کے بعد زندوں کا حال نظم کیا ہے۔ سب سے پہلے کاشین کا ذکر ہے جو "جہاں دیدہ ہیں اور بڑے نکتہ بین" وہ صیغۂ مال میں ملازم تھے

ضعیفی کا جب ان کو آیا پیام   تو پنشن ملی اور ہوا گھر قیام

لیکن زمانہ ان کے موافق نہ رہا۔ تنگ دستی نے سارا مزا کرکرا کر دیا۔ دساکیرپ میں کلسن بھی ایک مشہور تاجر تھے۔

عجب صاحبِ خلق و اخلاق ہیں   مروت میں وہ شہرۂ آفاق ہیں

ان کا بڑا بیٹا نہایت ذی شعور تھا اور لندن سے شادی کرکے لایا تھا۔ محکمہ پولیس میں ایک شخص اینٹے ذکراس نامی تھے جن سے ہر خاص و عام خوش تھا۔ ایک دفعہ وہ گھوڑے پر سے گر گئے اور ایسی چوٹ آئی کہ کام سے معذور ہو گئے۔ پنشن لے کر خانہ نشین ہو گئے۔

فرانسس ہلیس کا ذکر ہو چکا ہے ان کے تین بیٹے تھے۔ مگر وہ اپنے باپ کے کام اور نام کو نہ سنبھال سکے۔ باہمی نفاق اور پھوٹ نے سب کچھ خاک میں ملا دیا۔ نپولین بیل بھی شور کے احباب میں تھے اور نہایت زندہ دل اور رنگین طبع تھے۔ مگر شراب کی بہت بری لت لگی تھی "اسی سے کہیں جم کے رہتے نہیں"۔ آگرہ میں شور کے ایک اور دوست تھے جن کا نام مسٹر فارٹن تھا وہ سرِ دفتر مال کے عہدے پر فائز تھے۔ نہایت قابل شخص تھے۔ حکام کو بھی ان کی دیانت داری کا اعتراف تھا۔ عوام میں بھی اچھی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ شور نے "الکو صاحب" نامی ایک اور "مشفقِ باوفا" کا ذکر کیا ہے جو "بڑے کارداں اور بڑے ہوشیار" اور تحصیل میں پیشکاری کی خدمت پر مامور تھے۔ جیمس برٹفیلڈ تو شور کے رشتہ دار ہی تھے۔ تاہم ان کو بھی "کرم فرما" اور "باوقار" ظاہر کیا ہے۔ چونکہ وہ ریاست گوالیار کے "قدیم نمک خوار" تھے، اس لئے مستقل سکونت وہیں تھی۔ مارٹن برادران کا ذکر ہو چکا ہے۔ ان کی اولاد کے بارے میں لکھا ہے کہ اپنے اپنے گھر خوش ہیں "مگر سب کے چھٹے جدا ہو گئے"۔

اس کے بعد شور نے اپنے ہم زلف نواب کانسٹلین کی تعریفوں کے پل باندھے ہیں۔ انہوں نے چالیس برس تک سرکاری خدمت انجام دی اور پنشن لے کر خانہ نشین ہو گئے۔ کلکٹر ضلع نے متعدد بار انہیں ڈپٹی کلکٹری کے لئے نامزد کرنا چاہا مگر انہوں نے ہمیشہ انکار کر دیا کہ نیت میں فتور آجائے گا۔ پنشن لینے کے بعد اپنا دل چرندوں اور پرندوں سے بہلانے لگے کاغذ کے پھول پتے کترنے میں انہیں "بے حد کمال حاصل تھا" وہ اب زمانے سے "دل تنگ" ہے۔ آخری زمانے میں طبیعت تصوف کی طرف مائل ہوئی اور اس موضوع پر صدہا کتب کا مطالعہ کیا

ڈاکٹر جان نامی ایک "نامور" کا بھی ذکر ہے جو بہت خوش مزاج اور "عمدہ بشر" ہونے کے علاوہ "کیا کرتے ہیں بیشتر چیر پھاڑ"۔ انہوں نے علم الابدان پر ایک لاجواب کتاب تالیف کی تھی جس کو سرکار نے بہت پسند کیا اور انہیں انعام و خطاب سے عزت بخشی۔ پنشن یاب ہونے کے بعد وہ کان پور چلے گئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

غیر مسیحی احباب میں سب سے پہلے لالہ شیو نرائن، سیکرٹری چونگی کا ذکر ہے۔ یہ صاحب علم تسخیر کے ماہر تھے اور ہر شخص ان سے خوش تھا۔ دوسرے ڈاکٹر مکند لعل کو سراہا ہے جو اپنے احباب سے فیس نہیں لیتے تھے اور نہ دوا کے دام ہی لیتے تھے۔ غربا کا بھی مفت علاج کرتے تھے۔ ان کے لئے شور نے دعا کی ہے۔

خدا تا قیامت سلامت رکھے

بیانِ آگرہ کے خاتمہ پر شور نے آگرہ کی تعریف میں ایک مختصر نظم بھی درج کی ہے۔ تین شعر یہ ہیں:۔

اے نشاطِ عیش کی کچھ دھوم اور ہے   دیکھا ہے ہم نے یوں تو کئی بار آگرہ
اللہ رے عیشِ اہلِ بے خوشی اُف رے دل لگی   شاداب ہے بہار سے بسیار آگرہ
جلسے یہاں کے دیکھ کوئی دن تو اور شور
دکھلایا ہے خدا نے بہ دشوار آگرہ

دہلی کی سیر کے بیان میں سب سے پہلے "حالِ پر ملال شہر شاہجہاں آباد خلد آباد" کا بیان کیا ہے اور اس کی تباہی پر آنسو بہائے ہیں۔ اسی ضمن میں قلعہ کی بربادی کا بھی نقشہ کھینچا ہے، اور آخر میں "نہ رونق نہ وہ لطف ہے سیر کا" کہہ کر اس بیان کو ختم کیا ہے۔ اس کے بعد بیانِ ملاقاتِ باقی ماندہ" مذکور ہے

اس کے ذیل میں دریبہ کلاں، دُکان گلاب عطر فروش، چاوڑی بازار، بازار کلاں، چاندنی چوک، گھنٹہ گھر، عجائب گھر، کمپنی باغ، منڈی غلّہ، سبزی منڈی، قطب کی لاٹ اور البیلے تیلے پھول والوں کی سیر کی ثنا و صفت نظم کی ہے۔ بعد ازاں بعض عمایدین شہر کی جدائی پر آنسو بہائے ہیں۔

عمایدین شہر میں سب سے پہلے مولوی آزردہ کا ذکر ہے جو

ہر اک فن میں کامل تھے اور نامور

وہ مفتی عدالت تھے اور لاجواب شعر کہتے تھے۔ غدر میں اُن کی جان مفت گئی، اور اُن کے ساتھ ہی اُن کے دونوں فرزند بھی ہلاک ہوئے۔ مشہور خوشنویس امیر علی پنجہ کش، شاہ عبدالعزیز، بدر الدین مہر کن، کالے صاحب طبیب، میر تقی میر، میر حسن، شاہ نصیر، خواجہ میر درد، شاہ ظفر، مرزا غالب، مومن اور ذوق کا بھی ذکر کیا ہے جنھوں نے دہلی کی شہرت و عظمت کو چار چاند لگائے۔

پرانے لوگوں کے تذکرے کے بعد موجود الوقت "رئیسان و شاعران" کا ذکر ہے۔ نواب ضیاء الدین خاں آف لوہارو کے بارے میں فرماتے ہیں کہ انہیں فارسی میں کامل دستگاہ ہے اور اردو میں بھی خوب کہتے ہیں۔ ان کی شاعری پر شور نے کیا خوب مرصع مصرعہ کہا ہے۔

زباں ہے سلیس اور بیاں ہے نفیس

اس سلسلے میں آپ کے صاحبزادگان نواب احمد سعید خاں اور حسام الدین خاں کا ذکر کیا ہے جنہیں "شعر گوئی سے بھی شوق ہے"۔ پھر جناب مبیں کا نام لیا ہے اور انہیں "اُستاد" اور "فنِ شعر میں قابل صاد" کہا ہے۔ شور نے لکھا ہے کہ شہر کی تمام طوائفیں محفلوں میں مبیں کی غزلیں گاتی ہیں۔ نواب مرزا داغ کو "عالی دماغ" اور مرزا ارشد گورگانی کے کلام کو "مرغوب" کہا ہے احسن اور رحالی کو "اختر و ذر" سے تشبیہہ دی ہے، پھر کسی نابینا شاعر المتخلص بہ ویراں کا ذکر ہے۔

جو تاریخ گوئی میں ہے لاجواب

شعرا کے بعد شور نے فضل مصوّر، حکیم محمود خاں، حکیم بدرالدین خاں اور حکیم قیام الدین کے کمالِ فن کی داد دی ہے۔ اخیر میں جمیس اسکنر کے بیان کے ساتھ اس خاندان کے دیگر دو افراد نواب مرزا (اسٹوارٹ اسکنر) اور چھوٹے مرزا کا ذکر کیا ہے جن کو شور نے اپنا "یارِ غار" بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ

بڑے خانداں کے ہیں یہ آدمی　　　کہ جرنیل تھا باپ ان کا کبھی

دہلی کی سیر کے خاتمہ پر پہلے تو یہ دعا ہے "جو قائم ہیں یارب وہ قائم رہیں"۔ بعد ازاں مرحومین کے لئے دعا کی ہے "وہ جنت میں داخل ہوں جو مر گئے"۔ سب سے آخر میں یہ شعر لکھ کر دہلی کی سیر ختم کی ہے۔

کرو شکر حاکم کہ دل شاد ہے　　　نئے سر سے دلی پھر آباد ہے

جے پور کی سیر کے حال میں ساقی نامہ کے بعد پہلا شعر ہے ؎

گئے سیر کو ہم جو جے پور کی　　　اُسے دیکھ کر دل کو فرحت ہوئی

اس کے بعد شور نے "جے پور دارالسرور" کی آرائش و زیبایش کی تعریف کی ہے۔ اس سلسلہ میں تمام قابل دید چیزوں کا ذکر آگیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ جے پور جانے کا اتفاق ایسے وقت ہوا کہ

جے پور تھا جلوۂ نور میں

یعنی شہزادہ (پرنس آف ویلز) نے ورود اجلال فرمایا تھا اور بہ تقریب دعوت تمام شہر بقعۂ نور بنا ہوا تھا ؎

شب قدر وہ شب بنی تھی وہاں　　　تجلّی تھی اک نور کی سب عیاں
وہ کنولوں کی اور قمقموں کی بہا　　　چراغوں کی وہ روشنی بے شمار
کہ اخترِ فلک پر خجل ہو گئے　　　مہ و خور بھی عاشق ہوئے دیکھ کے

جے پور میں شور کی ملاقات کپتان الفونی سے ہوئی جن کو انہوں نے بڑی خوبیوں کا انسان کہا ہے، اور "جو سراسر محبت کی بنیاد ہیں"۔ اسی طرح کپتان طامس کو سراپا مجسم بہ اخلاق اور مروت میں شہرۂ آفاق" کہا ہے۔ میتنول نامی ایک کمیدان کی بھی تعریف کی ہے اور مسٹر ہابن کی طبابت کو سراہا ہے۔ ان چاروں حضرات کو شور نے اپنا "شفیق" بیان کیا ہے۔

جے پور میں ایک روز راجہ صاحب کے سررشتہ دار نے شور کی دعوت کی اور ایسے عمدہ اور لذیذ طعام دستر خوان پر چنے

کہ جنت کی نعمت خجل اُس سے تھی!

شور جب الور گئے ہیں اُس وقت راجہ شیودان سنگھ کا دور دورہ تھا۔ اُن کے دورِ حکومت کی سب سے بڑی تعریف یہ ہے کہ

کوئی عہد میں اس کے مفلس نہ تھا

والیِ الور کو جس چیز کا شوق ہوا اُس کو حدِ کمال تک پہنچا کر پیچھا چھوڑا مثلاً اسلحہ خانے کی طرف توجہ منعطف ہوئی تو وہ لاجواب اسلحہ بہم پہنچا سے

جن کا جواب نہیں گھوڑوں کا شوق ہوا تو

بھرے اصطبل روز ہی جاتے تھے — کہ عربی و ترکی چلے آتے تھے

وہ مشکی نہ رنگ ایسا دیکھا کوئی — یہی زلفِ مشکیں کو حسرت رہی

وہ سبزہ کہ فیروزہ شرما گیا — وہ گلدار، لالہ بھی گل کھا گیا

وہ سرخہ کہ سرخی جب اس سے نہ پائے — تو رنگ حنا رشک سے کٹ ہی جائے

وہ نقرہ کہ زینت اس پہ مدام — سراپا ہے وہ نقرئی لا کلام

وہ کرّہ کہ جوبن پہ غوغہ کرے — وہ رنگ اس کا سرنگت دیکھا کرے

سبزہ زانو ایک ایک ایسے سمند — سمند صبا کا ہو دم جن سے بند

اس کے بعد پری خانہ کا تذکرہ ہے جس میں ایک ایک پری وش انتخاب لاجواب ہے۔

ہزاروں کی تنخواہ وہ پاتی تھیں — ہزاروں ہی اوپر اڑا جاتی تھیں

خزانہ انہوں نے ہی خالی کیا — بھرا تھا جو قلعہ میں دولت کا

بعد ازاں راجہ صاحب کو پتنگ بازی کا شوق ہوا۔ اس کے لئے بھی بہتر سے بہتر سامان بہم پہنچایا گیا اور ہزاروں پر پانی پھر گیا۔

اسی طرح لعلوں سے جب دل لگا — ہزاروں ہوئے لعل اُن پر فدا

. . . . . لڑائی رہا کرتی تھی صبح و شام

اور محض لڑائی ہی نہیں ہوتی تھی بلکہ ہزاروں کی بازیاں بدی جاتی تھیں۔ اس شوق سے طبیعت سیر ہوئی تو شیر کے شکار کی سوجھی اور اتنے شیر شکار کئے کہ جنگل خالی ہو گئے۔ ؎

شکار ہو کے الور کو جب جاتے تھے — تو گھر میں ہزاروں ہی نقد آتے تھے

کہ نذریں دیا کرتے تھے سب اہل کار — کیا راجہ صاحب نے ہے یہ شعار

الغرض — اسی طرح جو شوق پیدا ہوا

اسے حد تلک خوب پہنچا دیا

اس دوران میں راجہ صاحب کے مشکوے معلٰی میں ایک فرزند نرینہ پیدا ہوا۔

. . . . خوش اقبال و خوش رو فرخندہ فال

ہوئی اس خوشی کی بڑی دھوم دھام — شب و روز جلسوں کا تھا اژدہام

خزانے کا دروازہ کھولا گیا — مہینوں تلک وہ لٹایا گیا

غرض چھ مہینے یہ نقشہ رہا — کہ دعوت سے کوئی نہ خالی بچا

کری پھر چھٹی بھی بڑی شان سے — عجب ٹھاٹھ اور ارمان سے

چھٹی کے سلسلے میں جنرل نسلی صاحب کا بھی خوب نام ہوا کیونکہ

. . . . . چھٹی کی انہوں نے جو کی دھوم دھام

چلے کرتے توپی ملاٹک کے ہاتھ — جلو میں مرد خور بھی تھے ساتھ ساتھ

ان انتظامات میں جنرل صاحب کے برادر کپتان مینوئل نسلی نے بھی کافی حصہ لیا تھا۔ شوؔر نے ان کی "خدمات" کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ شوؔر اسی زمانۂ جشن میں الور پہنچے تھے ان کی بھی چند دعوتیں ہوئیں اور ایک ماہ تک یہ کیفیت رہی کہ

چلا خوب دن رات دورِ شراب — کہ جس کی نہ حد تھی نہ کچھ تھا حساب

جوزف نسلی صاحب فوج کے جنرل تھے، شعر گوئی سے انہیں خاص شغف تھا۔ فنا تخلص کرتے تھے۔ خوشنویس بھی اعلیٰ درجہ کے تھے۔ اور ستار بھی خوب بجاتے تھے۔ شوؔر سے ان کا بہت قریبی رشتہ تھا، اس لئے انہیں کے یہاں قیام تھا لیکن مہمان راجہ صاحب کے تھے چنانچہ فرماتے ہیں۔ ؎

شب و روز جلسوں میں حاضر تھے ہم — عنایات راجہ نہ ہوتی تھیں کم

ہمیں بخیر تکلف سے خلعت ملا — ادا شکر بھی دل سے ہم نے کیا

شوؔر نے اس موقعہ پر تہنیت نامہ راجہ صاحب کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ چند شعر دیکھئے ؎

یہ فرزند دلدار پیدا ہوا ہے — نصیبے کا بیدار پیدا ہوا ہے

نہ دولت کی ہو گی کمی راج کو اب — یہ ایسا گہربار پیدا ہوا ہے

مہ و خور سے کیا اس کو تشبیہ دوں میں — سراسر پر انوار پیدا ہوا ہے

لبالب مے عیش سے جام ہو گا — خوشی کا طلبگار پیدا ہوا ہے

یہ سب کچھ تو ہوا لیکن ریاست بیس لاکھ کے قرضے میں دب گئی اور اس کی ساکھ جاتی رہی۔ حکومت نے دو ایک بار تنبیہہ کی، لیکن جب کوئی اثر نہ ہوا تو ایک ایجنٹ کی تعیناتی عمل میں آئی۔ راجہ صاحب معزول کر دیئے گئے، اور ان کے مصارف کے لئے ایک رقم بطور وظیفہ مقرر ہو گئی۔ اسی اثنا میں جنرل نسلی مرض سل میں گرفتار ہو گئے۔ راجہ صاحب کو ان سے حد درجہ محبت تھی۔ "بظاہر ملازم تھے باطن میں یار"۔ از بس علاج کیا

مگر اس مرض سے نہ جانبر ہوئے — اسی سل کے آخر کو تھپڑ پڑے

۴۴ سال کی عمر تھی کہ دنیا سے منہ موڑ لیا (۱۸۶۸ء) تمام الور میں شورِ ماتم بپا ہوا۔ ہزارہا لوگ جنازے کے ساتھ تھے۔ راجہ صاحب کو جوزف نسلی کی جدائی کا بے حد صدمہ ہوا۔ ہم سن ہونے کے علاوہ دونوں نے ایک ہی مدرسے میں تعلیم پائی تھی۔ اسی زمانے میں وہ نونہال بھی رخصت ہو گیا

جس کے جشنِ ولادت میں خزانہ کا منہ کھول دیا گیا تھا۔ اولاد کے غم میں رانی صاحبہ بھی سدھار گئیں۔ ان پے درپے صدمات نے راجہ صاحب کی کمر توڑ دی۔ جیسے تیسے ایک دو برس گزارے،

بالآخر گئے وہ بھی تابِ بقا

راجہ صاحب کی وفات پر ریاست کا نظم و نسق کپتان کیڈل کے تفویض ہوا۔ ان کی خوبیٔ انتظام سے ریاست کی کایا پلٹ ہو گئی۔ ڈپٹی طامس ہیڈرلی کو محکمہ مال کا نگراں مقرر کیا گیا۔ اسی سلسلے میں ان کے صاحبزادے بھی کام میں لگ گئے۔ ان تینوں باپ بیٹوں سے شور کے اچھے مراسم تھے۔ ہیڈرلی کا ایک نہایت نفیس مکان میرٹھ میں بھی موجود تھا۔

کئی سال تک الور میں ایجنٹی کا دور دورہ رہا۔ بالآخر، دور کا ایک رشتہ دار نکل آیا اور

دیا اس کو سرکار نے راج پاٹ

ان کا نام نامی منگل سنگھ تھا۔ یہ وہی مہاراجہ الور ہیں جن کا سالِ رواں میں ولایت میں انتقال ہوا ہے۔

گوالیار کسی زمانے میں ہندوستان میں سب سے بڑی حکومت تھی، بلکہ کہنا چاہئے کہ سارا ہندوستان اس کے قبضۂ اقتدار میں تھا۔ شور فرماتے ہیں ؎

کسی وقت میں ہند قبضہ میں تھا یہی راج مالک تھا اس ملک کا
علی گڈھ میں افواج تھیں بے حساب وہ جرار و کرار اور انتخاب
علی گڈھ میں شامل تھے بارن مجال مرہٹہ کا اقبال تھا بے مثال
وے پلٹا جب چرخ نیلی نے رنگ نظر آیا پھر وقت کا اور ڈھنگ
بیکایک جو انگریز یہاں آ گئے تو بادل سے اس ملک پر چھا گئے
خدا کو جو منظور تھا وہ ہوا مرہٹہ کا لشکر ہوا ہو گیا

اسی سلسلے میں شور نے اشارۃً غدر کا بھی ذکر کیا ہے ؎

. . . کہ راجہ کی بھی فوج کا سر پھرا
کہ راجہ کی بے جا وہ درپے ہوئی خزانہ لٹا، جاں بہ مشکل بچی
ہوئے راجہ لشکر سے اپنے فرار لیا آگرہ آ کے دم اور قرار
پسند اس کو سرکار نے بھی کیا انہیں پاس اپنے ہی رہنے دیا

نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی قدر و منزلت بدستور قایم رہی اور ان کو ریاست گوالیار کا فرمانروا تسلیم کر لیا گیا۔

اس کے بعد شور نے گوالیار کے مختلف محلات و عمارات کی صفات بیان کی ہیں۔ اس ضمن میں انہوں نے پھول باغ، کوٹھی، موتی محل کیفیت بازار لشکر وغیرہ کی تصویر نظم میں کھینچی ہے۔ موتی محل کے بیان میں ضمناً مسٹر مائکل کا بھی ذکر آ گیا ہے جو فنِ انجنیری میں "انتخاب" تھے۔ انہیں کی نگرانی میں موتی محل تعمیر ہوا تھا۔ مسٹر مائکل مشہور فرانسیسی کرنل پیرن کے پوتے تھے۔ تعمیر محل کے اختتام پر وہ کلاں صوبہ کے عہدہ پر فائز ہوئے اور ...جین میں تعیناتی ہوئی۔ ان کے ایک بڑے بھائی بھی تھے جو عام طور سے منا صاحب کے نام سے مشہور تھے۔ شاعری کا انہیں بہت شوق تھا۔

مرہٹہ حکومت کے زمانۂ عروج میں تین مشہور کیمپ تھے۔ ایک کیمپ کرنل پیرن کی ماتحتی میں تھا۔ دوسرا سوائی سکندر کی ماتحتی میں تھا اور تیسرا کیمپ کرنل جیکب کی ماتحتی میں تھا۔ اپنے زمانے میں ان تینوں نے بڑے بڑے کارنمایاں انجام دئے ہیں۔

شور نے گوالیار کی بے مثال رنگ سازی کو نہایت عمدگی سے بیان کیا ہے ؎

رنگا ہو جو ہر رنگ میں کچھ بشر وہی قدرداں اس کا ہے سر بسر
وہ رنگین کپڑا رنگا کرتے ہیں کہ ہر رنگ سے دل لیا کرتے ہیں
اگر چرخ نیلی انہیں دیکھ پائے تو ہو رنگ فق اور منہ کو چھپائے
وہ سوہا کہ سب رنگ سے ہے سوا اُسے دیکھ سوہا بھی سر سبز ہوا
وہ ماشے کہ تھوڑی ہو جس کی معاش اسے جان و دل سے کرے وہ تلاش
وہ سردی کہ ہے خوشنما با لضرور کہ ہے گرم رویوں کو اس سے سرور
وہ لاکھی کہ لاکھ اس کو دھویا کرے نہ رنگ جائے، دھوبی کو دھبہ لگے
وہ خاکی کہ لے اس کو ہر خاکسار ملے خاکساروں میں اس کو وقار
وہ فیروزی ہے کہ اگر دیکھ پائے تو فیروزہ بھی رشک سے ہیر کھائے
وہ ہے شربتی دل کو ٹھنڈا رکھے اثر اس کا شربت سے بڑھ کے رہے
وہ کافوری، دل جس سے مسرور ہو جو گھر میں بلا ہو وہ کافور ہو

غرض رنگ سب نامی ہیں شہر میں
کہ ایسے نہیں ہیں کہیں دہر میں

اس کے بعد شور نے جیندار اکبن دولت سے متعارف کیا ہے سید کفایت حسین، جمعدار رسالہ کے باب میں لکھتے ہیں "بڑے وضعدار اور یاروں کے یار"۔ اسی سلسلے میں آگے چل کر کہا ہے۔

ہے ان کے رسالے میں اک قصداً   وہ اپنا برادر ہے اور دوستدار

اس کا نام انہوں نے گشتبن ظاہر کیا ہے اور اس کو بڑی خوبیوں کا آدمی بیان کیا ہے۔ ایک اور صاحب بنام جان آلطوقی "جواں عمر، خوش سیرت و خوش جمال" تھے وہ محکمۂ ٹھگی ڈکیتی سے منسلک تھے۔ انہوں نے صدہا ٹھگوں اور ڈاکوؤں کو گرفتار کرکے انعام پایا تھا۔

اپنے بارے میں شور فرماتے ہیں ؎

مجھے بھی تعلق ہے سرکار سے   اسی راج سے اور دربار سے
قدیمی نمک خوار ہوں راج کا   یہ مدت کا ذکر ہے نہیں آج کا
بزرگان میرے ملازم تھے یہاں   بڑے عہدوں پہ رہا ہے کام ان کا
علاوہ ازیں ع   یہاں پر ہوں میں بہر حال دو شاد بال

مراد آباد کو عجیب شہر اور قابل الطاف و سیر بتا کر کہا ہے کہ اٹھتی ہے دل میں ہر اک وقت لہر۔ رام گنگا اور کانگن ندی کی بھی خوب خوب تعریف کی ہے اور بے حد غلو سے کام لیا ہے۔ بازار کو "بحر طویل" اور "سیر و دل لگی کی سبیل" بتایا ہے اور چھتنے کی تعریف کی ہے کہ "ہر شے مہیا ہے ہر دم وہاں"۔ اس کے بعد ظروف اور صنعت پارچہ کا ذکر ہے اور دونوں صنعتوں کی نہایت کشادہ دلی سے داد دی ہے۔

رؤساء شہر میں نواب سعید الدین احمد کے باب میں تحریر کیا ہے ؎

جہاں دیدہ ہیں اور پسندیدہ ہیں   حمیدہ خصائل ہیں سنجیدہ ہیں
رفیع المکاں اور عالی ہمم   بلند حوصلہ اور مجسّم کرم
دلے اب ضعیفی سے معذور ہیں   قناعت گزیں اور مجبور ہیں

مرزا اسد علی بیگ ایک مشہور زمیندار اور نہایت با وضع آدمی تھے۔ ان کے بارے میں لکھا ہے ؎

ہمیشہ سے ان کو ہے شوق شکار   پسند اس کے آگے نہیں کوئی کار
نہ چھوڑا کوئی صید یہ تھا کمال   بچا مرغ قبلہ نما بال بال
غرض عمر کھوئی اسی ذوق میں   توجہ نہ کی اور کسی شوق میں
بڑی خوبیوں کے ہیں وہ آدمی   ہمارے بھی مشفق و اشفق ولی

اپنے سبھی احباب کو شور بالعموم "برادر" کہا کرتے تھے۔ اس لحاظ سے مراد آباد میں بھی اُن کے تین چار برادر تھے۔ ڈاکٹر ولیم فانتوم کے بارے میں کہا ہے ؎

نہیں ہوتی ہے جب کسی سے شفا   مریض ان سے کرتا ہے پھر التجا
بفضل خدا وہ شفا پاتا ہے   دوا اور دعا سے مرض جاتا ہے

ایک صاحب افسر پولیس تھے، میتھیوز نام تھا۔ اُن سے شور کی بڑی رسم و راہ تھی۔ ان کے متعلق کہا ہے۔

حمیدہ خصال اور کثیر العیال   خدا باغِ دنیا میں رکھے نہال

پھر گرلین خاندان کا ذکر ہے جس میں ایک بڑے میاں اور اُن کے پانچ صاحب زادے شامل ہیں۔ پہلے اُن کا تعلق سردھنہ سے تھا۔ مگر

پڑا اُن پہ جب انقلابِ زمن   معیشت کے باعث سے چھوڑا وطن

ایک ڈپٹی صاحب تھے۔ چارلس نام تھا۔ ان کے لئے کہا ہے۔

. . . . . .   رہے مدتوں یہاں بصد احترام
ہماری بھی اُن سے ملاقات ہے   کہ ذات اُن کی مجموعہ حسنات ہے

اپنے ایک دوست شیو راج سنگھ کا ذکر کیا ہے کہ

. . . . . .   زمیندار و راجہ وہ مشہور تھے
بعمرِ جوانی ہوا انتقال   ہوا دوستوں کو تاسف کمال
گئے تھے نہانے کو وہ سردوار   کہ میلہ تھا وہاں کمبھ کا بے شمار
پیامِ اجل اُن کو وہاں آگیا   کہ گھر تک پہنچنا بھی دشوار ہوا

ولی محمد جرّاح کے لئے لکھا ہے ع

بڑا سچا سیدھا مسلمان ہے!

کان پور کی سیر کے حال میں اولاً بازار، چرمی، پتلی گھروں اور کمپنی باغ کی ثنا و صفت کی ہے بعد ازاں "چاہ گنج شہیداں" کا ذکر کرکے نانا راؤ کے مظالم بیان کئے ہیں جو اُس نے زمانۂ غدر میں انگریزوں پر توڑے تھے۔ آخر میں کسی زیر تعمیر گرجا گھر کی "خوش نمائی" کے ذکر پر اس بیان کو ختم کیا ہے۔

الہ آباد کے بیان میں سنگم، پل، جمنی، قلعہ، چوک و سبزی منڈی، کمپنی باغ، میوہال، تھارن ہل لائبریری، میور سنٹرل کالج، اور کتھیڈرل کا تذکرہ ہے۔ کالج کے ذکر میں جہاں علم و ہنر کی خوبیاں بیان کی ہیں وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ ہندوستانی جوان لکھ پڑھ کے ہوشیار تو ہو گئے مگر ان میں یہ خرابی بھی پیدا ہو گئی کہ

گئے اپنی موروثی پوشاک بھول،

"احباب الہ آباد" میں سب سے پہلے مسٹر جی وارڈن، ہیڈ کلرک ہائی کورٹ کا ذکر ہے۔

خدا نے دیا ان کو سب اقتدار　　مگر وضعداری ہے ان کا شعار

نیز جب کبھی الہ آباد آتے تھے تو مسٹر فرانسس لائن کے یہاں مقیم ہوتے تھے۔ وہ رئیس آگرہ کہلاتے تھے اور ہائی کورٹ میں مترجم تھے سے

چلا جاتا ہے وضعداری سے کام　　توکل خدا پر ہے ان کو مدام

ان کے ایک اور بھی بھائی الہ آباد میں تھے جن کا نام چارلی لائن تھا۔ ان کا بھی ہائی کورٹ سے تعلق تھا۔ مرغ بازی کا انہیں بہت شوق تھا لکھنؤ سے کئی بازیاں جیت چکے تھے۔ انہیں حضرات کے ایک عمو زاد بھائی تھے جن کا نام ہیری لائن تھا۔ صیغۂ دیوانی سے منسلک تھے۔ اخیر میں پنڈت اجودھیا ناتھ، وکیل ہائی کورٹ کا ذکر کیا ہے سے

طبیعت میں ہے شعر خوانی کا شوق　　کلام مکلف سے ہے ان کو ذوق
اگرچہ وکیلوں کا ہے اور طور　　پر اخلاق کا ان کے بڑا نا ؤ اور
یہ ہے بے تکلف وہ ہم سے مدام　　مزے شعر خوانی کے تھے صبح و شام

لکھنؤ کے بیان میں لکھتے ہیں کہ

اسے شہر لکھوں یا جنت کہوں　　کہ جنت کو ہے رشک اس پر فزوں
نہ تھا ہند میں کوئی ایسا دیار　　برستا تھا مینہ زر کا لیل و نہار

اس کے بعد غیاث الدین حیدر، نصیر الدین حیدر، آصف الدولہ، سعادت علی خاں وغیرہ کے اوصاف بیان کئے ہیں۔ پھر واجد علی شاہ کا ذکر ہے۔ ان کے متعلق لکھتے ہیں اور بالکل ٹھیک لکھتے ہیں کہ

لٹایا تمام عمر وہ سیم و زر　　گیا سر سے پدموں کا پانی اتر
جواہر کو پتھر سے بدتر کیا　　کروڑوں کا یوں گھر برابر کیا
نہ کچھ خوفِ عقبےٰ نہ دنیا رہا　　خوشی کا شب و روز چرچا رہا
برس بھر بھی نوکر جو کوئی رہا　　تمام عمر کی روٹیاں لے گیا

ان اذکار کے بعد مشہور عمارات کا تذکرہ ہے۔ اس ضمن میں تمام قابلِ دید یادگاروں کا بیان آگیا ہے، اور بعض بیانات میں خوب خوب دادِ سخن دی ہے۔ اسی سلسلے میں مطبع منشی نول کشور کا بھی ذکر کیا ہے سے

زبس مہتمم بھی ہیں اس کے خلیق　　زمانہ کے ہیں وہ سراسر شفیق
اسی طرح اچھے ہیں سب اہلِ کار　　زمانہ ثنا خواں ہے لیل و نہار

از انجملہ اک ہیں ہمارے بھی یار　　وہ پنڈت رتن ناتھ ہیں باوقار

"فسانۂ آزاد" کے متعلق:-

بہا اس میں دریا سخن کا بہا　　کہ پانی ہے بات اس کی شکل ذرا

اخبار "اودھ پنچ" کے متعلق لکھتے ہیں سے

ایڈیٹر بھی اس کے ہیں باغ و بہار　　وہ گلزار خوبی کے ہیں گلعذار
سناتے ہیں اکثر وہ سرکار کو　　نہاں کچھ نہیں رکھتے اسرار کو
غرض وہ کسی سے بھی ڈرتے نہیں　　ظرافت سوا بات کرتے نہیں
جو رد تا کوئی ہو تو ہنس جاتا ہے　　یہ لطف اُن کی تحریر میں آتا ہے
بڑے عمدہ ناظم و ناثر ہیں وہ　　ہر اک علم کے خوب ماہر ہیں وہ
ہماری بھی اُن سے ملاقات ہے　　کہ ذات اُن کی مجموعۂ حسنات ہے

اس کے بعد لکھنؤ کی مخصوص اشیاء مثلاً پارچہ چکن، عطرِ حنا، تمباکو خمیرہ، خربزہ وغیرہ کی تعریف کی ہے، اور اس بیان کو اس شعر پہ ختم کیا ہے:-

غرض لکھنؤ ہے وہ خلدِ بریں　　کہ ایک ایک شے پر ہے صد آفریں

اخیر میں لکھنؤ کی تباہی کی المناک داستان بیان کی ہے اور نواب واجد علی شاہ کے واقعۂ معزولی کو نظم کیا ہے۔ انتخاب ملاحظہ ہو سے

گلستانِ خوبی ملا خاک میں　　کیا اس کو برباد افلاک نے
لیا دم میں سرکار نے لکھنؤ　　ہوا قبضہ انگریز کا چار سو
اسی دم چراغِ خوشی گل ہوا　　ہنسا گل نہ وہ شورِ بلبل ہوا
ہوا ایک سکتے کا عالم تمام　　کیا گردشِ چرخ نے اپنا کام
پھر آخر کو وہ کھلبلی پڑ گئی　　کسی کو کسی کی نہ سُدھ بُدھ رہی
گئے شاہ کلکتہ با دلِ فگار　　الم دوش پر، آہ لب پر ہزار
غرض ایک دم کا تھا سارا ظہور
اُٹھا اُس کے جاتے ہی شور و نشور

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی مسودہ کی صورت میں موجود نہ تھی بلکہ اشعار موزوں کر کے ساتھ کے ساتھ وہ کاتب کو دیتے جاتے تھے۔ سردھنہ کا ذکر شروع ہی کیا تھا کہ پیامِ اجل آگیا اور مثنوی نامکمل رہ گئی سردھنہ کے نامکمل بیان کے بعد اگلے صفحے پر ان کی موت کا واقعہ بیان کیا گیا ہے اور اس کے بعد قطعات تاریخِ وفات وغیرہ درج ہیں

اگر مسودہ موجود ہوتا تو یہ نقص ہرگز واقع نہ ہوتا تعجب نہیں کہ آخر میں شور میرٹھ کا بھی ذکر خیر کرتے۔ میرٹھ میں ان کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔

سردھنہ میں بیگم شمرو کا دربار مرجع ہر خاص و عام تھا۔ بہت سے یورپین اس دربار سے وابستہ اور ممتاز عہدوں پر فائز تھے۔ شور کے نانا فراسوکوئس اسی دربار کے متوسلین میں تھے اور ایک اعلیٰ رتبہ پر متمکن تھے۔ اختر لونی صاحب یہاں کے مشہور جنرل تھے۔

غرض چھاؤنی وہاں کی گلزار تھی بہار اُس پہ تو بان لبسیا رتھی

یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ یورپین شعرائے اردو میں اکثر و بیشتر بیگم شمرو کے دربار کو رونق بخشتے رہے۔ چنانچہ جن شعرا کا ذکر اس مضمون میں آیا ہے ان میں زیادہ تر وہی لوگ شامل ہیں جن کا بالواسطہ یا بلاواسطہ دربار سردھنہ سے تعلق رہ چکا ہے۔ خود بیگم بھی نہایت باکمال عورت تھی۔ حکمرانی کی اہلیت رکھنے کے علاوہ شعر و سخن کی بھی اچھی قابلیت رکھتی تھی فارسی و اردو لکھنے پڑھنے میں پوری مشاق تھی۔ اُس کے فارسی مکتوبات ملتے ہیں۔ اس کا آخری وصیت نامہ بھی فارسی ہی میں تحریر تھا۔

(حقوق محفوظ)

پیارے لال شاکر (میرٹھی)

رباعی

اے کاشف شانِ طرب اے نغمہ نواز!
اے مطربِ پُر عشوہ و تازہ و ناز!
جب چھیڑ کے ساز کر ڈالا ہے دل کو پامال
اس چھیڑ کی مضراب سے چھیڑ اپنا ساز!

سعید احمد اعجاز

تجلیات

سفینے تتلیوں کے قلزمِ ضو میں خراماں ہیں
گہر ہر رنگ کے تاباں ہیں رنگیں بادبانوں پہ
عیاں ہوں جیسے ہنگامِ شبِ انجم آسمانوں پہ
سمن کے پھول ہیں یا نور کی موجیں کف افشاں ہیں

شفق لالہ کی ہے زیرِ شجر لرزاں فضاؤں میں
سوادِ شام میں پرّاں ہیں کچھ چنگاریاں گویا
دھندلکے ہیں حسیں لعلوں کی ہیں ضو باریاں گویا
کہ لہراتی ہیں مضطر بجلیاں کالی گھٹاؤں میں

یہ نرگس ہے کہ سرمستِ حیا ہے نازنیں کوئی
تجلّی ریز ہیں شبنم کی بوندیں سبزۂ تر پہ
کہ تارے جھلملاتے ہیں زمرّد فام چادر پہ
یہ سب جلوے ہیں کس کے گر پسِ پردہ نہیں کوئی

تخت سنگھ
(گورنمنٹ کالج لائل پور)

سجدۂ نیاز

آرہا ہوں تیری بزمِ ناز میں کس شان سے
دل میں بے پایاں اُمنگیں روح میں طوفان سے

عشقِ وحشت آفریں کو رہنما مانے ہوئے
جان کو اک ہدیۂ ناچیز گردانے ہوئے

ایک سیلابِ جنوں، رگ رگ کو برماتا ہوا!!!
ذہن میں مے، مے میں تیرا عکس لہراتا ہوا

دو جہاں کی عشرتیں محجوب سی ہوتی ہوئیں
تیری نظریں دو جہاں کی وقعتیں کھوتی ہوئیں

ہر مصیبت سجدۂ تعظیم کو جھکتی ہوئی
گردشِ ایام کی کچھ سانس سی رُکتی ہوئی

اختیاراتِ محبت کے بھنور بپھرے ہوئے
اور چہرے ہمت و توفیق کے نکھرے ہوئے

حادثاتِ دل شکن کے حوصلے چھوٹے ہوئے
رنج و غم کے روح فرسا ضابطے ٹوٹے ہوئے

آرہا ہوں اور جبیں میں ہے نہاں اک آفتاب
یعنی وہ سجدہ کیا ہے تیری خاطر انتخاب

ہے نظر خلاق کی بھی جس پہ للچائی ہوئی
ہائے اک بُت کی خدائی جوش میں آئی ہوئی

عدم

جستجو

صبحدم تھی فضائے چرخ کبود یا کہ تھی رہگذار موجِ سرود
شورِ ناقوسِ دیر و بانگِ اذاں ہر زباں پر درود سر بہ سجود
نغمہ زن قمریاں صنوبر پر عالمِ کیفِ نغمۂ داؤد
بے حجابانہ غنچے جلوہ ریز سرخیٔ رخ کہ آتشِ نمرود
روح پرور خرامِ نازِ صبا جاں فزا نکہتِ چمن کی نمود
اس طرح دل سے کلفتیں غائب جیسے ظلمت جہان سے مفقود

لطف اندوز حسِ دیدہ و گوش
فرحتیں تھیں دلوں سے دوش بدوش

بے قراری تھی دل کو تھا میں خموش مائلِ سجدہ تھی جبینِ نیاز
اک کلی نے چٹک کے مجھ سے کہا اے کہ گریہ ترا طریقِ نماز
اے کہ تیری نوائے سوزاں سے گلستاں کی کلی کلی ہے گداز
اے کہ سینہ ترا تجلی زار ہے حقیقت جہاں کی تیرا مجاز
نغمہ ہے سازدارِ سوزِ دروں یا حجابِ سکوتِ پردۂ ساز

چہ شنیدی کہ تو خموش استی
چوں جمادی سکوں فروش استی

شاعر کا جواب

مجھ کو اس کا خیال رہتا ہے جو ہے عنقا مثال میرے لئے
کوئی نادیدہ گم شدہ شے ہے کہ ہے جس کی تلاش دل کو مرے
کبھی پایا نہیں نواؤں میں میں نے ہستی کی راگنی میں جسے

دور غوغا سے ڈھونڈتا ہوں اب
روح کے دشتِ خامشی میں اسے

سعید احمد اعجاز

ایک شام

ہم لڑکوں کو سال بھر کے پھلوں میں پکّے پکّے سرخ بیر سب سے زیادہ مرغوب تھے۔ ہم اس سُرخ سُرخ، زرد زرد، اور سبز سبز پھل سے لدی ہوئی بیریوں کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا کرتے اور انہیں دیکھتے ہی ہمارے منہ میں پانی بھر آتا۔ بستی کے اردگرد پھلوں کے اور بھی کئی درخت تھے لیکن انہیں دیکھ کر کم ازکم دامن تسبر ہمارے ہاتھ سے کبھی نہ چھوٹتا بیروں کی بات ہی کچھ اور تھی۔

جب ہماری نظر رنگ رنگ کے بیروں سے لدی پھندی بیریوں پر پڑتی تو ہمیں یوں محسوس ہوتا، جیسے سرسبز ٹہنیوں سے ہزارہا سُرخ، زرد اور سبز آنکھیں ہماری طرف گھور رہی ہیں۔ یہ آنکھیں کچھ اس انداز محبت سے ہمیں دیکھتیں کہ ہمارا دل بے قابو ہو جاتا۔ اور ہمیں ماں باپ اور استادوں کا پڑھایا ہوا سبق کہ "بیٹا دیکھو کسی کی ملکیت کو "بری نظر" سے نہیں دیکھنا چاہیئے" بالکل بھول جاتا۔

ہمارے راستے میں اگر کوئی چیز حائل تھی تو وہ کمبخت رکھوالے تھے جو طوطوں کے علاوہ بیر چرا کر بھاگنے والے لڑکوں کی پیٹھ پر بھی بلا تکلف اپنی غلیل سے غلّہ چھوڑ دیا کرتے۔ لڑکا بیچارہ "ہائے میری اماں میں مرگیا" کہہ کر رونے لگتا یا اگر اس کی قسمت اچھی ہوتی تو بھاگ نکلتا۔ دوسری مشکل ہمارے لئے یہ تھی کہ بیریوں کے تنوں پر جھڑبیریوں کی خاردار ٹہنیاں کس کر باندھ دی جاتی تھیں تاکہ کوئی لڑکا چپکے سے بیری پر چڑھ کر بیر نہ کھا جائے اکثر ایسا اتفاق ہوتا کہ ہم لوگ رکھوالے کی نظر بچا کر درخت پر چڑھ جاتے۔ خوب پیٹ بھر کر موٹے موٹے پکّے بیر کھاتے اور جب دیکھتے کہ رکھوالا آوازیں لگاتا چیختا چلاتا دوسری طرف چلا گیا ہے تو ٹہنیوں سے تنے کی طرف آتے۔ نیچے اترتے اترتے دھم سے چھلانگ لگا کر غائب ہو جاتے۔

بڑی دیر تک حسین اور شیریں نظرت بیروں کو محبت کی نظروں سے دیکھتے رہنے کے بعد ہم جنگل میں نکل جاتے۔ وہاں جھڑبیریوں اور جنگلی بیریوں سے کھٹے اور میٹھے بیر توڑ کر کھایا کرتے۔ لیکن انہیں حاصل کرنے میں کئی کانٹے اس انداز سے ہمارے ہاتھوں کو چوم لیتے کہ ان سے خون بہنے لگتا صبح جا کر کہیں دوپہر کو کھانا کھانے کے وقت واپس آتے۔

جب رکھوالا کھانا کھانے کے لئے ایک آدھ گھنٹہ کو باغ سے غائب ہوتا تو ہم بڑے لڑکے سب کے سب ایک بیری پر چڑھ جاتے وہاں ہماری انگلیاں بجلی کی طرح کام کرتیں۔ چھوٹے لڑکے جو درخت پر نہیں چڑھ سکتے تھے آسمان کی طرف منہ اٹھائے ہوئے نیچے کھڑے رہتے اور ہمیں پکار پکار کر کہتے "بھائی کچھ ہماری طرف بھی پھینکو نا" ہم کسی موٹے سے بیر کی گٹھلی ان کے سر پر دے مارتے اور کہتے "یہ لو موٹا سا بیر"! یا ان پر کوئی خشک ٹہنی پھینک دیتے لیکن ہمیں اس جسارت کا موقع بہت ہی کم ملتا تھا۔

آخر ایک دن ایسا بھی آیا جب جنگل کی تمام جھڑبیریوں اور جنگلی بیریوں کی گودیں کھٹے میٹھے بیروں سے خالی ہو گئیں۔ اب ان سے کوئی کھٹمٹھا بیر حاصل کرنا اتنا ہی مشکل ہو گیا جتنا سمندر کی تہ سے موتی نکالنا۔ چنانچہ اب ہم نے بیر توڑنے کے لئے جنگل میں جانا بند کر دیا۔ اور بستی کی نواحی بیریوں ہی کو کلیجہ تھام تھام کر تکا کرتے۔

ایک دوپہر مجھے بہت تنگی پڑی۔ میں جنگل میں گیا کہ شاید جھڑبیریوں کی گھنی ٹہنیوں میں چھپے ہوئے کچھ بیر مل جائیں۔ لیکن تمام دوپہر کی آوارہ گردی کا نتیجہ صرف پانچ کھٹے بیروں کی صورت میں رونما ہوا۔ شام ہو چکی تھی اور میں کھیتوں سے ہوتا ہوا گھر واپس آرہا تھا۔ تکان سے میرا بند بند چور تھا۔ منہ خشک تھا۔ اور ہاتھ خالی۔ اور کپڑے کانٹوں سے الجھنے کی وجہ سے پھٹ گئے تھے۔

"آہا میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں" —— میرے منہ سے بے ساختہ یہ فقرہ نکل گیا۔ میرے سامنے کھیت کے کنارے بیری کا ایک نہایت ہی نفیس درخت تھا۔ جس کی سرسبز ٹہنیوں پر پکے پکے بیر لعل و زمرد کی طرح جڑے ہوئے تھے۔ میرے خیال میں یہ دنیا کا نفیس ترین درخت تھا

ہر شاخ دیکھنے والے کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوئے تھی۔ شام کی ہوا کے خنک جھونکے بار بار مجھ سے کہہ رہے تھے کہ "بیٹا چوری کرو، چوری!" دھر سورج بھی میرے لئے شفق کے زریں سمندر میں غوطہ لگانے کو تیار تھا۔ آہ شاید جنت کا سماں بھی اتنا حسین نہیں ہوتا!

میں نے چاروں طرف ایک نگاہ دوڑائی اور خدا کا نام لے کر جھٹ بیری پر چڑھ گیا۔ اس بلند قامت بیری کو چاروں طرف سے شیشم کے گھنے درختوں کے جھنڈ نے گھیر رکھا تھا۔ لیکن ساتھ ہی اس خیال سے میرے دل دھک دھک کرنے لگا کہ اگر رکھوالا آ گیا تو آنے والی کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔ مجھ پر اتنا خوف طاری ہوا کہ میں نے پورا پورا ارادہ کر لیا کہ درخت سے چھلانگ لگا کر بھاگ جاؤں "اپنی تباہی" کا بھیانک عالم مجھے صاف صاف نظر آ رہا تھا۔ گھنے پتوں میں سے مجھے اپنے گھر کی چھت نظر آ رہی تھی۔ مجھے اپنے چھوٹے بھائیوں پر رشک آتا تھا جو اس وقت گھر میں امن و امان سے بیٹھے تھے۔ مجھ پر رعشہ طاری ہونے لگا۔ لیکن جب دنیا کے بہترین بیروں پر میری نظر پڑی تو میں نے سوچا۔ خدا کارساز ہے ہمت نہیں ہارنی چاہیئے چنانچہ میں ایک بلند ٹہنی پر چڑھ گیا۔ بیروں کے پہلے خوشے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ آہ! میری جیب صرف ایک تھی۔ باقی جیبیں اماں نے سی دی تھیں۔ تاکہ میں انہیں کیوں۔ گول گول خوبصورت پتھروں، مٹی کے کھلونوں اور ندی کے کنارے سے اکٹھے کئے ہوئے گھونگھوں سے بھرپور نہ رکھا کروں۔ میرے لئے ایک جیب بالکل ناکافی تھی۔ خیر اُسے تو میں نے بیروں سے بھر لیا۔ اس کے بعد جھولی میں ڈالنے شروع کئے۔ اب بھی میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔

گہری شام ہو چکی تھی۔ میرا خوف کسی قدر کم ہو گیا تھا۔ کیونکہ دور کی چیز اب نظر نہیں آتی تھی۔ یکایک میں رعشہ براندام ہو گیا۔ بیری میرے پاؤں تلے سے نکلتی ہوئی معلوم ہوئی غضب ہو گیا تھا—کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دینے لگی—کوئی اس طرف آ رہا تھا۔ میں نے اپنی سانس روک لی۔ دم بخود ہو گیا۔ ہیں! یہ ایک تو نہیں دو آدمی تھے باتیں کرتے اس طرف آ رہے تھے۔

وہ نہایت آہستگی سے بول رہے تھے۔ میں نے ان کی آواز پہ کان لگائے۔ قدموں کی چاپ پھر سنائی دی اور بس۔ وہ کھڑے ہو گئے تھے خبیث! میں نے انگلی دانتوں میں داب لی۔ اب وہ نالائق عین میرے نیچے بیری کے تنے کے ساتھ آ بیٹھے تھے!

میں نے پتوں میں سے جھانکنے کے لئے اپنی گردن ذرا اکڑا لی۔ ایک آدمی تھا اور ایک لڑکی۔ وہ بازوؤں میں بازو ڈالے ہوئے تھے۔ اور ایک دوسرے سے آہستہ آہستہ کچھ کہہ رہے تھے۔ مجھے ان دونوں سے اتنی دلچسپی ہو گئی، اور میں ان کی دید میں اسقدر محو ہو گیا کہ رکھوالے کا خیال میرے دل سے بالکل جاتا رہا۔

اب تو کافی اندھیرا ہو چکا تھا۔ میں کھڑے کھڑے تھک گیا تھا میں نے سہارا لینے کے لئے اپنی پیٹھ ایک موٹے سے عمودی ٹہنے سے لگا دی اور آہستہ سے ٹانگیں پھیلا کر اگلی ٹہنیوں پر رکھ دیں۔ اگرچہ میں نے یہ سب کچھ نہایت احتیاط سے کیا پھر بھی ایک ننھی سی خشک ٹہنی آواز پیدا کرتی ہوئی ٹوٹ گئی۔ اگرچہ یہ آواز کوئی اتنی بلند نہ تھی تاہم نوجوان لڑکی ڈر کر اپنے محبوب سے لپٹ گئی۔ اور کانپتی ہوئی آواز میں بولی "تم نے یہ آواز سُنی؟ کون ہے"؟

اس کا محبوب اِدھر اُدھر ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ دوڑا کر بولا "کچھ نہیں تم خواہ مخواہ گھبرا رہی ہو"۔ اس نے اپنی محبوبہ کی گردن میں باہیں ڈال دیں۔ اور میں یہ نظارہ دیکھ کر اور بھی اور پُرلطف اندوز ہوتا رہا۔

یہ نظارہ بھی عجیب تھا۔ میں ایک درخت پر بیٹھا تھا جو میرا نہیں تھا۔ ایک عجیب الجھن میں مبتلا تھا۔ رکھوالے سے پٹ جانے کا اندیشہ بھی تھا، اماں کی گالیوں اور مار پیٹ کا خوف بھی۔ کیونکہ گھر سے نکلے مجھے دیر ہو چکی تھی۔ میرے کپڑے پھٹ چکے تھے اور خراش آ جانے کی وجہ سے ہاتھ سے خون بھی جاری تھا۔ یہ ایسے قصور تھے جو اماں مجھے کبھی معاف نہیں کر سکتی تھی لیکن اگر ایک طرف غم انگیز خیالات میرے دل کو افسردہ بنا رہے تھے تو دوسری طرف تفریح اور دلچسپی کا سامان بھی میسر تھا۔

میں نے ایک خشک شاخ توڑ کر لڑکی کے سر پر پھینکی۔ وہ تڑپ اٹھی جیسے اس کا جسم بجلی کے تار کو چھو گیا ہے (لیکن یہ بات میں نے اب سوچی ہے۔ اس وقت مجھے علم نہیں تھا کہ دنیا میں کوئی ایسی چیز بھی موجود ہے جسے بجلی کا تار کہتے ہیں) نوجوان بھی کسی قدر گھبرا گیا۔

اس نے اوپر نگاہ اٹھاتے ہوئے کہا "کوئی چوہا ہوگا"۔

میں نے اپنا کھیل جاری رکھا۔ نہایت ہی آہستگی سے میں نے منہ سے اُلو کی آوازیں نکالنی شروع کی۔ لیکن اس آہستگی سے کہ انہیں معلوم نہ ہو سکے کہ کدھر سے آ رہی ہے۔ اس کے بعد میں کبھی ایک درخت کی ٹہنیوں میں زور سے ایک بیر پھینک دیتا کبھی دوسرے درخت کی ٹہنیوں میں۔ جس سے "ٹک" کی آواز پیدا ہوتی۔

نوجوان ڈرتے ڈرتے بولا "تم ڈرتی کیوں ہو کوئی جانور وغیرہ ہے گھبرانے کی بات نہیں ممکن ہے بارش کا کوئی قطرہ گرتا ہو اور اسی کی وجہ سے پتوں میں آواز پیدا ہوتی ہو"۔

میں نے دل میں کہا "ہاں میاں بڑے عقلمند ہو۔ آسمان پر بادلوں کا نام ونشان بھی نہیں۔ تارے جھلمل جھلمل کر رہے ہیں اور تم کہہ رہے ہو بارش کے قطرے گر رہے ہیں"۔

لڑکی گھبرا کر بولی "اب میں جاتی ہوں۔ میں ایک سیکنڈ یہاں نہیں ٹھہر سکتی"۔

دونوں چند ہی قدم آگے بڑھے تھے کہ میں نے اپنے منہ سے ایک مہیب آواز نکالی۔ جو بیماری کے دنوں میں رات کو روتے ہوئے کتوں کی آواز سے بھی کہیں زیادہ مہیب اور ڈراؤنی تھی۔

لڑکی نے ایک چیخ ماری اور نوجوان سے چمٹ گئی۔ دونوں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے آگے نکل گئے۔

میں نے فاتحانہ انداز میں درخت سے نیچے چھلانگ لگائی۔ اور کھیتوں میں دوڑتا ہوا گھر آگیا۔

(فرانسسکو جاٹیسا) **مہدی علی خاں**

غزل

میری فضائے زیست پہ ناز سے چھا گیا کوئی
آنکھ میں آنکھ ڈال کے بندہ بنا گیا کوئی

مرگ وحیات کے مزے آہ دکھا گیا کوئی
آ کے ہنسا گیا کوئی جا کے رلا گیا کوئی

سجدۂ عشق کے لئے پائے صنم ضرور ہے
میری جبینِ شوق کو راز بتا گیا کوئی

مرے تصورات کا سحر عجیب سحر ہے
دیکھ ذرا دلِ حزیں دیکھ وہ آگیا کوئی

سب کی طرف نگاہِ لطف بزم میں تھی رواں دواں
ایک نظر میں بے کہے سب کو مٹا گیا کوئی

فطرتِ عشق کے نثار اس کو مرا خیال تھا
صدقے غرورِ حسن کے مجھ سے چھپا گیا کوئی

بہزاد لکھنوی

رباعی

اے مطربِ مہوش [illegible] نغمہ تیرا
[illegible] عالم پہ [illegible] تیرا
یا رب یہ کہکشاں کیا ہے
آغوشِ فلک میں [illegible] نالہ تیرا

سید [illegible] اعجاز

شاعر کا خواب

خموشی کی روپہلی اوس میں بھیگی ہوئی فطرت
چراغِ صبحگاہی رات کے جاگے ہوئے تارے
سکوں کی گود میں سوئے ہوئے خوابوں کے نظارے
دلِ ذرات میں انگڑائیاں لیتی ہوئی نکہت
شعاعوں کے سفینے، چاندنی کا بحرِ بے پایاں
دیارِ کہکشاں کے نور میں ڈوبے ہوئے جلوے
سنہری بربطِ ناہید کے جادو اثر نغمے
شباب و شعر کے منظر، بہار و حسن کے طوفاں
تبسم پھول کا، پاکیزگی حوروں کے سینوں کی
کلی کے دِل کی دھڑکن، دلکشی رنگین جمالوں کی
فرشتوں کا تقدس، سادگی فردوس والوں کی
جوانی ماہ پاروں کی، ادا زہرہ جبینوں کی
یہ ملتے ہیں تو اک خوابِ جواں بنتا ہے شاعر کا
یہی ذرے ہیں وہ جن سے جہاں بنتا ہے شاعر کا

تابش صدیقی

تارا چند جی سے ہندی کی چندی

ٹھیٹ اُردوییں

بابو جی۔ میں نے آپ سے جو باتیں کہیں وہ تو آپ کی سمجھ میں نہیں آئیں۔ اچھا مہاتما جی سے جو بات چیت ہوئی۔ کیا اسے بھی آپ نہ سمجھ سکے اس میں تو کوئی بات اٹھا نہیں رکھی تھی اور سب باتوں کو ایسے ڈھنگ سے ایک جگہ اکٹھا کر دیا تھا جسے ہندی کی چندی کرنا کہتے ہیں۔

مہاتما گاندھی سے باتیں کر کے اٹھا ہی تھا جو آپ کی لکھت ملی اس پر بھی کچھ لکھ لکھا کے بھیج دینا چاہتا تھا۔ پر یہ دھیان آیا جیسے جو لکھا جا چکا اس کا کیا ہوا جواب پھر کہی ہوئی باتوں کو دہرایا جائے اور کہی ہوئی باتوں کا دہرانا ایسا ہی ہے جیسے چبائے ہوئے نوالوں کا پھر سے چبانا۔

پھر گاندھی جی سے بات چیت والی لکھت کی ایک کاپی آپ کے "ہندوستانی" کے لئے بھیجی ہی جائے گی جسے جی لگا کے دیکھئے پر نہ سمجھی ہوئی باتیں آپ چاہیں گے تو سمجھ سکیں گے اور جو اس پر بھی کوئی گتھی نہ سلجھ سکی تو اُسے پوچھ پاچھ کے سلجھا دیا جائے۔ برابر سب کچھ ہونے پر بھی آپ تو ایسے ہو گئے جیسے کوئی انجان بن جاتا ہے۔

اپنے تئیں ہی "ہندوستانی" میں اسے آپ نے چھاپا تو۔ پر اس کا چھاپنا نہ چھاپنا ایک سا ہو کے رہ گیا۔ اچھا، برا، اَڑا، چھڑا کوئی فٹ نوٹ لکھنا کیسا آپ اس پر دو ڈھائی بول بھی نہ لکھ سکے۔ اُسے پڑھ کے آپ نے کیا کہا اس کی کتنی باتیں اچھی لگیں۔ اپنے جی میں آپ نے کیا سمجھنا کیا، یہ سب باتیں جاننا چاہتا تھا پر آپ کے چپ سادھنے سے کچھ بھی نہ جان سکا۔

جب تک اپریل کا ہندوستانی نہیں چھپا تھا یہ سمجھے ہوئے تھا مہاتما سے بات چیت والی لکھت کے چھپنے کی جب گھڑی آئے گی تو آپ اس پر کچھ نہ کچھ لکھیں گے۔ پر جب وہ چھپ چھپا کے سامنے آئی تو یہ دیکھ کر اچنبھا ہوا۔ آپ نے تو اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا اور چھوا تک نہیں۔ ساتھ ہی یہ دھیان بھی آیا کہیں ایسا تو نہیں آپ کسی ایسے جھمیلے میں پھنس گئے ہوں جس سے دو بول بھی نہ لکھے جا سکے اور اس سے چھٹکارا ملنے پر لکھنا لکھانا اُٹھا رکھا ہو۔ پر اپریل کے "ہندوستانی" کو چھپے پانچ چھ مہینے ہو چکے۔ اس پر کچھ لکھنا ہوتا تو لکھ لکھا کے آپ کب کا بھیج چکے ہوتے۔

جب دیکھا آپ کی چپ بڑھتی ہی چلی جاتی ہے تو نہ رہا گیا اور یہ چٹھی لکھنا پڑی۔ میں یہ نہیں کہتا جو میں کہہ رہا ہوں بے سوچے سمجھے اُسے آپ مان ہی لیں نہیں پہلے اسے سمجھ کی کسوٹی پر کسئے۔ ٹھیک اترے تو مانئے ٹھیک نہ دکھائی دے تو مجھے جھٹلائیے۔ کیسے؟ کیوں اور کس لئے کو ساتھ لے کر۔

ربڑ کو جتنا کھینچئے کھینچے گا اور چھوڑ دیجئے تو سکڑ سکڑا کے رہ جائے گا ایسا کھنچنا، سکڑنا، سمٹنا بڑی سی بڑی اور چھوٹی سی چھوٹی بات میں آپ دیکھ سکتے ہیں کسی بات کو جتنا بڑھائیے بڑھے گی اور جتنا گھٹائیے گھٹ گھٹا کے رہ جائے گی۔ اکڑ تکڑ اور کھینچ تان کرنے سے بات بڑھتی ہے اور بھلمنسات برتنے سے بڑھتی ہوئی بات دب دبا جاتی ہے۔

اسے دیکھ کے آپ کہہ سکتے ہیں میرا کہنا بھی تو یہی ہے۔ پر میرے اور آپ کے کہنے میں بہت بل ہے۔ میں جو کہتا ہوں "کیوں" "اور کس لئے" کا پورا دھیان رکھ کر اور آپ اسے چھوڑ کر۔

کہیں کہیں تو آپ اپنی لکھت کے ٹکڑے بھی دیکھ لیجئے۔ ایک جگہ آپ یہ لکھتے ہیں۔

"کیا ہندی مہا شاعری ہوتی ہے اور کیا اس کے شبدوں کے سمونے سے اردو ادھوری ہو جائے گی"

دیکھئے ہندی اتنی ہی ہینی جا سکتی ہے جتنی یہ اردو میں

مکمل کر کے اس کی ہوائی ہندی کے جتنے بول اردو میں پورے سما چکے اور ان اپنی جلد نکال کے ہم چکے وہ سب جیتے جاگتے ہیں۔ انہیں کوئی مرا ہوا نہیں کہہ سکتا۔ ان کو چھوڑ کر ہندی کے اور جتنے بول ہیں اپنی جگہہ وہ کیسے ہی کیوں نہ ہوں اردو میں تو انہیں گڈھب اور بھولا بسرا ہی کہا جائے گا۔ کھلنے والی چٹکتی ہوئی کلیاں اور مہکتے ہوئے پھول ہیں۔ اس کا سارا رس تو اب ہی کہاں آ سکتا ہے۔ پرانے چاول جتنا گھی اٹھانے ہیں نئے چاول اس کا آدھا بھی نہیں اٹھا سکتے تو جو ہندی کے بول اردو میں پورے سما چکے وہ سب اردو ہی کے ہو چکے اور کسی جتن سے بھی وہ اس سے الگ نہیں ہو سکتے۔ اب رہا ہندی کے نئے نئے بولوں کا اردو میں ٹھونسنا تو یہ وہی جھگڑا ہے جس پر ہیرے آپ کے لکھا پڑھی ہوئی اور ہو رہی ہے۔

میں نئے ٹھونسے ہوئے بولوں کو مرا ہوا کہہ رہا ہوں اور آپ جیتا جاگتا۔ کیوں اور کس لئے سے میں ان کا مرا ہوا ہونا دکھا رہا ہوں اور آپ کیوں اور کس لئے کو چھوڑ کر انہیں جیتا جاگتا کہنے پر اڑے ہوئے ہیں۔

عربی، فارسی، ہندی ان سب کے وہ ملواں بول جن سے اردو کا نکھار اور ابھار ہے۔ ان بولوں سے ہٹ کر اردو کے ملے جلے بولوں کو ان کی جگہہ سے ہٹا کر کسی بھاشا کے نئے بول اس میں بڑھانا اردو کو ادھ موا بنانا نہیں تو پھر اور کیا ہے۔

اپنی لکھت کا یہ ٹکڑا بھی دیکھئے:۔

"انیکتا، کولاہل، رکشا، سمبندھ اور دشا ایسے جن لفظوں کا
میں نے استعمال کیا ہے انہیں کون مرا ہوا کہہ سکتا ہے۔ ہماری
طرف تو آپ کسی شہر یا گاؤں میں چلے جائیں ہر پڑھا لکھا اور
ان پڑھ چاہے ہندو ہو یا مسلمان انہیں سمجھ لے گا۔"

کیا اچھا ہوتا جو اسی کے ساتھ ساتھ ان پڑھے لکھے مسلمانوں اور ہندوؤں کی لکھتوں کے دو ایک ٹکڑے ہی اپنی بات منوانے کے لئے آپ لکھ دیتے جو ان بولوں کو لکھتے اور بولتے ہیں۔

"ہماری طرف تو آپ کسی شہر یا گاؤں میں چلے جائیں" لکھنے کا یہ ڈھب بتلاتا ہے:۔ اپنے جی میں آپ نے مجھے یہیں کا سمجھ لیا اور آپ کے دھیان میں جب میں یہیں کا ٹھیرا تو پھر وہاں کی باتیں کیسے جان سکتا ہوں۔ سنئے:۔ دلی کب کی لٹ لٹا چکی۔ ایسے ہی لکھنؤ بھی کب کا اجڑ چکا۔ اب دکھن ہی ایک ایسی جگہہ رہ گئی ہے جہاں ہند سے باہر اور پورے دیس کے چوٹی کے لوگ ایک جاہ اکٹھے ہو گئے ہیں۔ بڑی سی بڑی راج دھانی میں جو جو باتیں ہونا چاہئیں وہ سب آپ یہاں دیکھ سکتے ہیں۔ ہندو مسلمانوں کا آپس میں مل جل کے رہنا، اُن کا اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا بول چال، بات چیت، پہناوا ایسا ایک سا ہے جو کوئی دوسرا انہیں دیکھے تو نہ پہچان سکے اور سب کو ایک ہی سمجھے پھر یہاں بھی جائے کہیں کپل کا کھٹکا تک نہیں۔ سات آٹھ برس کا لڑکا سڑکوں پر سونا اچھالتا چلا جاتا ہے اور کوئی آنکھ اٹھا کر بھی ادھر نہیں دیکھتا۔ بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا سب کو راج ایک آنکھ دیکھتا ہے۔ یہاں کی چہل پہل، گہما گہمی، پرماتما کی دیا سے دن دونی رات چوگنی ہے۔ جدھر منہ کیجئے راج کی دیا کی بہتی ہوئی گنگا دیکھ لیجئے اور جدھر آنکھ اٹھا کے دیکھئے دھن برستا دکھائی دے گا۔

ایشور راسے سنسار کی جونس اور اس کی اونچ نیچ سے بچائے اور دکھن کے راج میں اور چار چاند لگائے۔

ستر، اٹھارہ برس سے میں بھی اسی سکھ چین کی گھنی چھاؤں میں بیٹھا ہنس بول رہا ہوں۔ چوتھے، پانچویں برس اُدھر کا بھی پھیرا ہو جاتا ہے۔ بڑے بوڑھوں کا چھوڑا ہوا کچھ کھیتی باڑی کا دھندا بھی ہے جس کی دیکھ بھال کے لئے کبھی کبھی گاؤں میں بھی آنا جانا ہوتا ہے اور وہاں کی کوئی چھوٹی سی چھوٹی بات بھی ایسی نہیں جو ان آنکھوں سے چھپی ہوئی ہو تو پھر آپ کا یہ "ہماری طرف" کہنا کیسا اور آپ کے اس کہنے کو میں کیسے مان لوں۔ میں نے آج تک مسلمان تو مسلمان اُدھر کے کسی ہندو کو بھی ایسے بول بولتے نہیں سنا۔

یہاں کے رجسٹرار آفس میں اپنی جان پہچان کے کچھ لوگ الہ آباد کے بھی ہیں۔ یہ آپ کی لکھت انہیں بھی دکھائی۔ سب نے بڑے اچنبے سے اسے دیکھا اور یہی کہا:۔ برس کے برس اُدھر جانا آنا رہتا ہی ہے ہم نے تو اب تک ایسے بول کسی ہندو سے بھی نہیں سنے۔ اب کچھ دنوں سے یہ سُن رہے ہیں۔ اُدھر ایک بڑا جتھا ایسا اٹھا ہے جو اردو میں بھولے بسرے بولوں کی ٹھونس ٹھانس اور ان کے پرچار کے جتن کر رہا ہے۔ یہ اوپری بات ہے جو ڈھائی دن میں بھاشا کی ایسی کایا پلٹ ہو گئی ہو۔

آپ نے سن لیا۔ الہ آباد والوں نے کیا کہا تو اب بھی اپنی لکھت کے اس ٹکڑے کو:۔

"ہماری طرف تو آپ کسی شہر یا گاؤں میں چلے جائیں۔ ہر پڑھا لکھا اور اَن پڑھ ہندو ہو یا مسلمان انہیں سمجھے گا۔"

کیا آپ دہرائیں گے۔ ایکتا، کولاہل، شکشا، سمبندھ، ہتو، آشا، دشا، ابھیاس، نشچے اور ایسے بہت سے اور بھولے بسرے بول یو۔پی، اودھ اور ان جگہوں کے آس پاس رہنے والے آپ کے دھیان میں سب کے سب بولتے اور سمجھتے ہیں اور دوسروں سے بھی آپ یہی منوانا چاہتے ہیں۔ پر جن کے سامنے وہاں کا پورا سماں ہو وہ اسے کیسے ٹھیک مان لیں اور آپ کے دھیان کا ساتھ دینے کی کیسے حامی بھریں۔

آج کل کے ہندی پرچار والوں کو چھوڑ کر نئے پرانے اردو لکھنے والے ہندوؤں ہی کی لکھتوں میں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کے تھوڑے بہت بول تو آپ کو دکھانا چاہتے تھے۔ پر آپ ایسا نہ کر سکے۔

یہ بھی ایک نئی بات دیکھی۔ آپ ایک جگہ جو لکھتے ہیں آگے بڑھ کر وہ بات بھول میں پڑ جاتی ہے اور اس کا دھیان نہ رہنے سے آپ ایسی دوسری بات چھیڑ دیتے ہیں جس سے پہلی کہی ہوئی بات کچھ سے کچھ ہو کے رہ جاتی ہے۔ دیکھئے پہلے تو آپ نے یہ لکھا۔

"میں نے یہ نہیں کہا ہے کہ فارسی عربی کے وہ بول جو اب ہماری بولی میں گھل مل گئے ہیں نکال ڈالے جائیں۔ انہیں رکھئے اور ضرور رکھئے۔"

اس لکھت کو پورا کرتے کرتے دھیان بھٹک کے نہ جانے کدھر چلا گیا جو آپ یہ لکھنے لگے:۔

"اس آپس کی بول چال کی جو بولی ہے اس کا آپ کیا نام رکھیں گے میں تو اسے اردو یا ہندی یا ہندوستانی کسی بھی نام سے پکارنے کو تیار ہوں یہی وہ بولی ہے جس کا چوکھا رنگ مولوی سید ابوالحسن نے اپنی چٹھی میں دکھایا ہے"

اپنی لکھت کے ان دونوں ٹکڑوں کو آمنے سامنے رکھ کر دیکھئے اور بتائیے کیا ان میں کوئی گھٹ بڑھ اور الٹ پلٹ نہیں۔ کہیں آپ عربی، فارسی کے ملے جلے بول اردو میں سے نکالنا نہیں چاہتے اور ان کے نکالنے کی حامی نہیں بھرتے اور کہیں آپ لکھنے کے ایسے ڈھب کو جس میں عربی فارسی کے بول تو بول اگر، مگر، کہ، چونکہ، بلکہ، چنانچہ، حالانکہ، یا، وگرنہ، لیکن کا بھی کہیں پتا نہیں "چوکھا رنگ" کہہ کے سراہتے ہیں۔ سوجھ بوجھ والوں کو تو یہ بتانا نہ چاہیئے۔ اردو میں سے عربی۔ فارسی کے گھلے ملے بول نکالنا

نہ چاہئیں۔ کہنے کو تو یہ کہہ دیا۔ پر کیا وہی جو جی میں تھا تو پھر اسے دکھا دینا کہیں تو اور کیا کہیں۔

کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا بھان متی نے کنبا جوڑا اس کہاوت کو سچ کرنے کے لئے کہاں کہاں سے ڈھونڈ کے کڈھب بول کے بول اردو میں ٹھونسے جا رہے ہیں۔ دھیان اور رات دن کی بول چال سے جو بول کالے کوسوں پرے پڑے ہوئے ہوں چن چنا کے انہیں ایک جگہ اکٹھا کرنے کے جتن کئے جا رہے ہیں۔

اوروں کو آپ کیوں دیکھیں اپنے ہی کو دیکھ لیجے۔ کیا پہلے سے آپ اسی ڈگر پر چل رہے تھے۔ کیا آپ کے لکھنے کا پہلے یہی ڈھنگ تھا۔ "ہندوستانی" کا پورا فائل سامنے نہیں نہیں تو آپ کی ایک ایک لکھت کا پورا پورا پتا دیتا۔ اب اس کے جو دو تین نمبر سامنے ہیں انہی کو دیکھ لیجے ان میں آپ کی تین لکھتیں ہیں جن میں سے کسی میں بھی آشا، دشا، سکتنا، ویاکرن، ابھیاس، کابیہ، جیون، ہردے اور ایسے اور دوسرے بولوں کو آپ نے منہ نہیں لگایا۔

"مسلمانوں کا ہندوستان میں آنا۔ (ہندوستانی، جولائی ۱۹۳۳ء)

"تبصرے" (ہندوستانی، جولائی ۱۹۳۴ء)

"[illegible]" (ہندوستانی، جولائی ۱۹۳۵ء)

یہ تینوں لکھتیں آپ ہی کی ہیں اور جن بولوں کو جیتا جاگتا آپ کہہ رہے ہیں اُن کا ان میں کہیں پتا بھی نہیں تو اب آپ ہی کہئے ان بولوں کو مرا ہوا نہیں تو جیتا جاگتا کون کہہ سکتا ہے۔ انہیں جیتا جاگتا کہنے میں آپ سے یوں ہی سی کچھ چوک ہو گئی۔ آپ کو یہ کہنا چاہئے تھا یہ بول ہیں تو مرے ہوئے پر اب یہ جلائے جا رہے ہیں۔

آپ کی جن لکھتوں کا ابھی اتا پتا دیا اب کہیں کہیں سے ان کے لکھنے کا ڈھنگ بھی دیکھ لیجے اور ہو سکے تو اسے اپنی آج کی لکھت سے بھڑا کے جانچئے جولائی ۱۹۳۳ء کے ہندوستانی میں آپ کے لکھنے کا یہ ڈھنگ ہے:۔

"ان بیانوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے مغربی کنارے پر مسلمان اپنے مذہب کے قائم ہونے کے کچھ ہی دن بعد آ کر بسے اور ان کی تعداد، دولت اور طاقت بڑی تیزی سے بڑھی ہندوستان کے مشرقی کناروں پر بھی عربوں کی پرانے زمانے میں بہت قدر و منزلت ہوتی جب در راستے دسویں صدی عیسوی میں و جلد اور رات کے [illegible]

تو یہ عمارت بھی کے ہاتھوں کے ہاتھ لگی۔ ہندوؤں اور یہودیوں کی یادگاریں
کا ورثہ [illegible] قائم ہوئیں:

جولائی ۱۹۲۴ء کے ہندوستانی میں بھی اپنے لکھنے کا نمونہ دیکھئے:

عام کتابیں جن میں ادب و حکمت اور معاملات و معارف کا ایک گنجینہ
ہے۔ اس زمانے میں لوگوں کو اس سے استفادہ کا شوق
[illegible] اور مصنف تالیفوں سے اس کے فائدے عام بنانے
کی کوشش کی گئی ہے [illegible] کے علاوہ اگر
صرف اس کی شرحوں کا نام گنایا جائے تو ایک طویل فہرست
تیار ہو سکتی ہے [illegible] مضامین و کلمات [illegible]
اس کے نکات و دقائق کا مختلف حوالوں اور تقریبوں سے ذکر
ہوتا [illegible] اس سے فیض یاب و مستفیض ہونے کا کوئی
ذریعہ [illegible] نہیں کیا گیا [illegible] عام صفحوں میں انتساب و
مطالعہ کا جو [illegible] خاطر خواہ ادا ہو سکتا۔

جولائی ۱۹۲۵ء کے ہندوستانی میں آپ کی لکھت کا یہ ڈھب ہے:

"ایک زمانہ تھا جب انسان کے تصور میں آسمان ایک لامحدود
کرہ تھا جو ایک لا انتہا قوت کا مسکن تھا جہاں نور ازلی جلوہ فگن تھا۔
عقل کل [illegible] عشق و محبت [illegible] مسرت کا دور
دورہ تھا۔ وہ آسمان تھا جو اس عالم کے نو افلاک پر محیط تھا، ان سب
سے الگ اور اوپر تھا، دائمی سکون اور امن کا مقام تھا، تبدیلی
اور حرکت سے ماورا تھا۔ عالم کون و فساد اور کرّوں پر مشتمل تھا۔ کرہ
ارض عین مرکز میں واقع تھا اور اس کے فلک پر چاند حکومت کرتا تھا"

اچنبھا ہوتا ہے جو ایسا لکھ سکتا ہو اور جس کی اڑان اتنی اونچی ہو۔ وہ اتنا
نیچے اتر آئے اور یہ لکھنے لگے:

"اردو کے کلیور کو لیا رہے گئے" میرا بھی یہی نویدن ہے" اس کا
پورا بھیجئے تو جو کچھ آپس میں تھوڑا سا بھید ہے"۔ ان دو باتوں میں
ہے" مولوی صاحب کو ہندی کے لفظ کیسے جان پڑتے ہیں۔

اچھا یہ تو بتائیے یہ کیا بات ہے: میرے لکھنے کے ڈھنگ کو آپ
نے جو کھا رنگ کہا تھا تو اسے برا بھی ہوا اور اسی لئے اگر آپ بھی چلے ہوتے
تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ منہ سے تو جو کھا رنگ کہہ دیا پر اپنی لکھت میں اُسے
برت سکے۔

عربی فارسی بولوں سے آج کل کے ہندوؤں کی چڑ اور ان کی جگہ
اردو میں کڈھب بول ٹھونسنے دیکھ کر میں نے اس ڈھب کے کواڑ کھول دئے
تھے اور سمجھتا تھا، عربی، فارسی بولوں کے نہ ہونے سے آپ لوگ ادھر ہی آ
جائیں گے اور ادھر آنے سے ہو گا کیا۔ آئے دن کی تو تو میں میں اور نئی بھاشا
بنانے کی دوڑ دھوپ سے چھٹکارا بھی مل جائے گا اور نئے بولوں کی ڈھونڈ
ڈھانڈ کے لئے گھڑی گھڑی سنسکرت کی ڈکشنری بھی نہیں اٹھانا پڑے گی
سبھی بنائی بھاشا بیٹھے بٹھائے مل جائے گی اور نئی بھاشا بنانے کی ادھیڑبن
میں جو گھڑیاں کٹ رہی ہیں وہ ایسے کٹھن دھندوں میں کٹنے لگیں گی۔

ہمارے سامنے ہندوؤں کے دو جتھے ہیں۔ ایک وہ جو عربی فارسی
نہیں جانتا اس کو ہیرا پھیری کرنا نہیں آتا۔ اردو میں جو سنے اور جتنے بول بھی
ہیں سب کو یہ اپنے ہی یہاں کا سمجھتا ہے رہا دوسرا جتھا جو کچھ نہ کچھ عربی،
فارسی جانتا ہے وہ بات بات میں ہیرا پھیری کرنے کا راگ الاپتا رہتا ہے اور
جب کچھ لکھنے لکھانے کے لئے بیٹھتا ہے تو ڈھونڈ ڈھونڈ کے عربی فارسی
کے گھلے ملے بول اردو میں سے نکالتا اور کاٹ چھانٹ کے ان کی جگہ نئے
نئے کڈھب بولوں کو دے دیتا ہے۔ دھیان نہ رہنے سے بدیسی بولیوں
کے بول لکھت کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ لکھ چکنے پر اس کی جانچ پڑتال
کی جاتی ہے اور جانچنے میں جو بدیسی بول ملتے جاتے ہیں انہیں نکال ڈالا
جاتا ہے۔ جیسے کسی نے لکھنے کی دھن میں یہ لکھ دیا: "آپ کا حال کیا ہے؟
آپ سے امید ہے" جانچ کی کسوٹی پر کسنے میں "حال" لکھا ہوا دیکھ کر دھیان
آیا "حال" "احوال" "حالت" یہ بول تو عربی ہیں یہ دھیان آتے ہی اسے کاٹ کر
"دشا" کا کڈھب بول اس کی جگہ جڑ دیا "امید" کو پرکھا تو فارسی بول دکھائی
دیا۔ اس پر بھی ناک بھوں چڑھائی اور جھٹ سے اس جیتے بول کو بھی کاٹ
کوٹ کے اس کی جگہ مرا ہوا بول "آشا" رکھ دیا۔ آج کل یہی ڈھنگ چل پڑا
ہے اور بہت سے ہندو اسی میں لگے ہوئے ہیں۔

آپ لکھتے ہیں:۔ "میرا نویدن بھی یہی ہے" نویدن کی جگہ "مقصد"
"مدعا" لکھا جا سکتا تھا اور کون سے اچنبھے کی بات ہے جو پہلے ہی لکھا ہو
اور پھر کاٹ کے نویدن بنایا ہو۔ "مقصد" "مدعا" یہ وہ بول ہیں جنہیں ان پڑھ
بھی سمجھتا ہے اور جو ان بولوں کو عربی ہونے سے آپ نہیں لکھنا چاہتے
تھے تو ٹھیٹ اردو کا بول "کہنا" نویدن کی جگہ لکھا جا سکتا تھا اور "میرا بھی
یہی کہنا ہے"۔ آپ کی لکھت کا یہ ٹکڑا یوں ٹھیک ہو سکتا تھا۔ پر آپ کو "نویدن"
کے لئے جگہ نکالنی تھی اور جیسے بھی بن پڑا آپ نے نکال ہی لی۔ ایسے ہی
عربی فارسی کے گھلے ملے بولوں کو اردو میں سے نکال کر "شبد"، "کلیور"،

جیون، بیورا، ویاکرن جیسے نئے نئے بولوں کو جگہ دی گئی ہے۔ بھارتی لوکا تھا جس کو پھر وہی بات ادیدا کے کی

دیکھیے۔ اردو لکھنے کے دو ہی ڈھب ہو سکتے ہیں:۔ پہلا یہ ہے عربی، فارسی، ہندی کے وہ بول جو اردو میں گھل مل گئے ہیں۔ ان سب کو ملا جلا کے جو لکھنا لکھانا ہو وہ لکھا جائے۔ دوسرا ڈھنگ وہ ہے جسے ٹھیٹ اردو کہتے ہیں اور اسی ٹھیٹ اردو میں پہلے آپ کو پھر مہاتما جی اور پنڈت جواہر لال نہرو کو لکھا جا چکا اور اسی ڈھچر پر پھر آپ کو لکھا جا رہا ہے۔ آپ نے ان دونوں کو چھوڑ کر لکھنے کا ایک نیا ڈھب یہ نکالنا چاہا ہے جس میں جگہ جگہ بھونڈے بسرے بولوں کی بھرمار ہو اور گھسے ملے بولوں کی جان بوجھ کے کاٹ کوٹ کی گئی ہو۔

کیا آپ نہیں جانتے کسی بھاشا میں نئے نئے بول کب اور کس لئے بنائے جاتے ہیں۔ دیکھئے جب رات دن کی بول چال، بات چیت سامنے کے بول کسی بات کو جوں کا توں نہ دکھا سکیں۔ جیسے کسی دوسری بھاشا کی کوئی لکھت آپ اپنی اردو میں لانا چاہیں اور اس دوسری بھاشا کی وہ لکھت جسے اردو کے کپڑے پہناتے چلے ہوں اس میں کچھ ایسی گتھیاں جانیں جو اردو کے لئے بھول بھلیاں ہوں اور اس کی بول چال کے گنے چنے بول اس لکھت کے بھید کو نہ کھول سکیں تو جب اس بھید کو کھولنے اور چھپی ہوئی باتوں کو لیپ دکھانے کے لئے جیسے ہاتھوں کی لکیریں دکھائی دیتی ہیں سوچ ساچ کے نئے نئے بول بنانا اور بڑھانا پڑیں گے۔ اس سے ہٹ کر نئے بولوں کے گھڑنے کی کوئی جگہ ہی نہیں۔ جو سے اور جتنے ملواں بول چلے آ رہے ہیں انہیں یوں ہی رکھا جاتا ہے اور ان میں کچھ بھی گھٹ بڑھ نہیں کی جاتی۔ نہ جانے بیٹھے بٹھائے یہ کیا سوجھی ہے جو سامنے کے بولوں کو چھوڑ چھاڑ کے کڈھب بولوں پر لوگ ریجھے ہوئے ہیں۔

اردو ہی ایک ایسی بھاشا ہے جو پورے دیس میں تھوڑی بہت سب جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ نہ آپ کی یہ نرالی اور انوکھی بولی۔ میری پہلی چٹھی کے اس ٹکڑے کو لکھ کر آپ یہ لکھتے ہیں:۔

”اردو کی جگہ ہندی کا شبد رکھ دیجئے تو ہندی والوں کا بھی یہی کہنا ہے۔“

رکھنے کو کیا ہے جو جی چاہے اردو کی جگہ رکھ دیجئے۔ پر سوچ بچار کی آنکھوں سے دیکھئے تو اردو کا بول اٹل دکھائی دے گا جو اپنی جگہ سے ہٹ نہیں سکتا اور کوئی دوسرا بول اس کی جگہ لے نہیں سکتا۔ دیس کی چھوٹی بڑی بولیاں جتنی بھی ہیں ان سب کو الگ تھلگ دیکھ چکنے پر جب آپ اردو کو پرتالیں گے تو یہ بل کھلا ڈلا دکھائی دے گا۔

کسی بھاشا کے پھیلاؤ کو کیسے جانچتے ہیں۔ ان پڑھ گاؤں والوں اور گنواروں کی بات چیت کا کیا ڈھنگ ہے۔ عربی، فارسی کے بگڑے بگاڑے بولوں کو یہ کس فراٹے سے بولتے چالتے ہیں۔ دیس کی بولیوں میں سے مرہٹی میں عربی، فارسی کے بگڑے ہوئے بولوں کی کیسی ریل پیل ہے۔ گاندھی جی کی چٹھی میں یہ سب باتیں لکھی جا چکی ہیں۔ اس چٹھی کو نہ دیکھا ہو تو دیکھئے اور جو دیکھ لیا ہو تو پھر دیکھئے۔

اپنی اس لکھت میں ایک جگہ آپ نے یہ بھی لکھا ہے:۔

”جس طرح مولوی صاحب ہندی کے لفظوں کو سن کر کان میں انگلی ڈالتے ہیں اسی طرح پنڈت جی اردو کے چٹ پٹے شبد سن کر آپ کا منہ تکتے ہیں۔“

آپ سے یہ کس نے کہہ دیا۔ بھلا ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ دونوں باتیں بھی ٹھیک نہیں۔ نہ ”مولوی صاحب“ ہندی بولوں کو سن کر کانوں میں انگلیاں دیتے ہیں اور نہ پنڈت جی اردو کے چٹ پٹے بول سن کر کسی کا منہ تکتے ہیں۔ ہندی کے وہ بول جنہیں نہ کبھی اردو نے سنا اور نہ کبھی دیکھا ایسے ہی بھونڈے بسرے بولوں کو سن کر ”مولوی صاحب“ کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں اور وہ بول جو اردو میں گھل مل چکے انہیں سن کر کون ناک بھوں چڑھا سکتا ہے۔

رہا پنڈت جی کا منہ تکنا اس کے لئے میری پہلی چٹھیوں کو دیکھئے جن میں بہت سے پنڈتوں کی لکھتوں کا اتا پتا دیا جا چکا ہے۔ ان پنڈتوں کی لکھتوں کا وہی ڈھنگ ہے جو مسلمانوں کے لکھنے کا۔ پنڈت جی کتر کے کہیں سے الگ نہیں ہوتے اور اسی ڈھرے پر چلے جا رہے ہیں جس پر مسلمان۔ تو پنڈت جی کا منہ تکنا تب آپ کہہ سکتے تھے جب پنڈت جی اپنی لکھت کا ڈھچر مسلمانوں سے بچ بچا کے الگ رکھتے اور لکھت کی پگڈنڈی پر مسلمانوں کے ساتھ ساتھ کبھی نہ چلتے۔

دیس کی کسی بات کا ٹھیک ٹھیک موتہ ہو جو بھی ہو آپ بھاشا کی دیکھ بھال، جانچ پرتال کیجئے۔ اس کا آگا تاگا لیجئے آپ کو کوئی روکتا نہیں۔ پر یہ تو بتا دیجئے یہ سب کھٹراگ کس لئے۔ ہندی پرچار کو بدھ بدھ آٹھ دن بھی تو ابھی نہیں ہوئے۔ اس سے پہلے کیا ہو رہا تھا۔ دیس کونسی بولی بول رہا تھا۔ لکھت پڑھت کیسے کی جا رہی تھی۔ دیس والے کیسے

برت سکتے تو جو ہونا تھا ابھی اُسے ہی رہنے دینے میں کونسا گھاٹا اور ٹوٹا تھا۔ پرانی ڈگر چھوڑنا کیوں اور نئی بنانا کس لئے۔ کیا پرانا ہونا کوئی بری بات ہے اور جو کسی بات سے بچنا اس کے پرانے پن ہی سے مان لیا جائے تو سینکڑوں ایسی باتیں ہیں جنہیں ان کے پرانے پن سے چھوڑ دینا چاہئے۔ پر کیا وہ چھوڑی جا سکتی ہیں۔

حیدرآباد دیس کے دو نام ہیں ایک ہندو اور ایک مسلمان۔ انہیں دونوں ہاتھوں نے مل کر اردو کی ایسی موہنی مورت بنائی جسے آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔ یہ بھاشا کسی ایک کی بنائی ہوئی نہیں تو ہندو، مسلمان کے میل ملاپ سے اردو بنی، پلی، بڑھی اور پھیلی۔ یہ آگے بڑھ ہی رہی تھی جو اس کا سہارا دینے کے لئے دکھن کی عثمانیہ یونیورسٹی اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کا ساتھ دینا اردو کے لئے ایسا ہوا جیسے سونے پر سہاگہ یہاں کے راج نے کروڑوں کی لاگت سے اردو یونیورسٹی اور لاکھوں کی پونجی اور سے اس یونیورسٹی کے لئے ایک بڑی اکیڈمی بنوائی جس میں یورپ کی کٹھن سے کٹھن لکھتوں پر لکھتیں اردو کے اچھے سے اچھے کپڑے پہنتی چلی جا رہی ہیں اور یہاں کی راج دھانی نے سہارا دے کر اردو کو ایسی اونچی جگہ پہنچا دیا جہاں بڑی بڑی بھاشاؤں کی سبھا جمی ہوئی ہے تو ایسی اردو جو سارے دیس پر چھا جانا چاہتی ہے۔ اسے چھوڑ چھاڑ کے آپ ایک نئی بھاشا بنانے میں لگے ہوئے ہیں۔

اچھا اب اردو کو ایک اور ڈھب سے جانچ کے دیکھئے۔ بنگال، گجرات، مدراس ان تینوں جگہوں کی بولیاں دیس کی بڑی بولیوں میں گنی جاتی ہیں۔ کوئی بنگال کا رہنے والا مدراس پہنچ کر اپنی بنگلہ بھاشا میں وہاں والوں سے بات چیت کرنے لگے تو کیا اس کا ایک بول بھی مدراس والے سمجھ سکیں گے؟ ایسے ہی مدراس اور گجرات والوں کی بولیاں کیا بنگال کے رہنے والوں کی سمجھ میں آ سکیں گی؟ ہند کی چھوٹی بڑی بولیوں میں سے جونسی بولی بھی لیجئے وہ پہلے سے جس جگہ بولی جا رہی ہے وہیں بولی جائے گی۔ اس ٹکڑے سے آگے بڑھنے پر اس کا بولنا تو بڑی بات ہے کوئی اس بولی کو سمجھ بھی نہیں سکتا۔ یہاں کی پوری بولیوں میں سے اکیلی اردو ہی ایسی ہے جو پورے دیس میں تھوڑی بہت بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اردو بولنے والا دیس کے کسی ایسے ٹکڑے میں بھی چلا جائے جہاں یہ بھاشا نہ بولی جاتی ہو۔ اس پر بھی وہاں والے کچھ نہ کچھ اردو بات چیت سمجھ ہی لیں گے۔

جونسی بھاشا بھی ہو پہلے اس کا پھیلاؤ بھی دیکھا جاتا ہے اور اسی پھیلاؤ سے اس کے بڑے پن کا پتہ چلتا ہے۔ آپ نے دیکھا جو پھیلاؤ اردو کا ہے وہ یہاں کی اور کسی بولی کا نہیں تو پھر اردو ہی دیس کی بھاشا ٹھیر سکتی ہے۔ اس پر کہہ سکتے ہیں۔ ہندی بھاشا بھی تو ایسی ہی ہے۔ پر۔ آپ کا یہ کہنا تب ٹھیک سمجھا جائے گا جب آپ کسی ایسی جگہ کا پتہ دے سکیں۔ جہاں ٹھیٹ ہندی بولی جاتی ہو اور جس میں عربی فارسی کے بولوں میں سے ایک بول بھی نہ ہو اور وہاں کے لوگ فراٹے سے ٹھیٹ ہندی ہی بولتے ہوں۔ گاؤں والے اپنی بات چیت میں عربی فارسی کے جو سینکڑوں بگڑے ہوئے بول اٹھتے بیٹھتے بولتے ہیں۔ ان کی یہ بول چال ہندی نہیں کہی جا سکتی اسے بگڑی ہوئی اردو کہا جائے گا۔

آپ سے یہ باتیں کہہ ہی رہی تھیں جو پنڈت جواہر لال نہرو کی چھپی ہوئی لکھت پہنچی۔ سے ادھر اُدھر سے اور الٹ پلٹ کے دیکھا۔ یوں تو یہ لکھت اچھی اور بہت اچھی ہے۔ پر کہیں کہیں اس میں کچھ باتیں ادھوری رہ گئیں اور کہیں کچھ لکھنے سے چھوٹ گئیں۔ پھر، پنڈت جی جو بھی پوری بنانا چاہتے ہیں وہ کٹھن ہے۔ اردو، ہندی جھگڑا چکانے کے لئے میرے دھیان میں دو باتیں ہیں جو کچھ کٹھن نہیں۔ سب کا ایکا ہو جائے تو پھر اس جھگڑے مٹنے کا کہیں پتہ بھی نہ لگے۔ عربی، فارسی کے من من بھر کے بول ہندوؤں کو اچھے نہیں لگتے اور اسی پر وہ اینٹھے ہوئے ہیں ایسے ہی ہندی کے کڈھب بولوں کو مسلمان ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتے اور اسی پر ان کی تیوری چڑھی ہوئی ہے تو جھگڑا اتنا ہی ہے۔ آپس کی اس تن بھن اور اکڑ بکڑ کو الگ کر کے آپس میں میل ملاپ کے پینگ یوں بڑھا سکتے ہیں:۔

پہلی بات

(۱) ہندوؤں اور مسلمانوں میں سے ایسے لوگوں کو چن لیا جائے جو بَت بنے اور جھگڑالو نہ ہوں، بات کی تُو تُو کرنے کو برا جانتے ہوں، دیس کا پریم ان کی گھٹی میں پڑا ہو میل ملاپ کے رسیا ہوں اور سب سے بڑھ کر وہ لٹریچر اور بھاشا کا اتار چڑھاؤ اور اس کی اونچ نیچ دیکھنے کی پوری سمجھ رکھتے ہوں اور ایسی باتوں کو پورا پورا جانچ پڑتال سکتے ہوں سب کے سب دُھن کے پکے اور بات کے پورے ہوں۔ دونوں جتھوں میں سے ایسے سوجھ بوجھ والوں کو الگ کر کے اور انہیں ملا کے ان کی ایک پوری کمیٹی بنالی جائے جس میں یہ بھاشا کی نیا پار لگانے والے

ایک جگہ مل کے بیٹھیں جو ایک کہے دوسرے اُسے کان دھر کے سنیں جو سچی بات ہوتی ہے وہ آپ دل میں گھر لیتی ہے۔ ٹھیک بات کے ماننے میں کبھی ہٹ دھرمی نہ چاہئے اس کا کہنے والا چاہے کوئی کیوں نہ ہو اور جو ٹھیک نہ ہو تو جب بھی جو کچھ کہنا ہو وہ ایسے ڈھب سے کہا جائے جس کا سننا دوسروں کے لئے دوبھر نہ ہو جائے سب سے پہلے اردو کی جو جو لکھتیں ابھی سے اچھی مانی جا رہی ہیں (جیسے سرسید، آزاد، حالی، شبلی، نذیر احمد کی لکھتیں) انہیں سے کر ہندوؤں سے کہا جائے:۔ ان لکھتوں میں سے عربی، فارسی کے جتنے اور جتنے بول آپ لوگوں کو بھونڈے اُبھرے دکھائی دیں۔ ان سب کی ایک لسٹ بنالی جائے اور ساتھ ہی عربی، فارسی کے کڈھب بولوں کی جگہ بھرنے کے لئے اپنی ہندی میں سے ایسے گھلے ملے بول چھانٹ کے کمیٹی کو بتائے جائیں جنہیں مانا جاسکے۔ ایسے ہی ہندی کے جن کڈھب بولوں پر مسلمان ناک بھوں چڑھاتے ہیں، اُن سب کو ایک جگہ لکھ کے ان کی پوری لسٹ بنالیں اور اسی کے ساتھ بھونڈے بسرے ہندی بولوں کی جگہ بھرنے کے لئے عربی، فارسی کے گھلے ملے بول لکھ کر کمیٹی کو دکھائیں۔

تو ہندو اپنی جگہ عربی، فارسی کے بھونڈے اُبھرے بولوں کی پوری لسٹ بنانے کے ساتھ ان بولوں کی جگہ رکھنے کے لئے ہندی کے ملے جلے بول لکھ لیں گے اور مسلمان اپنی جگہ ہندی کے کڈھب بولوں کی لسٹ بنا چکنے پر ان بولوں کی جگہ برتنے کے لئے عربی فارسی کے گھلے ملے بول لکھ لکھا کے کمیٹی کے سامنے رکھ دیں گے۔ اس ڈھنگ سے پھیلا ہوا جھگڑا سمٹ سمٹا کے تھوڑی سی جگہ میں آجائے گا اور اب اتنی ہی بات رہ جائے گی جو کمیٹی پورے سوچ بچار سے ایک ایک بات کی پوری چھان بین کر کے یہ جھگڑا ایسا چکا دے جس کو ٹھنڈے جی سے دونوں جتھے والے مان لیں اور اس مانی ہوئی بات میں پھر کوئی کتر بیونت اور گھٹ بڑھ نہ ہو سکے۔ ہندو، مسلمان اپنی اپنی جگہ سچائی کے ساتھ پورا پورا سوچ بچار کر چکنے پر آمنے سامنے جب کمیٹی میں بیٹھیں گے تو پھر آپس میں ایک کو دوسرے کی کہی ہوئی سچی اور اچھی بات مان لینے میں کوئی جھجک اور کچھ ڈر نہ رہے گا۔

یہ جھگڑا دو تین کمیٹیوں میں نہیں نبٹ سکتا، اس کے لئے کمیٹیوں کا جال بچھانا پڑے گا۔ جب تک ہندو اور مسلمان دونوں مل کے کسی بات کے ماننے کی حامی نہ بھر لیں تب تک بیچ میں کچھ کچھ دن چھوڑ کے یہ کمیٹیاں یوں ہی ہوتی رہیں۔ ایک کمیٹی سے دوسری کمیٹی تک پورے سوچ بچار کے لئے بیچ میں پندرہ دن، مہینہ، سوا مہینہ جو بھی کمیٹی کہے وہی رکھا جائے۔ اس ڈھب سے اردو، ہندی جھگڑا مٹ مٹا کے رہ جائے گا اور اس ڈھنگ سے اس کی بڑھتی ہوئی لے دب دبا جائے گی۔

دوسری بات

اب تک جو بھی ہو رہا تھا یہ دھیان کر کے اسے یوں ہی چھوڑ دیا جائے۔ "ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا" آج کی باتوں پر سنسار کا جیب سادھنا آج ہی کے لئے ہے۔ یہی اس کی چُپ کل کوئی نہ کوئی سمجھوتا سامنے لے ہی آئے گی۔ یہ باتیں بہت پھیلاؤ چاہتی ہیں جن کے لئے یہاں جگہ نہیں نکل سکتی۔ جی چاہا تو اس پر بھی کبھی لکھوں گا۔

اب تک ٹھیٹ اردو لکھتا رہا اور اس ڈھب کے کواڑ میں نے ہی کھولے تھے اور اب میں ہی انہیں بھیڑے دیتا ہوں۔ انہیں کیوں کھولا تھا اور کس لئے بھیڑا جا رہا ہے یہ کوئی بھید نہیں جو آپ سے چھپا ہوا ہو تو اب جو لکھنا لکھانا ہوگا عربی، فارسی، ہندی ان سب کو ملا جلا کے لکھوں گا جیسے اس سے پہلے لکھا کرتا تھا۔

سید ابوالقاسم

شعر

اگر جینا ہے دنیا میں تو یہ توقیر پیدا کر
کہ تیرا ہر نفس اک مستقل افسانہ ہو جائے

غزل

رازِ چشمِ میگوں ہے کیفِ مدّعا میرا
غیر کی نظر سے ہے دُور میکدہ میرا

واسطہ کی خوبی نے سہل منزلیں کر دیں
حُسن عشق کا رہبر عشق رہنما میرا

کر دیا مجھے بے خود اُن کی بے نیازی نے
کہہ رہا ہوں خود اُن سے۔ "دل سنبھالنا میرا"

ہائے خوفِ بدنامی۔ وائے فکرِ ناکامی
بے وفا کے ہاتھوں میں حاصلِ وفا میرا

لطفِ خلوت و جلوت ہم نہ پا سکے لیکن
دُھوم ہر طرف اُن کی ذکر جا بجا میرا

طرزِ والہانہ کی داد کب ملی مجھ کو
نازِ دوست کب نکلا صُورت آشنا میرا

سوچنے لگے گی کچھ تیری خوش نگاہی بھی
رائگاں نہ جائے گا یونہی "دیکھنا" میرا

مَیں نے جب کبھی دیکھا سر جُھکا لیا تُو نے
تُو نے جب کبھی دیکھا۔ دل تڑپ گیا میرا

عُشرت حجاب" از خود چارہ سازِ دل کیا ہو
ساز ہو جب اے ظالم! سوز آشنا میرا

میری خستہ حالی نے سعیٔ خود شناسی کی
اُن کی خود نمائی نے جب کیا گلہ میرا

ہے جو حضرتِ منظور اعتبارِ این و آں
اِذنِ بے خودی لے کر پوچھے پتا میرا

علی منظور حیدرآبادی

سنیاسی

"شاما! آج تم اتنے چپ کیوں ہو۔ کچھ باتیں نہیں کرتے تو باجا ہی بجاؤ" اس کے ایک ساتھی نے کہا۔

"جب دیکھو باجے کی فرمائش" شاما نے ترشی سے کہا۔ "آج میرا جی نہیں چاہتا"۔

شاما نے بیس سال ہوئے سنیاسی کی زندگی اختیار کر لی تھی۔ اس سے قبل وہ اچھا تعلیم یافتہ آدمی تھا۔ اور دنیا کے جھگڑوں میں دوسروں کی طرح پھنسا ہوا تھا۔ لیکن جوانی میں ہی اس کے عادات و خصائل اپنے ساتھیوں سے بالکل مختلف تھے۔ اس نے بہت کوشش کی کہ ایمانداری اور سچائی کی زندگی بسر کرے۔ مگر تجربہ کے بعد ایسا معلوم ہوا کہ دنیا میں وہ کرا ایسا کرنا ناممکن ہے۔ جب کبھی وہ ایمانداری سے کسی کے ساتھ پیش آتا تو لوگ اسے ضرور دھوکا دیتے۔ آخر وہ شہر کی زندگی سے تنگ آ گیا۔

ایک دن وہ اپنا ستار لے کر جنگل کی طرف چل کھڑا ہوا اور شہر سے دور ایک جھونپڑی بنا کر رہنے لگا۔ وہ جنگلی پھلوں پر اپنا گزارا کرتا اور رات کو وحشی جانور اس کے ہمسایہ ہوتے۔ ابھی وہ ایک مہینہ بھی آرام سے نہ رہنے پایا تھا کہ اس کے سات اور دوست بھی اس کے ساتھ آ کر شامل ہو گئے۔ دن بھر وہ لوگ قدرتی مناظر سے لطف اٹھانے اور جنگلی پھل چننے میں گزارتے۔ اور شام کو وہ جھونپڑی میں جمع ہو کر شاما کے گرد بیٹھ جاتے اور وہ ان کو ستار سنایا کرتا۔ اس طرح بیس سال گذر گئے۔ مگر شاما کو کبھی اپنا وطن یا رشتہ دار یاد نہ آئے۔ بلکہ بستی میں جانے کے نام سے اسے وحشت ہوتی تھی۔ اس کے خلاف اس کے ساتھیوں کی یہ حالت تھی کہ اب تک شہر نہ بھولے تھے۔ وہ اپنی بیس سال پہلے کی زندگی کو یاد کر کے مزہ لینے لگتے۔ مگر شاما کو ان کی ان باتوں سے سخت کوفت ہوتی تھی۔ وہ گھبرا کر اپنا ستار بجانے لگتا۔ اور وہ لوگ اپنی سب گپیں بھول کر باجا سننے میں مشغول ہو جاتے۔ اس طرح بیس سال گذر گئے۔ ان کے خیالات اور طرز معاشرت میں کوئی نمایاں فرق ظاہر نہیں ہوا۔

آج شام وہ حسب دستور آگ کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ ہر ایک اپنے اپنے خیالات کے سمندر میں غوطے کھا رہا تھا۔ جھونپڑی کے باہر بھی اسی قسم کی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سب پرندے رات کی تاریکی سے ڈر کر اپنے اپنے گھونسلوں میں جا چھپے تھے۔ اب ان کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ تک کی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

اس خاموشی کو گھوڑے کی ٹاپ کی آواز نے توڑا۔ پھر کسی نے جھونپڑی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ سب ایک دوسرے کو پر معنی نظروں سے دیکھنے لگے۔

"آج سنسان رات میں یہ کون نازل ہوا" ایک نے اپنے ساتھ والے سے آہستہ سے کہا۔

"تم دروازہ کھولو تو خود ہی معلوم ہو جائے گا" شاما نے کہا۔

آخر ان میں سے ایک نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سڑے ہوئے پتوں اور جنگلی پھلوں کی ہلکی سی بو جھونپڑی میں داخل ہوئی۔ ایک شکاری اندر آیا۔ خوب طول ڈیل میں۔ نے ایک بھاری بندوق اٹھائی ہوئی تھی۔ اس کی ظاہری حالت سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی اچھے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس نے ایک گہری نظر ان سب پر ڈالی اور شاما سے کچھ دور ایک سادھو کے ساتھ بیٹھ گیا۔ وہ بہت دیر تک اس طرح خاموش بیٹھا رہا۔ مگر ان میں سے کسی کو اتنی ہمت نہ ہوئی کہ اس سے کچھ سوال کریں۔ "خوب آدمی ہے"۔ ان سب نے ایک دوسرے کے کان میں کہا۔

"تم کہاں سے آئے ہو بیٹا اور اس خوفناک جنگل میں اتنی رات گئے کیا کرتے رہے" شاما نے پوچھا۔

"یہاں میں شکار کے لئے آیا تھا بابا" شکاری نے شاما کو گھورتے ہوئے کہا "اسی دھن میں رات ہو گئی۔ دور سے تمہاری جھونپڑی کا چراغ ٹمٹماتا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے سوچا کہ تمہارے پاس کچھ کھانے کو مل جائے گا اور کچھ آرام بھی کر لوں گا"۔

"ہاں بیٹا کیوں نہیں"۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ اور کچھ جنگلی پھل اور ایک پیالے میں پانی لاکر اس کے سامنے رکھ دیا۔

کھا لینے کے بعد شکاری جھونپڑی کی بوسیدہ دیوار سے ٹیک لگاکر چپ چاپ بیٹھ گیا۔

"کچھ یہ تو بتاؤ کہ آجکل شہر میں کیا ہو رہا ہے؟ وہاں کے لوگوں کا اب کیا حال ہے؟" شاما نے آخر خاموشی کو توڑا۔

"کیا کہا بابا! کچھ شہر کا حال سناؤں! شہر کا تو کچھ مت پوچھو۔ روز بروز انسان کی حالت بدتر ہوتی جا رہی ہے۔ لوگوں میں شرافت تو نام کو نہیں رہی۔ دھوکے دے کر لوگوں سے روپیہ لے لینا، جھوٹ بولنا تو ایک معمولی بات ہے۔ جو لوگ کہ اپنے آپ کو شریف سمجھتے ہیں اور کہلاتے ہیں وہ ایسی بلائیں ہیں۔ جھوٹے وعدے کرنا۔ جھوٹی تعریفیں کرنا تو ان کی نظروں میں کوئی گناہ ہی نہیں۔ اصل یہ ہے کہ شہر رہنے کے قابل جگہ نہیں رہی"۔ شکاری نے ایک آہ سرد کھینچ کر کہا۔

اتنا کہنے کے بعد شکاری کی حالت میں تبدیلی پیدا ہوئی۔ خیالات کے طوفان اور ان کو ظاہر کرنے کے جوش میں اس کا منہ سرخ ہوگیا۔ وہ ایک دم کھڑا ہوگیا۔ "یہ ضرور ہے کہ شہر کی حالت آجکل بہت خراب ہے" شکاری نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر کر اپنا پاؤں زمین پر زور سے مارتے ہوئے کہا۔ "مگر ہم میں سے کسی کو اسے سدھارنے کا خیال بھی ہونا چاہیئے۔ بابا تم لوگ سمجھتے ہو کہ اس جنگل میں دُنیا داروں سے دور رہ کر بڑے نیک بن گئے ہو۔ مگر تمہیں اپنی ذمہ داریوں کا بھی کچھ خیال ہے یا نہیں۔ ذرا بڑے بڑے اوتاروں کی زندگی پر نظر ڈالو۔ انہوں نے اپنے اہل زمانہ کے لئے کیا کیا مصیبتیں اٹھائیں۔ ان کے خیالات بدلنے کے لئے ان کو کس طرح خدا سے دور پایا۔ دُنیا کو اس لئے چھوڑ بیٹھنا کہ وہ پاپوں بھری ہے۔ محض حماقت ہے۔ تم جیسے نیک سادھوؤں کو تو دنیا میں عام لوگوں سے زیادہ دلچسپی لینی چاہیئے"۔ شکاری نے شاما سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "کیونکہ تم ہی میں اتنی طاقت ہے کہ ان کے بُرے خیالات کو بدل سکو"۔ شکاری نے ایک گہری نظر ان لوگوں پر ڈالی۔ اور اپنی بندوق کندھے پر رکھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ اس کے دروازہ کھولنے سے ایک ٹھنڈی ہوا کا جھونکا جھونپڑی میں داخل ہوا۔

"اتنی رات گئے کہاں جا رہا ہے بیٹا۔ رات کی رات ٹھہر جا صبح جانا"۔ شاما نے کمبل سے کندھے ڈھکتے ہوئے کہا۔

"نہیں بابا میرا گھر یہاں سے دور نہیں ہے۔ اور گھر والے میرا انتظار کر رہے ہوں گے"۔

شکاری کے جانے کے بعد جھونپڑی میں بالکل خاموشی چھا گئی سب اپنے اپنے خیالات میں گم ہوگئے۔ گھنے درختوں میں سے ہوا کے گذرنے اور کمزور پتوں کے زمین پر گرنے کے سوا کوئی اور آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ وہ لوگ شکاری کے خیال میں بہت گم ہوگئے کہ اپنی جھونپڑی کی چھوٹی سی دنیا کو بھی بھول گئے۔ سردی کی شدت سے ان کے بدن کانپنے لگے۔ "بھیا آخر تم کو کیا ہوگیا ہے دروازہ بند کر دو دیکھو آگ بجھ گئی ہے"۔ آخر شاما نے ان کے خیالات کے طوفان کو روکا "کتنا صاف گو ہے...... مگر سچ کہتا ہے"۔ اس کے ساتھیوں نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ بلکہ چپ چاپ اپنی اپنی جگہ جا لیٹے۔

صبح کو جب وہ لوگ اٹھے تو شاما کو باہر جانے کے لئے تیار ہوتے دیکھا۔

"اتنے سویرے کدھر چلے" ایک نے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا۔

"پہلے ہمیں کچھ باجا تو سنا دو۔ پھر ہم سب مل کر باہر جائیں گے" دوسرے نے کھجاتے ہوئے کہا۔

"شہر جا رہا ہوں بھیا" اب اس سنسان جنگل میں میرا کچھ کام نہیں" شاما نے جواب دیا۔

"تمہارا جی چاہتا ہے تو جاؤ" مگر اب شہر کی گندی آبادی ہمارے قابل نہیں رہی"۔ پہلے نے کہا۔

"میں تم سے چلنے کے لئے کہہ بھی نہیں رہا"۔ شاما نے ترشی سے جواب دیا۔ اور کچھ کہے بغیر چل کھڑا ہوا۔

شاما کے جانے کے بعد وہ لوگ اپنا وقت حسب معمول سیر تفریح اور جنگلی پھل جمع کرنے میں گذارنے لگے۔ دن تو اس طرح گذار دیتے مگر شام کو وہ اکثر شاما کا ذکر ضرور کرتے۔ کیونکہ اس وقت جب وہ سب تفریح سے فارغ ہوکر آگ کے گرد بیٹھتے تو شاما ان کو سریلے راگ سنایا کرتا۔ جن سے ان کے دماغ میں ایک طوفان برپا ہو جاتا تھا ان کے خیالات دُنیا سے دور جنت کے باغوں کا گشت لگانے لگے۔ جہاں ان کو ہر طرح کی راحت ملنے کی امید تھی۔

اسی طرح اٹھوارہ گذر گیا۔ مگر شاما نہ آیا۔ آج صبح باہر جانے سے پہلے وہ لوگ ایک تھال کے گرد بیٹھے کچھ جنگلی پھل کھا رہے تھے۔

وہ سب آج غیر معمولی طور پر بہت خاموش تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے کان دروازے پر لگے ہوئے ہیں۔ ذرا سی آہٹ ہوتی تو وہ ایک دوسرے کو دیکھنے لگتے۔ آخر دروازہ دھڑکھڑانے کی آواز آئی۔ وہ حسب معمول ایک دوسرے کو تکنے لگے۔ "شاما آ گیا!" ان میں سے ایک نے چلا کر کہا۔ اور بھاگ کر دروازہ کھولا۔ باہر شاما کھڑا تھا۔ پریشان حال تھکا ہوا۔ "شاما" کہہ کر اس کے دوست نے اس کا کندھا ہلایا۔ مگر اس نے پلٹ کر دیکھا تک نہیں۔ سیدھا اپنے بستر پر جا لیٹا۔

"آخر اس کو ہو کیا گیا!" ایک نے دوسرے سے پوچھا۔

"بہت تھک گیا ہے" دوسرے نے جواب دیا۔

"شاید بیمار ہو" تیسرے نے کہا۔ اور پانی لے کر اس کی طرف لپکا۔

غرض یہ کہ ہر ایک نے اپنی اپنی رائے ظاہر کی۔ مگر شاما نے کسی کی بات کا کچھ جواب نہ دیا۔ اس طرح پورا دن گذر گیا۔ کسی کو اس سے کچھ سوال کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ "اس سے کچھ فائدہ نہیں"۔ ان میں سے ایک نے آخر تنگ آ کر شام کو اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "ہمیں کسی طرح اس کی پریشانی کی وجہ معلوم کرنی چاہیئے"۔ وہ سب شاما کے سرھانے جا بیٹھے۔

"شاما کچھ تو بتاؤ آخر تم کو کیا ہو گیا ہے"۔ ایک نے اس کا سر ہلا کر پوچھا۔

شاما نے آہستہ سے اپنی آنکھیں کھولیں۔ "تم لوگ میرا پیچھا نہیں چھوڑو گے..... مگر تم سن کر کرو گے کیا۔ سوائے افسوس کے کچھ چارہ نہیں"۔

"کچھ کہو تو سہی"۔ ان لوگوں نے تنگ آ کر کہا۔

"اچھا سنو!" شاما نے ان لوگوں سے کہتے ہوئے کہا۔ "شکاری تمہیں اتنا تو بتا ہی چکا ہے کہ شہر کے لوگوں میں شرافت باقی نہیں رہی۔ جھوٹ بولنا اور دھوکا دینا تو ان کے لئے ایک معمولی بات ہے..... اس کے علاوہ بہت سی اور باتیں ہیں جو شکاری ہم کو بتانا بھول گیا۔ وہ سب آرام طلب عیش پسند ہوتے ہیں۔ خدا کا خوف تو ان کے دل سے بالکل مٹ گیا ہے۔ اگر ان سے کہو کہ جیسی زندگی تم بسر کرتے ہو اس کے بدلے میں مرنے کے بعد تم کو جہنم ملے گی جس میں ہمیشہ جلنا ہو گا۔ تو ان کو یہ ایک مذاق معلوم ہوتا ہے بے فکری سے کہتے ہیں۔

"سادھو جی اگر دوزخ کی آگ سے ڈرتے رہے تو زندگی کا لطف کب اٹھائیں گے"..... "شاما نے اپنا ماتھا پونچھا اور گردن جھکا کر کچھ سوچ میں پڑ گیا۔

"عجیب وہ لوگ خدا کی بجائے خوبصورتی کی پوجا کرتے ہیں..... قدرتی خوبصورتی نہیں بلکہ وہ لوگ مصنوعی خوبصورتی کے پجاری ہیں وہاں کے شراب خانے اور ہوٹل ایسے لوگوں سے بھرے رہتے ہیں۔ ان کے کھیل تماشے بھی ایسے ہی گندے ہیں۔ شہر کی آدھی سے زیادہ آبادی ہر روز شام کو ان کھیل تماشوں میں لگ جاتی ہے اور گناہ کرنے کے نئے نئے ڈھنگ سیکھتی ہے!!" یہ کہتے ہوئے شاما کا چہرہ غصے سے لال ہو گیا۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔

شراب پینے کے لحاظ سے وہاں کے امیروں اور غریبوں کا ایک سا ہی حال ہے۔ جہاں انہوں نے شراب خانے میں قدم رکھا سمجھو کہ ان کے ہوش و حواس غائب ہوئے......... وہ لوگ بعض وقت اتنی پی جاتے ہیں کہ آپے سے باہر ہو کر طرح طرح کی بیہودہ حرکتیں کرنے لگتے ہیں.........!" اتنا کہنے کے بعد شاما نے ایک گہری نظر ان لوگوں پر ڈالی ان سب کی آنکھیں ایک نامعلوم جوش سے چمک رہی تھیں۔ "مگر ستے کیوں ہو بچو دعا کرو کہ خدا ان کے برے عقیدے اور بیہودہ حرکتیں بدل دے"۔ اتنا کہنے کے بعد شاما سو گیا۔

صبح کو جب وہ اٹھا تو جھونپڑی بالکل خالی تھی۔ اس کے ساتھیوں میں سے ایک بھی موجود نہ تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ وہ شہر گئے ہیں......... لوگوں کو سیدھا راستہ بتانے کے لئے نہیں..... بلکہ وہاں کی زندگی کا لطف اٹھانے کے لئے!!

"ذلیل کتے"!! شاما نے دانت پیس کر کہا۔

ختم

حقائق و معارف

ادراک ہیں بلا نہ الاّ محدود
محدود ہے عقل و فہم دنیا محدود
عقلوں سے احاطۂ خدا ناممکن
عقلیں محدود ہیں خدا محدود

مدت سے بہم دگر جدل برپا ہے
اور باعث جنگ ہے تو صرف اتنا ہے
حکمت جسے علت العلل کہتی ہے
مذہب اسے خالق الورے کہتا ہے

اللہ کے انکار کا جو خوگر ہے
حیران ہوں کیا سمجھ کے ہے کیونکر ہے
اللہ کا اقرار بھی مشکل ہے مگر
اللہ کا انکار تو مشکل تر ہے

قول حکما تھا کہ "یہ عالم کا نظام
مجموعۂ سالمات برقی ہے تمام"
پوچھا کہ یہ سالمات کیا ہیں تو کہا
"خاموش! کہ معیوب ہے تطویل کلام"

انسان کو تحقیق کی دھن جب سے ہے
اک بحث ہے جو ہزار ہا ڈھب سے ہے
راز دو جہاں کبھی کھلا ہے نہ کھلے
رٹتے رہو "کیا ہے، کیوں ہے اور کب سے ہے"

عالم کی بنا کیا ہے، یہ مجھ سے پوچھو
اصل دوسرا کیا ہے، یہ مجھ سے پوچھو
مذہب کا خدا کون ہے، یہ تم جانو
حکمت کا خدا کیا ہے، یہ مجھ سے پوچھو

یہ جھوٹ کہ اصل دوسرا کچھ بھی نہیں
عالم میں حقیقت کا پتا کچھ بھی نہیں
عالم کی حقیقت نہ سمجھنے والو!
عالم تو حقیقت کے سوا کچھ بھی نہیں

مذہب کی نگاہ میں خدا خالق ہے،
حکمت کی نظر میں مادّہ خالق ہے،
لیکن کسے معلوم، یہی خالق ہیں
یا اور کوئی اِن کے سوا خالق ہے،

معنی اللہ ہے اور نہ صورت اللہ
صورت اللہ ہے اور مورت اللہ
اللہ کیا ہے، یہ راز مجھ سے پوچھو
اللہ قوت ہے اور قوت اللہ

حکیم آزاد انصاری

وزارت

حضور سرورِ کائنات کی وفات کے بعد خلفاء کا دور شروع ہوا۔ ان میں سے پہلے چار خلفاء نہایت عالی دماغ، معاملہ فہم اور صاحبِ فراست تھے۔ دوست اور دشمن سب اس پر متفق ہیں کہ جس کام کے لئے مسلمانوں نے انہیں منتخب کیا تھا وہ انہوں نے بطریق احسن انجام دیا۔ خلیفہ ہونے کی حیثیت سے وہ مسلمانوں کے حکمراں، ان کی فوج کے سپہ سالار اور مذہب کے مقتداء تھے۔ یہ خلیفہ ہر معاملے کی نگرانی بذاتِ خود کرتے تھے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ کوئی بات خواہ سیاسی ہو یا مذہبی ان کی نظر سے پوشیدہ نہیں رہتی تھی۔ جب مسلمانوں نے بارہ برس کے قلیل عرصہ میں وسیع فتوحات حاصل کیں، اور ایشیا کے اکثر متمدن ممالک کو فتح کرنے کے بعد مصر سے گذر کر افریقہ تک اور دوسری طرف سمندر پار کر کے ہندوستان تک پہنچے۔ تب بھی خلفاء بدستور تمام باتوں کی نگرانی بذاتِ خود کرتے رہے۔ فتوحات کی وسعت اور نئے نئے مسائل کے بروئے کار آنے سے خلفاء کو اپنے طرزِ عمل میں تبدیلی کرنی پڑی اور پہلی سی ذاتی نگرانی بھی قائم نہ رہ سکی۔ مسلمانوں کی خوش قسمتی تھی کہ اکثر فتوحات حضرت عمرؓ کے زمانے میں ہوئیں۔ انہوں نے ایک طرف تو مفتوحین کی تالیفِ قلوب کی اور دوسری طرف فاتحین کو حد سے گذرنے نہ دیا۔ اس کے علاوہ مفتوحین میں جو خوبیاں قابلِ تسلیم تھیں انہیں بلا رد و قدح تسلیم کر کے اسلامی سیاسیات کا جزو بنا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ بجا طور پر اسلامی سیاسی قوانین کے بانی سمجھے جاتے ہیں۔

ابتدائی زمانے میں جو ممالک مسلمانوں کے زیرِ نگیں آئے ان میں ایران و شام بھی تھے۔ ایران قدیم زمانے سے ایک زبردست اور متمدن سلطنت کا درجہ رکھتا تھا، اور مدتوں سے وہاں سیاسی اداروں کی نشو و نما ہو رہی تھی۔ یہی حال شام کا تھا۔ گو یہ ملک خود مختار نہ تھا، لیکن روما اور اس کے بعد قسطنطنیہ کے زیرِ سیادت رہنے کی وجہ سے یہاں کے سیاسی ادارے بھی ترقی یافتہ تھے۔ ان ممالک کی فتح کے بعد حضرت عمرؓ کے زیرِ ہدایت مسلمانوں نے بہت کچھ سیکھا، اور اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کے سیاسی اداروں پر ان ممالک کا بڑا گہرا اثر پڑا۔

خلفاء کی سلطنت جب وسیع ہوگئی تو وہ تمام کام بذاتِ خود انجام نہ دے سکے، اور انہیں ایک مددگار کی ضرورت ہوئی۔ نائب حکمراں کا ظاہر ہے کہ صرف یہی فرض نہ تھا کہ وہ حکومت کے کاموں میں آقا کا ہاتھ بٹائے اور اسے مشورہ دے بلکہ اس کا فرض یہ بھی تھا کہ بوقتِ ضرورت حکمراں کا قائم مقام بھی بن سکے، اور اس کے اقوال و افعال خود حکمراں کے ہی سمجھے جائیں۔ اس قسم کے نائب یا وزیر کا عہدہ ایران میں بہت قدیم تھا، اور جب ضرورت پڑی تو مسلمانوں نے ایرانیوں کی نقل کی۔ کتاب ادب الوزراء میں بیان کیا گیا ہے۔ کہ ایرانی بادشاہ اپنے وزیر کی ایسی قدر کرتے تھے کہ جس کی مثال دوسرے ملکوں میں نہیں ملتی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ "وزیر ہمارے نظم و نسق کا منتظم ہے۔ وہ ہمارے ملک کا جمال ہے وہ ہماری زبان ہے وہ ہمارا ہتھیار ہے۔ اسی سے ہم فتوحات حاصل کرتے ہیں اور ان فتوحات کو قابو میں رکھتے ہیں"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وزارت ایرانیوں کی سیاسی زندگی کا ایک مستقل جزو تھی، اور وزیر کے اختیارات بے انتہا وسیع اور اور اس کا عہدہ معزز تھا۔ ایران سے نکل کر یہ عہدہ عربوں کی ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں پہنچا جو عرب کے مشرق میں ایران کے زیرِ سیادت قائم تھیں۔ ان میں یہ عہدہ ردف کہلاتا تھا۔ یہ ردف دربار میں بادشاہ کے دائیں طرف بیٹھتا تھا، اور جب شراب نوشی کی مجلس منعقد ہوتی تو بادشاہ کے بعد ردف ہی سب سے پہلے شراب پیتا تھا۔ زمانۂ جنگ میں بادشاہ کی عدم موجودگی میں ردف ہی اس کا نائب ہوتا تھا، اور مالِ غنیمت میں چوتھائی کا حقدار تھا۔ سلطنت حیرہ میں ردف کا عہدہ بنی یربوع میں موروثی تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس قبیلے کے رؤساء جو بادشاہت کے حقیقی دعویدار تھے، اپنے حق سے دست بردار ہو گئے تھے اور اس کے بدلے میں انہیں موروثی طور پر ردف مقرر کر دیا گیا تھا۔ قدیم ایران میں بھی اکثر سیاسی عہدے موروثی ہوتے تھے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ردف درحقیقت ایران ہی کی نقل تھی، اس کے علاوہ حیرہ کی ریاست ایران کی سرحد پر واقع تھی۔ اس لئے باوجود خالص عرب ہونے کے اس میں بیرونی اثرات برابر کام کر رہے تھے۔ جب مسلمانوں کو ضرورت پڑی تو انہوں نے ردف کا عہدہ جوں کا توں قائم رکھا، مگر اُسے وزیر کہنے لگے۔ اس لفظ کے متعلق بہت کچھ بحث ہے۔ بہرحال زیادہ قرینِ قیاس بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ وزیر سے مراد ایسا شخص تھا۔ جو

حکمران کی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے میں اس کی مدد کرے اور اس کا نائب ہو۔

قرآن شریف میں بھی وزیر کا ذکر آیا ہے۔ اس سے فقہاء نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ وزیر کا عہدہ نہ صرف خلاف شرع نہیں بلکہ اس کے جواز میں نص قرآنی موجود ہے۔ خلفاء چونکہ یہ تمام ذمہ داریاں بذات خود پوری نہ کر سکتے تھے اس لئے وہ بعض اختیارات کسی دوسرے شخص کو تفویض کر دیتے تھے تاکہ انتظام مملکت بہتر طریقے پر ہو سکے اور غلطی کا احتمال کم ہو جائے۔

فقہاء نے وزارت کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک وزیر جسے تمام اختیارات حکومت کے حاصل ہوں، اور دوسرا وہ وزیر جس کے اختیارات محدود ہوں اور جو صرف خلیفہ کے احکام کی تعمیل کرے۔ پہلے وزیر کو وزیر تفویض اور دوسرے کو وزیر تنفیذ کہتے ہیں۔ ان دونوں عہدوں کے اختیارات اور فرائض میں [illegible] مختلف تھے۔ اسی طرح ان میں جو خوبیاں تلاش کی جاتی تھیں وہ بھی مختلف تھیں۔

وزیر تفویض گویا وزیر اعظم سمجھے جاتے تھے۔ اس کا درجہ بہت بلند تھا کیونکہ اسے خلیفہ کے تمام فوجی اور شہری اختیارات حاصل ہوتے تھے۔ وہی سب سے بڑا عہدہ دار سمجھا جاتا تھا۔ وہ گویا خلیفہ کا نفس ناطقہ تھا اور اختیارات کے لحاظ سے اس میں اور خلیفہ میں کوئی فرق نہ تھا۔ وہ خلیفہ کے فرائض بذات خود انجام دیتا تھا اور اس پر صرف اتنا لازم تھا کہ جو احکام وہ صادر کرے ان سے خلیفہ کو باخبر رکھے۔ عوام کو اور خود اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کی حیثیت خلیفہ کے ایک ملازم کی ہے۔ خلیفہ کی طرح وہ سلطنت کے ہر ادارے کی جانچ پڑتال کر سکتا تھا خواہ وہ محکمہ فوجی ہو یا عدالتی یا شہری اور ہر محکمہ کے متعلق جو کام چاہے سب احکام صادر کر سکتا تھا۔ ان احکام کو بجا لانا ایسا ہی ضروری تھا جیسا کہ خلیفہ کے احکام کا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ احکام کی تعمیل ہو رہی ہے یا نہیں اس کے خاص ملازم مقرر تھے۔ مختصر یہ ہے کہ اس کو تمام اختیارات حاصل تھے جو خلیفہ کے تھے۔ مگر تین باتیں اس کے اختیار سے باہر تھیں۔ اول یہ کہ وزیر ہونے کی حیثیت سے وہ اپنا جانشین مقرر نہیں کر سکتا تھا۔ دوسرے خلیفہ اس کا تقرر کرتا تھا اس لئے عوام اس کے مجاز نہیں تھے کہ اسے معزول کر دیں۔ حالانکہ خلیفہ کا عزل و نصب دونوں عوام کے ہاتھ میں تھے۔ تیسرے یہ کہ اگر خلیفہ کسی شخص کا تقرر بذات خود کرے تو وزیر خلیفہ کے حکم کے اثر سے معزول نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے ماسوا وزیر کے اختیارات کی وسعت کا یہ عالم تھا کہ خلیفہ بھی اس کے فیصلوں کو رد نہیں کر سکتا تھا اور اس کے حکم سے جو رقم ایک دفعہ خزانہ میں داخل کر دی گئی خلیفہ بھی اسے واپس نہیں کر سکتا تھا لیکن خلیفہ وزیر کے مقرر کئے ہوئے اشخاص کو معزول کر سکتا تھا۔ مگر باوجود ان تمام اختیارات کے انتظام سلطنت کی پوری ذمہ داری خود خلیفہ پر ہی عائد ہوتی تھی نہ کہ وزیر پر۔ بعض مرتبہ ایسا ہوتا تھا کہ ایک معاملے کے متعلق ایک دوسرے کی اطلاع کے بغیر خلیفہ اور وزیر متضاد احکام صادر کر دیتے تھے۔ ایسی صورت میں تحقیق کی جاتی تھی کہ احکام پہلے کس کی طرف سے صادر ہوئے۔ پہلے احکام کی تعمیل کی جاتی تھی خواہ وہ خلیفہ کے ہوں یا وزیر کے۔ لیکن اگر مجلس مشاورت میں خود خلیفہ موجود ہو اور اس کے اور وزیر کے خیالات میں اختلاف ہو تو بہر صورت خلیفہ کا حکم مقدم سمجھا جاتا تھا۔

وزیر کے اختیار و اقتدار کا جو خاکہ اوپر پیش کیا گیا ہے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ خلیفہ اور وزیر میں بہت کم فرق تھا۔ اس لئے دونوں کی تعظیم یکساں سی کی جاتی تھی۔ صرف فرق یہ تھا کہ خلیفہ کے لازم ہونے کی حیثیت سے یہ ضروری نہیں تھا کہ وزیر کے خاندان کے متعلق تفتیش کی جائے۔ اس کے برعکس خلیفہ کا قبیلۂ قریش میں سے ہونا لابدی تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ اسلام میں بہت جلد ایک زمانہ ایسا آگیا تھا کہ جب خلیفہ کے لئے انتخاب کی شرط باقی نہ رہی تھی اور یہ عہدہ بنی امیہ اور بنی عباس میں محدود ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں خلیفہ بناتے وقت کم سے کم خوبیاں تلاش کی جاتی تھیں اور جس شخص میں یہ مل جاتیں اسے خلیفہ تسلیم کر لیا جاتا تھا۔ صرف اس کا بہت خیال رکھا جاتا تھا کہ وہ خاندان خلافت سے ہو۔ خلفاء راشدین کا انتخاب عوام کی طرف سے ہوا تھا۔ ان کے زمانے میں وزارت کا نشان نہیں ملتا۔ کیونکہ اس وقت حکومت کا کام بہت سادہ طریق پر انجام پاتا تھا اور دوسرے ان میں خود اتنی صلاحیت تھی کہ وہ تمام باتوں کی نگرانی کریں۔ سب سے پہلے بنی امیہ کے دور میں وزیر کا نام سننے میں آتا ہے، اور بنی عباس کے عہد میں وزارت اپنے کمال کو پہنچی۔ ان کے زمانے میں وزیر حقیقی حکمران تھے اور خلیفہ محض عضو معطل ہو کر رہ گئے تھے۔ خصوصاً اس زمانے میں جبکہ خلفاء دنیا و مافیہا سے بے تعلق ہو کر اپنی زندگی کا زیادہ حصہ حرم میں گذارتے تھے اور کنیزوں سے دل بہلانے کو امور سلطنت پر ترجیح دیتے تھے۔

تقرر کے وقت وزیر میں جو خوبیاں تلاش کی جاتی تھیں ان کا درجہ بہت بلند تھا۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ اسلام میں ایسے اشخاص بلکہ خاندان ملتے ہیں جنہوں نے اپنے کارناموں سے نہ صرف خلفاء کے دلوں میں جگہ کر لی تھی بلکہ عوام بھی ان کے ایسے گرویدہ تھے کہ ان کا نام اب تک عزت و احترام سے لیا جاتا ہے۔ اس کی بہترین مثال بنی عباس میں برامکہ اور عثمانی ترکوں میں کوپریلی

کی ہے۔ ان خاندانہائے وزارت نے شہری اور فوجی دونوں انتظامات میں وہ نام پیدا کیا کہ عوام ان کا دم بھرنے لگے، اور ان کے آقاؤں نے اپنی عنایات اور مراعات سے انہیں مالا مال کر دیا۔

لیکن وزارت کی سیاسی اہمیت سے قطع نظر، وزیر کی ایک بڑی اہمیت یہ تھی کہ تقرر کے وقت اس کا خاص خیال رکھا جاتا تھا کہ نظم ونسق کی نگرانی کے علاوہ وہ خلیفہ کا بہترین مصاحب بھی بن سکے۔ اگر خلیفہ کو علمی گفتگو کی ضرورت ہو تو وزیر اس میں حصہ لے اور اگر وہ تفریح کا خواہاں ہو تو وزیر اس کا دل بہلائے۔ مختصر یہ کہ وزیر ہر اس چیز میں پورا ماہر ہونا چاہیئے جسے عربی میں مجموعی طور پر "ادب" کہتے ہیں۔ یعنی "وہ ماہر شاطر ہو، موسیقی کے قواعد وقوانین جانتا ہو، پولو کھیل سکتا ہو، علوم ریاضی، طب اور نجوم میں دسترس رکھتا ہو، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ شعر وشاعری، صرف ونحو اور تاریخ کا عالم ہو، بوقت ضرورت شعر پڑھ سکے، اور حکایتوں اور داستانوں سے سامعین کا دل بہلا سکے"۔ چونکہ وزیر میں یہ تمام خوبیاں ہونی ضروری تھیں اس لئے اس ضرورت کو پورا کرنے کی غرض سے بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ اور ان میں انہیں بتایا گیا کہ یہ خوبیاں وہ کس طرح پیدا کر سکتے ہیں۔ یہ کتابیں نہ صرف اس وجہ سے دلچسپ ہیں کہ ان میں طرح طرح کے تاریخی اور نیم تاریخی قصے ملتے ہیں، بلکہ ان سے اس زمانے کے حالات معلوم ہوتے ہیں، اور سماجی کوائف کے لئے یہ کتابیں رہنما کا کام دیتی ہیں۔ اسی قسم کی ایک کتاب قوانین الوزارۃ ہے۔ نام سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بہت کچھ تاریخی اسناد ملیں گے لیکن کتاب پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ماوردی کا مقصد صرف ایسی کتاب مرتب کرنا تھا جسے پڑھ کر وزیر مصاحبت کے فرائض انجام دے سکے۔

خلیفہ مامون نے ایک مرتبہ مختصراً بیان کیا تھا کہ وہ وزیر میں کیا کیا خصائل ضروری سمجھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "میں چاہتا ہوں کہ میرے وزیر میں تمام انسانی خوبیاں موجود ہوں۔ وہ دل کا سچا اور معاملے کا صاف ہو، عالم ہو، تجربہ کار ہو، راز کو پوشیدہ رکھ سکے، بروقت احکام کی پیروی کرنے میں مستعد ہو، اور موقع کے لحاظ سے خاموش رہے یا بات کرے، میرے اشاروں تک کو سمجھ جائے، سپہ سالار کی طرح مستعد اور قاضی کی طرح عقیل وفہیم ہو، علماء کا انکسار اور فقہا کی باریک بینی رکھتا ہو، بذل ونوال کی قدر کرے، مگر ایسے موقعوں پہ بیجا انکسار سے سبک سار نہ ہو، اور اپنی باتوں سے دلوں کو مسخر کر سکے"۔

وزیر تفویض سے کم درجے کا وزیر تنفیذ ہوتا تھا۔ اس کا فرض اتنا تھا کہ خلیفہ یا وزیر تفویض کے احکام کی تعمیل کرے۔ یہ عہدہ درحقیقت اسلامی سیاسیات میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ وزیر تنفیذ خلافت کے ادنیٰ اور اعلیٰ طبقوں کے درمیان محض ایک واسطہ تھا۔ اس لئے اس کا فرض یہ تھا کہ احکام کی تعمیل کرائے، تمام تقررات کا اعلان کرے، جنگ کے موقعوں پر جنگی تیاریوں کی لوگوں کو ترغیب دلائے، اور سیاسی واقعات کو عوام تک پہنچانے کا وسیلہ ہو۔ بعض مرتبہ اسے مجلس مشاورت میں بھی بلا لیا جاتا تھا، اس لئے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ اس کے اختیارات صرف انہیں باتوں تک محدود ہوں۔ وہ خلیفہ اور عوام کے درمیان ایک واسطہ تو ضرور تھا، مگر یہ نہیں تھا کہ اس کی حیثیت محض ایک ادنیٰ ملازم کی ہو، بلکہ وہ بعض موقعوں پر اپنے عہدے سے کام بھی لے سکتا تھا۔ اس کے اقتدار کا اندازہ اس سے ہوگا کہ خلیفہ کے تمام احکام، حکومت کی تمام روئداد اور تقررات کے تمام کاغذات جب تک اس کے ہاتھوں میں سے نہ گذرلیں اور اس کے دفتر میں ان کی توثیق نہ ہو جائے، اس وقت تک انہیں کوئی قانونی اہمیت حاصل نہ ہوتی تھی۔ ہر سرکاری کاغذ پر اس کے دستخط ہونا ضروری تھے۔

ان دونوں وزیروں کے درجے اور کام میں جو فرق تھا اس سے انکے دفتری تعلقات بھی واضح ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ان دونوں عہدہ داروں کا حکومت سے جو گہرا تعلق تھا، اور جس طرح وہ سارے کاروبار پر حاوی ہو گئے تھے اس کا اندازہ معمولی کتابیں پڑھنے سے مشکل ہی ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس قابلیت کی ان میں ضرورت سمجھی جاتی تھی اس کے استعمال کا موقع انہیں کب اور کیسے ملتا تھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں وزراء تقریباً ہر روز دربار خلافت میں باریاب ہوتے تھے، اور ان ملاقاتوں میں ہمیشہ ان کی قابلیت کا امتحان ہوتا رہتا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ اسی وجہ سے انہیں اخلاق وآداب کا بہترین نمونہ بننا پڑتا تھا۔ ماوردی نے لکھا ہے کہ دیانتداری، ضبط اوقات، اور ہمہ دانی ان کی صلاحیت اور قابلیت کا جزو تصور ہوتی تھی۔ یہ بھی کافی نہ تھا کہ وزراء صرف ایک علم پر حاوی ہوں، خواہ وہ فقہ ہو یا علم دین، یا حکومت کے مختلف شعبہ جات۔ ممکن تھا کہ خلیفہ کی خواہش کے مطابق کسی وقت ہر قسم کے علوم میں ان کی دسترس کا امتحان ہو جائے۔ کیونکہ دربار خلافت میں ہر طرح کے علماء جمع رہتے تھے، اور ہر نوع کے مباحث میں وزیر کو حصہ لینا پڑتا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ بہت ہی کم وزراء اس معیار پر پورے اترتے تھے جسمانی اور دماغی خوبیاں بھی وزیر میں تلاش کی جاتی تھیں۔ کوشش یہ تھی کہ وہ صاحب الرائے ہو، معاملہ کو جلدی

کئے، حلیم الطبع ہو، سبک حرکات سے پرہیز کرے اور کسی صورت میں دنیوی درجے اور مناصب کا اس پر اثر نہ ہو۔

جب وزیر کی قابلیت کا یہ معیار ہو تو ناممکن تھا کہ وزراء کا انتخاب محض ایک طبقہ اور ایک ہی مذہب سے کیا جائے۔ چنانچہ فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ ایک غیر مسلم بھی وزیر مقرر کیا جا سکتا ہے۔ ماوردی گیارھویں صدی عیسوی میں گذرا ہے اور غالباً پہلا مسلمان سیاست دان ہے جس نے یہ خیال ظاہر کیا ہے۔ اس کا مقابلہ تاریخ یورپ سے کرو، جہاں انیسویں صدی کے وسط میں بعض ممالک نے غیر مذاہب کے لوگوں کو چند مراعات دے کر سرخروئی حاصل کی تھی، گو یورپ کے اکثر ممالک اب بھی ایسے ہیں جہاں غیر مذہب کے لوگوں کو انسانیت کے زمرے سے خارج سمجھا جاتا ہے۔ ماوردی کے بعد بعض فقہاء نے اس نظریے کو قبول نہیں کیا، بلکہ اسے گناہ کبیرہ بتلاتے رہے، لیکن اس میں ذرا شبہ نہیں کہ مسلمان حکمرانوں نے وزراء کے تقرر میں مسلم اور غیر مسلم کے فرق کو کبھی روا نہیں رکھا۔

بہرحال یہ ظاہر ہے کہ وزیر تفویض اور وزیر تنفیذ دونوں مل کر تمام کام انجام دیتے تھے، اور ان کے تعاون کے بغیر حکومت کا کام چلنا ناممکن تھا۔ لیکن سلطنت جوں جوں وسیع ہوتی گئی اور کام کی پیچیدگی بڑھتی گئی یہ محسوس ہونے لگا کہ صرف دو وزیر کام پر حاوی نہیں ہو سکتے۔ اس لئے دو کے علاوہ اور بھی وزیر مقرر ہونے لگے۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ کیا ان سب وزیروں کا درجہ برابر ہے، اور کیا ان میں سے ہر ایک خلیفہ کی نمائندگی کر سکتا ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو اندیشہ تھا کہ ان مساویانہ درجہ رکھنے والے عہدہ داروں میں ہمیشہ کشیدگی رہے، وہ ایک دوسرے کی مخالفت پر تلے رہیں، اور ایک دوسرے کی تخریب میں کوشاں رہیں۔ اس لئے اول تو ان وزراء کو کسی بڑی ضرورت سے مقرر کیا جاتا تھا، اور وہ سب مل کر اپنے فرائض انجام دیتے تھے یا خاص خاص خدمات ان کے سپرد کی جاتی تھیں، تاکہ کسی قسم کا تصادم نہ ہونے پائے۔ لیکن باوجود ان سب احتیاطوں کے پھر بھی تصادم کا خطرہ تھا۔ اس لئے سیاسیات کے ماہروں کی متفقہ رائے ہے کہ ایک سے زیادہ ایسے وزیر مقرر نہ کئے جائیں جن کے اختیارات لامحدود ہوں، اور اس کی اجازت انہوں نے صرف دو صورتوں میں دی ہے۔ اول تو یہ وہ سب کسی فرض کو متحدہ طور پر انجام دیں، تاکہ مسابقت کا سوال ہی پیدا نہ ہو اور سب مل کر ایک آدمی سمجھے جائیں۔ یا یہ کہ ان کے فرائض کی حد بندی اس طریقے پر کی جائے کہ ان میں تصادم کا شائبہ پیدا نہ ہو۔ دوسری صورت میں وہ حکومت کے محض وکیل ہونگے، اور اپنے مخصوص فرائض کے سوا کسی اور کام میں دخل دینے سے رکے رہیں گے۔ پہلی صورت میں تمام امور سلطنت ان کی متحدہ مجلس مشاورت میں پیش ہوں گے۔ مگر ان کا فیصلہ متفقہ ہونا چاہئے۔ اگر ایسا نہ ہو سکے تو خلیفہ کا فیصلہ آخری اور قطعی سمجھا جائے گا۔ دوسری صورت میں ہر وزیر اپنے خاص محکمے کا افسر اعلیٰ ہوگا اور اس کے اختیارات معدودے چند مستثنیات کے ساتھ لامحدود ہوں گے۔ اس حالت میں خاص خاص صوبے، مثلاً عراق یا مصر یا خراسان وغیرہ الگ الگ ہر وزیر کے سپرد کر دیئے جائیں۔ یا حکومت کے خاص خاص شعبوں کے وہ ذمہ دار قرار دیئے جائیں۔ مثلاً ایک وزیر فوجی امور کے لئے، دوسرا شہری امور کے لئے، اور تیسرا محاصل کے انتظام کے لئے مقرر کیا جائے۔ پہلی صورت میں وزیروں کی حیثیت قدیم ایران کے والیان صوبہ کی ہوگی، اور دوسری حالت میں ان کے فرائض وہی ہوں گے جو آج کل متمدن ممالک کے وزراء انجام دیتے ہیں۔

وزراء کا تقرر براہ راست خلیفہ کی طرف سے ہوتا تھا، مگر تقرر کے وقت کسی قسم کے مراسم ادا نہیں کئے جاتے تھے۔ خلیفہ کا نہ صرف تحریری حکم بلکہ زبان سے حکم دے دینا، یا صرف اشارہ کر دینا تقرر کے لئے کافی سمجھا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ خلیفہ نے یہ طریقہ اختیار کر لیا تھا کہ جہاں تک ہو سکے وہ عوام سے الگ رہتے تھے۔ ایسی حالت میں ان کے حاشیہ نشینوں کی تعداد بھی محدود تھی۔ آخری عہد میں وزراء کا تقرر انہیں حاشیہ نشینوں میں سے ہونے لگا۔ جب یہ حالت ہوئی تو وزیر کی نہ پرانی قابلیت رہ گئی اور نہ اس کا پرانا اقتدار باقی رہا۔ چنانچہ قاضی تنوخی نے بغداد کے ایک بندر نچانے والے کا قصہ لکھا ہے کہ وہ اپنے بندر سے پوچھتا تھا کہ حجام بنے گا؟ نان بائی بنے گا؟ اور ہر سوال پر بندر سر سے ہاں کا اشارہ کرتا تھا لیکن جب پوچھتا کہ وزیر بنے گا تو بندر نہیں کا اشارہ کرتا، اور تماشا دیکھنے والے کھل کھلا کر ہنس پڑتے۔ آخری عہد عباسیہ میں وزارت کا عہدہ بالکل حذف کر دیا گیا تھا۔ اور وزیر کی جگہ امیر الامراء نے لی تھی، جو خلیفہ کا ملازم ہونے کے بجائے درحقیقت اس کا مالک ہوتا تھا۔

وزیر کو برخاست کرنے کا حکم بھی خلیفہ کے سوا اور کوئی نہیں دے سکتا تھا۔ خلیفہ مطلق العنان حکمران تھا۔ وہ اپنے ملازمین کو اپنی مرضی سے نوکر بھی رکھ سکتا تھا اور برخاست بھی کر سکتا تھا۔ بالعموم اسلامی سیاست میں حکومت کا کوئی ملازم، خواہ وہ عدلیہ سے تعلق رکھتا ہو یا نظم و نسق سے یا مذہبی امور سے، مستقل نہیں سمجھا جاتا تھا۔ تاریخ اسلام میں کسی ملازم کو مستقل کرنے کی غالباً پہلی مثال اس وقت پیش آئی جب سلاطین عثمانی نے محمد علی پاشا کو مصر کا مستقل والی مقرر کیا؛ اور تاریخ کے طالب علموں پر واضح ہے کہ سلاطین نے بجبر و اکراہ اس کی منظوری دی تھی۔

محمد جمیل الرحمٰن

کل رات

کیسی شیریں تھی اے نظر کل رات   کس قدر دل کشا تھے نظارے
رقص کرتے تھے فرش پر نغمے   جھلملاتے تھے عرش پر تارے
کہکشاں کی ردائے رنگیں سے   نور کے چھوٹتے تھے فوارے
نور کے رنگ نور کے جلوے   نور کی موج نور کے دھارے
بامِ افلاک سے عروسِ قمر   دیکھتی تھی زمیں کے مہ پارے
وہ جنہیں سادگی کی صورت میں   یاد تھے بانکپن کے فن سارے
وہ جنہیں نکتہ دانِ ناز کہے   عالمِ دلبری کے سیّارے
وہ جنہیں کاتبِ حیات لکھے   حُسن کے نوبہار گہوارے
وہ جنہیں دیکھئے تو نرم و گداز   اور چھو لیجئے تو انگارے
وہ کہ جن کے خمار میں لرزاں   مستیوں کے ہزار چٹخارے
وہ کہ جن کی اداؤں کے آگے   زُہد بیٹھا ہو حوصلہ ہارے

کیسی شیریں تھی اے نظر کل رات
ایسے میں تم کہاں رہے پیارے

قیوم نظر

نکاتِ غالب و رقعاتِ غالب

آج کل غالب کے حالات۔ اس کی غیر مطبوعہ نظم و نثر اور اس کی جملہ تالیفات مصنفات کی طرف سب کی توجہ مبذول ہے۔ بعنوان بالا جس کتاب کا نام درج کیا گیا ہے وہ غالب کی ایک درسی تصنیف ہے جس کو اپنی وفات سے صرف دو سال پہلے مرزا صاحب نے مرتب کیا تھا۔ یعنی فروری ۱۸۶۷ء میں

اس کتاب کا حجم $\frac{۲۲ \times ۱۸}{۸}$ کی تقطیع کے ۱۶ صفحات ہیں۔ اور یہ غالب کے چند انتخاب کردہ فارسی رقعات اور اردو میں زبان فارسی کے قواعد زبان کا آئینہ ہے۔ اس رسالے کے ٹائیٹل پیج پر یہ عبارت درج ہے۔ حسب الحکم میجر فلر صاحب بہادر ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن ممالک پنجاب یہ دو رسالے نکاتِ غالب و رقعاتِ غالب تصنیف جناب نواب اسد اللہ خاں غالب بمطبع سعادت علی خاں کے مطبع سراجی میں شائع ہوئے۔ اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ یہ دونوں کتابیں پنجاب یونیورسٹی کے طلبا کے لئے غالب نے بہ فرمائش قلمبند کی تھیں۔ اور اس امر کے اصلی محرک ماسٹر پیارے لال تھے جن کا تخلص آشوب تھا۔ اور وہ لالہ سری رام مؤلف تذکرۂ خمخانۂ جاوید کے حقیقی چچا تھے۔ ماسٹر صاحب موصوف پرانے دہلی عربک کالج کے تعلیم یافتہ ایک نامور اہل قلم تھے۔ جو مرزا صاحب کے دلی دوست اور بہت مداح تھے۔ چنانچہ اردوئے معلیٰ میں ان کے نام کے بھی چند رقعات موجود ہیں۔ ان درسی رسالوں کا دیباچہ خود پیارے لال صاحب کا لکھا ہوا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں۔ کہ اُن دنوں نواب اسد اللہ خاں بہادر غالب نے قواعد صرف فارسی میں کئی اوراق بہ زبان اردو لکھے ہیں۔ اور چند خطوطِ فارسی اپنے مجموعۂ نثر میں سے کہ جس کا پنج آہنگ نام ہے ضمیمہ ان اوراق کا کئے ہیں۔ یہ دونوں رسالے جناب فیض مآب میجر فلر صاحب بہادر کی خدمت میں بھیجے گئے۔ جو ان کے مقبول نظر ہوئے۔ اور انجمن علمی لاہور میں بھی سزاوار درس و تدریس اور شائقہ آفرین و تحسین قرار پائے۔ چنانچہ میجر صاحب ممدوح نے اس احقر العباد کے پاس بھجوائے۔ اور حکم دیا کہ پانسو نسخے چھاپے جائیں۔ تاکہ مدارس میں پڑھائے جائیں" وغیرہ وغیرہ۔

جس زمانے میں یہ کتاب مرتب ہوئی تھی۔ اس وقت پنجاب یونیورسٹی کے کرتا دھرتا ورنیکولر لٹریچر کی اشاعت اور اس کی روز افزوں ترقی کے دل سے خواہاں تھے۔ چنانچہ مولوی محمد حسین آزاد۔ خواجہ الطاف حسین حالی اور ماسٹر پیارے لعل ایسے قابل اہل تصنیف دلی سے بلوا کر اس کی علمی انجمن کو سجایا گیا تھا جس نے قصص ہند۔ نیرنگ خیال۔ تذکرۂ آب حیات۔ حالی کی نیچرل نظمیں اور کتاب رسوم ہند وغیرہ شائع کی تھیں۔ جن کی نظیر اردو کی تمام درسی کتابوں میں آج تک نہیں مل سکتی۔ بھلا ایسی انجمن غالب کو کب فراموش کرنے والی تھی۔ مگر مرزا صاحب اب ہو چکے تھے۔ کچھ لکھنا پڑھنا تو گیا۔ رات دن صاحب فراش رہتے تھے۔ اسی لئے کوئی اچھی کتاب لکھ سکنے کا عذر کر کے اس مجموعے کو ان الفاظ سے شروع کیا۔ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ آسمان زمین کے پیدا کرنے والے کو سجود۔ اور خدا کی راہ بتانے والے محمد کو درود۔ پیر اکہتر برس کا ناتوان آدمی دُنیا میں عزت اور عقبیٰ میں نجات کا طالب۔ ترک سلجوقی اسد اللہ خاں غالب۔ کہتا ہے کہ میں کہہ سکتا ہوں۔ کہ یہ درویش دلریش فقیر باکرامت ہے۔ کرامت یہ کہ روح تحلیل ہو گئی اور جسم سلامت ہے۔ اپنا ایک شعر فارسی معہ ترجمہ لکھتا ہوں ؎

در کشاکش ضعفم نگسلد روان از تن
اینکہ من نمے میرم ہم ز ناتوانیہاست

یعنی کثرت ضعف سے روح میں اتنی طاقت ہی نہیں کہ جسم سے ٹوٹ کر نکل جائے۔ واقعی ناتوان آدمی کچھ کام نہیں کر سکتا۔ لیکن اتنا ناتوان ہو گیا ہوں کہ مر نہیں سکتا۔ اس تمہید کے بعد اصل مضمون کی طرف رجوع کیا ہے۔ اور فرمایا ہے۔

نمبر ۱ - (یعنی نمبر ۱) اس زمانے سے تیس برس پہلے میں نے اپنی نثریں جمع کیں (یعنی رقعات وتنقیدات کتب بزبان فارسی) اور اس کا پنج آہنگ نام رکھا۔ آہنگ لغت فارسی ہے۔ اور اس کے دو معنی ہیں۔ قصد اور آواز۔ چونکہ وہ ایک مجموعہ پارسی ہے۔ میں نے باب کو آہنگ قرار دیا ہے۔ یہ لغت دونوں معنوں کے رو سے بجائے باب سزاوار اور بجا ہے۔ (مراد یہ کہ پنج آہنگ پانچ باب کی کتاب ہے۔ جیسے گلستاں کے پانچ باب ہیں یہ باتیں جو خطوط وحدانی میں درج ہیں۔ مرزا کی نہیں ہیں) پھر لکھتے ہیں۔ چالیس برس میں وہ رسالہ لکھا ہے (شیخ سعدی کی گلستاں بھی کہتے ہیں چالیس ہی سال میں تصنیف ہوئی تھی) اور اب اکتیس برس کے بعد ارادہ ہے کہ کتاب پنج آہنگ کی چوتھی آہنگ جس میں فارسی کی صرف کا بیان ہے اس کو اردو میں ترجمہ کیا جائے۔ تاکہ وہ اوراق حضور پرنور قبلہ حاجات خلق اور کعبہ آمال انام۔ نائب مسیح علیہ السلام۔ جامع دانش وداد۔ امرا کے مربی اور علما کے استاد۔ جناب معلی القاب میکلوڈ صاحب بہادر زار فرمائے ممالک وسیعہ پنجاب۔ یعنی بہ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر ان کا خطاب اور فی الحقیقت سلطان فلک رخش ہلال رکاب۔ کی نظر کئے جائیں

خدا کرے مجھ ترک جاہل کا بیان حضرت کے پسند آئے۔ اور یہ رسالہ ان کی زبان مبارک سے نکات غالب نام پائے۔ (اس طرز عبارت سے بخوبی واضح ہے۔ کہ مرزا اب اس زمانہ کے دستور کے مطابق حتی الامکان مقفی عبارت ہی لکھنے کی کوشش کیا کرتے تھے)

نمبر ۲ - (اس نمبر یا نمبر میں جناب مرزا صاحب اردو زبان کے متعلق کچھ ارشاد فرماتے ہیں) اردو آگے مرکب تھا۔ عربی اور فارسی اور ہندی اور ترکی ان چار زبانوں سے۔ اب پانچویں زبان یعنی انگریزی بھی اس میں شامل ہو گئی۔ دیکھو گنجائش اردو کی کہ یہ پانچوں زبانوں پر کس لطف سے حاوی ہوتی ہے۔ اور یہ زبانیں اس میں کس طرح سما گئی ہیں۔ کہ کوئی زبان غیر نہیں معلوم ہوتی۔ (اب یہاں سے قواعد صرف کو لکھنا شروع کیا ہے) یہ بھی جاننا چاہیئے۔ کہ بے اور جیم اور زے اور کاف عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں آتے ہیں مگر یہ چاروں حرف فارسی میں بہ تغیر لہجہ ایک صوت میں پاتے ہیں۔ بے اور جیم کے تلے اور زے کے اوپر تین تین نقطے دیئے جاتے ہیں۔ اور کاف کے دو مرکز لگاتے ہیں۔ گویا عربی کی بے جیم زے اور کاف فارسی میں پ چ ژ اور گ بن جاتے ہیں۔ اور تائے فوقانی یعنی تے اور دال اور رے یہ تین حرف انگریزی زبان میں ایک شدت کے ساتھ لائے جاتے ہیں۔ وہاں تے پر دو نقطے اور بڑھاتے ہیں (یعنی ٹ۔ انگریزی میں T) اور دال اور رے پر طوئے چھوٹی سی بناتے ہیں (یعنی ڈ = D اور ڑ = R)

نکتہ۔ فقیر کو اس تحریر سے ان صاحبان انگریز کی خدمت گزاری مراد ہے جو ولایت سے تشریف لائیں۔ اور فارسی اور اردو کو اچھی طرح نہ جانتے ہوں پس اب ضرور آپڑا ہے کہ لغات مشکل کمتر درج کروں بلکہ الفاظ زبانزد عوام سے کام لوں۔ وغیرہ۔ وغیرہ۔ پھر مرزا صاحب فرماتے ہیں اب لمبر بہ لمبر لکھونگا مطابق اصل کتاب کے ہر مطالب کو نکتہ تعبیر کرونگا۔ (وہ یہ ہوا) نکتہ۔ فارسی میں مبتدی کی سہولت فہم کے لئے تعلیم کے دو دستور مقرر کئے ہیں۔ مصدر اور مضارع۔ مصدر سے ماضی اور مفعول کا صیغہ پیدا ہوتا ہے۔ اور مضارع سے فاعل اور امر نکلتا ہے۔ مصدر فارسی کے آخر نون کے سوا دوسرا حرف نہیں ہوتا۔ اور مصدری نون سے پہلے دال اور تے کے سوا تیسرا حرف نہیں آتا۔ جیسے کردن اور گفتن۔

نکتہ۔ مضارع مانند مصدر کے کسی سے نہیں بنتا۔ اور اپنی ذات کے واجب ہونے میں مصدر سے کم نہیں۔ ہاں مصدر اول ہے اور مضارع ثانی۔ بس اس کو مصدر سے اتنا علاقہ ہے جتنا موجود ہونے میں ثانی کو اول سے اور گنے جانے میں دو کو ایک سے۔

اور مصدر کی طرح مضارع کی ذات میں سے بھی افعال پیدا ہوتے ہیں۔ آخر ہر مضارع کے دال ہے۔ اور مضارع کی دال سے پہلے حرف کی قید نہیں۔ اکثر حرف تہجی آتے ہیں۔

غرض اس تشریح قواعد زبان میں بھی مرزا کا طرز استدلال اور صرفیوں یا نحویوں سے دوسرے مختلف ہے۔ جیسا کہ مندرجہ بالا مصدر اور مضارع کی بحث سے منتج ہوتا ہے۔

اسی رسالہ کے ضمن میں ایک جگہ مثنوی معنوی کا شعر لکھ کر بتایا ہے کہ اس میں شصت (بمعنی گھات) کو شست کے ہم قافیہ نظم کیا گیا ہے اور یہ صحیح نہیں ہے۔ اصل شعر ان دنوں لکھا ہوا دکھائی دیا تھا

چیزہائے جست تیر از شست او
شصت را ادشنا گر دشیم ست او

مگر مجھے تعجب آتا ہے۔ کہ شعر مذکور میں شصت یعنی ساٹھ کا کہیں ذکر ہی نہیں ہے۔ جو یہ ساٹھ کی بحث کیا۔ البتہ یہاں ہر دو جگہ شست کا لفظ غلطی سے شصت لکھا گیا ہے۔

اس نادر مجموعے کے خاتمے کی عبارت مرزا صاحب نے یہ لکھی ہے۔ نکتہ: اب میں اس تحریر کو ختم کر کے مسودہ انحصار رکھتا ہوں۔ اور ایک کاتب خوشنویس سے اس کی نقل کو لکھوا کر نورچشم اقبال نشاں بالو بیات حل ستودہ خصال کو دیتا ہوں۔ ماشاءاللہ گورنمنٹ بہادر کا کیا اقبال ہے کہ غالب ناتواں نیم جان باآنکہ چھ طرح کے ضعفوں میں مبتلا ہے۔ ضعفِ پیری۔ ضعفِ بصارت۔ ضعفِ اعضا۔ ضعفِ دل۔ ضعفِ دماغ۔ ضعفِ طالع قلم اٹھا سکا۔ اور مطلب کو دل سے زبان تک اور زبان سے قلم تک لا سکا۔ واللہ علیٰ کل شیءٍ قدیر۔

نوٹ:۔ اساتذہ ادب میں سر سید احمد خاں۔ اور مرزا غالب دونوں نے قواعد زبان کے رسالے لکھے۔ لیکن آزاد مرحوم کی جامع القواعد ہی زیادہ مقبول عام ہوئی۔ جو شاید اب بھی کہیں کہیں بطور کورس داخل ہے۔ مولانا حالی نے بھی ایک رسالہ تذکیر و تانیث کی بحث میں لکھا تھا لیکن غیر مکمل ہی رہ گیا۔

سرخوش

رباعی

جب وقت لبِ مغنیہ گاتی ہے
سُر لہرِ تشنگی کی دل کو گرماتی ہے
سرمستی مسحور کی صورت مری روح
خوابوں کے حریم کی طرف جاتی ہے

سعید احمد اعجاز

حیات

عشق بھی آخر عدوئے جان و تن ثابت ہوا
رہنما سمجھے تھے جس کو راہزن ثابت ہوا

آندھیاں چلتی تھیں جس صحرا میں اور اڑتی تھی خاک
تیرے آ جانے سے جنت کا چمن ثابت ہوا

پھر اسی کے عہد و پیماں پر ہمیں جینا پڑا
دہر میں جو بارہا پیماں شکن ثابت ہوا

حسن ہے حسن ارتباطِ آب و گل کا نام تھا
جلوۂ یزداں فریبِ اہرمن ثابت ہوا

بے حقیقت جانتے تھے جس دلِ محزوں کو ہم
رونقِ ہنگامۂ دار و رسن ثابت ہوا

وہ دلِ سوزاں لئے پھرتا ہوں پہلو میں کہ جو
انجمن سے اٹھ کے شمعِ انجمن ثابت ہوا

اہلِ محفل ہو گئے سرشار سن کر اے نظیر
میرا شعرِ تازہ، صہبائے کہن ثابت ہوا

اصغر حسین خاں نظیر

کیوپڈ اور میری شاہدہ

گل گشت کر رہی تھی اک صبح میری پیاری — عکسِ جمال سے تھی ساری فضا درخشاں
اس وقت اتفاقاً کیوپڈ اُدھر سے گزرا — تقدیر کھینچ لائی اس کو سوئے گلستاں
کھیلا لگا کے بازی وہ میری شاہدہ سے — ہارا تمام اُس نے جو کچھ تھا پاس ساماں
اک پل میں ہار ڈالے تیر و کمان و ترکش — ہونٹوں کے لعلِ خنداں رُخ کے گلِ فروزاں
پھینکا اتار کر پھر آئینۂ جبیں بھی — گیسو کا پیچ برقِ دنداں، چہِ زنخداں
جب جیت لیں یہ چیزیں سب میری شاہدہ نے — جھنجلا کے پھر لگائیں کیوپڈ نے چشمِ فتاں

کنگال ہو گیا وہ نورِ نظر بھی کھو کر
بیچارہ آخر اٹھا اندھا وہاں سے ہو کر

مسعود شاہد

پہلی پوجا

(رابندرناتھ ٹیگور کی ایک افسانوی نظم)

براہِ راست بنگالی سے

"ترلوکیشور مندر"*
لوگ کہتے تھے وشوکرما نے اپنے ہاتھوں اسے تعمیر کیا تھا۔
زمانہ قدیم کے کسی سورج بنسی راجہ کے عہدِ حکومت میں ہنومان خود
اس کے لئے پتھر لایا تھا
اتہاس کے پنڈت (تاریخ داں) فرماتے تھے: "یہ مندر کرات جاتی
کا تعمیر کردہ ہے"۔
"یہ دیوتا کراتوں کا ہے"۔
ایک دفعہ جب کشتری راجا نے ملک پر فتح پائی ———
مندر کا صحن پوجاریوں کے لہو سے لالہ گوں ہوگیا۔
دیوتا نے نئے نام اور پوجا کے نئے آئین کی آڑ میں سلامتی پائی ———
ہزار سال قدیم بھگتی کی دھارا کا بہاؤ ——— طریق پرستش
یک لخت تبدیل ہوگیا۔
کرات آج اچھوت قرار دئیے گئے۔ اس مندر میں ان کا داخلہ بند
ہوگیا۔
کرات سماج سے الگ کر دئیے گئے۔ ندی کے اس پار مشرق
میں ان کے گاؤں تھے۔
وہ بھگت تھے مگر ان کا مندر نہیں۔ ان کے گیت تھے بھجن
تھے۔
اُن کے ہاتھ ہنر مند۔ ان کی نگاہیں حق شناس۔
وہ جانتے تھے کس طرح پتھر کے اوپر پتھر چنا جاتا ہے۔
کس طرح پیتل پر روپہلی مینا کاری کی جاتی ہے ———
کرشن شلپا (بنگلوں چیندوا کشیدا) پر موتی ستھاپت کرنے کا طریقہ کیا ہے۔
مگر عنانِ حکومت ان کے ہاتھ میں نہیں تھی۔ ان سے ہتھیار چھین گئے
تھے۔
رہنے سہنے، پوشش و طرزِ معاشرت میں وقار قائم رکھنا ان کے لئے
منع تھا۔ کتبِ مقدسہ کے مطالعہ و تعلیم حاصل کرنے کا انہیں حق حاصل نہیں تھا
ترلوکیشور مندر کا سنہری کلس مغربی سمت سے دکھائی دیتا تھا۔ اس کے
درشن وہ کر سکتے تھے بہت دور سے کھڑے ہوکر دل ہی دل میں اسے
پرنام کرنے کی انہیں اجازت تھی۔
کتک کی چودھویں۔ چاندنی رات کی تقریب ——— جشنِ پرستش۔
مندر میں نوبتی، مردنگ، کرتال اور جھینے بج رہے تھے۔
قناتوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ بیچ بیچ میں پھریرے لہرا
رہے تھے۔
راہگذار کے دونوں طرف دلکش ترتیب کے ساتھ دوکانیں سجی ہوئی
تھیں ———
پیتل کے برتن، چاندی کے زیورات، دیوموتی کے قیمتی پارچات
ریشمی کپڑے، لکڑی اور مٹی کے رنگ برنگ کھلونے، کاغذی بنسریاں،
چیغوزے، بھینٹ پوجا کا سامان پھل پھول مالا، دھوپ، اگر بتی،
تیرتھوں کے جل بھرے چھوٹے چھوٹے برتن وغیرہ سب تیزی سے بک
رہی تھیں۔
بازیگر اپنے مخصوص انداز میں گا بجا کر اپنے کرتبوں سے لوگوں کو
محوِ حیرت کر رہے تھے۔

---

* ہندو علم الاصنام میں تعمیر کا دیوتا۔

کتھا سنانے والے رامائن کی کہانی سنا رہے تھے۔

سفید وردیوں میں ملبوس مسلح سنتری گھوڑوں پر سوار ہو کر گشت لگا رہے تھے۔

شاہی وزرا ہاتھیوں پر ہودج میں بیٹھے جا رہے تھے۔ ان کے آگے آگے سنگھا[1] بجتا چلا جاتا تھا۔

پردہ دار پالکیوں میں امیر گھرانوں کی مستورات تھیں اور ان کے آگے پیچھے نوکروں کی ایک پلٹن۔

ایک تناور پیپل کے زیر سایہ سنیاسی، ننگے، جٹا دھاری اور بھسم ملے سا دھوؤں کا بھاری جمگھٹا تھا۔ عورتیں آتیں۔ ان کے چرنوں میں بڑی عقیدت کے ساتھ بھوگ ——— پھل، دودھ، مٹھائی، چاول وغیرہ رکھ کر چلی جاتیں۔

گاہے بگاہے فلک بوس نعروں سے فضا گونج اٹھتی تھی ———

"جے تریکیشور جے"

کل راجہ کی بھی پوجا کا شبھ لگن ہوگا۔ مہاراج بنفس نفیس ہاتھی پر سوار ہو کر تشریف لائیں گے۔ ان کی گذرگاہ دو رویہ کیلے کے درختوں کی قطاریں ——— پھول مالاؤں سے آراستہ۔ اور منگل گھٹ (نیک شگونی گھڑے) آم کے پتوں سے پیراستہ۔

لمحہ بہ لمحہ گذرگاہ پر معطر پانی کا چھڑکاؤ جاری تھا۔

چاند کی تیرھویں رات

مندر میں پہلے پہر کی آرتی کا گھنٹہ۔ بھیری، دمامہ بجا۔

آج چاند کے چہرہ پر ایک دھندلکا چھا رہا تھا۔

چاندنی پھیکی پھیکی ——— سہمی سی

ہوا بند ———

آسمان پر دھواں سا پھیلا تھا۔

دور ——— حد نظر تک درخت ہراساں، ٹہنیاں سہمی ہوئی سی معلوم دیتی تھیں ———

کتے بلا وجہ لمبی لمبی دردناک آوازیں بھول بھول کر اٹھتے تھے ———

گھوڑے اچانک کان کھڑے کر کے ہنہنانے لگتے تھے کسی نامعلوم سمت کی طرف دیکھ کر۔

ناگہاں زمین کے نیچے سے خوفناک آواز سنائی دی ———

جیسے پاتال کے دیو جنگی نقاروں پر زبردست چوٹیں لگا رہے ہوں ———

گڑا گڑ گڑ گڑ ....

مندر کے گھنٹے زور زور سے بجنے لگے۔

ہاتھی بندھا ہوا تھا۔ وہ زنجیریں توڑ کر چنگھاڑیں مارتا ہوا بے تحاشا بھاگ نکلا۔

زمین لگاتار زلزلہ سے ہلنے لگی

ہزارہا لوگ حواس باختہ ہو کر چیختے چلاتے ادھر ادھر بھاگ کھڑے ہوئے۔

ان کی آنکھوں سے خوف و ہراس ٹپک رہا تھا۔

آپا دھاپی میں اپنے بیگانے کی تمیز نہ رہی۔

زمین شق ہوئی جاتی تھی۔ جا بجا دھوئیں کے بادل اٹھنے لگے۔ کہیں گرم پانی کے چشمے بہ نکلے ———

کہیں بڑے وسیع تالابوں کا لبا لب پانی بالو کے نیچے سما گیا۔

مندر کی چھت سے آویزاں بڑا گھنٹہ ہلورے کھا کر بجنے لگا ———

ٹن ٹن ......

یکدم یہ صدا خاموش ہو گئی اور دھڑام دھڑام کی ہیبت ناک آواز سے سینے دہل گئے۔

زمین جب ساکت ہوئی۔

چاند مغرب کی جانب ڈھل رہا تھا۔

جلتی ہوئی قناتوں سے آسمان میں اٹھتے ہوئے دھوئیں کے حلقے اس طرح معلوم ہوتے تھے جیسے چاندنی کے ساتھ پٹے ہوئے ہوں۔

دوسرے دن جب عزیزوں کے غم میں آہ و بکا سے چاروں طرف فضا میں الم چھا رہا تھا۔

شاہی لشکر جرار نے مندر کا محاصرہ کر لیا۔

اس کے پیچھے استھان پوتر کرنے کے لئے گنگا جل کے گھڑے۔

راج منتری آئے، دھرندھر جوتشی آئے، دھرم شاستروں کے بڑے بڑے پنڈت آئے۔

کیا دیکھا ——— مندر کی بیرونی دیوار بالکل مسمار ہو چکی ہے۔

دیوتا کی ویدی کے اوپر کی چھت گر گئی ہے۔

پنڈتوں نے کہا، اگلی پورنما سے پہلے پہلے سرکار (دوبارہ تعمیر)

---

[1] ایک قدیم قسم کا بگل

ہو جانا چاہیئے۔ نہیں تو دیوتا مورتی کو چھوڑ کر چلے جائیں گے۔

راجہ نے حکم دیا: "فوراً سنسکار کرایا جائے"۔

وزیر نے عرض کیا "ان کراتوں کے سوا پتھر کا کام کون کرے گا۔ ان کی ناپاک نگاہوں سے دیوتا کی رکشا کا کیا انتظام ہوگا"۔

"مندر کے سنسکار سے کیا فائدہ جب دیوتا کی آنکھ ہمارا (عضوی عظمت) کی تقدیس نہ رہی تو:

کراتوں کے سرغنہ مادھو کو راجہ نے بلو بھیجا۔

بوڑھا مادھو اپنے سر کے خشک و سپید بالوں پر سفید چادر اوڑھ کر حاضر ہوا۔۔۔۔

زرد رنگ کی دھوتی پہنے، تانبے کے رنگ کا جسم ننگا، دونو آنکھیں قابل رحم عاجزی سے سرشار،

نہایت مؤدبانہ انداز میں مہاراج کے قدموں کے پاس چھوت کی احتیاط رکھتے ہوئے مٹھی بھر کمل پھول رکھ کر اس نے مجراء عرض کیا۔

راجہ نے کہا "تمہارے بغیر دیو مندر کا سنسکار نہیں ہوسکتا"۔

"ہم پر یہ دیوتا کی کرپا ہے مہاراج!" ان الفاظ کے ساتھ مادھو نے دیوتا کے احترام و عقیدت میں پرنام کیا۔

مہاراج نرسنگھ رائے نے دوہرایا "آنکھیں باندھ کر کام کرنا ہوگا۔ دیوتا کی مورتی پر نگاہ نہیں پڑنی چاہیئے۔ کر سکو گے؟"

مادھو نے عرض کیا "باطنی آنکھوں سے کام سرانجام دیں گے اے باطن شناس، جب تک کام چلے گا۔ آنکھ نہیں کھولوں گا"۔

باہر کراتوں کی جماعت کام کر رہی تھی۔

مندر کے اندر مصروف کار تھا مادھو۔

اس کی آنکھوں پر نہایت مضبوطی سے کالا کپڑا بندھا تھا۔

دن رات مندر سے باہر نہیں نکلتا۔

(دل سے) دھیان کرتا (زبان سے) بھجن کرتا۔ اور اس کی انگلیاں تھیں سرگرم کار۔

وزیر آتا اور کہتا "جلدی کرو، جلدی کرو"۔

دن گذرتے جا رہے ہیں۔ شبھ لگن کے لئے وقت تنگ ہے"۔

مادھو دست بستہ عرض کرتا۔ جس کا (دیوتا) کام ہے وہ خود ہی جلد کرا رہا ہے۔ ہم درمیان میں تو ایک بہانہ ہیں"۔

چاندنی راتیں گذریں۔ پھر اندھیری راتوں کا دور آیا

اندھا مادھو انگلیوں سے چھو کر پتھر کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔

اور پتھر ان کا دے رہا تھا جواب۔

پاس ہی کھڑا تھا پہرہ دار۔

اس کے بعد مادھو نے آنکھوں کی پٹی ذرا ڈھیلی کی۔

پنڈت نے آکر کہا "اکادشی کی رات کو پہلی پوجا کا شبھ لگن ہے۔

اس سے پہلے کام ختم ہو جائے گا کیا؟"

مادھو نمسکار کر کے بولا۔ "میں اس کا کیا جواب دوں؟

بھگوان کی جب کرپا ہوگی۔ وقت پر اطلاع بھجوا دوں گا"۔

"اس سے پہلے خواہ دیر ہو یا رکاوٹ"۔

مندر کے دروازے سے چاندنی روشنی مادھو کے سپید بالوں پر آکر کھیل رہی تھی۔ مادھو نے لمبا سانس کھینچ کر کہا۔۔۔

"جاؤ پہریدار مہاراج کو خبر کرو کہ مادھو کا کام آج ختم ہو گیا ہے۔ وہ اپنا کام آکر کریں مبادا لگن گذر جائے"۔

پہریدار چلا گیا۔

مادھو نے آنکھوں سے پٹی کھول کر الگ پھینک دی۔

جب کھلے دروازے سے اکادشی کے چاند کی جوان کرنیں دیوتا کی مورتی کی بلائیں لے رہی تھیں۔

مادھو گھٹنے ٹیک کر دست بستہ مورتی کے سامنے بیٹھ گیا۔

دیوتا کے چہرہ پر جمی ہوئی تھیں ساکن نگاہیں۔

آنکھوں کے چشمہ سے بہ رہی تھی پریم کی گنگا۔

آج برسوں سے دیدار کے بھوکے بھگت کو دیوتا کا قرب اور درشن نصیب ہوئے۔

راجہ نے مندر میں قدم رکھا۔

مادھو سر بسجود تھا۔ دیوتا کی ویدی مول (قربان گاہ) پر۔

جب راجہ کی تلوار کے ایک ہی وار سے اس کا سر تن سے جدا ہو گیا۔

دیوتا کے قدموں میں یہی تھی پہلی پوجا اور آخری پرنام۔

(ٹیگور)

جگن ناتھ شرما پربھاکر

دنیائے ادب

عورت

تابشِ خورشید۔ نورِ ماہ۔ پانی کی جھلک
خندۂ قلقل، صدا کوئل کی، غنچوں کی چٹک

لرزشِ سیماب۔ بجلی کی تڑپ۔ شاخوں کا لوچ
عقل کی تیزی، طبیعت کی اُپج، شاعر کی سوچ

اضطرابِ موج۔ کانٹوں کی خلش۔ ناگن کے بل
تیر کی سرعت۔ کماں کا عجز، شمشیروں کے پھل

آب موتی کی، چمک کندن کی، ہیرے کی دمک
اشرفی کا روپ، ٹکسالی صداقت کی کھنک

دامنِ کہسار کے منظر، نوائے آبشار
شورِ دریا، کروٹیں لہروں کی، ساحل کا قرار

زمزمہ کا عطر، کیفِ نغمہ، لے کی پختگی
شورشِ مے، مستیِ مے، نوش، جوشِ بیخودی

آہوئے رم خوردہ کی وحشت، طرارے، تیزیاں
گائے کی سنجیدگی، جگنو کی آتش ریزیاں

وادیِ کشمیر کی نزہت، گلوں کا رنگ و بو
سرو کا قد۔ مور کی رفتار، قُمری کا گلو

رونقِ شامِ اودھ، صبحِ بنارس کا نکھار
آگرہ کے تاج کی عظمت۔ ہمالہ کا وقار

دلپذیریِ اذاں دلداریِ ناقوسِ دَیر
صحنِ مسجد کا تقدس۔ پرتوِ فانوسِ دَیر

ہر بھجن کا فیض۔ حسنِ اعتقادِ برہمن
کمبھ کے میلے کی شہرت، وقعتِ گنگ و جمن

تلخیِ انجام جب سب کوششیں ناکام ہوں
خوشنما سیبوں کی ہلکی ترشیاں، جب خام ہوں

بربط و چنگ و سرود و ارغنوں کے زیر و بم   لرزشیں پردوں کی آوازوں کے جادو، تال سم

دیکھ کر یہ اقتباس کارگاہِ انس و جاں   کارپردازانِ قدرت میں ہوئیں سرگوشیاں
ایک بولا امتزاج ان کا قیامت ساز ہے   دوسرا کہنے لگا۔ خاموش کوئی راز ہے

صبحدم جب گوشہ گوشہ مطلعِ انوار تھا   ذرہ ذرہ عالمِ نیرنگ کا سرشار تھا
اُس مرکّب کو اصولی جنبشیں ہونے لگیں   تاکہ ہو غربالِ ندرت سے کثافت تہ نشیں
یہ عناصر ایک مدت تک رہے گرمِ عمل   آخرش تحریکِ عصمت سے ہوئے آپس میں حل
جلوۂ حُسنِ ازل سے پا کے قلبِ ماہیت   آگئی کافور میں بلّور کی سی خاصیت
اب ہیولیٰ ارتقائی منزلیں طے کر گیا   شہپرِ پروازِ عفّت سے بلندی پر گیا
اعتدالِ عنصری پر پالیا جب اعتبار   عزمِ فطرت کے مطابق شکل کی اک اختیار
آئی اعضا میں گدازی اور نرمی جسم میں   آئی رخساروں پہ سُرخی اور گرمی جسم میں
جوں ہی پہنچا پایۂ تکمیل پر یہ شاہکار   دستِ قدرت نے ٹٹولی نبض اس کی بار بار
بسترِ نکہت پہ یہ پتلی جو محوِ خواب تھی   مست انگڑائی کے ہاتھوں جاگ اُٹھی شرما گئی

دیکھ کر شاعر نے اس کو نکتۂ حکمت کہا
اور بے سوچے زمانے نے اُسے "عورت" کہا

شاد عارفی

"ہمایوں"

اُردو کے یورپین پرستار

دہلی کی سلطنت مٹنے پر جب ہندوستان کی سلطنت بدلی اور انگریزی حکومت کا دور دورہ ہوا تو بقول نواب نصیر حسین خیال مرحوم کسے معلوم تھا کہ اردو پھر بھی یوں رائج رہے گی۔ سرکاری حکم اور خرچ سے فورٹ ولیم کلکتہ میں اردو کالج قائم ہوا اور ڈاکٹر جان گلکرائسٹ کی نگرانی میں اس کا سکہ چلنے لگا۔ صرف یہی نہیں بلکہ اردو زبان کی وسعت و ہمہ گیری پر نظر کر کے اُسے سلطنت کی زبان بنانے کی فکر ہونے لگی۔ اور ۱۸۳۷ء میں جب فارسی زبان دفاتر سے متروک ہو گئی۔ تو اس کی جگہ اُردو ہی کو منتخب کیا گیا۔ حکومت کی نظروں میں کل دیسی زبانوں میں اردو کے سوا کوئی دوسری زبان اس قابل نہیں سمجھی گئی کہ وہ دفاتر کی زبان بن سکے۔ صدر عدالت دیوانی سے حکم نافذ کیا گیا۔ کہ ابھی کل ماتحت عدالتوں میں اردو کو رواج دیا جائے۔ اردو تصانیف پر حکومت کی طرف سے انعامات مقرر کئے گئے اور مدارس میں اُردو کی تعلیم لازمی قرار دیدی گئی۔ چنانچہ ہندو مسلمان اور یورپین سبھوں کی متفقہ مساعی جمیلہ کے باعث اُردو زبان سارے ملک میں رائج ہو گئی۔

یورپ کے جو لوگ سب سے پہلے اس ملک میں آئے وہ پرتگالی تھے انکی حکومت بہت قلیل مدت کے لئے اس ملک میں رہی پھر اس کا خاتمہ ہو گیا۔ لیکن اردو زبان نے پرتگالی اثر قبول کر لیا۔ یہاں تک کہ متعدد پرتگالی الفاظ الماری۔ گملا۔ آلپین۔ تولیا۔ تمباکو۔ نیلام۔ بوتل۔ کمرا وغیرہ اس زبان میں داخل ہو گئے۔ نیز فرانسیسی اور ڈچ زبانوں کا بھی اثر پڑا۔ ان قوموں کے بعد انگریز اس ملک میں آئے۔ دیسی باشندوں سے میل ملاپ کے باعث یورپین حضرات کو بھی اردو زبان سیکھنے کی ضرورت پڑی زبان کی تحصیل کے بعد وہ اس کی شیرینی و لطافت اور ہمہ گیری سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اُن کو اس زبان میں کتابیں لکھنے کا شوق پیدا ہو گیا۔ چنانچہ سب سے پہلا یورپین جس نے اردو زبان کے صرف و نحو پر ایک کتاب لکھی وہ جان جاشوا کٹلر تھا۔ یہ ڈچ قوم کا تھا۔ اور اپنی حکومت کی طرف سے شاہ عالم اور جہاندار شاہ شاہان دہلی کے دربار میں سفیر بنا کر بھیجا گیا تھا۔ اس کی اس کتاب کا سنہ تالیف ۱۷۱۵ عیسوی ہے (جس کو ڈیوڈ مل نے ۱۷۴۳ء میں شائع کیا) اس کے بعد ۱۷۴۴ء میں مسٹر میڈلے نے اردو زبان کے صرف و نحو کی ایک کتاب شائع کی۔

کٹلر صاحب کی متذکرہ کتاب کی اشاعت کے ایک سال بعد یعنی ۱۷۴۴ء میں فادر شلیزے نامی ایک پادری کی اُردو صرف و نحو کی ایک کتاب شائع ہوئی۔ مسٹر فرگوسن نے ۱۷۷۳ء میں اُردو زبان کی ایک لغت لکھی۔ اس کے بعد ۱۷۸۷ء سے اُردو زبان کے بہت بڑے محسن ڈاکٹر جان گلکرائسٹ کی تصانیف کا سلسلہ شروع ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے اُردو زبان پر مستند و قابلِ قدر کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں سے چند درج ذیل ہیں۔

(۱) انگریزی ہندوستانی لغت مطبوعہ کلکتہ ۱۷۸۶ء لغایت ۱۷۹۰ء

(۲) مشرقی زبان بشمول انگریزی ہندوستانی اور ہندوستانی انگریزی لغت (جس میں ہندوستانی زبان کے ابتدائی مسائل بیان کئے گئے ہیں) مطبوعہ کلکتہ ۱۷۹۸ء

(۳) قصص مشرقی (قدیم کہانیوں اور قصوں کا ترجمہ انگریزی سے اُردو میں) مطبوعہ کلکتہ ۱۸۰۳ء۔

(۴) مذکورہ بالا کتاب کا خلاصہ بعض اضافوں کے ساتھ مطبوعہ کلکتہ ۱۸۰۰ء

(۵) رہنمائے زبان اُردو مطبوعہ کلکتہ ۱۸۰۴ء۔

(۶) ہندوستانی انگریزی فرہنگ یہ کتاب ایڈنبرا میں ۱۸۰۱ء میں شائع ہوئی۔

(۷) مکالمہ انگریزی ہندوستانی مطبوعہ لندن ۱۸۲۰ء

اس کے بعد جان شیکسپیئر نے ایک ہندوستانی لغت لکھی جو ۱۸۱۷ء میں چھپی بعد مسٹر ڈنکن فاربس کی ہندوستانی لغت ۱۸۲۵ء میں بمقام لندن طبع ہوئی۔ جان ولیم ییل (علم طبیعیات اور کیمیا کا ماہر) آگرہ کالج میں پروفیسر تھا۔ اس نے (معہ نقشہ جات) آلات طبعی کے استعمال متعلق ۱۸۴۵ء میں اردو زبان میں ایک کتاب لکھی تھی جو آگرہ کے مطبع مصور میں ۱۸۴۵ء میں طبع ہوئی۔ جان پارکس لیڈے (جو آگرہ میں سرکاری مترجم تھا) اردو زبان سے نہایت دلچسپی رکھتا تھا۔ اور اردو کا ایک مطبع بھی قائم کر رکھا تھا۔ اس نے علم الاقتصاد پر انگریزی سے ترجمہ کر کے اردو زبان میں ایک کتاب موسومہ ستون المعاش تالیف کی تھی۔ جس کو اپنے ہی مطبع میں ۱۸۵۳ء میں طبع کرایا تھا۔ مسٹر برٹرینڈ نامی ایک فرانسیسی نے بھی اردو زبان کی ایک لغت لکھی تھی جو ۱۸۵۷ء میں پیرس میں چھپی تھی۔

مسٹر براؤس کی لکھی ہوئی ایک اردو انگریزی لغت ۱۸۶۴ء میں لندن میں شائع ہوئی تھی۔ ڈاکٹر فیلن ایک زبردست محقق اور جید عالم تھا۔ ہندوستان کا تعلیم یافتہ طبقہ اس سے اچھی طرح واقف ہے۔ اس نے یوں تو کئی لغات لکھے۔ مگر اس کی دو لغتیں اردو سے انگریزی اور انگریزی سے اردو بہت مشہور ہیں۔ ان تصانیف میں اس نے جس قدر محنت جانفشانی اور تحقیق سے کام لیا ہے وہ اسی کا حصہ تھا۔ یہ دونوں لغتیں نہایت مستند مانی جاتی ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ان سے بہتر ڈکشنریاں آج تک تصنیف نہیں ہوئیں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف ایک مدت دراز تک دہلی، آگرہ، الہ آباد لکھنؤ اور دوسرے بڑے بڑے شہروں میں رہا۔ وہ جہاں بھی رہا گلی کوچوں میں پھرا دیہاتوں میں گیا۔ بڑے بڑے علماء اور فضلاء سے ملا۔ اور ان سے لفظوں کی تحقیق کے متعلق گفت و شنید کرتا رہا۔ ہر ایک لفظ کو تولا، پرکھا، اس کے معنی کے متعلق تحقیق کر لینے کے بعد اپنی لغت میں درج کیا۔ اس نے اپنی اس تصنیف کے دیباچے میں اردو زبان پر محققانہ بحث کی ہے۔ نیز بعض ہندوستانی شعراء کا ذکر کیا ہے۔ اس کی نظر انتخاب کبیر داس اور نظیر اکبر آبادی پر خصوصیت کے ساتھ پڑی ہے۔ نظیر کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے اس کے کلام کی خوبیوں کو واضح طور پر بیان کیا ہے اور جو اعتراضات نظیر پر کئے گئے ہیں۔ اُن کا نہایت مدلل جواب دیا ہے۔

گارسن دتاسی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے۔ وہ فرانسیسی تھا۔ اور اگرچہ ہندوستان کی کوئی زبان نہیں جانتا تھا۔ لیکن اردو زبان میں اس قدر کمال حاصل کر لیا تھا کہ اس زبان کا محقق مانا جاتا تھا۔ اور پیرس یونیورسٹی میں اردو کا پروفیسر مقرر ہوا تھا۔ وہ نہایت مہارت کے ساتھ اردو میں خط و کتابت کرتا تھا۔ چنانچہ اس کے اردو خط کے نمونے اب تک پیرس کے کتب خانۂ ملی میں محفوظ ہیں۔ پروفیسر موصوف نے بہت سی اردو کتابوں کے ترجمے فرانسیسی زبان میں شائع کر کے اپنے ملک اور قوم کو اردو تصانیف سے روشناس کیا ہے۔ غرضیکہ پروفیسر موصوف کو اردو زبان سے سچا عشق تھا۔ اور باوجود اس کے کہ وہ ہندوستان سے ہزاروں میل پر تھا۔ مگر پھر بھی اردو زبان سے درس و تدریس تک ہی دلچسپی نہ لیتا تھا بلکہ اس زبان میں تصنیف و تالیف بھی کرتا تھا۔ اس کی تصنیفات و تالیفات کی فہرست بہت طویل ہے۔ جن میں سے بعض حسب ذیل ہیں۔

(۱) انتخاب کلام میر معہ ترجمہ مطبوعہ پیرس ۱۸۲۶ء (۲) اردو زبان کا ابتدائی رسالہ مطبوعہ پیرس ۱۸۳۳ء (۳) مسلمانانِ مشرق کا علم عروض مطبوعہ پیرس ۱۸۳۴ء۔ (۴) انتخاب از گل بکاولی معہ ترجمہ مطبوعہ پیرس ۱۸۳۵ء۔ (۵) انتخاب کلام ولی معہ ترجمہ مطبوعہ پیرس ۱۸۳۶ء۔ (۷) ذکر تذکرہ حیات شعراء و مصنفین اردو مطبوعہ پیرس ۱۸۳۸ء۔ ایک ہندوستانی ڈرامے کا انتخاب مطبوعہ پیرس ۱۸۵۸ء۔ (۸) مؤلفین و مصنفین اردو کے حالات اور ان کی تصانیف کا ذکر مطبوعہ پیرس ۱۸۶۸ء۔

یہ تو اردو و نثر کا حال تھا۔ لگے ہاتھوں اب ذرا شاعری پر جو اردو زبان کی مایۂ ناز کائنات ہے۔ نظر ڈال لیجئے تو ایسے وقت میں جبکہ یہ زبان آجکل کی سی ترقی یافتہ اور پاکیزہ اردو نہ تھی۔ تاہم اپنی شیریں زبانی، دلکشی اور نرم گفتاری کی بدولت نہ صرف دیسی باشندوں بلکہ سات سمندر پار کے بسنے والوں کی زبان پر بھی اپنا راج بنا لیا۔ اور دیسی باشندوں کے ساتھ مخلصانہ تعلقات نے اس قدر کھینچی اور اتحاد پیدا کر دیا کہ انیسویں صدی کے آغاز سے ہی اکثر یورپین حضرات نے اردو زبان میں اشعار کہنے شروع کر دیئے تھے۔ جن میں سے بعض شعراء کے مختصر حالات معہ نمونہ کلام درج ذیل کئے جاتے ہیں یقین ہے کہ ناظرین اردو زبان کے ان مغربی شعراء کے کلام کی پاکیزگی، زبان کی صفائی اور الفاظ کی بندش ملاحظہ فرما کر نہ صرف محظوظ ہوں گے بلکہ اس کو اردو زبان کی عالمگیر مقبولیت، جاذبیت اور ہر دلعزیزی پر محمول کر کے اپنی پوری توجہ اور منظم قوت کے ساتھ اس زبان کی نگہداشت کریں گے اور باد مخالف کے زہریلے جھونکوں سے بچا کر اپنے اسلاف کی یادگار کو قائم و برقرار رکھتے ہوئے اس کی ترویج و ترقی کی سعی بلیغ کریں گے۔ اور اس طرح سچے اخلاف ہونے کا عملی ثبوت پیش کریں گے ؎

زمین سخن پر پڑے سو رہے ہیں شہیدانِ تیغ سخن کیسے کیسے (سیفی بلگرامی)

(۱) **شائق** تخلص اصل نام جان فانٹم تھا۔ یہ فرانسیسی تھا۔ اور ہندوستان میں مختلف فوجی عہدوں پر مامور رہا۔ فارسی اردو دونوں زبانوں میں اچھی قابلیت رکھتا تھا۔ ۱۸۴۶ء میں بمقام بھرت پور انتقال کیا۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو ؎

جور رقیب و منتِ درباں و طنزِ غیر کیا کیا جفائیں ہم نے سہیں تیرے واسطے

(۲) **مفتون** تخلص۔ اصل نام آگسٹن ڈی سلوا۔ بنگالی تھا اور آگرے میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ مرزا عنایت علی ماہ کا شاگرد تھا۔ کلام ملاحظہ ہو:۔

نکالوں کس طرح پہلو سے ٹکڑا اس کے پیکاں کا
کہ مدت میں گذر دل میں ہوا ہے آج مہماں کا

(۳) **واکر** تخلص، پورا نام جان واکر، انگریز تھا، اور کلکتہ میں کسی عالی عہدے پر فائز تھا۔ اردو سے نہایت اُنس رکھتا تھا۔ اور لب و لہجہ نہایت صاف اور درست تھا۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

او طالب دنیا تجھے عبرت نہیں آتی کھائی دہن خاک نے فغفور کی ہڈی

گر راست ہو قسمت ہو کبھی باعثِ دولت مشہور ہے رکھ پاؤں ہما ہمنوا کی ہڈی

(۴) صبا تخلص، نام جوہانس۔ اردو ادب سے کافی دلچسپی رکھتا تھا۔ اور شاعری میں اچھا دخل تھا۔ میر وزیر علی صبا کا شاگرد تھا۔ بطور نمونہ ایک شعر درج کیا جاتا ہے ؎

دیکھنا توڑ کے وحشت میں نکل جاؤنگا مجھکو پہنانے ہو زنجیر یہ زنجیر عبث

(۵) افلاطون تخلص۔ اصل نام بنجمن جونسٹن حیدرآباد دکن میں ملازم تھا، پیشہ ڈاکٹر تھا۔ اردو اور فارسی دونوں میں اشعار کہتا تھا۔ مرزا مہدی حسن حنا کا شاگرد تھا۔ نمونہ کلام حسب ذیل ہے ؎

کیوں خزاں میں سر پٹک کر مر نہ جائے عندلیب ہے بقائے گل سے وابستہ بقائے عندلیب

(۶) آزاد تخلص۔ اصل نام الگزنڈر ہیڈرلی۔ اردو زبان سے خاص شغف تھا۔ اور اگرچہ ریاست الور میں بعہدہ کپتان ملازم تھا ـ پھر بھی شعر و شاعری کا سلسلہ جاری رکھتا تھا، ۱۸۶۱ء میں انتقال کیا۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

ابرو نہ ہو تو تیغ ستم ریز کھینچیے مژگاں نہ ہو تو خنجر براں نکالیے

(۷) اسفان تخلص۔ پورا نام جارج اسفن۔ قیام زیادہ تر دہلی میں رہا۔ منشی خوب چند ذکا نے اپنے خاص دوستوں میں لکھا ہے۔ اردو شاعری سے نہایت دلچسپی تھی۔ اور ہمیشہ شعرا کی صحبت میں نشست رہا کرتی تھی۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے: ؎

خط کا یہ جواب آیا، لکھا جو کبھی پھر خط کر ڈالونگا اک دم میں ٹکڑے آن کے پرزے

(۸) فراسو تخلص۔ پورا نام معلوم نہ ہو سکا[۱]۔ اردو ادب سے کافی دلچسپی تھی۔ اور بہ سلسلۂ ملازمت مستقل قیام دہلی میں رہا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ گلستان میں رہ کر گلوں سے دلچسپی نہ ہوتی۔ چنانچہ دہلی ہی میں شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ اور خیراتی خاں دلسوز کی شاگردی اختیار کی۔ نمونتہً ایک شعر درج ذیل کیا جاتا ہے۔ جس میں مسٹر فراسو نے اپنے محبوب کے قد کی تعریف کی ہے: ملاحظہ ہو۔

قمری کے مانند وہ پہنے محبت کا طوق

باغ میں گر قد تیرا سرو کو دکھلائیے

(۹) شور تخلص۔ پورا نام جارج پرنس شور۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں اچھی مہارت تھی۔ علی گڑھ میں قیام تھا۔ صاحب دیوان تھا۔ دو دیوان ۱۸۷۰ء میں ممتاز المطابع میرٹھ میں طبع ہوئے تھے۔ مگر اب نایاب ہیں۔ منشی کریم الدین پانی پتی اپنے تذکرہ شعرائے اردو میں لکھتے ہیں۔ کہ میرے مکان پر مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ اور ان مشاعروں میں پڑھنے کے لئے اپنی غزلیں اکثر بھیجا کرتے تھے۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

[۱] فرانسس گوٹن ایڈیٹر ادبی دنیا۔

دیر و حرم میں دے نہیں ترجیح زاہدا

سر جس طرف جھکایا وہی سجدہ گاہ تھی

(۱۰) طوماس تخلص۔ پورا نام جان ٹومس تھا۔ انگریز تھا۔ دہلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ اور اسی شہر کو اپنا وطن ثانی بنا لیا تھا۔ نصیر دہلوی جیسے ماہر فن سے شرف تلمذ تھا۔ بطور نمونہ ایک شعر درج ذیل کیا جاتا ہے: ؎

سودا ہے زلفِ یوسفِ ثانی کا اس قدر

روتے ہیں ہم کھڑے سر بازار زار زار

(۱۱) جمیعت تخلص۔ پورا نام معلوم نہ ہو سکا۔ میجر آرچیٹن کی بیوی تھی اور اپنے شوہر کے ساتھ آگرے میں قیام پذیر تھی۔ اردو خوب جانتی تھی اور کبھی کبھی اشعار بھی موزوں کر لیتی تھی۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

روٹھا ہے ہمارا جو وہ دلبر کئی دن سے

اس واسطے رہتی ہوں میں مضطر کئی دن سے

(۱۲) لارڈ ہین مار ... وکھ اس زبان کی ہمیشہ تعریف کرتا تھا۔ شاعری کا از حد شوق تھا۔ مگر مذہبی تعصبات کا جذبہ بہت غالب تھا جس کا شائبہ کلام میں بھی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک مصرعہ ملاحظہ ہو: ع

دین اسلام گھٹے دین مسیحا بڑھ جائے

جس کا کسی منچلے شاعر نے مصرعہ ثانی میں یوں جواب دیا ہے۔ ع

گر براقِ نبوی سے خرِ عیسیٰ بڑھ جائے

(۱۳) صاحب تخلص۔ اصل نام الوسس رین ہارڈٹ۔ فرانسیسی جنرل سومرو کا فرزند تھا۔ اس کی شاعری کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ دہلی میں اس کے مکان پر اکثر مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ اور شہر کے اکثر ممتاز و مشہور شعرا ان مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ خیراتی خاں دلسوز کا شاگرد تھا۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو ؎

ہے زلف حلقہ زن خطِ دلبر کے آس پاس

یا اژدہا ہے فوج سکندر کے آس پاس

(۱۴) عبری تخلص۔ پورا نام آئزک عبری تھا۔ مذہباً یہودی تھا۔ کلکتہ آکر بس گیا تھا۔ اردو زبان سے بڑی محبت تھی، ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

اشک سے بشیشۂ جگر چشم میخانہ بنے

دیکھیے اب ہمہ تن عبرت میخانہ ہوا

ـــ تخلص اصل نام جارج فانٹوم۔ اس کا باپ برناڈ فانٹوم

(۱۵) صاحب نواب نظام الملک آلی دکن کی سرکار میں فوجی کپتان تھا۔ اور خود اس کا تعلق ریاست رام پور سے تھا۔ شعر و سخن میں میر نجف علی شفقت سے مشورہ لیتا۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتا تھا۔ اور اچھا کہتا تھا۔ صاحب کے علاوہ کبھی جرجیس بھی تخلص کرتا تھا۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

یاد روز وصل آنے کی مجھے اے شوخ

کہ چھوٹے وعدوں پہ بھی انتظار باقی ہے

تخلص۔ نام مس آمین شکیر۔ مسٹر شکیر صاحب پولیس کپتان منفیہ شہر کلکتہ کی بیٹی

(۱۶) ملکہ تھی۔ اردو زبان کی بہت مداح اور اس کی شیرینیت کی دلدادہ تھی۔ کبھی کبھی اشعار بھی کہہ لیا کرتی تھی۔ مؤلف سخن الشعراء منشی عبد الغفور نساخ سے اصلاح لیا کرتی تھی۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے۔

ہوگئی نیند بھی ہمسایہ کی تا صبح حرام — میں نے نالہ جو کسی رات سر شام کیا

ـــ تخلص۔ اصل نام دانیال گارڈنر تھا۔ ضلع ایٹہ میں مقیم تھا۔ اس کا

(۱۷) شکر باپ وہیں سرکار انگریزی میں کسی معزز عہدے پر مامور تھا۔ پہلے جوزف مینلے متخلص بہ فنا کی شاگردی اختیار کی تھی۔ مگر بعد کو مرزا عباس حسین ہوش لکھنوی سے مشورہ سخن کرنے لگا تھا۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

پہنچا ہے بعد مرگ فلک پر مرا غبار — رتبہ بلند خلق میں ہے خاکسار کا

ـــ تخلص۔ پورا نام ایرن جیکوب۔ گورکھپور میں سکونت پذیر تھا۔

(۱۸) ایرن حضرت ریاض خیرآبادی مرحوم سے شرف تلمذ تھا۔ نمونۂ کلام درج ذیل ہے:

یہ کیا چپکے چپکے شکایت ہے اے دل

خبردار کس کا گلا ہو رہا ہے

ـــ مسٹر بلیک کی بیٹی تھی۔ اردو سے خاص دلچسپی رکھتی تھی۔ اور

(۱۹) خفی کبھی کبھی اشعار بھی موزوں کر لیا کرتی تھی۔ اس سے زیادہ حال معلوم نہ ہو سکا۔ نمونۂ کلام یہ ہے:۔

اے خفی اپنے اشک بے تاثیر

مفت میں جگ ہنسائی کرتے ہیں

ـــ تخلص۔ اصل نام جون بلیفیرز۔ اُردو کا اچھا شاعر تھا۔ جنرل ہمبر

(۲۰) اسپر کے بیٹے متخلص بہ صاحب (مندرجہ مضمون ہذا نمبر ۱۵) کے خاص دوستوں میں تھا۔ اور شاہ نصیر دہلوی کے ارشد تلامذہ میں تھا۔ بطور نمونہ ایک شعر درج کیا جاتا ہے۔

شمع فانوس میں در پردہ جلی ہے دیکھو

شعلۂ آہ نکالے ہے جگر سے باہر

یہاں تک تو اُن یورپین حضرات کا تذکرہ تھا۔ جنہوں نے اُردو زبان کی خدمت بذریعہ تصنیف و تالیف اور شعر و سخن کی ہے۔ اب چند ایسے یورپین حضرات کا بھی ذکر کر دینا بیجا نہ ہوگا۔ جنہوں نے اس زبان میں شاعری یا تصنیف و تالیف تو نہیں کی، تاہم اردو زبان سے بے حد دلچسپی رکھتے تھے اور اچھی طرح لکھ پڑھ لیا کرتے تھے۔ اور فصیح اُردو میں گفتگو کر سکتے تھے۔

سر ولیم جونس — ۱۷۸۳ء میں وزرٹ کلکتہ میں جج ہو کر آئے تھے۔ آپ ہی دراصل "ایشیاٹک سوسائٹی" کے بانی تھے۔ اٹھائیس زبانوں کے ماہر تھے۔ اُردو میں بڑی اچھی استعداد تھی۔ ۱۷۹۴ء میں ہندوستان ہی میں انتقال کیا۔

ڈیوک آف کناٹ — ملکۂ وکٹوریہ کے صاحبزادے۔ اُردو نہایت خوب لکھتے۔ اور نہایت روانی کے ساتھ بولتے تھے۔

فریڈرک پین کوٹ — اردو محض جانتے ہی نہ تھے۔ بلکہ اس زبان میں اچھی مہارت رکھتے تھے۔

لیڈی چیمسفورڈ — اُردو کی نہایت دلدادہ تھیں۔ چنانچہ ہندوستان آ کر شملے کے ایک زنانہ جلسے میں اُردو ہی میں تقریر کی۔ جو ادبی حلقوں میں بہت پسند کی گئی۔

آنجہانی ملکہ وکٹوریہ — کو بھی ساٹھ سال کی عمر میں اردو سیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ اور آگرے کے مولوی برکت اللہ مرحوم موصوفہ کو پڑھانے کے لئے لندن بھیجے گئے۔ موصوفہ نے تھوڑے ہی عرصے میں اچھی طرح اُردو لکھنا پڑھنا سیکھ لیا۔ چنانچہ اپنا ایک روزنامچہ بھی اردو ہی میں لکھا ہے۔ ۱۸۹۰ء میں شاہ ایران کی سیاحت انگلستان کے موقع پر وہ ایک جگہ لکھتی ہیں کہ:

آج کا دن بہت اچھا رہا، شاہ پرشیا معہ چند وزیروں کے آئے تھے۔ کھانا ہمراہ کھایا۔ سوا تین بجے لندن گئے۔

"کلیم" **سید قاسم رضا**

نقد و نظر

نغمۂ فردوس

خان بہادر چودھری خوشی محمد ناظرؔ بی اے (علیگ) سابق گورنر ریاست جموں و کشمیر کے مجموعۂ کلام کا حصۂ اول نغمۂ فردوس کے نام سے پروفیسر محمد عبد اللہ کا کل ایم اے نے مرتب فرما کر شائع کیا ہے۔ کتاب کا سائز ۲۶×۲۲/۸ اور حجم ۲۰۰ صفحات ہے۔ کاغذ نفیس اور کتابت و طباعت نہایت شگفتہ۔ قیمت دو روپے۔ ملنے کا پتہ شیخ مبارک علی تاجر کتب لوہاری دروازہ لاہور

کتاب کے شروع میں مصنف و مرتب کی تصاویر ہیں۔ اس کے بعد دونوں حضرات کے دیباچے ہیں جن میں نغمۂ فردوس کی ترتیب و تدوین اور ناظرؔ کی شاعری کے تاریخی و ارتقائی پہلوؤں کے متعلق اظہار خیال کیا گیا ہے۔ چودھری خوشی محمد ناظر سر عبد القادر کی آراستہ کی ہوئی بزم مخزن کے صدر نشینوں میں تھے۔ ان کی شاعری کا آغاز ۱۸۸۹ء میں ہوتا ہے جب وہ ابھی پنجاب کے دور افتادہ گوشے میں ایک معمولی سے اسکول کے طالب علم تھے۔ اس کے بعد وہ علی گڈھ کالج میں تشریف لے گئے جہاں اس زمانے میں سر سید اور مسٹر آرنلڈ کے زیر اثر ہندوستان کی نژاد نو کے بہترین دل و دماغ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ علی گڈھ میں ناظرؔ کا رجحان قومی اور نیچرل شاعری کی طرف ہو گیا۔ اس کے بعد ان کی شاعری کا تیسرا دور جسے شگفتہ ترین دور کہنا چاہئے شروع ہوا جب وہ کشمیر میں بہ سلسلۂ ملازمت مقیم تھے۔ نغمۂ فردوس کی بہت سی دل آویز نظمیں اس زمانے کی یادگار ہیں۔ ان کی شاعری کے چوتھے دور کی ابتدا ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ہوتی ہے اور یہ دور اب تک قائم ہے۔ اگرچہ ناظرؔ کی اپنی رائے ہے کہ اس آخری دور کے رنگ سخن کی تشریح کے لئے یہ شعر کافی ہے۔

ناظرؔ اب ذوق نظر بے کار ہے
منظر ہستی پرانا ہو چکا

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ناظرؔ کے قلم سے اب بھی بعض ایسی رنگین و مرصع نظمیں نکلی ہیں کہ ذوق سلیم کو سر دھننے کے سوائے چارہ نہیں

نغمۂ فردوس کے مختلف ابواب ہیں جن کے ماتحت اس نوع کی متعدد نظمیں درج ہیں۔ مثلاً سروش غیب۔ یاد رفتگاں۔ تہنیات درباری۔ بہرے مناظر قدرت۔ مطائبات۔ غزلیات۔ رباعیات۔ ناظرؔ کی مشہور و معروف نظم جوگی جو طرز خیال کی جدت اور انداز بیان کی حلاوت سے ہندوستان بھر میں مقبول ہو چکی ہے اس مجموعے میں شامل ہے۔ ہماری رائے ہے کہ اگر ناظرؔ اپنی زندگی میں اس نظم کے علاوہ اور کچھ نہ لکھتے تو بھی ان کا نام ادب اردو میں حیات جاوداں حاصل کر لیتا۔

ناظر کو مختلف اصناف سخن پر اُستادانہ قدرت حاصل ہے۔ وہ موقع و محل کے مطابق نہایت شیریں، پر زور اور شاندار زبان استعمال کرتے ہیں اور اُس کے ساتھ محاورے کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ انہوں نے مسلسل نظم لکھنے کی طرف اس وقت توجہ کی جب اردو میں جذبات نگاری کا تنہا ذریعہ غزل بن چکی تھی۔ جوگی اور ناظرؔ کا مکالمہ بعض بعض مقامات پر اتنا دلکش ہے کہ کچھ نقل کرنے کو جی چاہتا ہے۔ مثلاً جوگی ناظر سے کہتا ہے۔

کیوں بابا ناحق جوگی کو تم کس لئے آ کے ستاتے ہو
ہیں پنکھ پکھیرو بن باسی تم جال میں ان کو پھنساتے ہو
کوئی جھگڑا دال چپاتی کا کوئی دعوے گھوڑے ہاتھی کا
کوئی شکوہ سنگی ساتھی کا تم ہم کو آن سناتے ہو
ہم حرص و ہوا کو چھوڑ چکے اس نگری سے منہ موڑ چکے
ہم جو زنجیریں توڑ چکے تم لا کے وہی پہناتے ہو
سنسار سے یاں مکھ پھیرا ہے من میں ساجن کا ڈیرا ہے
یاں آنکھ لڑی ہے پیتم سے تم کس سے آنکھ ملاتے ہو

ناظرؔ کا جواب سنئے

ہیں ہم پردیسی سیلانی یوں آنکھ نہ ہم سے چرا جوگی
ہم آئے ہیں تیرے درشن کو چتون پہ میل نہ لا جوگی
آبادی سے منہ پھیرا کیوں جنگل میں کیا ہے ڈیرا کیوں

ہر محفل میں ہر منزل میں ہر دل میں ہے نور خدا جو گی
نی شہر میں خوب ہلتا ہے واں حسن پہ عشق مچلتا ہے
واں پریم کا ساگر چلتا ہے چل دل کی پیاس بجھا جوگی
واں دل کا غنچہ کھلتا ہے گلیوں میں موہن ملتا ہے
چل شہر میں سنکھ بجا جوگی بازار میں دھونی رما جوگی

سرورِ کائنات

رائٹ آنریبل سید امیر علی مرحوم کی مشہور عالم کتاب "سپرٹ آف اسلام" کے پہلے حصے کا ترجمہ سرورِ کائنات کے نام سے قومی کتب خانہ لاہور نے حال ہی میں شائع کیا ہے۔ کتاب مجلد ہے اور ۲۲ × ۲۹ / ۱۶ کی تقطیع پر شائع ہوئی ہے۔ کاغذ اچھا لکھائی چھپائی اچھی اور ظاہری وضع قطع نہایت خوبصورت قیمت ایک روپیہ چار آنے۔ کتاب کے مترجم مولانا منصور احمد مرحوم ایڈیٹر ادبی دنیا ہیں۔

سید امیر علی مرحوم قانون، تاریخ، فلسفہ مذہب اور سیاست کے بہت بڑے عالم تھے اور اس حیثیت سے ان کی شہرت متمدن دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچ چکی ہے۔ تصنیف و تالیف کے سلسلہ میں ان کا ایک ہمیشہ زندہ رہنے والا کارنامہ "سپرٹ آف اسلام" ہے۔ یہ کتاب اپنے مطالب و معانی حسن انشاپردازی اور اثر و اہمیت کے اعتبار سے دورِ حاضر کی اُن چند کتابوں میں شمار ہوتی ہے جنہوں نے مشرق کی فضیلت و قابلیت کا سکہ مغرب پر بٹھا دیا ہے۔ سید امیر علی کو خدا نے ایسی قدرتِ اظہار بخشی ہے اور وہ معمولی معمولی واقعات کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والا مسحور ہو ہو جاتا ہے۔ ایسا شخص جس کے قلم کی جنبش بے روح چیزوں میں زندگی کی حرارت پیدا کر سکتی ہے جب دنیا کے سب سے بڑے مذہبی، سیاسی اور علمی انقلاب پر خامہ فرسائی کرے اور اس ہستی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مناقب و فضائل بیان کرے جسے دنیا نے خیر البشر تسلیم کر لیا ہے تو پھر اندازہ کیجئے کہ اس کی تحریر میں کس قدر شوکت اور اس کے الفاظ میں کس قدر قوت پیدا ہو جائے گی۔ "سپرٹ آف اسلام" نے یورپ کے سامنے اسلام اور بانیٔ اسلام کی صحیح، پاکیزہ اور دلفریب تصویر پیش کرنے میں بہت بڑا حصہ لیا ہے۔ آنحضرت کے متعلق مغربی دنیا کے تنگ نظر اور متعصب پادریوں نے محض بغض و عناد کی وجہ سے نہایت ناپاک اور غلط قصے مشہور کر رکھے تھے۔ سپرٹ آف اسلام کی اشاعت سے جھوٹ کا یہ قلعہ آہستہ آہستہ مسمار ہو رہا ہے۔

سپرٹ آف اسلام کا پہلا حصہ سیرت النبی پر مشتمل ہے اور دوسرے حصے میں اسلام کی تعلیم اور اصول و ایمان کے متعلق مضامین ہیں۔ سرورِ کائنات پہلے حصے کا ترجمہ ہے۔ ترجمہ جس کاوش، محنت اور خوبی سے کیا گیا ہے اس کی کفالت صرف منصور احمد مرحوم کا نام کرتا ہے۔ اردو زبان کی خوش قسمتی ہے کہ "سپرٹ آف اسلام" ایسی عالمگیر شہرت رکھنے والی بلند پایہ کتاب کے ترجمے کی خدمت منصور احمد نے سر انجام دی جن کا سحر آفریں قلم قوتِ تحریر میں اپنے بہت کم حریف رکھتا تھا۔ منصور احمد کو دوسری زبان کے خیالات کو اپنی زبان میں منتقل کرنے کا جو ملکہ حاصل تھا اُس کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ سید امیر علی کو منصور احمد سے بہتر مترجم نہیں مل سکتا تھا۔ افسوس ہے کہ یہ کتاب مترجم کی زندگی میں شائع نہ ہو سکی۔ وہ لوگ جو منصور احمد مرحوم سے دوستانہ مراسم رکھتے تھے اس کتاب کو ایک بچھڑے ہوئے دوست کی پاک یادگار کے طور پر پڑھیں گے اور وہ لوگ جو ان کی تحریر کے مداح تھے اس نسخے میں ان کی جادو نگاری اور ان کے اسلوب بیان کی شگفتگی کو اپنے عروج پر دیکھیں گے۔ کتاب میں جگہ جگہ انشا پردازی اور محاکات نگاری کے لاجواب نمونے نظر آتے ہیں الفاظ کی برجستگی، فقرات کی چستی اور محاورات کی بندش کی خوب صورت مثالیں ہر صفحے پر موجود ہیں۔ اس مختصر سی جگہ میں ان سب چیزوں کے اقتباسات مشکل ہیں۔

"ع"

Wear FLEX SHOES



ہمیشہ فلیکس کے جوتے پہنیئے

جو آرام دہ، پائیدار اور بے مثل وضع کے ہوتے ہیں

یہی موسم ہے جبکہ لوگ اپنے لیئے نئے جوتے خریدتے ہیں آجکل تمام فلیکس ایجنٹوں کے ہاں

فلیکس کے نئے جوتوں کا اسٹاک موجود ہے جن میں سے آپ اپنی مرضی کے مطابق پسند کر سکتے ہیں۔

وہ لوگ جو اپنی پوشاک کی وقعت کرنا جانتے ہیں ہمیشہ فلیکس کے جوتے ہی پسند

کرتے ہیں جو کہ مضبوط آرام دہ اور فرحت بخش ثابت ہو چکے ہیں۔

فلیکس بوٹوں کے متعلق گارنٹی کیجاتی ہے کہ تمام تر چمڑے سے تیار ہوتے ہیں۔

تمام ہندوستان برما اور سیلون میں سات سو سے زیادہ فلیکس ایجنٹ فروخت کرتے ہیں

چیف ایجنٹس:۔ بھلہ شو کمپنی کانپور

تیار کنندگان:۔ دی نارتھ ویسٹ ٹینری کمپنی کانپور

فلیکس البرٹ سلیپر

فی جوڑہ سیاہ Rs. 4/4/-

فلیکس آکسفورڈ شو

روزانہ استعمال کے لئے بہترین اور سب سے عمدہ چمڑے کا اپر دیئے ہوئے چمڑے کا سول لگایا گیا ہے

قیمت Rs. 5/6 فی جوڑہ سیاہ

لوکل ایجنٹ
دی بھلہ شو کمپنی انارکلی اینڈ دی مال لاہور

دی بھلہ بوٹ ہاؤس امرتسر	خواجہ بوٹ ہاؤس فیروزپور سٹی
دی ایمن بوٹ شاپ امرتسر	دی کیلاش بوٹ ہاؤس جالندھر
دی بسکٹ بوٹ ہاؤس امرتسر	بخشی جیلا محمد اینڈ سنز...
دی انعام بوٹ شاپ گوجرانوالہ	احمد موسیٰ اینڈ برادرز کراچی
دی کشمیر بوٹ ہاؤس راولپنڈی	دی پریم بوٹ ہاؤس سیالکوٹ
دی پاپولر بوٹ ہاؤس اوکاڑہ	دی جالندھر بوٹ ہاؤس جالندھر شہر
کیونٹری ہسٹی لدھیانہ	بسنت شو کمپنی لائلپور
دہلی بوٹ ہاؤس فیروزپور کینٹ	

گراموفون کے

پرانے ریکارڈ

اگر آپ کے پاس ہوں تو انہیں مت پھینکئے

سائنسدانوں نے ایک مسالہ حال میں دریافت کیا ہے

جس کو

زیڈ

ZED

کہتے ہیں اس کے لگانے سے ریکارڈوں میں گھسی ہوئی لکیریں گہری ہو جاتی ہیں اور آواز بہت تیز ہو جاتی ہے وہی دلکش نغمے جو بہت بھلے لگتے ہیں از سر نو عود کر آتے ہیں۔ گھر گھراہٹ بالکل مٹ جاتی ہے نئے ریکارڈوں پر زیڈ لگانے سے عمر بڑھ جاتی ہے اور دیر تک نہیں گھستے خوب بک رہا ہے آپ ہی خرید لیجئے قیمت ایک شیشی دو روپیہ (۲) محصول ۸

ملنے کا پتہ:۔ گرین فیلڈز (انڈیا) کمپنی بنڈر ٹی رسی پی

صوبے کے تمام تعلیمی رسالوں سے اولین اور اردو کا بہترین تعلیمی رسالہ

رہنمائے تعلیم لاہور

جو ۳۴ سال سے متواتر اور باقاعدہ شان و شوکت کے ساتھ پنجاب کے دارالسلطنت لاہور سے جاری ہے۔ مدرسین کی مشکلات کو موثر اور پرزور الفاظ میں افسروں تک پہنچانا اور ان کے حل کی تجاویز پیش کرنا خاص اسی کا کام ہے اس رسالہ میں ہر قسم کے علمی، ادبی، اخلاقی، طبی، ریاضی اور سائنٹفک مضامین شائع ہوتے ہیں۔ گویا یہ رسالہ سررشتہ تعلیمات کا عموماً اور مدرسین و طلبا کا خصوصاً ایک اعلیٰ درجہ کا سچا وکیل ہے۔

الغرض اگر کوئی رسالہ تعلیم و فن تعلیم کا ٹھوس کام کر رہا ہے - وہ "رہنمائے تعلیم" ہی ہے۔ قیمت سالانہ صرف پانچ روپے (ھ) پیشگی لی جاتی ہے نمونہ آٹھ آنے کو دیا جاتا ہے۔

درخواست کرنے کا پتہ

ماسٹر حکمت سنگھ ریٹائرڈ ایڈیٹر رسالہ رہنمائے تعلیم لاہور، ام کا ۵۵